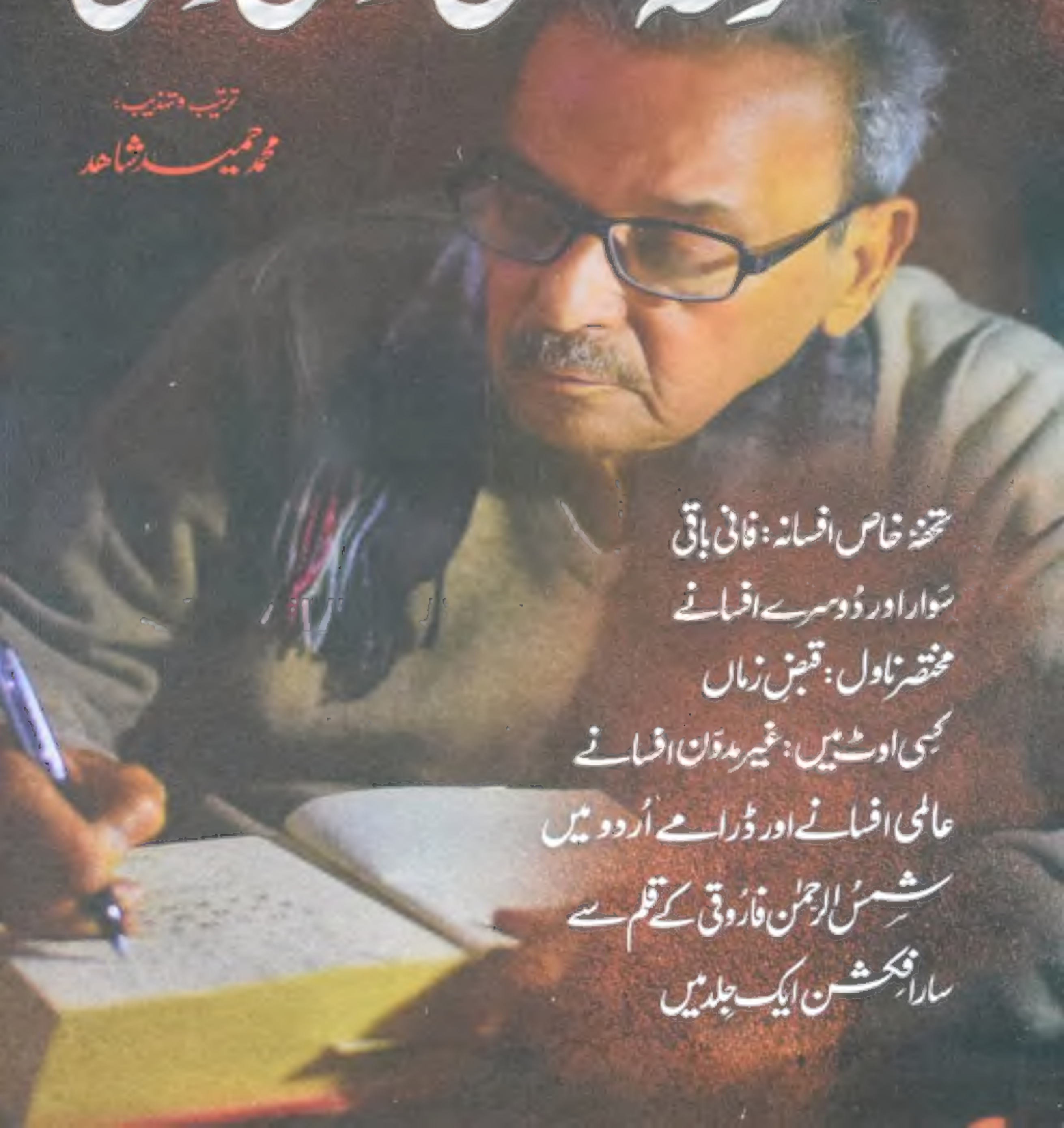
افسانے، ناول، ڈرامے، تراجم

مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی

ترتیب و تہذیب:

محمد حمید شاہد



تحفۂ خاص افسانہ: فانی باقی

سوار اور دوسرے افسانے

مختصر ناول: قبضِ زماں

کبھی اوٹ میں: غیر مدوّن افسانے

عالمی افسانے اور ڈرامے اُردو میں

شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے

سارا فکشن ایک جلد میں

مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی

ناول:

کئی چاند تھے سرِ آسماں
قبضِ زماں

افسانے:

سوار اور دوسرے افسانے

شاعری:

گنجِ سوختہ
سبز اندر سبز
چار سمت دریا
آسماں محراب
مجلس آفاق میں پروانہ ساں (کلیاتِ نظم)

انگریزی کتب:

The Mirror of Beauty (کئی چاند تھے سرِ آسماں)
The Sun that Rose from the Earth (سوار اور دوسرے افسانے)
The Secret Mirror
Early Urdu Literary Culture and History

ترجمے:

شعریات (Poetic، ارسطو)
Aab-e hayat (آبِ حیات، محمد حسین آزاد)
The Shadow of a Bird in Flight (منتخب فارسی اشعار کا ترجمہ)
Four Short Novels of Ibn-e-Safi

ادبی تنقید:

شعر شور انگیز
تفہیم غالب
غالب پر چار تحریریں
ساحری، شاہی، صاحب قرانی (داستان امیر حمزہ کا مطالعہ)
خورشید کا سامانِ سفر
ہمارے لیے منٹو صاحب
اردو کا ابتدائی زمانہ
شعر غیر شعر اور نثر
صورت و معنیٔ سخن
لفظ و معنی
افسانے کی حمایت میں
تنقیدی افکار
اثبات و نفی
اُردو غزل کے اہم موڑ
اندازِ گفتگو کیا ہے
تعبیر کی شرح
معرفتِ شعرِ نو
عجب سحر بیان تھا
تحقیق تنقید اور نئے تصورات (انتخاب از محمد حمید شاہد)

عروض، لسانیات، فرہنگ:

عروض آہنگ اور بیان
لغاتِ روزمرہ
درسِ بلاغت

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے مصنف شمس الرحمٰن فاروقی اُردو دنیا کی ایسی عہد ساز شخصیت ہیں جن کے کام، علمی توفیقات اور تخلیقی امتیازات کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا۔ ہندوستانی حکومت نے انھیں ''پدم شری'' جیسا بڑا ایوارڈ دیا تو حکومتِ پاکستان کی طرف سے ''ستارۂ امتیاز'' کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ خلاق شاعر، مجتہد نقاد، دانشور اور شب خون جیسے رجحان ساز رسالے کے مدیر اور سب سے بڑھ کر ایسے ناول نگار جنھوں نے اپنے فن پاروں کو تہذیبی مرقع بنا کر اس صنف پر امکانات کے نئے آفاق کھول دیے۔ شمس الرحمٰن فاروقی 15 جنوری 1936ء کو پرتاب گڑھ، یوپی، ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ علم و فضل کی قدیم روایت اپنے بزرگوں سے وراثت میں پائی۔ دادا حکیم مولوی محمد اصغر فاروقی تعلیم کے شعبے سے وابستہ تھے اور فراق گورکھپوری کے استاد تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے 1953ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ مقابلے کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فائز رہے۔ اسی دوران ان کے تنقیدی مضامین اور تراجم شائع ہونا شروع ہوئے جنھوں نے ادبی دُنیا کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ جون 1966ء میں ادبی رسالہ ''شب خون'' نکالا اور کئی نسلوں کے ادیبوں کی تربیت کی۔ انھوں نے نقد، شاعری، فکشن، لغت نویسی، داستان، عروض، ترجمہ جیسے کئی فنون پر کتابیں لکھیں۔ تنقید کے میدان میں ان کا سب سے معرکہ آرا کام ''شعر شور انگیز'' کو سمجھا جاتا ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں میر تقی میرؔ کی تفہیم جس انداز سے کی گئی ہے اس کی کوئی مثال اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ اس کتاب پر انھیں 1996ء میں سرسوتی سمان ادبی ایوارڈ بھی ملا۔ انھوں نے ارسطو کی ''بوطیقا'' کا بھی از سرِ نو ترجمہ کیا اور اس کا بہت شاندار مقدمہ تحریر کیا۔ ان کا شعری کلیات ''مجلس آفاق میں پروانہ ساں'' کے نام سے شائع ہوا۔ 2001ء میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان افسانوں نے انھیں مائل کیا کہ وہ برصغیر کی مغلیہ تاریخ کے پس منظر میں کوئی ناول تحریر کریں۔ یہ ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس ناول نے شائع ہوتے ہی کلاسک کا درجہ حاصل کیا۔ اُردو کے تمام بڑے فکشن نگاروں، نقادوں اور قارئین نے اس کا والہانہ استقبال کیا جس کا اندازہ اس ناول کے متعدد ایڈیشنز اور تراجم کی اشاعت سے لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں اس ناول کا کلاسک ایڈیشن شائع کرنے کا اعزاز ''بک کارنر'' جہلم کو حاصل ہوا، اس جدید اشاعت کو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بے حد سراہا۔ ان کا داد بھرا پیغام موصول ہوتا... (بنام امر شاہد) ''ماشاءاللہ، تم کتاب کو دُور تک پھیلا رہے ہو۔ امید ہے کتاب جلد پوری فروخت ہو جائے گی — تمھارا شمس الرحمٰن فاروقی۔''... ادارے کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

اکتوبر 2020ء دُنیائے اُردو اس خبر سے بہت مضطرب ہوئی کہ شمس الرحمٰن فاروقی کووڈ 19 کے وائرس کا شکار ہو گئے ہیں۔ انھیں علاج کے لیے دہلی منتقل کیا گیا جہاں وہ اس وائرس کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں ان کے بے حد اصرار پر 25 دسمبر 2020ء کی صبح انھیں واپس الٰہ آباد منتقل کیا گیا مگر وہاں پہنچنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر سماجی رابطوں کے ذرائع سے فوراً پوری ادبی دنیا میں پھیل گئی۔ انڈیا، پاکستان اور جہاں جہاں اُردو بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے وہاں اسے خاندان کے کسی بزرگ کی موت کی خبر کی طرح سمجھا گیا۔ ان کی وفات سے اُردو ادب ایک بلند قامت ادبی شخصیت سے محروم ہو گیا۔ انھیں ان کی زندگی میں جو شہرت، مقبولیت اور پذیرائی ملی وہ بہت کم افراد کو ملتی ہے مگر وہ اس سے کہیں زیادہ کے حق دار تھے۔ (ناشر)

محمد حمید شاہد

ناول

= مٹی آدم کھاتی ہے

افسانے

= بند آنکھوں سے پرے

= جنم جہنم

= مرگ زار

= آدمی

= سانس لینے میں درد ہوتا ہے

= محمد حمید شاہد کے پچاس افسانے (انتخاب: توصیف تبسم)

= دہشت میں محبت (انتخاب: محمد غالب نشتر)

= پارو (منتخب افسانے: انتخاب و سرائیکی ترجمہ: اصغر عابد)

ترتیب و تدوین

= پاکستانی ادب: ۲۰۰۲ (بہ اشتراک منشایاد)

= پاکستانی ادب: ۲۰۱۰ (بہ اشتراک احمد جاوید)

= سارک ممالک: منتخب تخلیقی ادب (بہ اشتراک انور زاہدی)

= آٹھ اکتوبر: تحریر کے آئینے میں (بہ اشتراک دیگر)

= تخلیق، تنقید اور نئے تصورات (تنقید فاروقی سے انتخاب)

= راجندر سنگھ بیدی: تنقیدی مطالعہ اور منتخب افسانے (انتخاب و مطالعہ)

= غلام عباس: تنقیدی مطالعہ اور منتخب افسانے (انتخاب و مطالعہ)

= جینے کی پابندی: خالدہ حسین (افسانے) (ترتیب، ابتدائیہ)

= مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی (افسانے، ناول، ڈرامے، تراجم) (ترتیب، ابتدائیہ)

= مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی (تنقیدی مضامین) (ترتیب، ابتدائیہ)

تنقید

= ادبی تنازعات (تنقیدی مضامین)

= اردو افسانہ صورت و معنی (فکشن کی تنقید)

= کہانی اور یوسا سے معاملہ (فکشن کی تنقید)

= راشد، میراجی، فیض: نایاب ہیں ہم (نظم کی تنقید)

= اردو فکشن: نئے مباحث (فکشن کی تنقید)

= افسانہ کیسے لکھیں (نئے لکھنے والوں کے لیے رہنما کتاب)

= جستجو گفتگو (تنقیدی مکالمات)

= منٹو آج بھی زندہ ہے (تنقیدی مباحث)

دیگر کتب

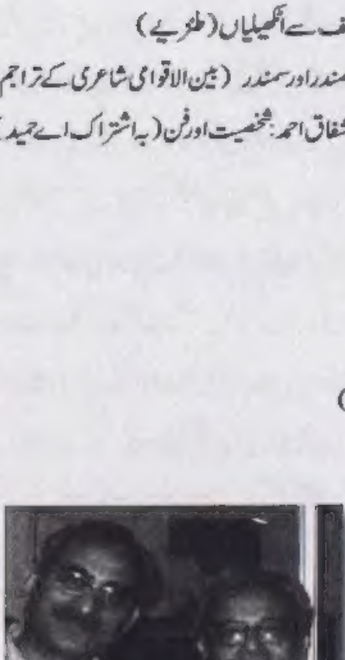
= پیکر جمیل (سیرت النبیؐ)

= لمحوں کا لمس (نظمیں)

= الف سے اٹکھیلیاں (طنزیے)

= سمندر اور سمندر (بین الاقوامی شاعری کے تراجم)

= اشفاق احمد: شخصیت اور فن (بہ اشتراک اے حمید)



مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی

افسانے، ناول، ڈرامے، تراجم

ترتیب و تہذیب:
محمد حمید شاہد

بک کارنر
جہلم، پاکستان

Majmua Shamsur Rahman Faruqi
Compiled by Muhammad Hameed Shahid
Jhelum: Book Corner. 2021
768p.
1. Fiction - Short Stories - Novel
ISBN: 978-969-662-327-4

مہتمم اعلیٰ: شاہد حمید
ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعت: 2021ء
کتاب: مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی
مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی
ترتیب وتہذیب: محمد حمید شاہد
حروف خوانی: محمد اقبال پارس
خطاط: احمد علی بھٹہ
سرورق: ابو امامہ
کمپوزنگ وصفحہ سازی: عمر فاروقی
کتابت: نُوری نستعلیق، علوی نستعلیق
ناشر: بک کارنر
ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner
bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

مہر افشاں فاروقی

اور

باراں فاروقی

کے نام

تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا کیا؟
میں سن نہیں پایا
وہ بولی میں نے اک
ننھی سی چڑیا دیکھی
کہاں تھی وہ؟
وہ سامنے پیڑ پر
اچھا، اس نے کہا، میں سمجھا
تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا

شمس الرحمٰن فاروقی

انگریزی (رابرٹ کریلی) سے ترجمہ

اس بزم میں...

حصہ سوم: مختصر ناول

حصہ چہارم: کسی اوٹ میں

حصہ پنجم: عالمی فکشن کے تراجم

افسانے

ڈرامے

ضمیمہ:

''اس بات میں تو شاید کسی کو کلام نہ ہو کہ فن پارہ تہذیب کا مظہر ہوتا ہے اور تہذیب کے کسی بھی مظہر کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے اور نہ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب تک ہمیں ان اقدار کا علم نہ ہو جو اس تہذیب میں جاری و ساری تھیں۔ فن پارے کی حد تک وہ تہذیبی اقدار اس شعریات میں ہوتی ہیں (یعنی ان اصولوں اور تصورات میں ہوتی ہیں) جن کی پابندی کرنے یا کلام Discourse میں جن کو رائج کرنے سے کلام Discourse کو اس تہذیب میں فن پارے کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔''

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی کا فکشن

شمس الرحمٰن فاروقی کا فکشن اُردو ادب کا ایک مکمل باب ہے۔

اس باب کا مطالعہ تب ہی ڈھنگ سے ممکن ہو پائے گا کہ اُردو ادب کی اس جید شخصیت کے فکشن کو مکمل صورت میں پڑھا جائے۔ فاروقی صاحب کے اس مجموعے کو مرتب کرنے کا خیال اُن کی زندگی ہی میں زیرِ بحث آیا تھا مگر فیصلہ ہوا تھا کہ اس کی ابتدا اُن کے تہذیبی دستاویز ہو جانے والے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' سے کی جائے۔ اس ناول کی نئی اشاعت ان کی زندگی میں ہوئی مگر اس مجموعے کی ترتیب سے پہلے ہی وہ کووڈ19 کا شکار ہو کر ہسپتال جا پہنچے۔ کووڈ سے نپٹ چکے تو بھی صحت بحال نہ ہوئی اور 25 دسمبر 2020ء کو وہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے اور اس باب میں ہمیں ان کی وہ رہنمائی اور معاونت میسر نہیں جو اُن کے ہوتے ہوئے ممکن تھی۔

اُردو تنقید میں اپنے عہد کا سب سے بڑا نام ہو جانے والے شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری کے علاوہ ایک اور تخلیقی جہت ان کا فکشن ہے۔ ان کے فکشن نے ادبی حلقوں کو تب متوجہ کیا تھا جب وہ اپنی عمر کے لگ بھگ باسٹھ ترسیٹھ سال بتا چکے تھے۔ لیکن کیا یہ واقعہ اچانک ایک روشن صبح کو ہو گیا تھا۔ یقیناً ایسا نہیں تھا۔ اپنی ادبی زندگی کے آغاز سے ہی وہ فکشن کی طرف متوجہ تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ جیسا فکشن وہ لکھنا چاہتے تھے اس کی

صورت انھیں نہیں سوجھ رہی تھی۔ یہ سارے مراحل کیسے طے ہوئے اور تنقید کا بڑا نام فکشن کا بھی بڑا نام کیسے بنا، یہ جاننے کے لیے اُن سب تحریروں کی جستجو ہوئی جو اُن کے قلم سے فکشن کی ذیل میں نکلیں۔

فاروقی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ اور دونوں ناول تو دسترس میں تھے مگر اُن کا وہ کام جو ان کی زندگی میں کسی مجموعے کا حصہ نہیں بن پایا تھا اُسے ڈھونڈ نکالنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ اُنھوں نے مختلف اوقات میں خود مجھ سے اپنے فکشن کی کچھ تخلیقات کا ذکر کیا تھا۔ ان میں سے دو تو ناول ہیں جو چھپ کر قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں: ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اور ''قبضِ زماں'' اور تیسرا وہ طویل افسانہ جو ان کے مجموعے کی اشاعت کے بعد لکھا گیا تھا۔ یہ افسانہ ''باقی فانی'' تھا جو بھارت میں اپنے دوستوں کی مدد سے محترمہ شہناز نبی کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہونے والے ''رہروانِ ادب'' کے جنوری تا جون 2020ء کے شمارے سے ڈھونڈ نکالا گیا۔ میری نظر میں یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ''سوار اور دوسرے افسانے'' کے دیباچے میں فاروقی صاحب نے ''گلستان'' کے لیے لکھے گئے افسانوں اور کچھ اور افسانوں کے علاوہ ایک ناولٹ ''دلدل سے باہر'' کا ذکر کیا تھا جسے انھوں نے تین بار لکھا اور میرٹھ سے شائع ہونے والے رسالے معیار میں 1950ء یا 1951ء کے چار شماروں میں قسط وار شائع کروایا تھا مگر یہ افسانے ملے اور نہ ناول۔ پاکستان میں بیٹھ کر وہاں کے دوستوں کو جتنی مشقت میں ڈالا جا سکتا تھا ڈالا گیا مگر شاید ابھی ان تحریروں کے سامنے آنے کا وقت نہ آیا تھا۔

''سوار اور دوسرے افسانے'' کے دیباچے ہی میں فاروقی صاحب نے یہ بھی بتا رکھا ہے کہ ''شب خون'' کے پہلے ہی شمارے میں کئی چیزیں ایسی شامل تھیں جو لکھی تو انھوں نے تھیں لیکن ان پر نام کچھ اور تھے۔ ان میں سے دو نام جو بتائے گئے ''شہرزاد'' اور ''جاوید جمیل'' تھے۔ فاروقی صاحب نے اسی تحریر میں یہ بھی لکھا تھا کہ

> ''گویا افسانہ نگار بننے کا موقع مجھے دوبارہ ہاتھ آیا تھا لیکن پھر بھی معاملہ زیادہ تر افسانوں اور ڈراموں کے تراجم تک محدود رہا۔ دو چار برس میں تنقید اور تبصرہ نے مجھے اس درجہ اپنا لیا کہ افسانہ نگاری میری سوتیلی اولاد بھی نہ رہی۔''

''شب خون'' کے پہلے شمارے ہی سے لکھنے والوں کا مختصر تعارف شامل کیا جاتا تھا۔ مجھے جستجو ہوئی کہ دیکھوں تو بھلا ان فرضی مصنفین کا تعارف کن لفظوں میں کرایا گیا ہے۔ ''شہرزاد'' کے نام سے ''شب خون'' کے جون 1966ء کے پہلے شمارے میں ''بھیانک افسانہ'' کے تحت ''ہر ایک راہ رو کے ساتھ'' کے عنوان اور

مصنف کی طرف سے طویل تعارفی نوٹ کے ساتھ ایک تحریر شامل کی گئی تھی۔ اس افسانے کے آخر میں بھی ایک نوٹ تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ افسانہ پلاٹ اور واقعات کے اعتبار سے عہد جدید کے بھیانک افسانہ کے بادشاہ امریکی افسانہ نگار رابرٹ بلاخ کی کسی کہانی سے ماخوذ تھا۔ اس شمارے کے صفحہ نمبر 80 پر ''اس بزم میں'' کے عنوان تلے اپندر ناتھ اشک، پروفیسر سید احتشام حسین، اصغر زیدی، الا چندر جوشی، امینہ عکس، بشیر نواز، جوہر بجنوری، حامد حسین حامد، حبیب احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن، رام لعل، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، سلیمان اریب اور ڈاکٹر ستیاورسرن کے بعد شہرزاد کا تعارف بھی موجود تھا: ''شہرزاد: اپنے کیے ہوئے ترجموں کی طرح بھیانک نہیں تو پراسرار ضرور ہیں۔ ہمارے استفسار کے جواب میں انھوں نے لکھا۔ ع ''کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔'' جبکہ صبا جائسی، عمیق حنفی، فراق گورکھپوری، فضیل جعفری، ڈاکٹر سید محمد عقیل، پروفیسر مسیح الزماں، اور منظور الامین کے بعد سب سے آخر میں شمس الرحمٰن فاروقی سمیت عثمان عارفی، حمدون عثمانی اور انتخاب سید کا اجتماعی تعارف یوں تھا: ''الٰہ آباد کے نئے شاعر و ادیب ہیں اور 'تازہ واردان بساط ہوائے دل' کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' کہہ لیجیے شمس الرحمٰن فاروقی نے ''ہر راہ رو کے ساتھ'' کے مصنف والا تعارف قصداً پردے میں رکھا اور اپنی ان تحریروں سے فاصلے پر رہے جو فرضی ناموں سے شائع ہونے لگی تھیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ فاروقی صاحب ''شعرائے الٰہ آباد'' اور ''مرضیات جنسی کی نفسیات'' جیسی تحریروں پر اپنا نام دے رہے تھے مگر ماخوذ کہانیوں اور کہانیوں کے تراجم کے لیے انھوں نے ایک فکشنی نام متعارف کروانے کا اہتمام کیا تھا۔

اپنے نام کے بجائے کسی ایسے نام سے لکھنا جس کا اُن کے اپنے فکشن کی دُنیا سے باہر کوئی وجود نہ تھا پہلا اور آخری واقعہ نہ تھا۔ انھوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور اس ضمن کا دوسرا نام جو انھوں نے خود بتا رکھا ہے ''جاوید جمیل'' تھا۔ اس فرضی مصنف جاوید جمیل کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کے نام سے ''شب خون'' کے آخری برسوں تک کئی زبانوں کے تراجم شامل اشاعت ہوتے رہے۔ ''جاوید جمیل'' کی پیدائش بہ طور مصنف ''شہرزاد'' سے بعد کا واقعہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پہلی بار ''شب خون'' کے چوتھے شمارے میں ایک مضمون ''بیلے: ایک مختصر تعارف'' کے ساتھ طلوع ہوا۔ شاید فاروقی صاحب اوّل اوّل ''شہرزاد'' کو ''بھیانک افسانوں'' کے مصنف کے طور پر محدود رکھنا چاہتے ہوں گے جبکہ وہ خود ایک ساتھ کئی شعبوں میں سرگرم تھے۔ ایسے میں سارا بوجھ ''شہرزاد'' سے اُٹھوانا بھانڈا پھوڑ سکتا تھا لہٰذا انھیں ایک اور مصنف تخلیق کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ ''جاوید جمیل'' کی ''شب خون'' کے سارے شماروں میں شائع ہونے والی کُل تخلیقات ایک

چوتھائی سیکڑا ہیں۔ ان میں مضامین، افسانے، افسانوں کے تراجم، ڈراموں کے تراجم اور رپورتاژ وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ ''شہزاد'' کے معاملے میں یہ التزام رکھا گیا کہ اس نام سے افسانہ، افسانے کا ترجمہ اور ڈرامہ ہی شائع ہو۔ کسی اور نام کی اوٹ میں رہ کر فکشن لکھنے کا سلسلہ یہاں رُکا نہیں۔ تاہم جب یہ آخری مرحلے میں پہنچا اور کچھ کامیابیاں فاروقی صاحب کے فکشن کے حصے میں آئیں تو ان کا جی چاہنے لگا تھا کہ وہ یہ پردہ کھینچ کر ایک طرف کر دیں اور اپنے قامت کے ساتھ باہر آئیں۔

اکتوبر 1998ء میں ''شب خون'' کی ایک خاص اشاعت سامنے آتی ہے۔ جی، میری مراد شمارہ نمبر 220 سے ہے جس کے سرورق پر غالب کی تصویر شائع کی گئی تھی۔ اس میں ایک نیا فرضی مصنف ''بینی مادھو رسوا'' موجود ہے۔ اس کے نام سے ''غالب افسانہ'' جیسی اُردو دنیا میں بھرپور توجہ پالینے والی تخلیق شامل ہے۔ اس شمارے کے آخری صفحات میں ''اس بزم میں'' کے ذیل میں ''بینی مادھو رسوا'' کا تعارف ان لفظوں میں ہے: ''بینی مادھو رسوا'' کے بارے میں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ قارئین اس تحریر سے متعلق اپنے تاثرات سے آگاہ کریں''۔ یہ نام بس اسی ''غالب افسانہ'' تک ہی کارآمد رہتا ہے کہ یہ محض اس افسانے کا مصنف ہی نہ تھا افسانے کے متن میں بہ طور راوی کردار بھی موجود تھا۔ ''غالب افسانہ'' اتنا کامیاب رہا تھا کہ فاروقی صاحب کے اندر اس جانب متوجہ رہنے کی تاہنگ بڑھتی چلی گئی کہ دراصل یہی وہ اسلوب تھا جس کی وہ تلاش میں تھے۔

اگرچہ انھوں نے جدیدیت کی ترویج کے لیے بہت کام کیا مگر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ جدید تہذیب متروکیت یعنی Obsolescence کی تہذیب تھی۔ بہ قول اُن کے مغربی دُنیا میں متروکیت کا اس قدر دور دورہ تھا کہ عالم اور طالب علم سب اس پھیر میں تھے کہ کوئی نیا نظریہ اور کوئی نئی بات پیدا کی جائے جب کہ تہذیب کی دنیا میں نئی چیزیں بڑی مشکل سے قائم ہوتی ہیں۔ فاروقی صاحب کا مسئلہ اپنی تہذیب سے جڑنا اور اسے جوڑے رکھنا تھا۔ اُن کے خیال میں ہندوستان میں سامراجی نظام کے دباؤ میں سب سے زیادہ نقصان اُردو کو پہنچا تھا۔ ''شعر، غیر شعر اور نثر'' کی دوسری اشاعت (1998ء) میں انھوں نے ''پس نوشت'' کے طور پر جو تحریر شامل کی تھی، اس میں ان کا نقطہ نظر تھا کہ اُردو زبان، ادب اور تہذیب ہر لحاظ سے کم عمر ہونے کے باوجود سارے ہندوستان میں مقبول تھی۔ دُور دراز صوبوں میں بولی جاتی تھی۔ اس زبان نے فارسی، سنسکرت اور بعض مقامی علاقائی زبانوں سے بھی، مسلسل اور دوررس فائدہ اٹھایا اور سب کی محبوب ہو گئی تھی لہٰذا اُردو والوں کو یہ

باور کرانا کہ تمھارا ادب ناکارہ، زوال یافتہ اور اخلاقی اور عملی اعتبار سے دیوالیہ ہے، انگریزوں کے تہذیبی اور تعلیماتی ایجنڈے میں سرفہرست تھا۔ انگریز اس ایجنڈے کو اتنی کامیابی کے ساتھ سامنے لایا تھا کہ ہم نے خود اس کے زیرِ اثر اپنی تہذیبی میراث کو اپنے لیے باعث شرم کہنا شروع کر دیا۔ فاروقی صاحب اس صورت حال پر کڑھتے رہے تھے اور ''غالب افسانہ'' لکھ کر انھیں لگا تھا کہ وہ جو اُن پر اپنی تہذیب اور تاریخ کا قرض تھا اسے ادا کرنے کی صورت نکل آئی تھی۔ فاروقی صاحب کے فکشن کی اس نئی جہت کو سمجھنے کے لیے ''شعر، غیر شعر اور نثر'' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ایسی صورت میں ہماری پہلی ضرورت اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی وقار اور خود اعتمادی کو بحال کرنے کی ہے۔ چاہے اس کام کے دوران ہمیں مغرب پرستوں سے یہ طعنہ ہی کیوں نہ سننا پڑے کہ ہم ''قدامت پرست'' ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر اپنی تہذیبی اور ادبی میراث کو دوبارہ حاصل کرنے کی قیمت ''قدامت پرست'' یا ''رجعت پسند'' کہلانا ہے تو کیا حرج ہے؟ مغربی اقوام تو اس سے بڑی قیمت وصول کر کے بھی نہ مطمئن ہوں گی۔''

اسی تحریر میں انھوں نے اپنی تہذیب اور تاریخ کی قدر پہچاننے کے عملی اقدامات اٹھانے پر زور دیا اور تجویز دی تھی کہ مغرب سے آئی ہوئی ہر بات کو بے چوں وچرا قبول نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ مرعوبیت کے بجائے برابری کا معاملہ کیا جائے۔ اس تحریر کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> ''آج ہمارے لیے سب سے بڑے کام یہ ہیں۔ اوّل تو اپنی تہذیبی میراث کی قدر و قیمت کو پھر سے قائم کرنا، اور اس کے لیے سب سے پہلا یہ قدم اٹھانا کہ کلاسیکی شعریات کو اسٹیج کے مرکز میں لے آنا۔ ملحوظ رہے یہ شعریات محض غزل کے لیے نہیں، بلکہ تمام کلاسیکی اصناف شعر و نثر کے لیے ہمارے کام آئے گی۔''

فاروقی صاحب نے ''غالب افسانہ'' لکھا تو یہی کلاسیکی شعریات اُن کے کام آ رہی تھی اور اپنی تہذیبی اور ادبی میراث کی قدر و قیمت قائم کرنے کا یہی جذبہ کام کر رہا تھا۔ اس باب میں انھیں غیر معمولی

کامیابی ملی تھی۔ وہ خوش تھے کہ جو وہ کہنا چاہتے تھے اور جس اسلوب میں کہنا چاہتے اس کی تخلیقی صورت انھیں سوجھ گئی تھی۔ فکشن کے اندر جس کامیابی کی وہ تمنا رکھتے تھے وہ انھیں ملنے لگی تو وہ آگے بڑھے اور ایک اور افسانہ لکھا ''لاہور کا ایک واقعہ''۔ یہ افسانہ لکھ کر اگرچہ وہ مطمئن تھے کہ قدرت نے اُن کے اندر جو افسانہ نگاری کی صلاحیت رکھی تھی، تنقید نگاری اور اس باب کی کامیابیوں نے اسے ضائع نہیں کیا تھا۔ وہ نہ صرف محفوظ تھی، اسے کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے کی راہ بھی مل گئی تھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ''لاہور کا ایک واقعہ'' کامیاب افسانہ تو تھا مگر وہ اس نئے افسانے میں ادبی تہذیب اور تاریخ کی مدہم گونج سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے لہٰذا پھر سے ایک اور فرضی نام کی تلاش ہوئی تاکہ بہ طور مصنف اس کا نام اس افسانے کے ساتھ چھپ سکے۔ اس بار جو نام تخلیق ہوا وہ ''عمر شیخ مرزا'' تھا۔ یہی نام ''سوار''، ''ان صحبتوں میں آخر'' اور ''آفتاب زمیں'' کے ساتھ بہ طور مصنف شائع ہوتا رہا۔ بعد کے سب افسانوں میں ادبی تہذیب اور تاریخ کی گونج فاروقی صاحب کی منشا کے عین مطابق ہو گئی تھی۔ لہٰذا ان افسانوں کا مجموعہ چھپا تو کسی فرضی نام کی ضرورت نہ رہی تھی۔ فاروقی صاحب اسے اپنے نام سے سامنے لا رہے تھے اور اسی دوران وہ اپنے تہذیبی اور تاریخی مرقع ہو جانے والے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کو لکھنے کا بھی آغاز کر چکے تھے۔

اس مجموعے میں فاروقی صاحب کے فکشن کے اس سارے سرمائے کو بہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمیں اب تک دستیاب ہو سکا ہے۔ اُن کا ضخیم ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' چوں کہ پورے اہتمام سے اور فاروقی صاحب کی خواہش کے مطابق اس خاکسار کے دیباچے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے اور اسے دوسرے کام کے ساتھ ایک جلد میں چھاپنا ممکن بھی نہیں تھا، اس لیے باقی کا سارا کام اس مجموعے میں یکجا کر دیا گیا ہے۔ جی، چاہے یہ کام فاروقی صاحب کے اپنے نام سے سامنے آیا یا پھر انھوں نے کسی اور نام کی آڑ لے کر اسے لکھا وہ اب اس مجموعے کا حصہ ہے۔

اس ضمن میں یہ قرینہ برتا گیا ہے کہ سارے کام کو درج ذیل پانچ حصوں میں مدون کر دیا جائے:

۱۔ پہلے حصے میں ان کا غیر مدون افسانہ ''فانی باقی'' رکھا گیا ہے جو ان کے اپنے نام کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

۲۔ دوسرے حصے میں وہ پانچ افسانے ہیں جو ان کی زندگی میں ہی ایک مجموعے ''سوار اور دوسرے افسانے'' کی صورت، ان کے اپنے نام کے ساتھ، ایک خاص ترتیب میں سامنے آ چکے تھے۔

۳۔ تیسرے حصے میں فاروقی صاحب کا مختصر ناول ''قبضِ زماں'' ہے۔

۴۔ چوتھے حصے میں وہ افسانے ہیں جو طبع زاد تو ہیں مگر کسی اور نام سے چھپے اور اسی حصے میں وہ افسانے بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن کا خیال یا اسلوب ماخوذ تھا۔

۵۔ پانچویں اور آخری حصے میں فاروقی صاحب کے کیے ہوئے انگریزی کے، یا انگریزی سے دوسری زبانوں کے افسانوں کے تراجم ہیں۔ اسی حصے میں ان کے کیے ہوئے ڈراموں کے تراجم بھی فراہم کر دیے گئے ہیں۔ بتایا جا چکا ہے کہ یہ تراجم بھی فاروقی صاحب کے نام سے شائع نہیں ہوئے تھے تاہم ان میں ایلن کیپرو کی ایک ایسی تحریر بھی شامل ہے جسے ترجمہ تو مہر افشاں فاروقی نے کیا ہے مگر ترجمے کی نظرِ ثانی میں فاروقی صاحب کا اپنا نام موجود ہے۔

فاروقی صاحب کے شہرہ آفاق ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے ابتدائی ابواب اُن قارئین کے لیے بطور ضمیمہ شامل ہیں جنھوں نے ابھی تک یہ ناول نہیں پڑھا۔ تاہم مناسب یہ ہوگا کہ یہ ناول پوری توجہ سے مکمل صورت میں پڑھا جائے جسے بک کارنر نے پہلے اہتمام کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس اہتمام کے نتیجے میں اس عہد کی سب سے جید ادبی شخصیت کے فکشن کا مطالعہ درست درست تناظر میں ممکن ہو پائے گا۔ میں اشاعتی دُنیا میں قابل قدر خدمات انجام دینے والے ادارے ''بک کارنر'' جہلم کے سربراہان گگن شاہد اور امر شاہد کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس مجموعے کی اس اہتمام سے اشاعت ان کی ذاتی توجہ اور معاونت کے بغیر ممکن نہ تھی۔

محمد حمید شاہد

22 جنوری 2021ء

اسلام آباد

”ادب کے معیار آفاقی ہیں یا مقامی؟ یعنی کیا ہر ادبی تہذیب اپنے معیار خود مقرر کرتی ہے یا اسے ایسے معیاروں کی پابند ہونا چاہیے جو عالمی اور آفاقی ہیں.... یہ بھی ظاہر ہے کہ گذشتہ سو برس سے جن معائر اور اصول کو ہم آفاقی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل مغرب سے حاصل کیے گئے ہیں۔ (یا ہم انھیں مغرب سے حاصل شدہ سمجھتے ہیں) بے شک یہ معیار اور اصول بہت محترم اور موقر ہیں۔ ہم نے ان سے بہت قیمتی سی باتیں سیکھی ہیں اور آئندہ بھی سیکھتے رہیں گے (خاص کر طریق کار کے میدان میں) لیکن یہ بات بالکل واضح طور پر کہہ دینے کی ہے کہ کسی تہذیب کے معیار کسی دوسری تہذیب کے معیاروں پر فوقیت نہیں رکھتے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں۔“

شمس الرحمٰن فاروقی

فانی باقی

مرتب کے قلم سے

شمس الرحمن فاروقی کے ہاں تخیل اتنا ہرا بھرا ہے کہ وہ داستان، تاریخ اور تہذیبی مظاہر کے اندر سے ہر بار نئی کہانی تلاش کر کے لاتے رہے ہیں۔ ''فانی باقی'' میں وہ داستان کے اسلوب کو نئی زندگی عطا کرتے ہوئے ہمیں اُس محور تک لے چلتے ہیں جس کے سہارے کائنات کی ہر شئے قائم ہے۔ یہ میرو یا میرو کی کہانی ہے، وششٹھ رشی اور ہماری بھی۔ جی اُس میرو کی جو نیلوفری کی چار پنکھڑیوں جیسا ہے۔ جس کا ہر رُخ یا تو نیلم، سُرخ یاقوت، زرد پکھراج سے بنا ہے یا پھر سفید براق بلور اور سبز زمرد سے۔ یہ داستان افسانہ اترا کورو لوگوں کی ہے۔ انھیں جنات کہہ لیجیے یا دیو۔ آپ کہانی پڑھیں گے تو یقین جانیں ایک سحر تاثیر کرے گا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس افسانے میں ہمارے تصور اور تخیل کو ایڑ لگائی ہے؛ کچھ ایسے کہ جو نہیں تھا وہ آموجود ہوتا ہے۔ یہاں معروض محض انداز بیاں بھی بن جاتا ہے اور کہیں وہ سب جو حاضر تھا وہ غیاب میں چلا جاتا ہے۔

تا جنبش تار نفس افسانہ طراز است

بیدل بہ کمند رگ خواب است دل ما

اسے ایسے زماں اور مکاں کا قصہ کہا جاسکتا ہے، جس میں اُس شاعر کے اشعار بھی القا ہو سکتے ہیں جسے ابھی پیدا ہونا اور القا ہونے والے شعر کہنے ہیں۔ فاروقی صاحب انگریز ناول نگار ولیم میک پیس تھیکری سے متاثر ہیں۔ وہ اس کے تتبع میں کہانی کا ایک خاص زمانہ اور مقامات متعین ہونے پر جملوں کا آہنگ بھی اس کے مطابق بنا کر جہاں چاہتے ہیں کہانی کا راوی بدل لیتے ہیں۔ ابھی وہ کہانی کے اندر تھا، اب باہر ہے۔ وہ وششٹھ رشی کے لڑکھراتے قدموں پر نظر رکھے ہوئے ہے اور اس دوشیزہ یا پہاڑوں پر بسنے والی رُوح پر بھی جو سراپا قیامت تھی اور جس کا سراپا بیان کرنے کو فاروقی صاحب طلسم ہوش ربا کی طرف لپکے تھے۔ داستان گو کا یہ قصہ ہموار چلتا ہے اور موزوں بیانیے میں وہاں مکمل ہوتا ہے جہاں وامن وششٹھ کے گالوں پر بہتے قطرے دیکھے جاسکتے ہیں اور فنا اور بقا کے باب میں بہت کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے۔

افسانہ ''فانی باقی'' شہناز نبی کی ادارت میں کولکاتا سے شائع ہونے والے جریدے ''رہروانِ ادب'' کی اشاعت برائے جنوری-جون 2020ء سے لیا گیا ہے۔

محمد حمید شاہد

پہلی بات*

2020ء میں محمد حسن عسکری کی پیدائش کو سو سال ہو گئے۔ میں نے یہ افسانہ (یا آپ چاہیں تو اسے کوئی اور نام دے لیں) عسکری صاحب کو خراج عقیدت کے طور پر لکھنا شروع کیا تھا، لیکن جیسے جیسے افسانہ صورت پذیر ہوتا گیا، مجھے محسوس ہوا کہ عسکری صاحب اسے پسند نہ کرتے، کیا افسانے کے طور پر کیا کسی طرح کی تمثیلی تحریر کے طور پر۔ لیکن مجھے تو لکھنا وہی تھا جس کا تقاضا میرے دل دماغ میں تھا۔ کئی نشستوں میں یہ افسانہ مکمل ہوا۔ اب جیسا بھی ہے، آپ کے سامنے ہے۔

اس افسانے کے محرکات میں اقبال کا بہت سا کلام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ میں نے اقبال سے کہاں اور کس طرح استفادہ کیا ہے، وہ سب کچھ افسانے میں نمایاں نہیں اور آج کے اقبال پرست دور میں تو شاید بالکل نہ دکھائی دے، البتہ سرنامے کے طور پر ''بال جبریل'' کا ایک شعر ضرور پہچانا جا سکے گا۔

فوری محرکات میں سب سے نمایاں ایرک ہنٹنگٹن (Eric Huntington) کی ایک کتاب اور اس پر میرے دوست ڈیوڈ شلمین (David Shulman) کا تبصرہ ہے جو نیویارک ریویو آف بکس میں شائع ہوا تھا۔ ہنٹنگٹن کی کتاب یونیورسٹی آف واشنگٹن پریس نے شائع کی ہے اور اس کا نام ہے:

Creating the Universe, Depictions of the Cosmos in Himalayan Budhism.

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب ہمالیائی بدھ مت میں رائج کونیات (Cosmology) سے بحث کرتی ہے۔ میں نے اسے جستہ جستہ پڑھا۔ اس میں بہت سی باتیں ایسی ملیں جو جدید انسان کی ذہنی اُلجھنوں اور داخلی کشاکش کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور درحقیقت دعوتِ فکر بھی دیتی ہیں۔

اس افسانے میں بہت کچھ میری اختراع ہے۔ جس طرح سے بھی پڑھیں، یہ افسانہ ہی ہے۔ افسانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں اسے محمد حسن عسکری کی رُوح کی خدمت میں خراج عقیدت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد، فروری۔ اپریل، 2020ء

---

* یہ تحریر افسانے کے ساتھ ''پس نوشت'' کے طور پر شائع ہوئی تھی۔

لااعلم

ہے حال میں ماضی ماضی حال میں مست
لکھا ہے خط شکست میں بود و ہست
ہم روے زمیں پراست و ہم زیر زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

فانی باقی

ا

مری جفا طلبی کو دُعائیں دیتا ہے
وہ دشت سادہ وہ تیرا جہان بے بنیاد

گیارہ سال کی عمر، یعنی سنِ بلوغ کو پہنچتے پہنچتے مجھے سب کچھ سکھا اور سمجھا دیا گیا تھا۔

مثلاً یہ کہ ہماری انسانی کائنات کے دو نام ہیں: جزیرہ آلوچۂ سیاہ اور جمبُ دویپ، اور وہ کائناتی محور، جس کے سہارے کائنات کی ہر شے قائم ہے، اس کا نام کوہستان میرو ہے۔ اسے سمیرو بھی کہتے ہیں۔ سمیرو یا میرو کے پانچ رُخ ہیں:

① اوّل مشرقی رُخ جو نیلم کا بنا ہوا ہے۔

② دوسرا جنوبی رُخ جو سرخ یاقوت کا ہے۔

③ تیسرا مغربی رُخ، یہ زرد پکھراج کا ہے۔

④ چوتھا شمالی رُخ ہے جو سفید بُراق بلور کا ہے۔

⑤ اور سب سے آخری رُخ سمیرو کے مرکز میں ہے۔ یہ گہرے سبز زمرد کا ہے۔

اس کائنات کے شمالی خطے میں ناقابلِ گذار پہاڑ ہیں اور دشت اور صحرا ہیں یہ خطہ اس قدر وسیع اور گھنا ہے کہ اگر اوپر جا کر بہت دُور سے اس کا مشاہدہ کیا ہے تو لگتا ہے کہ سارا جمب دویپ اور کچھ نہیں ہے، صرف کوہ وصحرا ہے۔ لیکن یہ سلسلۂ کوہستان و دشت وصحرا ختم بھی ہو جاتا ہے اور جہاں یہ ختم ہو جاتا ہے وہاں وسیع وعریض میدان ہیں۔ اتنے وسیع کہ جہاں تک نظر جائے، لگتا ہے صرف میدان ہی میدان ہے۔ لیکن غور

سے دیکھیں تو اس میدان میں بستیاں بھی آباد ہیں۔ وہاں کے باشندوں کو اترا کورو کہتے ہیں۔ ان کی عمریں ہزار برس یا اس سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنی معبود دیویوں سے شادیاں بھی رچا لیتے ہیں لیکن کسی شادی کی مدت حیات سات سے آٹھویں دن تک نہیں پہنچتی۔ آٹھویں دن کیا ہوتا ہے؟ یہ کسی کو نہیں معلوم۔ دیوی سے شادی کرنے والا شاید جاں بحق ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غیر معمولی لمبی عمروں کے باوجود اس خطے میں آبادی کا دباؤ اتنا نہیں ہوتا کہ لوگ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوں اور اس طرح وسیع وعریض علاقوں میں جنگ وقتال کر کے جل تھل کو کشتوں سے بھر دیں۔ اس کی نوبت ہی نہیں آتی اور آبادی کا تناسب برقرار رہتا ہے۔

دیویوں سے شادی کرنے والوں کے علاوہ اور لوگ بھی ہیں جو اس خطے میں جینے مرنے کا وظیفہ پورا کرتے ہیں۔ بے شمار درخت، جھاڑیاں، اونچے نیچے پہاڑ ہیں اور ان گنت ندیاں ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی زندگیاں بھرتے ہیں اور انھیں کچھ خبر نہیں کہ یہیں پاس میں کہیں اترا کورو لوگ (یا جنات؟ یا دیو؟) بھی رہتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی زبانوں میں (کیونکہ الگ الگ علاقے کے لوگ الگ الگ زبان بولتے ہیں) میں جن، پری، دیو، پری وغیرہ الفاظ ہیں ہی نہیں۔ کچھ علاقے ایسے ہیں جہاں سخت گرمی پڑتی ہے۔ ان کے یہاں ٹھنڈی چیز کا تصور نہیں۔ وہ ٹھنڈے اور گرم میں فرق نہیں کر سکتے اور ان کی زبان میں برف کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ انھیں گرم پانی پلائیں یا ٹھنڈا یخ پانی، انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک قول یہ بھی مجھے پڑھایا گیا کہ جزیرۂ آلوچۂ سیاہ خود کوئی کائنات نہیں ہے، وہ دراصل تمام کائناتوں کا مرکز ہے اور جزیرۂ آلوچۂ سیاہ کو سات سمندر گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ ان سمندروں کی تفریق اس طرح قائم ہے کہ ہر ایک سمندر کے بعد ایک خطۂ زمین ہے۔ کچھ لوگوں کا مشاہدہ ہے کہ ان سات سمندروں میں الگ الگ چیزیں بھری ہوئی ہیں۔ اوّل میں آبِ تلخ و نمکیں، دوئم میں شربتِ گڑ، سوئم میں شراب یا سوم رس، چہارم میں مکھن، پنجم میں جُغرات اور چھٹویں میں دُودھ۔ آخری سمندر کے بعد کوئی خطہ نہیں ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔

ایک بڑی مایوسی کی بات یہ تھی کہ کسی کو نہیں معلوم کہ تمام کائناتوں کا آخری سرا کہاں ہے۔ کہا گیا کہ اس سرے کے بارے میں ہم جان بھی لیں کہ وہ کس طرف اور کتنے فاصلے پر ہے تو بھی ہم وہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ لیکن دُکھم، جو انسان کی اصل تقدیر ہے، اس سے نجات تب ہی مل سکتی ہے جب ہم تمام کائناتوں کے انتہائی آخری کنارے کو چھو لیں۔ معلوم ہوا کہ دُکھم یعنی دُکھ، درد، غم، اِنتشار سے کسی کو نجات نہیں۔

میرے استاد کی عادت تھی کہ بولتے بولتے سو جایا کرتے تھے۔ ہماری یا کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کو بیدار کرے یا درس چھوڑ کر چلا جائے۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میرے استاد سرِ صبح ہی سو گئے اور سرِ شام بیدار ہوئے۔ ان کے چہرے پر اور چہرے ہی پر کیوں، ان کی ساری شخصیت پر، ان کی پور پور پر، نور کی قوت برستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بے تاخیر اور اس طرح، گویا وہ سوئے ہی نہ تھے، انھوں نے کہنا شروع کر دیا:

''ہاں، یہ جزیرۂ آلوچۂ سیاہ بھی کسی کا بنایا ہوا ہے۔ یہ بے انت نہیں ہے۔ بس اتنی بات درست ہے کہ کوہستان میرو ساری کائنات، بلکہ تمام کائناتوں کا محور ہے۔ اس کوہستان کے مختلف کوہ و در کو تم ایک نیلوفر کے پھول کی طرح تصور کر سکتے ہو۔

اور جب تصور کر سکو گے تو اسے وجود میں بھی لا سکو گے۔ اس طرح کہ کوہستان میرو ے نیلوفری کی چار پنکھڑیاں ہیں اور ہر پنکھڑی ایک براعظم ہے اور جنوبی پنکھڑی کا نام بھارت ہے اور یہ ملک، جس پر تم آباد ہو، اسی بھارت یا ہند یا سندھ کا ایک حصہ ہے۔''

میری تعلیم کے آخری سال کئی پوشیدہ قوتوں کو اپنے اندر پیدا کرنے اور پھر ان سے خارجی ماحول پر اثر انداز ہونے، بلکہ کبھی خارجی ماحول کو نیست و نابود کر کے یا ماحول خلق کرنے کی مشق میں صَرف ہوئے۔ میں کچھ سمجھتا، کچھ نہ سمجھتا، لیکن سوال کرنے یا تفصیل و کوائف معلوم کرنے کا یارا مجھ میں نہ تھا۔ کسی میں بھی نہ تھا۔ میرے والدین میں بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ شاید تھی کہ ان کا عقیدہ تھا کہ حقیقت دراصل تمھارے ذہن کا داخلی ترین حصہ ہے تو کیا حقیقت الگ سے، معروضی طور پر، کچھ نہیں؟ ایک بار میں نے ہمت کر کے پوچھ ہی دیا۔ والدہ تو دوپٹے میں منہ چھپا کر میری بیوقوفی یا معصومیت پر مُسکرانے لگیں۔ لیکن میرے والد چپ رہے۔ میں خوش ہو رہا تھا کہ بڑے میاں کو اچھا چت کیا ہے۔ اب کل جا کر اپنے اُستاد جی کی بھی اُستادی نکالوں گا۔ لیکن چند لمحے کے سکوت کے بعد میرے باپ گویا ہوئے:

''معروض کیا ہے؟ صرف اندازِ بیاں ہے۔ تم اس گھڑے کو دیکھ رہے ہو اور اس میں بھرے ہوئے پانی کو بھی دیکھ رہے ہو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جب تم اس کے پاس جانے کا ارادہ کرو تو پاس تک نہ پہنچ سکو؟ اگر تم ایک چیونٹی میں تبدیل ہو جاؤ تو تم گھڑے کا منہ بھی نہ دیکھ پاؤ گے۔ گھڑے کی سطح چیونٹی کو اتنی ہی وسیع اور لاحد نظر آئے گی جیسے انسانوں کی زمین کی سطح تمھیں محسوس ہوتی ہے کہ سطح ہے، چپٹی ہے اور بے اَنت ہے

اور اگر تم کسی اُونچی جگہ کھڑے کر دیے جاؤ گے تو تمھیں گھڑا نظر بھی نہ آئے گا اور ابھی تو ہم تین شخص اس گھڑے کو دیکھ رہے ہیں۔ ہم کہیں بھی جا کر گواہی دے سکتے ہیں کہ ہماری کوٹھری میں ایک پانی کا گھڑا ہے اور وہ پانی سے بھرا ہوا بھی ہے۔ اس وقت تو تم اپنی آنکھوں، اپنی قوتِ مشاہدہ، قوتِ ادراک کے بل پر گواہی دے سکتے ہو اور وہ بالکل سچی گواہی ہوگی۔ لیکن اگر ہم لوگ یہاں نہ ہوں؟ کوئی بھی نہ ہو؟ تو پھر کون گواہی دے گا کہ پانی کا گھڑا یہاں ہے؟ پھر تمھاری قوتِ مشاہدہ کس کام کی جب وہ موجود اور غیر موجود میں فرق کرنے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو؟''

مجھے یہ فضول سی بال کی کھال لگی۔ لیکن اچانک میرے باپ نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا تو میں نے دیکھا کہ ہماری کوٹھری کی چھت سے ایک چاند لٹک رہا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا (یا دیکھا) کہ وہی چاند چھت سے اُتر کر میرے دل میں روشن ہو گیا ہے۔ گھبرا کر میں نے اپنا سر جھنجھوڑا، ہاتھ پاؤں پھینکے جیسے مجھے صرع کا دَورہ پڑ گیا ہو۔ لیکن اب جو ہوش آیا تو چاند کہیں نہ تھا۔ چھت پہلے کی طرح سنسان تھی۔

یہ بھی ان لوگوں کا کوئی شعبدہ ہوگا، میں نے دل میں سوچا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ آگ نہ جلائے یا پانی تر نہ کرے؟

اگلے دن درس شروع ہونے کے پہلے اُستاد نے مجھ سے پوچھا:

''کیا تم جانتے ہو کہ تمھاری ریڑھ کی آخری ہڈی سے لے کر سر کی آخری ہڈی تک بہتر ہزار ندیاں ہیں؟''

میں نے کہا: ''جی نہیں۔''

اُستاد کی بات مجھے بالکل احمقانہ لگی تھی، لیکن زبان پر حرفِ استفسار یا اِنکار لانے کی مجال کہاں تھی؟ اُستاد نے فرمایا:

''یہ بہتر ہزار ندیاں تمھارے بدن کے تمام حصوں کو انفاس کی قوت پہنچاتی ہیں، کچھ بہت تیزی سے، کچھ آہستہ آہستہ اور کچھ بالکل آہستہ۔ اگر یہ ندیاں نہ ہوں تو انفاس کی مناسب قوت کے بغیر تم اپاہج ہو جاؤ، خاص کر تمھارا دماغ کچھ نہ رہ جائے، پلپلی جھلیوں کا گندہ مجموعہ ہو کر رہ جائے۔

میں چپکا سنتا رہا....

''اور تمھارے بدن میں سات چکر ہیں۔ ہر چکر کو بیدار کرنے سے اس کی قوتیں بیدار ہوتی اور زندگی کو بامعنی بناتی ہیں اور ساتویں چکر کے نیچے، تمھاری ریڑھ کی آخری ہڈی کے آخری جوڑ کے نیچے کنڈلنی کا مستقر ہے۔ وہ ایک ناگ ہے جو ہر وقت خوابیدہ رہتا ہے۔ وہ جو حق کا سچا متلاشی ہے، وہ اپنے وجود کی فہم حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف کنڈلنی کو جگانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر تم ایسا کر سکو تو کیا ہر طرح کے دُکھ درد سے آزاد ہو سکو گے؟ نہیں، ہر طرح کا دُکھ تو نہیں، لیکن جینے مرنے کے دُکھ کو سہنے کی صلاحیت تم میں پیدا ہو جائے گی۔ وہ معروضی ہو یا موضوعی، لیکن تم دُنیاوی زیست کے دُکھ سے ہر طرح آزاد ہو گے۔ تم جانتے ہو، انسانی وجود کی سب سے بڑی آزمائش دُکھم ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے، مختلف درجوں میں اور مختلف شکلوں میں۔ جب تم دُودھ پیتے بچّے تھے اور تمھیں بھوک لگتی تھی اور تمھارے رونے، گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے کے باوجود تمھیں دُودھ نہ ملتا تو تم اس وقت اپنی ننھی مُنی ہستی کے سب سے بڑے دُکھ میں مبتلا تھے۔

اور اب، جب تم خود کو کائنات میں تنہا نظر آتے ہو، تنہائی سے بڑھ کر کوئی دُکھ نہیں۔ ہاں موت کا خواب البتہ ایک ایسا دُکھ ہے جو موت کے وقت سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کنڈلنی کوئی علامت نہیں، کوئی اِستعارہ نہیں، تم خود ہو۔ اسے جگاؤ گے تو خود تمھیں کائنات کی سب سے بڑی بیداری نصیب ہو جائے گی۔ کوئی ضروری نہیں کہ تمھیں کنڈلنی کو جگانے کے لیے خود کو کسی پہاڑ کے غار میں بند کر لینا پڑے۔ تم نے سُنا ہوگا کہ ایک زمانے میں لوگ اپنے خزانے پر ایک سانپ متعین کر دیتے تھے۔ سانپ کو ہٹاؤ تو خزانے کا راستہ دکھائی دے۔ کیا وہ کوئی طلسمی سانپ تھا، یا علامتی سانپ، یا واقعی اپنے دانتوں کے پیچھے کوئی زہریلی تھیلیوں والا، نوکدار دانتوں والا، دو شاخہ زبان والا؟ کیا معلوم؟''

میری سمجھ میں کچھ بھی تو نہ آیا۔ بھلا انسانی جسم میں کوئی سانپ بھی سویا ہوا ہو سکتا ہے؟ سچ مچ کا

سانپ اور وہ بھی ناگ دیوتا؟ ہوگا۔

"اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ تم کنڈلنی کو جگالو تو تم دُکھ سے واقعی آزاد ہو جاؤ۔ ہاں، دکھ تمھاری نگاہوں میں حقیر یا غیر اہم لگنے لگتا ہے۔ دُکھ تو کائنات کا مرکز ہے، اس سے فراغ کہاں؟ پیدا ہونے سے لے کر نجات حاصل کرنے کے درمیان جتنی منزلیں ہیں وہ دُکھ سے عبارت ہیں اور یہ نہ بھولو کہ سب سے بڑا مرحلہ نجات حاصل کر لینے کا ہے۔ اس کے بعد تمھاری زندگی میں کوئی مقصد نہ رہے گا تو تم وہاں پہنچ کر کیا کرو گے"؟

ایک سبق نے تو میری عقل ہی غارت کر دی۔ ذہنی اور مادی کائناتیں آپس میں مدغم ہو سکتی ہیں۔ تم اپنے لیے چاند خلق کر سکتے ہو اور اسے آسمان پر معلق بھی کر سکتے ہو۔ کیا تم نے غور کیا کہ خارجی مظہرے سمندر، پہاڑ، آسمان وغیرہ اگر نظر آتے ہیں تو یہ تمھارے ذہنی مظاہر کا پرتو بھی ہو سکتے ہیں جنھیں تمھارا شعور ادراک کے پردے پر منعکس کر سکتا ہے؟ یعنی مظاہر ہی اصل مظاہر ہیں؟

یہ سب مجھے پڑھایا گیا۔ پڑھایا ہی نہیں سکھایا گیا۔ سکھایا ہی نہیں میری ذات اور وجود کا حصہ بنایا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مظاہر اگر داخلی ہیں تو میں انھیں خارجی سطح پر بھی دیکھ سکتا ہوں اور اگر دیکھ سکتا ہوں تو وہ موجود ہیں اور اگر وہ موجود ہیں تو میرے ہی خلق کردہ ہیں۔

تو پھر یہ شعروشاعری، یہ عشق ومحبت، یہ دریافت اور ایجاد۔ یہ سب کیا ہیں؟ یہ سب تم ہو، تمھارے باہر کچھ نہیں۔ ہر بار مجھے غیب سے یہی جواب آتا۔ مجھے اپنے آپ سے، ہر شے سے خوف آنے لگا۔ یہ دُنیا، یہ وجود، یہ تگ ودو، یہ دوستیاں، ملک گیریاں، کشورستانیاں، یہ سب میں ہی ہوں؟ ہاں۔ اگر یہ سب تم نہیں ہو تو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ تم ہی ان کے خلاق ہو اور تم ہی ان کو نیست و نابود کرو گے، کر سکتے ہو، اب بھی یہی کر رہے ہو۔

میں یہ سب سن، پڑھ اور سیکھ کر زندگی سے اُکتا گیا تھا۔ میں اپنے گھر، اپنی درسگاہ، اپنے گاؤں، سب کو بے معنی اور فضول جاننے لگا تھا۔ یہ کون سی تعلیم ہے اور کون سی عقل جو مجھے سکھاتی تھی کہ میں ہی اپنا بنانے والا اور پھر اپنا ہی زوال ہوں اور پھر صفحۂ ہستی سے خود کو مٹانے والا بھی ہوں۔ آخر اور بھی لوگ ہیں۔ کھاتے، پیتے، انسانی افعال اور انسانی آلودگیوں سے خالی نہیں۔ وہ جیتے، لڑتے بھڑتے، بدلہ لیتے، جرم وسزا

کے مراحل سے بھی گذرتے ہیں لیکن وہ میری ہی طرح کے لوگ نہیں تو پھر کیا ہیں؟ کیا اُنھوں نے اپنے آپ کو خود ہی بنایا ہے۔ تو کیا ان کو نجات کی فکر نہیں؟ لیکن نجات بھی دُکھم کا اَنت تو نہیں؟ تو ان کے دُکھ کیسے ہیں؟ ویسے، جیسے کسی جانور کے ہوتے ہیں؟ جسے کوئی پروا نہیں کہ فکر کرے کہ وہ کہاں سے آیا تھا اور مرنا کسے کہتے ہیں؟ بس مرنے سے خوف، زندگی کو قائم رکھنے کے جدوجہد، اسے وہ سمجھتے ہیں۔

ان کو شاید موت کی حقیقت کا علم بھی نہیں۔ ہاں، دُکھ وہ ضرور جانتے ہیں، یا شاید جانتے ہیں لیکن اس نام سے نہیں؟ کیا وہ نام کا تصور بھی رکھتے ہیں یا یہ ہم ہیں جو اشیا کو نام دے کر سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس شے کو اپنے علم کے حصار میں قید کر لیا؟ لیکن موت کے بعد کیا ہے؟ شاید کچھ نہیں، ورنہ ہر ارذل ترین ذی رُوح زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اتنی تگ و دو کیوں کرتا ہے، اتنے دُکھ کیوں بھوگتا ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ انھیں نہیں معلوم، زندگی کو وہ جانتے ہیں۔ اسی لیے زندگی کو عزیز رکھتے ہیں۔

۲

میں نے ایک رات گھر چھوڑ دیا۔ میرا باپ ہماری جھونپڑی کے دروازے پر کھردرے فرش پر سویا ہوا تھا۔ میری ماں کہیں اندر رسوئی کی چوکھٹ کو تکیہ بنا کر معصوموں کی نیند سو رہی تھی۔

میرا باپ؟ میری ماں؟ کیا میں بھی اپنے باپ کی قوتِ ایجاد کا ایک مظہرہ تھا؟ کیا اس نے اپنا نطفہ میری ماں کے رحم میں ڈالا تھا اور میں نے ہستی کے خفیف ترین ذرّے سے لے کر مکمل ہوش و حواس والے وجود کی منزلیں اس آرام گاہ میں محفوظ گذاری تھیں؟ شاید وہی چند لمحے تھے جب میں دُکھ سے بے خبر تھا یا پھر میری ماں.... کیا میری ماں بھی اس چاند کی طرح تھی جسے میرے باپ نے آناً فاناً ہماری جھونپڑی کی چھت سے معلق کر کے پھر اُسے میرے دل میں اُتار دیا تھا؟ تو پھر نہ کوئی میرا باپ تھا، نہ کوئی میری ماں۔ میں اس پورے برہمانڈ میں اکیلا تھا۔

پھر بھی، میں چل پڑا۔ ہمارے بھارت کے جنوبی خطے میں ایک ملک ہے جس کو ایک زمانے میں کیرالا پترا کہا جاتا تھا۔ کیرالا یعنی تاڑ کا پیڑ اور پترا بمعنی بیٹا۔ اس کے نام بدلتے گئے، یہاں تک کہ اس کے کئی علاقے متعین ہوئے اور ان کے نام بھی الگ الگ رکھے گئے اور بدلتے گئے۔ بہر حال مجھے تو کیرالا پترا

ہی نام اچھا لگتا ہے۔ میں نے اب تک جتنے علوم حاصل کیے تھے ان میں موسیقی اور رقص کو خاص اہمیت تھی۔ لیکن کیرالا پترا میں ایسے کئی رقص تھے جنھیں وہاں جا کر ہی سمجھا اور ممکن ہوا تو سیکھا جا سکتا تھا۔

اثنائے راہ میں مجھے کئی بار یہ خیال آیا کہ یہ سب سیکھنے سے کیا فائدہ؟ مجھے تو اپنا ہی علم ابھی کچھ نہ تھا، دُنیا بھر کی غیر ضروری چیزیں جان لینے کے بعد میں خود کو سمجھ لوں گا؟ کنڈلنی کو جگانا بے شک میری دسترس میں تھا لیکن کیا دُکھ کا کوئی علاج وہاں تھا بھی کہ نہیں؟ مگر خیر، چلو آگے بڑھو۔ ناگ کنڈلنی تو میرے بس میں تھا ہی، آگے چلتے ہیں، دیکھیں کیا دکھائی دیتا ہے۔

''ایک قصر نادر روزگار مثل آسمان بلند ہے.... ایک دریچہ طلائے احمر کا اس قصر میں نمایاں ہے۔ صبح کو جب آفتاب نکلتا ہے.... ایک ہوا آتی ہے وہ پردے کو اُڑاتی ہے۔ پردہ اُڑ کر میخ ہائے طلا پر نصب ہو جاتا ہے۔ چالیس دروازے اس دریچے کے داہنے اور بائیں بنے ہیں۔ وہ بھی وَا ہو جاتے ہیں۔ ہر دروازے میں ایک ایک عورت حسین، منقلِ آتشیں لیے، مشک و عنبر سُلگتا ہوا، آ کر کھڑی ہوتی ہے۔ بعد اس کے ایک نازنین مہ جبین، مہر تمکین، نمونہ برقِ طور، از سرتا پا دریائے جواہر میں غرق، اس دریچۂ طلائی میں کرسیِ جواہر نگار پر آ کر بیٹھتی ہے، کرشمہ واَدا میں طاق، حسن و جمال میں شہرہ آفاق. گلے میں ہیکل الماس کے نگینوں کی پڑی ہے.... جو اس نازنین کو دیکھتا ہے، دلدادہ، شیفتہ و فریفتہ ہوتا ہے.... وہ نازنین (ترنج کو) مجمعِ عشاق میں پھینکتی ہے۔ جو شخص اس ترنج کو اُٹھا کر سونگھتا ہے، گریبان چاک کرتا ہے اپنے کو ہلاک کرتا ہے۔ ایک سمت ایک برج نظر آتا ہے۔ اس برج پر ایک کبوتر باز لباسِ زریں پہنے، چھپی طلائی ہاتھ میں، کبوتر اُڑاتا ہے۔ ایک زنجیر طلائی اس برج سے لٹکی رہتی ہے۔ ہر شخص (جو) اس ترنج کو سونگھ کر دیوانہ ہو جاتا ہے، جوش جنوں میں بڑھتا ہے، زنجیرِ طلائی کو پکڑ کر چڑھتا ہے۔ جب قریب برج کے پہنچتا ہے کہ اوپر چڑھ جائے اپنے کو اس نازنین تک پہنچائے، اس برج میں ایک سوراخ پیدا (ہوتا) ہے۔ اس سوراخ سے ایک ہاتھ نکلتا ہے، اس شخص کو اندر سوراخ کے کھینچ لیتا ہے۔ بعد ایک ساعت کے اس شخص کا سر کٹا ہوا، سوراخ سے وہی ہاتھ باہر پھینک دیتا ہے۔ پھر وہ

نازنین نظر نہیں آتی، کھڑکی بند ہو جاتی ہے۔''

(ایرج نامہ، جلد اول، داستان گو: شیخ تصدق حسین)

معلوم نہیں میں ہوش میں ہوں یا مجھ میں کسی قسم کا سحر تاثیر کر گیا ہے۔ یا شاید میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ میں ہڑبڑا کر جاگا۔ میں کسی ندی کے کنارے پہاڑی کی چھاؤں میں سو گیا تھا۔ وہاں خدا جانے مجھ پر کیا معرکہ گذرا۔ کیا میرا باپ اپنی قوتیں استعمال کر کے مجھے واپس بلا رہا تھا؟ یا اس نے یہ طلسمات صرف مجھے چکر میں ڈالنے کے لیے خلق کیے تھے؟ میں پھر سو گیا۔ اب....

''ایک صحرائے پُرخار دشت پر آزار سے گذر ہوا جہاں کی زمین بھی تابشِ آفتاب سے سیاہ تھی، تیرہ بختی مسافرانِ صحرا کی گواہ تھی.... پانی نام کو نہیں چشمہ چشم بھی اشکوں سے خالی، زبانِ مژگاں سے سُوکھی سناتے.... کہیں کہیں جانور جو نظر آتا نکلتا تا پانی کی تلاش میں پھڑ پھڑاتا زبان باہر نکالے تڑپتا۔ ..دو تین چیلیں پوٹے ٹیکے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھیں اور ہانپ رہی تھیں، سوزِ جگر کی سرد مہری سے کانپ رہی تھیں۔

تالاب اور جھیلیں برنگِ آئینہ مصفا ہیں۔ بگلے ایک پاؤں سے بغلوں میں چونچ دابے کھڑے ہیں.... مینڈک جھیل چشمے میں اڑاتا ہے۔ جھینگر کی چیں چیں ہے، ٹٹیری ٹراتی ہے.... ہوا سرد چلنے لگی۔ درختوں کی کھڑکھڑاہٹ سے ہرن کی ڈاریں دامانِ کوہ اور بیہڑ سے نکلیں.... کسی طرف سے پاڑھے کسی جانب سے نیل گائیں ظاہر ہوئیں۔ کچھار میں شیر ڈکارا، ہاتھی چنگاڑا، درختوں میں مرغ جھنڈ کے جھنڈ بولنے لگے۔ ڈھیٹر چہکارے، جھیلوں پر بگلوں نے پھریری لی، مچھلیاں دم مارنے لگیں۔

جوانانِ بوستاں مثل صالح پاک روش و نیک رُو، پنجۂ مرجاں برنگ دست دعائے عابد خوش خو، صد برگ میں تسبیحِ صد دانہ کا شمار، جعفری مطیع جعفر تیار۔ نسیم سحر میں متبرک نفس زاہدوں کا اثر، دفترِ قدرتِ خدا کا ورق، ہر برگ سوسن زبانِ شکر کنندگانِ داور، مہندی برنگ روشن ضمیرانِ صاف باطن، بوئے گل مشام اہل راز کی ساکن، غنچہ مثل دہانِ حقیقت آگاہان خاموش، قمریوں کی زبان پر حق سرہٗ کا جوش، کلیاں صومعہ زادان خوشبو، سنبل یادکدیورِ قدرت میں آشفتہ مو....

ہر سمت شاہدانِ طناز پائینچے کلائیوں پر ڈالے دوپٹے کاندھوں پر ڈھلکائے ہوئے ہزاروں ناز و انداز سے پھرتے، دم خرام محشر بپا کرتے۔ رات کا وقت، شمع و چراغاں روشن، صحن میں چوکا لگا، پلنگوں پر جوبن۔ کوئی نیند میں غافل کوئی لہو ولعب کا شاغل۔ کہیں چوسر کہیں گنجفہ۔ کہیں ستار بجتا، بائیں کا ٹھیکا۔ کہیں کہانی ہو رہی ہے کہیں شعرخوانی ہو رہی ہے۔ کہیں پردے پڑے ہوئے چاہنے والے درپردہ مزے اڑاتے، شام ہی سے پہنچے ہوئے۔ کہیں دوئی کی صدا، کسی جا قہقہے اُڑتے، پھبتیاں کہنے کی آواز برپا۔ قلماقنیاں داغستانیاں کاندھے پر رکھے پہرے پر ٹہلتیں۔ باری دارنیاں اوٹوں کے قریب جاگ رہیں۔"

(طلسم ہوش رُبا، جلد اوّل، داستان گو: سید محمد حسین جاہ)

میرے خدا، یہ کون سے ملک ہیں جن کے مناظر میں نے دیکھے؟ کیا واقعی ایسی جگہیں جسمانی، وجود رکھتی ہیں؟ یا ان کا وجود محض ذہنی ہے؟ اچھا فرض کیا ذہنی ہی وجود سہی، لیکن کہیں تو کوئی چیزیں ایسی ہوں گی جن کی بنا پر میں ان کا تصور کر سکا، خواب ہی میں سہی یا کیا واقعی میں نے خواب دیکھے تھے یا ان جگہوں پر میں کبھی نہ کبھی آیا گیا تھا؟ کہا جاتا ہے ہم ایسی چیزوں کا تصور نہیں کر سکتے جو موجود نہ ہوں۔ یہ ہمارے فلسفے کا بنیادی اُصول ہے۔ تو پھر، وہ جو کچھ میں نے دیکھا، کیا تھا؟ دیکھا بھی کہ نہیں؟ لیکن یہاں تو دیکھنے اور تصور میں لانے میں کوئی فرق نہیں؟ اب میں کیا کروں؟ چلو فرض کیا وہ سب جگہیں، وہ سب مناظر، وہ سب ماحول، وہ ہوائیں، وہ آوازیں، وہ موسیقی، وہ سب ہیں ہی نہیں لیکن ہو سکتے ہیں۔

میں نے مانا ہم لوگ عجائبات اور حجابات سے گھرے ہوئے ہیں اور جب ہم ہی لوگ بے وجود ہیں تو پھر ان متفرق، متلون دنیاؤں کا کیا ڈر؟ کوئی مجھے واپس بلائے یا میں خود گھبرا کر واپس چلا جاؤں یا یہیں یا کہیں اور اپنی ہتیا کر لوں، کسی کا کیا بگڑتا ہے؟ میں جانتا ہوں کہ مجھے کوہستان ہمالیہ پر بھی جانا ہے۔ مانا کہ وہ جگہ یہاں سے بہت دُور ہے اور ابھی چند لمحوں کے جو خواب میں دیکھ کر جاگا ہوں، ان کی ان مراحل کے آگے کوئی حقیقت نہیں جو مجھے کوہستان ہمالیہ کی راہ میں مجھے درپیش ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے وہاں میرے خوابوں کی طرح دیولوک بھی ہیں اور اسرلوک بھی۔ اژدہے اور مگرمچھ بھی ہیں اور رقاصان سیماب منظر بھی۔ وہاں کی بھول بھلیاں ایسی ہیں کہ پوری پوری قومیں ان میں داخل ہو کر گم ہو جاتی اور پھر نابود ہو جاتی ہیں۔ بڑے

بڑے محلوں کے محافظ ہیں جن کے سر آسمان کو چھوتے ہیں اور جن کے ایک ہاتھ میں کل عالم کی موت ہے اور ایک ہاتھ میں کل عالم کی حیات۔ جو کوئی ان کے سوالوں کے جواب نہ دے سکے، ان کے ایک اشارے میں فنا ہو جائے گا۔

۳

یہاں، یعنی جس جگہ کہ اب میں ہوں، یہاں کئی طرح کے ناچ گانے، موسیقی کے نظام ہیں۔ یہی جگہ کیرالا پترا ہے اور میں یہاں مدتوں سے قیام پذیر ہوں۔ یہاں میں ان کی موسیقی اور رقص کے سارے فنون، سارے شعبدوں پر مکمل مہارت حاصل کر چکا ہوں۔ صرف ایک کھیل یا سوانگ باقی ہے۔ اسے یہاں کے لوگ گُرُی یتم سوانگ، یا رہسیہ کہتے ہیں۔ اس رہسیہ کو جاننے اور برتنے والے صرف ایک رشی ہیں جو بارہ سال میں ایک بار منظرِ دُنیا پر آتے ہیں اور اپنا رہسیہ دکھا کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس میں کئی قول اور بھی ہیں۔ میں انھیں وقت پر بیان کروں گا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ نادرۂ روزگار مناظر جنھیں میں اثنائے راہ خواب میں دیکھ چکا ہوں (اس کو مدتیں گذریں)، ان سے بھی بڑھ کر کوئی اعجوبہ ہو سکتا ہے۔ لیکن دیکھیں گے۔ ان بزرگ کے نمودار ہونے میں اب صرف چند ہفتے باقی ہیں۔

ان بزرگ کا نام کوئی نہیں جانتا۔ ان کی عمر کتنی ہے، یہ بھی کسی کو نہیں معلوم۔ بس یہ ہے کہ لوگ انھیں رہسیہ سمراٹ کہتے ہیں۔ کچھ لوگ انھیں نٹ راج بھی کہتے ہیں۔ وہ بارہ سال میں ایک بار نمودار ہوتے ہیں۔ کاویری ندی کی تہ میں کہیں ایک غار میں ان کا مسکن ہے۔ ان کا ناچ تین دن یا پانچ دن یا سات دن چلتا ہے۔ میں نے بہت پوچھا لیکن کوئی اس سے زیادہ بتانے پر راضی نہ ہوا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ روشنی بہت معمولی ہوتی ہے اور کوئی منچ یا تماشا گاہ کا چبوترا یا تخت نہیں ہوتا۔ رقص گاہ کی زمین کو چوبیس گھنٹے کی محنت میں تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی اسے چکنا کرتے ہیں لیکن اتنا نہیں کہ نٹ راج تماشے کے دوران لڑکھڑا جائیں یا پھسل جائیں۔ زمین بالکل برابر کر دی جاتی ہے، کنکر پتھر نکال دیے جاتے ہیں تا کہ زمین اپنی اصل صورت میں نظر آئے۔ رہسیہ سمراٹ کے پیچھے چار موسیقار ہوتے ہیں۔ وہ سازندوں کا بھی کام کرتے ہیں۔ جس زبان میں وہ گیت گاتے ہیں وہ ویدوں کی سنسکرت سے مشابہ ہوتی ہے، لیکن سراسر ویدی سنسکرت نہیں ہوتی۔

اس میں کیرالا پترا کی قدیمی زبان کی بھی آمیزش ہوتی ہے۔ اس زبان کے آغاز اور اس کی اصل کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ لیکن اتناسب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ زبان دیوتاؤں کی بنائی ہوئی لیکن ان قوموں کی زبان ہے جو بھارت میں آریاؤں کی آمد کے پہلے سے آباد تھیں۔ شروع شروع میں یہ سارے ملک میں جگہ جگہ بولی جاتی تھی، یعنی اس بھارت میں جس پر تم آباد ہو اور جو ایک وسیع تر بھارت یا ہند یا سندھ کا حصہ ہے۔ ویدی سنسکرت کی طرح یہ زبان باہر سے نہیں آئی تھی۔

کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تصور کی حد سے باہر دُور زمانوں میں ایک مخبوط الحواس شخص رہتا تھا۔ اسے کوئی کام نہ آتا تھا، اس کی پرورش کے لیے اسے ایک مندر میں حاجب مقرر کرا دیا گیا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ جس سے بھی ملتا، کچھ دیر بعد اس کا نام بھول جاتا تھا۔ زبان اس کو آتی نہ تھی، اس لیے اشاروں سے اور اس سے زیادہ غوں غاں کر کے بتاتا تھا کہ کون آیا کون گیا۔ ان باتوں کی بنا پر لوگ اسے مسخرہ بھی سمجھتے تھے۔

مندر میں جس مقدس کتاب کے اقوال کا وِرد ہوتا تھا وہ اس قدر قدیم تھی کہ اس کے کئی اوراق پر سے حرف اُڑ چکے تھے۔ پروہت لوگ اپنی اپنی اٹکل سے الفاظ نکالتے، لیکن ان کے معنی پھر بھی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ایک زمانہ گذر گیا، کتاب قدیم تر اور بوسیدہ تر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اسے پڑھنا موقوف کر دیا گیا۔ زائرین آتے، اسے دُور سے سلام کرتے یا اگر بہت ہوا تو اسے آہستہ سے مَس کرتے اور چلے جاتے۔ ان احتیاطوں کے باوجود استمرارِ زمان کے باعث کتاب کے حرف تقریباً سب کے سب اُڑ گئے۔ اب اسے مندر کے ایک تاریک کونے میں رکھ دیا گیا کہ ہوا بھی نہ لگے۔ بہت ہی شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا کہ کوئی دُور دراز کا مسافر اس کتاب کے کسی اشلوک یا فقرے کے معنی پوچھنے آ جاتا تو اسے پروہتِ اعلیٰ کے سامنے حاضر کیا جاتا۔ پروہت اپنی سمجھ سے جو معنی بتا دیتا انھیں کو آخری اور حتمی قرار دیا جاتا۔ سوال پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کی کسی کو نہ جرأت تھی اور نہ ضرورت۔

ہمارے مخبوط الحواس مسخرے کو شراب کا بھی بہت چسکا تھا۔ ایک رات وہ ساری رات پیتا رہا اور بے سدھ ہو کر اس طاق کے نیچے پڑ رہا جس پر وہ مقدس کتاب رکھی جاتی تھی۔ صبح ہوئی تو دُنیا جاگ گئی لیکن نہ جاگا تو وہ مست و خراب نیم فاتر العقل خادم۔ جب بہت دیر ہو گئی اور زائرین کو کتابِ مقدس کی دُور سے زیارت میں مشکل ہونے لگی تو اس نیم فاتر العقل مسخرے کو گھسیٹ کر مندر کے باہر کر دیا گیا۔ وہ تین دن تک

سوتا رہا۔ چوتھے دن جب وہ جاگا تو اس کی زبان پر کچھ عجیب و غریب نامانوس اور ذرا کرخت الفاظ رواں تھے۔ کرختگی کے باوجود اس زبان میں ایک پراسرار موسیقی بھی تھی گویا کہیں دُور کچھ دیوتا آپس میں گفتگو کرتے ہوں۔ وہ دن بھر ایسے ہی اوَل فول بکتا رہا۔ شام کے قریب ایک پروہت، جو بہت بڑے عالم بھی تھے، نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ تو کچھ مانوس اور شنیدہ سے ہیں۔ اچانک اس پر یہ بات روشن ہوئی کہ وہ الفاظ تو کتاب مقدس سے بہت مشابہ ہیں۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور کتاب کو اپنے دامن میں چھپا کر باہر لایا۔ کتاب کی جھلک پاتے ہی مسخرے نے اس کی تمام عبارتیں فرفر پڑھنا شروع کر دیں۔ بہت غور اور تذبذب کے بعد یہ نتیجہ نکالا گیا کہ جو زبان وہ مخبوط الحواس حاجب بول رہا تھا، وہی تو کتابِ مقدس کی اصل زبان تھی جسے لوگ امتدادِ وقت اور تطاولِ ایام کے باعث بھول چکے تھے۔

پھر وہی زبان ملک کیرالا پترا کی زبان قرار پائی۔ دن گذرتے گئے، اس میں سنسکرت بھی بہت ساری داخل ہوگئی۔ سنسکرت وہ زبان تھی جسے یہاں کے طالبِ علموں اور قاضیوں نے کوہستان سمیرو کے طویل اسفار کے بعد آہستہ آہستہ حاصل کیا تھا۔ پھر بعد میں عربی کے الفاظ بھی اس میں دخیل ہوتے گئے۔ جو لوگ عربی سے متاثر اس زبان کے ماہر تھے انھیں منشی اور ماپلا کہا جاتا تھا۔ پھر یہ عربی معاشرے میں اس قدر نفوذ کر گئی کہ دو زبانیں وجود میں آگئیں، ایک تو وہ جسے مقامی زبان میں، لیکن عربی رسم الخط میں لکھا جاتا اور ایک تو وہ زبان جسے ہم آپ سب بولتے تھے۔ اس زبان میں بھی عربی الفاظ کی وافر تعداد تھی لیکن مقامی دیوتائی زبان کے تصرف کی وجہ سے وہ الفاظ بدلتے گئے اور اب تو بمشکل ہی انھیں عربی الفاظ کہا جاسکتا تھا۔

زبانیں سیکھنے کا بے حد شوق اور بہت جلد کسی بھی نئی زبان پر ماہر ہونے کی بے اندازہ صلاحیت مجھے بزرگوں سے ملی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ شاید سوچنے، دیکھنے، موسیقی کے زیر و بم کو سمجھنے کی قوت جو مجھے ماں کے پیٹ ہی میں مل گئی تھی، اسی طرح یہ بھی کوئی عطیۂ الٰہی ہے اور شاید ایک دن وہ بھی آئے جب میں دنیا کی کسی بھی زبان کو صرف ایک بار سن کر سمجھ سکوں گا۔ یعنی کوئی لفظ بولا گیا اور میں نے اسے فوراً سمجھ لیا، خواہ زبان کا نام مجھے معلوم نہ ہو اور نہ ہی اس خطے کا نام جہاں وہ بولی جاتی ہوگی۔

آخر وہ وقت آگیا جب رہسیہ سمراٹ نے ظہور کیا۔ لوگ مجتمع ہونے لگے۔ موسیقاروں نے اپنی جگہ سنبھالی۔ تماشا گاہ، جیسا کہ میں نے بتایا، مسطح تھی، کوئی مرتفع جگہ نہ تھی۔ لوگ مگر پھر بھی جمع ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے پاس کے گھروں کی چھتوں اور چھجوں پر بھی لوگ آ آ کر بیٹھتے گئے۔ پھر ناریل اور تاڑ کے

پیڑوں کی باری آئی۔ لوگ بخوبی جانتے تھے کہ ناچ کا دور کئی دن بھی چل سکتا ہے۔ لیکن تماشائیوں کا اشتیاقِ دید ہر ضرورت، ہر پابندی پر غالب آ گیا تھا۔

دن پھوٹنے سے پہلے موسیقی بلند ہوئی اور ایک دروازے سے، جو بظاہر تو اب تک کچھ خفیہ سا تھا، سمراٹ ظاہر ہوئے۔ بالکل سیاہ لباس میں ملبوس، کوئی آرائش نہیں، ہاتھ، گلا، پاؤں اور کمر سب زیورات سے عاری۔ پاؤں میں گھنگھرو بھی نہیں۔ ان کا قد کچھ ٹھیک سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ایک لمحے لگتا کہ وہ پستہ قد ہیں، ایک لمحے لگتا کہ وہ اوسط سے زیادہ طویل القامت ہیں اور کبھی تو وہ بہت تنومند، توانا اور طویل القامت دکھائی دیتے تھے۔ لباس کی طرح ان کا بدن بھی سارا بالکل سیاہ تھا یا شاید انھوں نے کسی ترکیب سے، کوئی لیپ لگا کر، یا کسی تیل کی مالش کر کے خود کو سیاہ فام کر لیا تھا۔ انھوں نے ناظرین کو جھک کر ڈنڈوت کی۔ ایک نعرہ بلند ہوا۔ موسیقی کی لَے دھیمی ہوتی گئی، یہاں تک کہ دُور والوں کو بمشکل سنائی دیتی ہوگی۔ (لیکن یہ بھی میرا وہم تھا۔ بعد میں لوگوں نے بتایا کہ وہ باریک اور تیور سے تیور تر سُر، آواز کے ہر زیر و بم، کو بہت صاف سُن سکے تھے۔)

رہسیہ سمراٹ نے کائنات کی تخلیق شروع کی۔ ان کی آنکھ کے ہر اشارے، ابروؤں کی جنبش، ان کی انگلیوں کے ہر کنایے، ان کے پاؤں کا ہر ادھورا یا مکمل قدم، ان کی کمر یا گردن کی ہر جنبش، کائنات کے اَن دیکھے اور ناقابلِ تسخیر اُصول موت و زیست کے سامنے ان کا سرو قد ہونا، زمیں بوس ہونا، ان سب سے خوف اور بیم و اُمید و التجا سے بھری ہوئی دُنیائیں تعمیر ہوتی چلی گئیں۔ جمب دویپ، کائناتی کوہستان میرو، نیلوفری کی ہر پنکھڑی اور ہر پنکھڑی پر آباد دُنیائیں۔ سرشٹی میں ان گنت کوس کی دُوری پر جھلملاتے ہوئے ستارے، برفستان، ریگزار، پانی، پانی، پانی ہی پانی۔ یہ سب اور بہت کچھ ان کے ہر اشارے، خفیف ترین اشارے یا بدنی حرکت کے رموز کی بدولت سامنے آتا گیا یا یہ کوئی طلسم تھا، کوئی غیر انسانی وجود تھا جس کی کلید رہسیہ سمراٹ کے اشاروں اور حرکات و سکنات میں تھی۔ ان کے پاؤں، پاؤں ہی نہ لگتے تھے، ان کے ہاتھ، ہاتھ نہ لگتے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور کھلی ہوئی بھی تھیں۔

ایک لمحہ وہ بھی آیا جب ہم نے خالق الخالقین، یعنی برہما کو اپنے سامنے دیکھا۔ کیا وہ کسی پردے کے پیچھے سے اچانک نمودار ہو گیا تھا یا وہ خود وہی سب کچھ تھا جسے ہم نے اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ رہسیہ سمراٹ اب کہیں نظر نہ آتے تھے، ہاں، چیونٹیوں کی ایک قطار تھی جو منظر گاہ کے اس سرے پر تھی جہاں سے رقص شروع ہوا تھا۔ پھر ہر طرف کچھ سفید و نیلگوں دُھواں سا پھیلنے لگا۔

بعد میں مجھے بتایا گیا کہ سات دن اور سات راتوں میں تخلیق کا یہ کائناتی سفر تمام ہوا۔ اس مدت میں کون آیا، کون چلا گیا، مجھے کچھ نہیں معلوم۔ مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ جب میں نے آنکھ کھولی تو جم غفیر ویسا ہی تھا جیسا کہ بالکل آغاز میں تھا۔ لوگ بے شک چلے گئے ہوں، نئے تماشبین آ گئے ہوں گے، لیکن میں نے تسلسل ہی دیکھا۔ صرف تسلسل۔ منظرگاہ پر دُنیاؤں کا ویسا ہی ہجوم تھا۔

اچانک مجھے نٹ راج دکھائی پڑے۔ ان کے ہاتھ میں تین بتیوں کا ایک دِیا تھا۔ انھوں نے ایک پھونک میں تینوں بتیاں روشن کر دیں اور دفعتاً ہر طرف آگ ہی آگ تھی، اگر آگ کا کوئی وجود ہے تو وہی ہر طرف تھا۔ سب دنیائیں، سب ستارے، سیارے، کہکشائیں میرے سامنے بے آواز جلتی گئیں اور پھر.... پھر نٹ راج بھی اسی کائناتی آتش کدے میں خاک ہو گئے۔ ہر طرف راکھ ہی راکھ تھی۔

مجمع میں گریہ کا شور تو اسی وقت بلند ہونے لگا تھا جب دیے کی بتیاں روشن ہوئی تھیں۔ میں نے زندگی میں ایسا دردناک، ایسا دُکھ بھرا منظر نہ دیکھا تھا، نہ میری تعلیم و تعلّم کے دنوں میں، نہ میرے بن باس کے دنوں میں مجھے اس کے پاسنگ کا، ایک ذرۂ بے مقدار بھر کا تصور ہی ممکن ہوا تھا، یا ہو سکتا تھا۔ بے ساختہ و بے ارادہ میری آنکھیں بھر آئیں اور پھر میرے چہرے پر آنسوؤں کی چادر پھیل گئی۔ میں کیوں رو رہا تھا؟ کس کے لیے رو رہا تھا؟ میرا تو کچھ بھی نہ کھویا تھا، ہاں علم کا اعتماد جس نے میری زندگی کی رہنمائی اب تک کی تھی۔ وہ زعم، خود اعتمادی، وہ طمانیتِ قلب جو میرے ماں باپ کا عطیہ تھا۔ اب میں دنیا میں بالکل تنہا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں کہ ان قاتل روشنیوں میں میری بصارت نہ جل جائے۔ شاید میرے آنسو تھم سکیں کہ جب کچھ نہ دیکھوں گا تو روؤں گا کس پر؟ لیکن میں تو خود پر رو رہا تھا، خود کو رو رہا تھا۔ مجمع میں سینہ زنی اور سر پر خاک اڑانے اور اپنی رانوں کو زور زور سے پیٹنے کا شور تھا جیسے ان کی رانوں اور کمر پر کوئی کیڑا اچل رہا ہو، کوئی چیونٹی سرسرا رہی ہو۔ دفعتاً مجمع سے ایک آواز بلند ہوئی۔ دیکھو، دیکھو، وہ راکھ تو چلنے لگی ہے! ہراس سے مغلوب ہو کر میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا، یا یوں کہیں کہ گر پڑا۔ کہیں دُور سے سنسناہٹ کی سی، سناٹے کی صدا بلند ہونے لگی۔ جیسے سمندر کا پانی پیچھے ہٹ رہا ہو، پھر آگے آ رہا ہو۔ لیکن.... نہیں۔ یہ تو جیسے کئی مردنگ ایک ساتھ بجنے لگے ہوں اور ان کی تال آہستہ آہستہ تیز، پھر تیز تر ہو رہی ہو۔ آہستہ آہستہ راکھ میں کچھ اضطراب، کچھ انتشار کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ میں شور کو سُن سکتا تھا اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھا کہ اچانک مجھے ٹھنڈک اور نرم، دل آویز تری کا احساس ہوا، جیسے کوئی اپنے بھیگے آنچل سے میری

عرق آلود پیشانی پونچھ رہا ہو۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ بھینی بھینی پھوار اب میرے چاروں طرف تھی۔ طبیعت میں ٹھہراؤ کی مطمئن سی خنک پھیلنے لگی تھی۔ پر اِکا دُکا ہلکی ہلکی بوندیں مجھ پر، بلکہ میرے چاروں طرف بھی ٹپکنے لگیں۔ مگر شاید یہ کوئی سرگوشی کی سی آواز ہو، جیسے میں خواب میں ہوں اور یہ بوندیں نہیں ہیں بلکہ کسی لطیف، آسمانی بانسری سے پھوٹتے ہوئے سُر ہیں۔ کچھ الفاظ بھی ہیں اور یہ الفاظ اب مجھے صاف سنائی دے رہے ہیں:

It droppeth as the gentle rain from heaven
Upon the place beneath. It is twice blessed:
It blesseth him that gives and him that takes;
Tis mightiest in the mightiest.

سب الفاظ میں صاف صاف سُن رہا ہوں۔ ان میں عجیب سی موسیقی ہے، جیسے دُور سے آبشار کے گرنے کی آواز آ رہی ہو یا شاید کسی کی کلائی میں کانچ کی رنگین چوڑیاں آپس میں بج رہی ہوں۔ عجب اسرار ہے، یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر یہ زبان کون سی ہے؟ کوئی فرنگی زبان ہو تو ہو یا شاید یہ زبان ہی نہیں، صرف آوازوں کا مجموعہ جو بالکل اتفاق سے کسی آہنگ میں ایک ساتھ کھنک رہا ہو۔

لیکن اب مجھے الفاظ کے معنی بھی سمجھ میں آنے لگے ہیں۔ اس طرح نہیں کہ میں ان کی صرفی ترکیبوں، ان کی نحوی صورتوں کو سمجھ سکوں۔ ان میں حال کا صیغہ بتانے والا لفظ کون سا ہے اور ماضی یا مستقبل کی نشان دہی کرنے والا کون سا فقرہ ہے؟ لیکن میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں، جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ از خود سمجھ لیتا ہے کہ کچھ کہا جا رہا ہے اور یہ بھی سمجھنے لگتا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ کوئی آسمانی بشارت ہے جو بہت دُور سے نغمے کی صورت میں مجھ پر اُتر رہی ہے۔ جا، اُٹھ جا۔ اپنی تقدیر اور اپنا انجام تلاش کر۔ یہ نعمت ہے جو تجھے ودیعت ہوگی اگر تو خود کو اس کے لائق ثابت کر سکے گا۔ مگر یہ تگ و دو سے، کتابوں میں سر کھپانے سے، دھیان اور مراقبے میں نہیں ملتی۔ تو نے کائنات کو بنتے اور فنا ہوتے دیکھ لیا ہے۔ اب تجھے سکون اسی وقت نصیب ہوگا جب تو خود کو اس آسمانی نغمے میں منتقل کر سکے گا جو تجھ پر ابھی نازل ہو رہا ہے۔

الفاظ اور پیغام تو میں نے سمجھ لیے، لیکن کیا یہ الفاظ کچھ اور معنی بھی رکھتے ہیں؟

میں نے آنکھ کھولی۔ شام کا دُھواں بھرا دھندلکا ہر طرف تھا۔ تماشائی سب جا چکے تھے۔ دُنیا اپنے معمولہ کاروبار میں منہمک تھی، جیسے یہاں ابھی کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ میں نے منظرگاہ پر داخل ہو کر چاروں طرف

اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بزرگ نظر آئے جو دریاں قالین وغیرہ سمیٹنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ رہسیہ سمراٹ کہاں چلے گئے تو انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا، گویا انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہو۔ لیکن انھوں میرے لجاجت بھرے چہرے کو دیکھا تو سمجھ لیا کہ میں واقعی جویا ہوں، فضول گو نہیں ہوں۔ انھوں نے کہا:

''جہاں رہتے ہیں وہیں چلے گئے ہوں گے۔ ویسے اصلیت کسی کو معلوم نہیں۔ ذرا آگے اپنی کاویری ندی گھومتی ہے، اس قدر کہ معلوم ہوتا ہے۔ دوہری ہو کر اپنے میں سما جائے گی۔ ٹھیک اس موڑ پر ایک گھنا درخت ہے اور اسی جگہ ندی کا پانی بہت گہرا ہے۔ سنتے ہیں سطح کے بہت نیچے ایک کنڈ ہے جس میں مگر اور گھڑیال اور سونس اور بڑے بڑے کچھوے بسیرا لیتے ہیں۔ نٹ راج اسی کنڈ میں ڈوب جاتے ہیں۔ پھر پتا نہیں چلتا۔ کہتے ہیں اس کنڈ کے سب سے گہرے حصے میں ان کی جھونپڑی بھی ہے۔''

وہ بزرگ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ گہرے کنڈ کے سب سے گہرے کونے میں جھونپڑی؟ میں نے خیال کیا یہ بھی کچھ اسی طرح کی بات ہو گی کہ نٹ راج بات کہتے پوری کائنات کی تعمیر کرتے ہیں اور پھر اسے نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ مگر اس راکھ کے منتشر ہونے پر وہاں کیا معاملہ ہوا تھا؟ کیا دکھائی دیا تھا؟ میں نے بڑے میاں سے پوچھا، اگرچہ میری آواز خوف اور شرمندگی سے کپکپا رہی تھی۔

''دیکھو گے؟''

اُنھوں نے اچانک آنکھیں نکال کر پوچھا۔ اُف، وہ کیا آنکھیں تھیں، جیسے گرد و پیش کا سارا صحرا، سارا آسمان، ساری زمین بھڑک رہی ہو برافروختہ اور جاہ و جلال کے غضب سے لبالب۔ بگولے ہیں کہ شعلے ہیں کہ پوری سرشٹی ایک الاؤ ہے۔ مجھے لگا اگر میں آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے دیکھا کہ راکھ کے اس ڈھیر سے ایک پرندے کا سر آہستہ آہستہ برآمد ہو رہا ہے۔ گردن کے اوپر بالکل سنہرا، بلکہ خود ہی سونے کا ڈلا جسے نرم کر کے گردن، سر اور چونچ بنا دیا ہو۔ لیکن بقیہ جسم بالکل ہمارے مونال تیتر کی طرح تھا۔ سرخ، زرد، نیلے رنگوں میں دمکتا ہوا۔ لیکن اس کی چونچ مونال سے بہت زیادہ لمبی تھی، بالکل جیسے کوئی خنجر ہم سب کے سینوں میں اُتر جانا چاہتا ہو.... اور.... اور اس کی چونچ میں بے شمار سوراخ تھے جن میں سے ہلکے ہلکے شعلے جھانک رہے تھے۔ موسیقار؟ میں نے سوچا۔ لیکن موسیقار تو بہت بڑا ہوتا ہے، کچھ شتر مُرغ یا سیمرغ جیسا اور بالکل

سُرخ۔ لیکن سنا ہے موسیقار ہزار سال میں ایک بار نمودار ہوتا ہے۔ اس کی چونچ سے لاتعداد گیت اور راگ صورت نُما ہوتے رہتے ہیں، صورت نُما میں نے اس لیے کہا کہ ہر راگ، ہر گیت، ہر لہرے، ہر تان کو، ہر شخص الگ الگ سُن اور دیکھ سکتا ہے۔ موسیقار شام تک نغمہ سنج رہتا ہے، دُور دُور سے لوگ اسے سننے اور دیکھنے آتے ہیں۔ لیکن اس کے پہلے کہ کوئی اس کے قریب آسکے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر دلدوز آواز میں چیختا ہے۔ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔ جب روشنی ہوتی ہے تو وہاں راکھ کا ایک ڈھیر نظر آتا ہے، موسیقار کا دُور دُور تک پتا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں جو بھی موسیقار کے گیت سُن لے وہ اپنے وقت کا سب سے بڑا نائک، سب سے بڑا کلاونت بن جاتا ہے۔

مگر یہاں تو وہ مونال یا موسیقار، بالکل خاموش تھا۔ اس کے چاروں طرف بس ایک گونج سی تھی جو اسے گھیرے میں لیے ہوئے تھی۔ جب گونج اتنی شدت اختیار کر گئی کہ خود وہ پرند بھی اس میں گُم ہوتا محسوس ہوا تو اچانک ایک بجلی سی گری اور اس پرند کو اُڑا لے گئی۔ میں ساری حِس، ساری قوتِ مشاہدہ و ادراک کھو بیٹھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میں کہیں دُور بہت دُور پاتال کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر تک سویا اور مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ جاگ رہا بھی ہوں کہ نہیں۔ ہوائیں مرے سر میں پیچاں تھیں۔ وہ کچھ یہ کہتی ہوئی لگ رہی تھیں کہ اُٹھ، تجھے ابھی اور بھی دُور جانا ہے۔ مگر میں کہاں جاؤں کیوں جاؤں؟ میں رہسیہ سمراٹ تو ہوں نہیں کہ تمام دُنیاؤں کو ایک دم میں بنا ڈالوں اور پھر ایک دم میں ملیامیٹ کر ڈالوں۔ کیا میری ساری صلاحیتیں، سارے اکتسابات، اسی طرح ضائع ہو جائیں گے جس طرح کہ رہسیہ سمراٹ نے دُنیائیں بنائیں اور ضائع کر دیں؟

۴

سامنے ٹھنڈے پانی کی جھیل، چاروں طرف مرغزار، سرد ہوا، ذہن میں انتشار۔ کتنا ٹھنڈا پانی ہے؟ میں کود کر دیکھوں؟ اچانک مجھے کسی نے پانی کی طرف اُچھال ہی تو دیا۔ میں نے ہزار چاہا کہ اس نادیدہ پنجے کی گرفت سے آزاد ہوں لیکن حریف زبردست تھا، تڑپنے کی بھی مجال نہ دیتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سرد پانی کے صدمے نے میری قوتِ قلب ضائع کر دی یا شاید کئی لمحوں کے لیے معطل کر دی۔ میں تہ تک

اُترتا چلا گیا۔ پھر جو آنکھ کھلی تو میرے سامنے منظر جلد جلد بدل رہا تھا، جیسے پردے تصویریں دوڑ رہی ہوں۔ ایک منظر کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہ تھا۔

''چاندنی کھلی ہوئی تھی، دشت و در چاندی کا پتر۔ شاہد بہار کو مشاطۂ شب آئینۂ ماہ دِکھاتی.... رات کا سناٹا، تمام میدان سفید ہو رہا، جانور اپنے اپنے مسکن میں بیٹھے ہوئے۔ کبھی جو ہوا کے جھونکے سے کوئی درخت کھڑکتا، ایک آدھ ہرن، خرگوش جست کر کے جھاڑی سے باہر نکل آتا، اِدھر اُدھر دیکھ کر چوکڑی مار جاتا۔ جھاڑیوں سے ہرن، پاڑھے، چیتل، نیل گاؤ سر نکالے۔ جھیلوں کا یہ عالم کہ جیسے خانۂ زمین میں آئینے جڑے ہوئے۔ کنارے کنارے بگلے، قازیں، سُرخاب، پروں میں منھ ڈالے ایک پاؤں سے کھڑے ہوئے۔ دامن کوہ میں کوڑیالا کھلا ہوا، نرگستان کواکب کو شرماتا....

نیچے پال کے، چوکا تختوں کا بچھا تھا۔ اس پر چاندنی کا فرش و قالین آراستہ تھا۔ مقابا اور صندوقچہ دھرا تھا، صندوقچے سے لگا ہوا آئینۂ حلبی رکھا، ساقنیں ہزار بناؤ کیے، دلائی سفید اودی گوٹ کی اوڑھے، آگے سے طوق سونے کا دکھلانے کو گلا کھولے، پانچے پائجامے کے پیچھے تخت پر پڑے، ماتھے پر افشاں لگائے، پٹے چھوڑے بال بنائے، لبِ تخت باہزاراں ناز و انداز بیٹھی تھیں۔ کان کا زیور جھوم جھوم کر جھونکے لیتا تھا، رُخ تابندہ بحرِ حسن تھا، اس میں اس زیور کا عکس پڑتا تھا۔ یہ ظاہر تھا جیسے کنول دریا میں تیرتے ہیں یا مچھلیاں اور جانوراں آبی پیرتے ہیں۔ ہاتھوں میں کڑے پڑے، دستِ حنائی میں پور پور چھلے تھے۔

....ایک سمت لگن اور پتیلوں میں نیچے بھیگتے تھے، سامنے کچھ حقے تیار تازہ کیے رکھے تھے۔ تپائیاں سوراخ دار بچھی تھیں۔ چلمیں ان میں گھری تھیں۔ کوئی گنڈہ گنڈہ لڑاتا تھا، کوئی دونی کی پیتا تھا.... ساقن بھی مسکراتی تھی، یہ کیفیت دُونا نشہ جماتی تھی۔ ایک طرف سامنے خریدار دُعائیں دیتے تھے، کشمیر اور سالجھاں مانگتے تھے۔ یارقند پیسے والی چلم کے بھروانے والے اُڑاتے تھے۔ کوئی کہتا تھا، ساقن کے دم کی خیر، آج تو

پیڑو پر کی ہم کو بھی پلوایے۔ ساقن کہتی تھی، بیٹا انگیا کے اندر پیو یہ بہت عمدہ ہے۔ دم بدم چلم جما کر دیتی تھی۔ خریداروں میں یہ بحث تھی کہ ایک کہتا تھا، تم سر کرو۔ دوسرا کہتا تھا، کیا ہم کو پست پینے والا مقرر کیا ہے؟

.... حلوائی کی دُکان پر تھال برنجی برابر چنے تھے۔ آگے دُکان کے زنجیر برنجی لٹکتی تھی، گھنٹی اس میں بندھی تھی۔ اندر دُکان کے نوکروں نے گولوں پر کڑھاؤ چڑھائے تھے، مٹھائی بناتے تھے۔ الماریاں مٹھائی سے بھری رکھی تھیں، مٹھائیوں کو جالدار اور محراب دار چنا تھا کہ پھول اور گلدستے بنے معلوم ہوئے تھے۔ مٹھائی پر ورق طلائی اور نقرئی لگے تھے، عجب جوبن دیتے تھے.... نانبائی بصد خوش ادائی ظروف مسی صاف وشفاف میں طعام لذیذ چُنے ہوئے۔ پلاؤ، زردہ، قورمہ، مرغ کا شوربا، کباب و باقرخانی، آبی نان، ہوائی کلچے وغیرہ ہر قسم کا کھانا مہیا رکھتے تھے۔ تنور گرم تھا پتیلا چڑھا تھا۔ ایک طرف ماہی دے میں کباب گرما گرم تھے۔ کچھ لوگ دُکان میں کھانا کھاتے تھے، کچھ خریدار پیالے لیے کھڑے تھے....

(طلسم ہوش رُبا، جلد اوّل: داستان گو، محمد حسین جاہ)

میں اس جھیل کی تہ میں کتنی دُور نکل آیا ہوں؟ کوئی قوت مجھے جھیل سے باہر لے آئی ہے، یا ابھی اس جھیل ہی میں ہوں؟ یہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ میں جانتا ہوں یہ دُنیا بہت بڑی ہے اور پورا برہمانڈ (اگر وہ پورا ہے بھی) تو لامتناہی ہے اور میں حقیر ترین ذرّے سے بھی کمتر ہوں یا شاید ہوں ہی نہیں اور یہ سب میرے ذہن کی دُنیا میں آباد ہے؟ مجھے پھر نیند آ گئی۔

I will arise and go now, and go to Innisfree,
And live alone in the bee-loud glade.
And I shall have some peace there, for peace comes dropping slow,
Dropping from the veils of the morning...
There midnight's all a glimmer, and noon a purple glow,
And evening full of the linnet's wings.
I hear the lake water lapping with low sounds...

زبان تو وہی ہے جو میں نے پہلے سُنی تھی، اپنے اس پُرانے گاؤں میں، جب نٹ راج نے تمام کائناتوں کو نیست و نابود کر دیا تھا، اس کے کچھ ہی بعد۔ لیکن آواز مختلف، لہجہ مختلف۔ جیسے کوئی نیند یا نشے میں ہو اور کچھ بھرائی ہوئی سی آواز میں بول رہا ہو۔ لیکن یہی کیفیت تو میری بھی ہے۔ میں شاید نشے ہی میں ہوں۔ عجائبات مخلوقات کی وسعت اور رنگارنگی نے مجھے اپنے آپ سے کسی طرح منقطع کر دیا ہے۔ میں گرد و پیش کی دُنیا کو دیکھ تو رہا ہوں (اگر وہ دُنیا ہی ہے) لیکن سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔

میں نے دوبارہ جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ اب جو پاؤں زمین کو لگے تو میں نے دیکھا کہ اسی منظر گاہ کا کنارہ ہے، پیچھے کوئی ندی بہ رہی ہے، شام ہر طرف پھیل رہی ہے، کنار رود سیہ فام شام ہے، میں ہوں۔ میں نے خود کو سنبھالا، لاٹھی کندھے پر رکھی اور شمال کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں، جہاں کوہستان ہمالیہ کا دُشوار گذار سلسلہ ہے، پانی ہے برف ہے ہوا ہے۔ میرے باپ نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ دُنیا کے بے مصرف مشغلوں میں وقت گذارنے سے بہتر ہے کہ تم کنڈلنی کو بیدار کر لو اور پھر مکمل خود آگاہی کی تلاش میں کوہستان ہمالیہ میں کہیں گہرائی میں اپنا گھر بنا لو اور کنڈلنی سے مکالمہ قائم کرو۔ کائنات جو کچھ ہے اور کائنات میں جو کچھ ہے وہ تمھارے ہی ذہن کا جیتا جاگتا پرتَو ہے۔ یہ خارجی مظاہر تمھارے ذہن کے داخلی منظرنامے کا حصہ ہیں۔ ہمالیہ کے کونے کونے میں زندگی کرنے کے روپ بھرے ہوئے ہیں۔ وہاں کوہ و کمر پر چراغ لالہ سے روشنی ہوتی ہے، وہاں تمھیں خود سے باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ابھی تو تم سوئے ہوئے ہو، کہ تمھیں اس ہستی ناپائیدار سر سے یک گونہ لگاؤ ہے، جیسا کہ ایک شاعر نے، جو ابھی پیدا نہیں ہوا، یوں لکھا ہے جب اس نے حقیقت اور خواب پر غور کیا۔

تا جنبشِ تار نفس افسانہ طراز است
بیدؔل بہ کمند رگ خواب است دل ما

کیا مطلب، وہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوا اور اس کے شعر آپ پر القا ہو چکے ہیں، یا القا ہو رہے ہیں؟ یہ کون سی دُنیا اور کون سا علم ہے؟ لیکن باپ کے سامنے یارائے زباں کُشائی کس کو تھا۔ تم تعینات سے باہر آ سکو گے تب تمھیں یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی۔

دفعتاً میرے سامنے آسمان میں ایک دریچہ روشن ہو گیا۔ دریچہ، شگاف یا صرف میرا وہم، مجھے آنکھوں کے سامنے دُنیا کچھ تاریک سی لگنے لگی۔ لیکن اب اس دریچے میں ایک شاخ زرّیں نظر آئی جس پر

ایک نیلگوں زرد پرند کچھ کہتا ہوا نظر آیا۔ اس کے پیچھے ایک سیاہ پردہ سا، جس پر وہی لفظ لکھے ہوئے تھے جو وہ پرندہ (یا کوئی آفاقی وجود؟) اپنی زبان سے ادا کر رہا تھا۔ میں ان الفاظ کو پڑھ نہ سکتا تھا لیکن جو کچھ سُن رہا تھا اسے خوب سمجھ سکتا تھا۔ شروع کے الفاظ صاف سنائی نہیں دیے، لیکن ان کے بعد:

Miracle, bird or golden handiwork,
More miracle than bird or handiwork,
Planted on the starlit golden bough,
....
Of hammered gold and gold enamelling
To keep a drowsy Emperor awake;
Or set upon a golden bough to sing
To lords and ladies of Byzantium
Of what is past, or passing, or to come.

کیا مطلب، یہ بائزین ٹیم کوئی جگہ ہے؟ اور وہاں ایسے پرند ہیں، یا کم از کم ایک پرند ایسا ہے جو ماضی اور حال اور مستقبل کی تمام باتوں کے علم پر حاوی ہے؟ اور کیا میرے باپ نے کبھی وہ پرندہ پالا تھا؟ لیکن اب تو وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ پھر انھیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟ مگر ذرا ٹھہریں، مجھے بھی تو دو بار کسی فرنگی زبان میں بہت کچھ شاعری سُنائی دی تھی اور مجھے معلوم نہیں کہ جن لوگوں کے وہ شعر ہیں وہ کس زمانے میں تھے؟ اور سچ پوچھیں تو مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں کس زمانے میں ہوں؟ کیا میرے پیچھے کوئی ماضی ہے اور کیا میرا کوئی مستقبل بھی ہے؟ کیا ایسا بھی ہوگا کہ میرے بعد جو لوگ ہوں گے وہ میری اس ہرزہ سرائی کو پڑھ سکیں گے؟ کیا جس زبان میں اس وقت گفتگو کر رہا ہوں وہ کوئی زبان بھی ہے یا یہ صرف میرے دل میں ہے؟ اور کہیں لکھ دوں تو کیا یہ زبان کل باقی بھی رہے گی کہ نہیں؟

کیا میں اس جھیل میں دوبارہ کود پڑوں جس میں ایک بار کود کر یہاں پہنچا تھا؟ بے وقوف آدمی، ہوش کی بات کرو، لیکن شاید تم ہوش ہی میں نہیں ہو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھے کہ اب تک جو کچھ ہوا ہے اس میں تمھارے دل دماغ کا کچھ دخل رہا ہو تو رہا ہو، لیکن تمھارے ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اب دوبارہ اپنے ارادے سے اس جھیل میں غوطہ لگاؤ تو شاید غرقاب ہی ہو جاؤ یا کہیں اور پہنچ جاؤ۔ اشیا کا اختتام یوں نہیں ہوتا۔ جو ہے اور جو نہیں ہے اس میں کچھ ایسا فرق بھی نہیں۔ صرف تمھاری سمجھ کا پھیر ہے۔ تم کوہستان ہمالیہ کے لیے

نکلے تھے، تو بس ادھر ہی طرف جاؤ۔ جب تم سے کوئی تعرض کرے گا تو دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔ ابھی تو راستہ آسان ہے۔ خیر آسان نہ سہی لیکن معلوم ہے۔

تو میں چلا گیا۔ میں آنکھ بند کر کے ایک طرف چل پڑا۔

۵

ان کا نام وامن وششٹھ تھا یا شاید وامن ان کا نام نہیں تھا بلکہ لقب تھا، کیونکہ وہ بھی وامن اوتار کی طرح پستہ قد تھے، بلکہ کہا جائے کہ بونے تھے تو زیادہ صحیح ہوگا۔ وامن اوتار کی طرح وہ بھی وشنو جی کے بہت سچے اور پکے بندے تھے، بلکہ کچھ لوگ انھیں وشنو جی کا اوتار ہی سمجھ لیتے تھے۔ لیکن وہ ان وامن اوتار کی طرح نہیں تھے جو لوہے کی لاٹھ کی طرح زمین میں گڑے ہوئے ہیں اور اس کا سرا آسمان کو چھوتا ہے۔ لوگ کہتے تھے وہ زمین کو تھامے ہوئے ہیں نہیں تو لحظہ لحظہ اتنے زلزلے آئیں کہ ساری دُنیا تہ و بالا ہو جائے۔ انھیں وامن اوتار نے ایک بار اپنے راجا سے کہا کہ رہنے سونے کے لیے کچھ زمین دے دو۔ راجا نے ان کے پستہ قد کو دیکھا تو مسکرا کر بولا:

''زمین کیا کرو گے، ہاں تین قدم چلو، اتنی زمین تمھیں مل جائے گی جتنی تم تین قدم میں طے کر سکو گے۔ وہی تمھارے لیے کافی ہوگی۔''

وامن نے راجا کو رحم بھری نگاہ سے دیکھا اور کہا:

''اچھا، تو میں چلا۔ تم میرے قدم دیکھتے رہنا کہ تین سے زیادہ تو نہیں ہو رہے ہیں۔''

پھر راجا کے سامنے زمین آسمان کے بیچ کہیں ایک کھڑکی سی کھل گئی۔ وامن اوتار اس میں سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پلک جھپکنے میں جتنا عرصہ لگتا ہے اس سے بھی کم مدت میں وامن نے جانی پہچانی کائنات، سورج، چاند، ستارے، سمندر، پہاڑ سب پار کر لیے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دشتِ امکاں کو بھی پار کر گئے، یعنی اس سب کو، جو ابھی ہے نہیں لیکن ہو سکتا ہے، یا کبھی ہوا ہوگا اور اب وقت کے اس پار بہنے والے دھندلے پانیوں میں ان گنت صدیوں سے غرق ہے۔ پھر ان کا دوسرا قدم محسوس کائنات سے آگے، امکانات سے پرے، ان کائناتوں کو پار کر گیا جو وجود نہیں رکھتیں لیکن جو وجود میں آنے کے لیے بے قرار ہیں

یا دراصل ابھی وہ بے قرار بھی نہیں ہیں لیکن جب انھیں امکانات کا علم ہوگا تو ان کی روح میں ناتمامی کا احساس چبھنے لگے گا اور وہ خود کو مکمل کرنے کے لیے وجود میں آجانے کے لیے مضطرب ہونے لگیں گی۔ راجا کے حواس گم ہونے لگے، لیکن اس کی آنکھیں وہیں کھڑکی کے پار ٹکٹکی لگائے ہوئے تھیں۔ وامن اوتار کا تیسرا قدم اندر لوک، پرلوک، کے آگے کائنات غیر وقت پر پڑا ہی تھا کہ راجا چیخ اُٹھا:

''بس مہاراج، بس۔ مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ اب آگے دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔
میں دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں۔''

وامن اوتار مسکرائے۔ راجا نے اپنا تاج ان کے قدموں میں رکھ دیا اور گڑ گڑا کر بولا:

''یہ راج پاٹ سب آپ کا۔ میں اس کا مستحق نہیں۔ یہ سب آپ سنبھالیے، مجھے بن باس دیجیے۔''

وامن اوتار نے راجا کو تکبر اور خودنمائی سے حذر کرنے کی تلقین کی، کہا ''ہم تاج گیر نہیں، تاج بخش ہیں۔'' اور اپنی راہ لی۔

اور ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ تین قدم جو وامن اوتار نے طے کیے تھے، حسبِ ذیل تھے:

اوّل: نیند۔ دوم: نیند اور خواب۔ سوم: گہری نیند۔

یہ تینوں قدم روحانی طور پر شاید وہی تھے جو وامن نے راجا کی آنکھوں کے سامنے اپنے گوشت پوست کے جسم کے ساتھ طے کیے تھے۔ واللہ اعلم۔ لیکن جن وامن وششٹھ کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ابھی اپنے ہم نام اوتار کے بہت پیچھے، کئی درجے نیچے کہیں نفسِ مطمئنہ کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے کنڈلنی کو اس درجے اپنی گرفت میں کر لیا تھا کہ وہ اسے دوپٹے کے طور پر اپنی کمر میں لپیٹے رہتے تھے لیکن ابھی وہ خود کو یا اپنے داخلی وجود کو نامکمل سمجھتے تھے۔ وامن وششٹھ کے پاس سب کچھ تھا، وہ لاانتہا علوم کے مالک تھے اور اتھاہ اسرار کی گہرائیوں میں اُتر چکے تھے لیکن ابھی انھیں وہ نہ ملا تھا جو انھیں بے نیازی کی مملکت پر قابض و قادر کر دیتا۔

وہ اسی تلاش میں ملکوں ملکوں قریہ و امصار، دشت و در میں سرگرداں رہے۔ ایک بار وہ تھک کر اور اپنی ہستی سے بے زار ہو کر ایک ٹیلے کے دامن میں چادر لپیٹ کر پڑ رہے۔ تو انھوں نے خواب میں کسی کو دیکھا، کچھ روشنی اور کچھ ابر مطیر کے لباس میں چھپا ہوا۔ وامن نے چاہا کہ ان (روح؟ جسم؟ تصور؟) سے

پوچھیں کہ میری خلش کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ لیکن رعب اور ہیبت نے زبان کھولنے کی قوت سلب کر دی تھی۔ پھر انھوں نے محسوس کیا (دیکھا؟ دل میں کہیں منعکس دیکھا؟) کہ وہ ہستی دور کسی بہت اونچی جگہ شمال کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پھر ان کے دل میں خیال آیا، مجھے شمال کی طرف چلنا چاہیے۔ اس کے پہلے کہ ان کی آنکھ کھلتی (یا وہ ہوش میں آتے؟)، انھوں نے سنا، کوئی کہہ رہا ہے، حجاب تم خود ہو، تمھارا علم اور فضل اس سے بڑا حجاب ہے۔ انھیں سکتہ سا آ گیا۔ یہ سب جو میں نے صدیوں کی تپسیا اور دھیان اور دشت و جبل میں مارے مارے پھر کر حاصل کیا ہے، یہی مجھ پر حجاب بن کر چھا گیا ہے؟ کیا اس کی روشنی کی بدولت میں اندھا ہو گیا ہوں اور میری خلش یہی ہے کہ مجھے بصیرت کی تلاش ہے؟ آشنا اپنی حقیقت سے ہوا اے رہرو ذرا، دانہ تُو، کھیتی بھی تُو، باراں بھی تُو، حاصل بھی تُو۔ آہ، کس کی جُستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے، راہ تُو، رہرو بھی تُو، رہبر بھی تُو، منزل بھی تُو۔ ناخدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو۔ پھر میں کہاں جاؤں؟ کہیں نہیں، اپنے جھوٹے علم اور اپنی معصوم غلط فہمیوں کو ترک کر، دُور وہ شمال کا فلک نشیمن تیرا منتظر ہے۔ تُو نے ابھی اپنے آپ سے باہر نکلنا تو سیکھا نہیں ہے، یہ کنڈلنی جسے تو اپنا طرۂ امتیاز جانتا ہے، یہی تو تیری راہ کا بندھن ہے۔ تیرے ہاتھ پاؤں اسی نے باندھ رکھے ہیں۔ ان قیود سے ماورا ہو جا۔ تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بیکراں ہو جا۔ یہ ہند و ایران کیا، صین و روم کیا، یہ سب قیود ہیں جو علم نے تجھ پر عائد کیے ہیں، ورنہ کائنات کی ہر شے ایک دوسرے سے متحد ہے اور متحد نہیں تو متصل ضرور ہے۔

۶

تو یہ حالات اور وجوہ تھے جنھوں نے ایک دن وامن وششٹھ کو ہمالیہ کے دامن میں پایا۔ اب تک وہ گھنے جنگلوں میں روشنی کی تلاش کرتے رہے تھے، وسعتوں کا انھیں تجربہ نہ تھا۔ اپنے اندر کی وسعت کو تو وہ متصوّر کر سکتے تھے لیکن کشادگی کی انتہاؤں اور بلندیوں کی ظالم بے نیازی سے انھیں واسطہ نہ پڑا تھا۔ برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر، خندہ زن ہے جو کلاہ عالم تاب پر، اور لطف یہ تھا کہ اس بلندی اور بے نیازی کے باوجود انھیں اس طلسمی کوہستان میں سفر بالکل بار نہ لگتا تھا۔ تھکن یا اُکتاہٹ انھیں دُور سے چھوتی بھی نہ تھی۔

کئی دن کئی رات کے سفر نے انھیں کوہستان ہمالیہ کی گہرائیوں میں پہنچا دیا۔ یہاں چیڑ کے درخت تو بہت پہلے ہی پیچھے چھوٹ گئے تھے، اب مدت ہوئی وہ سیاہ قامت، تنومند، گھنی پتیوں والے دیودار بھی غائب تھے۔ پہاڑوں پر کہیں کہیں کچھ جھاڑیاں نظر آتی تھیں، لیکن پست قد اور پژمردہ۔ ان کی جگہ تمام گہرے یا کم گہرے غاروں پر برف کی مہر تھی۔ ہوائیں بہت تند تھیں لیکن دھوپ ذرا سی رہ گئی تھی، جیسے کسی کی آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہو، آنکھیں ذرا ذرا کھلی ہوئی ہوں اور ان کی زرد سنہری روشنی فضا کو گرم کرنے کی کوشش کرتی ہو۔ ہوائیں، الاماں اور دونوں طرف صف بستہ پہاڑوں کی دیواریں، ان کی بلندی بھی ٹھیک سے نظر نہ آتی تھی۔ وہ سارے چرند، درندے اور پرند جن سے نچلی وادیوں میں رونق تھی اب کہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔ صرف برفانی تیندوا کبھی کہیں کسی چٹان کے سائے میں اپنی جھلک دکھا دیتا تھا۔ سب سے اونچی چوٹیوں پر بسنے والے دیوؤں کی جسامت والے سیاہ فام جھالردار لباس میں ملبوس یاک کسی دُور کی وادی میں دکھائی دیتے، لیکن صرف واہمے کی طرح، کہ خدا جانے وہ حقیقی تھے یا قوتِ تخیل نے انھیں بنایا تھا۔ انسان کا کہیں پتا نہ تھا۔ نیم روشن فضا میں یہ بھی ٹھیک سے نہ معلوم ہوتا کہ یہ چاک گریبان صبح کی شفق ہے یا شام کے نشتر نے آفتاب کی فصد کھولی ہے اور اس کا لہو سارے آسمان پر پھیل گیا ہے۔

وشسٹھ رشی نے لڑکھڑاتے ہوئے قدم آگے بڑھائے۔ سامنے ایک سیاہ چٹان پر کچھ پُراسرار سی، ہلکی لیکن غیر مرتعش روشنی سی نظر آئی۔ پیچھے کچھ نہ تھا، صرف اونچی نیچی بھوری سیاہ پہاڑیاں آسمان تک پھیلی ہوئی تھیں مگر سُریلی سی آواز آہستہ آہستہ فضا میں پھیلنے لگی تھی، جیسے کوئی وچتر وینا پر گا رہا ہو۔ وہ اور قریب گئے تو کوئی پری یا شاید کوئی دوشیزہ یا شاید پہاڑوں میں بسنے والی کوئی رُوح تھی۔ انھوں نے ہمت کر کے دو چار قدم آگے بڑھائے، گانے والی اب سامنے نظر آ رہی تھی۔ ایسی شکل! یہ سراپا، یہ قد و قامت، یہ قیامت جلوہ بدن۔ وشسٹھ رشی نے یا کسی اور بھی رشی منی نے اپنے دُور ترین اور بے قابو ترین خواب میں بھی ایسی شکل نہ دیکھی ہو گی اور نہ ایسی آواز سُنی ہو گی۔ ہمت کر کے وہ اور قریب گئے کہ خال و خط کو اور صاف دیکھ سکیں۔ لیکن اس کی شخصیت کا افسوں ایسا تھا کہ وہ بہت آگے نہ بڑھ سکے۔ جس حد تک ممکن ہوا، انھوں نے آنکھ اُٹھا کر اس پری کو دیکھا۔ پھر وشسٹھ منی کو محسوس ہوا کہ کہیں قریب ہی محفل سجی ہوئی ہے۔ داستان گو کسی کا سراپا بیان کر رہا ہے:

> ''سراپا کا کیا بیان کیا جائے کہ صفحۂ فسانہ وقت تحریر وصف رُخ، رشک گلزار بہشت بنتا ہے۔ قلم خود نکتہ چینی کرتا ہے.... مانگ جادۂ کہکشانِ فلک کو راہ بھلا دے، پیشانیِ نور

آگیں صبح صادق کو کاذب بنا دے۔ خال ہندو رہزن ضمیر عاشقاں، بھویں وہ محراب جو سجدہ گاہ حسینان جہاں.... آنکھیں وہ جام سرشار محبوبی جو دل خستہ کو بریاں کریں.... رُخسار تاباں گل سرخ کو ندامت سے آب آب کرے بلکہ چشمۂ خورشید کو بے آب و تاب کرے.... لب یاقوت رنگ لعل بدخشانی کا جگر خون کرے بلکہ یاقوت رمانی کو ہیرا کھلائے، مرجان غیرت سے مرمر جائے.... سینہ گنجینۂ نور چھاتیوں کا اس پر ظہور، نار پستاں کو دیکھ کر نار بستاں کا سینہ شق ہو، سیب ہی کا رنگ غیرت سے فق ہو۔ شکم صاف و شفاف تختۂ بلور، ناف کو گرداب بحر حسن کہنا پرانی بات ہے، یہ چشمۂ آبِ حیات ہے۔ موئے کمر آئینۂ حسن میں گویا بال آیا ہے، یا تارِ خطِ شعاعِ آفتابِ سپہرِ حسن برملا ہے۔ آگے عجب لذت کی چیز ہے، وہ ہنسنی ہے جو موتی چگتی ہے یا وہ چور خانہ ہے جس کو کلید تمنا کھولتی ہے۔ وہ مضمون حجاب ہے جس پر مہر خط شباب ہے۔ وہ مورنی ہے جو کہ مستی میں رال مور کے منہ سے ٹپکے تو وہ اپنی منقار میں لے لے۔ وہ دیدۂ پُرنور ہے جس میں وصل کی سلائی سُرمہ لگائے گی، وہ غنچۂ تنگ سربستہ ہے جس میں ہوائے تمنا بڑی مشکل سے جائے گی....“

(طلسم ہوش ربا، جلد اول: داستان گو محمد حسین جاہ)

داستان گو کا بیان ابھی جاری تھا، لیکن اب مغنیہ کی آواز اس پر حاوی ہونے لگی تھی۔ وششٹھ رشی نے سُنا:

همہ عمر با تو قدح زدیم ونہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما
چو غبار نالۂ نیستاں نہ زدیم گامے از امتحاں
کہ ز خود گذشتن ما نہ شد بہ ہزار کوچہ دو چار ما
نہ بہ دامنے ز حیا رسد نہ بہ دستگاہ دُعا رسد
چو رسد بہ نسبت پا رسد کف دست آبلہ دار ما

وامن وششٹھ کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ انھوں نے دوڑ کر اس حسینہ کے پاؤں لیے اور بے ساختہ ان کی زبان پر جاری ہوا:

چہ کسی و چہ نام خوانندت
در کدامی مقام دانندت

وہ مسکرا کر بولی:

''اور آپ؟ آپ کا گذر اس طرف کیونکر ہوا؟ میں تو یہیں رہتی ہوں، یہی میرا گھر ہے اور یہی میرا مدفن۔''

'میں خود کو ڈھونڈتا ہوں لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ کیا آپ....؟ یہ کون سی تلاش ہے، کس کی تلاش ہے؟ یہ کلام آپ کو کس نے سکھائے؟''

''شاید آپ بھولتے ہیں۔ یہاں ہر شے ہر وقت موجود ہے۔''

''اور آپ نے یہ زبان کہاں سیکھی؟''

وہ ہنسی۔''جہاں سے آپ نے سیکھی ہوگی۔''

''میں نے؟ میں نے تو سیکھی نہیں۔ جب آپ محوِ نغمہ تھیں تو یہ الفاظ خود بخود میری سمجھ میں آتے جا رہے تھے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس زبان کا نام کیا ہے اور یہ شاعر کون ہے۔ وہ ہے بھی کہ نہیں؟''

'چلیے، خودنگری کی کئی منزلیں تو آپ نے طے کر لی ہیں کہ آپ ماضی مستقبل کی ہر زبان سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کے آگے کی راہیں آپ پر ابھی تک بند ہیں۔ خود کو حاصل کرنے کے پہلے، بہت پہلے، آپ کو خودنگری کے علاوہ بہت سی منزلوں سے گذرنا ہے۔ خود بینی، خودنگہداری، خوداختیاری، ترکِ خود، پھر ترکِ ترک۔''

وامن وششٹھ نے کہنا چاہا،''میں سمجھا نہیں۔'' لیکن الفاظ ان کے منہ سے ادا ہونے کے پہلے اس حسینہ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور انھیں اپنے قدموں پر سے اُٹھاتی ہوئی بولی:

''چلیے، میں آپ کو اپنا گھر دکھاؤں، اپنے شوہر سے ملاؤں۔''

''مگر مجھے کہیں کچھ راستہ تو نظر آتا نہیں۔'' وششٹھ رشی نے کچھ پریشان ہو کر کہا:''ہر طرف تو

یہاں پہاڑ ہیں، گھاٹیاں ہیں، بندراہیں ہیں۔ راستے کا کیا ذکر؟''

''یہی تو میں نے کہا کہ ابھی آپ نے خودنگری کے آگے قدم رکھا نہیں۔ آپ نے اشیا کی حقیقت کا پہلا باب بھی نہیں پڑھا۔ میرے ساتھ چلیے، میرے قدم بقدم چلیے۔''

وششٹھ رشی نے اب جو دیکھا تو وہ ہکا بکا رہ گئے۔ پہاڑ، بیابان، گھاٹی، ایسا کچھ تو وہاں نہ تھا۔ سامنے سبزہ زار، پیچھے آبشار، دورویہ پھولوں کی روش، بیچ میں جادہ جس پر نرم قدموں کے نشان صاف نظر آتے تھے۔ ان کا پہلا قدم بہزار دقت اُٹھا، پھر سب آسان ہو گیا۔

''میرا نام کلپنا ہے۔'' اس حسینہ نے کہا۔ ''مجھے میرے شوہر نے بنایا ہے۔ میری زندگی میں سب کچھ ہے مگر محبت نہیں ہے، یگانگت نہیں، حتیٰ کہ دسراتھ بھی نہیں۔ شوہر کے باوجود میں اکیلی ہوں، بانجھ ہوں۔ اس کنول کی طرح جسے پالا مار گیا ہو۔''

''شوہر نے بنایا....؟'' وششٹھ رشی کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئے، شاید اس طرح کی کرید بدتہذیبی کے مترادف ہوتی۔

کلپنا نے وششٹھ کی ہچکچاہٹ کو گویا محسوس ہی نہ کیا اور کہا:

''میرے شوہر بہت دُور سے آئے ہیں، جنوب میں کوئی علاقہ کیرالا پترا نام کا ہے۔ انھوں نے ہر طرح کا علم حاصل کیا ہے اور وہ ہر طرح کی قوت کے مالک ہیں۔ وہ بود کو نابود اور نابود کو بود کر سکتے ہیں۔''

اب وامن وششٹھ کو کچھ کہنے کی تاب ہی نہ تھی۔ وہ کوئی آسمانی قوت ہے؟ کوئی آسریا دیو تو نہیں؟ میں نہ جانے کہاں پھنس گیا ہوں۔ اب دیکھیں نجات بھی ہوتی ہے کہ نہیں۔ یہ لڑکی خود کہہ رہی ہے کہ میں کوئی انسانی وجود نہیں ہوں، ان رشی کی قوتِ ارادی کا مرئی اور جسمانی روپ ہوں۔ پھر تو وہ غیر مخلوق ہوئی؟ مگر غیر مخلوق تو صرف پرمیشور ہے؟

وہ ان خیالات میں گم تھے کہ لڑکی بولی:

''گھبرایئے نہیں، اب گھر بہت دُور نہیں۔ لیکن یہ تو بتائیں کہ آپ تو وامن اوتار کے پہلے ہی قدم میں کھوئے گئے ہیں۔ ابھی آپ نے دشتِ امکاں کو بھی ٹھیک سے نہیں طے کیا ہے اور اگر باطنی انداز میں کہیں تو آپ ہنوز نیند کی منزل میں ہیں۔ پھر آپ

یہاں کہاں؟"

دامن وششٹھ کو یہ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟ ابھی وہ جواب کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہے تھے کہ وہ حسینہ بولی:

"آپ کو میرے شوہر نے بلایا تو نہیں؟ یہ میں اس لیے پوچھتی ہوں کہ کسی باطنی تصرف کے بغیر کسی بھی ذی وجود کا یہاں تک پہنچنا محال تھا۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" دامن وششٹھ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ہاں مجھے ایک اشارہ ضرور ملا تھا کہ شمال کی طرف چلو۔ ادھر ہی تمھارا مدعا حاصل ہوگا۔"

"جی تو پھر بات وہی ہے۔ کلپت رشی نے آپ کو ضرور اشارہ بھیجا ہوگا۔"

"کلپت؟"

"جی ہاں، میرے شوہر کا نام کلپت ہے۔ کلپنا اور کلپت کی جوڑی اچھی ہے نہ؟" وہ عجیب پُراسرار سی ہنسی ہنس کر بولی: "دیکھیے وہ ہمارا گھر ہے۔"

غار کا دہانہ بہت کشادہ نہ تھا، لیکن ذرا گردن جھکا کر کوئی انسان بآسانی داخل ہو سکتا تھا اور دامن وششٹھ تو کوتاہ قد تھے، ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ غار سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی، اس طرح نہیں جیسے اندر کوئی چراغ روشن ہو بلکہ اس طرح جیسے کہیں دُور الاؤ جل رہا ہو اور اس کے شعلے دیوار سے منعکس ہو کر ہر طرف پھیل گئے ہوں۔ کلپنا کے قدم دیکھتے ہوئے وہ اندر داخل ہوئے۔ غار کی روشنی کہاں سے آ رہی تھی وہ اس بات کو متعین نہ کر سکے لیکن روشنی نہایت لطیف تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ غار کی چھت کہیں اونچی کہیں نیچی ہے لیکن اس کی لمبائی بہت ہے، بلکہ یوں کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ غار کا سِرا نظر نہ آتا تھا۔ کلپت رشی غار میں ایک طرف چکنے فرش پر دوزانو بیٹھے تھے، اس طرح گویا کوئی مجلس ہو اور وہ میرِ مجلس ہوں۔

غار کے دہانے سے ذرا دُور آخر تک بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی نہر بہ رہی تھی، بہت شفاف پانی، تہ میں رنگ برنگ پتھر، لیکن نہیں، شاید وہ مچھلیاں تھیں، اٹکھیلیاں کرتی، غوطے لگاتی، اِدھر سے اُدھر اُچھلتی، ایک تماشے کا سماں تھا۔ یہ نہر کہاں سے آئی ہے اور اس کا سرا کدھر ہے، دامن وششٹھ نے سوچا لیکن وہ ابھی بول نہ پائے تھے کہ کلپت رشی نے کہا:

"بیٹھو، تم اچھے آئے۔ میں نے تمھیں ادھر آنے کا اشارہ دیا تھا، ملا ہوگا۔"

''جی ہاں!'' وششٹھ رشی نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔

'بات یہ ہے تم بھی میرے ہم سفر ہو، لیکن تمھیں راستہ ٹھیک سے نہیں معلوم، بلکہ یوں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ تم منزل سے بھی بے خبر ہو۔''

وامن وششٹھ کچھ کہنے والے تھے کہ کلپنا نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر انھیں چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔ کلپت رشی کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ اس طرح گفتگو کر رہے تھے گویا سب کچھ دیکھ رہے ہوں:

'تم تو بالکل ہی گُم کردہ راہ ہو۔ جن کے نام پر تمھارا نام ہے وہ عارف تھے، لیکن کامل نہیں۔ بنانا اور مٹانا دونوں ایک ہی عمل ہیں لیکن مٹانے میں دیر لگتی ہے۔ وقفے یا مدت کے معنی میں دیر نہیں، اس تغیر کے معنی میں جو مٹانے کے بعد آہستہ آہستہ رو پذیر ہوتا ہے۔ رہسیہ سمراٹ نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تم نے مٹنے کے عمل کا پہلا حرف ابھی ابھی دیکھا، اسے سیکھنا اور زبان سے ادا کرنا تو دُور کی بات ہے۔''

وامن وششٹھ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کلپنا بھی ذرا متعجب نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ نہر دیکھ رہے ہو؟ اور یہ مچھلیاں؟'' انھوں نے سوال کیا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ نہر میری بنائی ہوئی ہے اور یہ مچھلیاں بھی۔ لیکن یہ میرے ہاتھ پاؤں کی محنت سے نہیں، میری قوتِ تخلیق سے بنی ہیں۔ پہلے یہاں کچھ نہ تھا۔ تم سوچ رہے ہوگے اس پانی کا سرچشمہ کہاں ہوسکتا ہے؟ سرچشمہ میں ہوں۔''

کلپنا نے چونک کر اپنے شوہر کو دیکھا۔ یہ بات شاید اسے بھی نہیں معلوم تھی۔

''میں نے یہاں کتنی عمریں گذاریں، مجھے اس کا اندازہ تو ہے، لیکن پورا علم نہیں۔'' کلپت رشی نے کہا۔ ''تم گردو پیش میں کیا دیکھ رہے ہو، بتاؤ۔''

وششٹھ رشی اب تک عاجزانہ سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ اب انھوں نے نگاہ اُٹھائی تو دیکھا کہ بظاہر جہاں مچھلیوں والا چشمہ ختم ہوتا تھا، اس کے کچھ آگے یا کچھ اوپر، پورا نظام شمسی قائم تھا۔ سب سیارے اپنے اپنے کام میں محو تھے۔ سورج کی گردش سے نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں لیکن تمازت ان تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن چشمے کے بعد تو بظاہر کچھ نہ تھا، غار وہیں ختم ہو چکا تھا، بظاہر اس پر وہاں کوئی باندھ بندھا ہوا تھا، لیکن باندھ کا پانی وہاں کہیں جمع نہ ہوتا تھا۔ نہ جانے اس کا پانی اور مچھلیاں کہاں چلی جاتی ہیں، انھوں نے

سوچا۔ اب تو اس غار کی چھت بھی دکھائی نہ دیتی تھی لیکن کہیں، جہاں چھت ہونی چاہیے تھی، ایک اور کائنات نظر آ رہی تھی جس میں کوئی سیارہ، کوئی نظامِ شمسی نہیں تھا مگر اس کے باوجود ایک کے بعد ایک کئی کہکشائیں سامنے سے گذر رہی تھیں۔ ان کے بہت آگے، یا بلندی پر، یا پیچھے، کئی روشن ستارے چکا چوندھ کر رہے تھے، لیکن ان کی روشنی کبھی دُور جاتی ہوئی محسوس ہوتی، کبھی اپنی جگہ پر قائم دکھائی دیتی اور کبھی کبھی تو کسی کہکشاں کے جمِ غفیر میں وہ ستارہ ہی نظر نہ آتا تھا۔

وامن وشِشٹھ نے گھبرا کر اپنے ہاتھ پاؤں کو دیکھا۔ سب کچھ وہیں تو تھا جہاں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کسی اور دُنیا میں نہیں پھینک دیے گئے تھے، اپنی جگہ محفوظ تھے۔ محفوظ؟ کیا واقعی یہاں کوئی محفوظ ہے؟ کچھ دُھندلی سی آواز اُنھوں نے سُنی، اس میں عجب طرح کا غیر انسانی زور تھا، جیسے کوئی کسی خطرے سے آگاہ کر رہا ہو۔ انھوں نے دھیان دے کر سنا۔ نہیں، کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔ کلپت رشی کہہ رہے تھے:

''یہ سارے آسمان اور ان کے سارے سورج اور ستارے، ہوائیں اور بادل، روشنیاں اور اندھیرے، سب میرے بنائے ہوئے ہیں اور یہ وہی ہیں اور وہی نہیں بھی ہیں جنھیں تم اوپر انسانی آسمان میں دیکھتے یا تصور کرتے ہو۔''

وامن وشِشٹھ نے ہمت کر کے پوچھا:

''م.... مگر کیوں؟''

کلپت رشی کچھ شرمندہ سی مسکراہٹ مسکرائے (شرمندہ مسکراہٹ اور ان کے ہونٹوں پر؟ وشِشٹھ نے حیرت سے سوچا)۔ ''ہاں، کیونکہ میرا جی اس دُنیاوی کائنات میں اُکتا گیا تھا۔ میں اتنا سارا علم حاصل کر چکا، پھر وہ سب بھلا بھی چکا اور اپنے دل دماغ ہی نہیں پورے وجود کو علم، اطلاع، گمان، وہم سب سے پاک کر چکا تو بھی جن سوالوں کے جواب کی مجھے تلاش تھی وہ بے نیاز جواب ہی رہے۔ کہتے ہیں ایک کائناتِ عظمیٰ ہے جس میں سب کائناتیں جمع ہیں یا مدغم ہیں۔ تو پھر اس کی شکل کیا ہے؟ وہ تکونی ہے کہ چوکور ہے کہ دائرہ ہے یا زنجیرہ ہے؟ کیا کوئی قانون قاعدے ہیں جن کے تحت یہ کائنات زندہ اور عمل پذیر ہے؟ اور یہ زندہ ہے بھی کہیں؟ اپنی معمولی دُنیا میں تو زمان، مکان، علت معلول، سب جانتا ہوں، لیکن یہ کس طرح عمل کرتے ہیں؟ اچھا اگر کوئی کائناتِ عظمیٰ نہیں ہے، صرف ہماری کائنات ہے تو پھر وہ سب کہاں ہیں؟ وہ جمب دویپ، وہ کوہستان سمیرو، وہ بے ازل اور بے ابد کنول کا پھول کہاں سے آیا؟

''جب میرا جی ان سوالوں سے گھبرا جاتا تو میں اپنا دل بہلانے کے لیے نئے نئے آسمان اور آفاق بنا کر دل بہلاتا یا وقت گذاری کرتا لیکن نہیں۔ مجھے کسی اور کی تلاش تھی۔ حُسن کی، زندہ حُسن کی، جسے میں دیکھ سکوں، سُن سکوں، چھو سکوں، جسے میں صرف اور صرف اپنا کہہ سکوں اور وہ حُسن ارادے اور ذہن کا بھی مالک ہو۔ اسے تکلم پر قدرت ہو، اسے ہواؤں، آبشاروں، طیور، ابروباراں، صاعقہ، ان سب کی موسیقی کا بھی شعور ہو۔''

دامن وششٹھ ہی نہیں، کلپنا بھی کلپت رشی کا منہ دیکھ رہی تھی۔ دونوں چاہتے تھے کہ کچھ کہیں، لیکن مداخلت کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کلپت رشی کے الفاظ ہوا کی طرح سارے غار میں بہہ رہے تھے:

''مجھے معلوم تھا کہ کائنات کا آخری سِرا چھو لینے ہی پر میرا دُکھ دُور ہو سکے گا اور یہ دُکھ تمام دُکھوں کا بادشاہ تھا اور کائنات کا سِرا کہاں ہے، مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا تھا تو میں نے پہلی خوب صورت شے جو بنائی وہ مور تھا۔ طاؤس لاہوتی بھی اس قدر حسین، اس قدر دِلربا کیا ہوگا۔ میں تو ایک لمحے کے لیے مبہوت رہ گیا۔ یہ میں نے بنایا ہے؟ لیکن اس نے وجود میں آتے ہی پر پھڑ پھڑاتے ہوئے غار کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ اس قدر وحشت تو شاید حیوانی طاؤس میں بھی نہ ہوگی اور اس کی آنکھیں، وہ دلفریب کہ تکتے رہیے، لیکن ان میں فہم اور فکر اور ارادے کی روشنی نہ تھی۔ افسوس کہ ان کا حُسن میرے کسی کام کا نہ تھا۔

میں نے طاؤس کو باہر نکل جانے کا اشارہ دیا۔ اشارہ کیا دیا، اسے غار کا باہری دہانہ دکھا دیا اور وہ خوشی خوشی اُڑ کر باہر کی چٹان پر جا بیٹھا اور اپنی آئندہ معشوقوں کو اپنی جھنگار بھری آواز میں پکارنے لگا، لیکن وہاں مورنیاں کہاں تھیں؟ وہاں کی ہوا ہی اور تھی، زمیں اور تھی۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں سمجھ لیا کہ یہاں کچھ سرسبز نہ ہوگا اور کچھ تھکی ہوئی سی رفتار کے ساتھ نشیب کی وادیوں کی طرف اُڑ گیا۔

میں مایوس نہ ہوا، میں جانتا تھا کہ جو کچھ مجھے درکار ہے، وہ بن ہی جائے گا اور بنانے کی اس کوشش میں بھی ایک لذت تھی۔ کچھ اور وقت گذرا (اگر وقت کا کوئی تصور اس

جگہ ممکن تھا) اور میں نے پانی کا یہ چشمہ بنایا جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ اچھا شگون تھا، کہ پانی منبع اور علامت ہے زندگی اور تحرک کی۔ جیتی جاگتی زندگی اب کچھ دُور نہ ہونا چاہیے، میں نے سوچا۔ ایک مدت تک میں لہروں کے گذرنے، لہرانے اور جوش کرنے کا منظر دیکھتا رہا۔ ہر بار نیا پانی، ہر بار نئی لہر اور ہر بار روشنی کے کھیل یا شرارت کی وجہ سے لہروں کے نئے رنگ۔ میں نے سوچا کیوں نہ میں اس زندہ، تقریباً تکلم پر قادر، زندگی سے بھرپور پانی کو اپنے پاس بلاؤں، اس کی باتوں سے دل بہلاؤں، اس کے رنگوں سے لطف اندوز ہوں لیکن توبہ، وہ لہریں میری کب سننے والی تھیں؟ اور ان میں قوتِ سامعہ شاید تھی بھی نہیں۔ پھر میں نے چشمے کے پانی میں رنگ برنگی چھوٹی بڑی مچھلیاں بنائیں لیکن اب ایک نیا مسئلہ سامنے تھا۔ میرا یہ غار بہت لمبا، بہت گہرا سہی، لیکن پانی اس کے آخری سرے پر جمع ہوتا رہا تھا۔ اب یا تو وہ واپس میری طرف آئے یا اُٹھنا شروع ہو۔ مجھے یہ دونوں صورتیں منظور نہ تھیں۔ کیونکہ رُخ بدلنے یا انداز ورفتار بدلنے کے نتیجے میں پانی کچھ کا کچھ ہوسکتا تھا۔ پھر یہ مچھلیاں کہاں جائیں گی؟ میرے رہنے اور پاؤں پھیلانے کی بھی جگہ رہے گی کہ نہیں؟''

وامن وششٹھ نے ہمت کر کے مداخلت کی: ''لیکن.... لیکن اب تو ایسا نہیں ہے۔ غار کے آخری سرے پر کوئی اور غار یا حوض بنا ہے کیا؟'' کلپنا مبہوت کھڑی سُن رہی تھی۔ اس غار اور غار کے بنانے والے کی تاریخ سے وہ واقف نہ تھی، سمجھتی تھی کلپت رشی نے اسے یوں ہی پایا ہوگا اور اس میں اقامت اختیار کر لی ہو گی۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ کچھ بھی ایسا نہیں ہو جو دراصل ویسا ہی ہو جیسا کہ نظر آتا ہے۔ غار کی اُونچائیوں پر وہ دُنیائیں، دشت وصحرا، کہکشائیں، پوری پوری کائنات کو شروع سے قائم دیکھتی آ رہی تھی اور باہر جو آسمان و زمین تھے وہ اپنی ہی طرح کے آسمان وزمین تھے۔ کیا معلوم کتنی دُنیائیں ہیں اور کہاں ہیں اور کس نے بنائی ہیں۔ کلپت رشی نے آنکھیں کھول کر کلپنا کو دیکھا، کچھ عجب سی مسکراہٹ مسکرائے اور پھر کہنے لگے:

''ہاں، تو میں نے اپنے غار کے سرے پر چھوٹا سا حوض بنایا۔ مچھلیوں کو اور چشمے کے پانیوں کو ایک اور جولاں گاہ مل گئی۔ پھر میں نے اس نئے حوض کے پرلے سرے پر ایک چھوٹی سی نہر نکالی کہ حوض جب بھر جائے تو پانی اور مچھلیاں اس کے کناروں پر

سیلاب کا سا ڈھنگ نہ اختیار کر لیں۔ اب سب بالکل ٹھیک تھا۔ پانی نہر کے سرچشمے سے نکل کر میرے غار میں آتا رہتا اور حوض میں جمع ہو کر باہر نئے غاروں اور گہرائیوں کی طرف نکل جاتا لیکن وہ مچھلیاں، ہزار رنگ کی تھیں اور رنگ بدلتی بھی رہتی تھیں اور ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی۔ سطح سے لے کر تہ تک اور تہ سے لے کر سطح تک ان کے انگنت نقش و نگار بنتے۔ چشمہ اپنی سُریلی، کچھ سرخوش سی آواز میں آتا اور جاتا اور گاتا رہتا۔ لیکن میں بات کس سے کرتا؟ کون میرے غار کے فرش پر نازک قدموں سے چلتا اور اور اس کے نقش پا پھول کی طرح کھلتے جاتے؟ کس کے گنگنانے یا گانے کی آواز میرے دھیان میں خلل ڈالتی اور مجھے نیند آنے لگتی؟ کس کے بدن کے خطوط کبھی کہیں جھلک دکھا جاتے کبھی کہیں اور کسی شمع کی لو کی طرح روشن نظر آتے؟ میں کس سے پوچھتا کہ تم نے کھانا کھایا کہ نہیں؟ مچھلیوں کو اپنا کھانا خود ہی اس نہر میں مل جاتا تھا اور کچھ نہیں تو چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے پانی کے ساتھ باہر سے بہ کر آتے، وہی ان کے لیے کافی تھے۔ مچھلیوں کی خوب چین سے گذر رہی تھی۔ چشمہ بھی اپنے نغمے کے بہاؤ میں مگن تھا۔ مضطرب تھا تو میں تھا۔"

وامن وششٹھ نے گھبرا کر دیکھا۔ کلپت رشی کی آنکھیں کچھ سرخ، کچھ نم ہو رہی تھیں۔ سرخی تو ٹھیک ہے، لیکن یہ نمی کیوں؟ وششٹھ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ انھوں نے سوچا کہ کسی طرح ان کی گفتگو فی الحال روک دی جائے تو کیسی رہے؟ ایسا نہ ہو کہ ان تمام دل پذیر اور دل دوز باتوں کو دوبارہ اپنے لفظوں کے ذریعے زندہ کرنے میں ان کی زندگی پر کچھ آنچ آئے۔ انھوں نے سوال بھری آنکھوں سے کلپنا کو دیکھا اور انھیں حیرت ہوئی کہ وہ بھی رو رہی تھی۔ آنسو اس کے رُخسار پر ڈھلک آئے تھے لیکن وہ انھیں خشک کرنے کی بھی زحمت نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس اثنا میں کلپت رشی کا بیانیہ جاری تھا:

"....میں اس اضطراب کے عالم میں نہیں جینا چاہتا۔ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ سب میرے اکتسابات، یہ میرے دُور ترین دُنیاؤں کے روحانی سفر، میرے کوئی کام نہ آئیں گے؟ میں نے سارے ماحول سے خود کو جُدا کر لیا۔ بند آنکھوں کو کھول دیا۔ اب وہ آنکھیں مُردہ اور بے نور تھیں۔ سارا نور، ساری قوتِ ایجاد میرے ذہن میں مرتکز ہو گئی تھی۔ عورت کے بدن، اس کے حُسن، اس کے مزاج کے بارے میں جو کچھ میں

نے دیکھا اور سمجھا اور تصور کیا تھا، وہ سب میرے تصرف میں تھا۔ بس جان ڈالنے کی دیر تھی۔ مجھے نہیں معلوم مجھے کتنی دیر لگی، لیکن ایک دن یا شاید ایک رات میری آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی اور کلپنا میرے سامنے کھڑی تھی۔''

وامن وششٹھ کے منہ سے نکلا: ''یہی کلپنا؟ یہ تو.... یہ زندہ ہیں؟ بالکل زندہ۔ ان کے خون کی گرمی، ان کی سانسوں کی دھڑکن، میں یہاں سے بھی سن سکتا ہوں!''

کلپنا اچانک بول اٹھی: ''مہاراج، اور یہ پانی کا چشمہ، یہ مچھلیاں، جو آپ کے سامنے ہیں، یہ زندہ نہیں ہیں کیا؟ کیا آپ کی مت بالکل ہی ماری گئی ہے؟'' وہ تھوڑی سی ہنسی، ہنس کر بولی، ''شاید ابھی کچھ زیادہ سفر نہیں کیا ہے۔ عالم کو آپ نے بہت کم دیکھا ہے۔'' اچانک وہ بپھر کر بولی: ''ہاں، اسی زندگی نے تو مجھے تباہ کر ڈالا ہے۔ آپ کس خیال میں ہیں اور کس دُنیا کے باسی ہیں؟''

کلپت رشی نے یہ سب شاید سُنا ہی نہیں۔ وہ کہہ رہے تھے: ''میں نے اسے تکلم اور ذہن پر بھی قادر تصور کیا تھا۔ دل دماغ اور تمامی اعضائے رئیسہ تو تھے ہی لیکن مجھے یہ خبر نہ تھی یا شاید تھی، لیکن میں لوبھ کی شدت میں اس بات کو نظر انداز کر گیا تھا کہ اگر دل ہے تو جہاں وہ سارے جسم میں خون دوڑاتا ہے، وہاں وہ جذبات اور درد اور تقاضا بھی پیدا کرتا ہے۔ سب کچھ جانتے ہوئے میں اس دل میں جو گوشت کا لوتھڑا ہے اور اس میں فرق کرنا بھول گیا تھا جو انسان کو انسان بناتا ہے، جیسے کمی، زیادتی، روح کی بھوک اور جسم کی پیاس کا بھی احساس ہوتا رہتا ہے۔''

کلپنا کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن کلپت رشی پر اس وقت وہ عالم طاری تھا کہ دیو اور راکھشس بھی مداخل ہونے کی جرأت نہ کرتے۔

''میری آنکھیں دیکھتے ہی وہ بولی: ''میں کون ہوں؟''

''مجھے جواب نہ پڑا تو اس نے دوسرا سوال کر دیا: ''میرا نام کیا ہے؟''

''تمھیں میں نے بنایا ہے۔ تمھارا ابھی کوئی نام نہیں ہے۔''

''اس کی پیشانی پر ناراضی کی شکن نظر آئی تو میں نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا، تم کلپنا ہو۔''

''اچھا تو پھر آپ کون ہیں۔ ہیں بھی کہ نہیں؟''

''میں ہوں، لیکن میرا کوئی نام نہیں ہے۔ باپ ماں نے اگر کوئی نام مجھے دیا تھا تو میں اسے بھول چکا ہوں۔''

''اچھا، اگر میں کلپنا ہوں تو آپ کلپت ہیں۔'' وہ جھٹ بولی: ''حساب برابر ہوا۔''

''کلپت بھی اچھا نام ہے۔ میں نے کچھ تذبذب کے بعد اس کی پسند کو اپنی پسند بنا لیا۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟ میں کس لیے بنائی گئی ہوں؟''

''تمھارا کوئی کام نہیں۔ تم اس غار کو اپنی موج خرام سے روشن کرو، اپنے تبسم سے شفق گوں کرو، اپنی آواز سے چرند و پرند کو اور مجھے بھی مسحور کرو۔''

''مجھے یہ سب کچھ نہیں آتا۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''نہ مجھے کھانا پکانا آتا ہے، نہ میں آپ کی چادر میں پیوند لگا سکتی ہوں، نہ میں رات کو گیت سنا کر آپ کو سُلا سکتی ہوں اور گانا تو مجھے بالکل ہی نہیں آتا۔''

''ٹھہرو، ذرا ٹھہرو۔ موسیقی میں تمھیں دکھاؤں گا، تمھاری آواز کو پرندوں کی چہچہاہٹ سے، ٹھنڈی ہواؤں سے ہم آہنگ ہونا، میں تمھیں سکھاؤں گا۔ تمھیں بس میرے لیے رونقِ حیات بننا ہے۔''

اب کلپنا سے نہ رہا گیا۔ ''جی ہاں، آپ نے مجھے سب کچھ سکھایا، سب کچھ بنایا، لیکن کبھی محبت کی نگاہ سے مجھے نہ دیکھنا.....''

''محبت کی نگاہ؟'' کلپت رشی نے کچھ متعجب ہو کر پوچھا۔

''آپ دماغ کی، دل کی، حقیقت جانتے ہیں۔ ابھی آپ نے خود ہی کہا۔ پھر اس دل کے تقاضے بھی جانتے ہوں گے۔'' کلپنا تیز لہجے میں بولی۔ ''مجھے کسی کی بھی رونقِ حیات نہیں بننا۔ میری بھی کوئی زندگی ہے؟ میری زندگی کی رونق کون بنے گا؟ کون بن سکتا ہے؟ کیا میں کوئی بے جان کھلونا ہوں؟''

اب کلپنا کے آنسو ندی کی طرح بہہ رہے تھے۔ وششٹھ تو ایک طرف رہے، کلپت رشی کو بھی لب کھولنے کی جرأت نہ تھی۔

''آپ نے اتنا کچھ گیان حاصل کیا لیکن یہ نہ جانا کہ چاہت کے بغیر کچھ نہیں؟ مجھے چاہنے والا تو کوئی آپ نے بنایا نہیں اور کیوں بناتے؟ آپ کو اپنی دلبستگی کے لیے گڑیا بنانی تھی تو کچھ اور بناتے۔ آپ

نے ادھوری مخلوق پیدا کر دی اور اسی پر آپ کو تسخیرِ فطرت کا، تسخیرِ کائنات کا جنون تھا؟ نہیں معاف کیجیے گا، آپ تو تخلیق کائنات کا دعویٰ رکھتے تھے؟''

وششٹھ رشی کو لگا، وہ اچانک نیند سے بیدار ہو گئے ہیں۔ انھوں نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ سب کچھ تو ویسا ہی تھا، وہیں تھا۔ لیکن انھیں یہ وہم کیوں ہو رہا تھا جیسے کچھ بدل گیا ہے یا بدلنے والا ہے؟ یوگ وششٹھ (جس کے نام سے انھوں نے اپنا نام مستعار لیا تھا، یعنی ان کے دونوں نام مستعار تھے) میں تو لکھا ہے کہ سب کچھ انسان کے ذہن میں ہے اور وہ حقیقت یا وہ وجود، جو انسان اپنے ذہن میں اور پھر اپنے ذہن سے پیدا کرتا ہے، اس میں پہاڑ کی ایسی چوٹیاں، ایسے کوہسار بھی ہیں جو لچک دار ہیں۔ انھیں بڑھایا جائے تو پتا لگتا ہے کہ ایک اتھاہ، بے انت سلسلہ ہے جس میں سب کائناتیں لپیٹی پڑی ہوئی ہیں۔ تو کیا یہ پیاز کے چھلکے کی طرح ہیں یا پیاز کے چھلکے ہی ہیں؟ مگر یہ کلپنا تو سمجھتی ہے کہ سب کچھ حقیقی ہے۔ ایک میں ایک بندھا ہوا یا مدغم نہیں ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ پر حقیقی ہے مگر مجھے کیا خبر، مجھے کیا علم؟ ابھی تو میں نے وامن اوتار کا پہلا قدم بھی نہیں پورا کیا ہے۔ میں تو راہ میں کہیں معلق ہوں۔ یوں کہیں کہ میں ابھی نیند ہی میں ہوں۔ میں تو ابھی نیند اور خواب کے علاقے کی طرف قدم زن بھی نہیں ہوا ہوں۔ کلپنا اور کلپت جن اسرار سے واقف ہیں، مجھے ان کی بھنک بھی نہیں مل سکی ہے۔ کلپنا کو تو کلپت نے بنایا ہے، یہ بات وہ خوب جانتی ہے لیکن مجھے کس نے بنایا، اس سوال کے جواب کا سایہ بھی مجھ تک ابھی تک نہیں پہنچا۔ مجھے کلپت نے اپنی قوت کے بل بوتے پر کھینچ بلایا تھا لیکن مجھے لگتا ہے یہ سفر بھی....

مگر کچھ بدل ضرور گیا ہے، مجھے یقین ہے یا میں ہی کچھ بدل گیا ہوں؟ کچھ نہیں، بہت کچھ۔ وامن وششٹھ نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کیا کوئی نیا شخص ادھر آنے والا ہے؟ کیا وہ کلپت رشی سے بھی زیادہ قوتوں کا مالک ہے؟ مگر کیا کلپت رشی کی قوتیں ان کے لیے مخصوص ہیں اور یا ہر ایک میں مشترک ہیں؟ اور قوت ہے کیا؟ کیا نجات اور نروان کی راہ، جسے یوگ وششٹھ میں موکش پایہ (راہِ آزادی) کہا گیا ہے، سب کے لیے ہے؟ یعنی کیا ہم میں سے کوئی بھی اس راہ پر چل سکتا ہے اگر اسے راہ کا سرا، یعنی اس کا پہلا قدم، معلوم ہو؟ لیکن یہ موکش کیوں لازم ہے؟ ہمیں کس نے یہاں (یا کہیں بھی) قید کیا اور پھر نجات کی راہ ڈھونڈنے پر مکلف کیا؟ کیا کلپت رشی کو نجات کی راہ مل گئی ہے؟ اور کلپنا کو؟

ابھی وہ ان سوالوں میں اُلجھے ہوئے تھے کہ انھوں نے دیکھا، کلپنا کے سر کے چاروں طرف کچھ

آگ کے سے شعلے ہیں۔ کیا یہ کلپنا کے سر سے اُٹھ رہے ہیں؟ یا کوئی نئی آگ ہے؟ چشم زدن میں انھیں ایسا محسوس ہوا کہ چشمے میں پانی کی لہریں نہیں ہیں، آگ کی لپٹیں ہیں اور یہ لپٹیں شعلہ بن کر ہر طرف لپک رہی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلے گویا زندہ ہو کر غار میں ہر طرف دوڑنے لگے۔ غار کے آخری سرے جو آسمان تھا، (یا جو چھت تھی؟) اس پر جگمگانے والی، ڈرانے والی، بے چین کر دینے والی ساری دُنیائیں، سب دشت و صحرا، سب سمندر اور سب آسمان، جلنے لگے۔ صرف کلپت رشی اور کلپنا اپنے اپنے دھیانوں میں غرق تھے گویا کچھ بدلا ہی نہیں ہے یا شاید انھیں آگ کی گرمی ابھی تک پہنچی نہیں ہے۔

وامن وششٹھ نے لڑکھڑاتے ہوئے قدم پیچھے ہٹائے۔ وہ آگ شاید ان کا پیچھا کر رہی تھی۔ نہیں، سارے شعلے ابھی اسی غار تک محدود تھے۔ اچانک انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے اندر سے کچھ کم ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ کنڈلنی، جسے وہ ہمیشہ کردھنی کی طرح کمر سے باندھے رہتے تھے، وہ سانپ غائب تھا۔

جیسے کسی نے دن دہاڑے ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی ہو۔ انھیں آگ کی گرمی اور اس کی چمک تو محسوس ہو رہی تھی، لیکن انھیں نظر کچھ نہ آتا تھا۔ یہ بھی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ غار کے باہر ہیں یا اندر ہیں۔ ایک مرتبہ انھیں ایسا لگا کہ وہ آگ غار سے باہر نکل کر ان کے وجود پر مسلط ہونے والی ہو۔ انھوں نے گھبرا کر ایک اور قدم پیچھے ہٹایا اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔ کیا یہی انجام ہے؟ کیا اسی کو نجات، نروان، موکش کہتے ہیں۔

نہ معلوم کتنی دیر ہو گئی تھی۔ انھوں نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تو وہاں کچھ بھی نہ پایا۔ آگ نے سب نگل لیا تھا یا خاک کر دیا تھا اور کوہستانی برفیلی ہوا اچانک گرم آندھی بن کر سب کچھ اُڑا لے گئی تھی؟ نہ کلپنا نہ کلپت رشی، نہ وہ پانی کا چشمہ، نہ وہ مچھلیاں۔ نہ وہ خاک نہ پتھریلی چٹانیں، نہ غار کی گہرائیاں، حدِ نظر تک ایک اونچی پہاڑی تھی جو دُور کسی ڈھلان میں گُم تھی اور وہ نہر وجود، جو اس سب کا منبع تھی؟ وہ خود سے شرمندہ ہوئے۔ انھیں اپنے ہی وجود کے سرچشمے کا پتا نہ تھا اور اب وہ ناگ بھی انھیں چھوڑ گیا تھا۔ انھیں کسی اور وجود کے حق یا باطل ہونے کا سوال اُٹھانے کا حق ہی کیا تھا؟

ایک زمانے میں انھیں صوفیوں کے بعض حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ ان میں سے ایک صوفی کا قول تھا کہ ہر آن وجود ہے اور ہر آن فنا ہے۔ تو پھر ایسی صورت میں کسی مقررہ ذات کے سرچشمے کی

تلاش فضول تھی۔

وششٹھ رشی نے تھکے ہوئے قدموں سے نیچے اُترنا شروع کیا۔ اب وہ سبزہ زار تھا نہ آبشار، نہ وہ سرو اور دیودار کے پیڑ۔ راستہ ناہموار تھا، جیسا کہ پہاڑوں میں ہوتا ہی ہے۔ وہ ذرا اور نیچے اُترے، موسم کچھ گرم ہو چلا تھا۔ غار کے آس پاس تو سرد ترین موسم تھا اور غار کے ذرا اوپر ہر جگہ برف بندی تھی۔ یہاں سورج تو ابھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن آسمان دُور تک نیلا تھا۔ وہ اُترتے گئے۔ دفعتاً انھیں شک ہوا کہ کہیں کوئی چیز چمک رہی ہے۔ اِدھر اُدھر تو کچھ بھی نہ تھا۔ اوپر اونچا پہاڑ تھا۔ نیچے، جہاں وہ کھڑے ہوئے تھے، دُشوار گذار گھاٹیاں اُترتی چلی گئی تھیں۔ انھوں نے ہمت کر کے بائیں طرف کگر پر سے جھانکنا چاہا۔ ان کا سر چکرانے لگا۔ نہیں، کچھ بھی نہ تھا۔ پھر انھوں نے دو قدم اُتر کر دائیں جانب دیکھا۔ ہرا سنہرا رنگ چمک رہا تھا۔ اُنھوں نے نظریں جمانے کی کوشش کی اور دیکھا کہ بہت کچھ نیلا رنگ بھی تھا۔ یہ تو مور تھا۔ وہی مور تو نہیں جو کلپت رشی نے بنایا تھا؟ عام طور پر مور اتنی بلندی پر نہیں پائے جاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ وہی مور تھا، کسی بنا پر اس کی قوت پرواز ختم ہو گئی تو وہ گھاٹی کے شگاف میں اُتر گیا۔ غالباً دم لینے کے لیے، لیکن پھر وہ اس شگاف سے باہر نہ آ سکا، شاید پر پھیلا کر اُڑ جانے کی جگہ نہ تھی۔ کیا کلپنا اور مچھلیوں سے بھری نہر کی طرح وہ مور بھی کلپت رشی کی راہ پر چلنے پر مجبور ہو گیا تھا؟

وامن وششٹھ کے گالوں پر دو قطرے بہہ نکلے۔ دُھند ہر طرف بہت تیزی سے چھائی جا رہی تھی۔ بھاری دل کے ساتھ انھوں نے ٹٹول ٹٹول کر قدم رکھنا آغاز کیا۔ تھوڑی دیر بعد دُھند نے انھیں بالکل پوشیدہ کر لیا۔

سوار

اور دوسرے افسانے

مرتب کے قلم سے

شمس الرحمٰن فاروقی کے لیے تخلیقی عمل سے وابستہ ہونا ہی زندگی تھی اور زندگی کا مقصود تخلیقی عمل سے جڑنا۔ تاہم تخلیقی عمل سے جڑنے کے معنی محض شعر کہنا یا کہانی لکھنا نہیں تھا۔ ابھی انھوں نے میٹرک نہ کیا تھا کہ شاعری اور کہانی لکھنے کی طرف راغب ہو گئے تھے مگر ہوا یہ کہ انھیں تنقید لے اُڑی اور اس نے اُن کی ساری توجہ ہتھیائے رکھی، حتی کہ وہ ناقدین میں سب سے بلند قامت ہو گئے۔ یہ وہ سارا زمانہ تھا کہ بہ ظاہر وہ تنقید کے طرف راغب تھے مگر اپنے تئیں اس اسلوب اور تکنیک کی تلاش میں تھے جو ہماری اپنی تہذیبی میراث کی قدر و قیمت پھر سے قائم کرنے کے لیے موزوں ترین ہو۔ وہ اس عرصے میں اور ناموں سے کہانیاں لکھتے رہے۔ حتیٰ کہ اُن کے قلم نے معجزہ دکھایا اور ''غالب افسانہ'' تخلیق ہو گیا۔ حقیقت، ادبی تاریخ اور تہذیب سب بہم ہو کر ایک مرقع میں ڈھل گئے تھے اور وہ بھی کچھ یوں کہ اُن کی تخلیقی بے چینی کو قرار آیا۔ یہ افسانہ شمس الرحمن فاروقی کی فکشن نگاری کے لیے وہ سنگ میل ہے جہاں سے اُن کا یہ فن بلندیوں کی طرف گامزن ہوا۔ فکشن لکھنا اُن کے ہاں شاعری جیسا محترم اور لائق توجہ ہو گیا۔ اس جانب اُن کا قلم رواں ہوا اور اس تخلیقی رو میں انھوں نے اس مرحلے کے پہلے افسانے سمیت پانچ افسانے لکھے اور پھر ناول کے میدان میں وہ کارنامے دکھائے کہ اپنا نام یہاں بھی نمایاں لکھوالیا۔

فاروقی صاحب نے پہلے پہل ''شب خون'' کے مختلف شماروں میں فرضی مصنفین کے نام سے یہ افسانے شائع کروائے۔ پہلا افسانہ یعنی ''غالب افسانہ'' بینی مادھو رسوا کے نام سے جب کہ باقی سارے افسانے (جن میں ''سوار''، ''آفتاب زمیں''، ''ان صحبتوں میں آخر'' اور ''لاہور کا ایک واقعہ'' شامل ہیں) ایک اور فرضی مصنف عمر شیخ مرزا کے نام سے شائع ہوئے۔ جب فاروقی صاحب کے اِن افسانوں کو اُن کے اپنے لفظوں میں ''دور ترین توقعات سے زیادہ پذیرائی ملی'' تو وہ فرضی ناموں کی اوٹ سے نکل آئے اور اپنے نام سے مجموعہ چھپنے کو دے دیا۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ فکشن اپنی تہذیب اور ثقافت کی تشکیل ہو کر ایک اور سطح پر اپنی تخلیقی قوت سے نئی تہذیبی اور ثقافتی تشکیل بھی کر رہا ہوتا ہے، تو یہ بات عین مین فاروقی صاحب کے فکشن پر یوں صادق بیٹھتی ہے کہ اُنھوں نے تہذیبی، تاریخی اور ادبی واقعات اور پہلے سے موجود کلاسیکی متون کو بہت باریک بینی سے دیکھا اور اس سب کو اپنے تخلیقی عمل سے گزار مناسب ترین زبان میں کہانیوں میں یوں ڈھال دیا ہے کہ ہر کہانی میں ہمارا اپنا متروک تہذیبی ماضی پھر سے زندہ اور کہیں زیادہ اُجلا اور روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔ بے شک یہ افسانے اُردو افسانے کی روایت میں ایک الگ نوع کا تجربہ ہیں۔ ایک ایسا تجربہ جو کامیابی سے ہمکنار ہوا اور افسانہ نگار کی توقیر میں اضافہ کر گیا۔

فاروقی صاحب کے افسانوں کا یہ اکلوتا مجموعہ ''آج'' کراچی سے 2000ء اور شب خون کتاب گھر الٰہ آباد سے 2003ء میں شائع ہوا تھا۔

محمد حمید شاہد

فکشن کے تین اہم ترین نقادوں

اور اپنے عزیز دوستوں

عابد سہیل

وارث علوی

اور

وہاب اشرفی

کے نام، کہ انھوں نے مجھے افسانے پر تنقید
لکھنے سے باز رکھنا چاہا تو میں نے افسانے کی تنقید ترک کرنے
کے بجائے خود افسانے لکھنا شروع کر دیے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد،

ستمبر 2000ء

Fiction and factuality are, of course, not opposed. What makes a work fiction is not that the story is untrue - it may well be true, in part or in whole - but its use, or extension, of a variety of devices (including false or forged documents) which produce what literary theorists call "the effect of the real."

Susan Sontag

دیباچہ

میری پہلی ادبی کاوش ایک مصرع تھا جو میں نے سات سال کی عمر (1942ء) میں کہا۔ میں نے لفظ 'کہا' جان بوجھ کر استعمال کیا ہے، کہ اس مصرعے کو کاغذ پر لانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ مصرع کیا تھا، میرے 'دکھی بچپن' کی داستان کا دریا میرے حسابوں اس کوزے میں بند ہو گیا تھا:

معلوم کیا کسی کو مرا حالِ زار ہے

اس سہمے ہوئے سے مصرعے کی تصنیف کو میری ادبی زندگی کا آغاز مانا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میری ادبی زندگی کا پہلا قدم شاعری کے میدان میں اُٹھا تھا لیکن یہ بھی کہ اس پر نہ دوسرا مصرع لگ سکا، اور نہ ہی میں پھر ایک مدت تک مزید فکر شعر کر سکا۔ مصرع لگانے کی کوشش میں نے ضرور کی تھی، اور اس کا قافیہ کچھ 'فگار' قسم کا تھا لیکن بات کچھ ٹھیک سے بن نہ سکی۔ پھر میں نے کوشش بھی چھوڑ دی، اور اب بالکل یاد نہیں کہ 'فگار' قافیے کے ساتھ میں نے اور کون سے الفاظ بھرنے کی سعی خام کی تھی۔ یقین ہے کہ مصرع ناموزوں رہا ہو، ورنہ میں اسے بھول نہ جاتا۔

ایک دو سال بعد میں نے خالی وقتوں میں ایک قلمی ماہ نامے 'گلستان' کی ترتیب و اشاعت شروع کی۔ 'ترتیب' اس معنی میں کہ اِدھر اُدھر کی کاپیوں سے کاغذ جمع کر کے انھیں چھوٹی تقطیع پر کچھ ٹیڑھا میڑھا کاٹ کر

میں ان کے سولہ یا بیس یا چوبیس صفحات بنالیتا اور براہِ راست انھیں صفحات پر اپنی 'تصنیفات' درج کرتا۔ یہ زیادہ تر میرے افسانے اور مضامین ہوتے۔ کبھی کبھی اخبار یا رسالے سے اخذ کیا ہوا کوئی کارٹون یا فوٹو بھی شامل ہو جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک بار ہٹلر کی تصویر کو اپنے کسی شمارے کی 'زینت' بنایا تھا، اور اس پر عنوان مقرر کیا تھا، 'دُنیا کی خوفناک ترین ہستی: ہٹلر'۔ ایک بار کسی رسالے میں اُردو مرثیے کی نشوونما پر مضمون پڑھ کر میں نے اس کے مطالب اپنی زبان میں ادا کر کے اپنے اس مضمون کو 'گلستان' میں داخل کیا تھا۔ وہ شمارہ جس میں میرا یہ مضمون تھا، بالکل اتفاق سے والد صاحب کی نظر سے گذرا تو وہ ناراض ہوئے کہ تم نے بعض اشعار ناموزوں نقل کر دیے ہیں۔ مجھے اس وقت موزوں ناموزوں کی خبر نہ تھی۔ جس مرثیے میں والد صاحب کو ناموزوں اشعار نظر آئے تھے، وہ شجاع الدین نوری کی تصنیف تھا:

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا
ولے سب تکلف دیا ہم مٹا

والد صاحب نے ہر مصرعے کی تقطیع 'فعولن فعولن فعولن فعل' کر کے مجھے سمجھایا کہ کہاں غلطی ہے۔ وہ میرا عروض کا پہلا سبق تھا۔ فعولن فعولن کی وہ تکرار مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسی دم مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ زمانے میں عروضی ضرور بنوں گا لیکن بات ہو رہی تھی 'گلستان' کی ترتیب اور 'اشاعت' کی۔ ترتیب کا حال تو اوپر آ گیا۔ اشاعت اس کی یوں ہوتی تھی کہ اس کی خاص قاری میری بڑی بہن زہرا ہوتی تھیں، کہ ان کے بھی افسانے کبھی کبھی 'گلستان' کے شگوفوں کی تعداد میں اضافہ کرتے تھے۔ کچھ دن بعد گھر کے کاموں اور چھوٹے بھائی بہنوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داریوں نے افسانہ نگاری کو افسانۂ پارینہ بنا دیا، لیکن 'گلستان' کے پڑھنے والوں میں شامل وہ ہمیشہ رہیں۔ کبھی کبھی میں اپنے ایک آدھ اسکولی ساتھی کو بھی 'گلستان' کا قاری ہونے کا شرف بخش دیتا۔

'گلستان' کا پیٹ بھرنے کی خاطر میں نے افسانہ نگاری شروع کی، اور اپنے شوق کو پورا کرنے کی خاطر تنقید۔ مجھے شاعری پر اظہارِ خیال کرنے، اور مختلف شعرا کی خصوصیات الگ الگ بیان کرنے کی کوشش کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ ایک بار میں نے مختلف شعرا کی صفات پر مبنی ایک نقشہ بنایا جس میں غالب کی صفت 'نازک خیالی' اور مومن کی خصوصیت 'معاملہ بندی' لکھی۔ میرے ایک بڑے باپ مولانا عزیز الرحمٰن صاحب

مرحوم (ہم لوگ انھیں مولانا ابا کہتے ہیں) نے وہ نقشہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ تم نے بالکل ٹھیک لکھا ہے، معاملہ بندی واقعی مومن کی سب سے نمایاں صفت ہے۔ اس وقت مجھے 'معاملہ بندی' کے معنی اچھی طرح نہ معلوم تھے۔ میرے جی میں آئی، مولانا ابا سے پوچھوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ میں 'معاملہ بندی' کے صحیح معنوں سے بے خبری میں تنہا نہ تھا۔ ایک مدت کے بعد مجھے پتا لگا کہ اسے 'وقوعہ گوئی' بھی کہتے ہیں اور اس موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم کی ایک تحریر بھی میری نظر سے گذری لیکن بات پھر بھی صاف نہ ہوئی۔

شاعری کا سلسلہ 'گلستان' کے آغاز کے کچھ دن بعد دوبارہ چلا، لیکن 'بحر رجز میں ڈال کر بحر رمل چلے' کا قضیہ اکثر اٹھتا، کہ جب بھی والد صاحب کی نظر میرے اشعار پر پڑتی تو وہ خفا ہی ہوتے۔ مجھے تو بہر حال علم نہ ہوتا کہ میں کہاں بھٹک کر کدھر چلا گیا ہوں۔ مشکل یہ تھی کہ وہ مجھے بتاتے کچھ نہ تھے، اور اپنی عقل کے مطابق شعر کے معاملے میں نفس مطمئنہ حاصل تھا لیکن عروض حاصل کرنے کی خلش کھٹکتی رہی۔ والد صاحب یا کسی اور بزرگ سے کہنے کی ہمت نہ تھی کہ سکھا دیجیے، اور اپنے نزدیکی لوگوں میں کسی شخص کو میں ایسا جانتا نہ تھا کہ مجھے عروض سکھا دے گا۔ اس آرزو کی تکمیل کا آغاز بہت دنوں بعد ہوا، جب میں نے الہ آباد یونیورسٹی کے مشہور ماہر عربیات پروفیسر محمد رفیق سے عروض میں ایک دو سبق لیے۔ پھر بہت جلد ہی میں نے کتابیں دیکھ دیکھ کر از خود اس علم میں مہارت حاصل کر لی۔

بات پھر آگے نکل گئی۔ 'گلستان' کا آخری شمارہ اس وقت نکلا جب میں دسویں کا طالب علم تھا۔ میں اسے باقاعدہ ماہانہ تو کبھی نہ نکال سکا تھا، میری کاہلی ہی اس کی بے قاعدہ اشاعت کی ضمانت کے لیے کافی تھی لیکن ہائی اسکول کے بعد میرا جی اس سے اچاٹ ہونے لگا، کہ اس وقت تک میں 'گلستان' کے باہر اخباروں اور رسالوں میں اپنی تحریریں چھپوانے کی تمنا کرنے لگا تھا۔ میرا پہلا افسانہ شاید 1948ء/1949ء ہی میں چھپا، یعنی جس سال میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اب نہ افسانے کا نام یاد ہے نہ اس بھاگوان پرچے کا، لیکن ہائی اسکول کے زمانے سے میں چار چھ مہینے میں ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا افسانہ چھپوا لینے میں کامیاب ہونے لگا تھا۔

ایک مشکل یہ تھی کہ میرے یہاں رسالے بالکل نہ آتے تھے، اس لیے مجھے ٹھیک سے نہ معلوم تھا کہ میری تحریریں کس پرچے کے لیے موزوں ہوں گی۔ میرے ننہال میں میری چھوٹی خالہ صاحب مرحومہ بہت رسالے منگاتی تھیں، اور میں جب بنارس اپنے ننہال جاتا تو انھیں پڑھتا بھی، لیکن وہ زیادہ تر عورتوں کے

رسالے ہوتے تھے، یا پھر کچھ اتنے اونچے معیار کے کہ ان میں افسانہ بھیجنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ایک بار جی کڑا کر کے کہیں کچھ بھیجا تو پھر اس کی خبر نہ آئی۔ یہ حال میری اکثر تحریروں کا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ بنارس ہی میں ایک اخبار سے واپسی نامہ آیا تو اسے میرے ایک بزرگ نے دیکھ لیا اور وہ ہنس کر بولے، ''یہ لو اپنا مضمون واپس۔ کہو، کیا رہ گئی؟'' ان کا لہجے اور الفاظ کا تمسخر میرے دل میں لوہے کی سلاخ جیسا چبھا، لیکن بات بہر حال سچ تھی۔ کسی رسالے سے مضمون کا واپس آنا اور سرِ بازار عزت اتر جانا ان کی نظر میں برابر تھا۔

مرحوم قیسی الفاروقی میرے عم زاد بھائی تھے۔ جس زمانے کا ذکر میں کر رہا ہوں، اس وقت ان کا کلام نظم و نثر بہت سے پرچوں میں مسلسل چھپتا تھا۔ عمر میں وہ مجھ سے بہت بڑے تھے، لہٰذا ان سے مشورہ یا ہدایت لینے کی ہمت نہ تھی اور دوسری بات یہ کہ جن پرچوں میں وہ چھپتے تھے وہ مجھے اپنی گوں کے نہ لگتے تھے لیکن ایسے پرچوں کی مجھے خبر نہ تھی جو میرے پسند خاطر ہوتے۔ گیارہویں جماعت میں میرا اٹھنا بیٹھنا جماعت اسلامی کے ادبی حلقوں میں ہوا تو رسالہ 'معیار' میرٹھ میری توجہ کا مرکز بنا۔ میں نے گیارہویں جماعت کے زمانے (1949ء/1950ء) میں اپنے خیال میں ایک ناولٹ لکھا، 'دلدل سے باہر'۔ ہوسکتا ہے وہ طویل افسانہ ہی رہا ہو لیکن میں اپنی خوش فہمیوں میں گرفتار اسے ناولٹ ہی کہتا تھا۔ 'دلدل سے باہر' کو میں نے تین بار لکھا۔ (دوسری بار تو اس لیے لکھنا پڑا کہ ایک بار میرے ایک دوست نے کچھ طنزیہ لہجے میں کہا کہ تم اپنے ناولٹ کی توصیف وثنا سننے کے بہت مشتاق معلوم ہوتے ہو۔ اس پر میں نے مسودہ اس کے ہاتھ سے لے کر وہیں پارہ پارہ کر دیا، اور تیسری بار اس لیے لکھا کہ اپنے دوست اظہار عثمانی مرحوم کے مشوروں کی روشنی میں مجھے دوسرے مسودے میں بھی جگہ جگہ ترمیم ضروری معلوم ہو رہی تھی۔) خدا بخشے میرے انگریزی کے استاد اور نہایت عمدہ شاعر اور ادب شناس فرشتہ سیرت غلام مصطفیٰ خان رشیدی مرحوم (1923ء تا 1993ء) کو کہ انھوں نے پورے مسودے کو بغور پڑھا اور میری ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔

'دلدل سے باہر' بالآخر 1950ء تا 1951ء میں 'معیار' میرٹھ کے چار شماروں میں بالاقساط چھپا۔ مجھے تھوڑی سی خوشی تو ہوئی، لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس ناولٹ (یا جو بھی وہ تھا) سے اُکتا چکا تھا اور زندگی، انسان، عورت، گناہ وغیرہ کے بارے میں اس کے مضمر مفروضات مجھے بچگانہ اور خام لگنے لگے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں اس وقت بہت ساری انگریزی پڑھ چکا تھا اور جماعت اسلامی سے بھی برگشتہ ہونے لگا تھا۔ میں اپنی مطبوعہ یا مسودہ تحریروں کو سینت کر رکھنے کا کسالا کبھی نہ کھینچ سکا۔ 'گلستان' کا ایک ورق بھی

میرے پاس محفوظ نہیں۔ ’دلدل سے باہر‘ کا بھی نہ مسودہ میرے پاس ہے اور نہ ’معیار‘ کے وہ پرچے جن میں اس کی اشاعت ہوئی تھی۔

انھیں دنوں میں نے ایک افسانہ ’سرخ آندھی‘ لکھا جو سوویٹ روس میں مذہب پر استبداد کے بارے میں تھا۔ رشید صاحب نے تو وہ افسانہ پسند ہی کیا، لیکن اُردو کے استاد (میں اُردو کا طالب علم نہ تھا) جناب شمس الآفاق شمس گورکھپوری (1912ء تا1993ء) نے اسے پڑھ کر فرمایا کہ یہ تو کسی بڑے افسانہ نگار کا افسانہ معلوم ہوتا ہے! (مجھے ہمیشہ اس بات کی شرمندگی رہی ہے کہ انتہائی خوشی، یا گھبراہٹ کے باعث مجھے اس وقت شکریہ ادا کرنے، یا کوئی مناسب جواب دینے کے لیے الفاظ نہ ملے۔ میں نے دھیمی، پھنسی پھنسی آواز میں صرف یہ کہا کہ سر، وہ افسانہ میں نے ہی لکھا تھا۔ مرحوم بھی شاید میری مشکل کو سمجھ گئے۔ انھوں نے فرمایا، ’’بھئی افسانہ تو وہ تمھارا ہی تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس میں پختگی ایسی ہے جیسے بڑے افسانہ نگاروں کے یہاں ہوتی ہے۔‘‘)

اُردو میں وہ افسانہ کہاں چھپا مجھے یاد نہیں۔ ممکن ہے مجھے خبر بھی نہ لگی ہو کہ افسانہ چھپا کہ نہیں۔ (ایک بار تو لطیفہ یہ ہوا کہ کسی پرچے کو افسانہ بھیج کر عدم جواب کے باعث مایوس ہو گیا تھا لیکن ایک دن بازار سے سودا لینے گیا تو جس کاغذ میں سودا لپیٹا گیا تھا وہ اسی رسالے کا ایک ورق تھا، اور اس پر میرا افسانہ بڑی آب و تاب سے روشن تھا۔ وہ کاغذ بھی میں نے محفوظ نہ کیا۔) جب میں الٰہ آباد یونیورسٹی میں ایم اے کے آخری سال میں تھا (1954ء/1955ء) تو ایک دن میرے جی میں آئی کہ اگر افسانہ ’سرخ آندھی‘ اتنا ہی عمدہ ہے جتنا شمس الآفاق صاحب کہتے تھے تو اسے انگریزی میں ترجمہ کر کے یونیورسٹی میگزین میں کیوں نہ دے دوں؟ ایک بات یہ بھی تھی کہ میگزین کے ایڈیٹر میرے استاد کے کے مہروتر صاحب تھے میں جن کے مداحوں میں تھا۔ میں نے جھٹ پٹ ترجمہ کر کے افسانے کا انگریزی عنوان The Scarlet Tempest رکھا۔ ٹائپ وغیرہ کرنے کا تو سوال ہی نہ تھا، ہاتھ سے لکھ لکھا کر میں نے افسانہ ان کے حوالے کیا اور میری توقع کے بالکل خلاف انھوں نے بھی اسے پسند کیا اور اسی عنوان سے چھاپ دیا۔ بعد میں مجھے شیکسپیئر کے ایک ڈرامے میں Crimson Tempest کا فقرہ نظر آیا تو مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ عنوان کیوں نہ رکھا۔ بہرحال، اب میرے پاس اس افسانے کا نہ اُردو مسودہ ہے نہ انگریزی اور نہ ہی الٰہ آباد یونیورسٹی میگزین کا وہ شمارہ جس میں The Scarlet Tempest چھپا تھا۔

بات میں بات نکلنے کی وجہ سے میں پھر ذرا آگے چلا آیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا، انٹرمیڈیٹ پاس کرتے کرتے میں نے بہت کچھ انگریزی، تھوڑی بہت اُردو اور اس سے کچھ کم فارسی پڑھ ڈالی تھی۔ افسانہ نگاری کے شغف نے شاعری ترک کرادی تھی۔ شاعری ترک ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ابھی خود کو شعر کے رموز سے پوری طرح واقف نہ سمجھتا تھا۔ ہائی اسکول یا انٹرمیڈیٹ کی بات یہ ہے، میرے ایک دوست راشد نے شعر سنایا:

نشیلی نشیلی یہ آنکھیں تری کیوں
شراب محبت تو پی لی نہیں ہے

یہ یاد نہیں کہ اس نے یہ شعر اپنا بتا کر سنایا تھا یا کسی اور کا، شاید راشد ہی کا شعر تھا۔ بہرحال، مجھے شعر میں کوئی قباحت نظر نہ آئی، اگرچہ وہ مجھے کوئی بہت زوردار بھی نہ محسوس ہوا تھا۔ پھر اس نے وہ شعر ہمارے ایک مشترک دوست یامین کو سنایا۔ یامین بھاری بھرکم بدن کا، اور ہم لوگوں سے عمر میں بڑا تھا۔ شاید اسی لیے ہم لوگ اسے 'عقل کل' قسم کی چیز سمجھتے تھے۔ یامین نے چھوٹتے ہی کہا، ''یہ شعر بالکل واہیات ہے، اور اس میں سکتہ بھی ہے۔''

پہلے الزام کا تو کوئی جواب میرے پاس نہ تھا، الا یہ کہ مجھے تو اس میں کوئی واہیات پن نظر نہ آتا تھا، لیکن سکتہ ہونے کے بارے میں تو مجھے بے شک وشبہ پورا یقین تھا کہ شعر میں سکتہ کہیں نہیں، لیکن یامین صاحب تھے کہ اڑے ہوئے تھے کہ 'پی لی' پر سکتہ ہے۔ جب میں اور راشد پورے وثوق سے انکاری رہے کہ شعر میں سکتہ نہیں ہے، تو یامین نے بڑے اعتماد سے راشد کی کاپی سے ایک خالی ورق اور اپنی جیب سے پنسل کھینچتے ہوئے کہا، ''تم لوگ یوں نہ مانو گے۔ دیکھو صحیح وزن یہ ہے، اس پر مصرعے کی تقطیع کرو اور بتاؤ کہ مصرع صحیح اترتا ہے کہ نہیں۔'' پھر اس نے سادے صفحے پر بڑے بڑے حرفوں میں 'مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن' یا ایسے کچھ الفاظ لکھے اور کہا، ''لو، تقطیع کرو۔'' ظاہر ہے کہ یہ الفاظ ہمارے لیے جادو منتر سے بھی زیادہ نامفہوم اور پُراسرار تھے۔ تقطیع کیسے ہوتی ہے اور یہ الفاظ تقطیع کے کام کے ہیں بھی کہ نہیں، ہم دونوں اس باب میں معصوم تھے۔ مجھے یقین تھا کہ یامین محض جھانسا دے رہا ہے، لیکن میرے پاس اس کا توڑ کچھ نہ تھا۔ ہم ایک دوسرے کا منھ تکتے رہے اور یامین صاحب اکڑتے ہوئے نکل گئے۔ اس دن میں نے اپنے عروضی بننے کے ارادے کی تجدید کی، اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ جس طرح شوق اور محنت سے میں انگریزی ادب حاصل کر رہا ہوں،

اسی طرح ایک دن اُردو شاعری کے بھی فنون اور نکات سیکھوں گا۔

میں بہت چاہتا تھا کہ بی اے میں فارسی، یا کم سے کم اُردو ضرور لے لوں۔ ایک یہ بھی تمنا تھی کہ اُردو پڑھوں تو سینٹ اینڈ روز کالج (St. Andrew's College) میں نام لکھے گا۔ میرے باپ اور متعدد عم زاد وہاں پڑھ چکے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں مجنوں صاحب کی شاگردی کا اعزاز نصیب ہوگا۔ (مجنوں صاحب اُردو اور انگریزی دونوں پڑھاتے تھے۔) لیکن والد مرحوم کا خیال تھا کہ اُردو فارسی گھر پڑھنے کی چیزیں ہیں اور پھر یہ کہ اسکول کالج میں ملازمت حاصل کرنا ہو تو 'جدید' مضامین پڑھنے چاہییں۔ 'جدید' مضامین میں جغرافیہ بھی تھا، اور یہ سینٹ اینڈ روز میں تھا نہیں۔ لہٰذا انٹر کی طرح یہاں بھی مجھے 'غیر ادبی' مضامین پڑھنے پڑے اور سینٹ اینڈ روز کالج کے بجائے مہارانا پرتاپ کالج میں نام لکھانا پڑا۔ یہ کالج اُسی سال کھلا تھا اور ہم لوگ وہاں بی اے کے اولین طالب علم تھے۔ مجنوں صاحب کا شاگرد بننے کی حسرت ہی رہ گئی۔ انھیں دنوں مہدی افادی کے ایک صاحب زادے نافذ حسن بھی سینٹ اینڈ روز میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ان کی خوبصورتی، نفاست، جامہ زیبی اور اعلیٰ لیاقت کی بڑی دھومیں تھیں۔ ہم لوگ کبھی موقع نکال کر مجنوں صاحب یا نافذ صاحب کے کلاس سننے چلے جایا کرتے تھے۔ مجنوں صاحب خود بہت جامہ زیب تھے، لیکن وہ بہت منحنی سے، چھوٹے قد کے شخص تھے، اور نافذ صاحب چھریرے بدن کے، دراز قد، خود کو انتہائی لیے دیے رکھنے والے، اے آر خاتون کے کسی ناول کا کردار معلوم ہوتے تھے۔

مجنوں صاحب اور میرے والد صاحب انٹرمیڈیٹ یا شاید بی اے میں ساتھ رہ چکے تھے۔ عمر میں وہ والد صاحب سے بڑے تھے، لیکن کسی باعث تعلیم ترک کر دینے کی وجہ سے ان کا اور میرے والد کا ساتھ ہو گیا تھا۔ میرے عم زاد محمد عزیر فاروقی، جن سے میری بہن زہرا منسوب ہوئیں، مجنوں صاحب کے براہِ راست شاگرد تھے اور ان کی علمیت کے چرچے میرے بھائی صاحب کی زبان پر اکثر رہتے تھے۔ میری بڑی آرزو تھی کہ والد صاحب کے ساتھ مجنوں صاحب سے ملنے جاؤں، لیکن ایک دو بار سے زیادہ اس آرزو کا اظہار ان کے سامنے نہ کر سکا۔ والد صاحب نے ہر بار فرمایا: ''ہاں، کسی دن تم کو لے چلیں گے۔'' لیکن یہ خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ دفتری مشاغل میں والد صاحب کا انہماک اور پھر عبادات و وظائف میں ان کا توکل اس قدر تھا کہ انھیں کسی اور کام کی فرصت بمشکل ہی ملتی تھی۔

اس وقت تک میں مجنوں صاحب کے بہت سارے افسانے اور ناول (بلکہ ناولٹ) پڑھ چکا تھا اور

ہارڈی کے بھی اکثر ناول میری نظر سے گذر چکے تھے۔ اس وقت یہ بات بھی عام تھی کہ مجنوں صاحب کے بہت سے ناولٹ طبع زاد نہیں، بلکہ ہارڈی کی تحریروں کی تلخیص اور چربہ ہیں۔ ہارڈی کو پڑھنے کے دوران میں نے بھی یہ بات دیکھی تھی، لیکن مجھ پر اس کا کوئی منفی تاثر قائم نہ ہوا اور یہ بھی ہے کہ مجھے مجنوں صاحب کے مدافعین کی بھی یہ بات متاثر نہ کر سکی کہ مجنوں چونکہ کثرت سے مطالعہ کرتے ہیں لہٰذا ان کے مطالعے کا عکس ان کے افسانوں میں آجائے تو کیا عجب ہے۔ تو کیا اس کا مطلب ہے کہ دوسرے افسانہ نگار کچھ نہیں پڑھتے؟ میں اپنے دل میں سوچتا۔ مجنوں صاحب کے افسانوں کی نثر اور ان افسانوں کے کئی راویوں کی شخصیت کی کشش، دونوں ہی نے مجھے ایک مدت تک اپنے سحر میں مبتلا رکھا، لیکن مجھے یہ بات پورے یقین سے معلوم تھی کہ میں نے اگر افسانہ نگاری باقاعدہ اختیار کی تو بھی مجنوں صاحب کی طرز کا افسانہ نگار نہ بنوں گا۔

بی اے کے زمانے (1951ء/1953ء) میں میری ذہنی زندگی کا ملجا اور ماوا ہارڈی کے ناول تھے، اور مجھے اس بات کا بھی یقین واثق تھا کہ میں سات جنم لوں تو بھی ہارڈی جیسا ناول نگار نہیں بن سکتا۔ ادھر جماعت اسلامی کا لایا ہوا اخلاقی/مذہبی/اصلاحی رجحان بھی میرے لیے اپنی کشش کھو چکا تھا۔ ادب کے بارے میں ان لوگوں کا رویہ مجھے کمیونسٹوں کے ہی طریقے کا تنگ نظر، تقلید پسند اور تعمق سے عاری معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ترقی پسندوں کے لیے کمیونسٹ ''پارٹی لائن'' سب کچھ تھی اور 'ادارۂ ادب اسلامی' کے لیے جماعت کے احکام حدیث و قرآن سے کچھ ہی کم مرتبہ رکھتے تھے اور چونکہ جماعت کا دعویٰ تھا کہ حدیث و قرآن کی فہم صرف ہمارے پاس ہے، لہٰذا احکام جماعت کی تاویل و تعبیر میں دوسروں کے لیے کوئی اجتہاد بھی ممکن نہ تھا۔

اس صورتِ حال میں میرے لیے افسانہ نگاری ترک کرنے اور صرف تنقید اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، اور تنقید لکھنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ بی اے کا امتحان دے کر گرمی کی چھٹیوں میں شیکسپیئر کے تقریباً سارے ڈرامے میں نے پڑھ ڈالے۔ اس وقت شیکسپیئر سمجھ میں کتنا آیا، یہ تو اللہ ہی جانے، لیکن یہ حقیقت اب مجھ پر پوری طرح آشکار تھی کہ جماعت اسلامی کے 'ادارۂ ادب اسلامی' کے دروازے سے نہ ہارڈی گذر سکتا ہے، نہ شیکسپیئر۔ غالب کو بھی شاید در پر کھڑے رہنے کی اجازت کے سوا کچھ نہ ملے گا، اور بیچارے اقبال کا بھی بہت سارا کلام کاٹ پیٹ کر 'ادارہ' کی فائلوں میں دبا دیا جائے گا۔ میں ان لوگوں، اور خاص کر شیکسپیئر اور غالب، کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہ تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بی اے، پھر ایم اے کی پڑھائی اتنی فرصت کہاں دیتی کہ میں

ناول یا افسانہ نگار بننے کی سعی کرتا۔ ایم اے کے شروع میں ایک ناول ضرور لکھنا چاہا تھا، لیکن بیس ہی بائیس صفحات کے بعد دل اُکتا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جمیلہ نے اسے ناپسند کر دیا تھا۔

ایم اے کے دوران میں نے اپنی زندگی کا لائحۂ عمل یہ تجویز کر لیا تھا کہ کسی یونیورسٹی، ترجیحاً الٰہ آباد یا علی گڈھ میں انگریزی کا استاد بننا، انگریزی میں شاعری کرنا، اور اُردو میں تنقید لکھنا۔ اول الذکر کئی وجوہ سے ممکن نہ ہوا۔ انگریزی میں شاعری بہت لکھی، اور اپنے خیال میں اچھی لکھی مگر ایک دن یہاں سے بھی دل آپ ہی آپ ہٹ گیا۔ اس کے بجائے اُردو میں تھوڑی بہت شاعری کا سلسلہ ایم اے کے بعد پھر شروع ہوا۔ اُردو میں تنقید مَیں ضرور لکھتا رہا۔ اس زمانے کی بہت کم تحریریں شرفِ اشاعت حاصل کر سکیں۔ خواہ وہ مطبوعہ رہیں خواہ غیر مطبوعہ، میں نے انھیں محفوظ نہ رکھا۔ میرا خیال ہے کہ اپنے مسودات، مبیضات، یا مطبوعات کو احتیاط سے نہ رکھنے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں ان سے کبھی کلیتاً مطمئن نہیں ہوا۔ کتابی شکل میں جو چھپ گیا وہ تو محفوظ ہو گیا۔ باقی (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) کے بارے میں یقین سے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔

میرا یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ 1949ء/1950ء سے کوئی 1975ء تک میں انگریزی، اور انگریزی کے توسط سے دوسری یورپی زبانوں سے فکشن اور ڈرامہ کا بڑا پُرشوق طالب علم رہا۔ مطالعے کے اس شوق، اور اپنی ادبی زندگی کے بہت شروع میں بالالتزام افسانہ لکھنے کے باوجود میں نے 1952ء/1953ء کے بعد افسانہ کیوں نہ لکھا، اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہارڈی کے علاوہ بھی میں نے کئی مغربی ناول نگاروں کو ہمت شکن پایا اور ''آہو نہ چر سکیں گے اس شیر نر کے بن میں'' والی کیفیت مجھ پر مستولی رہی۔ اس کے برعکس، اُردو میں تنقید لکھنا میری نظر میں زبان کی خدمت تھا، اور شعر کہنا ایک گہری، ناقابلِ وضاحت، ذاتی مجبوری۔ شاعری میرے سینے میں سانس کی طرح اور دل میں خون کی طرح موجزن رہتی تھی اور جس طرح سانس کا باہر نکلنا دل میں دورانِ خون کی ضمانت تھا، اسی طرح شعر کہنا میرے لیے زندگی کی ضرورت اور دلیل تھا۔ شعر گوئی میرے لیے ''ہر نفسے کہ فرو می رود ممد حیات است و چوں بر می آید مفرح ذات'' والا معاملہ تھی۔

یہی لیل و نہار تھے کہ میں نے اپنا رسالہ نکالنے کی ٹھانی، اور چند مہینے کی تیاری کے بعد 'شب خون' کا پہلا شمارہ بابت ماہ جون 1966ء شائع کر دیا۔ یہ مئی 1966ء کا وسط تھا۔ پہلے ہی شمارے میں کئی چیزیں میں نے ایسی شامل کیں جو لکھی تو میں نے ہی تھیں، لیکن اس پر نام کچھ اور تھا۔ ان میں ایک نام 'شہرزاد' بھی تھا جسے

ایک بھیانک افسانے (Terror Story) کے مترجم اور بھیانک افسانے پر ایک تنقیدی نوٹ کے مصنف کی حیثیت سے پیش کیا گیا تھا۔ 'شہرزاد' کے بہت سے تراجم 'شب خون' میں شائع اور مقبول ہوئے۔ پھر ایک آدھ طبع زاد افسانہ میں نے 'جاوید جمیل' کے نام سے شب خون ہی میں لکھا۔ گویا افسانہ نگار بننے کا موقع مجھے دوبارہ ہاتھ آیا تھا، لیکن پھر بھی معاملہ زیادہ تر افسانوں اور ڈراموں کے تراجم تک محدود رہا۔ دو چار برس میں تنقید اور تبصرہ نے مجھے اس درجہ اپنا بنا لیا کہ افسانہ نگاری میری سوتیلی اولاد بھی نہ رہی۔ شاعری البتہ پروان چڑھتی رہی، اور کبھی کبھی دل بھی (دل ہی دل میں) سلیم احمد کی طرح یہ کہنے کی جرأت کر لیتا کہ شاعری اگرچہ میرا کمزور بچہ ہے، لیکن پھر بھی وہ ہاتھی کا بچہ ہے۔

گاہے گاہے میرے دل میں ہوک اٹھتی کہ ناول لکھا جائے۔ عبداللہ حسین اور انتظار حسین کے ناول پڑھ کر یہ امنگ اکثر دل میں موجزن پیدا ہوتی۔ لیکن فرصت کہاں اور ہمت کسے۔ ہوک اٹھتی اور میں دل کو یہ کہہ کر سمجھا لیتا کہ

ہوا رکے مرے پاؤں ذرا تھمیں اک روز
میں آستان و در کوئے یار دیکھوں گا

لیکن تنقید کی ہوا کہاں رکتی اور مجھے کب رُکنے دیتی۔ تنقید کے نئے نئے موضوعات، مطالعے کے نئے نئے میدان، سامنے آتے گئے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ صحت بھی گھٹتی رہی۔ تنقید اور اس کے ملحقات میری ادبی زندگی کا مرکز بن گئے، شاعری بھی مرکز میں، لیکن کم و بیش زیرِ زمین رہی۔ ناول تو کیا، اب چھوٹے موٹے افسانے کا بھی امکان افق کے نیچے اترتا جا رہا تھا۔ میرا عزیز بھائی نورالسلام مجھ سے کہتا کہ آپ ناول لکھیے، اور ہو سکے تو انگریزی میں لکھیے، بہت کامیابی ہوگی۔ لیکن مجھے ہنس کر چپ ہو جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔

بالآخر میں نے افسانے یا ناول کی طرف دوبارہ متوجہ ہونے کا خیال دل سے نکال ہی دیا۔ لیکن اتفاق سب سے بڑی مجبوری ہے کہ اس کے خلاف حفظِ ماتقدم نہیں ہو سکتا۔ 1997ء کا سال آیا تو غالبیات پر تازہ رنگ آیا۔ دسمبر 1997ء میں غالب کی پیدائش کو 200 برس ہو جاتے، اور 1969ء جیسی طوفانی، ولولہ افزا تقریبات نہ سہی، لیکن اس موقعے پر کچھ کرنے کا ارادہ سب نے کیا۔ الٰہ آباد کے ایک پرانے مصور ایچ سی مصرا کی بنائی ہوئی غالب کی ایک بہت ہی عمدہ تصویر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کے بچے کھچے کاغذات

سے ان کے نبیرہ سہیل صدیقی سلمہ نے مئی 1997ء میں مجھے عطا کر دی تھی۔ میں نے ارادہ کیا کہ کبھی 1997ء/1998ء میں 'شب خون' کا ایک شمارہ شائع کروں جس میں غالب سے متعلق کچھ واقعی عمدہ تحریریں ہوں۔

کئی مہینے کی کوشش کے بعد جب کچھ مضامین جمع ہوئے اور میں ستمبر 1998ء میں پرچہ ترتیب دینے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ پرچہ میرے حسب دلخواہ بننے میں کئی موانع ہیں۔ اوّل تو یہ کہ غالب پر صفحات بہت کم ہیں۔ دوسری مشکل یہ کہ جو مضمون میرے خیال میں سب سے اچھا تھا، وہ الٰہ آباد کے ایک نوجوان ہندی ادیب کرشن موہن کا تھا۔ یہ مضمون فہرست میں سب سے اوپر رکھے جانے کا حقدار تھا لیکن یہاں تقدیم وتاخیر کا نازک مقام آ پڑا تھا۔ اُردو فارسی کے دو بزرگ پروفیسروں کے مضامین کو مؤخر کرنا اور ہندی کے ایک ریسرچ اسکالر کی تحریر کو ان پر فوقیت دینا کچھ بے ڈھنگا سا لگتا تھا اور بعض لوگوں کی خفگی کا بھی موجب ہوتا۔ اب یہی صورت تھی کہ میں خود ہی غالب پر ایک لمبا چوڑا متن تیار کروں، اور جلد از جلد تیار کروں۔ ''شب خون'' کے صدقے ایسے مقامات مجھ پر پہلے بھی آ چکے تھے۔ اس بار لیکن مجملہ یہ تھا کہ میرا ذہن بالکل خالی تھا۔ غالب کے بارے میں جو کچھ اپنے خیال میں نئی باتیں مجھے گذشتہ سال ڈیڑھ سال میں سوجھی تھیں، میں انھیں ایک انگریزی اور ایک اُردو مضمون میں بیان کر چکا تھا۔ ہر چند کہ میں نے گذشتہ بتیس پینتیس برس میں غالب پر بہت لکھا تھا، لیکن کہی ہوئی باتوں کو دہرانا میرے لیے چبائے ہوئے نوالوں کو پھر چبانے کے برابر تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ غالب کے بارے میں افسانے اور حقیقت پر مبنی ایک بیانیہ کیوں نہ لکھوں، جس میں کچھ غالب سے متعلق ادب کے معاملات، کچھ اس زمانے کی ادبی تہذیب اور کچھ تاریخ، سب حل ہو کر یکجان ہو جائیں۔ میں کئی برس سے اُردو کی قدیم ادبی تاریخ اور تہذیب پر بیک وقت اُردو اور انگریزی میں کتاب لکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ ہماری پرانی ادبی تہذیب ہمارے حافظے اور علم سے تقریباً غائب ہو چکی ہے۔ اگر یہ وقت کی سطح کے نیچے اُتر کر ڈوب گئی تو ہمارا نقصان عظیم ہوگا، اور اس کی بازیافت تو خیر ممکن ہی نہ ہوگی۔ جن تہذیبوں کا ماضی نہیں، ان کا مستقبل بھی نہیں۔ اُردو ادب و تہذیب کو فراموش کر دینے، اسے پایۂ اعتبار سے ساقط تصور کرنے یا ساقط قرار دلوانے کی جو کوششیں ملک میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں (اور ان کوششوں میں ہمارے بھی بعض سر برآوردہ حلقے شریک ہیں،) ان کو دیکھتے ہوئے یہ اور بھی

ضروری ہے کہ ہم اپنے تاریخی حافظے کو زندہ رکھیں اور اپنی ادبی تہذیب کو جان دار، قائم رہنے والی، اور آج بھی بامعنی حقیقت کے طور پر پیش کریں۔

مالک رام مرحوم کا بے حد وثوق انگیز اور معلومات سے بھرپور افسانوی مضمون 'میرزا غالب، حالات، عادات، خصائل (مطبوعہ 'احوال غالب'، مرتبہ مختار الدین آرزو، 1953ء) میرے سامنے تھا۔ آرزو صاحب کی کتاب میں اس مضمون کے آخر میں درج ہے، 'نظر ثانی، جنوری 1951ء' میں نے یہ افسانہ/مضمون پہلی بار شاید اس کی اولین شکل ہی میں پڑھا ہوگا، کیونکہ کتاب تو میرے ہاتھ میں بہت تاخیر سے آئی۔ بہتوں کی طرح مجھے بھی مدتوں گمان رہا تھا کہ مالک رام صاحب جو بھی ہوں، لیکن انھوں نے غالب کے حالات چشم دید بیان کیے ہیں۔ جب بعد میں ان کے بارے میں ٹھیک سے جانا کہ وہ ہمارے ہی زمانے کے محترم اور معزز عالم ہیں، تو بھی اس افسانہ نما مضمون کا طلسم شکست نہ ہوا۔

مالک رام مرحوم کی طرح میں نے بھی اپنے افسانے کو واحد متکلم کی زبان سے بیان کرنے کی ٹھانی، لیکن اس خیال سے کہ مالک رام صاحب کی تحریر کا کوئی براہِ راست اثر میرے متن پر نہ پڑے، میں نے ان کا افسانہ/مضمون تو کیا، 'احوال غالب' بھی کھول کر نہ دیکھی۔ آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو کتاب نکال کر 'میرزا غالب، حالات، عادات، خصائل' پر ایک نظر ڈالی ہے اور مالک رام صاحب کی روح کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

اُردو کی حد تک تو مالک رام میرے پیش رو یا رہنما تھے۔ گیان چند نے بعد میں مرزا فرحت اللہ بیگ کے نیم تاریخی بیانیے ''دہلی کی آخری شمع'' کی طرف توجہ دلائی کہ فرحت اللہ بیگ کو اُردو میں ''ادبی/تاریخی'' افسانے کا موجد کہہ سکتے ہیں۔ میں اس بات سے متفق ہوں، لیکن فرحت اللہ بیگ کے متن کا اثر مجھ پر کوئی بہت گہرا نہ تھا۔ ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنا بیانیہ لکھتے وقت ''دہلی کی آخری شمع'' کہیں بھی جگہ میرے تحت شعور میں تھی۔

جس کتاب نے خالص افسانوی تکنیک کے لحاظ سے زمانۂ نوجوانی میرے ذہن پر گہرا اثر قائم کیا تھا وہ کلکتہ میں متولد مشہور انگریز ناول نگار ولیم میک پیس تھیکری (William Makepeace Thackeray, 1811-1863) کا تاریخی ناول The History of Henry Esmond تھا۔ یہ ناول 1852ء میں شائع ہوا تھا اور میں نے اسے ٹھیک سو سال بعد 1953ء میں ایم اے سال اول کے کورس میں پڑھا تھا۔ اس ناول

میں کئی باتیں میرے دل پر دیر پا نقش چھوڑ گئیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا راوی جگہ جگہ واحد متکلم کا صیغہ ترک کر کے واحد غائب کا طرز اختیار کر لیتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ناول کے واقعات اٹھارویں صدی میں پیش آتے ہیں، اور اس کی زبان بھی سراسر اٹھارویں صدی کی ہے۔ کیا لہجہ، کیا محاورہ، کیا جملوں کا آہنگ، کسی شے سے گمان نہ ہوتا تھا کہ یہ ناول اٹھارویں صدی کے نصفِ اوّل کی تصنیف نہیں ہے اور تیسری بات یہ کہ اس ناول میں بعض معاصر ادبی شخصیات، مثلاً سوئفٹ (Jonathan Swift) اور ڈاکٹر آربتھناٹ (Dr. Arbuthnot) کرداروں کی حیثیت سے پیش کیے گئے تھے۔ اگرچہ ان کی اہمیت ناول کے پلاٹ میں محض ضمنی تھی، لیکن پڑھنے والے کو لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی جیتا جاگتا ان سے ملا ہے۔

'ہنری ازمنڈ' کو میں نے سال 1953ء کے بعد دوبارہ نہ پڑھا، لیکن اس کا نقش دل پر اب تک روشن ہے۔ تھیکری نے اس ناول کے دیباچے میں ایک بات کہی تھی جو میرے دل کو بہت لگی۔ اس نے کہا کہ اس ناول کے ذریعے میں تاریخ کو ہیروؤں کی داستان کے بجائے مانوس کہانی (To make familiar rather than heroic) بنانا چاہتا ہوں۔ 'غالب افسانہ' اور اس کے بعد کے بھی سب افسانوں میں تھیکری کا ناول اور اس کی باتیں مہربان دوستوں کی طرح میرے رفیق ورقیب رہیں۔

جدید انگریزی ناول میں دو شخصیتوں کو میں نے فوری پیش رو کی طرح سامنے رکھا۔ بلکہ اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ادبی تہذیب اور ادبی تاریخ کو افسانے میں ڈھالنے کے امکانات کی راہ پر چلنے کی ہمت مجھے ان دو ناول نگاروں سے ملی۔ ایک تو مشہور خاتون ناول نگار اے ایس بائٹ (A.S. Byatt, born 1936) جس کا پورا نام اینٹونیا سوزن بائٹ (Antonia Susan Byatt) ہے، اور دوسرا پیٹر ایکرائڈ (Peter Ackroyd, born 1949) جو ناول نگار، نقاد، ادبی سوانح نگار، غرض کہ بہت کچھ ہے۔ بائٹ کے یہاں جو بات مجھے سب سے زیادہ متاثر کن لگی وہ یہ کہ اسے ادبی حوالوں، ادبی واقعات کی طرف اشاروں کو اپنے ناولوں میں بے تکلف اور بکثرت استعمال کرنے میں لطف آتا ہے اور جب اس کے جی میں آتی ہے وہ فن، مصوری، ادب کے بارے میں لمبی لمبی بحثیں بھی ناول میں ڈال دیتی ہے، اور پھر بھی ناول کامیاب معلوم ہوتا ہے۔ ایکرائڈ کے ناولوں، خاص کر Chatterton نے مجھے سکھایا کہ کسی ناول میں کوئی بڑا شہر کس طرح افسانہ جاتی اور مرکزی اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔

خیر 'غالب افسانہ' لکھتے وقت یہ سب باتیں میرے ذہن میں فعال نہ تھیں، کیونکہ اس وقت یہ توقع ہی نہ

تھی کہ میں اس طرح کے افسانے اور بھی لکھوں گا لیکن جب 'غالب افسانہ' میں نے لکھ لیا تو خود مجھے لگا کہ یہ تو کوئی بہت کامیاب متن بن گیا ہے۔ اس پر اپنا نام بطور مصنف دینے میں مجھے (اُس وقت) کئی قباحتیں (حقیقی یا مفروضہ) نظر آتی تھیں۔ بہت سوچ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ راوی اور مصنف کا نام ایک ہی ہے۔ پھر میں نے راوی کے بھی نام کئی سوچے۔ 'بینی مادھو رسوا' کا نام سب مجوزہ ناموں کا قرعہ ڈال کر نکالا گیا۔

ایچ سی مصرا کی بنائی ہوئی شبیہ غالب اور 'غالب افسانہ' دونوں بہت کامیاب ثابت ہوئے لیکن مجھے اب بھی یہ خیال نہ تھا کہ میرے اندر سویا ہوا افسانہ نگار جاگ اُٹھا ہے اور باہر آنے کے لیے دستکیں دے رہا ہے۔ اب یہ بالکل اتفاق ہی تھا کہ انھیں دنوں میں نے ایک خواب دیکھا، اور جب میں جاگا تو وہ خواب غیر معمولی طور پر پوری تفصیل کے ساتھ میرے حافظے میں موجود تھا۔ میرے بے ساختہ جی میں آئی کہ اس کو افسانہ بنا دوں۔ اکثر و بیشتر، بلکہ اکثر و بیشتر ہی کیوں، تقریباً تمام خوابوں کی طرح، اس خواب کا بھی انجام ادھورا اور بے اصولا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کے لیے ایک انجام متصور کیا۔ پھر اس انجام میں آپ ہی آپ افسانے یعنی Fiction کی عینی نوعیت اور نظری تنقید سے متعلق کچھ باتیں آگئیں۔ اس طرح 'لاہور کا ایک واقعہ' وجود میں آیا۔ اس میں پیلی گندی قمیص والے کے گھر میں در آنے اور پستول دکھانے تک کے واقعات من و عن میرے خواب پر مبنی ہیں، میں نے کچھ بڑھایا ہے نہ کم کیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ سب ایجادِ بندہ ہے۔

یہ بات بہر حال ہے کہ 'لاہور کا ایک واقعہ' لکھ کر مجھے بے حد طمانیت کا احساس ہوا تھا کہ افسانہ نگاری کی تھوڑی بہت صلاحیت جو مجھ میں ہے، قدرت اسے ضائع نہیں ہونے دینا چاہتی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے نام کی بھی دھن ہوئی۔ بوجوہ اپنا نام میں استعمال نہ کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں گیان چند نے کہا کہ آپ کا اپنے نام کو مخفی رکھنا بھی 'مشہوری' کا ایک طریقہ تھا، اور مشہوری آپ کو حاصل ہو چکی۔ اب اس نقاب کو اُتار پھینکیے۔ واقعہ یہ ہے کہ نام چھپانے میں بعض مصلحتیں تھیں، جن کا ذکر ابھی کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔ 'مشہوری' میرا مقصد ہرگز نہ تھا۔ اب یہ اور بات کہ جہاں افسانے زیرِ بحث آئے وہاں اس نام پر بھی طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوئیں۔ 'بینی مادھو رسوا' کا نام اپنے وقت، اپنی تاریخ اور غالب کے ساتھ اس طرح منسلک ہو چکا تھا کہ اسے پھر بروئے کار لانا یقیناً غیر مناسب تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بہت سے پڑھنے والوں نے 'غالب افسانہ' پڑھ کر کہا، یا 'شب خون' کو لکھا کہ دو ہی شخص اس کے مصنف ہو سکتے ہیں، نیر مسعود، یا شمس الرحمٰن فاروقی۔ گیان چند، خود نیر مسعود، عرفان صدیقی، اور بہت سے دوستوں نے کہا کہ اس افسانے کا مصنف شمس الرحمٰن فاروقی کے سوا کوئی

نہیں ہوسکتا۔ اس پس منظر میں مجھے اور بھی ضروری معلوم ہوا کہ میں کوئی اور نام اختیار کروں۔

سوچتے سوچتے، عمر شیخ مرزا، میرے ذہن میں گونجا، اور دل نے فوراً ہی کہا کہ اس سے اچھا نام ممکن نہیں۔ عمر شیخ مرزا میں تاریخ اور اسرار اور مہم جوئی کی گونج تھی، فاصلے کا لطف تھا، اور اس نام کا آہنگ، 'عمر شیخ' تک اس کی اُٹھان، اور پھر 'مرزا' کے رقیق ولطیف مصمتوں کے ذریعے اُتار، خود ایک مصرعے کا حکم رکھتا تھا۔ یہ نام فعولن فعولن کے وزن پر پورا بھی اُترتا تھا اور پھر اس میں میرے جد امجد کے نام نامی کی جھلک بھی تھی۔ بس میں نے 'لاہور کا ایک واقعہ' پر 'عمر شیخ مرزا' لکھ کر اسے 'شب خون' میں اشاعت کے لیے دے دیا۔ پھر اسے اور 'غالب افسانہ' اپنے دوست اجمل کمال کو کراچی بھیج دیا کہ چاہیں تو 'آج' میں چھاپ لیں۔ ان پر میں نے مصنف کی حقیقت ظاہر کر دی تھی، اس درخواست کے ساتھ کہ ابھی اسے صیغۂ راز میں رکھا جائے۔

'لاہور کا ایک واقعہ' فوری طور پر 'افسانہ غالب' کے بقدر کامیاب نہ ہوا، شاید اس لیے کہ اس افسانے میں ادبی تاریخ اور تہذیب کی گونج مدھم تھی۔ پھر بھی، آہستہ آہستہ اس کا لطف کئی دوستوں پر واضح ہوا۔ میرے قریبی لوگوں میں جو بھی اس بات سے واقف تھا کہ ان افسانوں کا مصنف میں ہوں، اس نے باصرار کہا کہ اب آپ 'میرا افسانہ' لکھیے۔ میں ٹال مٹول کرتا، کہ ابھی ذہن میں کوئی بات بن نہیں رہی ہے۔ (تنقیدی مضمون کی طرح افسانہ بھی میں اس طرح لکھتا ہوں کہ کئی کئی پیراگراف پہلے دل ہی دل میں لکھ لیتا ہوں۔ یہ عمل تحریر کے پہلے شروع ہو کر تحریر کے دوران جاری رہتا ہے۔) لیکن افسانے تو مجھے اب لکھنے ہی تھے، اور اسی لے اور اسی آہنگ کو قوی تر کرتے ہوئے لکھنے تھے جن کا نمونہ 'غالب افسانہ' میں سامنے آیا تھا۔

اٹھارویں صدی کو میں ہند اسلامی تہذیبی تاریخ کا زریں باب سمجھتا ہوں۔ اُردو فارسی ادب، تصوف، علوم عقلیہ ونقلیہ، فنونِ حرب وضرب، موسیقی، ان میدانوں میں اٹھارویں صدی والوں نے جو نئے نئے مضمار وبیدا دریافت کیے اور فتح کیے، ان کی مثال پہلے نہیں ملتی، بعد میں ملنے کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں اور اٹھارویں صدی کی دہلی کا کوئی کیا حال لکھے۔ ہم لوگ چند شہر آشوبوں، چند ہجوؤں، تعصب اور کینہ پر مبنی چند افسانوں کو تاریخ قرار دے کر اٹھارویں صدی کی دہلی کو زوال، انتشار، بدامنی، طوائف الملوکی، امیروں کی مفلسی اور غریبوں کی فاقہ کشی کا شہر سمجھتے ہیں۔

سو برس کی مدت کم نہیں ہوتی، اور بے شک اس مدت میں دلی کئی بار لٹی اور اجڑی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سارے سو برس وہاں اُلّو ہی بولتے رہے تھے۔ 'مرقع دہلی' کو بہت کم لوگوں نے پڑھا ہے۔ لیکن

جنھوں نے پڑھا بھی ہے وہ اکثر یہی کہتے ہیں کہ درگاہ قلی خان کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی کے نصفِ اوّل کی دلّی محض راگ رنگ اور عیاشی کی آماج گاہ تھی۔ علومِ عقلیہ ونقلیہ، تصوف اور فنون و حرفت کی گرم بازاری انھیں درگاہ قلی خان کے بیان میں نظر نہیں آتی اور جس نے جعفر زٹلی کی ایک آدھ ہجو یہ نظم پڑھ لی، اس نے تو گویا اس بات کو جان و ایمان بنا لیا کہ فرخ سیر کے زمانے میں ہی دلّی کا بیڑا غرق ہو چکا تھا۔

خیر، 'مرقع دہلی' اور جعفر زٹلی کے کلام سے کتنے لوگ واقف ہوں گے؟ یہی دو سو چار سو۔ اُردو والوں کے سوادِ اعظم کے لیے تو (مثلاً) شاہ عالم ثانی کے بارے میں یہی سچی تاریخ ہے کہ اس زمانے میں لوگ کھلے عام 'مملکت شاہ عالم از دہلی تا پالم' کہتے تھے۔ مؤرخین جانتے ہوں گے کہ یہ کہاوت مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے بارے میں نہیں، بلکہ کسی اور ہی شاہ عالم کے بارے میں ہے۔ عام لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کہاوت ہمارے شاہ عالم آفتاب کے بارے میں ہے اور شاہ عالم آفتاب کی تصنیف کردہ داستان 'عجائب القصص' کتنے لوگوں نے پڑھی ہے؟ جو پڑھیں گے وہ جانیں گے کہ اس داستان میں اعلیٰ درجے کی علمیت اور ذہانت اور قوتِ حافظہ کا اظہار ہوا ہے۔

بچارے شاہ عالم کے بارے میں ہماری زیادہ تر معلومات کا سرچشمہ 'آبِ حیات' ہے۔ محمد حسین آزاد کے جادو نگار قلم نے شاہ عالم کو بادشاہ کے بجائے ایک فلاکت زدہ اندھا اور ہر طرح کے وقار و ادب سے عاری مفلس بوڑھا بنا کر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> دہلی میں اگرچہ بادشاہ اس وقت فقط شاہ شطرنج تھا، یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ ساتھ غلام قادر نابکار نقد بصارت تک بھی لے گیا تھا مگر یہ (سید انشا) اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال لیتے تھے مثلاً جمعرات کا دن ہوتا تو باتیں کرتے کرتے دفعتاً خاموش ہوتے اور کہتے: ''پیر و مرشد، غلام کو اجازت ہے؟'' بادشاہ کہتے۔ ''خیر باشد۔ کہاں؟ کہاں؟'' یہ کہتے، ''حضور، آج جمعرات ہے، غلام نبی کریمؐ جائے۔ شاہِ دین و دُنیا کا دربار ہے، کچھ عرض کرے۔'' شاہ عالم بہ ادب کہتے، ''ہاں بھئی، ضرور چاہیے۔ سید انشاء اللہ خاں، ہمارے لیے بھی کچھ عرض کرنا۔'' ایک لمحے کے بعد پھر یہ کہتے کہ ''پیر و مرشد! پھر غلام کو اجازت ہو۔'' بادشاہ کہتے کہ ''ہیں اے بھئی

میر انشاء اللہ خاں، ابھی تم گئے نہیں؟'' یہ کہتے، ''حضور بادشاہ عالی جاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیوں کر جائے۔ کچھ نذر و نیاز، کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو!'' بادشاہ کہتے، ''ہاں بھئی درست، درست! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔'' جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ میر انشاء اللہ خاں لیتے اور ایک دو فقرہ دعائیہ کہہ کر پھر کہتے کہ ''حضور دوسری جیب میں دست مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے، کیونکہ وہاں سے پھر کر بھی تو آنا ہے۔'' بادشاہ کہتے، ''ہاں ہاں بھئی، سچ ہے، سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لا کر دو۔ بال بچے کیا جانیں گے کہ تم آج کہاں گئے تھے۔'' اگرچہ ان فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے، لیکن پھر کب تک؟

ملاحظہ فرمائیے، یہاں شاہ عالم ایک سادہ لوح، ادبار زدہ، نکبت میں گرفتار، عملاً بے دست و پا زمیندار ہے، اور سید انشا ایک چالاک، حیلہ ساز، خودغرض مصاحب جو اپنے مربی کو بے وقوف بناتا، اور اسے مفلس سے مفلس تر بنانے سے کچھ دریغ نہیں کرتا۔ اب میں آپ کے سامنے کسی ہندوستانی نہیں، بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ایلچی تھامسن ٹوائننگ (Thomson Twining) کے سفرنامے سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ ٹوائننگ نے نومبر دسمبر 1794ء میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ (ماخوذ از، شاہجہاں آباد کی سیاحت، از تھامسن ٹوائننگ، تلخیص و ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر)

لاہور دروازے سے یہ (ایلچی کا) جلوس قلعۂ معلیٰ میں داخل ہوا۔ آگے بعض عہدہ داران کھڑے تھے۔ وہ اس جلوس کو فیل خانے کے بڑے چوک کے راستے سے آگے لے گئے۔ یکے بعد دیگرے چوک آئے، آخر میں بعض دوسرے عہدہ دار آئے جن کے شاندار لباسوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑے منصب دار تھے۔

اب مہمان موصوف (ٹوائننگ) اپنی سواری سے اُتر گئے۔ انھیں سید رضی خان اور میر منشی کی رہنمائی میں دیوان عام کی طرف لے جایا گیا۔ یہ ایک عالی شان عمارت تھی، جس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے دالان تھے۔ یہ عمارت بہت عمدہ تھی۔ ان دالانوں سمیت ایک وسیع مربع نماشہ نشین تھی۔ اس کے نیچے سنگِ مرمر کا خوبصورت فرش تھا۔ یہ مقام تھا جہاں وزیر مملکت بادشاہ کی حضوری میں کھڑا ہوتا تھا۔

فرمائیے، اس ہجوم میں، یا اس مقام پر آپ کو سید انشا کہیں دکھائی دیے، اور کیا آپ یہاں نابینا بادشاہ کو چھوٹے موٹے بے سہارا بوڑھوں کی طرح مجبوراً جیب میں ہاتھ ڈالتے اور انشا کے لیے چند حقیر سکے نکالتے دیکھ سکتے ہیں؟ مزید سنیے:

> ..اس کے بعد ایک دوسرے بڑے ہال یعنی دیوانِ خاص میں مہمان موصوف کو لے جایا گیا۔ دیوانِ عام کے مقابلے میں یہ عمارت کہیں زیادہ عظیم الشان اور خوبصورت تھی۔ لیکن بلاشبہ حالیہ تباہی و بربادی کے نقوش نمایاں تھے ..... اس عمارت کے ستون سفید سنگِ مرمر کے تھے اور ان میں بیش قیمت عقیق جڑے ہوئے تھے ... نہایت درجہ منقش چھت، مرصع اور خوبصورت ستونوں پر آویزاں ہوئی تھی جس پر بہت نازک فن کارانہ گل کاری تھی جن میں طلائی آرائش مخلوط تھی.....
>
> ... محل کے بعض عہدہ دار زرق برق لباس میں ملبوس سامنے آئے اور آداب بجا لائے۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ سلامت تسبیح خانے میں جلوہ افروز ہو چکے ہیں.....
>
> .... یہاں سے آگے بڑھ کر وہ لوگ ایک بڑے اور وسیع چبوترے کے سرے پر پہنچے. .... آگے بڑھنے پر انھیں لوگوں کی دو قطاریں نظر آئیں۔ یہ بظاہر امیروں پر مشتمل تھیں جب ذرا اور آگے بڑھے تو ایک وسیع گوشہ تھا جو محل سے ملحق تھا، جہاں بہت سے لوگ زرق برق لباس پہنے ہوئے کھڑے تھے......
>
> ......وہ معمر بادشاہ کے قریب پہنچ گئے جو مشرقی انداز میں سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں سمت اور عقب میں ریشمی گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان کا سہارا نہیں لے رہے ہیں۔ حالانکہ بادشاہ کی عمر اکہتر سال کی تھی، لیکن حاضرین میں بظاہر وہ سب سے زیادہ قد آور اور قوی معلوم ہو رہے تھے...... اس وقت وہ نابینا تھے۔ لیکن بادشاہ کو دیکھنے میں بظاہر کسی کراہیت کا جذبہ نہیں ابھرتا تھا، کیونکہ (اندھے پن کی) ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی۔ صرف ان کے پپوٹے دھنسے ہوئے تھے۔

مزید تفصیلات کو چھوڑ کر اب صرف یہ بیان سن لیجیے کہ ایلچی کے لیے شاہی مطبخ سے کھانا بھیجا گیا تھا۔ اسے بیس آدمی بڑی بڑی دیگوں میں بہنگیوں پر لاد کر لائے تھے۔ ''داروغہ مطبخ کے ہمراہ رقاصائیں اور سازندے بھی آئے تھے۔ وہ رقاصائیں بہت عمدہ زرق برق لباسوں میں ملبوس، اور زیوروں سے آراستہ پیراستہ تھیں۔'' آخر میں ٹوائننگ کا یہ قول بھی ملاحظہ کر لیں کہ اگر شاہ عالم کی تخت نشینی عام حالات میں ہوئی ہوتی، یا اس کے مصاحب اور مشیر لائق اعتماد ہوتے تو اسے ''اپنی ہمت، صلاحیتوں اور اوصافِ حمیدہ کے اعتبار سے اپنے خاندان کے ممتاز ترین حکمرانوں کی صف میں جگہ ملنی چاہیے تھی۔''

میں اس دلّی کا دلدادہ تھا، کیوں کہ اُردو کی ادبی تہذیب صحیح معنی میں اپنا رنگ اور طور طریق محمد شاہ اور احمد شاہ اور پھر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں حاصل کرتی ہے۔ سیاسی قوت اس شہر کی بھلے ہی گھٹ گئی ہو، لیکن اس کی تہذیب زوال آمادہ اور انحطاط آلودہ نہ تھی، اور دس بار لٹنے کے بعد بھی اس شہر کی گلیوں میں بھیرو نہیں، بلکہ اس زمانے کی حسین ترین رقاصائیں ناچتی پھرتی تھیں۔ دلّی کا چھوٹا سا پیکر آصف الدولہ کے وقت سے لے کر واجد علی شاہ کے عہد کا لکھنؤ تھا۔ لیکن افسوس کہ لکھنؤ کی تصویر ہمارے ذہنوں میں پریم چند کے افسانے اور ستیہ جیت رائے کی فلم نے بنائی ہے، ٹھوس تاریخ نے نہیں۔

دلّی کا حق تھوڑا بہت ادا کرنے کے لیے میں نے پہلے میر کے بارے میں افسانہ نہیں لکھا۔ بلکہ 'سوار' لکھا۔ میرے اپنے حساب سے اس افسانے کا مرکزی کردار خود شہر دہلی ہے کہ جس کے بغیر نہ وہ پُراسرار سوار ہوتا، نہ بدھ سنگھ قلندر، نہ عصمت جہاں، اور نہ افسانے کا راوی مولوی خیر الدین۔ ان سب کی شخصیتیں دلّی کی شخصیت کا ذرا ذرا سا ٹکڑا ہیں۔ پھر ''سوار'' کے بعد مجھے ''اُن صحبتوں میں آخر'' لکھنا ہی تھا اور وہاں بھی، جیسا کہ بہت سے پڑھنے والوں نے محسوس کیا، صرف میر نہیں ہیں۔ اس کے بعد 'آفتاب زمیں' آتا ہے، جس میں دہلی کی جھلک بھی ہے، اور دہلی کی اولاد معنوی، یا اس کے جانشین کے طور پر لکھنؤ دھیرے دھیرے خود کو قائم کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے شجاع الدولہ اور سعادت علی خان کا خونِ گرم برقِ خرمن بن گیا۔ اس کی طرف کچھ اشارے 'غالب افسانہ' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان افسانوں کو میری دور ترین توقعات سے زیادہ پذیرائی ملی۔ ان کے واقعات، ان کی زبان، ان کی فارسیت، ان میں بیان کردہ تہذیبی اور تاریخی معلومات، ان کے کردار، سب ہی کو خوردبینی آنکھ سے دیکھا گیا۔ میں اسے اپنی کامیابی سے زیادہ اہلِ اُردو کی کامیابی سمجھتا ہوں کہ انھیں اپنی ادبی تہذیب کے مظاہر سے لگاؤ

ہے، اور وہ اپنے تاریخی اور ثقافتی حافظے کو گنوانا نہیں چاہتے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ مجھے بھی اس خدمت کے لیے دعائے خیر سے یاد کریں گے۔

گر گفتہ ای ز عشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتے ست کہ از من شنیدہ ای

شمس الرحمٰن فاروقی

الہ آباد، ستمبر 2000ء

غالبؔ افسانہ

گفتن سخن از پایۂ غالب نہ زہوش است
امروز کہ مستم خبرے خواہم ازو داد

میرزا غالب، دیوان غزلیات فارسی

غالبؔ افسانہ

میں نسلاً راجپوت اور مولداً نظام آباد، ضلع اعظم گڈھ کا ہوں۔ اعلیٰ حضرت مہابلی خلد آشیانی کے وقتوں میں بلیا اور اس کے اطراف کے بھومی ہاروں نے کچھ شورش کی تو ان کی سرکوبی کے لیے افواج شاہی علاقۂ پٹیالہ، جے پور، اور جھنجھنو سے بھیجی گئیں۔ ان میں بہت سے راجپوت، پٹھان، اور سید بھی تھے۔ شورش تو بہت جلد فرو ہوگئی، لیکن فوج کے سواروں، نفروں اور بعض رسالداروں کو بھی پورب کے یہ علاقے اتنے پسند آئے کہ اکثر ہم یہیں بس رہے۔ سرائے رانی، سنجر پور، خراسان (جسے اب خراسوں کہتے ہیں)، سرائے میر.... یہ مواضعات اسی زمانے میں آباد ہوئے۔ نظام آباد البتہ قدیم الایام سے موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جیوشِ اکبری کے ساتھ آنے والوں میں کچھ میرے بھی اجداد تھے، جنھوں نے نظام آباد میں سکونت اختیار کی لیکن ہمارے گھرانے کو اصل فروغ تب ملا جب شہنشاہِ ہندوستان و دکن، اعلیٰ حضرت محی السنۃ والدین، فردوس مکانی اورنگ زیب عالم گیر کے مبارک دور دورۂ سلطانی میں اعظم خان اور عظمت خان دو بھائیوں کو دستک شاہی کے ذریعے ان اطراف کی جاگیر وطنی تفویض ہوئی۔ اعظم خان نے اعظم گڈھ آباد کیا اور عظمت خان نے اعظم گڈھ سے کوئی دس کوس شمال مغرب میں عظمت گڈھ۔ اعظم خان کے سوار و منصب داروں میں سے کچھ بے شک میرے اجداد تھے جو علاقۂ پنجاب سے اٹھے تھے اور یہاں نظام آباد میں آبسے۔

ہم لوگ ہے ہے بنس کے چندر بنسی راجپوت ہیں۔ جنگ و جدل کے علاوہ علم و ہنر بھی ہمارے گھرانے کی پہچان رہا ہے۔ فردوس آرام گاہ و اعلیٰ حضرت روشن اختر محمد شاہ بادشاہ غازی کے عہد سعادت بنیاد میں زمین واملاک کے جھگڑے اٹھے تو ہمارے ایک بزرگ نے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لی اور یہ علیحدگی اتنی شدید ہوئی کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے اخلاف بھی مسلمان رہے، اور بحمد اللہ اب بھی کہیں جو احیا ہیں، مذہب اسلام کے پیرو ہوں گے۔ میرے جدّ اعلیٰ اپنے قدیمی مسلک پر رہے، اور میں بھی ایشور کی کرپا سے اسی پر قائم ہوں۔ اپنے مسلمان بھائیوں سے ہمارا ربط آہستہ آہستہ پھر استوار ہوا تو ملنا جلنا، ریت رسم، یہاں تک کہ ایک آدھ بار تو شادی بیاہ کے بھی مراسم بن گئے۔ ایسے موقعوں پر تلوار تک چلنے کی نوبت آ گئی، لیکن مرور ایام کے ساتھ سب برابر ہو گیا۔

ہمارے دادا نے اسلحہ سازی کا کام شوقیہ اختیار کیا۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کو اپنے اسلحہ کے بارے میں ویسا ہی علم و اعتماد رکھنا چاہیے جیسا اپنی اولاد یا بیوی کے بارے میں ہوتا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ اپنا اسلحہ خود بنانے سے بہتر کوئی طریقہ اپنے ہتھیار کو جاننے اور سمجھنے کا نہیں ہے۔ اوّل اوّل تو وہ قدیم انداز کے تیغ، جمدھر اور شیر پنجے ہی بناتے تھے، لیکن ایک عیسائی پادری کے طعنہ دینے پر کہ تم ہندوستانی لوگوں کو ہمارے ہتھیار بنانا مشکل ہے، انھوں نے طرح طرح کی قرابینیں، دگاڑے اور کچھ بھی بنانے شروع کر دیے اور اس فن میں وہ اس قدر کامیاب ہوئے کہ کمپنی بہادر کے سپاہی اور اطراف کے ڈکیت دونوں ہی بڑی قیمت دے کر ان سے ہتھیار مول لے جاتے تھے۔ میرے باپ کا زمانہ آتے آتے ہمارا پیشہ اسلحہ بازی کے بجائے اسلحہ سازی ہو گیا۔

ہمارے قصبے نظام آباد کے بعض تال تلیوں میں ایک خاص قسم کی سیاہ مٹی نکلتی ہے۔ اس کے برتن بہت اچھے بنتے ہیں، اور دور دور دساور کو جاتے ہیں۔ ایک کمھار کا بیٹا میرا دوست بن گیا تو میں نے بابو جی قبلہ سے چوری چھپے اس کا فن بھی سیکھ لیا۔ کیا معلوم تھا کہ ایک دن اس ہنر سے مجھے کچھ تمتع بھی ہو سکے گا۔

ہمارے گھرانے کی دونوں شاخیں اعظم خان اور عظمت خان کی اولادوں، اور اس طرح آل تیمور کے فرماں رواؤں کی خدمت کو اپنا دین و ایمان جانتی تھیں۔ بکسر کی جنگ (1764ء، مرتّب) میں بکسر یے تو دونوں طرف سے لڑے تھے، کہ کچھ کرائے کے ٹٹوؤں کے طور پر کمپنی بہادر کے جھنڈے تلے تھے، اور کچھ ایسے تھے جو حضور فیض گنجور اعلیٰ حضرت شاہ عالم ثانی شہنشاہ ہند، اور نواب وزیر کی فوجوں میں تھے۔ لیکن ہمارے

گھرانے کے جتنے لوگ اس جنگ میں شریک تھے، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے سب اعلیٰ حضرت کے لوائے سطوت وسلطنت کے ہی سائے میں تھے۔ اس جنگ میں ہمارے دونوں گھرانوں کے اکیس سورماؤں نے جامِ شہادت نوش کیا۔

بکسر کے بعد بھی ہماری وفاداری اعلیٰ حضرت اور نواب وزیر سے رہی۔ لیکن خود عالی جناب جنت مآب شاہِ عالم ثانی نے بہار اور بنگال کی دیوانی کمپنی بہادر کو سونپ دی، اور نواب وزیر اس کے چند برس بعد اللہ کو پیارے ہوئے۔ جنت مآب اپنی تمام خوبیوں اور حکمت عملیوں کے باوجود انگریز کے جال سے نہ نکل سکے۔ مراٹھا سردار مہاداجی نے انھیں الہٰ آباد سے نجات دلائی اور ان کا وکیل مطلق بن کر راج کرتا رہا۔ ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی موت کے بعد جنت مآب ملکی سیاست کے نقشے پر بے اثر ہو گئے۔ مراٹھا کے مرنے کے بعد انگریز کو پھر موقع ملا تو اس نے اعلیٰ حضرت کو اپنی 'حفاظت' میں لے لیا۔

لکھ لٹ نواب وزیر آصف الدولہ مبرور عدن مقام کے زمانہ مسعود و محفوظ تک تو ہم اودھ کے زیرِ پرورش اور زیر نگیں رہے۔ لیکن وزیر علی خان مغفور کو ہٹا کر مرزا منگلی مرحوم جنت آرام گاہ کو مسندِ وزارت دلانے میں خان علامہ اور دوسروں نے جو دُکھ اُٹھائے اور اٹھوائے، ان میں اودھ کے آدھے علاقے کا تحویل وزارت سے نکل کر انگریزوں کے چنگل میں جاتا بھی تھا۔ اس طرح ہم لوگ لفظاً و معناً قیدِ فرنگ میں آ گئے۔ دلوں میں دھیمی دھیمی آگ سلگتی رہی، لیکن ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

خان علامہ اور میرے دادا میں پرانی ملاقات تھی، اور وجہِ ملاقات وہی اسلحہ سازی۔ علامہ موصوف کو میرے دادا کی بنائی ہوئی گھپڑیں بہت پسند تھیں۔ وہ انھیں منگوا کر اپنے انگریز دوستوں کو نذر کرتے تھے۔ 1798ء کے اواخر میں بڑے لاٹ کے دربار میں نواب وزیر کی طرف سے عہدۂ وکالت سنبھالنے کی غرض سے کلکتہ جاتے ہوئے خان علامہ اپنے بعض اعزا اور میرے دادا جان سے ملنے اعظم گڈھ بھی آئے تھے۔ دادا نے انھیں حسبِ سابق اپنی بنائی ہوئی ایک گھپڑ اور ایک قرابین پیش کیں لیکن اس بار انھوں نے تھوڑی رنجش کا بھی اظہار کیا کہ خان علامہ نے سعادت علی خان کو نواب وزیر بنوانے میں یہ بھی خیال نہ کیا کہ الہٰ آباد سے لے کر بریلی تک کتنا بڑا علاقہ انگریز کے ہاتھ میں دلوا دیا گیا۔ خان علامہ نے فرمایا ''بھوانی سنگھ وہ چند ضلعے دے کر میں نے اودھ کو بچا لیا۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ اودھ کیا سارا ملک ہند ہی کلکتہ کو دہلی مان لے گا۔''

میری پیدائش 1840ء کی ہے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ دستور کے مطابق مجھے آلات

حرب وضرب کے علاوہ قلم کا بھی ہنر سکھایا گیا۔ میں نے گھر پر فارسی، عربی اور تھوڑی بہت ریاضی سیکھی۔ پھر مولانا فاروقی چریاکوٹی کے ایک شاگرد کے مدرسے میں باقاعدہ تعلیم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ میری پیدائش سے تین سال پہلے 1837ء میں اعظم گڈھ میں کچھ پادریوں نے ایک انگریزی اسکول کھولا تھا، ویزلی اسکول کے نام سے۔ (ویزلی اسکول ایک مدت سے ویزلی انٹر کالج ہو گیا ہے اور اپنی پرانی جگہ پر اب تک موجود ہے، مرتب۔) میرے والد کے ایک دوست جو کمپنی بہادر کی نوکری کر چکے تھے، مُصر ہوئے کہ بنی مادھو کو انگریزی پڑھواؤ، کہ اسی میں اب کاروبار ملکی ومالی وفوجی چلے گا۔ اس کی روز روز کی ضد سے تنگ آ کر میرے قبلہ نے میرا نام وہاں لکھا ہی دیا۔ اس وقت میری عمر کوئی دس برس کی تھی۔

انگریزی مدرسے میں فارسی انگریزی، ریاضی اور تاریخ وغیرہ کے ساتھ ساتھ کرشٹان مذہب کی باتیں، اور ایک نئی چیز اور پڑھوائی جاتی تھی، جسے وہ لوگ 'ہندی' کہتے تھے۔ یہ تھی تو وہی ہندی جسے ہم گھروں میں بولتے تھے، لیکن اسے سنسکرت حروف میں لکھا جاتا تھا، اور اس میں ہماری ہندی کے میٹھے، رواں لفظوں کی جگہ خدا جانے کہاں کہاں کے لفظ بھر دیے گئے تھے۔ مجھے وہ زبان بڑی عجیب سی لگی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ بڑا ہو کر ریختہ لکھوں گا، ہندی کا شاعر بنوں گا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس نئی 'ہندی' میں حضرت میر تقی میر اعلی اللہ مقامہ اور قبلہ میر ببر علی صاحب انیس کی طرح کا کلام کیونکر ممکن ہو سکے گا۔ میں نے بعض ماسٹر صاحبان کو یہ بھی کہتے سنا کہ 'ہندی' ایک الگ زبان ہے۔ یہ ہندوؤں کی زبان ہے، مسلمانوں کی زبان ریختہ یا اُردو کہلاتی ہے۔

اس اسکول میں کچھ ایسے بھی بچے تھے جن کی وہاں کے اساتذہ میں بڑی آؤ بھگت تھی۔ چہرے بشرے، اور چال ڈھال سے تو وہ ہمارے ہی جیسے تھے، اگرچہ ذرا نیچی ذات کے، لیکن ان کے نام عجیب تھے، آدھے ہندوستانی اور آدھے کرشٹانی۔ مثلاً ایک لڑکے کا نام تھا سیموئل سنگھ۔ ایک اور لڑکا تھا، اس کا نام تھا لارن داس (بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اصل میں یہ لارنس داس تھا۔) ایک اور لڑکا جو ہم میں سب سے بڑا تھا، جان مسیح الدین کہلاتا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں کا اچھا تھا اور موقع بے موقع ہم لوگوں کو پیٹنے سے گریز نہ کرتا تھا۔ یہ سب لڑکے کوئی چیز بپتسمہ ہوتی تھی وہ کرا کے کرشٹان ہو چکے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ بپتسمہ بھی ختنے کی قسم کی کوئی رسم ہوتی ہوگی لیکن پھر پتا چلا کہ اس میں کسی متبرک پانی کے چھینٹے دیے جاتے ہیں۔

خیر، ان لڑکوں میں ہم لوگوں کے خلاف ایکا بہت تھا اور وہ کوشش کر کے ہم لوگوں سے مختلف لہجے میں،

اور خلاف محاورہ ہندی بولنے کا خاص التزام رکھتے تھے۔ مجھے تو وہ ایک آنکھ نہ بھائے۔ اس لیے نہیں کہ انھوں نے بپتسمہ کرایا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ہم لوگوں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ اسکول میں ایک دو انگریز بھی تھے اور میرے لیے انگریزوں کو قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ان کی بولی میری سمجھ میں نہ آتی تھی، لیکن خدا معلوم کیوں مجھے ان سے ڈر لگتا تھا۔ ہم لوگوں سے وہ بہت میٹھے لہجے میں بولتے، لیکن موقع پڑنے پر سخت سزا دینے سے نہ چوکتے تھے۔ وقت کی پابندی وہاں بہت تھی۔ میں ہمیشہ دیر تک سونے والا، اکثر تعویق سے اسکول پہونچتا اور سزا کا مستوجب ٹھہرتا۔ ایک بار میں کچھ جلدی چھٹی ہو جانے کی خوشی سے مغلوب ہو کر اسکول کے بڑے ہال کمرے سے ذرا شور وغل کرتا ہوا گذرا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بڑے ماسٹر صاحب سن رہے ہیں۔ فوراً پکڑوا بلایا گیا اور دس بیت کا مستحق قرار دیا گیا۔ یہ سزا ایک جلاد صفت ماسٹر امینوئل لال کے ہاتھوں دلوائی گئی۔

میں ویزلی اسکول میں بہت دن رہا نہیں۔ ادھر میرے فرشتہ سیرت والد کو برادری والے طعنہ دیتے کہ تم بچے کو بھرشٹ کیے دے رہے ہو اور اُدھر مجھے اسکول کی 'ہندی' اور جان مسیح الدین ایسے ثور صفت لڑکوں کا دست تطاول بدشوق بنائے دیتے تھے۔ تھوڑی بہت انگریزی میں نے ضرور سیکھ لی، اور چھٹی جماعت میں جوں توں کر کے کامیاب ہونے کے بعد میں نے اسکول چھوڑ دیا۔ اب وہی مدرسہ تھا اور وہی فارسی، تھوڑی سی عربی اور ریاضی و منطق و ہیئت۔ گھر پر بنوٹ، گتکا، تیغ زنی، بندوق بازی کی مشق ہوتی تھی۔ محلے کے اکھاڑے میں کشتی ہو جاتی تھی۔ میں نظام آباد سے اعظم گڈھ چار کوس پیدل آتا جاتا تھا۔ اس وجہ سے بھی بدن خوب کسرتی ہو گیا تھا۔

لیکن مجھے تو شاعر بننے کی دھن تھی۔ ایک دن والد محترم نے مجھے کچھ شعر گنگناتے دیکھ لیا۔ بڑی ڈانٹ پڑی اور دادا جان سے شکایت بھی ہوئی۔ پرمیشور انھیں پنر جنم سے بچائے، مجھ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بولے، ''تو کیا ہوا؟ شرفا کے کاموں میں سے ایک کام یہ بھی ہے۔ اسے کچھ نہ کہو۔ ہماری ایک ہی تو اولاد ہے۔''

دو تین سال آرام سے گزرے۔ کچھ پڑھنے پڑھانے اور شعر کہنے میں، اور کچھ مشق تیر و تفنگ اور تیغ و جمدھر میں۔ دادا جان بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور والد کے یہاں بھی کسی دوسری اولاد کی توقع نہ تھی۔ عام راجپوتوں کے علی الرغم ہمارے گھرانے میں تعددِ ازدواج کا طریقہ بالکل نہ تھا۔ ہاں چوری چھپے، یا علی الاعلان،

عشق کرنے کی بات اور تھی۔ لہٰذا میں تنہا ہی اولاد رہ کر جیا۔ ایک دن دادا جان کو معلوم ہوا کہ خان علامہ کے دادا استاد ملا سابق بنارسی کے ایک پوتے مولوی خادم حسین ناظم ہمارے قصبے کے پاس ہی تحصیل کے صدر مقام محمد آباد میں منصف ہو کر آئے ہیں۔ دادا نے فرمایا کہ استاد کے بغیر شاعر نہیں بنا جاتا۔ چلو تمھیں مولوی صاحب کا شاگرد بنوا دوں۔

ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اول وقت پہونچے، خان علامہ کا نام درمیان میں لا کر اطلاع کرائی۔ مولوی صاحب خود باہر آ کر ہم لوگوں کو اپنے دیوان خانے میں لائے۔ عطر پان سے تواضع کی۔ مولوی صاحب مغل وضع کی چوگوشیہ ٹوپی اور جدید طرز کا چغہ پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی، گلے میں ململ کا لمبا کرتا، ہاتھ میں عقیق احمر کی تسبیح۔ میں دل میں بہت ڈرا ہوا تھا، لیکن ان کو دیکھ کر ایک طرفہ فرحت کا احساس ہوا۔ گلابی جاڑے تھے، دیوان خانہ میں ہلکی ہلکی خوشبو شمامۃ العنبر کی پھیلی ہوئی تھی۔ دادا مرحوم نے عرضِ مدعا کی تو مولوی صاحب نے فرمایا، ''میاں تخلص کیا کرتے ہو؟'' میں نے دبی زبان سے عرض کیا، ''جی تخلص کا گنہگار ابھی نہیں ہوا۔'' مولوی صاحب ذرا مسکرائے، ایک لمبی سی ہوں کی، پھر ایک لحظہ چپ رہ کر بولے، ''اچھا تو میاں بینی مادھو، تم ہے ہے بنس کے راجپوت، صاحب تیغ و سپر خاندان کے چشم و چراغ، شاعری کر کے اپنے گھرانے کو رسوا کرنے پر اتارو ہو، تو لو ہم تمھارا تخلص 'رسوا' تجویز کرتے ہیں۔''

دادا صاحب اور میں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ ''بہت خوب۔'' مولوی صاحب نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، ''اچھا اب اپنا کوئی شعر تو پڑھو۔'' میرا تو دم ہی نکل گیا۔ کنکھیوں سے دادا جان کی طرف دیکھا، لیکن وہ تو بالکل بے تعلق سے ہو گئے تھے۔ جبراً قہراً یہ مطلع میں نے پھنسی پھنسی آواز میں پڑھا:

ہستی کو حباب سمجھے گا
ہر سانس کو آب سمجھے گا

مولوی صاحب نے فرمایا ''خوب۔ لیکن 'سمجھے' بروزن فاعلن اب اچھا نہیں لگتا، اسے 'جانیے' کر دو۔'' ابھی میں کچھ کہنے والا تھا کہ آپ نے مزید ارشاد فرمایا ''اور میاں صاحب، سانس کو آب کہنے کی نہ کوئی دلیل ہے، اور نہ بین المصرعتین ربط ہی قائم ہوتا ہے۔ اسے یوں کر دیں، 'عالم کو آب جانیے گا' اور اسے مصرع اولیٰ قرار دیں تو کیسی رہے؟ کہو کچھ عروض بھی جانتے ہو؟''

میں نے اٹک اٹک کر عرض کی، ''جی حضور، اور اصلاحی مصرع ثانی میں تسکین اوسط ہے۔''

مولوی صاحب نے پھر فرمایا، ''خوب۔'' دادا صاحب گویا ہوئے۔ ارشاد ہوا، ''سبحان اللہ حضرت، کیا اصلاحیں صادر فرمائی ہیں۔'' مولوی صاحب کے اصرار پر میں نے ایک شعر اور پڑھا:

افسوس ساتھ میرے یاروں نے دشمنی کی
اس کی گلی میں رہتا تو چاکری ہی کرتا

مولوی صاحب نے ایک لحظہ سکوت فرمایا، پھر کہا، ''ہاں شیخ ناسخ کے رنگ کا شعر ہے۔ شیخ مرحوم اکثر اشاروں میں بات کہتے تھے۔ خود فرمایا ہے:

ہے بیت ہی میں معنی بیت خیال بند
نزدیک ہے بہت جسے سمجھے ہیں دور ہے

لیکن تمھارے شعر کی بندش صاف نہیں بیٹھی۔ پہلا مصرع یوں کر دو:

دُنیا کی بادشاہی کس کام کی ہے میرے

اب بات ذرا سامنے کی ہوگئی، لیکن صاف ہے۔ دیکھو مبتدی کو صفائی ادا زیادہ ضروری ہے۔''

بات میری سمجھ میں ٹھیک سے نہ آئی تھی، لیکن دادا صاحب مرحوم ''بہت خوب، بہت مناسب'' کہتے رہے۔ مولوی صاحب نے یہ کہہ کر ہم کو رخصت کیا کہ ''بھئی ہمیں اتنی فرصت نہیں کہ تم جیسے نوجوان کی آمدِ شعر پر اصلاح دیتے رہیں۔ کبھی کبھی ادھر سے گذرنا ہو تو ایک آدھ غزل دکھا دیا کرنا۔''

جب ہم باہر نکلے تو ہمیں دیکھ کر حیرت اور شرمندگی ہوئی کہ دو سیر شیرینی جو ہم بطور نذر لائے تھے، اس کے عوض مولوی صاحب قبلہ نے کوئی مہینہ بھر کا سیدھا اور کئی طرح کے پھل اور ترکاریاں ہمارے بیل گاڑی پر لدوا کر تیار کرادی تھیں۔ مولوی صاحب اندر جا چکے تھے، شکریے کا بھی موقع نہ دیا، ہم ان کی کرم فرمائیوں اور شاعرانہ قوتوں پر عش عش کرتے گھر لوٹے۔

میں مولوی خادم حسین ناظم کا شاگرد کیا بنا کہ اپنے حسابوں فارغ التحصیل ہو گیا۔ مدرسے جانا چھوڑ کر سارا وقت شعر و شاعری اور تیر و تفنگ میں گذارنے لگا۔ پھر ایک جگہ کچھ معاملاتِ دل بھی نکل آئے۔ کچھ ادھر کا

بھی اشارہ تھا۔ بات بہت آگے نہ بڑھی لیکن دل لگانے اور دل لگی کا تو سامان تھا ہی۔ میں سولہ برس کا خاصا وجیہہ جوان نکلا تھا۔ کسرتی بدن، گھر میں کھانے پینے کی کمی نہ تھی۔ والدین کا لاڈ پیار الگ، اور کیا چاہیے تھا؟

لیکن وہ 1856ء کا سال مجھ کچھ عجیب بھاری گذرا۔ اودھ کی سلطنت کے انتزاع کا ہم لوگوں پر براہِ راست اثر یہ پڑا کہ کلکتے کے بڑے لاٹ کے خلاف دلوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑنے لگی۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ اشیا کی قیمتیں آپ سے آپ بڑھنے لگی تھیں۔ ضروری اشیا بھی عام لوگوں کی دسترس سے باہر ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا اودھ کی پیداوار اب مشرقی اضلاع میں آنا بند ہوگئی ہے۔ موٹے اور باریک اناج سب ایک بھاؤ ہوکر روپے کے آٹھ نو سیر بکنے لگے۔ لوگوں میں خبر اڑی کہ کمپنی نے اودھ اور اطراف کا سارا مال ولایت بھیج دیا۔

بادشاہ جان عالم کے کلکتہ پہنچنے کے چند ہفتے بعد لوگوں میں خفیہ باتیں مشہور ہونے لگیں کہ نہ صرف اودھ، بلکہ دلّی کی بھی بادشاہت واپس آنے والی ہے۔ کبھی کبھی کوئی شخص سرگوشی میں ''چپاتی'' نام کی کسی چیز کا ذکر کرتا جو دراصل خفیہ پیغام رسانی کا ایک طریقہ تھی۔ کبھی کوئی کہتا کہ منڈیاؤں کی چھاؤنی میں جو فوج کمپنی بہادر نے شاہ اودھ کو دبائے رکھنے کے لیے متعین کر رکھی تھی، اب وہ باغی ہونے والی ہے یا ہوگئی ہے۔ آرکاٹ کے ڈنکا شاہ کا ذکر 1856ء کے اواخر میں زبانوں پر پھیلنے لگا کہ وہ جہاں جاتے ہیں، ان کے آگے آگے ڈنکا بجتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کے سردار آ رہے ہیں۔ اپنے مواعظ میں وہ (ان کا اصل نام بعد میں معلوم ہوا کہ مولوی احمد اللہ ہے) کھلے بندوں ہندو مسلمان دونوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد و جنگ کی ترغیب دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریزوں کی حکومت بے دینی اور باطل پر مبنی ہے۔ یہ لوگ ہندو مسلمان دونوں سے ان کا مذہب چھڑا کر انھیں خدا سے دور کر دیں گے۔

یہ سنسنی کی باتیں میرے نوجوان خون میں گرمی اور بہجت کی لہریں دوڑا رہی تھیں، اور میں بھی کچھ الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگا تھا، کہ میرے دادا جان کا انتقال 1856ء کے بالکل آخر میں اچانک تھوڑی سی علالت کے بعد ہوگیا۔ وہ چھیاسی برس کے تھے، لیکن ان کی صحت ہم نوجوانوں کی سی تھی۔ کسی کو اندیشہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے۔ بعد کے زمانے میں مجھے اکثر خیال آتا کہ شاید ان کی پاک روح نے محسوس کر لیا تھا کہ ابنائے وطن پر جو ستم انگریز بہادر کی طرف سے ٹوٹیں گے، ان کو دیکھنے سے پہلے ہی آنکھ بند کر لینا بہتر ہے۔

1857ء کو شروع ہوئے ایک دو مہینے گذرے تھے کہ چپکے چپکے یہ خبر پھیلی کہ ڈنکا شاہ کو انگریزوں نے فیض آباد میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہمارے لوگوں میں عجب بے چینی اور کشمکش سی پھیل گئی۔ میں نے ایک دن اپنے والد کو میری ماں سے کہتے سنا کہ بنی مادھو کو اس کے ماموں کے پاس شاہجہاں پور بھیج دو۔ یہاں حالات اب دگرگوں ہونے والے ہیں۔

پھر ایک رات یہ خبر جنگل کی آگ کی سی تیزی سے پھیلی کہ میرٹھ میں انگریزوں کے ساتھ کچھ بہت خراب سلوک دیسی سپاہیوں کے ہاتھوں ہوا اور فرنگی سب میرٹھ، بلند شہر وغیرہ چھوڑ چھوڑ کر پنجاب کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ واقعہ کیا ہوا، اس کی تفصیل نہ معلوم ہوئی، بجز اس کے کہ سپاہیوں کو ایسے کارتوس منھ سے کاٹنے کو ملے تھے جن میں سور یا گئو کی چربی تھی۔ منگل پانڈے نامی سپاہی نے کارتوسوں کو کاٹنے سے انکار کیا اور اپنے انگریز افسر کو گولی مار دی۔ کہا جا رہا تھا کہ انگریزوں نے یہ خبر دبا رکھی تھی لیکن اب یہ ہر طرف پھیل گئی ہے۔ دیسی سپاہی جگہ جگہ خروج کر رہے ہیں اور اعلیٰ حضرت ظل سبحانی ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ ثانی کو شاہ ہند کا لقب دے کر دوبارہ تخت نشین کر دیا گیا ہے۔ دوسرے دن اور نزدیک کی یہ خبر آئی کہ دیسی سپاہیوں اور ڈنکا شاہ کے ساتھیوں نے فیض آباد کا جیل خانہ توڑ کر ڈنکا شاہ کو رہا کرا لیا ہے اور اب وہ ایک جم غفیر کے ساتھ عازم لکھنؤ ہیں۔

اسی رات بہت دیر گئے ایک تنومند بوڑھا منھ پر ڈھاٹا باندھے ہماری گڑھی پر آیا کہ میں بلیا کے بابو کنور سنگھ کا ایلچی ہوں، مجھے ٹھاکر صاحب سے ملنا ہے۔ بابو کنور سنگھ کی عمر اس وقت اسّی کے قریب تھی، ان کا راج چھوٹا سا لیکن دبدبہ دور دور تک تھا۔ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے اور اپنے علاقے میں آنے والے گوروں کو سرِ بازار گالیاں دلواتے تھے۔ میرے والد نے ایلچی سے کچھ بات کیے بغیر اس کا مدعا سمجھ لیا۔ مجھے انھوں نے اسی ایلچی کے ایک نائب کی معیت میں رات ہی رات شاہجہاں پور روانہ کر دیا۔ میں نے ہزار کہا کہ میں آپ کے ساتھ رہوں گا، لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ دادا مرحوم کے برخلاف وہ مزاج کے تیز بہت تھے، اور ان کے سامنے کسی کو تابِ مقاومت نہ تھی۔ میں تو ان کا بچہ ہی تھا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ صبح ہوتے ہوتے میرے والد بھی چند جاں نثاروں کو ساتھ لے کر کنور سنگھ کی طرف نکل گئے۔ ہماری گڑھی پر میری والدہ اور کچھ بوڑھے نوکر رہ گئے۔

لڑائی کا وہ سارا زمانہ میں نے شاہجہاں پور کے ایک قصبے روضہ کے باہر اپنے ماموں کے شکاری بنگلے میں گذارا۔ ماموں کے آدمی ہر وقت مجھ پر کڑی نگاہ رکھتے کہ کہیں گھر سے نکل نہ جاؤں۔ لڑائی کی خبریں کبھی کبھی وہاں تک پہنچ جاتی تھیں۔ ہندوستانی سپاہ کی ہر فتح کے ساتھ میرا دل بلیوں اچھلتا اور ہر شکست کے ساتھ اتنا ہی ڈوب جاتا۔ 1858ء کا وسط آتے آتے جنگ ختم ہونے لگی تھی اور میرے صبر کا پیمانہ بھی چھلکنے لگا تھا۔ میں دل میں ٹھان لی کہ مناسب موقع دیکھ کر بنگلے کی اونچی دیوار پھاند کر نکل جاؤں گا اور برجیس قدر کی سپاہ سے جاملوں گا۔

میں اپنے لیے سواری کا انتظام کر رہا تھا۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اندھیاری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک دو راتوں میں وہاں سے نکل لوں۔ اچانک مجھے ایک ملازم نے چپکے سے بتایا کہ برجیس قدر، بیگم حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ، یہ سب الگ الگ جنگوں میں ہزیمت اٹھا کر شمال کی طرف جانے والے ہیں۔ انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے ہیں، اور نہ اس کی کوئی توقع ان سے یا ان کے ساتھیوں سے ہے۔ اسی شام یہ اطلاع میرے جسم کو جھنجھوڑ گئی کہ مولوی صاحب اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے دُور کے عزیز جگن ناتھ سنگھ راجہ پوایاں کے یہاں قیام پذیر ہونے والے ہیں۔ پوایاں ہمارے قصبے روضہ سے بہت قریب نہ تھا، لیکن ایک رات کے دھاوے میں وہاں پہنچنا ممکن تھا۔

گئی رات میں کمند لٹکا کر اور ہاتھ پاؤں تڑانے کا خطرہ مول لے کر بنگلے کی اونچی دیوار سے اترا۔ ایک وفادار ملازم دو عمدہ گھوڑوں کے ساتھ منتظر تھا۔ بے تکان بھاگتے ہوئے ہم دن نکلے پوایاں کی سرحد کے پاس پہنچے تو ہر طرف فرنگی جھنڈوں اور فوجوں کا ہجوم دیکھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہیں رُک کر میں نے سرگوشیوں میں یہ منحوس خبر سنی کہ راجہ پوایاں کی غداری نے ڈنکا شاہ کی جان لے لی۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ بات بالکل کھل گئی جب میں نے گاؤں کی عورتوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ ڈنکا شاہ کے ماتم میں سینہ زنی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ ان کے پیچھے ہی چند عورتیں ہاتھ اٹھا اٹھا کر جگن ناتھ سنگھ کو برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ کمپنی کے سپاہی انھیں دھکیل دھکیل کر گاؤں کے اندر لے جا رہے تھے۔

دُنیا میری نظر میں تاریک ہوگئی۔ یہ بات اب بالکل صاف تھی کہ ہندی افواج کو ہر جگہ شکست ہو چکی۔ اب کچھ رہا نہ تھا جس کے لیے جنگ کی جائے۔ ملازم کو تو میں نے وہیں رخصت کیا، اور اس کا بھی گھوڑا ساتھ لے کر میں نے چلتی ہوئی راہیں چھوڑ کر چپ چپاتے سنسان راستوں سے اعظم گڈھ کی راہ لی۔

اس سفر کی داستان کبھی اور سناؤں گا۔ کوئی ڈھائی مہینے میں سفر میں رہا، یوں جیسے کوئی مفرور مجرم کوتوال سے چھپتا پھرتا ہے۔ سارا راستہ کمپنی بہادر کے جیالے سپاہیوں کے ظلم اور ان کے بہیمانہ حرکات کے علائم سے بھرا پڑا تھا۔ کتوں اور چیل کوؤں نے لاشیں کھانی چھوڑ دی تھیں۔ زغن اور لکڑ بگھے مردوں کو کھاتے کھاتے بیمار ہو گئے تھے۔ راستے میں دونوں طرف کوسوں تک پھانسیاں ہی پھانسیاں نظر آتی تھیں۔

اثنائے راہ میں یہ دل شکن خبریں بھی سنائی دیں کہ بڑوت باغپت کے شاہ مل جاٹ اور رایا مہابن کے دیبی سنگھ تو انگریزوں کی فتح دہلی کے بھی پہلے گاجر مولی کی طرح کٹ گئے۔ الہ آباد کے مولوی لیاقت علی کا بھی جھنڈا چند ہفتے اکبری قلعے پر لہرا سکا۔ نیل صاحب نے ان کو عبرت ناک سزا دے کر مارا۔ انگریز ہر طرف سیلاب کی طرح چڑھے ہوئے تھے۔

میں شہر پہنچ کر چپ چاپ ایک جگہ ٹھہر گیا کہ کچھ سن گن تو لے لوں۔ میرے جاننے والوں میں کوئی نہ ملا، اور انجان لوگ بات کرتے ڈرتے تھے۔ اتنا سنا کہ نظام آباد کے راجپوت بالکل برباد ہو گئے۔ رات کے اندھیرے میں گھر پہنچا تو اپنی گڑھی کو زمیں بوس پایا۔ ایک بھی متنفس نہ تھا۔ رات بھر کی پوچھ گچھ سے اتنا پتا لگا کہ والد اور ان کے ساتھی کنور سنگھ کے ساتھ شہید ہوئے۔ انگریز فوج نے آ کر ہماری گڑھی مسمار کر دی اور نوکروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ میری والدہ نے عزت بچانے کی خاطر گڑھی کے کنویں میں کود کر جان دے دی۔ اب انگریزوں کے سپاہی اور جاسوس مجھے پوچھتے پھر رہے ہیں۔ میرے مسلمان اعزا جو قتل عام میں بچ رہے تھے، وطن چھوڑ کر کہیں اور جا بسے۔ کسی کو ان کی خبر نہیں۔

مجھ پر عرصۂ زمین اور عرصۂ حیات دونوں تنگ ہو چکے تھے۔ لیکن میں جاتا بھی تو کہاں؟ شاہجہاں پور کو مراجعت ممکن نہ تھی۔ ویسے بھی، میں نے دونوں گھوڑے دورانِ سفر بیچ دیے تھے اور میرے سفر کے آخری دن پا پیادہ گذرے تھے۔ اچانک مجھے اپنے بچپن کے ساتھی اور دوست کمھار کی یاد آئی۔ شاید اس کا گھر تباہی سے بچ گیا ہو؟ اور اس میں تو کوئی شک نہ تھا کہ اگر وہ موجود ہو تو میرے لیے سر چھپانے کی جگہ تھی۔

اور ہوا بھی ایسا ہی۔ میرا دوست مجھے دیکھ کر رو دیا۔ کہنے لگا کہ دادا یہ سارا گھر تمھارا ہے۔ جس طرح چاہو رہو، بس منھ نہ کھولنا، ورنہ تمھاری بولی سے لوگ تمھیں پہچان جائیں گے۔ میں مشہور کر دوں گا کہ تم میرے چاچا کے لڑکے ہو۔ چاچا کی موت کے بعد بنارس سے آئے ہو۔ دماغ کمزور ہونے کی وجہ سے بول

نہیں سکتے۔

میں نے وہ دن اوپری سکون سے گذارے۔ چاک کے کام کی جو مشق میں نے بچپن میں بہم پہنچائی تھی، میرے بہت کام آئی۔ باہر والوں میں کسی کو گمان نہ ہوا کہ میں پیدائشی کمہار نہیں ہوں۔

1860ء کا سال آتے آتے انگریزوں کی آتش انتقام کچھ سرد پڑنے لگی تھی۔ بھاگے ہوئے لوگ واپس آ رہے تھے۔لیکن میرے یہاں کون تھا جو واپس آتا؟ مجھے خدائے سخن کا شعر یاد آیا:

ساون ہرے نہ بھادوں ہی سوکھے ہم اہل درد
سبزہ ہماری آنکھ کا سیراب تھا سو تھا

کمہار کے بھیس نے شاعری پڑھنا پڑھانا بھی مجھ سے چھڑا دیا تھا۔لگتا تھا اب زندگی بے منّتِ قرطاس وقلم ہی گذرے گی۔ لیکن ایک دن میرے دوست نے آکر خبر دی کہ دادا سنا ہے کانپور میں انگریزوں نے توپ بندوق بنانے کا کارخانہ کھولا ہے۔تم تو یہ کام بخوبی جانتے ہو، اور انگریزی بھی پڑھے ہو۔ اس وقت بھرتی زوروں پر ہے، زیادہ پوچھ گچھ نہ ہوگی۔تم کمہار کے کام کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ تمھیں اس طرح من مار کر جیتے دیکھ کر میرا جی کڑھتا ہے۔تمھاری زمینیں ابھی انگریز نے ضبط کر رکھی ہیں۔ جب چھوٹیں گی تو میں تم کو خبر کردوں گا۔

بات دل کو لگتی تھی۔ تھوڑے ہی دن بعد میں کانپور کے کارخانۂ توپ وتفنگ کی بھرتی کے لیے لین ڈوری لگائے کھڑا تھا۔ بھرتی والے صاحب نے اتنا ضرور پوچھا کہ ''تم نے لڑائی میں کوئی حصہ تو نہیں لیا؟'' میں نے سچ سچ جواب دیا کہ ''بالکل نہیں۔'' میں بھرتی ہو گیا اور تھوڑے ہی دن میں میری کارکردگی کے باعث میری ترقّی ہوگئی۔ مجھے کوئی افسر نما چیز بنا دیا گیا اور بتایا گیا کہ آج سے میں 'فورمین' ہوں۔تنخواہ اب معقول ہوگئی تھی۔ میں نے پریڈ کے بازار کے پاس ایک چھوٹا سا گھر ڈھائی روپے مہینے پر لے لیا، ایک ملازم رکھ لیا، اور خالی وقت میں مشغلۂ شعر وسخن کرنے لگا۔

اس وقت کانپور میں کوئی نامی استاد نہ تھا۔ میاں رجب علی بیگ سرور بنارس جا چکے تھے۔لکھنؤ سے آغا حجو شرف کبھی کبھی آ نکلتے تھے۔ ورنہ محفلوں میں ہر شخص خود کو استاد ہی تصور کرتا تھا۔ میں نے مولوی صاحب

قبلہ کی نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا تھا کہ مبتدی کے لیے صفائی بیان ضروری ہے، نہ کہ ندرتِ مضمون۔ لیکن کیا کرتا، میرا دل خیال بندی کی طرف لپکتا تھا۔ شیخ ناسخ اور مرزا نوشہ کا کلام وردِ زبان رہتا تھا۔ شیخ صاحب تو اس شبستان تیرہ روز کے شب و روز دیکھنے کے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ اب مرزا نوشہ تھے اور میری تمنا کہ ان کی طرح کا شعر کہوں، ان کے پاس اٹھوں بیٹھوں، کچھ سیکھ کر واپس آؤں۔

مئی 1862ء کی بات ہے۔ ایک دن میں توپ خانہ بازار کی کوتوالی کے سامنے سے گذر رہا تھا کہ نظامی پریس کے مولوی عبدالرحمٰن تیز تیز قدموں سے آتے ہوئے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ٹھٹکے، اور بولے،''لو بھئی میاں رسوا، تم مرزا کا نام بہت جپتے رہتے ہو، تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں نے مرزا کا مکمل کلامِ ریختہ منطبع کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے ایک پتلی سی کتاب میرے سامنے کر دی۔ میں نے آخری ورق دیکھا تو واقعی مولوی صاحب کی طرف سے اعلان تھا، اور ان کی مہر تھی، اس امر کے ثبوت میں کہ یہ کتاب انھیں کی چھاپی ہوئی ہے۔ لکھا تھا،''جناب مجمع لطف بے کراں محمد حسین خاں صاحب دہلوی نے بعد نظرِ ثانی اور تصحیح جناب مصنف کی ایک نسخہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے بافضال ایزدی مطابق اس نسخے کے شہر ذی حجہ 1278 ہجری مطبع نظامی واقع شہر کانپور میں صحتِ تمام اور درستی کمال سے چھاپا۔'' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے بکمالِ اشتیاق وہ نسخہ ان سے وہیں خرید لیا۔ لیکن شروع کا صفحہ دیکھا تو صحتِ تمام کے دعوے کے باوجود غلطی نظر آئی، کہ دوسری ہی غزل (جس میں صرف ایک شعر تھا) کوئی لمبر شمار نہ تھا۔ اس طرح غزلوں کی تعداد درست نہ رہ گئی تھی۔ لیکن میں نے مولوی صاحب سے کہا نہیں، کہ بے چارے خفیف ہوں گے۔

اس دن سے دیوانِ غالب کا وہ نسخہ میرا شب و روز کا ہمدم و دمساز بن گیا۔ جی چاہتا تھا کہ میں اس نسخے کی اشاعت کو مرزا نوشہ سے اپنی رسم و راہ قائم کرنے کا وسیلہ بنا لوں۔ لیکن یہ کس طرح ہو، بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ انطباع کے بعد وہ دیوان ہزاروں لوگوں نے دیکھا ہوگا، پھر میری کیا تخصیص تھی؟ اور یہ بات، کہ دیوان کانپور میں طبع ہوا، اور فی الوقت میں بھی کانپور میں تھا، میرے لیے تو ایک دلکش اتفاق ہو سکتی تھی، مگر مرزا صاحب کو اس سے کیا؟

اس ادھیڑ بن میں کوئی ایک مہینہ نکل گیا۔ ایک دن میں نے پریڈ کے میدان کے بازار میں ایک پادری کو دیکھا کہ لوگ اس کے پاس آ آ کر کسی کتاب پر اس سے دستخط لیتے ہیں۔ میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ کیا اسرار

ہے۔ استفسار پر معلوم ہوا کہ کتاب کا مصنف وہ پادری ہی ہے۔ لوگ اس کی کتاب خرید کر لاتے ہیں اور اس پر اس کے دستخط لے کر گویا اپنی قدردانی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ میرے دل میں ایک مرتبہ یہ بات گونجی کہ اگر میں بھی مرزا کے دیوان کے کچھ نسخے خرید کر ان سے دستخط کرا لاؤں اور دوستوں کو تحفتاً پیش کروں تو کیسی رہے؟ مرزا سے ملنے کا بہانہ بھی ہاتھ آئے گا، اور دوستوں پر مفت کرم داشتن کا بھی موقع رہے گا۔

پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ چمن گنج میں نظامی پریس جا کر دیوان کی پچیس جلدیں مول لیں۔ قیمت کچھ زیادہ نہ تھی، صرف آٹھ آنے۔ پھر ہر کتاب کو بڑے اہتمام سے مجلد کرایا۔ ہر جلد پر چھ آنے صرفہ آیا۔ مولوی صاحب نے معمولی مشینی کاغذ پر کتاب چھاپی تھی، لیکن انطباع روشن اور صاف ہونے کی وجہ سے کتاب بھلی معلوم ہوتی تھی۔

ایک مہینہ تو اسی حیص بیص میں گذرا کہ کتابیں لے کر جاؤں بھی یا نہ۔ کہیں میرزا صاحب برا نہ مان جائیں۔ بہر حال، بعض دوستوں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ جانا چاہیے، لیکن ذرا موسم بدل جائے، ہوا سرد ہو جائے اور سفر آسان ہو جائے۔

چار مہینے میں نے ان مجلدات کو حرزِ جاں کی طرح سینت کر رکھا۔ نومبر 1862ء کے آخری دن تھے۔ جب میں بسبیل ڈاک قنوج، فرخ آباد، بیاور، کول، بلند شہر، غازی آباد، شاہدری، دلہائی ہوتا ہوا بیس دن کی مسافت کے ہرج مرج جھیلتا، غم والم اٹھاتا دلّی پہنچا۔ میں بارہ ہندوراؤ کی ایک سرا میں اترا۔ معلوم ہوا کہ بلی ماروں کا علاقہ یہاں سے کچھ بہت دور نہیں۔ آہنی سڑک ابھی کانپور کے پاس سے بھی نہ گذری تھی، گو کہ اس کے آنے کے غلغلے تھے۔ میں نے بھی اب تک ریل کی سواری کی نہ تھی، اور نہ اس کا ارادہ تھا۔ لیکن دہلی کی ریل منزل میری سرائے کے پاس ہی تھی۔ وہاں کی چہل پہل، لوگوں کی دھکا پیل، دھواں دھکڑ دُخان پھینکتے ہوئے آتشیں انجنوں کا آنا جانا (اس لفظ سے میں کانپور میں آشنا ہوا) مجھے یہ سب کچھ عجب وحشت انگیز سا لگا۔

شام ہو رہی تھی، میں نے دو کباب داغ کروائے، ساتھ میں دو پراٹھے منگوائے، لیکن گھبراہٹ اور تکانِ سفر کے باعث کچھ کھایا نہ گیا۔ جلدی لیٹ رہا۔ صبح کو بھٹیارن سے استصواب کیا تو اس نے کہا کہ "میاں صاحب، ان نواب اور شاعر لوگوں کا دستور ہے کہ دن چڑھتے اٹھتے ہیں، کچہری دربار جاتے ہیں، بڑے لوگوں سے ملتے ملاتے ہیں۔ شام کو ہوا خوری کو نکلتے ہیں۔ ان سے ملاقات کا سب سے اچھا وقت دن ڈھلے چراغ جلے ہے۔ مرزا نوشہ صاحب کا نام میں نے سنا ہے۔ وہ دلّی کے تو ہیں نہیں، ممکن ہے ان کے طرز وطور

اور رہے ہوں، لیکن اب تو وہ بھی یہیں کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ میں نے ایک آدھ بار انھیں رجواڑے کی گلی سے سواری میں گذرتے دیکھا ہے۔ تو میاں صاحب، ابھی شہر کی سیریں کرو۔ شام میں ایک مشالچی ملازم اور گھوڑا سئیس تمھارے ساتھ کر دوں گی۔ آرام سے مل کر چلے آئیو۔''

شام ڈھلنے کے ذرا پہلے میں نے لباس تبدیل کیا، مچھلی کے چھلکوں کی ٹوپی سر پر جمائی، اس پر رنگین پگڑی باندھی۔ کانوں میں موتی کے بالے ڈالے، ریشمی دھوتی کے نیچے پاؤں میں بانے پہنے، جودھپوری جوتیاں پہنیں۔ پھر ساز سینگڑا لگا کر اپنے دادا مرحوم کی بنائی ہوئی گھرد کاندھے سے لٹکائی۔ میں اپنے قریبی قصبے مبارک پور سے مرزا صاحب وقبلہ کے لیے دو ریشمی لنگیاں اور دو ہی ریشمی پگڑیاں بطورِ خاص بنوا لایا تھا۔ میرے وطن نظام آباد کی مٹی کے کچھ برتن، مثلاً چلمیں اور فرشیاں بھی تھیں۔ ان کو خوان پر رکھوایا، اسی پر کتابیں بھی رکھ کر سئیس کے حوالے کیں۔ مشالچی کو آگے کیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر چلا۔

اس وقت تک شام اچھی طرح پھول چکی تھی۔ اندھیاری کی بنا پر گری پڑی حویلیوں اور لٹے ہوئے بازاروں کے منظر پر ایک ذرا پردہ سا آ گیا تھا۔ جامع مسجد پر بے فکروں اور چٹوروں کا مجمع ویسے ہی تھا۔ افسوس کہ میرا سئیس اور مشالچی دونوں ہی میواتی تھے، اور دلّی میں نو وارد۔ وہ بار بار راہ کھوٹی کرتے اور شہر کی تبدیلیوں پر الزام دھرتے۔ میرا سئیس خاص کر بڑا باتونی تھا۔ ''میاں صاحب، راستہ اب کسے سجھائی دے ہے، اور سجھائی بھی دے تو کیسے؟ مسجد سے راج گھاٹ تک اب لق ودق صحرا ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر ہیں اور ان کے اندر سانپ بچھوؤں کے مسکن۔ مرزا گوہر صاحب عالم کے باغ کی نچلی سمت کئی بانس نشیب تھا۔ اب وہ بنیچے کی چاندنی کے برابر ہو گیا۔ آہنی سڑک کے واسطے کشمیری دروازے سے لے کر کابلی دروازے تک میدان ہی میدان ہے۔ پرانی گلیاں لوگوں سے اٹی پڑی ہیں، راستے کھو گئے ہیں۔ اگلا جائے تو کہاں جائے؟ پنجابی کٹڑا، دھوبی واڑا، سعادت خان کا کٹڑا، یہ اور اس طرح کے کتنے ہی محلے مٹ گئے۔ گلیوں کی شکلیں بدل گئیں۔ میاں صاحب، اب یہ دلّی وہ دلّی نہیں، ایک کمپ ہے، بارگ ہے، اجاڑ گھروں کا جنگل ہے۔ حضرت مرزا ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے زمانے میں یہ سب گلیاں اور بازار روشنی سے جھکا جھک تھے۔ اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔'' مجھے مرزا صاحب کا قطعہ یاد آ گیا جو انگریز کے ڈر سے ہنوز منطبع نہ ہوا تھا لیکن شدہ شدہ لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گیا تھا۔

گھر سے بازار کو نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

اور آج کی دلّی کے بارے میں اپنے وقت کے ابلغ البلغا، اشعر الشعرا، خدائے سخن حضرت میر تقی کے کئی شعروں میں سے یہ شعر ذہن سے پھسل کر بے ساختہ زبان پر آ رہا:

اب شہر ہر طرف سے میدان ہو رہا ہے
پھیلا تھا اس طرح کا کاہے کو یاں خرابا

میں نے دل میں کہا، ''ایشور کرے کبھی دلّی کے بھی دن پھریں۔ امی جی ہو۔ تخت پر وہی براجے جس کا حق ہے۔''

انھیں سب باتوں، راستہ ڈھونڈنے اور ٹھوکریں کھانے میں دو گھنٹے صَرف ہو گئے۔ مجھے خفقان ہو رہا تھا کہ مرزا صاحب بسترِ استراحت پر نہ تشریف لے گئے ہوں۔ اگر میری خبر پر انھیں اٹھنا پڑا تو بڑی شرمندگی کی بات ہو گی۔ ادھر وہ مشالچی اور سئیس اتنے احمق کہ انھیں کالے صاحب کا احاطہ ہی مل کے نہ دیتا تھا۔ مرزا صاحب کی حویلی کا ایک دروازہ عالم خاں کے کٹڑے کی طرف کھلتا تھا اور ایک کالے صاحب کی مسجد کی طرف۔ صدر دروازہ کالے صاحب کی خانقاہ سے ملا ہوا تھا۔ بارے خانقاہ کا پتا ملا تو حویلی بھی نظر آئی۔ ایک دو ملازموں کو باہر استادہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ ابھی لوگ موجود ہیں۔

اطلاع کرائی تو فوراً ہی بلوا لیا گیا۔ وہ حضرات پہلے سے موجود تھے۔ مرزا صاحب کا شغل شروع ہو چکا تھا، شاید حضارِ مجلس سے کسی قسم کا پردہ نہ تھا۔ ہائے میں مرزا صاحب کی شکل کیا بیان کروں۔ کشیدہ قامت، متوسط بدن، لیکن ہاڑ بہت چکلا، شانے اس عمر میں بھی خم سے آزاد۔ سنہرا چمپئی رنگ، اس پر سفید ڈاڑھی، سر منڈا ہوا۔ مسکراتا ہوا روشن چہرہ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن تھوڑے سے سرور کی وجہ سے سرخی مائل۔ آنکھوں میں شوخی اور فراست کی چمک۔ پورا چہرہ مہرہ اور قد و قامت بالکل کسی تازہ وارد تورانی کا تھا، بس ڈاڑھی ہندی طرز کی نہ ہوتی، اور سر نہ منڈا ہوا ہوتا تو اچھے اچھوں کو یہی دھوکا ہوتا کہ کوئی آغائے تورانی ہے۔ ساری ڈاڑھوں

کے گر جانے کے باعث دونوں گال ذرا پچک گئے تھے۔ یہ ایک کمی نہ ہوتی تو پیرانہ سری کے باوجود وجاہت و حسانتِ مردانہ کا بہترین نمونہ قرار پاتے۔ آواز ان کی نہایت صاف اور کھلی ہوئی تھی۔ اکبر آبادی برج کی لچک اور مٹھاس لہجے میں اب بھی تھی، لیکن اس پر دلّی کی کرخت بولی کی گہری تہہ جم چکی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ لوگ میری پوربی، بھوج پوری کا ہلکا سا رنگ لیتی ہوئی آواز اور زبان کو بھلا کیا خیال کرتے ہوں گے۔

اور کیا خُلقِ عظیم تھا، کیا شفقت تھی۔ انھوں نے لبِ فرش تک آکر میرا استقبال کیا۔ اپنے دستِ چپ پر بٹھایا۔ دستِ راست پر جو صاحب بیٹھے تھے، ان کا لباس مغل منصب داروں کی طرز کا تھا۔ بڑے گھیر کا جامہ، اس کے نیچے قیمتی کپڑے کا زیر جامہ۔ کمر میں ریشمی دوپٹہ، جس سے خنجر جواہر نگار و آب دار آویزاں۔ سر پر زربفت کی پیچ گوشیہ ٹوپی، جو مغل طرز سے ذرا مختلف تھی۔ ڈاڑھی موچھیں گھنی، موچھیں چڑھی ہوئی، نکے دار۔ ڈاڑھی بڑی صفائی سے ذرا چوکورسی تراشی ہوئی۔ داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت میں ایک بہت بڑی زمرد کی انگوٹھی، غالباً مہر نگیں کے کام آتی ہوگی۔ فاصلے کے باوجود نگینے پر کچھ کندہ کیا ہوا صاف دکھائی دیتا تھا۔ انتہائی خوبصورت اور وجیہہ انسان تھے۔ معلوم ہوا نواب ضیاء الدین خان صاحب نیر رخشاں ہیں۔ میں نے سروقد ہو کر کھڑے ہو کر تعظیم دی۔ انھوں نے مسکرا کر سلام لیا اور دعا دی، ''خوش رہیں، آباد رہیں۔ دولت و اقبال زیادت باد۔''

جو بزرگ مرزا صاحب کے سامنے تشریف فرما تھے ان کی ڈاڑھی موچھیں بہت گھن کی تھیں، کنگھی کی مشاطگی سے آزاد، بالکل چڑیا کا جونجھ لگتی تھیں۔ سر پر اونچی دیوار کی مخملی ٹوپی، بدن پر انگریزی وضع کا بھاری کوٹ، نیچے موٹا اونی کُرتا، اسی کپڑے کا ڈھیلا پاجامہ۔ متبسم آنکھیں۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے خاص شاگرد منشی شیونرائن آرام ہیں۔ آگرے سے بغرضِ ملاقات و علاج تشریف لائے ہیں۔ میں نے پھر سروقد ہو کر تعظیم دی۔ انھوں نے تقریباً انھیں الفاظ میں دعا دی جو نواب ضیاء الدین صاحب کی لسانِ مبارک سے ادا ہوئے تھے۔

مرزا صاحب نے فرمایا، ''میاں، خانہ بے تکلف ہے، بتاؤ کچھ شغل بھی رکھتے ہو؟''

میں نے دبی زبان سے جواب دیا۔ ''حضور، راجپوت ہوں، برت بھی دو آتشہ کتاب سے کھولتا ہوں۔''

مرزا صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، شیونرائن صاحب آرام نے تحسین کی نگاہ سے مجھے دیکھا۔ نواب صاحب نے ارشاد فرمایا:

"میاں صاحب زادے، یہ تو تم نے ہمارے قبلہ مرزا صاحب کا شعر پڑھ دیا۔"
میں بات کو بھانپ گیا کہ اشارہ کس طرف ہے اور میں نے فوراً مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

خجلت نگر کہ در حسناتم نہ یافتند
جز روزۂ درست بہ صہبا کشودۂ

پھر میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، "پیرو مرشد کی کرامت ہے کہ ایسا جواب بن پڑا۔ پیرو مرشد لسان الغیب کا درجہ رکھتے ہیں۔"

اس پر سب لوگوں نے کہا، "بے شک، بے شک۔"

مرزا صاحب نے کلو داروغہ کو آواز دے کر میرے لیے گیلاس اور نقل منگوائی۔ پھر غایت سفر پوچھی۔ میں نے مختصراً عرض کر کے سب سے پہلے تو وہ لنگیاں اور پگڑیاں نذر کیں۔ میری خوش نصیبی تھی کہ پگڑیاں ان کی پسند کے مطابق نکلیں۔ انھوں نے فرمایا، "بہت خوب، بہت خوب۔ مجھے عمامے میں سرخ رنگ بالکل پسند نہیں۔ اچھا ہوا ان عماموں میں کوئی بھی سرخ دھاگہ نہیں ہے۔" میں نے جھک کر تسلیم کی، پھر چلمیں اور فرشیاں پیش کیں۔ بالکل سیاہ مٹی، اس پر روپہلا کام بنا ہوا۔ یہاں والوں کے لیے نئی چیز تھی، بہت پسند کی گئی۔

نواب صاحب اور منشی صاحب تو رخصت ہوئے، میں مرزا صاحب قبلہ کے ساتھ مشغلِ مے و مینا کرتا رہا۔ کوئی انگریزی شراب تھی، بالکل بے رنگ، اور بہت تیز۔ غالباً شامپین رہی ہو۔ رات جب بہت بھیگ چلی تو میں نے اجازت چاہی۔ فرمایا:

"دیر ہوتی ہے، جاؤ بھئی جاؤ۔ میں کچھ فکرِ سخن کروں گا۔ ہے ہے، مجھے اپنی جوانی کا شعر یاد آ گیا:

فکر سخن یک انشا زندانی خموشی
دود چراغ گویا زنجیر بے صدا ہے

لیکن اب میں بھی زیادہ جاگتا نہیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی:

''حضور، جب اس کلام میں ایسے ایسے شعر تھے تو اس پر خطِ تنسیخ پھیرنا کیوں گوارا کیا؟''

جیسے ایک دم وہ چپ ہو گئے۔ میں ڈرا کہ ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ لیکن پھر وہ کچھ دھیمے لہجے میں بولے، ''میاں، اس بڑھاپے میں اقبال کرتے شرم آتی ہے، لیکن اس کلام کو رد کرنے کا رنج مجھے بھی ہے۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا کہ میں لڑکپن میں بے راہرو تھا۔ بے مطلب بکتا تھا۔ جب کچھ تمیز آئی، وہ اوراق یک قلم چاک کیے اور چند شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے۔ لیکن اصل بات سلامت روی فکر اور سلاستِ بیان کی نہ تھی۔ میری نوجوانی تھی، میں سمجھتا تھا کہ شعر، سننے سنانے سے زیادہ، پڑھنے پڑھانے کی شے ہے۔ پھر مرزا عبدالقادر بیدل کا قول دل میں جاگزیں تھا کہ زبان اور معنی میں مغائرت ہے، زبان کو معنی کا تحمل نہیں۔ مرزا بیدل فرماتے ہیں:

اے بسا معنی کہ از نا محرمی ہائے زباں
با ہمہ شوخی مقیم پردہ ہائے راز ماند

لیکن میں نے دیکھا کہ ہمارے یہاں شعر سننے کا رواج زیادہ ہے، پڑھنے کا کم اور زبان کو میرے معنی سے یوں ہی پردہ تھا۔ میں بات اشاروں اشاروں میں کہتا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ ایک دن طبیعت جھنجھلا ہی تو اٹھی۔ میں نے دل میں کہا اب ریختہ کہوں گا ہی نہیں، فارسی لکھوں گا۔ دوستوں کو خوش کرنے کے لیے اعلان کر دیا کہ ریختہ زیادہ تر مسترد کر کے صرف منتخب اور آسان کلام داخل دیوان کروں گا۔ حالانکہ جو کلام چھوڑ دیا تھا، اس میں بھی نام نہاد آسان کلام کی کمی نہ تھی۔ انتخاب کیا کیا، بس ایک دوپہر کو ایک دوست کے یہاں بیٹھے بیٹھے کچھ سرخوشی کے عالم میں جہاں چاہا قلم لگا دیا۔ ورنہ جن غزلوں پر یہاں لوگوں نے مجھے استاد مانا، وہ بھی زیادہ تر اس زمانے کی کہی ہوئی ہیں جب میری عمر پچیس سے متجاوز نہ تھی۔''

''اب اس کلام کی بازیافت کی کوئی امید نہیں؟'' میں نے پوچھا۔ فرمایا: ''مجھے اب اپنا کلام بہت کم یاد رہتا ہے۔ تازہ کلام بھی بھول جاتا ہوں اور ان اشعار سے تو اب قیامت ہی میں ملاقات ہو گی۔''

میں نے ازراہِ شوخی میر کا شعر پڑھ دیا:

قیامت کو جرمانہ شاعری پر
مرے سر سے میرا ہی دیوان مارا

مسکرائے، فرمایا، ''تو آپ بھی میری طرح ہیں، اوروں کی طرح سودائی نہیں۔'' میں نے اس پھڑکتے ہوئے فقرے پر سبحان اللہ کہا اور عرض کیا، ''اب اجازت مرحمت ہو اور کیا یہ ممکن ہے کہ پیرومرشد مجھے کسی ایسے وقت طلب فرمائیں جب تخلیہ ہو؟'' اصل میں مجھے کتابوں پر دستخط کی فرمائش کی ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ امید تھی کہ رات بھر میں ہمت جٹالوں گا۔

کچھ دیر سکوت کے بعد فرمایا، ''اچھا تو میاں تم کل دوپہر کو کھانا یہیں کھاؤ۔ اس کے بعد میں ذرا لیٹ رہتا ہوں، کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تمھارے لیے وہی وقت نکال لوں گا۔''

مجھے کچھ اور کہنے کی ہمت نہ پڑی، حالانکہ ان کے آرام میں خلل انداز ہونا سخت شاق تھا۔ آداب کر کے سرائے واپس چلا آیا۔

اگلی صبح طبیعت کسل مند تھی، دیر سے اٹھا۔ تیار ہوتے ہوتے بارہ بج گئے۔ میں تنہا ہی سوار ہو کر بلی ماروں کو چلا۔ راستے میں ہر جگہ گذشتہ جرنیلی نظام کی دردناک نشانیاں اور آہنی سڑک کے واسطے مزید انہدام کی تیاریاں نظر پڑیں۔ میں نگاہ جھکائے چلتا گیا۔ اس بار راستہ نہ بھولا۔ مرزا صاحب کمالِ شفقت سے میرے منتظر تھے۔ میرے جاتے ہی کھانا لگا۔ مرزا صاحب کے لیے اتنا کم اور سادہ کہ بقدرِ اشکِ بلبل، اور میرے لیے وافر اور متنوع۔

کھانے کے بعد پیرومرشد نے انگنائی میں دھوپ سے ذرا ہٹ کر اپنا پلنگ بچھوایا، میرے لیے ایک چھوٹی سی صندلی بچھائی گئی۔ بھنڈا تازہ کیا گیا۔ مرزا صاحب اپنا پیچوان کبھی کبھی مجھے اولوش فرماتے۔

جب بھنڈے کا لطف لے چکے تو مرزا صاحب نے فرمایا، ''ہاں صاحب، اب کہو، اب تخلیہ ہے۔'' میں نے کتابوں کی گٹھری کھولی، اور ایک کتاب ان کی طرف بڑھا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے کتاب کھول کر کہا، ''یہ تو میرا ہی دیوان ہے۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا؟''

میں نے عرض کیا، ''اس کی حاضری کا مقصد کچھ اور ہے۔ ملتمس ہوں کہ حضور ان مجلدات کو اپنے دستخط سے مزین فرما دیں۔ میں انھیں نذرِ دوستاں کر دوں گا، اس سے بہتر تحفہ دلّی کا کیا ہوگا۔''

''مگر بھائی، میں دستخط کیوں کروں؟ یہ کتابیں میری ملک تو ہیں نہیں۔''

میں نے التماس کیا، ''صاحبانِ عالیشان کے یہاں یہ طریقہ مصنف کی قدر شناسی کا رائج ہے کہ کتاب پر

مصنف ہی سے دستخط کرا لیتے ہیں اور اسے بڑا قیمتی تحفہ قدردانوں کے لیے جانتے ہیں۔"

مرزا صاحب ہنسے، ارشاد ہوا، "ہم تو یہ جانتے تھے کہ مصنف کی قدردانی ظاہر کرنے کے لیے اسے سات بلکہ چودہ پارچے کا خلعت پہناتے ہیں، اکیس رقوم جواہر کی مالا اور سات عدد کا جیغہ زیب گردن و سر کرتے ہیں۔ نصف روپے کی کتاب مول لے کر اس پر مصنف کے دستخط لینا اور کتاب تقسیم کرنا کون سی قدرشناسی ہے۔ خیر لاؤ، تم کہتے ہو تو اپنی مہر کیے دیتا ہوں۔ حسنِ اتفاق کہ ابھی 1278ھ میں نئی مہر بنوائی ہے۔"

یہ کہہ کر انھوں نے داروغہ سے قلم دان مانگا، ہر کتاب پر اپنے دست مبارک سے مہر کی۔ چاندی کے نگینے کی چوکور مہر تھی۔ پھر سوچ کر ایک کتاب پر لکھا:

برخوردار بینی مادھو سنگھ رسوا

اے آمدنت باعث دل شادیٔ ما

اسداللہ خان غالب نگاشتہ 16 رجب المرجب 1279ھ

کتاب میرے طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے، "اب تو خوش ہو۔" میں نے سر وقد ہو کر کتاب ان کے ہاتھ سے لی، آنکھوں سے لگائی۔ ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اجازت چاہی کہ آرام میں مخل نہ ہوں۔ ارشاد ہوا، "کوئی بات نہیں۔ بیٹھو۔ مجھے تمھارا لہجہ اچھا لگتا ہے اور تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ شعر کب سے کہتے ہو۔ صاحب دیوان ہو کہ نہیں، اور کس کے شاگرد اس فن میں ہو؟"

میں نے اپنے استاد مولوی خادم حسین ناظم، اور ان کے دادا ملا سابق بنارسی کا ذکر کیا۔ فرمایا، "مولوی ناظم صاحب سے تو شرف ملاقات نہیں، لیکن ملا سابق علیہ الرحمۃ سے واقف ہوں۔ ان کی مثنوی 'تاثیر محبت' میں نے اپنے بنارس کے قیام میں دیکھی تھی۔ بڑے جید آدمی تھے۔"

میں ان کی خدمت میں کچھ گستاخ ہو چلا تھا، شاید اس لیے کہ انھوں نے مجھے کچھ منہ بھی لگا لیا تھا۔ میں نے عرض کیا، "پیر و مرشد، جان کی امان پاؤں۔"

ایک بار مجھے انھوں نے غور سے دیکھا، فرمایا، "کہو کہو، کیا بات ہے؟"

میں نے جی کڑا کر کے کہا، "حضور کی رائے ہندوستانی فارسی گویوں کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ لیکن آنجناب تو خود بھی ہندوستانی ہیں؟"

ان کا چہرہ تھوڑا سرخ سا ہو گیا، لیکن پھر بھی انھوں نے نرمی سے فرمایا، ''فارسی زبان کے رموز و غوامض میری روح میں یوں پیوست ہیں جیسے فولاد میں جوہر یا رگِ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم۔ میں کہاں اور یہ غیاث الدین رامپوری اور دلوالی سنگھ قتیل فرید آبادی کہاں۔ ان کے اجداد نے بھی کبھی ایران نہ دیکھا ہوگا۔''

''لیکن حضور اور بھی تو ہندی شعرا ہیں۔ امیر خسرو، ملا فیضی، ملا غنی کاشمیری، ابوالبرکات منیر، یہ لوگ تو غیاث و قتیل جیسے نہیں۔''

اب ان کے لہجے میں ذرا گرمی آگئی۔ ''اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں، سمجھے؟ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ ہاں غنی اور منیر اور خود فیضی اچھے شاعر ہیں، معنی یاب ہیں، لیکن زبان سے ان کو کیا علاقہ؟''

میرے جی میں آئی، پوچھوں کہ زبان اور مضمون تو ایک دوسرے کے تابع ہوتے ہیں، پھر یہ کیوں کر ہوا کہ کوئی معنی یاب ہو لیکن زبان خراب لکھے۔ مگر اتنی گستاخی کی ہمت نہ تھی۔ میں نے سوچا بیدل کے پردے میں بات کریں۔ کل بیدل کا ذکر آبھی چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''حضور ایک زمانے میں تو میرزا بیدل کے بڑے مداح تھے....''

میری بات کاٹ کر بولے، ''مداح اب بھی ہوں، لیکن ان کی زبان کا نہیں۔ بیدل اور ناصر اور غنیمت، ان کی فارسی کیا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔'' انھوں نے کلیان کو آواز دی کہ بھنڈا دوبارہ تازہ کرو۔ میں نے رکتے رکتے عرض کی، ''ڈرتا ہوں جس طرح حضور ان شعرا کو ایوانِ شعر سے خارج فرما رہے ہیں، کہیں آپ کے ساتھ بھی زمانہ وہی سلوک نہ کرے۔''

یا تو لیٹے ہوئے تھے، یا مرزا صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمایا، ''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی زبان کی زمام میرے ہاتھ میں ہے، طبع میری سلیم ہے اور ذوق میرا درست اور میرے مضامین تو ایسے ہیں کہ لوگ انھیں رہتی دُنیا تک پڑھتے اور سمجھتے پھریں گے۔ ابھی یہ اہل ہند کیا جانیں گے اور کیا سمجھیں گے۔''

پھر انھوں اپنا شعر پڑھا۔

پایۂ من جز بہ چشم من نیاید در نظر
از بلندی اخترم روشن نیاید در نظر

خدا کی قسم، وہ وقت اور وہ ماحول، وہ ان کے چہرے پر بادشاہوں کا سا جلال اور مضمون کی وہ ندرت، کلام کا وہ زور، میں پھڑک ہی تو گیا۔ (اس واقعے کے برسوں بعد کسی انگریزی اخبار میں دیکھا کہ بہت سے ستارے ہم سے اتنی دور ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک بہت دھندلی، اور بہت دیر میں پہنچتی ہے، درحالے کہ اصل میں وہ بے حد چمک دار ہیں۔ تب مجھے ان کا یہ شعر یاد آیا۔ میں نے دل میں کہا، ہے بھگوان، کیا مرزا صاحب کو علم غیب تھا جو ایسے مضمون باندھ لیتے تھے؟) لیکن اس وقت تو مجھے ان کو چھیڑنا اور ان سے کچھ سیکھنا منظور تھا۔ دل کھول کر اس شعر کی داد دینے کے بعد میں نے کہا، ''قبلہ و کعبہ، غنی کے تو میرزا صائب بھی قائل تھے۔''

''اجی صاحب زادے، صائب کیا اور ان کا فیصلہ کیا؟ اہلِ ہند کے درمیان رہتے رہتے ان کی زبان خود غیر معتبر ہو گئی تھی۔ وہ ایرانی نژاد تھے مگر واردِ شاہجہان آباد تھے۔ 'انتقام کشیدن' اور 'انتقام گرفتن' دونوں بول گئے۔ 'انتقام گرفتن' ترجمہ ہے ہندی محاورے 'انتقام لینا' کا۔ فارسی میں غلط، بالکل غلط۔''

''مگر پیر و مرشد، اگر صائب کی زبان مشکوک ہے تو عرفی کو کیا کہیں گے؟ انھوں نے بھی تو عمر کا بڑا حصہ اکبر آباد میں گذارا؟''

''ہے ہے۔ عرفی کا نام تم کیوں بیچ میں لائے۔ وہ ہمارا مطاع ہے، ہم اس کے مطیع ہیں۔ وہ جو بھی کہے سب درست۔''

میں نے مدرسے میں جو تھوڑی سی منطق پڑھی تھی اس کے رو سے قبلہ و کعبہ کی یہ بات مجھے صریحاً غلط معلوم ہوتی تھی۔ لیکن مجھے ان سے مناظرہ تو کرنا نہیں تھا، کچھ حاصل ہی کرنا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا، ''حضرت، خان آرزو تو فرماتے تھے کہ جس طرح ایرانی صاحبانِ قدرت کو زبان میں تصرف کا حق ہے، اسی طرح ہندوستانی صاحبانِ قدرت کو بھی ہے۔''

''مگر اہلِ ہند میں صاحبانِ قدرت ہیں کہاں؟ کیا تم قتیل کو صاحبِ قدرت کہو گے، جو 'ہمہ جا ہمہ عالم' کو غلط بتاتا ہے اور 'ہیچ نہ بود' کی جگہ ریختہ کا محاورہ 'خاک نہ بود' لکھتا ہے؟''

''حضرت اہلِ ہند میں اور بھی لوگ ہیں۔ اگر امیر خسرو اعلی اللہ مقامہ مسلم الثبوت ہو سکتے ہیں تو بیدل کیوں نہیں؟ اہلِ ہند پانسو برس سے فارسی لکھ بول رہے ہیں، کیا ان کی فارسی اپنی جگہ مستند نہ مانی جائے؟ آخر سب ایرانی استاد بھی تو شیراز و اصفہان کے نہ تھے۔ کوئی بلخی ہے، کوئی غزنوی، کوئی بخاری، کوئی گنجوی۔''

''دیکھو دنگا کرنے کی بات اور ہے۔ ورنہ سیدھی خدالگتی یہی ہے کہ اہل ہند کو فارسی نہیں آتی۔ میرا معاملہ اور ہے۔ اس زبان سے ازلی و وہبی مناسبت کے علاوہ میرا تو ایک ایرانی استاد بھی تھا جس نے مجھے یہ زبان گویا گھول کر پلا ہی دی تھی۔''

اتنا کہہ کر وہ آنکھ بند کر کے لیٹ گئے۔ شاید تھک گئے ہوں۔ مجھے یہ بھی خیال ہوا کہ شاید میں حد سے آگے نہ بڑھ گیا ہوں۔ میں اجازت کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ انھوں نے آنکھیں بند کیے کیے فرمایا:

''اہل ہند کی فارسی پر ان کی اپنی زبانوں کا اثر محالہ پڑا ہے، خواہ ہندی، خواہ بھاکا۔ اس لیے ان کی فارسی میں ایرانیت نہیں۔''

''لیکن حضرت والا یہ بھی تو خیال فرمائیں کہ جس قوم نے خسرو، فیضی، غنی، بیدل، بہار جیسے لوگ پیدا کیے ہوں، اس کا بھی تو فارسی زبان پر حق ہوگا؟'' میں نے ذرا زور دے کر کہا۔

''تم ان باتوں کو نہ سمجھوگے۔ بہار نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور صحیح کیا ہے۔ لیکن جہاں وہ بھی اپنے قیاس پر جاتا ہے، منھ کی کھاتا ہے۔ اہل زبان کے معاملات اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

''گستاخی معاف، پیر و مرشد میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بہار اور برہمن اور بیدل جو دن رات فارسی بولتے، لکھتے اور سوچتے تھے، انھیں اہل زبان کہنا چاہیے۔ میں اپنا خدشہ پھر عرض کروں گا کہ حضرت والا اگر اہل ہند کی فارسی کو برا کہتے رہے تو مبادا لوگ آپ کی بھی فارسی کو غیر معتبر کہہ دیں۔''

انھوں نے لمبی سانس لی اور بولے، ''آخر بچے ہو، اور راجپوت بچے ہو۔ تمھاری ضد کا علاج میرے پاس نہیں۔ اب جاؤ، میں کچھ آرام کروں گا۔''

میں سر سے پاؤں تک لرز اہی تو اٹھا کہ میں نے اس فرشتہ خصال بزرگ کو خفا کر دیا۔ میں نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور سر جھکا کر کہا، ''یہ نیچہ حاضر ہے۔ اسے میرے سینے میں اتار دیجیے لیکن للہ خفا نہ ہو جیے۔''

مرزا صاحب نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا، گویا اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔ ''خفگی کی کوئی بات نہیں۔ ہا، مومن خاں کیا خوب کہہ گیا ہے:

ناتوانی سے دم رکے تو رکے
میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

میاں صاحب، میں خفا نہیں ہوں۔ اپنی تقدیر پر افسردہ ہوں کہ اس دیار سے، اس ملک سے، فارسی کا ذوق اٹھتا جاتا ہے۔

غالب سوختہ جاں را چہ بہ گفتار آری
بہ دیارے کہ نہ دانند نظیری ز قتیل"

مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا، بس دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا کہ میں نے بے سبب ان کو افسردہ کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انھوں نے فرمایا، "ہاں مومن خان کچھ ہمارا ہم زبان تھا۔ اس کا ہندی شعر اس وقت خود یاد آیا۔ یہ شخص اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔ اچھا میاں تم اب جاؤ۔ فرصت ہو تو کل بھی اسی طرح آ جانا۔"

میں "بسر و چشم حاضر ہوں گا" کہہ کر رخصت تو ہوا لیکن راستے بھر خود کو نفرین کرتا رہا کہ میں مرزا صاحب سے بحث میں کیوں الجھا۔ دوسری طرف یہ سوچ کر بھی میں کم رنجیدہ نہ تھا کہ مرزا صاحب جیسا روشن دماغ شخص اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا کہ جب کوئی زبان اپنے ملک کے باہر پھیلتی ہے اور غیر ملک والے مدتِ مدید تک اس میں سلسلۂ شعر و نثر و حرف و سخن جاری رکھتے ہیں تو غیر ملکیوں کی زبان، اور غیر ملک سے آئی ہوئی زبان میں تغیر لازمی ہے اور کسی ملک میں جب کوئی غیر زبان قائم ہو جاتی ہے تو پھر وہ اس ملک کی بھی ہو جاتی ہے۔ آخر انگریزی بھی تو ہے کہ ہمارے ملک میں تیزی سے مستولی ہوتی جاتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار رہے تو سو دو سو برس میں ہندوستانی لوگ بھی انگریزی میں صاحبِ قدرت ہو جائیں گے۔

رہی دوسری بات، کہ بیدل، غنی وغیرہ کو تسلیم نہ کر کے مرزا صاحب قبلہ اپنی بھی نامعتبری کی بنیاد قائم کر رہے تھے، تو میں ذرا آگے کی بات یہیں بیان کر دوں کہ ان واقعات کے کئی برس بعد میرے دادا استاد مولانا فاروق چریا کوٹی کے براہِ راست اور بڑے ہونہار شاگرد مولوی شبلی صاحب ہوئے۔ انھوں نے شعر فارسی کی تاریخ پانچ جلدوں میں لکھی۔ یہ جلدیں 1909ء تا 1918ء شائع ہوئیں۔ (آخری جلد ان کے انتقال کے بعد چھاپے خانے سے آئی۔) میں نے بڑے شوق سے وہ جلدیں عندالاشاعت منگائیں کہ دیکھوں ان میں ہمارے میرزا صاحب کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ لیکن مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ وہاں میرزا صاحب تو کیا، بیدل اور غنی اور سرخوش اور خان آرزو کا بھی ذکر نہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ شبلی صاحب کی نظر میں میرزا غالب

وغیرہ مستند نہ تھے۔

دوسرے دن میرزا صاحب کے وہاں جانے کے لیے میں فتح پوری کے بازار فواکہ سے گذر رہا تھا کہ دیکھا سارا بازار کابل کے عمدہ انگوروں سے پٹا پڑا ہے۔ میں نے ایک بڑی جھابی انگوروں کی مزدور کے سر پر رکھوالی۔ مرزا صاحب کی طبیعت اس وقت بحال نظر آئی۔ شاید وہ خفیف سا تکدر، جو میری بحثا بحثی سے پیدا ہوا تھا، زائل ہو چکا تھا۔ انگور دیکھ کر وہ خوش تو بہت ہوئے، لیکن ان کا مرغوب میوہ اور ہی بات رکھتا تھا۔ فرمایا:

''بہت عمدہ پھل لائے۔ بچوں کے کام آئیں گے۔ ایک دو دانے میں بھی کھالوں گا۔ لیکن کاش کہ ہر موسم آم کا موسم ہوتا۔ میں نے اپنی مثنوی میں کہا ہے:

آم کے آگے پیش جاوے خاک
پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

اس میں اور شعر بھی مزے کے ہیں۔'' میں ابھی تک اس شعر کی مناسبتوں اور حسنِ تعلیل کی داد کے لیے منھ کھولنے ہی والا تھا کہ مرزا صاحب نے فرمایا، ''اور میں انگور تو مفتی آزردہ وغیرہ جیسوں کو کھلاتا ہوں۔ کچھ سمجھے کیوں؟''

امتحان ٹیڑھا تھا، لیکن ماں سرسوتی نے لاج رکھ لی۔ معاً میں نے مرزا صاحب کا شعر پڑھا:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بچشم کم مبیں
ہی نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرزا صاحب مسکرائے، فرمایا: ''آدمی خوش ذوق ہو تو تمھارے جیسا ہو۔ شام کو آتے تو میں تمھیں لکیور پلاتا، کہ اس کا لطف بھی آم ہی جیسا ہوتا ہے۔ رنگت کی بہت خوب، قوام کی بہت لطیف، طعم کی ایسی میٹھی جیسے قند کا پتلا قوام اور یہ ہندوستانی گڑ چھال کی چھنی ہوئی شراب مجھے بالکل پسند نہیں۔''

(''لکیور'' کسی خاص شراب کا نام نہیں۔ ہر وہ شراب جس میں الکحل ہو، اور جو کھانے کے بعد پی جائے، Liqueur کہلاتی ہے۔ سب لکیوریں بہت تیز، خوشبودار، اور 'میٹھی' ہوتی ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ

کا تلفظ یوں کرتے ہیں کہ اول مکسور ہے اور واؤ معروف۔ غالب نے بھی یہی تلفظ کیا ہوگا۔ اغلب ہے کہ ان کی مراد شارتروز (Chartreuse) سے ہو جو اس زمانے کی مقبول فرانسیسی لکیور تھی۔ اس کا رنگ زردی مائل سبز یا ہلکا زرد ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے آم کے عرق سے اس کی مناسبت ظاہر ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ غالب نے لفظ لکیور سے ایسی برانڈی مراد لی ہو جس میں لکیور ملا کر اسے خوشبودار کیا گیا ہو، مرتب۔)

اب تک کھانا لگ گیا تھا۔ کھانے کے بعد بیسن سے ہاتھ دھوئے گئے۔ پھر اسی طرح انگنائی میں پلنگ اور صندلی کا اہتمام ہوا۔ بھنڈے کا دور چلا اور باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے عرض کیا:

''قبلہ و کعبہ نے کل جو حکیم مومن خاں صاحب کے بارے میں فرمایا تھا کہ طبیعت ان کی معنی آفریں تھی، اس پر کچھ مزید ارشاد ہو۔''

ٹھنڈی سانس بھر بولے، ''ہاں صاحب، وہ لوگ بھی خوب تھے، اور گوراشاہی کے پہلے کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اب نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں۔ ایک آزردہ اور ایک میں، دونوں جینے سے بیزار۔ نہ سخن وری ہے نہ سخن دانی۔ خیر، سنو۔ پرانے بزرگ معنی آفرینی سے مراد لیتے تھے کہ شعر میں کوئی نئی بات ہو، کوئی نیا مضمون ہو، کسی پرانی بات کا کوئی نیا پہلو ہو۔ ورنہ سامنے کی بات تو سب کہہ لیتے ہیں۔

دندان تو جملہ در دہانند
چشمان تو زیر ابروانند

کہنے میں کوئی مزہ نہیں۔ یہ کوئی کمال سخن وری نہیں کہ قافیہ سامنے رکھ لیا اور جس قافیے نے جو مضمون سجھایا، بے کھٹکے نظم کر دیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے۔''

تھوڑے سے سکوت کے بعد انھوں نے یہ دو شعر بڑے جوش و ذوق سے پڑھے:

عشرت ما معنی نازک بہ دست آوردن است
عیدِ ما نازک خیالاں را ہلال این است و بس
می نہم در زیر پائے فکر کرسی از سپہر
تا بکف می آورم یک معنی برجستہ را

اور فرمایا، ''میاں سنتے ہو۔ پہلا شعر صائب کا ہے، دوسرا کلیم ہمدانی کا۔ یہ خیالِ نازک کیا ہے؟ ایسا خیال جو لطیف اور باریک ہو، جو بیان میں آسانی سے نہ آئے اور جب بندھ جائے تو شعر کے اپنے لفظوں کے سوا کسی اور عبارت میں بیان ہو تو وہ بات نہ رہ جائے۔ اسی کو ابو طالب کلیم معنی برجستہ کہتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے آسمان کی بلندی پار کرنے جیسی محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ معنی ایسے ہوتے ہیں کہ ہاتھ میں آئے تو آئے، ورنہ چھوٹ گئے تو چھوٹ گئے۔ فقیر تکیہ نشین غالب کے یہاں ایسے مضامین کی کثرت ہے، کہ جب کوئی مضمون باندھ لیتا ہے تو خود وجد کرتا ہے کہ کیسے اس ہمائے بلند نشین کو پکڑا۔''

میرے منھ سے بے ساختہ نکلا:

آب بود معنی روشن غنی
خوب اگر بستہ شود گوہر است

میرزا صاحب ایک لمحے کو ٹھٹکے، پھر فرمایا، ''ہاں اچھی بات کہی۔ نازک مضمون بہتا ہوا پانی ہے، مٹھی میں نہیں آ سکتا۔ آ جائے تو گوہر ہی کہلائے۔ معنی روشن سے مراد ہے وہ مضمون جو اپنی تازگی کے باعث صدف سے تازہ نکلے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہو۔''

''سبحان اللہ، کیا تعبیر ارشاد فرمائی۔'' میں نے کہا۔

فرمایا، ''خیال بند شاعر وہ ہوتا ہے جو نادر مضامین کی تلاش میں دور دور نکل جانے کی جرأت کر سکے۔ سب سے پہلے خیال بند میاں شاہ نصیر تھے۔ لیکن جس شخص نے اس فن کو معراج پر پہنچایا وہ شیخ ناسخ تھے، کہ تمام شروع سابقہ کے ناسخ ہی ٹھہرے۔ ہم سب نے خیال بندی انھیں سے سیکھی۔ ہاں ان کے کلام میں درد مندی کی وہ کیفیت نہیں جو میر کا خاصہ ہے۔''

''پھر خیال بند شاعر سہل ممتنع تو نہ کہہ سکے گا شاید؟'' میں نے پوچھا۔

ارشاد ہوا، ''ہاں۔ مگر بعض لوگ نبھا بھی لیتے ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے اور کامیاب بھی ہوا ہوں۔ لیکن خالص خیال بندی کے ساتھ سہل ممتنع اور درد و کیفیت کا جوڑ دراصل ہے نہیں۔ ان دنوں خیال بندی کا چرچا اسی لیے کم ہوتا جاتا ہے۔ تمھارے کانپور کے پڑوس میں لکھنؤ ہے۔ وہاں ہماری طرف اور طرح کا ایک شاعر ہے، اسی نے آج کل خیال بندی کا چراغ خوب روشن کر رکھا ہے۔''

''غالباً آنجناب کی مراد نواب اصغر علی خان نسیم دہلوی سے ہے،'' میں نے عرض کیا۔
''ہاں اور آدمی وہ بڑے طنطنے والے ہیں۔ مجھے ایسے لوگ پسند ہیں،'' انھوں نے فرمایا۔ ''تم نے ان کا شعر سنا ہوگا:

مضمون کے بھی شعر اگر ہوں تو خوب ہیں
کچھ ہو نہیں گئی غزلِ عاشقانہ فرض

میں بھی کہتا ہوں کہ نرے مضامین ہجر و وصال کے ورے بھی تو کچھ ہوگا۔ اسے کیوں نہ ٹٹولا جائے۔ نظیری کیا خوب کہتا ہے:

ہزار رنگ دریں کارخانہ در کار است
مگیر نکتہ نظیری ہمہ نکو بستند

تو میاں، دُنیا تو بہت بڑی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ چشمِ تنگ کو وا کریں۔''
مجھے قبلہ و کعبہ کا شعر یاد آ گیا:

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

انھوں نے مسکرا کر فرمایا، ''شعر تو آپ کو خوب یاد ہیں، لیکن دیکھیے کہیں رسوا سے رسوا سر بازار نہ ہو جائیے۔ غالب کے چاہنے والے بہت ہیں، لیکن اس کا برا چاہنے والے بھی کم نہیں۔''
میں نے کہا، ''جناب والا کو تبارک و تعالیٰ نے محسودِ خلائق بنایا۔ اس کی قیمت تو ادا ہی کرنی ہوگی۔''
میرزا صاحب چپ ہو گئے۔ مجھے ہراس ہوا کہ زیادہ بے تکلف تو نہیں ہو گیا۔ لیکن وہ کسی سوچ میں تھے۔ میں بھی دم سادھے رہا۔ انھوں نے تھوڑی دیر بعد سر اٹھایا۔ ارشاد ہوا، ''جمعیت کم، تفرقہ زیاد۔ خودداری اور کبرِ نفس اور استغنا، یہ سب خداداد مجھ میں ہیں۔ پھر دکھ کیوں نہ اٹھاؤں۔ میرزا بیدل کہہ گئے ہیں:

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ نیست

لیکن چارہ نہ داشتن کے مضمون پر مجھے بیدل کا یہ شعر بہت اچھا لگتا ہے۔'' پھر انھوں نے ایک ادائے دردمندی وخودنگری سے شعر پڑھا، گویا اپنے دلِ داغ دار پر وہ جتنے مغموم ہیں، اتنے ہی متکبر بھی ہیں:

بیدل ز جگر سوختگی چارہ نہ دارم
با داغ مرا لالہ صفت عہد قدیم است

پھر ارشاد ہوا، ''زبان ومحاورہ الگ، کہیں یہ شخص شہنشاہ معنی تھا۔''

مرزا صاحب پھر خاموش سے ہو گئے۔ شاید شعر کی کیفیت میں گم تھے۔ اتنی دیر میں جھنڈا دوبارہ تازہ ہو کر آ گیا۔ پیر ومرشد متوجہ ہوئے تو میں نے عرض کیا، ''حضور کل شام کو حاضری کی اجازت ہو۔ پرسوں صبح کی ڈاک سے میں ان شاء اللہ چلا جاؤں گا۔''

فرمایا، ''ارے، ابھی آئے ابھی چلے۔ اے لو، میاں ذوق کا شعر یاد آ گیا:

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

کیا نوکری پر واپس جانے کی عجلت ہے؟''

میں نے گذارش کی، ''جی جلدی تو کوئی خاص نہیں لیکن....''

''تو کیا گھر پر کوئی منتظر ہے؟''

میرے دل پر چوٹ سی لگی، آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ''اعلیٰ حضرت، گھر ہے ہی نہیں۔ کانپور میں ہوں ضرور، لیکن غیر الدیار ہوں۔''

میری یہ کیفیت دیکھ کر مرزا صاحب نے بڑے نرم لہجے میں تفصیل پوچھی اور باصرار پوچھی۔ میں نے بھی مجبور ہو کر سب بتا دیا۔ وہ بالکل سناٹے میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے، ''تو تم بھی نسیمِ صبح گاہی کی طرح خانماں برباد ہو۔ جبھی تو میں کہوں کہ یہ دلِ درد آشنا اس بچے کو کہاں سے ملا۔ خیر جاؤ۔ رکتے تو اچھا تھا۔ لیکن تمھاری مرضی۔ ہاں کل شام کو ضرور آ جانا۔''

میں حسبِ وعدہ رات ڈھلے مرزا صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ کئی لوگ پہلے سے موجود تھے۔ ایک صاحب، جو مسن اور متین تھے، مرزا صاحب سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ طالبِ علم تو نہیں، لیکن کہیں معلم

لگتے تھے۔ قبلہ وکعبہ نے فرمایا: ''ذرا وہ شعر پڑھیے، میاں رسوا بھی سن لیں۔''
''حضرت، خاقانی کا شعر ہے،'' انھوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا، ''ملاحظہ ہو:

دست آب دہ مجاورانش
ارزن دہ برج کوترانش

اس کے معنی مفتی آزردہ صاحب کچھ بتاتے ہیں، لیکن میں ٹھیک سے سمجھا نہیں۔''
ارشاد ہوا، ''سمجھیں بھی تو آپ کیسے۔ یہ شعر مثنوی 'تحفۃ العراقین' کا ہے، اس کے پہلے والے شعر سے اس کا ربط ہے۔ وہ شعر سامنے نہ ہو تو مطلب کیا خاک نکلے۔'' پھر ایک لحہ تامل کر کے آپ نے شعر پڑھا:

روح از پے آبروے خود را
خلد از پے رنگ و بوے خود را

''کہیے، اب کچھ سمجھے؟''
''جی، اب کچھ کچھ بات کھل رہی ہے،'' مولوی صاحب بولے۔
''سنیے،'' مرزا صاحب نے فرمایا۔ ''یہ اشعار خانۂ کعبہ کی ثنا میں ہیں۔ استاد فرماتے ہیں، روح اپنی افزائش آبرو کے لیے کعبے کے مجاوروں کو وضو کا پانی دیتی ہے اور خلد، اخذ رنگ و بو کے لیے برج کعبۃ اللہ کے کبوتروں کو دانہ کھلاتا ہے۔''
مولوی صاحب بولے، ''ایک قول یہ ہے کہ 'دست آب دہ' لقب ہے اشرف الانبیا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔''
مرزا صاحب نے فرمایا، ''دیکھو ان اشعار میں فاعل موجود ہے۔ روح، کہ دست آب دہ ہے، اور خلد، کہ ارزن دہ ہے۔ یہاں کون سا قرینہ جناب رسالت مآب ﷺ کا ہے؟''
''جی، قرینہ تو کوئی نہیں، لیکن ایک جگہ خاقانی نے جنابِ رسولِ خدا ﷺ کے لیے 'دست آب دہ' کہا ہے۔ لوگ اسی سے استنباط کرتے ہیں۔''
''درست، لیکن وہ پورا فقرہ ہے 'دست آب دہ رسالت' یعنی منصبِ رسالت کو توضو کے ذریعے مزید روشن کرنے والا۔ بے شک یہ صفت حضور نبی آخر الزماں ﷺ کی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے 'دست آب دہ'

نہیں بدلتے۔ ’دست آب‘ کے معنی ہیں ’وضو کا پانی‘، لہٰذا ’دست آب دہ‘ کے معنی ہوئے، ’وضو کا پانی والا‘۔ اس کے سوا اور کوئی معنی نہیں۔‘‘

مولوی صاحب خاموش ہوئے تو میرزا صاحب اوروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ کئی لوگ جمع تھے۔ معلوم ہوا آج داستان گوئی کی محفل ہے۔ کبھی اُردو، کبھی فارسی داستان امیر حمزہ سنی جاتی ہے۔ مجھے ذرا تعجب ہوا کہ مرزا صاحب کو ان چیزوں سے بھی رغبت ہے۔ خیر، داستان گو تشریف لائے۔ کھانا ہوا، اس کے بعد داستان گو صاحب ایک مسند کی ٹیک لگا کر ذرا بلند جگہ پر بیٹھے۔ انھوں نے اپنے لیے افیون کا گھولوا تیار کیا، ایک دو چسکیاں لیں۔ پھر داستان آغاز ہوئی۔ شاید میرا لحاظ کر کے آج خسرو ہندوستان لندھور بن سعدان کا بیان تھا۔ داستان گو صاحب کیا تھے، گویا ایک کل کی گڑیا تھی کہ لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتی تھی۔ ہر لہجے پر قادر، ہر طرح کے لغات کے ماہر۔ رزم، بزم، طلسم، اور سب سے بڑھ کر عیاری کے وہ وہ قصے کہ لوگ چونک کر اپنی جیبیں ٹٹولتے کہ کہیں عمرو عیار نے ہماری بھی تو جیبیں نہیں تراش دیں۔

گئی رات تک محفل رہی۔ مرزا صاحب نے تقریباً آبدیدہ ہو کر مجھے رخصت کیا۔ صدر دروازے تک چھوڑنے آئے۔ پھر آنے اور خط لکھنے کی تاکید فرمائی۔ اِدھر وہ اندر تشریف لے گئے، اُدھر کلو داروغہ نے ایک ریشمی تھیلی میرے ہاتھ میں پکڑا دی، کہ نواب صاحب نے زادِ سفر عنایت کیا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ انکار کی تاب تھی اور نہ موقع۔ سرا پر آ کر دیکھا تو اکیاون روپے مہری تھے۔

اس ایک بار کے علاوہ میں کبھی دلّی نہ جا سکا۔ خط لکھتے مجھے شرم آتی تھی، لیکن سال میں ایک دو بار کوئی تحفہ میرزا صاحب کے لیے بھجوا دیا کرتا اور دعا کی درخواست کرتا۔ کبھی ملیح آباد کے آم اور جونپور کی امرتیاں، کبھی اپنے مبارک پور کی لنگیاں اور پگڑیاں۔ کبھی کبھی ایک آدھ غزل ہمت کر کے بھیج دیتا۔ لیکن انھوں نے اصلاحی غزل کبھی واپس نہ کی۔ شاید وہ مجھے شاگرد نہیں بلکہ حاشیہ بردار تصور کرتے تھے۔ کوئی بھی تعلق ان سے ہوتا، میرے لیے بہت ہوتا:

فی الجملہ نسبتے بہ تو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

وہ مجھے اپنا دوست تصور فرماتے تھے تو میرے لیے اس سے بڑا اعزاز کیا ممکن تھا۔

1868ء میں، انگریزوں کی دارو گیر و رستاخیز کے پورے دس سال بعد، مجھے اپنے کمہار دوست سے خبر ملی کہ میری زمینیں واگذار ہوگئی ہیں اور میرے گھرانے کو معافی مل گئی ہے۔ وہاں میرے گھرانے میں تھا ہی کون جو اس معافی سے منتفع ہوتا؟ جس گڑھی میں میرے اجداد ڈھائی سو برس رہے تھے اسے منہدم دیکھنے کے بعد میرے لیے بھی وہاں رہا ہی کیا تھا۔ میری ماں کے ایک عزیز بنارس میں عسرت کی زندگی گذار رہے تھے۔ میں نے انھیں بلا کر سب جائداد انھیں بے قیمت ہبہ کر دی۔ کانپور میں مجھے تنہائی کے سوا کوئی تعب نہ تھا۔ شادی میں نے کی نہیں۔ شاعری خوب چل نکلی تھی۔ توپ کے کارخانے میں تنخواہ اچھی تھی، عزت سے بسر ہو جاتی تھی۔

ایک دن فروری 1869ء کی کوئی تاریخ تھی کہ میں نے 'اودھ اخبار' میں پڑھا کہ بلبل ہند، نجم الدولہ، دبیر الملک، میرزا اسد اللہ خاں غالب، مالک حقیقی سے جا ملے۔ میں نے آہِ سرد بھری اور چپ ہو گیا۔ دل میں کہا، مرزا صاحب فرماتے تھے، اکرام خلاق زمین و زماں سے قلمرو نثر و نظم کا انصرام و انتظام بخوبی ہو چکا۔ اب اگر وہ چاہے گا تو میرا نام تا یوم القیام رہے گا۔ میرے دل نے کہا، آمین ثم آمین:

لکھا رہے سو برس تک جو لکھ جائے کوئے
لکھنے ہارا باؤلا سو گل گل مٹی ہوئے

میرزا کا نام ان کے بعد اور بھی چمکا۔ ان کے شاگرد خواجہ حالی نے 'یادگار غالب' نامی کتاب لکھی، [اول اشاعت، 1897ء، مرتب] اس کے خوب چرچے رہے۔ شبلی صاحب نے فارسی مرزا نوشہ کی نہ مانی تو کیا، خواجہ حالی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ غیر اہل زبان بھی فارسی پر قدرتِ تامہ رکھ سکتا ہے، اور میرزا صاحب کو یہ قدرت حاصل تھی۔ لاہور سے مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب 'آب حیات' چھپوائی [اول اشاعت، 1880ء، مرتب] تو اس میں میرزا صاحب کی باتیں ایسے مزے مزے کی لکھیں کہ لوگوں میں میرزا صاحب کا نام اپنے دوستوں کے ناموں سے مانوس ہو گیا۔ ابھی کچھ برس پہلے عظیم آباد کے کوئی صاحب ہیں، صلاح الدین خدا بخش، انھوں نے مرزا صاحب کا موازنہ جرمن کے کسی بہت بڑے شاعر سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ مرزا صاحب کو اس پر تفوق ہے۔ [یہ مضمون 1910ء میں چھپا تھا، اس میں صلاح الدین خدا بخش نے غالب کو عظیم

جرمن رومانی شاعر ہائنہ (1797ء تا 1856ء) پر فوقیت دی تھی، مرتب۔]

میں نے کہیں سنا کہ بھوپال میں کوئی ہونہار نوجوان بجنوری نام کے ہیں۔ انھوں نے مرزا صاحب قبلہ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ ہمارے صاحب کا مرتبہ کسی یورپین شاعر سے کم نہیں۔ لیکن ان کی یہ تحریر ابھی منظرِ عام پر نہیں آئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ بجنوری صاحب ان دنوں بہت بیمار ہیں، اللہ انھیں شفا دے۔ [عبدالرحمٰن بجنوری کی جس تحریر کا ذکر بینی مادھو رسوا نے کیا ہے وہ نامکمل رہی اور بجنوری کے انتقال کے بعد 'محاسنِ کلامِ غالب' کے نام سے 'نسخۂ حمیدیہ' کے دیباچے کے طور پر بھوپال سے 1921ء میں شائع ہوئی اور نقدِ غالب میں اہم مقام کی مستحق پائی۔ بجنوری کا انتقال 1918ء ہی میں ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 33 برس کی تھی، مرتب۔]

تھوڑی بہت انگریزی میں نے بھی پڑھی ہے۔ اتنا تو میں ڈنکے کی چوٹ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی انگریزی نظم میں وہ روانی اور وہ شوخی نہیں دیکھی جو میرے صاحب و قبلہ کے اکثر اشعار میں ملتی ہے۔ میرے محبان صادق الوداد حضرت نادر علی خاں نادر کاکوروی اور حضرت درگا سہائے سرور جہان آبادی نے انگریزی کے وافر ترجموں سے دامنِ اُردو کو مالا مال کیا ہے۔ لیکن میں دبی زبان سے کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ان میں سے کوئی نظم مرزا نوشہ یا میر تقی کے مرتبے کو نہیں پہنچتی۔ دوسری زبان سے ترجمہ کرنے میں کچھ نہ کچھ ضائع ضرور ہوتا ہوگا، یہ بات بھی ہے۔

مرزا صاحب کے مشکل اشعار کے معنی تو لوگ خود ان سے بھی پوچھ لیتے تھے، لیکن ان کے معتدبہ اشعار اُردو کی شرح درگا پرشاد صاحب نادر دہلوی کے ایک لائق شاگرد میاں حلم بریلوی نے لکھی۔ سنا گیا کہ ان کے سارے اُردو کلام کی شرح خواجہ بدر الدین راقم نے حیدر آباد جا کر لکھی تھی۔ لیکن وہ مرہونِ انطباع نہ ہوئی۔ پھر حیدر آباد ہی سے مولوی علی حیدر نظم طباطبائی نے اپنی شرح چھپوا کر عام کی [اول اشاعت، 1900ء، مرتب۔] مولوی صاحب کی علمیت اور شعر فہمی میں شک کسی کافر کو ہوگا، لیکن ان کی شرح کو غیر جنبہ داری سے پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مرزا صاحب مغفور سے کچھ کد ہے۔ ستائش وہ خوب کرتے ہیں، نکتے وہ عمدہ نکالتے ہیں۔ لیکن یہ بھی لگتا ہے کہ خواہ مخواہ کی عیب چینی بغیر انھیں چین نہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک علی گڈھ کے بی اے پاس صاحب نے، جو کانپور ہی میں مقیم ہیں، میرزا صاحب کے دیوان کے ساتھ بعض بعض اشعار کی شرح بھی شائع کی ہے [اول اشاعت، 1911ء، مرتب۔] حسرت موہانی

ان کا نام ہے۔ان دنوں قومی تحریکات میں حصہ لینے کے باعث جیل خانے میں ہیں۔ بڑے لائق اور گرما گرم شخص ہیں۔شرحیں ان کی نہایت مختصر لیکن بڑی معنی خیز ہیں۔شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔منشی تسلیم لکھنوی کے شاگرد ہیں۔اس لحاظ سے نواب نسیم دہلوی ان کے دادا استاد ٹھہرے۔منشی تسلیم صاحب کا ایک شعر مجھے مزہ دیتا ہے:

میں تو ہوں تسلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھ کو طرز شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

ان دنوں لکھنؤ والوں میں پھر تھوڑی بہت ٹھنی ہوئی ہے، درحالے کہ میر انشاء اللہ خان انشا نے تو صاف صاف انھیں لکھنؤ والوں کو لائق اعتنا گردانا ہے جو براہِ راست دہلی سے آئے ہوں، اور لکھنؤ میں جن کے گھر پچاس برس سے زیادہ پرانے نہ ہوں اور یہ انھوں نے اس وقت کہا جب اودھ پر مرزا منگلی کا راج تھا۔ وہ جنت آرام گاہ اپنی زبان کو شاید دہلی ہی کی زبان قرار دیتے تھے۔[ملاحظہ ہو'دریائے لطافت'، محررہ 1807ء، اول اشاعت 1850ء، مرتب۔] اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے میرزا صاحب میں ایسا کوئی تعصب نہ تھا۔ وہ شیخ ناسخ کے بھی قائل تھے اور خواجہ آتش کے بھی۔ایک بار بے خیالی میں انھوں نے مرزا رجب علی بیگ سرور کی تصنیف 'فسانۂ عجائب' پر بڑے سخت جملے کہے تھے۔لیکن ان اقوال میں تعصب نہ تھا، اپنی رائے کا بے لاگ اظہار تھا۔یہ ضرور ہے کہ مرزا صاحب خود اپنی زبان کے تئیں فرماتے تھے کہ اوروں کی نسبت فصیح تر ہے۔

میرزا صاحب مغفور کے ارتحال کی تاریخیں بہت کہی گئیں۔مولوی حالی نے غضب کا مرثیہ کہا۔میرا جی بہت چاہا کہ میں بھی مرثیہ کہوں۔لیکن کبھی ایک دو مصرعے سے آگے نہ بڑھ سکا۔خدا معلوم کیوں رقت طاری ہو جاتی۔لگتا کہ اپنے باپ دادا کا بھی مرثیہ کہہ رہا ہوں۔

مرزا صاحب کے گذرنے کی خبر کے کئی دن بعد تک میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان کا تعزیہ کسے دوں۔آخر دادا میاں کی درگاہ پر پانچ سیر شیرینی اور پانچ سیر کی شیر مالیں فاتحہ کرائیں اور تقسیم کر دیں۔گھر آکر مرزا صاحب کی یادگار تحریر کو آنکھوں سے لگا کر دو آنسو رو لیا۔

آج جبکہ نومبر 1918ء کی آخری تاریخ ہے، میں انگریزی حساب سے اٹھتر برس کا ہو گیا۔اتنی عمر بہت ہوتی ہے، امید ہے کہ جلد ہی میرا بلاوا آجائے گا۔کہنے کی باتیں تو اور بھی تھیں:

گفتی کہ چرا حال دل خویش نہ گوئی
من خود کنم آغاز بہ پایاں کہ رساند

میں نے وہی باتیں لکھی ہیں جن سے پڑھنے والے (اگر ان پراگندہ خیالیوں کا کوئی پڑھنے والا ہو) کو یہ تو معلوم ہو کہ میں کون تھا اور کن کن سے شرف ہم کلامی مجھے حاصل رہا ہے۔ گذری باتوں کو پچاس سے زیادہ سال ہونے کو آئے، لیکن لگتا ہے ابھی ابھی انھیں خواب میں دیکھ کر اٹھا ہوں۔ میرے باپ ماں کی من موہنی صورتیں، دادا جان اور مولوی خادم حسین ناظم کے نورانی چہرے، پوایاں راج کی سرحد پر انگریزی فوج کا ہجوم اور ڈنکا شاہ کا ماتم کرتی ہوئی اور پوایاں کے راجہ کو کوستی ہوئی عورتیں۔

میرزا صاحب کی بارعب شخصیت، جس میں بلا کا حُسن بھی تھا اور شوخی کے ساتھ عجب طرح کا حزن بھی۔ نواب ضیاء الدین خان اور منشی شیونرائن آرام۔ میر کاظم علی داستان گو۔ دلّی کے اجڑے پجڑے کوچہ و بازار، جن میں پھر بھی ایک غرور، ایک گردن افرازی کی شان تھی۔

اور میرا امامن، میرا کمھار دوست، اور وہ جسے بھی 1857ء نے کھا لیا۔ جس پر کبھی میری نگاہ پڑتی تھی۔ شاہ حاتم نے شاید ہم جیسوں کے ہی لیے کہا تھا:

اس وقت دل مرا ترے پنجے کے بیچ تھا
جس وقت تو نے ہاتھ لگایا تھا ہات کو
سب جان و تن ملا تھا نہ تھا کچھ خلل مگر
دونوں کے دل اس آن ترستے تھے بات کو

انگریز اتنی بڑی لڑائی ہارتے ہارتے جیت گیا۔ جرمن کو بھی شکست ہوئی۔ میرزا صاحب فرماتے تھے کہ غوث علی شاہ صاحب کا قول تھا، انگریز کا اقبال بلند ہے اس لیے اس کی عورتوں پر جن بھوت بھی نہیں آتا۔ اب میں اپنے جیتے جی تو اس اقبال میں گہن لگتے نہ دیکھ سکوں گا۔ اللہ بس باقی ہوس۔

He would not stay for me; and who can wonder?
He would not stay for me to stand and gaze.
I shook his hand and tore my heart asunder
And went with half my life about my ways.

A. E. Housman

سوار

چراغ کی روشنی مدھم تھی، یا یوں کہیں کہ زرد اور دُودی تھی۔ اس لفظ کو لکھ کر میں ذرا مسکرایا ہوں۔ یہ مصطلحاتِ طب میں سے ہے، اور مجھے اس کے معنی جانے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے۔ اشرف الاطبا حکیم شریف خاں صاحب مدظلکم العالی کبھی کبھی ہمارے مدرسے میں درس دینے قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ گذشتہ یوم الاحد کو آپ نے نباضی کے فن پر بڑی جامع تقریر فرمائی تھی۔ تقریر کیا تھی، پڑھنے اور پڑھانے کا مثالی سبق تھا۔ ایک بڑی عمر کا طالب علم شیخ الرئیس کی کتاب سے ایک جملہ پڑھتا، اگر پڑھنے میں اس سے غلطی ہوتی، یا خود کتاب کے نسخے ہی میں کوئی غلطی ہوتی تو قبلہ حکیم صاحب اس کی تصحیح کرتے۔ پھر وہ عربی عبارت کا فارسی میں ترجمہ کرتے۔ لیکن عبارت کے نکات وہ عربی ہی میں سمجھاتے۔ اس کے بعد ہر طالب علم کو حکم ہوتا کہ اپنے ساتھی کی نبض دیکھ کر ان خواص کی روشنی میں اس پر تبصرہ کرو جن کا بیان شیخ الرئیس کے سبق میں ہے۔ (تبصرہ کرنے کے لیے فارسی، بلکہ ہندی بھی بولنے کی اجازت تھی۔) بعض اوقات کوئی جھجکتا، کہ نبض پہچاننے میں غلطی نہ کر جاؤں یا کسی ایسے مرض کا ذکر نہ کر بیٹھوں جسے وہ طالبِ علم چھپانا چاہتا ہو۔ ایسی صورت میں حکیم صاحب جھجکنے والے طالبِ علم ہی کی نبض پر ہاتھ رکھ کر نبض کو مختلف طرح سے دباتے، کہ ہر بار اس کا سرگم بدل جاتا اور حکیم صاحب طالبِ علم سے کہتے کہ اپنی گردن میں دائیں طرف، شاہ رگ کے پاس انگلی رکھو، اور وہاں

پر نبض کے بدلتے سرگم کو محسوس کر کے اس پر تبصرہ کرو۔ یہ اور بھی مشکل کام تھا، مگر خالی از لطف نہ تھا۔ اسی سبق میں دودی نبض کا بیان تھا، یعنی ایسی نبض جو بالکل بے طاقت اور مرتعش ہو، جیسے بجھتے چراغ سے اٹھتی دھویں کی ہلکی لکیر۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ دودہ عربی میں کیڑے کو کہتے ہیں، اور دودی نبض وہ ہے جو کیڑے کی طرح بہت دھیمی چلے۔ لیکن ہم لوگوں کو چراغ کے دھویں والی توجیہ ہی خوش لگتی تھی۔

بس وہی حال میرے چراغ کا تھا۔ گرمی اس پر مستزاد۔ اگر پنکھا جھلوں تو کتاب کے اوراق اڑیں، اور اس سے بدتر یہ کہ چراغ کی لو اور بھی جھلملا جائے۔ مرتا کیا نہ کرتا، پسینہ آنکھوں اور منھ میں آنے لگتا تو آستین سے پونچھ کر پھر اپنے سبق کے اوراق پر نظر گاڑ دیتا۔ تفتازانی کی 'مطول' کا وہ نکتہ مجھ پر واضح ہی نہ ہوتا تھا۔ علامہ کا ارشاد تھا کہ کلام کے معنی منحصر ہوتے ہیں قائل کے عندیے پر، اور مخاطب کے اپنے ذہنی کیفیات پر۔ انھوں نے مثالیں بھی دی تھیں۔ میرا سبق یہ تھا کہ ان کے بیان کردہ اصول کو اپنی مثالوں کی روشنی میں ثابت کروں، یا علامہ کے قول پر کوئی اعتراض لاؤں۔ آج پنج شنبہ کی رات تھی، سبق ختم کر لیتا تو گھر جانے کی چھٹی تھی۔ لیکن علامہ کا اصول ہی ٹھیک سے سمجھ میں نہ آتا تھا، اپنی مثالیں کہاں سے وضع کرتا، یا علامہ پر اعتراض کہاں سے لاتا؟

میں مسجد فتح پوری کے ذرا پیچھے حضرت مولانا سیدنا وسندنا شاہ عبدالرحیم صاحب فاروقی علیہ الرحمۃ والغفران کی خانقاہ میں انھیں کے قائم کردہ مدرسۂ رحیمیہ کا طالب علم تھا۔ حضرت بڑے شاہ صاحب قبلہ تو ماہ صفر 1131ھ (مطابق جنوری 1719ء، مرتب) میں ہی رحلت فرما چکے تھے۔ ان کے بعد مدرسے کی سربراہی ان کے صاحب زادے احکم الحکما، اعلم العلماء، قدوۃ الواصلین، زبدۃ العارفین، معیار السالکین، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے مبارک ہاتھوں میں آئی۔ مجھ ناکارہ کو ان کے اسباق میں شریک ہونے کی سعادت کوئی دو برس تک نصیب رہی۔ ماتم وصد ماتم کا مقام ہے کہ چند مہینے پہلے 29 محرم الحرام 1176 سن ہجرتِ حضرت رسالت مآب ﷺ (مطابق 19 اگست 1762ء، مرتب) ہمارے قبلہ وحضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی حق پیوست ہوئے۔ دلّی کے تمام حلقوں میں اب تک ان کا سوگ منایا جا رہا ہے۔ مدرسے کی زمامِ کار اب غزالیٔ وقت، محدثِ زماں، ارسطوئے دوراں، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دام اللہ افضالہم و مدت فیوضہم کے دست مبارک میں ہے۔

اس وقت میری اٹھتی عمر تھی، یہی کوئی پندرہ برس کا رہا ہوں گا۔ مسیں بھیگ رہی تھیں، ہاتھ پاؤں اپنے

والد مبرور و مغفور کی طرح اچھے نکالے تھے۔ میرے والد، اللہ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، اعلیٰ حضرت شاہ عالم ثانی کے ساتھ بہار کے ایک چھوٹے سے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔ اس وقت آپ خدیو ہندوستاں، دارائے زماں، مملکتِ ہند اور مملکتِ علم دونوں کے حکمراں، ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی خلد اللہ ملکہم و سلطانہم کے اسم مبارک کے ساتھ سریر آرائے سلطنت نہ تھے۔ ان دنوں آں صاحب کی شہزادگی کے مبارک و مسعود ایام تھے، اور آپ کا لقب صاحب عالم، اور اسم مبارک شاہزادہ عالی گہر تھا۔ میری عمر کوئی تین سال کی رہی ہوگی، اور میری بہن ابھی پیدا ہی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کے نام، خیرالدین اور ستی بیگم، انھیں کے رکھے ہوئے تھے۔ قبلہ و صاحب عالم شاہزادہ عالی گہر نے از راہِ وفادار پروری و غریب نوازی میری والدہ کے لیے چھوٹی سی تنخواہ مقرر کر دی تھی۔ وہ نیک بندی اسی میں اپنا اور ہماری دو جانوں کا پیٹ پالتی تھیں۔ جب میں دس سال کا ہوا تو انھوں نے مجھے مدرسۂ رحیمیہ میں ڈال دیا، کہ مجھے مولوی بننے کا شوق تھا۔ اب تو مجھے یہاں پانچ سال ہونے کو آرہے تھے۔

میرے پاس اپنا حجرہ تھا۔ کوئی ساڑھے تین گز لمبا، تین گز چوڑا، کھردرے فرش پر چٹائی بچھی ہوئی، ایک لمبی نیچی سی چوکی جس پر کتابیں بکھری ہوئیں، کاغذ پھیلے ہوئے۔ ضرورت پڑنے پر انھیں کھسکا کر اسی چوکی پر کھانا کھا لیتا تھا۔ سونے کے لیے چارپائی کی اجازت نہ تھی۔ ایک ہلکی اور کچھ ملگجی سی اکبرآبادی دری، ہو سکا تو اس پر چھوٹی سی جاجم یا چاندنی۔ تکیے کی ضرورت تھی ہی نہیں، کسی موٹے دفتر کو سر کے تلے رکھ لیتا تھا۔ کھانا کبھی کبھی باہر سے آجاتا، ورنہ سوا روپیہ مہینہ جو مدرسہ ہر طالب علم کو دیتا تھا، مہینہ بھر کے کھانے کے لیے وافر تھا۔ سوا، یا حد سے حد ڈیڑھ دام میں عمدہ قسم کا سالن مل جاتا تھا۔ روٹیاں مفت تھیں، جتنی چاہو کھاؤ۔ کبھی کبھی کوئی ترکاری بھی روٹی پر رکھ دی جاتی تھی۔ ماہانہ رقم سے اتنا بچ جاتا تھا کہ اماں جی میرے لیے سال میں ایک دو سادہ جوڑے بنوا دیتی تھیں۔ کسی کسی سردی میں کوئی اللہ کا بندہ جڑاول کے نام پر شال دوشالہ یا اونی کپڑے کے پاجامے دے جاتا۔ کبھی کبھی میرے حصے میں بھی پڑتا۔ کتابیں مدرسے سے ملتی تھیں۔ زندگی گذرتی جاتی تھی، فکرِ فردا نہ تھی۔ لیکن اب وہ فکر بھی لاحق ہونے والی تھی۔ مدرسے میں یہ میرا آخری برس تھا۔ اب مجھے تلاشِ معاش، اور بہن کی شادی، دونوں مسائل سے معاملہ کرنا تھا، اور جلد کرنا تھا۔

بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ مجھے جلدی تھی کہ 'مطول' کی عبارت ٹھیک سے ازبر اور مستحضر کر لوں، اپنی مثالیں تیار کر لوں اور گھر جاؤں۔ جمعہ چھٹی کا دن ہوتا تھا، اس کی خوشی میں تمام طالب علموں کو اپنے اپنے گھر،

یا مقامی مربی کے یہاں جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ میں نے ذہن کو دوبارہ 'مطول' کی طرف مائل کرنا چاہا۔ مخاطب کے ذہنی کیفیات..... یعنی چہ؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخاطب یا سامع اپنے ذہنی کیفیات کے اعتبار سے مطلب نکالتا ہے؟ ہاں، کیوں نہیں؟ کسی مسجد میں ہم کہیں کہ ''امام صاحب آئے تھے''، اور ہم نے لفظ ''امام'' سے حجۃ الاسلام حضرت امام ابو حامد ابن محمد ابن محمد الطوسی الغزالی کا نام نامی مراد لیا ہو، لیکن سامع تو یہی سمجھے گا کہ ہم امام مسجد کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مطلبِ سامع کو مطلبِ قائل پر فوقیت ہوسکتی ہے؟ نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو احادیث و آیات الٰہی کا کیا ہوگا؟

مجھے سوچتے سوچتے جھپکی سی آگئی۔ چند لمحے (یا خدا معلوم ایک گھڑی) بعد چونک کر اٹھا تو محسوس ہوا کسی نے ذہن پر جالا تان دیا ہے، کچھ روزن بھی نہیں کہ روشنی اندر آئے۔ میں نے آنکھیں مل کر ہوش قائم کرنے کی کوشش کی۔ اتنے میں فتح پوری مسجد سے عشا کی اذان سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا تھا کہ مسجد کی جائے ضرور میں استنجا کر کے حوض وضو میں فریضۂ وضو انجام دوں اور بعد نماز گھر کی راہ لوں۔ شاید راستے میں علامہ اپنے تصرف سے میری گتھی سلجھا دیں، یہاں تو اب کچھ ہونا ہوانا تھا نہیں۔

میں 'معطول' کا دفتر سنبھال کر رکھ رہا تھا کہ میرے ذہن میں یہ مصرع خدا جانے کہاں سے در آیا:

سوار دولت جاوید بر گذار آمد

میں شاعر نہیں، فارسی کا کوئی خاص مطالعہ بھی نہیں۔ اتنی ہی فارسی پڑھی ہے جتنی اپنے اسباق کے لیے ضروری ہو۔ رہی غزل، تو وہ کوئی پڑھنے کی چیز نہیں، یوں ہی کوچہ و بازار کی ہوائیں میرزا بیدل، شیخ علی حزین، محمد افضل سرخوش، اچل داس، آنند رام مخلص، میرزا مظہر، خان آرزو اور بیسیوں دیگر شعرا کے کلام کو شہر بہ شہر اڑائے پھرتی تھیں۔ غزل کی اس مقبولیت کے باوجود میں نے کبھی ایک مصرع بھی نہ کہا تھا۔ اگر آئندہ کبھی کہنے کا خیال کرتا بھی تو ریختہ کہتا، کہ ان دنوں اچھے اور نئے شعرا ریختہ کی طرف جارہے تھے۔ ریختہ میں ایک شوخی اور رنگینی تھی اور وہ اب فارسی والوں کے ہاتھ سے نکلتی جارہی تھی۔ پھر یہ مصرع میں نے تو کہا نہ ہوگا؟ مگر کیا برجستہ، ذرا پُر اسرار سا مصرع تھا، سوار دولت جاوید برگذار آمد۔ کاش میں نے ہی کہا ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا امام سکاکی یا علامہ تفتازانی کی پاک روحیں یہ مصرع القا کر کے مجھے بتانا چاہتی تھیں کہ کلام کو بامعنی بنانا منحصر ہے سامع پر؟ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ پھر تو حق اور حقیقت کا معیار ہی ساقط ہوجائے گا۔ نہ

سہی، لیکن یہ مصرع اگر میں نے کہا ہے اور میں اس کے معنی سمجھ نہیں سکتا تو گویا یہ مصرع میں نے کہا ہی نہیں۔ کیا جانے یہ سوار دولت جاوید کون ہے، اور کس رہگذار پر اس کے ورود کی خبر دی جا رہی ہے؟ دوسرا مصرع لگاؤں خاک جب مجھے پتا ہی نہیں کہ مصرع اولیٰ میں کہا کیا گیا ہے۔

میں تو سمجھتا تھا کہ شاعر لوگ فکرِ سخن کرتے ہیں، سوچتے ساچتے ہیں، لفظ کاٹتے بڑھاتے ہیں، تب کہیں مصرع بنتا ہے اور اچھا شعر کہنے کے لیے تو خدا معلوم کتنا خونِ جگر جلانا پڑتا ہو، کتنے دن رات ایک کرنے پڑتے ہوں، یا اور اللہ جانے کتنے اور کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہوں۔ اسی لیے تو نعمت خان عالی نے کہا:

ارباب سخن راز سخن نام بلند است
از مصرع برجستہ خلف تر پسرے نیست

لیکن میاں جان، میں کون سا اربابِ سخن ہوں؟ مجھے تو بس یہ تمنا ہے کہ کسی اچھے مدرسے میں مدرس ہو جاؤں۔ جو کچھ بڑے بوڑھوں سے سنا اور سیکھا ہے اسے اوروں تک پہنچاؤں۔ شاعر بننا میرے گوشوارۂ عمل میں شامل ہی نہ تھا۔ مگر ہائے کیا خوب مصرع ہے، سوار دولت جاوید برگذار آمد۔ میں بے ساختہ گنگنانے لگا۔ مجھے موسیقی کا ذوق نہیں، لیکن میرے ساتھی کہتے ہیں میرا گلا اچھا ہے۔ میں مصرع دھیمے سر میں گنگناتا ہوا مسجد تک پہنچ گیا۔

پتا نہیں نماز میں کیا پڑھا کیا سنا۔ میرے دل دماغ میں تو وہی مصرع گونج رہا تھا۔ جیسے تیسے نماز پڑھ کر میں نے گھر کی راہ لی۔ گرمی کچھ کم ہو گئی تھی، دن بھر کی پچھوا دھم پڑ کر رک گئی تھی۔ سعادت خاں کی نہر کے دورویہ روشنی، اور پھولدار پیڑوں کی چھاؤں کے اطراف میں ہلکی ہلکی ہوا ٹھنڈی تھی۔

ہمارا گھر پھاٹک تیلیان کے بس ذرا اندر تھا۔ وہاں تک کا سیدھا راستہ تو یہ تھا کہ میں نہر سعادت خان کے کنارے کنارے چلتا چاندنی چوک کی آدھی راہ طے کر کے سیدھے ہاتھ کو کناری بازار میں مڑ جاؤں۔ پھر جامع مسجد کو الٹے ہاتھ پر چھوڑتے ہوئے چاوڑی بازار میں داخل ہو جاؤں، لیکن چاوڑی بازار کی پوری لمبائی طے کرنے کے بجائے آدھے راستے پر دائیں ہاتھ کو سوئی والان میں مڑ جاؤں۔ اس کے بعد گلیوں کا جال ہی جال تھا، لیکن آسانی اس میں تھی کہ میں پھر سیدھے ہاتھ گھوم کر بازار سیتا رام پہنچوں اور بلبلی خانہ، ترکمان دروازہ ہوتے ہوئے پھاٹک تیلیان پہنچوں۔ ذرا تیز تیز چلیں تو اس پورے سفر میں سوا ڈیڑھ گھڑی لگتی تھی۔

لیکن ایک راستہ اور تھا۔ یہ ذرا لمبا تھا، لیکن میں اسے کبھی کبھی اختیار کر لیتا تھا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ اثنائے راہ میں مالی واڑہ، یا بازار گل فروشاں کی سیر ہو جاتی تھی۔ وہ راستہ یوں تھا کہ فتح پوری سے ذرا آگے جا کر سیدھے ہاتھ کو بلی ماراں میں گھوم جائیں، پھر گلی قاسم جان کو چھوڑتے ہوئے الٹے ہاتھ کو مالی واڑے میں داخل ہو جائیں۔ پھر وہی راہ آپ کو چاوڑی بازار لے جاتی ہوئی پرانے راستے پر واپس لے آئے گی۔ بازارِ گل فروشاں والے مجھے پہچاننے لگے تھے، اور کبھی کبھی مجھ سے اپنی نذر نیاز کے موقعے پر فاتحہ دلواتے۔ پھر ہدیے کے طور پر مجھے کبھی ایرانی یاسمن کا بڑا سا گچھا، کبھی منگلور کے سرخ گلابوں کا گلدستہ، کبھی بنارس یا جونپور کے موگروں کے ہار، کبھی چمپا کی کلیاں، یعنی مناسب موسم کچھ پیش کرتے۔ اماں جی کے لیے یہ پھول بہترین تحفہ ثابت ہوتے۔ میری ماں کم عمری میں بیوہ ہوئی تھیں، اور اب بھی ان کے چہرے پر وہ صباحت تھی کہ اگر کبھی ہم لوگوں کے مجبور کرنے پر ذرا اچھا لباس پہن لیتیں تو محفل میں اچھی اچھی دولت مند شریف زادیوں کو ان پر غبطہ ہوتا تھا۔

مالی واڑے میں ہمیشہ کھوئے سے کھوا چھلتا تھا اور شور غل اس پر مزید سماں باندھ دیتا تھا۔ گل فروشوں کی صدائیں، گلہائے بوقلموں کی خوشبوئیں اور رنگینی، شائقین کا ہجوم، جن میں کبھی کبھی رجواڑے کی گلی والیوں کے ہوادار بھی ہوتے تھے، وہ رونق ہوتی تھیں کہ پوچھیے نہیں۔

''اے میاں، یہ حور ایرانی آپ کی منتظر ہے۔''

''سنو جی صاحب زادے، اس حیدرآبادی تلنگن سے تو دو دو بات کر لو۔''

''اجی مولانا، تسبیحوں کے لیے ان سے بہتر کلیاں کہاں۔''

''لے لو بھئی یہ مہرولی کے گلاب ہیں، شبنم اور شہد کی ملواں مئے ناب ہیں۔''

''صاحب یہ شاہجہانی دستنبو ہیں، گلیاں ان سے مشکبو ہیں۔''

''بیائید میاں صاحب، ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔''

''اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری۔''

ایک سے ایک ہار اور گجرے۔ ڈھائی تین سیر کا گجرا اور پانچ سات سیر کا سہرا تو معمولی بات تھی۔ لوگ گلدستے، دستنبو، ہار، گجرے، بدھیاں وغیرہ قیمت جمع کر کے پہلے سے بنوا رکھتے اور بھاری گجرے یا سہرے کے لیے تو دو دو تین تین دن پہلے کہنا پڑتا تھا۔ لیکن جو بھی اپنا مال لینے آتا فوراً وہاں سے چلا نہ جاتا۔ گل فروشوں کی

سجاوٹیں اور صدائیں اور خوشبوئیں دیر تک دلوں کو باندھے اور قدموں کو روکے رکھتیں۔

دور نزدیک سے آنے والے یہ ازہار متنوع اللون خدا جانے کس طرح اتنی دیر دیر تک محفوظ رکھے جاتے تھے۔ کئی کئی دن تک ان کی رونقیں کم نہ ہوتیں اور جب تک پچھلے پھولوں کو گاہک لے جائیں، نئے پھول آ جاتے لیکن اپنی شاخ سے ٹوٹ کر بیچارے غریب الوطن بھلا کب تک زندگی کرتے؟ ان کی تازگی بہرحال چند ہی دنوں کی مہمان ہوتی۔ میرزا رضی دانش کا کیا عمدہ شعر ہے:

گل بدست گل فروشاں رنگ بیماراں گرفت
آب غربت ناز پرورد گلستاں را نہ ساخت

گل فروشوں کا کمال یہ تھا کہ خود ان کی دکانوں پر کوئی گل زرد رُو دیکھنے میں نہ آتا تھا۔ خدا جانے کس وقت وہ اپنے پژمردہ اور افسردہ مہمانوں کو رخصت کر دیتے تھے۔ دکانیں تو ان کی علی الصباح کھل جاتیں اور رات گئے تک کھلی رہتیں۔ جب تک چاوڑی اور رجواڑے کا آخری تماش بین اور رؤسا و اہلِ ثروت کی صحبتِ شبینہ کا آخری مہمان نہ رخصت ہوتا، گل فروش بھی اپنی دکان سجائے رہتے۔

اس دن مجھے جونپور کے موگرے تحفے میں ملے۔ اس قدر بڑے بڑے جیسے سفید گلاب کے پھول اور اس قدر خوشبو کہ اکثر تو تین چار دن تک یوں ہی بستر پر پڑے رہنے کے باوجود مہکتے رہتے۔ میں بلادِ مشرق میں کبھی نہیں گیا، وہاں رہنے کا تو خیر کوئی امکان بھی نہ تھا۔ لیکن مجھے ان مشرقی پھولوں سے بے حد محبّت تھی، شاید اس لیے کہ میرے والد مرحوم کی آخری آرام گاہ مشرق میں بنی۔

آج بازار سے کھانا لے کر نہ کھایا تھا، کہ اماں جی کے ہاتھ کی نعمتیں نصیب ہوئی تھیں۔ اپنی بہن کے لیے تازہ رس گلوں بھرا ایک کوزہ لے کر گھر پہنچا تو لگا جیسے پھاٹک تیلیان کی ساری عمارت میری اماں جی کی پکائی ہوئی شیرمالوں کی خوشبو سے گمک رہی ہے۔ ستی بی بی دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی، اور ابھی میں ٹھیک سے اندر بھی نہ آنے پایا تھا کہ وہ بولی:

''بھائی جان، بھائی جان، آپ نے کچھ سنا؟''

''کیا سنا؟ میری بنو نے گھر بیٹھے کچھ سن لیا ہو تو سن لیا ہو، بازار میں تو آج کوئی خبر نہیں۔''

''ہٹیے آپ تو میری ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ سنا ہے کہ کل کوئی خنگ سوار نکلیں گے....''

''لے تو یہ رس گلے کھا، خنگ سوار وغیرہ کوئی تیری طرح بھو کے تھوڑی ہیں جو یوں بازاروں میں گھومتے پھریں۔''

''اور لو، تو کیا میں بازاروں میں گھومتی پھرتی ہوں؟ سن تو لیجیے، برائے خدا سن لیجیے اور اللہ ہمیں بھی انھیں دکھا دیجیے گا۔''

'بی بی ترا دماغ تو نہیں چل گیا؟ ذری کنے تو آ، تیری نبض ٹٹولوں۔ لے بھئی، تو باہر سانڈ کی جوں اینڈ تے مشٹنڈے خنگ سوار کو دیکھے گی؟''

''وہ کوئی بقول آپ کے مشٹنڈے نہیں ہیں۔ پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ کل صبح سیاہ قیطاس پر سوار وہ دو گھڑی دن رہے اچانک نمودار ہوں گے۔ یہیں ترکمان دروازے کے پاس۔ پھر وہ بلبلی خانے کی طرف بازار سیتارام، حوض قاضی، چاوڑی بازار ہوتے ہوئے جامع مسجد کے شمالی دروازے کی سمت آئیں گے۔'' اس خوف سے کہ میں پھر اسے نہ ٹوک دوں، وہ جلد جلد کہتی گئی۔ ''شمالی دروازے کی سمت سے وہ کناری بازار ہو کر چاندنی چوک پر نکلیں گے۔''

''پھر؟'' میں نے جھوٹی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''پھر کیا، وہ جس طرح اچانک ظاہر ہوئے تھے، اسی طرح غائب ہو جائیں گے۔ لیکن بھائی جان....''

مجھے ایسا لگا کہ اب جو بات کہنی ہے اسے کہنے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔ ''کہو کہو'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور اس کے ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو ٹھیک سے اڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی، وہ.... وہ....'' پھر اچانک وہ ہمت مجتمع کر کے بڑے جوش سے بولی۔ ''کوئی ان کا راستہ روک لے تو پھر وہ ان سے کچھ بھی مانگ لے.... سب کچھ ملے گا۔ بس راستہ روکنے کی دیر ہے۔''

''لڑکی غیبانی ہوئی ہے؟'' اماں جی تھکے ہوئے انداز میں بڑبڑائیں، ''آج صبح سے یہی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ آخر تو ان سے مانگے بھی تو کیا مانگے گی؟''

''میں اپنے بھین کے لیے چاندسی دلھن مانگوں گی۔''

''توبہ ہے۔ اتنی محنت اور ہمت کا کام، اور تمنا اتنی حقیر.... اے لو، میرے خیرو کو کیا ہو گیا؟'' اماں جی گھبرا کر بولیں۔ میں اپنی ماں بہن کی گفتگو سے بیگانہ سا، بالکل سن، ایک ٹک تاک رہا تھا۔ میرے دل میں خدا جانے کہاں سے یہ مصرع امڈا آ رہا تھا:

عنان او نہ گرفتند از گذار برفت

یہ تو پورا شعر ہی ہو گیا، میں نے تقریباً مجنونانہ انداز میں زیر لب کہا:

سوار دولت جاوید بر گذار آمد
عنان او نہ گرفتند از گذار برفت

تو کیا یہ شعر میں نے کہا نہیں، مجھ سے کہلایا گیا ہے؟ کیا واقعی کوئی بزرگ کل یہاں سے گزریں گے؟ اور کیا سچ میں اگر کوئی ان کی راہ روک لے.... لیکن میرا مصرع تو کہتا ہے کہ ان کی راہ کوئی بھی نہ روکے گا، حالانکہ شاید وہ خود بھی چاہتے ہیں کہ انھیں کوئی بڑھ کر روک لے؟ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا میں اپنی پیاری بہن ستی کے لیے ان سے کچھ مانگ لوں؟ شعر تو شعر ہی ہے، میں نے کہا بھی تو کیا ہوا کہ کسی نے ان کی لگام نہ تھامی اور وہ چلے گئے۔ شعر اور ہے، حقیقت اور ہے۔

میں سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ اماں جی سارے گھر میں گھبرائی گھبرائی خمیرہ گاؤزباں ڈھونڈ رہی تھیں۔ بچاری ستی بیگم پنکھے کی ہوا کر رہی تھی اور درود پڑھ کر دم کر رہی تھی۔ میں نے جلد جلد اپنے حواس درست کیے۔ ’’کچھ نہیں کچھ نہیں، گرمی بہت ہے۔ ذرا چکر سا آ گیا تھا۔ اماں جی، آپ پریشان نہ ہوں اور ستی بیگم، کوئی اور بستی نہیں، یہ دلی ہے۔ یہاں ہمیشہ ہی سیاہ پوش، سبز پوش، سانڈنی سوار، وغیرہ کی افواہیں اڑتی رہتی ہیں۔ یہ تو دلی والوں کے کھانے کی چٹنی ہیں۔ لو بھئی کھانے کے نام پر بھوک لگ گئی۔ اماں جی آپ کی شیر مالوں نے تو سارا بازار مہکا دیا ہے۔‘‘

کھانے کے دوران کوئی بات نہ ہوئی۔ ستی اور میں اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔ مجھے یاد آیا کہ بابا قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے وقت میں اسی دلی میں ایک بزرگ آئے تھے۔ وہ یوں ہی سڑکوں پر سوار پھرتے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ جو انھیں دیکھ لے وہ جنتی ہو۔ ایک عالم ان کی زیارت کو گیا۔ نہ گئے تو بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ نہ گئے۔ حضرت بختیار صاحب نے فرمایا، ’’میاں فرید، تم ان بزرگ کو دیکھنے گئے تھے؟‘‘

’’جی پیرو مرشد، میں تو نہ گیا۔‘‘

’’کیوں؟ کیا تمھیں جنت میں جانے کی تمنا نہیں؟‘‘

''جی اعلیٰ حضرت، ہے تو سہی۔''

''تو پھر؟''

''جان کی امان پاؤں،'' بابا فرید نے کچھ جھجکتے ہوئے فرمایا۔

''کہو، بے خوف کہو۔ میرے سامنے تمھیں نفس مطمئنہ حاصل ہے،'' حضرت بابا بختیار نے ارشاد فرمایا۔

''حضرت اقدس بھی تو تشریف نہیں لے گئے اور آنجناب کے بارے میں نص صحیح کی بشارت تو کوئی ہے نہیں کہ حضور کو جنت ہی ملے گی۔ میں اگر جا کر ان بزرگ کی زیارت کر کے جنت کا مستحق بن بھی گیا تو کیا؟ اعلیٰ حضرت نے تو انھیں دیکھا نہیں۔ لہٰذا معلوم نہیں کہ جنت آپ کے قدومِ بابرکات کو بوسہ دے گی کہ نہیں۔ تو ایسی جنت میں جا کر کیا کروں جس میں میرے حضرت وقبلہ، میرے محبوبِ روحانی، میرے پیر ومرشد نہ ہوں۔''

حضرت بابا بختیار کو یہ ارادت والفت، اور تعلق مع الشیخ کی قوت، اتنی پسند آگئی کہ آپ نے جوش میں آکر نعرہ کیا اور فرمایا:

''فریدالدین، ان بزرگ کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ جو انھیں دیکھ لے وہ جنتی ہو۔ میں حق سبحانہ تعالیٰ العزیز کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ جو تمھاری قبر دیکھ لے وہ جنتی ہو۔''

[سچ ہے:

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آج ایسے کوئی بزرگ ہوں جن کو روک کر انسان جو چاہے مانگ لے، اور جو مانگے اسے پا بھی لے؟ نہ سہی، لیکن میری ننھی سی بہن کو تو اعتقاد تھا۔ اسے مایوس کیوں کروں۔]

''ستی بی بی کیا وہ بزرگ جناب امیر حمزہ ہیں؟'' میں نے کھانا ختم کرتے کرتے پوچھا۔

''پتا نہیں، کیوں؟''

''تو نے کہا کہ وہ سیاہ قیطاس پر سوار ہوں گے۔ تو یہ نام تو داستانِ امیر حمزہ میں جناب امیر حمزہ کے مرکب کا ہے۔''

''پتا نہیں،'' اس کی پیشانی پر تفکر کی ہلکی سی شکن تھی۔ ''میں نے داستانِ امیر حمزہ کبھی سنی نہیں۔ مجھ سے تو کہنے والی نے یہی کہا تھا۔''

''تو وہ کہنے والی تجھے بے وقوف بنا رہی تھی۔ لیکن چل، کوئی بات نہیں۔ تیری ضد میں ضرور پوری کروں گا۔ استاد خیر اللہ مہندس کا پوتا میرا دوست ہے۔ ان لوگوں کی ڈیوڑھی بہت بڑی ہے، پردے کا بھی معقول انتظام ہے۔ میں کل شام تجھے انھیں کے یہاں لے چلوں گا،'' میں مسکرایا، ''اور تیرے طفیل میں بھی ان بزرگ کی زیارت کرلوں گا۔''

''اے ہے لڑکے تیری تو مت ماری گئی ہے۔ جوان لڑکی کو باہر لے جائے گا؟ خدا معلوم کون ہیں وہ بزرگ، یہ بی بی جن کو دیکھنے کے لیے دیوانی ہو رہی ہیں۔ کہیں کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے،'' اماں جی گھبرا کے بولیں۔

''نہیں اماں جی، سوار وغیرہ کوئی کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں نہ کوئی بزرگ ہیں نہ پیر نہ پیمبر۔ بس ان بنو کی ضد پوری کرنے کے لیے بقاء اللہ کی حویلی تک لیے چلا جاؤں گا۔''

''اب تم جانو، کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ زمانہ خراب ہے۔''

''اماں جی، آپ کو پتا بھی نہ لگے گا کہ ہم کب گئے، کب آئے،'' ستی نے کہا۔ ''آپ ہرگز اپنا دل برا نہ کریں۔''

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہ آئی۔ گرمی بھی بہت تھی اور پراگندہ خیالی بھی۔ اگر میں سچ مچ ان بزرگ کو روک لوں تو کیا مانگوں گا؟ ستی بیگم کے لیے اچھا سا دولھا؟ اپنے لیے ڈھیر سارا علم اور شہرت؟ اماں جی کے لیے صحت، اور فارغ البالی؟ اور کہیں الٹا نہ ہو جائے؟ سنتے ہیں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی انوکھی صورتوں میں مراد مانگی جائے تو وہ پوری تو ہوتی ہے، لیکن اس کے بدلے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ یہ خطرہ کون مول لے گا؟

مجھے بار بار جھپکی آتی اور کسی پریشاں خوابی کی بنا پر نیند بار بار اچٹ جاتی۔ میری ماں بہن ذرا بہتر نیند سوئیں۔ دن بھر گھر کی مشقت کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ خاص طور پر مہربان ہوتا ہے۔ مگر ستی بیگم کی شادی تو کرنی ہی تھی، اور جلد کرنی تھی۔ بادشاہ سلامت تو ابھی دیارِ پورب میں ہی تھے۔ ان تک عریضہ کون پہنچائے

اور کس طرح پہنچائے اور کیا اب وہ اس مختصر درماہے کے اوپر بیٹی کی شادی کے لیے کچھ اور ارزانی فرمانا پسند کریں گے؟ میرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہم، جو بادشاہ سلامت کی غیر موجودگی میں کاروبار سلطنت سنبھالے ہوئے ہیں، ان سے رجوع کروں؟ حضرت شاہ صاحب کی معرفت کوئی درخواست بھیجوں؟

ادھر یہ بھی تھا کہ ننھی سی بہن کو بیاہ کر گھر سے گویا باہر کر دینا مجھے بے حد شاق بھی لگتا تھا۔ صورت شکل، سبھاؤ، ہنرمندی، سب میں وہ میری ماں کی طرح تھی، بلکہ اور بھی نازک اور طبیعت کی اور لطیف و نظیف۔ ایک دن کے کپڑے دوسرے دن نہ پہن سکتی تھی۔ رات کا رکھا ہوا کھانا، خواہ کتنا ہی لذیذ ہو، اسے گوارا نہ تھا۔ بلکہ گھر میں ایک وقت جو کچھ کھانا بچتا وہ دوسرے وقت کا انتظار کیے بغیر کسی سائل کو دے دیا جاتا، اماں شکایت کرتی رہتیں کہ ان بیگمات کے لیے دونوں وقت تازہ روٹی کون پکائے۔ لیکن وہ ہمیشہ کہتی کہ اماں روٹی پکانے کے لیے میں ہوں، دن میں دس وقت پکا دوں اور شاکی نہ ہوں۔ پکانے ریندھنے، سینے کاڑھنے میں تو وہ طاق تھی ہی، قرآن اس نے کئی بار ختم کیا تھا۔ آمد نامہ اسے پورا زبانی یاد تھا۔ فارسی کی سادہ عبارت سمجھ لیتی تھی۔ لیکن ایسی بیٹی کے لیے بر کہاں سے آتا؟ اور اسے باعزت رخصت کرنے کے ساز و برگ کدھر سے پیدا ہوتے کہ میری بہن خوشی خوشی اپنا نیا گھر آباد کر سکتی۔

آج رات سونا شاید مقدر میں تھا ہی نہیں۔ وہ شعر کم بخت بھی ذہن میں شہد کی مکھی کی طرح بھنبھنا رہا تھا۔ خدا معلوم کب آنکھ لگی، لیکن اچانک محسوس ہوا کہ اماں تہجد کے لیے اٹھی ہیں۔ پھر میں سویا ہی نہیں، چپ چاپ لیٹا فجر کی اذان کا انتظار کرتا رہا۔

گرمیوں کی شام دیر سے ہوتی ہے، لیکن اس دن ایسا لگتا تھا شام ہو کر ہی نہ دے گی۔

میں سرِ شام ہی استاد خیر اللہ مہندس کی اس حویلی پر آ گیا تھا جو بلبلی خانے سے ذرا اورے تھی۔ حویلی سرراہ تو تھی ہی، اور سیاہ قیطاس سوار کا مبینہ راستہ بھی بالکل متصل تھا۔ دیکھا کہ وہاں پردے کا خاص اہتمام ہے۔ میری طرح اور بھی لوگ اپنی بہنوں بیٹیوں کو زیارت کرانے لائے تھے۔ تھوڑی بہت چہل پہل تھی، لیکن عام طور پر لوگ چپ چاپ تھے۔

ابھی کم سے کم تین گھڑی دن رہا ہوگا کہ سارا ماحول قرق ہو گیا۔ سڑکوں، گلیوں، دکانوں کے اندر ایک متنفس نہ تھا۔ لگتا تھا سارا شہر دروازوں اور دکانوں کے تختوں پر، یا راستے میں کسی اچھی جگہ کو تاک کر وہیں جم

گیا ہے۔ کیا فقیر، کیا چھابڑی والے، کیا دکان دار، کوئی بھی بازاری صدا سنائی نہ دیتی تھی۔ گرمیوں کی شام تھی، لیکن نہ کٹورا بجتا تھا، نہ برف والے پکارتے تھے، نہ گجرے والے خریدار کو متوجہ کرتے تھے۔ ایک بار میرے بچپن میں مکمل کسوف الشمس واقع ہوا تھا۔ اس وقت کا سماں اور آج کی شام کا منظر، دونوں بالکل ایک سے تھے۔ کسوف ہونے کو تو دن کو، اور دوسرے پہر میں ہوا تھا، لیکن سورج دھیرے دھیرے کر کے سارا چھپ گیا تھا اور ہر چیز پر شام کا سا رنگ آ گیا تھا۔ سب طیور درختوں میں منقار زیر پر تھے۔ بازار کے کتے چپ لیٹ گئے تھے۔ انھوں نے ہانپنا بھی بند کر دیا تھا۔ پیڑوں پر پتیاں اور شاخیں سیاہی مائل ہو گئی تھیں۔ سب لوگ گھروں میں چھپے بیٹھے یا محوِ دعا تھے یا سیاہ کپڑا آنکھ پر رکھ کر گرہن کو دیکھ رہے تھے۔ یہ شام کسوف کی شام نہ تھی، لیکن منظر سب وہی تھا، بجز اس کے کہ آج لوگ گھروں کے اندر نہیں بلکہ باہر تھے۔

دفعتاً ترکمان دروازے کی طرف سے ہلکا سا، عجیب سا شور اٹھا اور پھر خاموشی۔ میرے پاس کھڑے کچھ لوگوں نے زیرِ لب درود شریف پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ مدھم سا شور پھر اٹھا، اور اس بار کچھ دیر تک رہا۔ بعض لوگ گردن بڑھا بڑھا کر ترکمان دروازے والے راستے کو دیکھنے کی کوشش کرتے تو بعض اور لوگ انھیں سختی سے لیکن اشاروں ہی اشاروں میں منع کرتے۔ معلوم نہیں خوف کے باعث، یا اس لیے کہ گردن نکالنے والے ان کے نظارے میں حائل ہونے کا امکان پیدا کر رہے تھے۔ یہ شور کیسا تھا؟ کیا سب لوگ وہاں پر بلند آواز میں درود یا کوئی دعا پڑھ رہے تھے؟ کوئی نمودار ہوا بھی تھا کہ نہیں؟

گرمی کچھ بڑھ گئی تھی، حالانکہ زوال کے بعد دلّی میں موسم ہمیشہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پسینے کی ایک بوند میری آنکھ سے پھسلتی ہوئی ناک میں چلی گئی۔ لیکن میں ناک کو کھجلانے یا ملنے کی ہمت نہ کر سکا، کہ کہیں اتنی ہی دیر میں منظر بدل نہ جائے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے گرد کے لوگ کچھ بے چین ہو رہے ہیں۔ ''کیا معاملہ ہے؟'' میں نے اپنے دوست کے کان میں کہا۔ ''پتا نہیں،'' وہ اسی سرگوشی کے لہجے میں بولا، ''دل گھبرا رہا ہے۔ جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔''

ابھی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گلی کے موڑ پر ہماری نگاہوں سے اوجھل، صدائے گریہ بلند ہوئی۔ گریہ میں درود کے الفاظ بھی پیوست تھے، جیسے رونے والا غم سے نہیں، جذباتِ عقیدت سے مغلوب ہو کر رو رہا ہو۔ جلد ہی وہ آوازیں ہلکی پڑ گئیں اور میرے سارے بدن میں لرزہ طاری ہو گیا۔ پاس کے کچھ لوگوں نے آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے۔ کچھ لوگوں نے بہ آوازِ بلند رونا اور درود پڑھنا آغاز کیا۔

بالکل سیاہ رنگ کا مرکب، نہایت بلند و بالا، عراقی مرکبوں سے بھی زیادہ تنومند۔ ایک نظر میں تو لگا ہی نہیں کہ فرس ہے۔ مرصع ساز و یراق سے آراستہ، رکاب میں شہسوار کی جوتی ہیرے کی طرح جگمگاتی ہوئی، سنہری روپہلی کسی ہوئی لجام۔ فرس کی یال میں موتی پروئے ہوئے، اس کے سر پر سفید سرخ نیلگوں پروں کی کلغی .... سیاہ عمامہ برسر اور چارقب جیسا مخملی لباس دربر، لیکن زیور شاید کچھ نہیں۔ ایک لمحے کے لیے آنکھ اس کی رکاب پر دوبارہ پڑی تو پتا لگا کہ سوار کی جوتی ہی نہیں، اس کی رکاب بھی الماس نگار ہے۔ گردن اونچی اٹھی ہوئی، ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا، نگاہ بالکل روبرو، گویا بھرے پرے شہر سے نہیں کسی لق و دق صحرا سے گزر رہا ہو۔ چہرے پر شادابی، لیکن احساس برتری اور جذبۂ نخوت کی وجہ سے ایک طرف کی ہلکی سی رونق اور چمک، جسے دیکھ کر آنکھیں روشن بھی ہوں اور خوف بھی آئے۔ اس قدر پر رعب کی نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔ ایک ہاتھ میں قد آدم سے طویل نیزہ، بجلی کی طرح روشن۔ بدن قطعی ساکت، لیکن تحرک اور شور کے تاثر سے لبالب، جیسے استاد منصور یا منوہر کے مرقعے کی کوئی تصویر ہو۔ یہ سمجھ میں آ نہ سکا کہ سوار کا چہرہ مہرہ، قد و قامت، یہ سب کیسا ہے۔ چاروں طرف، ہر طرف، ایک روشنی کا احساس ہوتا تھا۔

مرکب بہت ہلکی دلکی چل رہا تھا، لیکن کہیں سے گھنٹیوں کی بہت خفیف آواز سنائی دیتی تھی، جیسے سیاہ قیطاس کے پاؤں میں گھونگھرو ہوں، نظر کچھ نہ آتا تھا۔ میں نے کنکھیوں سے چاروں طرف دیکھا، کہ آیا ہم میں سے کوئی جیالا اس شہسوار کو روک کر عرضِ مدعا کرنے کے لیے بڑھتا ہے۔ میرے تو پاؤں میں دم ہی نہ رہ گیا تھا۔ سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ رونے اور درود پڑھنے کی آوازیں اب بند تھیں۔ ہر شخص اپنی جگہ پر بے حس و حرکت تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے لوگ اب چاہتے ہیں کہ سوار جلد از جلد گذر جائے۔ اس کا وجود ہمارے سامنے دو ہی چار دقیقہ بھر رہا ہوگا، لیکن مجھے، اور شاید سب کو، محسوس ہو رہا تھا کہ بڑی مدت گذر چکی ہے اور اب ہم میں مزید یہ تاب نہیں کہ اسے اپنے سامنے دیکھ سکیں۔

پھر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ گریہ و بکا کی صدائیں ایک بار پھر ہر طرف سے بلند ہوئیں اور ٹھہر گئیں۔ لوگ آہستہ آہستہ بکھرنے لگے۔

شہر کے معمولات کو دوبارہ شروع ہوتے بہت دیر لگی۔ لگتا تھا سارے شہر کو ہلکا سا فالج مار گیا تھا اور اب وہ بہت آہستہ آہستہ روبہ صحت ہو رہا تھا۔ ادھر میری بہن رستے بھر گم سم رہی۔ گھر پہنچ کر میں نے پوچھا، ''دیکھ لیا اپنے خنگ سوار کو؟''

''کیا دیکھتی؟'' وہ تقریباً روہانسی ہو کر بولی۔ ''وہ تو کوئی نقاب پوش خاتون تھیں۔ سارا چہرہ اور بدن کا بڑا حصہ چادر میں چھپا ہوا تھا۔ ہاں، ان بی بی کے سفید راہوار کی زیارت ضرور کر لی۔ ان کو روکنے اور کوئی مراد کہنے کی ہمت ہی نہ ہوئی؟'' وہ آنسو خشک کرتی ہوئی بولی۔

''یہ کیا فضول یاوہ گوئی ہے!'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''وہ تو کوئی مرد تھا۔ سیاہ مرکب پر سوار اور تو اسے سفید مرکب والی کوئی نقاب پوش رجّی بجّی بی بی [سلطان التمش کی بیٹی، سلطان رضیہ بیگم، مرتب] بتا رہی ہے۔ لڑکی ہوش کے ناخن لے۔ میں تجھے بیکار ہی اتنی دور لے گیا۔ تیری آنکھیں تو نہیں دکھنے آگئیں؟''

''بھائی جان ان باتوں میں مذاق نہیں کرتے۔ پاک ذاتوں کا معاملہ ہے۔ کہیں وہ برا نہ مان جائیں اور اللہ تعالیٰ تو ضرور ہی ناراض ہوگا۔ آپ اللہ کی برگزیدہ ایک بندی کے رہوار کو سفید کی جگہ سیاہ کہہ رہے ہیں اور خود انھیں عورت سے مرد بنائے دے رہے ہیں۔ توبہ کیجیے توبہ۔ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟''

''ارے احمق، مجھے کچھ نہیں ہوا، تو ہی کسی بہت بڑے دھوکے....''

ابھی میرا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ پروس کی تحجن بی ہانپتی کانپتی پہنچیں اور میری اماں جی سے مخاطب ہو کر بولیں، ''اے ہے بی بی تم نے رضیہ سلطان کو نہیں دیکھا؟ کیا حسین اصیل مرکب تھا....''

''اے لو تحجن بی بی، تم کو بھی یہی وہم ہے! اچھے خاصے مرد شہسوار کو عورت بنائے دے رہی ہو۔''

''وہم؟ وہم مجھے کیوں ہونے لگا میاں صاحب۔ میں اب بھی عینک نہیں لگاتی۔ اللہ نے میری آنکھیں ابھی جوانوں کی ہی سی رکھی ہیں۔'' وہ بھنا کر بولیں۔

میں نے چپکے سے ستی کی طرف دیکھا۔ میری بات غلط ثابت ہو جانے پر وہ خوش نہیں، بلکہ گھبرائی ہوئی سی اور الجھن میں مبتلا نظر آتی تھی۔ یہ بات تو صاف تھی کہ میں وہی بیان کر رہا تھا جو میں نے دیکھا تھا، اور وہ دونوں بھی وہی بتا رہی تھیں جو انھوں نے دیکھا تھا۔ میرے دل میں اچانک بڑے زور کی خفقانی کیفیت پیدا ہوئی، جیسے کلیجا گھبرا کر سینے کے باہر نکل آئے گا۔ اٹھ کر میں نے ایک کٹورا ٹھنڈا پانی جھجر سے لے کر پیا، لیکن دل ٹھہرا نہیں۔ میں چپ چاپ دالان پار کر کے پرلی طرف کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ وہاں گرمی بہت تھی، لیکن مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

وہ تینوں آہستہ لہجے میں کچھ باتیں کرتی رہیں۔ ستی بیگم یا اماں جی کو اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ عشا کی اذان ہوئی تو میں کالی مسجد میں نماز کے لیے چلا گیا۔

مسجد میں لوگ نماز سے زیادہ باتوں کی طرف مشغول تھے۔ ایک بڑے مقطع اور متین سے بزرگ فرما رہے تھے:

"میاں میں نے ان آنکھوں سے دیکھا۔ سانڈنی سوار تھا۔ سرخ رنگ کا ناقہ، اس پر بلند قامت شہ سوار، سوار کے سر پر اسی رنگ کا عمامہ، بلند لہراتا ہوا۔"

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ لیکن تھوڑی دیر میں مجھے معلوم ہو گیا کہ ہر شخص نے سوار دولت جاوید کو اپنے طور پر دیکھا ہے۔ لیکن میں اسے "سوار دولت جاوید" کیوں کہہ رہا ہوں۔ یہ خطاب اسے کس نے دیا؟ مجھے پھر گھبراہٹ ہونے لگی۔ جوں جوں کر کے میں نے نماز ختم کی۔ گھر آ کر تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا اور لیٹ رہا۔

صبح مجھے فجر بعد ہی مدرسے پہنچنا تھا، لیکن نیند بالکل نہ آئی۔ میری ننھی بہن بھی اس واقعے سے کچھ ہراساں اور چپ چاپ تھی۔ اماں جی نے ہم دونوں پر درود شریف کئی گھڑی تک دم کیا۔

دوسرے دن سے ہی مدرسے کے لیل و نہار تھے۔ پڑھائی کا شور تھا اور امتحانوں کی فکر۔ حالانکہ ابھی کئی مہینے باقی تھے لیکن طالب علم بیچاروں کی طبیعت میں وحشت بھی تو بہت ہوتی ہے۔ اچانک ایک بڑی اچھی بات ہوئی۔ خدا معلوم ان شہسوار کی برکت تھی یا محض اتفاق، کہ بارشوں کے دن شروع ہونے کے کچھ پہلے استاد خیر اللہ مہندس کے یہاں سے ستی بی بی کا رشتہ آیا، اسی میرے دوست بقاء اللہ کے لیے، جو استاد خیر اللہ کی حویلی میں اس دن ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے گھر کی عورتوں نے ستی کو پسند کر لیا تھا اور ہر طرح چھان بین کرنے کے بعد رشتہ بھیجا تھا۔ اماں جی نے اور میں نے سوچ سمجھ کر یہ رشتہ منظور کر لیا۔ ایک بار میرے جی میں آئی کہ ستی کا بھی عندیہ لے لوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ لڑکیوں کو ویسے سب خبر ہو جاتی ہے، خدا جانے کیسے۔ لیکن کوئی بات معلوم ہونا اور اس پر راضی ہونا الگ الگ باتیں ہیں۔ میں دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ میری بہن نے بھی اسے رشتے کو پسند کیا ہو۔

میرے دوست بقاء اللہ کے گھر میں کھانے پہننے کو اللہ کا دیا بہت تھا۔ خاندانی وجاہت بھی تھی۔ لیکن بقاء اللہ اور اس کے والد اپنے اجداد کے برعکس، نہ مہندس تھے نہ ریاضی داں، نہ ماہر ہیئت، نہ معمار۔ حتیٰ کہ شاعر بھی نہ تھے۔ بقاء اللہ کے دادا استاد خیر اللہ مہندس ماشاء اللہ ابھی حیات تھے۔ ہندسہ اور ہیئت کے علاوہ انھیں شعر و لغت میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کے شاگرد ٹیک چند بہار انھیں 'خیر المدققین' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ خود

ٹیک چند بہار نے اپنے زبردست لغت 'بہار عجم' کی ساتویں تبییض ابھی حال میں مکمل کی تھی اور اس میں جگہ جگہ خان آرزو کو 'سراج المحققین' اور استاد خیر اللہ کو 'خیر المدققین' کہہ کر ان کا ذکر کیا تھا۔ استاد خیر اللہ نے جے پور کے راجا سوائی جے سنگھ کے لیے ایک بہت بڑا رصد خانہ شہر دہلی کے کچھ باہر تعمیر کیا تھا۔ رصد خانہ کیا تھا، علم نجوم اور ہیئت کی عظیم الشان درس گاہ اور معمل تھا۔ ماوراء النہر تک کے حکما اس میں اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کرنے اب بھی آتے ہیں۔

بقاء اللہ کے والد مولانا صفی اللہ کا میلان تصوف اور رجوع الی اللہ کی طرف تھا۔ لہٰذا انھوں نے کسبِ ہنر دُنیا کے بجائے اپنے تایا، دلّی کے بے تاج بادشاہ، شیخ وقت، قطب دوراں، سیدنا و مولانا حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی کے مزار پُرانوار پر معتکف رہنا پسند کیا تھا۔ بقاء اللہ کا رجحان رمل اور جفر کی طرف تھا اور اسے اس نوجوانی میں ہی شہر کے اچھے رمال اور جفار اپنا ہم پلہ مانتے تھے۔ مجھے پوری امید تھی کہ اس کے ساتھ منسوب ہو کر میری بہن کو دین و دُنیا دونوں سے بہرۂ وافر ملے گا۔

طے پایا کہ میری دستار بندی کے بعد ستی بی بی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔ اس میں مصلحت تھی کہ موسم اس وقت تک نرم ہو جائے گا، اور شاید میں بھی کہیں برسر کار ہو جاؤں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اللہ کے کرم سے دلّی کے حالات اس وقت علم و تعلیم کے لیے سازگار تھے۔ حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز کی اولاد امجاد سے ایک صاحب شاہ نظام الدین اورنگ آبادی نے دلّی آکر شیخ وقت حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ ان کے صاحب زادے حضرت شاہ فخر الدین صاحب قبلہ، جن کی پیدائش 1126ھ [مطابق 1714ء، مرتب] کی ہے، اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ 1143ھ [مطابق 1729ء، مرتب] میں حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی واصل بحق ہوئے۔ پھر شاہ نظام الدین صاحب بھی ملائے اعلیٰ سے جا ملے۔ ان کے وصال کے بعد حضرت شاہ فخر الدین صاحب قبلہ نے دہلی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ یہاں وہ 1160ھ [مطابق 1747ء، مرتب] میں تشریف لائے اور جلد ہی انھوں نے مدرسۂ غازی الدین فیروز جنگ میں درس دینا شروع کیا۔ چند برسوں میں آپ کے کلام اور درس کی برکت سے یہ مدرسہ پڑھنے پڑھانے والوں سے بھر گیا۔ اکثر نئے معلموں کی ضرورت پڑتی۔ کچھ تو مدرسۂ غازی الدین فیروز جنگ ہی کے فارغ التحصیل وہاں برسرِ کار ہو جاتے، اور مجھ جیسے خوش نصیب کچھ دوسرے مدارس سے بھی لے لیے جاتے۔ اس طرح خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ 1178ھ کی ربیع الثانی کی پانچ تاریخ [مطابق 15 اکتوبر 1764ء، مرتب]

کو مجھے مدرسۂ غازی الدین فیروز جنگ میں مدرس درجۂ چہارم مقرر کر دیا گیا۔ گیارہ روپے درماہہ مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ متمول طلاب کے یہاں سے کبھی موسمی تحفے یا تیج تیوہار کے موقعے پر عیدیاں آجاتیں۔ اس طرح مجموعی یافت ساڑھے چودہ یا پندرہ روپے ماہانہ تک پہنچ جاتی۔ اجلے خرچ اور تھوڑا بہت پس انداز کرنے کے لیے یہ کافی تھا۔

شوال 1178ھ [مطابق اپریل 1764ء، مرتب] کو ماں اور ماں جائے کی دلاری میری بہن اپنے گھر کو سدھاری۔ نکاح کی تقریب سادہ لیکن پرکار تھی۔ حضرت قبلہ شاہ عبدالعزیز صاحب دام اللہ فیوضہم و مدت برکاتہم اور شاہزادہ صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ بہادر دام اقبالہم و خلد اللہ ملکہم کی طرف سے نکاحی جوڑے آئے اور سلامی کے طور پر شاہ عالمی اشرفیوں کی ایک ایک تھیلی بھی۔ ہمارے شاہ صاحب قبلہ خود رونق افزائے محفل نکاح تھے۔

یہ سب تو ہوا۔ جہاں تک میں سمجھتا تھا، میری بہن اپنے گھر خوش بھی تھی۔ لیکن میرے دل پر ایک عجب سا بوجھ، ایک مبہم سا خوف، ہمہ وقت رہتا تھا، جیسے کوئی بہت ضروری کام کرنا تھا، لیکن میں بھول گیا ہوں کہ کام کیا تھا، اور مجھ سے اس باب میں مواخذہ بہت جلد ہونے والا ہے۔ ایک افسوس ناک خبر یہ تھی کہ بنگالے کے نواب سراج الدولہ شہید کے دستِ راست اور معتمد خاص راجا رام نرائن موزوں کو کسی الزام میں ماخوذ کر کے عظیم آباد میں دریائے گنگ میں غرق کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اواخر ربیع الاول 1177ھ [مطابق اکتوبر 1763ء، مرتب] کا تھا۔ یہاں خبر ذرا تاخیر سے آئی، لیکن شہر کے تمام حلقوں میں دیر تک ان کا ماتم ہوا۔ اکثر لوگوں نے راجا رام نرائن موزوں کو فرنگیوں کی سازش کا شکار قرار دیا۔ راجائے موصوف عمدہ فارسی گو تھے، ریختہ بھی کہتے تھے۔ بیان کیا گیا کہ ہنگام غرقابی ان کی زبان پر یہ شعر تھا:

محروم رفت بے تو لب تشنۂ حسین
اے آب خاک شو کہ ترا آبرو نہ ماند

اس شعر کی خوبصورتی، اور موت کے سامنے راجائے مشار الیہ کا تحمل اور تمکین، دونوں کا چرچا شہر میں مدت تک رہا۔ لیکن مجھے اس واقعے میں اپنے لیے کچھ اشارہ بھی ملتا محسوس ہوتا تھا، کہ انجام کی خوبی اس میں نہیں کہ انسان محل یا قلعے میں تجمل و خدم و حشم کے ساتھ مرے۔ انجام کی خوبی یہ ہے کہ اپنے جوہر کو نہ ترک

کرے۔ پھر میرا جوہر کیا تھا؟ سوار دولت جاوید کے بارے میں مجھ سے شعر کہوانا، اور یہ ثابت کرنا کہ اس کا وجود ہے؟ لیکن میں اس کی عنان کو پکڑ کر اسے روکنا کیسا، اس کی طرف کوئی اشارہ بھی نہ کر سکا۔ لیکن کیا ضرور کہ وہ شہسوار کوئی برگزیدہ بندے ہی رہے ہوں؟ بظاہر تو وہ اہل اللہ کی جگہ نعوذ باللہ کوئی ساحر یا شعبدہ ساز لگ رہے تھے۔ ورنہ مختلف لوگ انھیں یک لخت مختلف روپ [بہروپ؟، مرتب] میں کیوں دیکھتے؟

لیکن پھر مجھ سے وہ شعر کیوں کہلایا گیا، اور وہ بھی ایسے موقعے پر؟ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ وہ میرا ہی شعر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے میں نے اسے پہلے کہیں سنا یا پڑھا ہو، اور وہ میرے ذہن کے کسی نامعلوم گوشے میں محفوظ ہو گیا ہو، اور پھر اس وقت اچانک ذہن کی تاریک بھول بھلیاں سے چھوٹ کر سامنے آ گیا ہو؟ ایسا ہوتا تو بہر حال ہے، ورنہ توارد اور کسے کہتے ہیں؟ لوگوں نے پوری پوری غزلیں اپنی دانست میں خود تصنیف کی ہیں، لیکن تھیں دراصل وہ کسی اور کی۔ پھر کس سے پوچھوں کہ وہ شعر ہے کس کا؟ میر شمس الدین فقیر، یا ٹیک چند بہار سے؟ لیکن ان سے پوچھنے کی ہمت کسے؟ خود ہمارے شاہ صاحب قبلہ، اور ان کے بھائی حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سلمہما اللہ تعالیٰ فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن ان سے بھی پوچھنا آسان نہ تھا۔ دونوں بزرگان، حفظہما اللہ، شفقت اور نرم خوئی کا مجسمہ تھے، لیکن اس طرح کی بات تو پوچھے وہ جوان کی خدمت میں گستاخ، یا کم از کم بے تکلف ہو۔ میری مجال کہاں؟ خان آرزو سے میں البتہ پوچھ لیتا، وہ میرے دادا مرحوم کے ملنے والے تھے۔ لیکن خان مبرور تو کب کے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

لیکن وہ شعر کسی کا بھی ہو، اس سے کیا؟ دل کو لگنے والی بات تو یہ تھی کہ وہ شعر دو علیحدہ مصرعوں کے روپ میں از خود میری فکر میں آیا اور ایسے موقعے پر، جب اس کی ایک مخصوص معنویت ہویدا ہونے والی تھی۔ جن حالات میں وہ شعر مجھ پر القا ہوا، یا مجھے یاد آیا، ان میں تو اسے ایک طرح کی پیشین گوئی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس پیشین گوئی میں میرے لیے اشارہ کیا تھا؟

اچھا یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ سب معاملہ مثالی اور تشبیہی رہا ہو۔ خنگ سوار کے مرکب کا نام 'سیاہ قیطاس' تو کچھ اسی رمز کی طرف انگشت نمائی کرتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک عالم جانتا ہے کہ داستانِ امیر حمزہ ایک قصۂ موضوعی ہے، اس کی کچھ بھی اصل نہیں۔ اس میں جناب امیر حمزہ کے فرس کا نام سیاہ قیطاس بتایا گیا ہے۔ تو کیا یہ قرین قیاس نہیں کہ کسی بہت ہی ڈھیٹ قسم کے بہروپیے نے ایک سوانگ رچا ہو، اور اس نام کے ذریعے کنایتاً کہا ہو کہ یہ شہسوار حقیقی نہیں، عملی ہے۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ شہسوار کوئی واقعی بزرگ رہے ہوں، اور انھوں نے

واقعی اپنے فرس کا نام قیطاس رکھ لیا ہو؟ سوال صرف یہ ہے کہ اس واقعے میں میرے لیے کیا رمز پنہاں ہے؟

یہ خلش تو مجھے سالتی ہی رہتی کہ ان شہسوار کا ان حالات میں نمودار ہونا میرے لیے کوئی امتحان تو نہیں تھا؟ اور اگر تھا تو میں یقیناً اس میں ناکام رہا۔ لیکن کوئی یہ تو بتائے کہ وہ امتحان تھا کیا، اور مجھ سے کیا عمل یا قول متوقع تھا، میں اکثر تقریباً روہانسا ہو کر اپنے آپ سے پوچھتا۔ دوسری طرف یہ کہ بہن کی جدائی کا غم مجھے اب بھی تھا۔ مانا کہ اس کا گھر میرے گھر سے دو گھڑی سے کم کی مسافت پر تھا، لیکن یہ فاصلہ میرزا صائب کے مصرعے 'چوں فاصلۂ بیت بود فاصلۂ ما' کے مصداق لگتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ روز اسے دیکھنے جایا کروں، لیکن خوف تھا کہ بقاء اللہ ہزار میرا دوست سہی، اس کے گھر والے شک کر سکتے اور برا مان سکتے ہیں کہ میں اپنی بہن کے سسرال والوں کی ٹوہ میں وہاں بار بار جاتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ میری بہن وہاں بہت خوش ہے، اور آرام سے ہے۔ لیکن بلا وجہ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا سا معلوم ہوتا کہ ستی بی بی سوچے گی، بھائی جان نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔

لیکن سچی بات شاید یہ تھی کہ میں اس حقیقت کو قبول کرنے کو تیار نہ ہو سکا تھا کہ میری ننھی سی بہن اب بڑی ہو گئی ہے، گھر بار سنبھالنے کے لائق ہو گئی ہے، اپنی گرہستی کی مالک ہو گئی ہے۔ وہ اب اپنی ماں کے گھر کی مہتمم نہیں رہ گئی۔ کوئی غیر اس کی اپنی ہستی پر متصرف ہے، اور اپنی گرہستی کی ملکیت حاصل کرنے کی یہ قیمت سب ہی لڑکیاں جلد یا بدیر، طوعاً یا کرہاً، ادا کرتی ہیں۔ مجھے امید تھی کہ میری بہن کے لیے یہ سودا طوعاً تھا، نہ کہ کرہاً، اور وہ اپنی تقدیر پر مطمئن تھی۔ لیکن میں تو اسی ستی بی بی کو ڈھونڈتا تھا جو مجھ سے ہر رات کہانی سنتی تھی اور ہر دن اپنی توتلی زبان میں مجھ سے جھگڑتی تھی۔

اماں جی کبھی کبھی کنایتاً میری بھی شادی کا ذکر چھیڑتیں، لیکن میں صاف کنی کاٹ جاتا۔

چند مہینے اور نکل گئے۔ میں اس میش گم کردہ راہ کی طرح زندگی گزار رہا تھا جو قوت لا یموت کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی ہے، اور امید کرتی ہے کہ گرگ درندہ کے آ لینے سے پہلے اسے گھر کا راستہ بھی مل جائے گا۔ 1179ھ کا سال تھا، اور ماہ صفر اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا [مطابق اگست 1765ء، مرتب] کہ خبر آئی ہمارے بادشاہ جمجاہ نے اپنے اسم سامی ابو المظفر جلال الدین کی مناسبت سے صفر المظفر کی 24 کو بنگال اور بہار کی دیوانی کمپنی بہادر کے حوالے کر دی۔ بکسر کی جنگ میں شکست کا اہل دہلی کو اتنا غم نہ ہوا تھا جتنا اس سانحے پر ہوا۔ جنگوں میں شکست و فتح تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ آخر ابدالی نے مراٹھا کو چند ہی برس پہلے یہیں دہلی

کے پاس پانی پت کے میدان پر شکست فاش دی تھی۔ [جنوری 1761ء، مرتب] ابھی اس واقعے کو ایک دہائی بھی نہ گزرنے پائی ہے کہ مراٹھا گردی دوبارہ اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ لیکن اختیارات ملکی و مالی ایک بار ہاتھ سے نکل گئے تو نکل گئے۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ بادشاہ جمجاہ، ظل اللہ، الہ آباد ہی میں فرنگیوں کے زیر سایہ عمر کاٹ دیں گے، لال قلعے کو دوبارہ دلھن بننا اب نصیب نہ ہوگا۔

جب حالات ایسے ہوں تو پڑھنے پڑھانے سے میرا دل اچاٹ ہو جانا تعجب کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ لیکن فرائضِ منصبی تو ادا ہی کرنے تھے۔ شومی قسمت سے مجھے منطق پڑھانے کو کہہ دیا گیا، اور کتاب تھی مدرسۂ رحیمیہ کے متبرک بانی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہ العزیز کے بھی استاد میر زاہد ہروی مرحوم کی شرح ملا جلال، جو 'میر زاہد ملا جلال' کے نام سے علمی حلقوں میں معروف تھی۔ مدرسے کا نسخہ مجھے پڑھانے کے لیے دیا گیا۔ سوئے اتفاق سے وہ کئی جگہ کرم خوردہ اور مغشوش نکلا۔ میں نے طے کیا کہ یوم الخمیس کو جامع مسجد پر کتابوں، نقشوں، اور نوادر کا بازار لگتا ہے، وہاں جا کر ڈھونڈوں گا۔

روزِ مقررہ پر میں صبح صبح جامع مسجد پہنچا۔ آج کچھ بھیڑ زیادہ تھی، معلوم ہوا فیضی، غنی کاشمیری، ابوالبرکات منیر لاہوری وغیرہ کے دواوین کے کئی اچھے نسخے کوئی قندھاری کتب فروش آج لے آیا ہے۔ میری مطلوبہ کتاب سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے دکان داروں کے یہاں نہ ملی تو میں نے اُردو بازار کے اندر کا رخ کیا ہی تھا کہ بالکل گلی کے نکڑ پر ایک معمر لیکن تنومند پہاڑی سائیس کو ایک نہایت خوبصورت ابلق کی راس تھامے ہوئے دیکھا۔ اس قدر تیاری کا راہوار یا تو آج دیکھا تھا، یا پھر سوار دولت جاوید کے زیر ران۔ میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گیا۔ اللہ خیر کرے، سوار دولت جاوید کا خیال میرے لیے اکثر 'سرود بہ مستاں یاد دہانیدن' کے مصداق ہو جاتا تھا۔ پھر میں پہروں نہیں تو گھڑیوں اسی کے تصور میں کھویا رہتا۔ لیکن معاً میری نگاہ سواری سے ہٹ کر سوار پر پڑی۔ کیا گبھرو جوان تھا، دل خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچتا تھا۔ میں بے ارادہ اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

میرا قد کوئی نو وجب [تقریباً چھ فٹ، مرتب] ہے، اور اس لحاظ سے میں اپنے ہم چشموں میں خاصا ممتاز تھا۔ لیکن یہ جوان مجھ سے بھی ایک دو انگل نکلتا ہوا تھا۔ کوئی بائیس چوبیس کی عمر، کھلتا ہوا گورا رنگ۔ ترکی یا مغل وضع کی خوب صورت ترشی ہوئی نوک دار داڑھی، بلند پیشانی، نیلگونی مائل سبز آنکھیں، پکھراج کی طرح

جگمگاتی ہوئی۔ سر پر ریشمی زرد ہرا چیرۂ بلدار۔ لمبی بلند گردن میں زبرجد کی مالا، کانوں میں گوہریں مرکیاں۔ بدن پر بہت ہلکے جامہ وار کے ہلکے سبز رنگ کی نیمہ آستین، یا خفتان، جس کا سینہ آج کی جدید وضع کے موافق بائیں طرف کھلا ہوا۔ اس کے نیچے باریک کپڑے کا انگرکھا، اتنا باریک کہ اس کے نیچے کُرتا نہ ہونے کی وجہ سے چھاتی کے شیرانہ پٹھے صاف جھلکتے تھے۔ انگرکھے کی آستین خوب تنگ اور چنی ہوئی۔ کسے ہوئے ڈنڈ، چوڑی کلائیاں۔

ایک دکان پر کھڑا وہ کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ میں نے نزدیک جا کر دیکھا، غنی کاشمیری کے دیوان کا مطلا نسخہ تھا۔ حسنِ اتفاق سے کتاب فروش میرا شناسا نکلا۔ وہ کسی اور گاہک کی طرف متوجہ تھا لیکن مجھے اشارے سے سلام کر کے اس نے ایک کتاب اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ میں نے دیکھا تو یہ اسی 'میر زاہد ملا جلال' کا ایک عمدہ نسخہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ میرا یہاں آنا تو تائیدِ غیبی معلوم ہو رہا ہے، میں نے اپنے دل سے کہا۔ دکان دار جوں ہی پچھلے گاہک سے فارغ ہوا، میں نے اپنی کتاب کے دام پوچھے۔ ذرا سی رد و قدح کے بعد سوا روپے میں سودا پٹ گیا۔ اجنبی چابک سوار نے 'دیوان غنی' کی منہ مانگی قیمت، شاید ساڑھے آٹھ روپے، دے دی اور اور رخصت ہونے کے لیے مڑا۔

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ تعارف کے بغیر اس کو مخاطب کرنا بداخلاقی تھی، اور ادھر وہ شخص تھا کہ اپنے فرس پر سوار ہو کر چلا ہی جانے والا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے میرے شناسا کتاب فروش کا، کہ اس نے مشکل آسان کی۔ سوار کی طرف اشارہ کر کر وہ بولا:

''مولوی صاحب، آپ انھیں نہیں جانتے؟ یہ بڑی خوبیوں....''

ادھر وہ خنگ سوار بھی شاید مجھ سے معرفی کا متمنی تھا۔ میری طرف مڑا اور بات کاٹ کر بولا:

''مولوی صاحب، بندگی عرض کرتا ہوں۔ خاکسار کو بدھ سنگھ قلندر کہتے ہیں۔''

میرا چہرہ آپ سے آپ کھل اُٹھا۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے میں نے کہا، ''اور کمترین کا نام خیر الدین ہے۔ افسوس کہ میں آپ کی طرح شاعر نہیں ہوں۔''

''شاعر تو میں بھی نہیں ہوں، یوں ہی ریختہ میں کچھ بک لیتا ہوں۔''

''شاگردی کس کی اختیار فرمائی؟''

''باقاعدہ شاگرد تو کسی کا نہیں ہوں، لیکن گاہے ماہے قبلہ میرزا صاحب ازراہ تبرک ایک آدھ غزل پر

نقطہ لگا دیتے ہیں۔ اس وقت میں انھیں کی خدمت بابرکت میں حاضر ہونے والا تھا۔''

''سبحان اللہ، بڑے پائے کے بزرگ ہیں۔ ایک جہان ان کا مرید ہے اور شاعری میں کیا ریختہ کیا فارسی، سعدیٔ وقت ہیں۔''

''ہاں، لیکن افسوس کہ شاعری کی طرف آں جناب کی توجہ اب نہیں رہ گئی۔ ریختہ میں جو ارشاد ہوا ہے وہ جمع بھی نہیں کیا۔ یہ بھی فلک کی ستم ظریفی ہے کہ جس شخص نے کتنوں کو ریختہ کا استاد بنا دیا، اس کا ہی دیوانِ ریختہ مرتب نہ ہوا اور فارسی کا بھی دیوان بمشکل دو ڈھائی جزو کا ہوگا۔''

ہم لوگ باتیں کرتے چلے، گھوڑے کی لجام سائیس ہی کے پاس رہی۔ فارسی کے شعر مجھے بہت یاد تھے، اس وجہ سے تھوڑی ہی دیر میں بے تکلفی ہوگئی۔ آپس کے حالات پوچھے گئے۔ معلوم ہوا قلندر اپنے والدین کی واحد اولاد ہیں۔ لاہور کے ایک ذی علم اور ذی حیثیت کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہیں تعلیم پائی۔ والدین کی بہت ساری جائداد یہاں بھی ہے، اسی کے نظم ونسق میں لگے رہتے ہیں۔ طبیعت شعر گوئی کے ساتھ تصوف اور جوگ کی طرف مائل ہے۔ حضرت میرزا صاحب قبلہ کے دربار سے دونوں طرح کی تشنگی بخوبی بجھتی تھی۔ شادی ابھی نہیں ہوئی ہے۔

باتوں باتوں میں ہم کالی مسجد کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے پاس ہی رتّی تتّی کی قبر ہے، اور پیچھے ذرا دور چل کر میرزا صاحب وقبلہ کی خانقاہ۔ میں نے گھبرا کر کہا:

''ارے، ہم تو خانقاہ مظہری کے بالکل پاس آ گئے! میں تو نرا خالی ہاتھ ہوں، میرزا صاحب کی خدمت میں پہلی بار حاضر ہوں اور کچھ نذر یا ہدیہ پیش نہ کروں، یہ تو بڑی بدتہذیبی ہوگی۔ اچھا اب اجازت مرحمت فرمائیں، کفش خانہ قریب ہی ہے، میں گھر چلا جاؤں گا۔ ان شاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔''

''نہیں یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ چشمۂ حیواں تک آ کر پیاسا واپس جانا کہاں کی دانش مندی ہے؟ حضرت میرزا صاحب کے یہاں ایسی کوئی پابندی نہیں۔ جس کا جی چاہے کچھ لائے، جس کا جی نہ چاہے، کچھ نہ لائے۔''

''جی چاہنے نہ چاہنے والی بات تو یہاں ہے ہی نہیں حضرت۔ میں تو بخوشی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نذر پیش کروں، لیکن اس وقت تیاری جو نہیں ہے۔''

''چلیے تو چلیے، یقین فرمائیے قبلہ مرزا صاحب کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ میرا ذمہ۔''

میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا، ''لیکن میری اماں جی تو خیال فرمائیں گی۔ میرا ضمیر تو ناخوش رہے گا۔''

''معافی کا خواستگار ہوں، بات کو ذرا دیر میں سمجھا۔ اچھا تو لیجیے یہ 'دیوانِ غنی' میں نے اپنے لیے خریدا تھا، اسے حضرت کی نذر کر دیتے ہیں۔''

''معاذ اللہ! اتنا قیمتی تحفہ میں آپ سے لے لوں۔ اس کی قیمت میں تو میں پورا مہینہ روٹی کھا سکتا ہوں۔ نا صاحب، یہ مجھ سے نہ ہوگا۔''

''اچھا اسے میری طرف سے قرض بے میعاد سمجھیے، یا کسی وقت اس کے بدلے مجھے تھوڑی سی عربی پڑھا دیجیے گا۔ میں عربی میں ابھی ذرا کچا ہوں۔''

مجھ سے بھی زیادہ بحث کرتے نہ بنی۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ زیادہ انکار کروں گا تو تصنع معلوم ہوگا۔ ''چلیے ہماری آپ کی طے رہی، جمعہ کے جمعہ مجھ سے عربی پڑھ لیا کیجیے گا۔''

میرزا صاحب کی خانقاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی دربان بھی نہ تھا۔ ہم بے کھٹکے اندر داخل ہوئے، صدر دروازے کے دونوں طرف ایک ایک کوٹھڑی، اس کے بعد بڑا سا آنگن، چاروں طرف دالان۔ آنگن کے بیچوں بیچ نہر بہہ رہی تھی، اس کے دونوں طرف پھولدار درخت جن پر دو تین چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ خدا معلوم پالتو تھیں یا یوں ہی اڑتی پھرتی چلی آئی تھیں۔ آنگن کے اس پار سامنے دالان در دالان تھا۔ اندرونی دالان میں، ایک ذرا اونچی جگہ پر، میرزا صاحب رونق افزا تھے۔ ساری محفل اس قدر مہذب و مذہب، بھری پری، اور نفاست مآب معلوم ہوتی تھی کہ مجھے کہیں رک کر بیٹھنے کی ہمت نہ تھی، گویا اس کی پاکیزگی کو میرا وجود اس طرح ساقط کر دے گا جس طرح سفید چادر پر سیاہی کا دھبہ۔ ہم آہستہ چلتے بیرونی دالان پر ذرا ٹھٹکے، تو خدا معلوم اپنے آپ سے، یا خدا جانے میرزا صاحب کی آنکھ کا ہلکا اشارہ پا کر، جسے ہم لوگوں نے محسوس نہ کیا، ایک صاحب نے فرمایا، ''تشریف لائیے، ادھر جگہ ہے۔''

ہم لوگ نظر جھکائے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے، آگے چلے آئے۔ بدھ سنگھ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور ذرا خم ہو کر تعظیم دی، منھ سے بہت دھیمی آواز میں کہا، ''قبلہ و کعبہ، تسلیم بجا لاتا ہوں۔ سرکار کا مزاج کیسا ہے؟'' میرزا صاحب ذرا مسکرائے، پھر نہایت سریلی، دل نشین آواز میں فرمایا، ''جیتے رہو، دولت و اقبال زیادت باد۔'' پھر میری طرف ذرا سی نگاہ کے اشارے سے دیکھا، گویا پوچھ رہے ہوں یہ کون شخص ہے۔ میں نے

دوبارہ جھک کر سلام کیا، نگاہیں نیچی رکھیں اور ہاتھ باندھ کر بولا، ''بندے کو خیرالدین کہتے ہیں۔ قلندر صاحب نے ہمت دلائی تو دیدار اور کفش بوسی کے لیے حاضر ہو گیا ہوں۔''

انھوں نے اسی نیم تبسم سے فرمایا، ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ تشریف رکھیں۔''

فوراً تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ میرزا صاحب نے قلندر والی بات کیوں فرمائی، لیکن گھر پہنچ کر سب واقعات کو پھر ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے، اور جو کچھ دیکھا سنا تھا اسے حافظے میں گویا زندہ کرنے کے دوران، مجھے خیال آیا کہ یہ ان کا کشف تھا۔ مجھے حاضری میں تامل تھا، اور اس تامل کو بدھ سنگھ قلندر نے یہ کہہ کر زائل کرنا چاہا تھا کہ میرزا صاحب کے یہاں نذر و فتوح پیش کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ میرزا صاحب نے کشف سے یہ بات معلوم کر لی تھی اور اس کی تصدیق فرما رہے تھے۔

میں نے 'دیوانِ غنی' کا نسخہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر پیش کیا۔ میرزا صاحب نے ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا، ''مولوی صاحب، 'دیوانِ غنی' خوب لائے۔ ماشاءاللہ۔'' یہ دوسرا کشف تھا، کیونکہ کتاب کی جلد سادہ تھی، اس پر کوئی نام نہ تھا۔ پھر شاید کوئی اشارہ ہوا جسے میں محسوس نہ کر سکا۔ وہی صاحب، جنھوں نے ہم لوگوں کو آگے آنے کی ہدایت کی تھی، اپنی جگہ سے بڑھے، میرزا صاحب قبلہ اس دوران کتاب میرے ہاتھ سے لے چکے تھے۔ انھوں نے ایک دو ورق پلٹے، فرمایا، ''ہمارے ڈھب کا شاعر تھا۔'' وہ صاحب اب تک میرزا صاحب کے بالکل قریب آ چکے تھے۔ میرزا صاحب نے کتاب ان کے ہاتھ میں دے دی اور غنی کا شعر عجب کیفیت کے ساتھ پڑھا۔ ان کے پڑھنے کا انداز سارے جہاں سے نرالا تھا، میں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا:

عشق را دامے ست در پشت و بلند روزگار
کوہ کن در بیستوں مجنوں بہ صحرا بند شد

میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں کہ انھوں نے خود کو سنبھالا۔ ہم دونوں اب تک یوں ہی دست بستہ کھڑے تھے۔ آپ نے دوبارہ فرمایا، ''تشریف رکھیں۔'' میری بھی جان میں جان آئی، ہم وہیں دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور رنگ محفل کو ذرا سنبھل کر دیکھا۔

حضرت میرزا صاحب کی پشت پر ایک صاحب نہایت نستعلیق صورت، دبلے پتلے، ہلکے پستئی رنگ کی عبا اور اس کے نیچے گلے کا بند انگرکھا پہنے ہوئے، سر پر سادہ دوپلی ٹوپی، چہرے پر غضب کی نرمی، مورچھل ہلا

رہے تھے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ آپ کا نام غلام علی ہے، حضرت کے خلفائے خاص میں ہیں، بالکل خدمت گاروں کی طرح مرشد کے سارے کام کرتے ہیں۔ جو صاحب آپ کی پیشی میں تھے، ان کا نام معلوم ہوا کہ نعیم اللہ بھڑائچی ہے، بلادِ مشرق میں حضرت کے خلیفہ ہیں، لیکن سال کا بڑا حصہ مرشد کے قدموں میں گذارتے ہیں۔ اب میں ذرا آنکھ اونچی کی تو حضرت والا کو کچھ ٹھیک سے دیکھا۔

بہت گورا رنگ، دبلا ڈیل، کشیدہ قامت، سفید ڈاڑھی، کچھ نوک دار، نفاست سے ترشی ہوئی۔ لبیں کتری ہوئی، لیکن بہت ہلکی نہیں۔ بہت لطیف، سبز، ڈھاکے کی ململ کے انگرکھے کے نیچے سفید براق شبنم کا کُرتا، اتنا سفید کہ ململ کی سبزی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ انگرکھے پر کوئی عبا یا چغہ نہ تھا، لیکن پاس ہی نہایت سلیقے سے تہہ کی ہوئی کاغذی جامہ وار کی عبا، خفیف سبز اور زرد دھاریوں والا مشروع کا ڈھیلا پاجامہ۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، جن میں شب بیداری کی کچھ کچھ سرخی۔ سر پر چوگوشیہ کڑھی ہوئی ٹوپی جس کے نیچے سے سفید بالوں کی ایک لٹ کان کے پاس کاکل کی صورت ایک منظم اندازِ بے پروائی سے جھانک رہی تھی۔ میں نے اس قدر خوبصورت اور اس قدر پُر رعب شخص کبھی نہ دیکھا تھا اور میں کیا، شاید اس ساری محفل نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ سب اس طرح مؤدب تھے گویا کوئی دربار ہو۔ اگر شخصیت کے داب و دبدبہ کے لحاظ سے وہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالم گیر برد اللہ مضجعہ لگتے تھے تو دلنوازی کے لحاظ سے قطب دوراں حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب قدس سرہٗ و نور اللہ مرقدہٗ کی یاد دلاتے تھے۔

اب میں نے یہ بھی دیکھا کہ باہری اور اندرونی دالانوں کے درمیان وسطی در میں ایک مولوی صاحب دست بستہ کھڑے تھے، گالوں پر سے پسینہ بہہ کر ڈاڑھی میں جذب ہو رہا تھا۔ پھر میرے خیال میں آیا کہ نہیں، پسینہ نہیں وہ تو آنسو تھے۔ مولوی صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے:

''سرکار کے الفاظ خسروانہ کا واسطہ دے کر ملتجی ہوں کہ اس عاصی ناکارہ و ناہنجار کی تقصیر معاف ہو اور اب یہ حقیر بندگان آستانہ کے قدوم میمنت لزوم میں بیٹھنے کا مجاز قرار دے دیا جائے۔''

میری سمجھ میں نہ آیا کہ قصہ کیا ہے، اور یہ مولوی صاحب کب سے، اور کس لیے اس طرح گریان و بریان تھے۔ جب ہم لوگ داخل ہوئے تو بھی وہ موجود رہے ہوں گے، ممکن ہے قلندر صاحب نے انھیں دیکھا بھی ہو۔ لیکن لکل داخل دہشۃ کے مصداق داب درویشانہ کے باعث مجھے تو کچھ سجھائی دیا نہ تھا۔ میں نے ہمت کر کے نعیم اللہ صاحب بھرائچی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے میری مشکل آسان کی، بولے:

''آپ کرنال سے تشریف لائے ہیں۔ سرکار عالی مقدار سے بیعت کے خواستگار ہیں۔''

ان مولوی صاحب کو اس جملے سے شاید کچھ تقویت ملی، نعیم اللہ صاحب کی طرف رخ کر کے، لیکن روئے سخن حضرت میرزا صاحب ہی کی طرف رکھتے ہوئے، روہانسی آواز میں کہنے لگے:

''سرکار والاتبار کے ارشاد پر عمل کر لیا ہے....''

''لیکن دیر میں،'' میں نے پہلی بار شاہ غلام علی صاحب کو بولتے دیکھا، ورنہ اب تک تو وہ اس درجہ مؤدب تھے جیسے طیور علی رؤسہم کی تفسیر ہوں۔ ان کا لہجہ تو بہت سخت و سنجیدہ تھا، لیکن چہرے پر ذرا سی مسکراہٹ کی شفق بھی تھی، گویا وہ صورتِ حال سے لطف بھی لے رہے ہوں۔ ''سرکار والاتبار نے آپ سے دوبار ارشاد فرمایا کہ ڈاڑھی موچھیں ترشوا کر آدمی کی شکل بنا کر آیئے تو مرید کریں گے۔ لیکن آپ تو اپنی ہی شرع شریف پر اڑے رہے، کیوں؟''

''مگر سرکار یہ بھی تو ملاحظہ فرمالیتے کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے....''

''ہاں، مگر جب آپ کو خواب میں تہدید ہوئی کہ فلاح چاہتے ہو تو ہمارے میرزا صاحب کے ہی دامن پاک سے منسلک ہو جاؤ'' وہ اب پوری طرح متبسم تھے۔ ''لیکن یہاں اعلیٰ حضرت سے تمھاری سفارش کیا میاں قلندر کریں گے؟''

''قلندر، کون قلندر؟'' مولوی صاحب گھبرا کر بولے۔

اتنے میں میرزا صاحب نے سر اٹھایا اور فرمایا، ''اچھا انھیں آئندہ کو کان ہو گئے۔ کل جمعے کو بیعت کر لیں گے۔'' لگتا تھا وہ بھی اس معاملے سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔

مولوی صاحب نے بے ساختہ آگے بڑھ کر حضرت کے دامن کو بوسہ دیا اور ان کے پاؤں کے پاس بیٹھ کر آنسو خشک کرنے لگے۔ ساتھ ساتھ کہتے بھی جاتے تھے، ''سرکار کا کرم ہے، بڑا کرم ہے۔'' مرزا صاحب قبلہ یوں ہی سر جھکائے رہے۔ شاید وہ کچھ مزید ارشاد فرماتے کہ اچانک صدر دروازے کی بغل سے جو چھوٹی سی گلی غالباً زنان خانے کے دروازے کو جاتی تھی، اس کے نکڑ سے ایک شور بلند ہوا۔ بڑی سخت جانتوں والی آواز تھی، لیکن شین قاف درست تھا:

''ارے کہاں ہے وہ بھڑوا مرزا، کہیں مر گیا کیا۔ بڑا پیر اولیا بنا پھرتا ہے۔ تانبے کے پیسے رکھ کر اس کی بوٹیاں چیل کوؤں کو کھلاؤں۔ اس سے کہو کسی اور کو اپنے ناز دکھلائے۔ یہاں تیسرا پہر ہونے کو آیا، میں

دروازے پر کھڑی سوکھتی ہوں، اب تک میرے محافے کے ساتھ چلنے والے نفر نہیں آئے۔ اے لوگو بتاؤ میں اکیلی کس طرح ہرے بھرے صاحب کی درگاہ پر جاؤں۔ میں نہ جاؤں گی تو کیا وہ اپنی ماں بہنوں کو بھیجے گا؟ کون اس کی صحت اور سلامتی کی دعا کرے گا، کون اس کے نخرے اٹھانے والے مریدوں کو جمع کرنے کا انتظام کرے گا؟''

میں تو سناٹے میں آ گیا۔ یہ دربار در بار، شائقین اور عقیدت مندوں کا یہ ہجوم اور یہ بے ادبیاں۔ ہر چند کہ میں نے ان کے بارے میں سن رکھا تھا، لیکن یہاں تو پانی سر سے کئی ہاتھی ڈباؤ اونچا تھا۔ معاذ اللہ کیا ان محترمہ کو آتش جہنم کا خوف نہیں؟ میری تو سر اٹھانے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی، چہ جائے کہ اٹھ کر سلام بجالاؤں اور رخصت ہو جاؤں۔ لیکن میں نے محسوس کیا، اور پھر کنکھیوں سے دیکھ کر اس تاثر کی تصدیق بھی کی، کہ حضارِ محفل میں کسی تشویش، یا اعلیٰ حضرت کے روئے مبارک پر کسی ترجبینی کے آثار نہ تھے۔ سب یوں ہی بیٹھے تھے، گویا باہر کی آواز سے سراسر لاتعلق ہوں۔ حتیٰ کہ وہ کرنال کے مولوی صاحب بھی حضرت میرزا صاحب کی صندلی کے پائے سے یوں ہی لپٹے پڑے رہے۔ اتنے شاہ غلام علی صاحب نے کوئی اشارہ کیا تو میں نے دیکھا کہ دو شخص جو نفروں سا لباس پہنے، اہل محفل کی جوتیوں کے پاس بیٹھے تھے، اٹھے، اور جھک کر کورنش بجالاتے ہوئے الٹے قدم باہر نکل گئے۔ اندر سے ایک خادم نکلا، اس نے آہستہ آہستہ حضرت سے کچھ عرض کی تو وہ ذرا شگفتہ سے ہو گئے۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نفر بے چارے ذرا وقت سے پہلے آ گئے تھے اور پیرانی صاحبہ کی ڈانٹ مار کھا کر میرزا صاحب کی مجلس میں دبکے بیٹھے بلاوے کے انتظار میں تھے۔

حضرت کو ذرا شگفتہ دیکھ کر ایک صاحب نے، جو صورت اور لباس سے بخارا یا سمرقند کے معلوم ہوتے تھے، ہاتھ باندھ کر فارسی میں عرض کی، ''امروز درس پاک تفسیر مظہری مقرر بودہ شدہ است۔ اگر آں جناب امر فرمایند، از جزودان برمی آرند و خواندن آں را بسم اللہ کنند۔'' مجھے یاد آیا کہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی جو حضرت والا کے اجل خلفا ہیں، ان دنوں تفسیر مظہری کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ ان صاحب کو جواب دینے سے پہلے آں جناب نے ہماری طرف دیکھا، گویا کنایتاً فرما رہے ہوں کہ جانا چاہیں تو ہمیں رخصت ہے۔ ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور دوبارہ حاضر ہونے کی اجازت چاہ کر باہر آئے۔

اجازتِ رخصت مرحمت ہونے کے بعد جب میں ذرا جھک کر مرزا صاحب کے دستِ مبارک کو بوسہ

دے رہا تھا تو آپ نے فرمایا، ''مولوی صاحب، سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہمیشہ ذہن میں رکھو۔'' یہ کہہ کر انھوں نے حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث پاک اپنی زبانِ حقیقت بیان سے ادا فرمائی، افلا اکون عبداً شکوراً۔ میرے دل میں خیال گذرا کہ قبلہ حضرت اس بات کو اپنے لیے بڑی نعمت قرار دیتے ہیں کہ انھیں ایسی بیوی نصیب ہیں جو ہمہ وقت ان کے نفس اور کبر کو پامال کرتی رہتی ہیں، اور یہ بڑے شکر کا مقام ہے۔

قلندر صاحب کا سائیس سامنے ہی منتظر تھا۔ لیکن وہ فوراً سوار نہ ہوئے، مجھے ساتھ لیے چلتے گئے۔ وہ چپ سے تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں آ رہا تھا نہ میری کہ اب بات کیا کریں۔ لیکن ان کے بارے میں میرا خیال غلط نکلا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔ رجی بجی کی قبر کے پاس آ کر وہ رکے، اور کہنے لگے:

''حضرت بایزید بسطامی کے دولت کدے پر ایک طالب بڑی دور کی مسافت طے کر کے پہنچا۔ وہ شیخ کے اخفائے حال کے دن تھے۔ طالبین کا وہ ہجوم نہ تھا جو بعد میں ہوا۔ آواز دی تو اندر سے کسی نے ڈانٹ کر کہا، 'جا جا۔ بڑا آیا اس موئے نکھٹو کے ٹٹو شیخ کو پکارنے والا! وہ ڈھونگی کہیں جنگل میں لکڑیاں کاٹنے کے بہانے کسی سایہ دار شجر کے نیچے خراٹے لیتا ہوگا۔ چل بھاگ، نہیں تو ساری پیری مریدی نکال دوں گا۔'' قلندر ذرا مسکرائے، ''اس بچارے نے بھلا یہ میٹھے بول کاہے کو کہیں اور سنے ہوں گے۔ سراسیمہ ہو کے جو بھاگا ہے تو پھر جنگل سے نکل جنگل ہی کی راہ پکڑی۔ جنگل میں داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے شیخ کے دیدار ہو گئے۔ وہ ایک تنومند شیر پر سوار چلے آ رہے تھے۔ طالب یہ دُنیا اوپر منظر دیکھ کر ڈرا تو شیخ نے فرمایا، 'ڈرو نہیں۔ میں اُس کی سنتا ہوں تو یہ میری سنتا ہے۔''

میں نے کہا، ''مشفق من، نقل تو آپ نے خوب سنائی، اور حسب حال سنائی۔ میں نے تو یہ بھی سن رکھا تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی نازک مزاجی اور حُسن پرستی کے پیش نظر اعلیٰ حضرت کو کہیں سے حکم ملا تھا کہ فلاں سے عقدِ نکاح قائم کرو۔ لیکن میں تو قول باری تعالیٰ کو سامنے رکھتا ہوں اور اسی کا ورد رکھتا ہوں۔ قبلہ حضرت کو اللہ کریم نے جتنا بڑا بوجھ دیا ہے، اسے اٹھانے کی اتنی طاقت بھی دی ہے۔ میری تو یہی دعا ہے ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به۔ مجھ پر ایسی پڑتی تو میں بیٹھ ہی جاتا۔''

قلندر مسکرائے، ''بے شک، لیکن لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا بھی تو ہے، ورنہ ہم جیسوں کی

چار پائیاں اٹھ گئی ہوتیں۔"

میں نے دل میں کہا، خدا رکھے کیا غضب کا طباع اور معنی یاب شخص ہے۔ میر محمد تقی نے اپنے تذکرے میں ٹیک چند صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ خدا ہدایتش کند و اسلام نصیب۔ بھلا بات تو صحیح ہے، لیکن اللہ ہی جانے ہے کس کو کس کے ہاتھ پر فلاح نصیب ہوگی۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے، "بارے آئندہ یوم الجمعہ کو مدرسے میں اول وقت جناب کا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔"

"ان شاء اللہ۔" قلندر نے کہا۔ ادھر انھوں نے سوار ہو کر اپنی راہ لی، ادھر میں اپنے خیالوں میں گم اپنی پیاری بہن کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ جانا تو مجھے اپنے گھر تھا، لیکن شاید میرزا صاحب قبلہ کے یہاں رنگ درونِ خانہ کی ایک جھلک نے میرے ذہن میں تاہل اور تزویج کے مسائل کی بات ڈال دی۔ اللہ رکھے میری بہن ایسی خوش مزاج اور شیریں زبان تھی کہ بس سنتے رہو۔ میں نے دل ہی دل میں میاں بقاء اللہ کو ان کی خوش نصیبی پر داد دی۔ ورنہ ایک ہمارے حضرت میرزا صاحب بھی تو ہیں۔ اللہ انھیں سلامت رکھے، زندہ شہید کا درجہ پا چکے ہیں۔

میں 'میرزا زاہد ملا جلال' کو پڑھنے پڑھانے میں ایسا گتھا کہ اور کسی چیز کی سدھ ہی نہ رہی۔ کبھی کبھی شہسوار کا خیال ضرور آتا، لیکن خواب میں دیکھی ہوئی کسی صورت یا منظر کی طرح۔ ایک مدھم سی خلش، پرانی چوٹ کے کبھی کبھی تازہ ہو جانے کی سی کسک ضرور تھی۔ مگر وہ سوالیہ نشان نہ تھا جو شروع کے دنوں میں میری روح میں نیش زنبور سا کھٹکتا تھا۔ ہاں ایک بار جاگتے کے خواب میں انھیں میں نے ضرور دیکھا۔ ایسا لگا کہ مدرسے کے صدر دروازے پر اپنا رہوار سائیس کے ہاتھ میں دے کر اندر آ رہے ہیں۔ صدر دروازہ میری نشست سے بہت دور تھا، اور آڑ میں تھا، اس لیے عام حالات میں مجھے اپنی نشست سے دکھائی بھی نہ دیتا۔ لیکن اس وقت بالکل آئینہ سا میرے سامنے تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا، کتاب جو میرے ہاتھ میں تھی، ایک طرف گری اور چادر جو میں لپیٹے ہوئے تھا، کھل کر پاؤں میں آ رہی۔ اتنی ہی دیر میں وہ منظر غائب ہو گیا، اور اشیا اپنی معمولی صورت پر آ گئیں۔

میں نے اس کا ذکر کسی سے نہ کیا، بدھ سنگھ سے بھی نہیں۔ میرا کسی سے ایسا ملنا جلنا بھی نہ تھا۔ بدھ سنگھ البتہ ہر جمعہ کو آ جاتے تھے۔ عربی کا درس تو کم ہوتا، شعر و شاعری کا چرچا زیادہ۔ وہ اپنے شعر بمشکل ہی سناتے۔ لیکن ایک دن انھوں نے اچانک عربی کا سبق بند کر دیا اور بے فرمائش ہی اپنے شعر سنانے لگے:

جی کو سر زندگی نہیں ہے
کیا جی کے کرو کہ جی نہیں ہے

یہ شعر انھوں نے کچھ اس درد کے ساتھ پڑھا کہ میں تھوڑا مشوش ہوا۔ شاعر لوگ مضمون باندھتے ہی رہتے ہیں، کوئی مرے یا جیے ان کی بلا سے۔ لیکن اس شعر کی ادائگی میں عجب کسک تھی، گویا احوالِ واقعی کہہ رہے ہوں۔ مجھے حضرت میرزا صاحب کا ایک شعر یاد آیا کہ ان دنوں اکثر لوگوں کی زبان پر تھا:

نالہ موزوں می کند عمریست اما پیش یار
نیست مظہر در شمار شاعراں گویا ہنوز

تو شاعر صاحب کبھی اپنے دل کا حال بھی شاید سنا جاتے ہیں، میں نے اپنے دل سے کہا۔ لیکن قلندر صاحب سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ویسے بھی وہ اپنے شعر میں کچھ اتنے محو تھے کہ شاید میری بات سنتے بھی نہ۔ پھر انھوں نے زیبِ مطلع پڑھا:

تھمتے ہی تھمیں گے اشک ناصح
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

دوسرے مصرعے کی بندش ایسی غضب کی تھی کہ پڑھے جایئے اور لطف لیے جایئے۔ مگر انھیں داد یا بیداد سننے کا دماغ کہاں؟ آنکھیں بند کیے خود جھوم رہے تھے اور بار بار مصرع پڑھے جا رہے تھے، 'رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے۔' اچانک میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز بھرانے لگی ہے۔ میں اٹھنے والا تھا کہ کٹورے میں پانی بھر کر انھیں دوں، کہ انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ بڑی تمکین سے مجھے دیکھا اور یہ رباعی پڑھی:

جی میں جو قلندر کے کبھی آوے گا
دل اپنے کو چھین تجھ سے لے جاوے گا
یہ روز کا تیرا چیں بر ابرو رہنا
سب طاق اپر دھرا ہی رہ جاوے گا

یہ رباعی پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے، مجھ سے خلافِ معمول معانقہ کیا، اور بولے:

’’اچھا مولوی صاحب بندہ، ہم تو چلے۔ میں مر چکا ہوں، مولوی صاحب سنتے ہو:

میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لیے
حباب وار تنک دم رہا ہے آنکھوں میں‘‘

یہ شعر انھوں نے پڑھا، اور اپنے اشعار کا پرچہ، عربی کی درسی کتاب، سب وہیں پھینک کر یہ جا وہ جا۔ جب تک میں دوڑ کر صدر دروازے تک پہنچوں پہنچوں، وہ فتح پوری کی بھیڑ میں گم ہو چکے تھے۔ آج شاید ساز و یراق بھی ساتھ نہ تھا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ کوئی بزرگ بھی گھر میں نہ تھا جس سے مشورہ کروں۔ کیا میرے قلندر صاحب کو جنون ہو گیا ہے؟ کیا وہ بیمار ہیں؟ کیا انھیں کسی سے عشق ہو گیا ہے؟ لیکن عشق والے تو اکثر ہنستے کھیلتے نکل جاتے ہیں۔ ان کا تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ اعلیٰ حضرت مرزا صاحب سے استمداد کروں؟ لیکن ان سے کہوں تو کیا، پوچھوں تو کیا؟ اور میں قلندر صاحب کا لگتا بھی کون تھا اور حضرت میرزا صاحب کے یہاں کا آنے جانے والا بھی نہ تھا کہ ان کے یہاں کے آداب سے واقف ہوں۔ نہ معلوم ایسی باتیں ان کے روبرو ہوتی بھی ہیں کہ نہیں۔ کہیں میرا جانا گستاخی پر محمول نہ ہو۔

ایک بدھ سنگھ قلندر کی ہستی میں مجھے بڑا بھائی، باپ، اور دوست تینوں یکجا نظر آتے تھے۔ اب تک میں ان تینوں نعمتوں سے محروم رہا تھا۔ قلندر صاحب سے ابھی بے تکلف ہونے کا موقع نہ آیا تھا، لیکن مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے کوئی مسئلہ درپیش ہو اور میں ان سے ذکر اس کا کروں تو وہ توجہ سے سنیں گے اور بے غرض مشورہ دیں گے۔ لیکن اب تو ان کا ہی حال کچھ دگرگوں ہوتا لگتا تھا۔ کاش میں ان کے کچھ کام آ سکتا۔

اسی الجھن میں سارا دن نکل گیا، رات بھی گذر گئی۔ مجھ سے نہ ٹھیک سے کھانا کھایا گیا نہ سویا گیا۔ اماں جی پوچھتی ہی رہیں کہ آج جی کیسا ہے، نہ کھا رہے ہو نہ ٹھیک سے سو رہے ہو۔ لیکن میں نے انھیں بالا بتا دیا کہ مدرسے میں کام کے ہجوم کے باعث سر میں درد سا ہو گیا ہے۔ رات کٹتے کٹتے کٹی تو اچانک مجھے خیال آیا کہ بقاء اللہ سے کیوں نہ پوچھوں۔ وہ اتنا بڑا رتال اور جفار بنا پھرتا ہے، کچھ میرے بھی تو کام آئے۔

صبح اشراق پڑھتے ہی میں بقاء اللہ کے یہاں پہنچا۔ وہ دیوان خانے میں بیٹھ چکا تھا، ایک دو صاحبانِ غرض

بھی آ گئے تھے۔ ابھی بھیڑ شروع نہ ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر سلام کیا۔

''بھائی جان صاحب قبلہ۔ تشریف لایئے، خوب آیئے:

بیا بیا کہ ترا تنگ در کنار کشیم

کہیے کیا خدمت کروں۔ قلندر صاحب کا حال پوچھیے گا؟''

میں چکرا گیا۔ بقاء اللہ کو میں نے اپنی اور قلندر کی دوستی کے بارے میں کچھ بتایا نہ تھا۔ شاید میری بہن نے تذکرہ کر دیا ہو۔ لیکن اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں انھیں کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں؟ میں نے کچھ مبہم سا جواب دیا تو وہ بولا:

''آیئے زنان خانے میں چلتے ہیں۔'' پھر اس نے باہر کے مستفسرین سے کہا، ''آپ حضرات چندے غم کھالیں۔ بندہ بات کی بات میں حاضر ہوتا ہے۔''

وہ مجھے خاص اپنے حجرے میں لے گیا، جہاں کسی کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ میں ابھی مسند سے ٹیک بھی نہ لگانے پایا تھا کہ اس نے کہنا شروع کیا:

''بھائی جان، اب وہ کسی اور منزل کے مسافر ہیں۔ وہ صبا رفتار شہسوار ہیں۔ آپ کے ہاتھ نہیں آنے کے۔''

''میاں کچھ صاف صاف تو کہو۔ پہیلیاں کیوں بجھاتے ہو۔''

''صاف صاف آپ خود دیکھ لیں گے۔ انھیں کسی کی لو لگی ہے، اور اب وہ لوکا ہوئی جاتی ہے۔ وہ بہت دن ہمارے آپ کے درمیان نہ رہیں گے۔''

''کیا مطلب؟ کیا وہ خدانہ خواستہ بیمار ہیں؟''

''آپ بھی کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں بھائی جان۔ اس کی آنکھ کہیں لڑی تھی۔ لیکن بات بنی نہیں، یا شاید انھوں نے خود بنانی نہ چاہی۔ اس سلسلے میں مَیں نے کوئی تفحص نہیں کیا ہے۔ آپ چاہیں گے تو وہ بھی معلوم کر دوں گا، لیکن....''

''لیکن کیا؟ کیا ہم لوگ کچھ مدد نہیں کر سکتے؟''

وہ ہنسا، ''اجی صاحب، وہ مدد چاہیں تب تو۔ میں نے کہا نہ اب وہ کسی اور منزل کے راہی ہیں۔ پہلے تو

اتنا ہی معاملہ تھا:

دل را ز سینہ ام بت سرکش گرفت و رفت
در خانۂ من آمد و آتش گرفت و رفت

لیکن اب وہ آگ ان کے خرمن ہوش کو خاک کر چکی۔ آپ جانتے ہی ہیں العشق نار یحرق ما سوا المطلوب، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب ان کا مطلوب بھی وہ مطلوب نہیں۔ ایک ہی جست میں انھوں نے مجاز سے حقیقت کو جالیا۔"

"تو اب میں کیا کروں؟ ان کے والدین کو خبر کروں؟"

"اس سے کچھ نہ ہوگا۔ ویسے ان کو خبر ہو ہی جائے گی۔"

"تمھیں یہ سب کیسے معلوم؟"

"مجھے آپ کا خیال رہتا ہے۔ کل رات میں نے نقشہ کھینچا تو اس میں یہ ہدایت ملی کہ مولوی خیر الدین کے لیے بدھ سنگھ قلندر کا حال معلوم کرو۔ عام طور پر ہم لوگ اسی وقت کچھ معلوم کر سکتے ہیں جب کوئی سائل سوال کرے۔ لیکن بعض حالات میں سائل ممکن یا سائل غائب کے حوالے سے بھی تحقیق کر لیتے ہیں۔ قلندر صاحب کا حال دگرگوں ہے بھائی جان۔"

"میں ابھی ان کے یہاں جاتا ہوں۔"

"آپ جائیں یا نہ جائیں وہ تو جا چکے۔"

"کیا مطلب، کیا وہ اللہ نہ کرے چل بسے؟"

"نہیں مگر وہ ہم آپ کے لیے مر چکے ہیں۔"

میں نے جوں توں کر کے مدرسہ ختم کیا۔ عصر پڑھ کر میں بدھ سنگھ قلندر کی حویلی کو چلا۔ جوگی واڑہ کے ذرا پرے تراہا بیرم خاں پر ان کی سر بفلک حویلی تھی۔ ابھی ان کی گلی تک پہنچا بھی نہ تھا کہ کثرت سے لوگ آتے جاتے دکھائی دیے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی سامان تھا۔ بڑا سامان تھا تو وہ اسے سر پر اٹھائے یا اٹھوائے ہوئے تھا۔ لوگ کہہ رہے تھے بدھ سنگھ قلندر نے باپ دادا کا برسوں میں بٹورا ہوا روپیہ دن بھر میں لٹا دیا۔

اب حویلی لٹ رہی ہے، وہ بھی اب خالی ہوا چاہتی ہے۔

کسی کے سر پر بھاری بخارائی یا ایرانی قالین، کسی کے ہاتھ میں رومی گلدان، کسی کے ہاتھوں میں حلب کا آئینۂ تصویر نما، کہ کم و بیش بدن نما بھی تھا اور بدقت ہی اس سے سنبھل رہا تھا۔ کسی کے کاندھے پر کاشانی مخمل کا گٹھر۔ کسی کے ہاتھ میں شیرازی کبوتروں کا جوڑا، کبوتر بلند قامت، سفید اور سرمئی، گردن اٹھا کر راہ گیروں کو دیکھتے، غٹرغوں کرتے ہوئے۔ کسی کے ساتھ ڈوریا، تازی کتوں کی زنجیریں تھامے۔ پھر دیکھا کہ پانچ سات شخص بمشکل ایک بے حد بھاری پلنگ سر پر اٹھائے ہوئے، اٹھائے کیا، بہزار خرابی سر اور ہاتھوں پر اٹکائے ہوئے۔ پلنگ کے پائے ٹھوس چاندی کے، پٹیاں آبنوسی، پلنگ پوش مرزا پوری ہلکے ریشمی قالین کا۔ نیلی ساٹھن کے تکیے، جن پر ریشم کا کشمیری کام بنا ہوا، دو ریشمی بنارسی زرنگار گل تکیے، لیکن نہایت نرم۔ اوڑھنے کے لیے جے پوری دلائیاں ایسی لطیف اور نازک جیسی گلاب کی پتیاں۔ کسی کے ہاتھ میں چاندی کی سیلابچی، اتنی بھاری کہ اٹھائے نہ اٹھتی نہ تھی۔ دو شخصوں کے ہاتھ میں تانبے کا پاندان، کوئی بیس شاہجہانی سیر کا۔ ایک کتب فروش کو دیکھا کہ دو مزدوروں کے سر پر کتابوں کے بستے اٹھوائے چلا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ نادر گردی ہے، کہ ابدالی لوٹ ہے، یا کیا ہے اور ان دونوں کی تاخت و تاراج نے بھی اتنا چھوڑا تھا کہ دن بھر سے اٹھ ہی رہا تھا اور اختتام کو نہ آتا تھا؟

میں آگے بڑھتا گیا، ساتھ ہی ہجوم بھی بڑھتا گیا۔ حویلی کے صدر دروازے پر نکلنے تک کی جگہ نہ تھی۔ بدھ سنگھ قلندر کا کہیں پتا نہ تھا۔ میں کچھ دیر کسی نہ کسی طرح رکا رہا کہ حویلی سے کوئی گماشتہ یا داروغہ نکلے تو اس سے پوچھوں۔ مگر شاید اب وہاں کوئی نہ رہ گیا تھا۔ دور سے میں نے سائیس کی جھلک دیکھی تو اس کی طرف بڑھا۔ لیکن جب تک میں پہنچوں پہنچوں وہ بھی کسی طرف نکل لیا تھا۔ کیا شان دار گھوڑا تھا، میں نے اپنے دل میں کہا، نہ معلوم کس کے ہاتھ لگا۔ خدا کرے کوئی قدرداں ہی لے گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ کسی ٹھیلے میں جوت کر اس کی کمر توڑ ڈالے۔

واپسی میں ایک جگہ راستہ رکا ہوا تھا۔ میں بدتمیزی سے کہنیاں مارتا آگے نکلا کہ دیکھوں بدھ سنگھ قلندر نہ ہوں۔ وہی تھے۔ واللہ وہی تھے۔ بالکل سادہ گیروا لباس پہنے ہوئے، ننگے پاؤں۔ لیکن خدا کا شکر کہ گھوڑا زیرِ ران تھا۔ کمر میں خنجر، گردن اونچی کیے ہوئے، گلے میں فیروزے کا تعویذ، ہونٹوں پر ذرا سی مسکراہٹ، گویا اس جمِ غفیر کو اپنی بارات سمجھ رہے ہوں۔ لوگ تھے کہ ٹوٹے پڑے تھے۔ کوئی اولاد مانگ رہا تھا، کوئی

تندرستی۔ کوئی سفر سے اپنے بیٹے کی بسلامت واپسی چاہتا تھا۔ ایک بیوہ دکھیا تو موت مانگ رہی تھی، کہ اب جدائی سہی نہیں جاتی۔ لیکن وہ جیسے سنی ان سنی کیے وہیں رکے ہوئے تھے۔ راستہ نہ تھا، اور نہ ہی وہ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ ہمیں راستہ دو، یا شاید انھیں کسی کا انتظار تھا؟

ایک لمحے کے لیے میں نے بدھ سنگھ قلندر سے آنکھیں چار کیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں بھی ایک تبسم نظر آیا۔ گویا کہہ رہے ہوں، کیوں کیسی رہی؟ پھر انھوں نے سر سے خفیف سا اشارہ کیا، گویا مجھے پاس بلا رہے ہوں۔ میں ایک قدم بڑھا، پھر میں نے اپنے دل میں کہا، ادھر جا کر کیا کرو گے؟ تم بدھ سنگھ قلندر تو ہو نہیں، ایک معمولی معلم ہو۔ جوں ہی میں رکا، بدھ سنگھ قلندر نے اپنا داہنا ہاتھ سینے پر رکھا، گویا کہہ رہے ہوں، جو فیصلہ تم نے کیا، مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ اتنے میں اچانک بھیڑ چھٹ گئی، اور قلندر بڑے وقار و تمکین سے مرکب کو پویاں پویاں لیے چلے گئے۔ پھر جیسے کسی نے میرے کان میں بالکل صاف صاف کہا:

عنانِ او نہ گرفتند از گذار برفت

مجھے کپکپی سی آ گئی، جیسے مرطوب ہوا کی تپ چڑھنے والی ہو۔ لیکن میں نے خود کو سنبھالا۔ یہ کیا احمقانہ بیان ہے؟ میں نے اپنے دل سے کہا۔ بدھ سنگھ قلندر کے پاس تو لٹانے کے لیے آبائی دولت تھی، حویلی تھی، مال تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دل تھا۔ تم مدرسے کے مولوی، تمھارے پاس کیا ہے؟ جس کے دل ہو وہ دلداری کرے، دل بازی کرے، جان کھپائے۔ کسی شاعر نے کہہ دیا ہوگا:

بغیر دل ہمہ نقش و نگار بے معنیست
ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

لیکن تم کہاں کے دل والے ہو؟ ابھی تو تم نے دماغ کی تربیت کی ہے، اور وہ بھی معمولی سی۔ تمھاری پرواز ان فضاؤں میں نہیں ہو سکتی۔ تمھارا دل تو ابھی خالی صفحے سے بھی کم تر ہے۔ وہ ورق جو آتشِ بے وجود میں جل کر خاکِ سیاہ ہوتے ہیں، میرزاہد اور ملا عبدالحکیم کی کتابوں میں نہیں اور قلندر کے باپ ماں تمھاری ماں کی طرح بیوہ اور بے سہارا نہیں، وہ جھیل جائیں گے۔ تمھاری بے زبان ماں کا کیا ہوگا؟

میں خود کو سمجھاتا بجھاتا، دل کو عقل سکھاتا گھر کو چلا۔ سوار دولت جاوید کیا بلا ہے؟ تم نے کہیں سے ایک مصرع سن لیا تھا، وہ حسبِ اتفاق ایک اور مصرعے کے ساتھ تمھارے خیالوں میں گونج اٹھا۔ ایسے کہیں

تقدیریں نہیں بگڑتی ہیں؟ اور وہ سوار، جسے تم سب نے سرِشام دیکھا تھا، یقیناً کوئی نظر بندی کا ماہر شعبدہ باز رہا ہوگا۔ ورنہ وہ ہر کسی کو اس کی ہی تخیل کے مطابق کیوں دکھائی دیتا؟ حسن بن صباح، ابن المقنع، حکیم قسطاس الحکمت، نہ جانے کتنے ہی شعبدہ باز دُنیا میں آئے اور چلے گئے۔ اگر سب لوگ تمھاری طرح سے ان کو متبرک اور مستند جان لیتے تو آج یہ کارخانہ عالم خدائی کارخانہ نہیں بلکہ شیطانوں کی آماجگاہ ہوتا۔

معاذ اللہ تو کیا میں انھیں شیطان سمجھوں؟ نہیں، کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہیں۔ اس جہان کون وفساد میں بہت کچھ ایسا ہے، اور ہوتا رہتا ہے، جس کی وجہ، یا جس کا نام بھی عام لوگوں سے مخفی رہتا ہے۔ جن چیزوں سے تمھیں مطلب نہیں ان کی فکر کیا اور کیوں کرو۔ تمھیں پرائی کیا پڑی ہے اپنی نبیڑو۔ لیکن وہ مصرع مجھ ہی پر کیوں نازل ہوا؟ اول تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ مصرع تمھارا ہی ہو، یا وہ شعر تمھارا ہو۔ لیکن بالفرض اگر ایسا ہے بھی تو کیا لوگوں کی تقدیریں مصرعوں اور اشعار پر بنتی بگڑتی ہیں؟

اسی ادھیڑ بن میں گھر آگیا۔ آج بھی مجھ سے کھانا نہ کھایا گیا۔ اماں ہزار پوچھتی رہیں لیکن میں ان سے کیا بتاتا؟ بدھ سنگھ قلندر کے یوں نکل جانے کا رنج تو تھا ہی، لیکن انھیں میری اور قلندر کی گہری دوستی کا کچھ اندازہ نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو ان کی سمجھ میں یہ بات کیونکر آتی کہ شاید قلندر بھی سوار.... نہیں ان باتوں کو سوچنا بھی حماقت ہے۔ میں نے حال حال اپنے دل میں کہا۔

لیکن ایک بات تو تھی ہی جو دل میں لگی رہ گئی تھی اور کبھی کبھی قلندر مجھے راہ چلتے دکھائی جاتے تو وہ بات تازہ ہو جاتی۔ لوگوں میں وہ بہت جلد پہنچے ہوئے فقیر مشہور ہو گئے تھے اور ان کی راہ میں عقیدت مندوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ لیکن کسی نے انھیں بولتے نہ دیکھا تھا۔ وہ تھوڑے بہت مبہم اشاروں میں کلام کرتے۔ کلام کیا کرتے، کچھ انگلیوں کی سی زبان میں گفتگو کرتے اور عقیدت مند لوگ انھیں کو معنی پہنا لیتے۔ اپنی حویلی انھوں نے چھوڑی نہیں تھی، لیکن اب وہ صدر دروازے پر بنی ہوئی دربان کی کوٹھری میں رہتے تھے۔ ان کے والدین ان کی دیکھ بھال کے لیے لاہور سے آرہے تھے، لیکن انھوں نے قبول نہ کیا۔ تھک ہار کر ان کے باپ واپس لاہور چلے گئے، ان کی والدہ بیٹے کی نگہداشت اور خدمت کے لیے ٹھہر گئی تھیں۔ وہ قلندر کے لیے ان کے دل پسند کھانے پکواتیں۔ لیکن زیادہ تر سارا کھانا محلے کے غریبوں میں تقسیم ہوتا کیونکہ قلندر نے کھانا بہت کم کر دیا تھا۔ اکثر تو وہ ہفتہ ہفتہ بھر کھانا نہ کھاتے، لیکن ان کا چہرہ ایسا تروتازہ رہتا جیسے ابھی سیر ہو کر اٹھے ہوں۔

قلندر سے میری بات چیت تو کیا، اس دن کے بعد سے آنکھ بھی نہ ملی تھی۔ لیکن ہم دونوں کو ایک دوسرے کے وجود کا احساس شاید تھا۔ میں ہفتے عشرے میں ان کی حویلی کے سامنے سے، یا پاس سے گذر لیتا، اگرچہ اس کی وجہ میں نہ تب سمجھ سکا نہ اب۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے وجود کا احساس یوں ہی دلاتے ہوں گے کہ اس راہ پر اور اس چوکھٹ کے سامنے میرے قدم ضرور مجھے لے جاتے جن پر بدھ سنگھ کا بھی پاؤں پڑتا تھا۔ والدہ کے مقیم ہونے کے باعث حویلی میں نوکر چاکر، دربان، کہار سبھی آباد تھے۔ لیکن عام طور پر وہاں سناٹا سا رہتا تھا یا شاید وہ میرے دل کا سناٹا ہو۔ ایک بار جب وہاں سے ہو کر نکلا تو کسی کو کہتے سنا کہ بدھ سنگھ اب تک تو اپنی والدہ سے دو چار حرف بول لیتے تھے، لیکن اب وہ بالکل خاموش رہنے لگے ہیں۔

پھر ایک دن سنا کہ بدھ سنگھ قلندر نے دلّی چھوڑ دی اور بریلی چلے گئے ہیں۔ کیوں، یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ یوں تو ان کے ماننے والے سہارن پور، مرادآباد اور آگرہ تک موجود تھے، لیکن بریلی میں ان کے کسی خاص معتقد کی اطلاع نہ تھی۔ میں حسبِ معمول ان کی حویلی پر سے گذرتا رہا، اگرچہ اب ان کی والدہ بھی اسے چھوڑ چکی تھیں۔ شاید لاہور واپس چلی گئی تھیں یا کیا معلوم آمتا کی آنچ سے بے قرار ہو کر بیٹے کو ڈھونڈنے بریلی چلی گئی ہوں۔ بس ایک کہن سال بہشتی حویلی کے اندر جاتا آتا کبھی دکھائی پڑ جاتا۔ معلوم ہوا کہ وہ صحن میں لگے مولسری اور انار اور تلسی کے پیڑوں کو پانی، اور قلندر کی والدہ کے پیارے ہیرامن طوطے کو دانہ پانی دینے کا فرض انجام دیتا ہے۔ تراہا بیرم خاں کا مشالچی شام کی شام صدر دروازے کی چوکھٹ پر ایک چراغ جلا جاتا۔ مجھے کسی کا شعر یاد آیا:

روشن ہے اس نمط دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

دن مہینوں میں بدلتے گئے۔ میری اداسی کبھی زیادہ ہوتی کبھی کم۔ ایک آدھ بار سوچا، بقاء اللہ سے بات کروں، دل کا حال کہوں۔ پوچھوں میرے لیے کیا بہتر ہے۔ لیکن ایک تو یہ کہ ہمت نہ پڑتی، اور دوسرے یہ کہ پوچھتا بھی تو کیا پوچھتا۔ بظاہر تو میری زندگی میں کوئی کمی نہ تھی۔ مدرسوں کی دُنیا میں کچھ لوگ اب میرا نام بھی جان گئے تھے، مجھے عام طور پر ہونہار اور محنتی استاد کہا جاتا تھا۔ عام لوگوں کی نظر میں تو میں خوش نصیب ہی

تھا۔ اللہ کا دیا ضرورت کے لیے گھر میں سب کچھ تھا۔ شادی کوئی ایسی ضروری نہ تھی، نہ اس کی کوئی جلدی تھی۔ میری عمر کے لوگ عموماً شادی شدہ اور ایک دو اولادوں کے باپ بن جاتے تھے۔ لیکن بعض لوگ شادی دیر میں کرتے اور بعض تو کرتے ہی نہ تھے۔ لہٰذا میرا نا متاہل رہنا کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اماں جی نے بھی شادی کے لیے مجھ سے کہنا سننا چھوڑ دیا تھا۔ میں عمر کے بائیس برس پورے کر کے تیئیسویں میں تھا۔ ہاتھ پاؤں اب بھی کسرتی تھے، قد بھی ایک آدھ انگل اور بڑھ گیا تھا۔ ڈاڑھی خوب بھر کر نکلی تھی۔ لیکن لبیں میں نے باریک نہ کرائی تھیں، سپاہیانہ وضع میں ذرا چڑھی ہوئی اور گھنی موچھیں رکھتا تھا۔

سال 1182ھ [1768ء/1769ء، مرتب] کی بسنت کے دن تھے۔ آفتاب برج حمل میں آیا ہی آیا تھا۔ موسم بدل رہا تھا، آتی گرمیاں تھیں۔ مدرسے میں چھٹی تھی۔ سارا شہر پستئی زرد رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان بسنت کا ذوق سب کو تھا۔ سلطان جی کی بارگاہ پر بسنتی کپڑے پہنے عورتوں مردوں کے جھنڈ شام و سحر نظر آتے تھے۔ پہلے مسلمانوں کو اس موسم اور اس کے میلوں سے رغبت نہ تھی لیکن حضرت سلطان جی اور امیر خسرو کا تعلق بسنت کے تیوہار سے قائم ہوا تو چیت کے مہینے کا وسط ہوتے ہوتے دلّی کے سارے مسلمان بسنتی رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ چاند رات ہی سے بسنت چڑھانے کی تقاریب کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ سب سے پہلے، اللہ میاں کی بسنت بھوجلہ کی پہاڑی پر جامع مسجد کے نیچے، چاند رات کو چڑھتی۔ پھر دن نکلنے پر قدم شریف پر بسنت چڑھاتے۔ دوسرے دن حضرت قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی صاحب کی بارگاہ میں بسنت پیش ہوتی اور تیسرے دن قوال لوگ حضرت سلطان الاولیا کی خانقاہ پر بسنت لے جاتے۔ اس طرح دلّی کے بائیسوں خواجگان کی درگاہوں پر بسنت چڑھتی اور ہر بسنت کے ساتھ قوالوں، نغمہ سرایوں، صاحبانِ حُسن و جمال، ہاتھوں میں عطر پھول پان لیے ہوئے زائرین کا جم غفیر رہتا۔

اس دن میں بھی بسنت کی سیر کو نکلا تھا۔ چیت کی بارہ تاریخ تھی، شیخ وقت حضرت کلیم اللہ صاحب جہان آبادی کی بسنت اٹھی تھی۔ قوالوں کی ایک ٹولی شاہ مبارک صاحب مرحوم کی غزل گاتی جا رہی تھی:

بیٹھے ہیں زرد پوش جھلک سیں منا بسنت
چاروں طرف سے آج اٹھی جگ میں گا بسنت
مارا ہے جوش رنگ خزاں نے بہار کا
لائی ہے حُسن و عشق کو باہم ملا بسنت

کیوں ہو رہے ہیں عشق کے مارے تمام زرد
رکھتی ہے کس کے حسن کی دل میں ہوا بسنت
ٹیسو کے پھول نئیں یہ دہکتے ہیں کوئلے
آئی جنوں میں آگ برہ کی لگا بسنت

میں خود تو زرد پوش نہ تھا، آخر مولویت کی کچھ شرم رکھنی تھی۔ لیکن اس وقت واقعی سارا عالم بسنتی کپڑوں والوں کی آتش رخسار سے پڑا دہک رہا تھا۔ کلام میں وہ اثر تھا کہ واقعی جی چاہتا تھا کوئی ایسا ہوتا جس کی یاد میں میرا بھی رنگ زرد ہوتا۔ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی کی درگاہ کے بالکل سامنے ایک فقیر، خوش لباس وخوش صورت، سنائی غزنوی کی مثنوی کے اشعار پڑھ رہا تھا۔ کیا شعر تھے اور کیا آواز تھی۔ اللہ رے اس درویش کی محویت، ماحول سے بے خبری۔ اس کا پور بدن انہماک کی تصویر تھا۔ پیشانی پر ایک پروقار، بلکہ حاکمانہ سی شکن۔ میں وہیں رک کر رہ گیا:

پیش معما جمال جاں افروز
چوں نمودی برو سپند بسوز
آں جمال تو چیست مستی تو
آں سپند تو چیست ہستی تو

میں نے اپنے دل میں کہا، کوئی ہو بھی تو اس کو کوئی اپنی مستیٔ جمال دکھلائے، اور پھر اس پر اپنی ہی ہستی کو خاک کر ڈالے کہ اب میں نہیں آپ ہی آپ ہیں۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔

میں نے ذرا متعجب ہو کر نگاہ اٹھائی، کہ یہاں مجھے جاننے والا کون ہوگا۔ میرے بالکل قریب ہی چار کہاروں کا ایک ہوادار رکا ہوا تھا۔ اس میں ایک بسنتی پوش، نہ چاہتے ہوئے بھی میری نگاہ اٹھی تو اٹھی ہی رہ گئی۔

کھلتا ہوا سانولا رنگ، بڑی بڑی سیاہ روشن دلچسپ آنکھیں، گھنی بھوؤں کے نیچے سے مجھے دیکھتی ہوئی۔ لمبے سیاہ بالوں کی کھجوری چوٹی سینے پر پڑی، موباف کے بغیر ہی اتنی بھاری کہ گات کو دبائے دیتی تھی۔ ہلکے کبریتی کام کی زرد ململ کا گھیر دار جامہ، جس کے دامن پر ذرا بھاری کشمیری کام بنا ہوا تھا۔ جامہ کمر پر بے حد

تنگ، یا شاید کمر ہی موئے میاں کی طرح باریک تھی۔ اوپری بدن پر تنگ کرتی، جس کے نیچے مخملی پیٹ جھلکتا ہوا۔ کرتی کے نیچے پڑاتے کی انگیا کسی ہوئی۔ لمبی گردن میں سرمئی سچے موتیوں کا ہار۔ گات کے بیچوں بیچ، گردن سے ذرا نیچے نیلم کی دھکدھکی جس کے چاروں طرف ہیرے جڑے ہوئے۔ کانوں میں مٹر کے دانے کے برابر بالکل یک رنگ زمرد کے گوشوارے جن پر جے پوری مینا کا کام، ناک میں چنے کی دال کے برابر یاقوت کی کیل۔ کلائیوں میں سبز کریلیاں، ان کے ساتھ ٹھوس سونے کی شیر دہاں۔ پاؤں میں سنہری جگمگ کرتی جوتیاں، اتنی نیچ دیوار اور مختصر دوڑ کی، کہ بمشکل پنجوں اور ایڑی کو ڈھانکتی تھیں۔ باقی پیر پر نگار کے نقوش پیچاں صاف نظر آتے تھے۔ ہاتھوں کی محض ایک ایک انگلی میں الماس کی انگوٹھی، ناخنوں پر کچھ گلابی رنگ کا چمکیلا روغن، کف دست پر بھی پیچ دار نگار نمایاں۔ داہنی کلائی پر سرخ چمڑے کی پٹی پر ایک شاہین بچہ۔ جامے کا دامن تھوڑا اٹھا ہوا کہ نازک نازک ٹخنے اور سڈول پنڈلیوں کی بناوٹ نظر آتی تھی۔ پاؤں میں سنبھل پوری پازیبیں، گلبدن کا پائجامہ اس قدر کسا ہوا کہ لگتا تھا بدن پر پہنا نہیں مڑھا گیا ہوگا۔ لیکن اگر کپڑا تھا تو پائجامے میں ہلکی سہی، کہیں شکن تو ہوتی۔ یہاں تو تھوڑا بہت جو کچھ نظر آتا تھا، بے شکن اور ریشم سا ڈھلواں تھا۔ مجھے نواب قادر درگاہ قلی خاں کی مذکورہ ادبیگم یاد آئیں اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ادبیگم پائجامہ نہیں پہنتی تھیں بلکہ بقول نواب درگاہ قلی خاں، 'بدن اسفل را بہ رنگ آمیزی ہائے خامۂ نقاش بہ اسلوب قطع پائجامہ رنگین کرتی تھیں اور کیا مجال کہ کپڑے کے انداز سے سرِمو تفاوت واقع ہو جاتا۔ تو کیا یہ بیگم بھی....؟

اس وقت تو اس گل حدیقۂ محبوبی کو میں نے سرسری ہی نظر سے دیکھا تھا۔ یہ تفصیلات آنکھوں کے پردے پر از خود مرتسم ہو گئی تھیں اور میں نے بعد میں ان کی ساری جزئیات کو دوبارہ اپنے دل میں زندہ کیا اور ادبیگم کا خیال آتے ہی تو میرا کاٹو تو لہو نہیں بدن میں کا سا حال ہو گیا تھا۔ نگاہ اوپر اٹھانے کی تاب نہ تھی، اور اگر نیچی رکھتا تو کیا جانے بڑے گھیر کا جامہ کب ہوا کی اٹکھیلی سے، یا اس کے پہلو بدلنے میں، ذرا اور بالا زد ہو جاتا۔ پھر تو میرے لیے نہ جائے ماندن ہوتی نہ پائے رفتن اور میں وہاں سے نگاہ ہٹانا بھی نہ چاہتا تھا، بھلا خود ہٹ جانے کا سوال کہاں تھا۔

بہت آہستہ آہستہ میں نے گردن اٹھائی، جیسے حاکم انصاف کے سامنے مجرم سر اٹھاتا ہے۔ وہ آنکھیں مجھ پر اسی طرح تھیں، محویت یا شدت کے ساتھ نہیں، لیکن بے ارادہ بھی نہیں۔ گویا آنکھ کسی منظر پر آکر از خود ٹھہر گئی ہو۔

میں عجب مخمصے میں تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ ان کو سلام کروں؟ لیکن میری جان نہ پہچان، اور پھر یہ بھی کہ اگرچہ ان کے چہرے بشرے پر شاہزادیوں والی تمکینی کیفیت تھی، لیکن ظاہر ہے یوں بے پردہ کھلے ہوادار میں چلنے والی کوئی شریف زادی نہ ہو سکتی تھی۔ ایسوں کے تو نام ہی سے مجھے بھاگنا سکھایا گیا تھا چہ جائے کہ ان سے کوئی ربط رکھنا۔ لیکن اس طرح ہونق کی طرح کھڑا کب تک انھیں تکتا رہوں؟ منھ پھیر لینے کی نہ ہمت تھی اور نہ دل ہی مانتا تھا۔ بے اختیارانہ میرا ہاتھ سلام کو اٹھ گیا۔

ادھر میرا ہاتھ اٹھا، ادھر تبسم کی روشنی کی چھوٹ جو ابھی صرف آنکھوں تک تھی، ان کے لبوں تک آ گئی۔ اب میں نے دیکھا کہ ہونٹوں پر کوئی مصنوعی سرخی، حتیٰ کہ پان کی بھی لالی نہ تھی۔ وہ ہونٹ اپنے رنگ ہی میں گلابی تھے۔ لیکن وہ تبسم بس اتنا تھا کہ گہر دنداں کی خفیف جھمک مجھ تک پہنچی۔ اب یہ یاد نہیں کہ ادھر سے صرف سر ہی خم ہوا یا ہاتھ بھی اٹھا:

سر ازیں تیغ برون آساں نیست
آہ مظہر خم سلام کسے

میں اب پریشانی میں تھا کہ آگے بڑھ کر کچھ بات کروں یا نہ، اور بات کیا کروں۔ اتنے میں ایک نوعمر قبول صورت خادمہ، تنگ پاجامہ، لمبا کرتا پہنے، کان میں مرکیاں، بالوں کی مینڈھیاں گندھی ہوئی، سینے پر بھاری رنگین دوپٹہ، دونے میں کچھ لے کر آئی۔ شاید تبرک تھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز مجھ پر ڈال کر وہ ہوادار میں ان حسینہ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی کہاروں نے ہوادار اٹھایا اور مٹیا محل کی طرف چل پڑے۔ میں ادھر دیکھتا ہی رہا۔ مجھے موہوم سی امید تھی کہ جانے والے مڑ کر دیکھیں گے، لیکن وہ اپنی باندی سے کچھ بات میں مصروف تھیں۔ میں نے بے ساختہ ایک قدم بڑھایا کہ ہوادار کے پیچھے پیچھے جاؤں لیکن غیرت آڑے آ گئی۔ میں اور ایسے سوار کے پیچھے کسی نفر کی طرح دوڑوں، یہ کیونکر ممکن تھا۔

لیکن میں پھر انھیں پاؤں گا کہاں؟ میں نے اپنے دل میں کہا، اور فوراً جھجک گیا۔ پانے نہ پانے کا یہاں کیا مذکور ہے؟ میری دُنیا اور، میری عقبیٰ اور، میرے افسانے اور، میرے حقائق اور۔ ارباب ناز ونشاط کا اور میرا کیا جوڑ؟ میاں خیر الدین، ہوش کے ناخن لو، سمجھ کر بات کرو اور سمجھ کی بات کرو۔ مگر یہ جان لینے میں حرج ہی کیا ہے کہ وہ کون ہیں؟ انھیں میری طرف کوئی میلان تو ہو گا نہیں، اور نہ خدانہ کردہ مجھے ہے۔ لیکن یہ

دلّی ہے، یہاں ایسے ہلکے پھلکے معاملات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میں تو تماش بین بھی نہیں ہوں، صرف راہ گیر ہوں۔

میری نگاہ اسی ہوادار پر تھی جو رفتہ رفتہ انبوہ میں گم ہوا چاہتا تھا۔

''السلام علیکم مولوی صاحب،'' اچانک میرے کان میں آواز آئی۔ میں نے خود کو چور سا محسوس کیا، لیکن سلام کا جواب دیے ہی بنی۔ وہ ہمارے محلے کا بہشتی تھا۔

''وعلیکم السلام میاں لال محمد، آج اس طرف کیسے؟''

''کچھ نہیں میاں، یہ جو عصمت جہاں ابھی گئی ہیں میں ان کے ہی اطراف کا ہوں۔ ان کا حکم تھا کہ آج حضرت شاہ جی کلیم اللہ صاحب کی درگاہ پر سقائی کریو۔ اسی لیے حاضر ہوا تھا۔''

''کون عصمت جہاں؟'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔

''وہی جن کا ہوادار ابھی جناب کے کنے سے گذرا ہے۔ راجواڑوں میں ان کا بالا خانہ مشہور ہے۔ نواب اشرف الدولہ افراسیاب خاں بہادر، جو منھ بولے بیٹے ہیں ذوالفقار الدولہ نجف خاں بہادر کے، وہ ان کے یہاں بہت آتے جاتے ہیں۔''

میں نے کچھ مناسب جواب اور انعام دے کر اسے رخصت کیا۔ دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی، سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ مدرسہ بند تھا، گھر جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ ستی بی بی کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھ سکتا تھا کہ اسے کئی دن سے دیکھا نہ تھا۔ لیکن ممکن ہے آج وہ بھی بسنت کے میلے میں کہیں گئی ہو۔ سچی بات یہ تھی کہ میں کہیں جانا چاہتا نہ تھا، طرح طرح کے بہانے تراش رہا تھا۔

میں یوں ہی بے مدعا قدم اٹھاتا جمنا کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں کی چہل پہل ایک آنکھ نہ بھائی۔ لیکن ایک خفیف سی امید کی کرن پیدا ہوئی تھی کہ شاید شام ہوتے ہوتے عصمت جہاں ادھر بجروں کا تماشا اور روشنی دیکھنے آویں تو میں بھی انھیں دیکھ لوں گا۔ لیکن میں انھیں دیکھنے کا متمنی کیوں ہوں؟ یہ کیا خام خیالی ہے؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔ ساری خاندانی شرافت، بزرگانِ دین و علم کا تقرب، اہل اللہ کی صحبت، معلمی کی عزت، کیا یہ سب اسی لیے تھی کہ اسے دل کی ہوا میں یوں اڑا دیا جائے؟ مگر لسان الغیب تو کہہ گئے ہیں:

رندی و ہوس ناکی در عہد شباب اولیٰ

لاحول ولاقوۃ، تو کیا میں رندی اور ہوس ناکی اختیار کرلوں، اور عصمت جہاں کو دوبارہ دیکھنے کی معصوم ناکردہ کارسی خواہش کیا رندی اور ہوس ناکی کا حکم رکھتی تھی؟ میں نے اپنے دل میں پوچھا۔ نہیں، کسی نے جواب دیا، لیکن وہ راہ ادھر ہی کو جاتی ہے:

ترسم نہ رسی بہ مکہ تو اے زاہد
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

شادی کرلوں؟ ابھی تو نام ونشان بھی نہیں پوچھا گیا ہے اور تم اتنے اونچے اڑنے لگے۔ ایسوں ہی کو عورتیں کہتی ہیں کہ چینی میں پیشاب کر کے منھ تو دیکھا ہوتا۔ تم کیا، تمھاری اوقات کیا! وہ اشرف الدولہ کی منظورِ نظر، ہزاروں دلوں اور لاکھوں اشرفیوں سے کھیلنے والی، اور تم ایک قریب قریب مفلس مولوی اور یہ بھی تو سوچ لیتے کہ ابھی روزِ اوّل بھی نہیں، نہ معلوم کیا معاملے پیش آئیں۔ باریابی کے بعد بھی، بلکہ اختلاط وآمیزش کے بعد بھی، سینکڑوں پیچ پڑ سکتے ہیں۔ ابھی تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ ان لوگوں کو جان ودل سے کھیلنا خوب آتا ہے۔ لوگ جان ودل پر کھیل کر ان سے ملتے ہیں اور ایمان وامن، عزت وسطوت بھی کھو کر لوٹتے ہیں۔ مجھے مجسطی ومفتاح سے کام ہے کہ گلستان کے باب پنجم اور خسرو شیریں سے۔

جمنا کے کنارے ہجوم بڑھ رہا تھا اور میری پریشاں خیالیاں بھی اسی اعتبار سے دم بدم افزوں تھیں۔ بجرے والوں کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ ہندو عورتوں نے منّت اور دعا کے چراغ بھی ترانا شروع کر دیے تھے۔ کیا پتا ان میں کچھ مسلمان بھی ہوں۔ توہم پرستی تو مسلمانوں میں بھی زوروں پر ہے۔ تو کیا ہوا؟ کیا تم بھی منّت کا دیا تراؤ گے؟ لاحول ولاقوۃ۔ اللہ مجھے شیطانی وساوس سے بچائے۔ میں اب گھر جاؤں گا۔ بہت ہو گیا۔

لیکن نہ معلوم کیا بات ہوئی کہ میں بہت دیر میں گھر پہنچا۔ اماں انتظار کرتے کرتے روہانسی ہو گئی تھیں۔ میں نے کوئی بے معنی سی معذرت کی اور مزید کچھ کہے بغیر دو لقمے کھا کے سو رہا۔ اماں جی البتہ دیر تک مصلے پر بیٹھی رہیں، پھر شاید دو ہی تین گھڑی سوئی ہوں کہ تہجد کے لیے اٹھ گئیں۔ صبح ناشتے کے بعد انھوں نے میری شادی کی بات چھیڑی۔ ادھر ایک مدت سے وہ اس موضوع کو ہاتھ نہ لگاتی تھیں، میں چڑتا جو تھا۔ آج معلوم نہیں کیوں انھوں نے بڑی منّت سے کہا، ''بیٹا اب خالی گھر نہیں سہا جاتا۔ آنگن میں چاند روشن ہو تو میرا جی بہلے۔''

مجھ سے نہ چپ رہتے بنتی تھی، نہ انکار کرتے۔ عجب بات یہ ہوئی کہ اس بار مجھے اس مذکور پر کوئی الجھن یا جھنجھلاہٹ نہ ہوئی۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا تو اماں کی ہمت بڑھی۔

''میں نے ایک بڑا اچھا گھر دیکھا ہے۔ لڑکی چندے آفتاب چندے ماہتاب، گھرانا شریفوں کا ہے۔ تمھارے والد مرحوم کے جاننے والے ہیں اور انھیں کی طرح سپہ گری پیشہ ہے۔ میرے تو جی میں آئی رقعہ پہلے بھجوا دوں، تم سے بعد میں بتاؤں، لیکن اللہ رکھے تم شادی کا ذکر اذکار پر نہ جانے کیوں چیں بہ جبیں ہوتے ہو، اس لیے ہمت نہ پڑی۔''

''اماں جی، میں کوئی بے زبان بیٹی تو ہوں نہیں کہ آپ جہاں چاہیں جس کے دامن میں چاہیں باندھ دیں۔''

''اے لو، دیکھو خفا ہو گئے نہ۔ تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں نے بات شروع کی بھی، پکی کرنا دور رہا۔ میری تو صرف ایک تجویز تھی۔ اب مجھ سے کام بھی زیادہ نہیں ہوتا، سینے میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ لگتا ہے اب بہت دن مجھ رہنا نہیں ہے....''

''سینے میں درد؟''، میں نے بات کاٹ کر کہا، ''یہ کیسا درد ہے۔ کب سے ہے؟ آپ نے پہلے تو کبھی بتایا نہیں۔''

''تو اب کیا میں اپنی ہر چھوٹی بڑی بیماری تجھ سے کہوں گی بیٹا؟ بڑھاپے میں اس طرح کے آزار لگتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی جوڑوں میں درد، کبھی پیٹھ میں درد، کبھی سینے میں درد۔''

''نہیں۔ سینے کے درد کی بات اور ہے۔ پورا حال بتائیے، میں ابھی حکیم صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ درد بائیں طرف ہوتا ہے کہ دائیں جانب؟ شانے یا بازو تک تو نہیں جاتا؟''

مجھے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ پچھتا سی گئیں۔ ''اے لو، کیسا درد اور کہاں کا درد بیٹا۔ ابھی جاتی سردیاں ہیں، فصلیں بدلتی ہیں تو ہم بوڑھوں کو کھانسی، سینے میں، جوڑوں میں، درد تو ہو ہی جاتا ہے۔ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ نہیں تو حکیم رکن الدین صاحب کے روغن کی مالش کرا لوں گی۔ ابھی پرسوں ہی تمھاری دائی کھلائی آئی تھی، کہہ رہی تھی بی بی جی کوئی کام ہو تو یاد کر لینا۔''

''دیکھیے آپ کو میرے سر کی سوں اگلی بار درد ہو تو مجھے فوراً بتائیے گا، پوشیدہ نہ رکھیے گا۔''

''اچھا بابا، تیری ہی سہی۔ لیکن اس تجویز کے بارے میں تو کچھ بول۔''

میں کچھ دیر چپ رہا، جھوٹ بولنا چاہتا تھا، اور سچ بولنے کو کچھ تھا نہیں۔ ’’اماں جی دو تین دن کا وقت دیجیے، میں پرسوں سوچ ساج کر جواب دوں گا۔ شادی تو مجھے اب کرتے ہی بنے۔‘‘

وہ کھل اٹھیں، پہلی بار انھیں مجھ سے اتنا امید افزا جواب ملا تھا۔ ’’ٹھیک ہے، تو خوب سوچ سمجھ لے بیٹا۔ مجھے کوئی ایسی جلدی تھوڑی ہے۔ میرا بچہ راضی ہو جائے تو بہتیری دلہنیں ہیں۔‘‘

میں نے تھوڑی بہت جو طب پڑھی تھی اس کی روشنی میں مجھے اماں کے درد کی مزید تفتیش کرنی چاہیے تھی۔ وہ دھان پان سی تھیں، اور ان کی کوئی عمر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں شادی کے کئی برس بعد پیدا ہوا تھا، پھر بھی وہ اس وقت بہت ہوں گی تو بیالیس پینتالیس کی ہوں گی۔ نہ ان کا ڈیل ڈول وجع مفاصل والوں جیسا تھا اور نہ عمر۔ وجع صدر، اور اس کی اصل وجہ کی طرف میرا دھیان جانا چاہیے تھا، لیکن میں اپنی غرض مندیوں کے پیچھے دوڑ رہا تھا، میرا ذہن اپنی ہی الجھنوں کو بہت بڑی کر کے دیکھ رہا تھا۔ اگر میرے حالات معتدل ہوتے تو میں شاید اماں کے مرض کی اہمیت کا اندازہ کر سکتا۔

اس دن جب میں گھر سے نکلا تو یہ طے کر کے نکلا کہ راجواڑوں کی گلی میں آج وہ گھر دیکھ کر ہی آؤں گا۔ لیکن کچھ دور چل کر میری ہمت جواب دینے لگی۔ میں اِدھر سے اُدھر گرد باد سا چکر لگاتا رہا۔ قلعۂ معلیٰ کے دروازۂ غربی کے روبرو چوک سعد اللہ خان پر آج بہار تھی۔ یوں تو وہ جگہ روز ہی اپنی دل فریبی اور گہما گہمی کے لیے رشک اصفہان و روم ہوتی ہے لیکن بسنت کے دنوں میں اس کی رونق دہ چند ہو جاتی ہے۔ ہر چیز کی فراوانی، ہر طرح کے لوگوں کا مجمع۔ داستان گو، مولوی، واعظ، رقاص لونڈے، کنچنیاں، نجومی اور رمال، شعبدہ باز، حکیم اور بید، خصوصاً وہ جو امراضِ نہانی کا علاج کرتے ہیں اور سبھی اشیا و ادویہ کا کاروبار کرتے اور خلقت کو لوٹتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، اسلحہ فروش، طیور فروش، شکاری جانوروں اور کتوں کے بیوپاری، قفس ساز، آئینہ ساز، اس طرح کے دکان دار تو روز ہی ہوتے ہیں۔ بسنت کے دنوں میں عطر فروشوں، گل فروشوں، اقمشہ کے بیوپاریوں، اور اربابِ طرب کا اضافہ ہو جاتا تھا۔ مجھے اس چوک میں سیر کرتے کرتے تیسرا پہر آ گیا۔

میں نے چوک سعد اللہ خان سے نکل کر سامنے ہی چاندنی چوک کے قہوہ خانوں میں ایک دو گھڑیاں گذاریں۔ ایک قہوہ خانے میں حضرت خواجہ میر درد کا ایک نوعمر معتقد ان کی فارسی رباعیاں لحن سے سنا رہا تھا۔ کئی شعرا بھی موجود تھے۔ میں نے میاں نور العین واقف کو پہچانا، اور حیرت کی۔ عام حالات میں وہ اپنا تکیہ نہ چھوڑتے تھے۔ شاید بسنت کی کشش انھیں بھی کھینچ لائی تھی۔ میرے جی میں آئی کہ دیر تک سنوں، لیکن ایک

ہی رباعی نے ایسا تڑپایا کہ ٹھہرنا محال ہوا:

یک عمر ز دور می شنیدم او را
در بر بہ خیال می کشیدم او را
اکنوں کہ چو آئینہ رسیدم پیشش
خود را او دید من نہ دیدم او را

میری آنکھ نم ہوگئی اور میں چپکے سے باہر نکل آیا۔

عام حالات میں مجھے تو چاہیے تھا کہ میں نہر کے دو رویہ تماشوں اور دکانوں کی سیر کرتا ہوا پورا خاندانی چوک پار کر کے فتح پوری کو چلا جاتا۔ لیکن اب حالات کسی طرح عام نہ رہ گئے تھے۔ کٹرہ نیل پہنچتے پہنچتے میرے قدم سڑک کے اس پار کی اس تنگ گلی میں خود بہ خود مڑ گئے جو چاوڑی کو جانے والی گلی سے ملتی تھی۔ کچھ دیر بعد میں چونکا تو معلوم ہوا میں راجواڑوں کے پاس آ گیا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر تھوڑی سی ہنسی آئی، اور کچھ ڈر بھی لگا۔ یہ بھی تشویش ہوئی کہ اس گھر کا پتا کس سے پوچھوں گا اور کیا کہہ کر پوچھوں گا۔ اس کی توقع نہ تھی کہ یہاں کوئی میرا صورت آشنا ہوگا، لیکن چور تو میرے دل میں تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ہر شخص مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں سر جھکائے چلتا جا رہا تھا، اور مجھے یہ بھی خیال تھا کہ سر اٹھاؤں گا نہیں تو گھر کا پتا کیسے پوچھوں گا۔ کس سے پوچھوں، وہ تو بعد کی بات تھی۔

لال محمد نے کہا تھا کہ ان کا بالا خانہ بہت نمایاں اور مشہور ہے۔ اتنا پتا بہر حال کافی نہ تھا۔ لیکن اس دن قسمت میری اچھی تھی، میری مشکل آپ سے آپ حل ہوگئی۔ ان کی وہی خادمہ مجھے سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی جو اس دن ہوادار میں تھی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے مجھے پہچان کر سلام کیا۔ میں پھر گڑبڑایا کہ سلام کے جواب میں کیا کہوں، لیکن اس نے موقع نہ دیا، خود ہی مسکرا کر بولی، ''مولوی صاحب، آپ اچھے آئے۔ بی بی جی بس ابھی کہیں جانے ہی والی ہیں۔ میں ان کے استاد صاحب کو کہنے گئی تھی کہ آج تعلیم نہ ہوگی۔''

جانے ہی والی ہیں، میں نے دل میں کچھ افسوس اور کچھ اطمینان سے کہا۔ چلو جان بچی، زیادہ دیر بیٹھنا نہیں پڑے گا۔ لیکن اتنی دور آنا بے کار ہی گیا۔ وہ خادمہ تیز قدم چلتی ہوئی ایک عالی شان حویلی کے صدر دروازے پر رکی۔ ایک بگی، جس کے پہیوں اور دروازے پر پیتل کا کام تھا، اور جس میں دو کاٹھیاواڑی چلبلے

گھنی یال والے ٹانگن جتے ہوئے تھے، دروازے پر کھڑی تھی۔ میں جب تک دروازے پر پہنچوں پہنچوں، صدر دروازے پر بیٹھے دونوں کابلی دربان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں پہنچا تو عصمت جہاں دروازے پر آ چکی تھیں۔

ابھی انھوں نے مجھے ٹھیک سے دیکھا اور پہچانا نہ تھا۔ اسی خادمہ کی طرف دیکھ کر ذرا تیز لہجے میں بولیں، ''صغیر النساء، اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' ابھی وہ جواب میں کچھ کہنے نہ پائی تھی کہ ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''اللہ مولوی صاحب!'' ان کے منھ سے نکلا۔ لہجے میں کچھ تحیر اور شاید کچھ مسرت تھی۔ پھر ذرا ٹھہرے ہوئے لہجے میں، ''آپ کے سر کی قسم، مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ دست بستہ معافی کی خواست گار ہوں۔''
واللہ ایسی نرم و شیریں اور سڈول نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی بھلا حوروں کی بھی بولی کیا ہو گی۔ مجھ سے کچھ کہا نہ گیا، نہ آنکھیں چار کی گئیں۔ بس خدا جانے کہاں سے عرفی کا مصرع دل سے زبان آ رہا:

فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

''چلیے بنائیے نہیں، میں آپ کی طرح عالم فاضل نہیں کہ ہر موقعے پر عرفی کا شعر پڑھ دوں۔ اچھا اب مجھے اجازت مرحمت ہو۔ دیکھیے کل ضرور آیئے گا، اسی وقت۔''
وہ بگھی میں سوار ہو کر چلی گئیں اور میرے دل میں حسد اور رنج کے سینکڑوں تلاطم برپا کر گئیں۔ کسی کے یہاں جانا تھا، کیوں جانا تھا؟ کیا وہ کسی کی ملازم ہیں؟ پھر مجھ سے کس طرح کا تعلق بنائیں گی؟ دل نے کہا، ارے احمق، ابھی سے تعلق کی باتیں کرتا ہے۔ ابھی تو اس آستانے کی خاک بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر صغیر النسا بولی:

''مولوی صاحب، کیا مزاج ماندہ ہو گیا ہے؟ اندر تشریف رکھیں، شربت نوش فرمائیں، کچھ آرام فرما لیں۔''

لیکن اب وہاں ٹھہرنے کا یارا کسے تھا۔ میں اسے بندگی کہہ کر رخصت ہوا۔ راستے بھر دل میں وہی ہلچل رہی۔ ہائے کیا حُسن ہے، کیا مطلوبیت اور محبوبیت ہے۔ لیکن وہ اس کا چاہنے والا کون ہے؟ اور اگر چاہنے والا نہیں تو وہ کسی کے دامن سے متوسل ہے؟ میں ایسے کو معشوق (یہ لفظ پہلی بار میری زبان پر آیا تھا) بنا کر کیا کروں جو میرا نہ ہو سکے؟ مجھے حکیم سنائی کے وہ شعر پھر یاد آئے جو شاہ کلیم اللہ شاہ صاحب کی درگاہ کے

پاس نے تھے۔ عشق میں اپنے وجود کو تھوڑا ہی دکھاتے ہیں اور دکھاتے بھی ہیں تو پھر اپنی ہستی کو اپنی ہی آگ میں بھسم کر دیتے ہیں۔ 'بھکھ گیا عشق کا اژدر ترے غم خواروں کو'، مجھے میر تقی کا مصرع یاد آیا۔ لیکن عصمت جہاں تو خود ہی ایک خوبصورت سانپ ہے۔ اس سے کھیلو گے تو ڈسے جاؤ گے۔ اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ مجھے چند برس پہلے کا ایک واقعہ یاد آیا کہ روہیلوں کے نواب علی محمد خاں کے بیٹے نواب عبداللہ خاں کو سانپ پالنے اور کھلانے کا شوق تھا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تسخیر مار کا افسوں جانتے ہیں اور سانپ ان کے ہاتھ میں آ کر بے جان رسی ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ سانپ ہی کے کاٹے سے مرے۔ ایک زہریلا سانپ ان کے سامنے لایا گیا اور انھوں نے منتر پڑھ کر اسے ہاتھ میں لے لیا۔ سانپ نے پلٹ کر انھیں ایسا کاٹا کہ وہ چار گھڑی میں واصل بحق ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور مجھے تو کوئی عمل تسخیر بھی نہ آتا تھا۔ اگر میں نے اس دیوانگی سے توبہ نہ کی تو میرا حشر اور بھی برا ہونا تھا۔

لیکن کیا انسان صرف فائدے نقصان کے لیے جیتا ہے؟ کیا اور کوئی بلند تر مقصد و منظر نہیں جس کے لیے سعی کی جائے؟ یہ گھر گرہستی، یہ نام نہاد باعزت زندگی، یہ تعلیم و تعلم، یہ محفلیں اور مجلسیں، اسی وقت تک بامعنی ہیں جب انسان کے پاس بہتر لائحہ نہ ہو۔ یہ آہوانِ حرم کی طرح محفوظ جینا کوئی جینا ہے؟ زندگی میں پہلی بار مجھے جینے کا ایک نیا ذائقہ نصیب ہوا تھا اور اس کے آگے ساری گذشتہ عمر بالکل پھیکی سیٹھی بیماروں کا کھانا لگ رہی تھی۔ میں جوان اور تندرست تھا، ایسا کھانا کیوں کھاؤں؟ اور یہ گھر کیا اور روزی کمانے کے کم ارز طریقے کیا؟ آخر بدھ سنگھ بھی تو تھے۔ ان کے پاس کیا نہ تھا، لیکن انھوں نے سب ترک کر دیا، حتیٰ کہ کھانا بھی۔ انھوں نے سنائی کی اس نصیحت پر عمل کر کے دکھلا دیا:

دشت و کہسار گیر ہم چو وحوش
خانماں را بماں بہ گربہ و موش
خانہ را گر برائے قوت کنند
مور و زنبور و عنکبوت کنند

آج بدھ سنگھ قلندر سے بڑھ کر خوش نصیب کون ہوگا۔ گھر لٹا کر وہ کسی طرح گھاٹے میں نہیں اور میں گھر کب لٹا رہا ہوں؟ میں تو صرف اپنی نام نہاد، جھوٹی عزت لٹا رہا ہوں۔ جب تک میری اماں زندہ ہیں میں گھر

چھوڑ کر نہیں جانے والا۔ میں عصمت جہاں کو بیاہ لاؤں گا۔ نہیں تو اس کی گلی کے طواف کو ذریعۂ نجات جانوں گا۔ میں کل اسی وقت عصمت کے یہاں ضرور جاؤں گا۔ میں اماں کو سب کچھ بتا دوں گا۔

لیکن اگلے دن ہی کیا، میں عصمت جہاں کے گھر پھر کبھی نہ گیا۔ اس رات کے صبح ہوتے ہوتے مجھ پر صحرائے ظلمات جیسی کئی راتیں گذر چکی تھیں۔ فجر کی اذان ہوئی تو میں نے چین کا سانس لیا کہ مجھے معلوم تھا ایسی رات مجھ پر آئندہ نہ گذرے گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ عصمت جہاں کے ساتھ کوئی کھیل میرے کھیلنے کا نہیں ہے۔ بچپن میں ہم لوگ گھر گھر کا کھیل کھیلتے تھے۔ ایک گھر والے دوسرے کے گھر ملاقات کو جاتے، عطر پان سے ان کی خاطر تواضع ہوتی، دوستیاں اور رشتے استوار ہوتے۔ بیماری اور صحت کی باتیں ہوتیں۔ ہم جانتے تھے کہ یہ سب محض کھیل ہے، سوانگ ہے، لیکن ہماری محویت، اور جزئیات کے لیے ہمارا ذوق اس سے کم نہ ہوتا تھا۔ عصمت جہاں کے ساتھ اس طرح کا بھی کھیل میرے لیے نہ تھا اور ان کی، یا کسی کی بھی، راہ میں خاک ہو جانا میرا منصب نہ تھا۔

مجھ پر وحشت طاری رہنے لگی۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی اور اماں کی خدمتوں میں انہماک میں نے اور بڑھا دیا۔ وحشت کی اصل گھڑیاں تب ہوتیں جب میں اکیلا ہوتا۔ ایک آدھ بار راستوں میں عصمت جہاں اپنے ہوادار پر دکھائی دیں اور ہر بار مجھے لگتا کہ ان کی آنکھوں میں استفسار بھی ہے اور نوید بھی۔ لیکن میں نے ایک بار کے بعد انھیں کبھی آنکھ بھر کر نہ دیکھا۔ اس بار میں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جواباً ان کے لب کھلے، لیکن انھوں نے کیا کہا، میں نے سنا نہیں۔

اماں نے جس رشتے کا ذکر کیا تھا، اس کے لیے میں نے ہاں کر دی تھی۔ لیکن چند دنوں بعد اماں جی ہی نہ رہیں۔ ایک صبح میں فجر کے لیے اٹھا تو دیکھا تہجد کے مصلے پر وہ بے حس و حرکت پڑی ہیں۔ وہ بے ہوش تھیں اور پھر بھی ان کے چہرے پر درد کے سرمئی پرچھائیں تھیں۔ میں نے جلدی سے پڑوس کی عورتوں کو پکارا اور ستی بیگم کے گھر پر آواز دیتا ہوا حکیموں والی گلی میں اشرف الاطبا حکیم شریف صاحب کی حویلی پر دوڑتا ہوا پہنچا۔ وہ فرشتہ سیرت بزرگ فوراً میرے ساتھ سوار ہو کر ہمارے گھر تک آئے۔ لیکن تب تک وہ اللہ کے گھر جا چکی تھیں۔ ستی بی بی رو رو کر غش کھاتی اور جب ہوش میں آتی تو پھر روتی۔ ظہر بعد میں انھیں مہندیوں کے متبرک قبرستان میں سپردِ خاک کر آیا۔ چہلم تک ستی بی بی آبائی گھر میں رہی، اماں کو کئی قرآن پڑھ کر بخشے، غریب غربا کو بہت داد و دہش کرتی رہی۔ آخر چالیس دن پورے کر کے آنسو پونچھتی گھر کو سدھاری۔

اماں کے چہلم کے بعد میرا مزاج اور بھی سوداوی ہو گیا۔ آخر مدرسہ چھوڑ چھاڑ گھر میں پڑ رہا۔ ستی بیگم نے ہزار کہا کہ بھیا شادی کر لو، لیکن میں نے ایک نہ سنی اور ایک دن اسے اس بری طرح جھڑک دیا کہ وہ روتی اپنے گھر چلی گئی۔

شہر میں کوئی سوار نہ آیا۔ میں نے عصمت تخلص رکھ کر شعر کہنا شروع کر دیا۔ دو چار شاگردوں سے کچھ فتوح آجاتی ہے، گذارے کے لیے بہت ہے۔ راتوں کو بہت کم سوتا ہوں۔ روز امید کرتا ہوں کہ آج سوؤں گا اور خواب دیکھوں گا، لیکن ٹھیک سے کبھی نہیں سوتا، اور خواب دیکھے تو مدت ہو گئی۔

ان صحبتوں میں آخر ...

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا

میر، دیوان اول

ان صحبتوں میں آخر ...

گھر سے نکلے آج لبیبہ خانم کو پانچواں ہفتہ تھا۔ اس کے گھرانے کے لیے خانہ بدری کا یہ پہلا موقع نہ تھا۔ اس کے دادا افراہیم جودت بیگووچ نے صدی کے آغاز میں بلقان کو چھوڑ کر ارمن کے شہر نخ جوان میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اس سے بھی کئی صدیاں پہلے جب [1492ء میں، مرتب] فلپ پنجم نے غرناطہ، بلکہ سارے اندلس ہی کے مسلمانوں اور یہودیوں کے سامنے شرط رکھی تھی کہ یا مذہب ترک کریں، یا ملک چھوڑیں، یا جان سے ہاتھ دھوئیں، تو لبیبہ خانم کے یہودی النسل اور یہودی المذہب جدّ اعلیٰ، شاعر، فقیہ اور کاہن اعظم ذئب بن صالح نے جلاوطنی کو گلے لگا کر سو برس کے بسے بسائے گھر، کتب خانے اور دُنیاوی املاک، سب کو اپنے ہاتھوں سے آگ دے کر سربیہ (Serbia) کے مشہور شہر بیوغراد [موجودہ بلغاریہ، یا Belgrade، مرتب] میں پناہ لی تھی۔ وہاں ان دنوں عثمانیوں کی حکومت تھی اور مسلمان، یہودی، عیسائی، زرتشتی، سب کے سروں اور گھروں پر سلطان بایزید ثانی کا سایۂ عاطفت وعطوفت یکساں مستر اور مستنیر تھا۔

اس زمانے کے اندلس میں متوطن اکثر یہودیوں کی طرح ذئب بن صالح کی بھی زبان عربی تھی۔ اس کے مذہبی عقائد اور تصورات دُنیاوی و دینی پر موسیٰ بن میمون [1135ء تا 1204ء، مرتب] کے فلسفے کا گہرا اثر تھا۔ موسیٰ بن میمون کی تعلیم یہ تھی کہ جہاں تک حق کا سوال ہے، تمام مذاہب اپنے اپنے طور پر حق کی ہی طرف

لے جاتے ہیں، لیکن روزمرہ کی بود و باش اور معیشت کے لیے عبرانیت ہی سب سے اچھا مسلک ہے۔

ذئب بن صالح کو بنو امیہ کے دورِ حکومت کا اندلس اور عثمانیوں کے زمانے کا بلقان یکساں راس آئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ خود تو آخر عمر تک عربی ہی بولتا لکھتا رہا تھا، لیکن اس کے اخلاف نے عربی ترک کر دی تھی، کہ گھر سے باہر اس کا رواج نہ تھا۔ ذئب کی موت کے بعد اس کے اخلافِ نرینہ میں سے اکثر نے بیوغراد میں مروج سربیائی/ بوسنیائی زبان کے علاوہ ترکی، چرکسی اور فارسی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ مؤخر الذکر دو زبانیں تو دراصل شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہونے کے بعد گویا جہیز میں آئی تھیں۔ فارسی بولنے والے یہودیوں کی خاصی تعداد تجارت اور نوکری سلطانی کی غرض سے تبریز اور یاروان سے بیوغراد تک آمد و رفت رکھتی تھی۔ کوہ قاف کے جنوبی دامن میں بسنے والے چرکسی تقریباً سب کے سب سنی مسلمان تھے، لیکن ان میں اِکا دُکا کا یہودی خاندان، جن کا پیشہ دبیری تھا، بیوغراد میں عرصۂ دراز سے آباد تھے، اور اپنے حسن صورت کے لیے بھی سماج میں اتنے ہی نمایاں و ممتاز تھے جتنی ان کی کارکردگی بابِ حکومت میں ضرب المثل تھی۔

دو ڈھائی سو برس آرام سے گذرے۔ ذئب بن صالح کی خاندانی شکل و شباہت کے نقوش مقامی یہودی، اور بعض ترکی یا عیسائی گھرانوں کے رنگوں سے مل کر دھندلے پڑنے لگے تھے۔ ذئب بن صالح کی براہِ راست اولاد میں کوئی نہ بچا تھا، لیکن اس کا نام باقی تھا۔ موسیٰ بن میمون کی تعلیمات کا بھی اثر باقی تھا اور کئی گھرانے ایسے تھے جو اپنا رشتۂ نسب ذئب بن صالح سے باندھتے تھے۔ انھیں میں لبیبہ خانم کے جدِ اعلیٰ بھی تھے۔ یہ انھیں ایرانیوں میں سے تھے جن کی آمد بیوغراد میں 1400ء کے بعد شروع ہوئی تھی، یعنی اس وقت جب عثمانیوں کا تسلط بلقان پر اچھی طرح جم چکا تھا، اور یہودیوں کو وہاں عیسائی حکومتوں کے ہاتھوں کسی قسم کا خدشہ نہ رہا تھا۔ یہ لوگ، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں مصر سے آ کر بحرِ روم کے شمالی اور مشرقی سواحل پر آباد ہوئے تھے، زمانے، اور خاص کر رومائی شہنشاہوں، اور پھر عیسائیت کے ہاتھوں بار بار تباہ و تاراج کیے جانے کے باعث اپنی اصل اور آغاز سے اس قدر دور ہو چکے تھے کہ اب وہ خود کو عرب یا ایرانی سمجھنے لگے تھے۔ یوں تو سرزمین عرب، خاص کر نجد میں ایسے بھی لوگ کم تعداد میں نہ تھے جن کے چہروں کی صباحت اور آنکھوں کی نیلگونی کوہ قاف کی اقوام کو مات کرتی تھی، لیکن بحرِ روم کے شمال اور مشرقی ساحلوں کے اصل باشندوں میں عراق عرب کے عرب خون کی آمیزش کا لطیف سانولا پن تھا۔ لبیبہ خانم کے اجداد کی شکلوں پر اب ایرانی صباحت کے تیکھے پن کی بھی جلوہ ریزی تھی۔ لیکن گھنے سیاہ بال کچھ یونانی بہار بھی دکھا دیتے تھے۔

لبیبہ خانم کے پردادا اور پردادی کے گھرانے باہم قرابت قریبہ رکھتے تھے، اور ان کا زمانہ آتے آتے ذئب بن صالح، خاور بحرِ روم، ایران، اور بلقانی رنگ روپ کی یکجائی نے ان کے افراد خاندان کی صورتوں پر انسانی حُسن کی وہ شفق روشن کر دی تھی کہ ان کی خوبصورتی کی قسم کھاتے اور کہتے کہ یہ لوگ ازدواج اور مباشرت کے لیے نہیں، پرستش کے لیے بنائے گئے ہیں۔

سترہویں صدی کے اختتام پذیر ہوتے ہوتے عثمانیوں کی طاقت مشرقی یورپ میں کمزور پڑنے لگی۔ حکومت اگرچہ اب بھی ان کے ہاتھ میں تھی، لیکن اب ان کا وہ دبدبہ نہ رہا تھا۔ شمالی یورپ اور برطانیہ تک پھیلے ہوئے مسلمان ترک خاندان ایک ایک کر کے ممالک محروسۂ دولت عثمانیہ کے چتر تلے واپس آنے لگے تھے۔ وی آنا کے ترکی محاصرے [1683ء، مرتب] کی ناکامی نے اقوامِ یورپ کے دل سے ترکوں کا خوف کچھ کم کر دیا تھا۔ محاصرے کی ناکامی کی یادگار کے طور پر ہلالی شکل کا جو کلچہ اہل وی آنا نے ایجاد کیا تھا، اور جس کا نام سارے یورپ میں Croissant [ہلال، مرتب] ہی مشہور ہو گیا تھا، اہلِ یورپ کو ہر صبح ناشتے پر عثمانیوں کی ہزیمت پذیری کی یاد تازہ کراتا تھا۔ دور اندیش لوگ، خاص کر یہودی، اس دن کے خیال سے خوف زدہ رہنے لگے جب ان زمینوں پر دوبارہ عیسائیوں کا قبضہ ہو گا اور دُنیا ہر غیر عیسائی کے لیے تنگ ہو جائے گی۔ بیت المقدس پر صلیبی جنگ کے سورماؤں کی فتح [1099ء، مرتب] کے موقعے پر مسلمان اور یہودی جس طرح بے دریغ قتل کیے گئے، ان کے زن بچے جس بے دردی سے غلام بنائے گئے، ان کی عمارات و آثار جس غلو کے ساتھ زمین بوس کی گئیں، وہ سب باتیں اب لوگوں کے دلوں پر اجتماعی کابوس کی طرح مسلط تھیں۔ قوم کے بزرگ دانش مند یہ بھی کہتے تھے کہ اب اگر ہم اہلِ فرنگ کے غلام ہوئے تو پھر کوئی صلاح الدین ایوبی ہمیں رہائی دلانے کو نہ پیدا ہو گا۔

سترہویں صدی کے آخر برس میں لبیبہ خانم کے دادا افراہیم جودت بیگووچ کو غیر متوقع طور پر خاور بحرِ روم کی زمینِ مالوف کو مراجعت کا موقع ہاتھ لگا، اور کچھ ایسے حالات میں، کہ اسے بیوغراد کی سکونت ترک ہی کرنی پڑی۔ ہوا یوں کہ ارمن کے شہر تخ جوان میں بے سان و گمان ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ شہر کا بڑا حصہ، اور خاص کر اس کا بڑا بازار، منہدم ہو کر رہ گیا۔ شہر کی کثیر آبادی میں سے کچھ کو زمین ہی نے کھا لیا، اور کچھ کو زلزلے نے عمارتوں کے تلے کچل کر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جودت بیگووچ کے ایک ماموں شہرام یافع بھی مرگِ مفاجات کا شکار ہوئے۔ وہ جودت بیگووچ کے سگے ماموں نہ تھے، لیکن ان کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

شادی انھوں نے کی نہ تھی۔ انھوں نے اپنی ساری دولت اور ساری تجارت کا وارث افراہیم جودت بیگووچ کو قرار دے دیا تھا۔ چونکہ ابھی ان کی عمر بہت نہ تھی، بمشکل چالیس کے رہے ہوں گے، اس لیے سب کو توقع تھی کہ انھوں نے دور دراز رہنے والے افراہیم جودت بیگووچ کو محض رسماً اپنا وارث اور جانشین ٹھہرا لیا ہے، اور مناسب موقع آنے پر وہ اپنا گھر بھی آباد کریں گے، ان کے وارث اور والی بھی پیدا ہوں گے، اور ان کے کام سب ٹھیک چلتے جائیں گے۔

لیکن زلزلے نے وہ تمام باتیں، سارے مفروضے اور عزائم چشم زدن میں خاک کر دیے۔ اب شہرام یافع کی دولت کا وارث تو کیا، اس کی لاش کو ڈھونڈ کر سپردِ خاک کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ افراہیم جودت بیگووچ نے مجبوراً بوغراد کی جمی جمائی گرہستی، بابِ سلطانی کی ملازمت، دوست احباب کی محفلیں سب ترک کر کے اپنی بیوی، اکلوتے بیٹے اور بہو کے ساتھ نخ جوان کی راہ لی۔ زبان اور طرزِ معاشرت کا کوئی مسئلہ البتہ نہ تھا، کہ ارمنی زبان پر فارسی کا اتنا گہرا اثر تھا، اور ہے، کہ فارسی جاننے والا تھوڑی سی مشق کے بعد ارمنی پر قدرت حاصل کر سکتا تھا۔ خود فارسی بھی اس زمانے میں ارمنی کے بعد سارے ارمنستان میں مقبول ترین زبان تھی، اور افراہیم اس زبان سے بخوبی واقف تھا۔

توقع تھی، بلکہ توقع کیا، سب کو تقریباً یقین تھا کہ شہرام یافع کی تجارت اور دولت کا وارث اپنے حُسنِ کارکردگی، وہبی صلاحیت، اور تجربے کی بنا پر کچھ ہی برس میں زلزلے کے نقصانات کی تلافی کر لے گا، اور ماموں کی تجارت مزید ترقی کی شاہراہ پر گام زن ہوگی۔ لیکن افراہیم کو نخ جوان میں آئے پانچ مہینے بھی نہ ہوئے تھے کہ شہر کو دوسرے زلزلے نے آ لیا اور اس بار شہر ہی نہیں، بحر ماژندران کے تمام مغربی ساحل کو بھی بھونچال نے کچھ اس بے طرح لپیٹ میں لے لیا کہ کوئی سو میل تک کے سمندر کا پانی امڈ کر بیس اور پچیس ہاتھ بلند لہروں کی شکل میں، چالیس پچاس میل فی ساعت کی رفتار سے غراتا اور بڑھتا ہوا، ساحل بحر پر دس بارہ فرسنگ تک چڑھ آیا۔ ساحل پر کھڑے تمام جہاز غرق ہو گئے، تاجروں کی کوٹھیاں، دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتوں کی کوٹھریاں اور چھوٹے موٹے بازاری پیشہ وروں کے ٹھکانے، سب ملیا میٹ ہو گئے۔ حکومت کے نمائندوں، شحنۂ سواحل بحر اور کروڑ گیریوں کے دفاتر، مٹی اور پتھر اور کیچڑ کا ڈھیر ہو گئے۔

جب ساحل کی چڑھائیاں چڑھتے چڑھتے پانی کی غضب ناکی کچھ تھکی اور تھمی، تو جہاں جہاں زمین نے شق ہو کر اسے قبول کر لیا تھا، وہاں کئی کئی ہاتھی ڈباؤ جھیلیں وجود میں آ گئیں اور وہ پانی جو کہ ان جھیلوں میں نہ سما

سکا تھا، واپسی کی راہ ڈھونڈنے لگا۔ بحر ماژندران میں اترنے والے ننھے منے دریاؤں میں اتنا ظرف کہاں تھا کہ کروڑوں مکعب گز پانی کو سہار سکتے۔ تھوڑی ہی دیر میں جل تھل ایک ہو گئے تو پانی نے واپسی کی ٹھانی۔

ساحل پر چڑھائی کے ساتھ ساتھ سمندر کے ہزاروں مردہ، نیم مردہ جانور، مرغابیاں، کچھوے، گھونگھے، سانپ، خونخوار شارک اور بام، سمندر کی گہرائیوں میں دیر سے گلتی سڑتی لاشیں، ہڈیوں کے ڈھانچے، پرانے غرقاب جہازوں کے تختے، پانی ہی کی رفتار کے ساتھ ساحل، اور عمارتوں، اور عمارتوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے درمیان آ کر سروں کو قلم کرتے، ران اور کمر کی ہڈیوں کو توڑتے، چہروں کو مسخ کرتے، انسانوں اور جانوروں کے حلق اور پیٹ کے اندر دور تک سرایت کرتے ہوئے، زمین کی اونچ نیچ میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

اس شکست و تاخت نے جگہ جگہ ملبے کے اونچے نیچے ڈھیر بنا کر انسانوں کی آمد و رفت اور بھی مشکل کر دی تھی۔ تھکے ماندے، خوف اور بھوک سے ادھ مرے لوگ بہزار خرابی اس اونچی نیچی اوبڑ کھابڑ زمین اور ملبے کے تلے دبی اشیا کو یوں کریدتے اور اپنے زندوں یا مردوں کو یوں تلاش کرتے تھے جس طرح چیونٹیاں دھیرے دھیرے محنت کر کے ایک لمبی مدت میں زمین میں ننھے منے سوراخ بناتی ہیں اور یوں بھی، اس ملک گیر تباہی کے پس منظر میں انسان کی ہستی چیونٹی سے بڑھ کر حقیر محسوس ہوتی تھی۔

اب جو پانی واپس ہوا تو بہت سارے ملبے، کوڑے کچرے کے ساتھ کئی زندہ اور مردہ انسانوں کو بھی بہا کر لیتا گیا، اور بہت ساری سمندری چیزیں اپنی یادگار کے طور پر چھوڑتا گیا اور ان میں سب سے بڑھ کر خوف انگیز اور کراہیت افزا وہ سیاہ، چکنی، چپ چپاہٹ سے بھری کیچڑ تھی جو کیچڑ سے زیادہ کسی شیطانی اژدہے کا لعابِ دہن معلوم ہوتی تھی۔ اس لعاب نما کیچڑ کی موٹی تہہ کہیں بالشت بھر، کہیں زانگشت بھر، ہر جگہ تھی۔

سارے ملک میں بھی اتنے کوے اور چیلیں اور گدھ نہ تھے جو ایک دو ہفتے کی مدت میں مل جل کر زمین کی صفائی کر سکتے۔ قسطنطنیہ کے بابِ عالی کی طرف سے ابتدائی راحت رسانی، مجروحین کے ضروری علاج اور اموات کے کفن دفن کا انتظام تو تھا، لیکن شہروں اور گھروں کی صفائی، تعمیرِ نو، اور مالی و جانی نقصان کی تلافی کی کوئی سبیل نہ تھی۔ سڑتی ہوئی لاشوں اور غلاظتوں کے ملبے میں پلتے ہوئے کیڑے مکوڑوں کے باعث جگہ جگہ وبائیں پھوٹ پڑیں۔ وہ تو خیریت گذری کہ حاجیوں کے قافلے اپنے وقت پر رمضان کے اواخر اور شوال کے آغاز میں بغداد و دمشق سے روانہ ہونے کے لیے ارمن چھوڑ چکے تھے، نہیں تو نہ جانے کیا قیامت ٹوٹتی اور بابِ عالی کی طرف سے جو خطیر رقم ہر سال قافلۂ حج پر صرف ہونے کے لیے منظور ہوتی تھی، وہ ساری کی ساری

نہیں تو اس کا بڑا حصہ بھونچال سے متاثر علاقوں کی راحت رسانی میں لگ جاتا۔

زلزلے اور اس کے بعد کی آفات و بلیات نے افراہیم کی ساری تجارت، ساری املاکِ غیر منقولہ، اور زیادہ تر عمارات کو پامال کر کے برابر خاک کر دیا۔ جہاز ڈوب گئے، گوداموں میں رکھا ہوا مال زمیں دوز ہو گیا، یا غرقِ آب ہوا، یا سڑ گیا۔ خزائن، دفائن میں بدل گئے۔ صرف چند مکان اور ان میں تھوڑا بہت سامان محفوظ رہ گیا جس نے جسم و جان میں ایک کمزور سا رشتہ بنائے رکھا۔ آہستہ آہستہ جب حالات روبہ اعتدال ہوئے تو افراہیم جودت بیگووچ کے سارے بال سفید تھے اور کمر خمیدہ ہو چکی تھی۔ نو دمیدہ بال طیر چمن زاد کو اڑنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ سال کا چراغ بجھتے بجھتے اس کی بھی شمع حیات گل ہو گئی۔ وہ اردی بہشت 1080ھ [مطابق اپریل 1701ء، مرتب] کے وسطی ایام تھے، اور سال بھر میں دو قیامتوں کو اپنی کمر پر لاد لینے اور پھر کشاں کشاں اتار لینے والی بستی پر از سر نو بہار آ رہی تھی، لیکن شہرام یافع اور افراہیم جودت بیگووچ کی نوبت آخری بار بج چکی تھی۔ اب وہاں کسی نئی ابتدا کا امکان نہ تھا۔

اس وقت سارے گھرانے میں صرف لیبہ کا باپ عمانوئیل بن افراہیم، اس کی ایک دور کی بہن نعومیہ، اور لیبہ کے سوا کوئی نہ رہ گیا تھا۔ لیبہ کوئی چار برس کی تھی اور نعومیہ کی عمر کا کسی کو پتا نہ تھا۔ وہ مدت دراز سے ایسی لگتی تھی، گویا اس کی صورت اور اس کا بدن زمانۂ گذشتہ کے کسی لمحے میں کسی طرح مجر ہو گئے ہوں۔ پیدائشی بہری ہونے کے باعث اس کی زبان بھی رہ گئی تھی۔ وہ گھر کا معمولی کام کاج کر دیتی اور جو روکھا سوکھا مل جاتا اسے کھا کر کسی کوٹھری میں پڑ رہتی اور اب تو روکھے سوکھے کا بھی ٹوٹا پڑ گیا تھا۔

پے در پے جھٹکوں نے عمانوئیل کو ذہنی طور پر شکست خوردہ اور عملی طور پر ناکارہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے باپ سے چھپا کر افیون کا نشہ کرتا تھا۔ اب کوئی روک ٹوک نہ تھی، لیکن وسائل بھی نہ تھے۔ عمانوئیل نے بے تکلف لیبہ کے چھوٹے موٹے زیوروں اور پھر نعومیہ کے چھپ چھپا کر رکھے ہوئے ان گھڑ چاندی کے پازیب اور طوق، چھلے، رہن رکھ کر قرض لینا شروع کیا۔ جب وہ سب بھی تھڑ گیا تو مکان کا ایک ایک کمرہ رہن رکھ کر عمانوئیل اپنی لت اور بیٹی کی جان کی پرورش کرتا رہا۔ نعومیہ اکثر بے کھائے رہ جاتی۔ دبلی پتلی، بلکہ سوکھی اور زندگی کے رس جس سے بالکل عاری، اس کے بدن میں گھلنے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ ارمن کی سخت سردی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ ہڈیوں کے بخار نے اسے ایندھن کی طرح جلا ڈالا۔ اسفندیار 1080ھ کے آغاز میں اس کی مدت عمر سپری ہوئی۔ اس کے کچھ ہی دن بعد عمانوئیل بھی سردی سے اکڑ کر مر گیا۔ جن لوگوں

کے پاس املاک رہن تھی، انھوں نے تو اتنی مروت برتی کہ املاکِ مرہونہ پر قبضہ لے لیا اور سود کی رقم پر اصرار نہ کیا۔ لیکن ایک شخص ایسا تھا جس کا زرِ نقد نکلتا تھا۔ اس نے پانچ برس کی لبیبہ کو ایک رقاصہ زہرۂ مصری کے ہاتھ فروخت کر کے حساب برابر کیا۔

وہ زمانہ ایسا نہ تھا جب ننھے لاوارث بچوں، اور خاص کر لاوارث نادار بچیوں کے ساتھ مروت یا رعایت کا سلوک کیا جاتا۔ خریدے ہوئے انسانی بچے اور خریدے ہوئے جانور میں صرف یہ فرق تھا کہ جانور کو کبھی کبھی اگلے پاؤں میں رسی ڈال کر چراگاہ اور سرزمین میں کھلا چھوڑ دیتے تھے کہ جس طرح چاہے اپنا پیٹ بھر لے۔ لیکن انسانی بچوں کو گھر کی دیوار کے باہر جھانکنے کی بھی اجازت نہ ہوتی تھی۔

لبیبہ خانم پر بچپن میں کیا کیا ظلم ٹوٹے، اس کی تفصیل بے فائدہ ہے۔ گھر کے اندر جھاڑو برتن کا کام کرنے، اور راتوں کو زہرۂ مصری کے پاؤں دبانے کے ساتھ ساتھ وہ صبح شام ناچ اور گانے کی تعلیم بھی حاصل کرتی۔ ضرورت پڑنے پر اسے نیچے کی دکانوں سے سودا سلف لانے اور بازار کے لفنگوں کی گندی باتیں سہنے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ لیکن حُسن ایسی دولت ہے جو اپنے وقت پر بہار لاتی ہی ہے۔ بنفشہ ہو کہ گل مشکی، یا لالۂ صحرا، جب انھیں کھلنا ہوتا تو خزاں کے قدم شل ہو جاتے ہیں۔ بارہ تیرہ برس کی ہوتے ہوتے لبیبہ خانم نخ جوان کے لیے شہرِ آشوب بن چکی تھی۔ کہنے والے کبھی اس کا دل موہنے کو لاڈ اور چھیڑ کے لہجے میں، کبھی ہاتھ جوڑ کر رحم طلب لہجے میں کہتے:

فرماں دہی کشور دل کار بزرگ است
نودولت حسنی ز تو ایں کار نیاید

لیکن لبیبہ خانم نے بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایسی دھوم دھام کی معشوق کسی نے کاہے کو کی ہو گی۔ حُسن پرستوں، عاشق مزاجوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے اس سے توقع نہ باندھی ہو، اور جس کی توقع پوری ہوئی ہو۔ لبیبہ خانم نے وہ سارے اندازِ دلربائی، وہ سارے طرزِ ستم آرائی ازخود حاصل کر لیے تھے جن کے لیے دوسرے حسینوں کو مشق کرنی پڑتی ہے:

یکیست معنی اگر لفظ بے شمار بود
یکیست یوسف اگر صد ہزار پیرہن است

کیا پہناوا، کیا لب ولہجہ، کیا آواز، کیا نگاہ غلط انداز کی خفیف سی چشمک، کیا چال ڈھال، کیا طرزِ نشست و برخاست، لبیبہ خانم کی بوٹی بوٹی روئیں روئیں سے تمنا اور لگاوٹ تراوش کرتی تھی۔ اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لینے والے کو گمان گذرتا، اور بہت جلد ہی یہ گمان عقیدے اور یقین محکم میں بدل جاتا کہ بس ذرا سی کوشش کی دیر ہے، یہ مرغ بہشتی میرے ہی دام میں آئے گا۔ واللہ اس کی آنکھیں کہے دیتی ہیں کہ ہم تمھارے منتظر ہیں۔ ایک بوئے گل ہے جس کی سلسلہ جنبانی کوئی نسیم دلی کرتی ہے۔ یہ ایسا چمن ہے جس میں ہر ایک کی آمد وشد نہیں، لیکن میرے لیے اس کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر شخص اسی امید میں اس کے دروازے پر قبل از وقت پہنچا کہ ہجوم کے باعث مجھ پر اس کی نگاہ ابھی تک ٹھیک سے پڑی نہیں، آج بس دیکھ لینے بھر کی دیر ہے، پھر تو ہم ہی ہم ہیں۔ لیکن وہاں تخلیہ تو کبھی ہوتا ہی نہ تھا اور پھر بھی ہر شخص سمجھتا تھا کہ لبیبہ خانم مجھے اور صرف مجھے دیکھنا چاہتی ہے۔

اپنی مالکہ نائکہ زہرۂ مصری سے بھی اس نے خوب گن گن کر بدلے لیے۔ وہ ہزار گڑگڑاتی کہ فلاں رئیس یا فلاں ملک التجار کے ساتھ ذرا لگاوٹ کی بات ہی کر لے، لیکن لبیبہ خانم نے وہ گن سیکھے ہی نہ تھے۔ ایک دن ایک آذری رئیس زادے نے اس کے دروازے پر کھڑے کھڑے یہ کہہ کر اپنے گلے پر چھری پھیر لی:

رفتم از کوئے تو اے خو بہ جفا کردہ بگو
صرف اوقات بہ آزار کہ خواہی کردن

اور لبیبہ خانم نے جھروکے سے جھانکا تک نہیں۔ زہرۂ مصری چپ چاپ دیکھا کی۔ کرتی بھی کیا، لبیبہ کے شائقین اور تماشبین تانتا لگائے رہتے تھے۔ ان کی بدولت گھر میں من برس رہا تھا۔ عثمانی دینار اور ایرانی تومان سے لے کر ہندوستانی روپے کون سا سکہ تھا جس کی بدریاں روز لبیبہ خانم پر پر چڑھاوے میں نہ چڑھتی ہوں۔ وہ صرف وقتِ مقررہ پر دن میں دو بار اپنے حجرے سے نکل کر دیوان خانے میں رونق افروز ہوتی، ایک بار سہ پہر ڈھلنے کے بعد گانے کے لیے، اور دوسری بار رات گئے رقص کے لیے۔ سردی ہو یا گرمی، اس معمول میں فرق نہ آتا۔ گھر سے باہر وہ کبھی نکلتی نہ تھی۔ بعض دفعہ کسی بگڑے دل حاکم یا رئیس نے دھمکی دی کہ لبیبہ خانم فلاں وقت محل سرا میں حاضر نہ ہوئی تو اٹھوا منگوالوں گا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتِ مقررہ کے بہت پہلے بار برداری کے اونٹوں اور سواری کے ناقے زہرۂ مصری کے بلند و بالا پھاٹک کے اندر اور باہر ہجوم کیے نظر

آئے۔ معلوم ہوا کہ سارا گھرانہ اُٹھ کر یا روان، یا کہیں اور جا رہا ہے۔ اب جابر سے بھی جابر حاکم کی یہ مجال نہ تھی کہ قافلے کو روک لیتا، یا پوچھ دیتا کہ تمھارا پرچۂ راہداری کہاں ہے۔ ایک بار ایک امیر نے ارادہ کیا بھی تو کوتوالِ شہر نے اس سے صاف کہہ دیا کہ میں زہرۂ مصری کو روک کر لبیبہ خانم کو اٹھوا تو لاؤں گا، لیکن انجام کے ذمہ دار جناب ہوں گے۔ شہر بھر میں کسی کو ان کی مفارقت گوارا نہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ ان لوگوں پر کوئی جور یا زور زبردستی ہو، اور اہلِ شہر چپ دیکھتے رہیں۔ مجبوراً زہرۂ مصری کو شہر والوں کی طرف سے درخواست گذرتی کہ آپ کہیں نہ جائیں، مرضی آپ کی، شہر آپ کا، شہر والے آپ کے۔ پھر سارا سامان، فرش فروش، پالتو جانور، شیشہ آلات، واپس گھر میں لائے جاتے اور روز کا نقشہ پھر قائم ہو جاتا۔

زہرۂ مصری خود تو قبطی عیسائی تھی، لیکن اس نے لبیبہ خانم کے مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا تھا، اور نہ اسے دینِ موسوی کی کوئی تعلیم ہی دلوائی تھی۔ اپنے بعض یہودی چاہنے والوں کی بدولت لبیبہ خانم کو اپنے مذہب کی کچھ شدبد ہو گئی تھی۔ اپنی شریعت کے اعتبار سے آغازِ سال میں وہ یومِ کفارہ کا روزہ ضرور رکھتی، لیکن اس سے زیادہ اس نے اپنے اور اپنے دین، یا مذہب، یا لائحۂ حیات کے بارے میں سوچا نہ تھا۔ اس کے حسابوں اس کا مذہب اپنے چاہنے والوں کے ساتھ کج دار و مریز کا کھیل کھیلنا تھا، یعنی یہ کہ ان کے ساتھ ایسا برتاؤ ہو کہ ہر ایک کو یقین رہے کہ کامگار وہی ہوگا، لیکن کوئی اس پر قابض بھی نہ ہو سکے۔ اس نے کبھی ٹھہر کر سوچا نہ تھا کہ کیا اس کا یہ رویہ کسی فطری ذہانت یا چالاکی پر مبنی تھا کہ اس کے لیے سب سے اچھی راہ یہی تھی کہ اپنے بہترین اثاثے، یعنی اپنے حُسن اور اپنے بدن کی اس طرح حفاظت کرے کہ لوگ مایوس بھی نہ ہوں اور گوہر مراد کسی کے ہاتھ بھی نہ لگے، اور اس طرح یہ نقد گرانمایہ کسی کے پاس عاریتاً بھی نہ جائے، اس کی قدر گھر بیٹھے بڑھتی رہے اور اس کا کیسہ کبھی ایک لمحے کو بھی خالی نہ ہو؟ نہ اس نے کبھی رک کر یہ سوچا کہ کیا اس کے دل کی گہرائی میں کہیں دُنیا، اور اربابِ قضا و قدر سے انتقام لینے کا جذبہ موجزن تھا، اور وہ اس طرح حساب برابر کر رہی تھی کہ جس طرح دُنیا نے اسے محفوظ گھر، محبّت کے گوشے، اور عام انسانی توقیر سے محروم رکھا تھا، اسی طرح وہ زہرۂ مصری سے لے کر اپنے گاہکوں، چاہنے والوں (جن میں عورتیں بھی شامل تھیں)، صاحبِ ثروت، باحیثیت لوگوں، یعنی کل کے سب اقتدار دار لوگوں کو آج اپنے اقتدار تلے رکھنا چاہتی تھی؟

سچ تو یہ ہے کہ اپنے بدن کی حفاظت، اس کی ظاہر اور پنہاں لطافتوں اور نزاکتوں کو اپنی ہی آنکھ تلے کھلتے پھلتے معطر اور مطلّی ہوتے دیکھنا، یہ اس کی زندگی کا مرکزی سروکار خود بخود ہی بن گیا تھا۔ بچپن اور جوانی

کے درمیان کی فصل اس پر گذری تھی، لیکن وہ گھر کے کاموں کو مر مر کر پورا کرنے، اپنی مالکہ نائکہ کے حکم بجا لانے، اور تعلیم لینے میں اس طرح خود کو کھپا چکی تھی کہ اسے اپنے بدن کی تبدیلیوں کا پتا ہی نہ چل سکا تھا، اور نہ وہ یہی سمجھ پائی تھی کہ وہ اچھی ہیں یا بری ہیں۔ اسے صرف یہ محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کی آنکھیں اب اس پر کسی اجنبی زاویے سے پڑتی ہیں، اور وہ آنکھیں جو پہلے اس کے منھ پر آ کر رک جاتی تھیں، اب گردن، اور اس کے نیچے، اور پھر کمر، اور اس کے بھی نیچے کچھ ڈھونڈتی ہوئی سی لگتی ہیں اور اس احساس کے بالیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی رفتار، اس کی چتون، اس کی آواز کی موسیقی، کمر جھکا کر کوئی چیز اٹھانے، اور سر اونچا کر کے کوئی چیز پھینکنے کے طور، اس کا شرما کر منھ پھیر لینا، ان سب باتوں میں از خود کوئی ایسی تبدیلی بھی آ گئی تھی جس سے اسے ڈر بھی لگتا تھا، اور جو اسے اچھی بھی لگتی تھی، کیونکہ وہ اتنا تو دیکھ ہی سکتی تھی کہ گھر میں، یا گھر کے باہر، کسی بھی لڑکی میں وہ بات نہیں جو اس میں ہے۔

پھر اسے جلد ہی، اور خود بخود یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ جو اپنی چھوٹی سی زندگی میں دوسروں کی تابع رہ کر اتنے دکھ بھوگ چکی تھی جو کئی عمروں کے لیے کافی ہوتے، اب اس کے پاس بھی ایک ایسی چیز تھی، جس کے ذریعے وہ بہت کچھ اقتدار حاصل کر سکتی تھی۔ پھر اسے تنہائی میں اپنے جسم کو بغور دیکھنے اور اس میں شگفتگی کے آثار کی دھندلی نمود کو، اپنی چشم تصور اور قوتِ تخیل کے ذریعے نمایاں کرنے میں ایک لطف آنے لگا۔ اب اسے زہرۂ مصری کی زد و کوب بھی نہ اٹھانی پڑتی۔ اس کی مالکہ اس بات کا خاص خیال رکھتی کہ لبیبہ خانم کے بدن پر، خاص کر منھ، یا سینے، یا کولھے پر چوٹ کا کوئی نشان یا داغ نہ پڑ جائے۔ اب اسے منھ دھونے اور نہانے کے لیے خوشبودار صابن، اور نہا کر بدن پونچھنے کے لیے تولیہ بھی ملنے لگا۔ ورنہ پہلے اول تو نہانے کی ہی فرصت اور اجازت نہ تھی، اور اگر وہ کبھی نہا لیتی تو سخت سردی ہوتی یا بارشوں کے دن ہوتے، اسے بدن خشک کیے بغیر وہی اتارے ہوئے کپڑے پہننے پڑتے تھے۔ بالوں میں ڈالنے کے لیے روغن یاسمن کی ایک چھوٹی سی کپی، اور بال کاڑھنے کے لیے لکڑی کی ایک پرانی سے کنگھی جس دن اسے ملی، اس دن اس نے پہلی بار خود کو انسان محسوس کیا۔

زہرۂ مصری کو اس وقت کا بڑا انتظار تھا جب لبیبہ خانم کو چھوٹے کپڑوں اور عمر کے دیگر لوازم کی ضرورت پڑے گی۔ لیکن لبیبہ نے اسے اس فتح مندی کا بھی موقع نہ دیا۔ احساسِ حُسن کے ساتھ اس میں کچھ ایسی فطری نخوت آ گئی تھی کہ نائکہ زہرہ کو اب اس سے کچھ ڈر لگنے لگا تھا، وہ اسے بلوغت کے گر بتانے یا ان

معاملات کے بارے میں پوچھنے سے گریز کرتی تھی۔ ایام گل سے پہلی بار سابقہ پڑنے پر لبیبہ خانم گھبرائی، نہ روئی، نہ اس نے زہرۂ مصری سے کچھ پوچھا۔ جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی صعوبتوں کی خوگر تیرہ برس کی جان نے کسی نہ کسی طور پر سمجھ لیا تھا کہ یہ کوئی بیماری نہیں ہے اور اسے کسی نہ کسی طرح یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اس بات نے اس کی دولت مندی میں کچھ محسوس، کچھ نامحسوس اضافہ بھی کیا ہے۔

لبیبہ خانم نے اپنی انھیں نویافتہ رعنائیوں اور نخوتوں کے ساتھ نو سال گذار دیے۔ 'نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا' کے مصداق دونوں جانب روزِ اول کی سی چہل پہل رہی۔ کہتے ہیں اکیس بائیس برس کی عمر میں کسی کے حُسن پر شباب آتا ہے۔ یہ بات کوئی ان تماش بینوں کے دل سے پوچھتا جو بارہ تیرہ سال کی لبیبہ خانم کے طلبگار تھے، اور جنھیں یہ محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ گردشِ ماہ و سال بھی اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ ایسا نہیں کہ اس کے سارے چاہنے والے روزِ اول سے وہی تھے، 'ایک اگر جی لے بھی گیا تو آتے ہیں مر جانے دو' کا قصہ یہاں بھی تھا اور لبیبہ کے بھی طور طریقے وہی تھے۔ بعض بعض نئے آنے والے ایسے بھی تھے جن کو دیکھ کر تصور بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ اس یوسف کشور خوبی اور گل گلزار محبوبی کی خواہانی کا دماغ بھی رکھتے ہوں گے۔ انھیں میں ایک نیم ایرانی، نیم چرکسی نوجوان شاعر اور مطرب تھا جسے لوگ بایزید شوقی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ ایک سمرقندی طائفے کے ساتھ شہر شہر گھومتا اور حافظ یا مولوی کی غزلیں گایا کرتا تھا۔

کشیدہ قامت، چھریرے بدن، نیلی آنکھوں، گھونگھر والے بالوں، قیامت کی رسیلی آواز والا بایزید شوقی ناک نقشے کے اعتبار سے اس قدر نازک تھا کہ اگر زنانہ لباس پہن لیتا، جیسا کہ اس کے طائفے والے اسے کبھی کبھی پہنا بھی دیا کرتے تھے، تو اچھی خوبصورت عورت معلوم ہوتا۔ اس کی عمر اور اس کے دیگر حالات کا کسی کو پتا نہ تھا۔ بس ایک دن اس کی طائفہ نخ جوان میں وارد ہوا، اور بایزید شوقی کی آواز کی دھوم مچ گئی۔ یہاں آنے کے دوسرے ہی تیسرے دن صبح سویرے خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ زہرۂ مصری کے سامنے والے بازار کے چوک پر جا بیٹھا۔ اسے شاید اس وقت معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کس کے دروازے پر ہے اور یہاں کس قسم کے لوگ رہتے ہیں۔ ابھی اتنی روشنی نہ ہوئی تھی کہ سگانِ کوچہ کے بھی خال وخد نمایاں نظر آسکتے۔ ایک دو گھروں کے آگے چراغ ٹمٹما رہے تھے، لیکن زہرۂ مصری کے جھروکے میں شمعی رنگوں کی قندیلوں سے منور بارہ فانوسوں کے شمعدان سے اب بھی لویں پھوٹ رہی تھیں۔ ادھر اکا دکا مزدور، کچھ انسان کے اور کچھ اللہ

کے، اور اِکا دُکا سپاہی، کچھ انسان کے اور کچھ اللہ کے، اپنے کاروبار کو جا رہے تھے، یا جانے کو تیار ہو رہے تھے اور ادھر بایزید شوقی نے سہ تار پر خواجہ شیراز کی غزل شروع کی:

اے شاہد قدسی کہ کشد بند نقابت
وے مرغ بہشتی کہ دہد دانہ و آبت

ساری فضا پر سناٹا سا چھا گیا۔ ایسا لگا کہ لبیبہ خانم کے گلزار کے طائر بھی جو کسی دور افتادہ گلِ خود رنگ کی یاد میں زمزمہ کناں تھے، کان دھر کر سن رہے ہیں کہ یہ کون ہے جس کی لے شہر تا باغ ایک آواز ہے کہ دلوں میں اتری چلی آتی ہے۔ فجر کی نماز کو جانے والے بھی ٹھٹک کر رک گئے۔ اکثروں نے گمان کیا کہ یہ اجنبی مغنی اپنی میٹھی آواز سنا کر اور موہنی صورت دکھا کر لبیبہ خانم کو متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ بعض نے دل میں افسوس کیا کہ اس خوش رو جوان کی بھی یہیں مٹی خراب ہونی تھی، اس بچارے کو کیا خبر کہ یہاں تماش بینوں کی آرزوؤں کے مزاروں کے سوا چار طرف کچھ نہیں لیکن بایزید ایک بے چین، آسمان بوس، متلاطم وجد میں گم، اپنے آپ میں تنہا، گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ بعض اوقات وہ ایک ایک مصرع ایک ایک گھڑی تک طرح طرح سے دہراتا اور نئی سے نئی ادائیگیاں دکھاتا:

رفتی بہ کنار من دل خستہ و ناکام
خوابم بشد از دیدہ دریں فکر جگر سوز
تا جائے کہ شد منزل وماوائے کہ خوابت
راہ دل عشاق زد آں چشم خماری
یارب نہ کناد آفت ایام خرابت

یہاں تک کہ جب وہ مقطع پر پہنچا تو سننے والوں کو لگا کہ اب ان کے ساتھ ساتھ بایزید کی بھی جان چلی جائے گی:

حافظ نہ غلامے ست کہ از خواجہ گریزد
لطفے کن و باز آ کہ خرابم بہ عتابت

دیکھنے والوں نے دیکھا کہ زہرۂ مصری کی حویلی کے پٹ کھلے، ایک بوڑھا دربان باہر آیا اور بایزید شوقی کو اندر بلا لے گیا۔ وہاں بایزید نے کیا دیکھا، کیا سنا، یہ کسی کو نہیں معلوم، لیکن جب اس کا طائفہ شہر نخ جوان سے کوچ کرنے لگا تو بایزید اس میں نہ تھا۔ وہ رہتا کہاں تھا، یہ بھی کسی کو نہ معلوم ہوا۔ اتنا ضرور تھا کہ ہر صبح زہرۂ مصری کی حویلی کا پھاٹک کھلنے کے پہلے ہی وہ سامنے کے چوک پر پہنچ کر کبھی مولوی اور کبھی حافظ کی غزل گاتا، تا آنکہ اس کی طلبی اندر سے نہ آجاتی۔ دو تین برس یوں ہی گذر گئے۔ بایزید نے کسی اور طائفے کی سنگت بھی نہ اختیار کی تھی، اور نہ وہ کہیں کسی کے گھر میں، یا کسی تقریب کے موقعے پر گانے ہی کے لیے جاتا تھا۔ شروع شروع میں اس کی طلبیاں بہت تھیں، لیکن پھر سب ہی نے سمجھ لیا کہ اب وہ صرف اپنے لیے اور لیبیہ خانم کے لیے گاتا ہے۔

پھر ایک دن یہ خبر بچے بچے کی زبان پر تھی کہ لیبیہ خانم نے بایزید شوقی سے نکاح کر لیا، زہرۂ مصری کی حویلی راتوں رات چپکے سے چھوڑ دی، اور صبح ہوتے ہوتے شہر بھی چھوڑ دیا۔ زہرۂ مصری نے کیا کیا فیل نہ مچائے، کیا کیا کوششیں نہ کیں کہ کچھ پتا ہی چل جائے کہ دونوں گئے تو کہاں گئے۔ یقیناً کسی ساربان، یا قافلے سے ساز باز بہت پہلے سے کر رکھی ہوگی مگر ان دنوں شہر میں کوئی قافلہ آیا گیا نہ تھا۔ زہرۂ مصری نے حکام کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بہانہ بھی تراشا کہ لیبیہ نے بایزید کے اغوا سے یہ قدم اٹھایا ہے، ورنہ وہ خود تو اس سے چڑتی اور دور بھاگتی تھی۔ مگر یہ بات کسی کے بھی حلق سے نہ اتری۔ زہرہ کو لیبیہ سے محبت تو خاک نہ تھی، لیکن سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے دے کر کسے افسوس نہیں ہوتا۔ زہرہ اور لیبیہ کے درمیان اقتدار کی مساوات تو مدت العمر ہوئی بدل چکی تھی۔ اب پلڑا لیبیہ کے حق میں بھاری تھا۔ زہرۂ مصری ابھی لیبیہ کی محکوم نہ تھی تو اس پر کسی قسم کا اختیار بھی نہ رکھتی تھی۔ قانون کی رو سے لیبیہ خانم اس کی زرخرید ضرور تھی، لیکن عثمانیوں، بلکہ عام مسلمان حکومتوں میں بھی، مفرور لونڈی غلام کی تلاش اور بازیافت کا کوئی نظام نہ تھا۔ یہ معاملہ مالک اور غلام کے درمیان تھا، اور لیبیہ خانم کے معاملے میں کسی کو بھی زہرۂ مصری سے ہمدردی نہ تھی۔ نہ ہی کوئی شخص لیبیہ خانم کو صحیح معنی میں زہرۂ مصری کی مملوک سمجھتا تھا۔

زہرۂ مصری کے گھر میں لیبیہ خانم کے قید ہونے، مشقیں اٹھانے، اور پھر وہیں ایک طرح سے حکومت

کرنے کا زمانہ پچیس برس سے کچھ اوپر کو محیط تھا۔ اس طرح وہ اب عمر کی تیس منزلیں طے کر چکی تھی، کوئی بھولی بھالی بچی نہ تھی۔ لہٰذا زہرۂ مصری کی فریادیں، کہ بایزید شوقی میرے بچی کو بھگا لے کر گیا ہے۔ کسی کے لیے وثوق انگیز نہ تھیں۔

بایزید شوقی کی عمر کیا تھی، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ نہ یہ بات کسی کو معلوم تھی کہ اس کے چہرے کا ہلکا سنہرا چمپئی رنگ جسے حُسن پرستوں کی اصطلاح میں ''رنگ مہتابی'' کہا جاتا تھا، دراصل رنج باریک [عرفِ عام میں تپ دق، مرتب] کی زردی تھی۔ اسے کھانسی بالکل نہ آتی تھی، اس لیے لبیبہ خانم کو بھی شک نہ گذرا کہ اسے ہڈی کا بخار ہے۔ وہ اکثر طوطیٔ ہند امیر یمین الدین خسرو کا شعر پڑھتا، اور لوگ گمان کرتے کہ وہ یوں ہی رسمی سی بات کر رہا ہے:

درونم آتش اندیشہ بند از بند می سوزد
عفاء اللہ گر کس را تپ اندر استخواں باشد

نخ جوان چھوڑتے وقت بھی اسے بخار تھا، لیکن اس نے کسی کو کچھ شک نہ ہونے دیا۔ بیماری، اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے راہ دشوار اختیار کی جو سیدھی ان کی منزل کو نہ جاتی تھی۔ اس میں لبیبہ خانم کی مرضی اور اجازت شامل تھی، کیونکہ دونوں کا ہی مدعا یہ تھا کہ منزل کو فی الوقت خفیہ رکھا جائے۔

یہ مہر کا مہینہ اور 1106 کا سال تھا [مطابق ستمبر 1767ء، سنہ ہجری کے اعتبار سے صفر 1140، مرتب۔] مشرق میں بحرِ ماژندران (جسے بعض بحرِ خزر بھی کہتے تھے)، اور مغرب میں بحرِ اسود، دونوں طرف سے سرد اور بارش بھری ہواؤں کا جوش تھا۔ مرطوب ہوا، بارش کی وجہ سے سڑک پر کیچڑ اور گڈھے، جگہ جگہ سفر کو اور بھی مشکل بنا رہے تھے۔ لبیبہ خانم اور بایزید شوقی کی اصل منزل تو تبریز تھی، لیکن ممکن متعاقبوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے انھوں نے شمال مغرب کی سمت اختیار کی۔ اصفہان سے شروع ہو کر ہمدان اور کرمان شاہ سے گذرتی ہوئی عظیم الشان عباسی شاہراہ جو ارومیہ جھیل کے کنارے پہنچتی تھی، یا روان ہو کر دور شمال میں طبلیسی کو نکل جاتی تھی۔ لبیبہ اور بایزید نے شروع میں اپنی سمت ایسی رکھی گویا وہ کسی مقام پر اس شاہراہ کو جا لیں گے۔ ظاہر ہے ان کی راہ اس طرح بہت لمبی ہو گئی، اور انھیں کئی جگہ غیر اہم بستیوں اور کم چلتی ہوئی سڑکوں سے گذرنا پڑا، جہاں پڑاؤ کے لیے مناسب سرائیں بھی نہ تھیں۔ ورنہ تبریز تو نخ جوان سے بمشکل تیس کوس کے

فاصلے پر تقریباً سیدھی جنوب کی سمت تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ نخ جوان کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں سارا ملک اقالیم عثمانیہ میں پڑتا تھا، جبکہ جنوب میں کوئی بیس ہی پچیس کوس چل کر ایران کی سرحد شروع ہو جاتی تھی اور اس سمت میں ایران کا پہلا بڑا شہر تبریز ہی تھا۔ زبان ان دونوں کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی، سیاسی پناہ ضرور ان کے لیے اہم تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں خطبہ اور سکہ تو شاہ طہماسپ صفوی کا چلتا تھا، لیکن زمامِ کار نادر قلی خان کے ہاتھ میں تھی۔ نادر قلی خان نے غالباً شاہ طہماسپ صفوی سے اپنی وفاداری اور تعلقِ خاطر کے ثبوت کی غرض سے اپنا نام طہماسپ قلی خان رکھ لیا تھا، اور شاہ عباس صفوی سوئم کی موت [1736ء، مرتب] کے بعد اس نے نادر شاہ کا لقب اختیار کر کے ایران کا تاج وتخت بھی سنبھال لیا تھا۔ اس بات کو ابھی کوئی دس برس باقی تھے، لیکن اپنے حُسنِ انتظام، تدبرِ ملکی، اور لیاقتِ عسکری کی بدولت طہماسپ قلی خان نے سارے ایران میں اپنے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

عثمانیوں اور ایرانیوں میں گاڑھی کبھی نہ چھنی تھی، اور ان دنوں کو کتا چھنی تھی۔ عثمانیوں کو نادر قلی خان کی قوت اور ہر دل عزیزی ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ اسے ایک معمولی خراسانی چرواہے کی اولاد سمجھتے تھے اور اس سے کسی قسم کی سیاسی گفت وشنید کرنا، یا اس کے ساتھ کسی صلح نامے پر دستخط کرنا دون مرتبہ جانتے تھے۔ لیکن دونوں حکومتوں کے درمیان اس کشیدگی کے باعث ممالک عثمانیہ سے بھاگ کر مملکتِ ایران میں پناہ لینے والوں کو توقع ہوتی تھی کہ انھیں واپس عثمانی حکام کے سپرد کر دیا جائے گا۔

پیچ دار راہیں اختیار کرنے، اور ٹھہر ٹھہر کر سفر کرنے کی وجہ سے لبیبہ خانم اور بایزید شوقی نے تین دن کا سفر تین ہفتے میں طے کیا۔ تبریز میں انھیں کوئی جانتا نہ تھا، عافیت ہی عافیت تھی۔ لبیبہ خانم اپنے ساتھ اتنا زر نقد اور زیور لائی تھی کہ کئی سال تک انھیں فکرِ معاش نہ ہوتی۔ پھر بھی، بایزید نے فوراً چند تبریزی امیر زادوں کی اتالیقی حاصل کر لی۔ لبیبہ خانم دوبارہ گھر میں بند ہو گئی، لیکن یہ محروسی آشیاں بندی کی تھی، اور ہزاروں نام نہاد آزادیوں سے بڑھ کر تھی۔

یکم رجب 1143 ہجری [یعنی 10 جنوری 1731ء، مرتب] کو لبیبہ خانم ایک بچی کی ماں بنی۔ بچی کا نام نور السعادۃ رکھا گیا۔ بچی کی پیدائش کے تیسرے دن بایزید کو سردی لگ کر کھانسی شروع ہوئی۔ وہ بمشکل ایک

ہفتہ بستر پر رہا اور اس عرصے میں بھی اس نے طبیب کا منھ نہ دیکھا۔

''میں اب موت ہی کا منھ دیکھوں گا لبیبہ خانم،'' اس نے رک رک کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں تمھارا قصور وار ہوں، جب تم نے مجھے پہلی بار بلایا تھا تو مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا۔ نہیں تو مجھے چاہیے تھا کہ کسی موقعے پر تمھیں بتا ہی دیتا کہ میرے چہرے کی گلابی سرخی دراصل عارضی ہے۔ موت ایک عرصے سے میری تلاش میں ہے اور یہ تلاش بہت جلد ختم ہو جائے گی۔''

''تم کیوں قصوروار ٹھہرو؟'' لبیبہ نے چیں بر جبیں ہو کر کہا۔ ''یہ کون سی منصفی ہے کہ جان بھی تمھاری جائے، اور قصوروار بھی تم ہی ٹھہرائے جاؤ۔ مجرم اگر کوئی ہے تو وہ ہے جسے کوئی تقدیر کہتا ہے، کوئی....''

''چپ، ایسی بات منھ سے نہ نکالو، جس پر بعد میں پشیمانی ہو۔ ہم لوگ اس لیے بنائے گئے تھے کہ اپنی حدِ کمال کو پہنچیں۔ میری، اور سچ کہو تو کسی کی بھی حدِ کمال اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ تم تک پہنچ جائے۔ میں تمھارے لائق تھا بھی نہیں۔ کہاں میرا کثیف سینہ، کہاں تمھارے جمالِ بے مثال کا عکس۔ اس کے بعد مجھے جینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اتنے دن تو تمھاری محبت مجھ مردہ کو یمن زندگی کی بدولت اٹھائے رہی۔''

یہ کہتے کہتے وہ اچانک پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کہاں سے اس کے بدن میں نئی جان آگئی تھی کہ اس نے پورے لحن کے ساتھ شعر پڑھا:

چو رسی بہ کوئے دلبر بہ سپار جان مضطر
کہ مبار باد دیگر نہ رسی بدیں تمنا

پلنگ کے سرہانے کا سہارا لے کر بایزید نے ایک بار پھر سرگوشی کے لہجے میں یہی شعر دہرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔

وہ پہلی سردی نورالسعادۃ کے لیے بڑی سخت تھی بلکہ سب ہی کے لیے سخت تھی، کہ بوڑھے لوگ بتاتے تھے کہ ایسی بے مہر سردی تبریز میں نصف صدی سے نہ پڑی تھی۔ نورالسعادۃ کو ہر پانچ سات دن پر کھانسی یا نزلہ ہو جاتا، پھر اس کا سینہ جکڑ جاتا، اور سانس اس قدر تیز چلنے لگتی کہ اس کا پھول سا چہرہ نیلا پڑنے لگتا۔ اطبا کی رائے تھی کہ اسے پیدائشی دمہ ہے، یا پھر باپ کے اثر سے اس کے بھی پھیپھڑے کمزور ہیں۔ آج کے ڈاکٹر ہوتے تو شاید الرجی تشخیص کرتے۔ ان دنوں یہ تصور ہی نہ تھا لیکن ایک دو حکیموں نے یہ ضرور کہا کہ تبریز کی سرد،

مرطوب ہوا بچی کے لیے مناسب نہیں، چند مہینے کسی طرح سہار لے تو اسے کسی نسبتاً معتدل جگہ لے جاؤ۔ مثلاً اصفہان میں ہوا یہاں کی بہ نسبت خشک ہے اور سردی بھی وہاں کم پڑتی ہے۔ اصفہان کا قیام اس بچی کے لیے مفید ہوگا۔

لیکن چھتیس برس کی عمر میں بیوہ ہو جانے والی، دُنیا میں تن تنہا، لبیبہ خانم کس کے سہارے نئی جگہ منتقل ہوتی؟ نخ جوان واپس جانے کا سوال تھا ہی نہیں، اور وہاں کا موسم بھی بہر حال تبریز ہی کی طرح کا سخت اور سرد تھا۔ اصفہان میں، بلکہ تبریز کے باہر سارے ایران کبیر میں کوئی بھی اِن ماں بیٹی کا جاننے والا نہ تھا۔ تبریز میں تو لبیبہ خانم کو بیوگی کے چند ہی ہفتوں کے اندر بعض بااثر اور بعض رنگین مزاج عمر رسیدہ لوگوں کی طرف سے شادی، یا پھر داشتہ بن کر رہنے کے لیے کنائے بھی آنا شروع ہو گئے تھے۔ یہ سلسلہ جنبانیاں لبیبہ خانم پر بے حد شاق تھیں، لیکن ان میں امید کی ایک گدلی دھندلی سی کرن بھی تھی کہ تبریز میں رہے گی تو بالکل سبزۂ بے گانہ بن کر نہ رہے گی۔ خیاباں میں گلِ بے خار نہ سہی تو سبزۂ لب جو کی طرح روندی اجڑی پچھڑی بھی نہ رہے گی۔ اب لبیبہ میں وہ نخوت، وہ تمکنت، وہ خود اعتمادی نہ تھی۔ اب اسے خود پر وہ اطمینان نہ تھا جو اپنے حُسن کے عالم میں انتخاب، اور سارے جہاں میں اپنی محبوبی کی دھوم کے تیقن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مزاج میں تنک اب بھی تھی، لیکن اب ان نازوں کے اٹھانے والے اٹھ گئے تھے۔ اس کے باوجود اتنا تو تھا ہی کہ جس اعتماد کے ساتھ اہل محبت نے لبیبہ خانم کے تنہا رہ جانے میں در و بام دوستی کے از سر نو کھلنے کی نشانیاں دیکھی تھیں، اس سے زیادہ اعتماد اور پُر رمز تمکنت کے ساتھ لبیبہ خانم نے رواق و منظر آشنائی کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاہ پڑ جانے کے اشارے بھی اپنے طلب گاروں کو بھجوا دیے۔

چھ سات مہینے کی عمر ہوتے ہوتے نورالسعادۃ دو تین بار مرتے مرتے بچی۔ سردیاں جا چکی تھیں، لیکن تبریز کی ہوا میں رطوبت ابھی باقی تھی۔ نورالسعادۃ کے لیے اب بھی عافیت نہ تھی۔ وہ اس قدر دبلی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں گڑیوں کے جیسے معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر بس دو آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں، گہری اور سبز آنکھیں جن میں بیماری کی نقاہت کے باوجود آگاہی کی عجب روشنی تھی، گویا وہ دُنیا اور اہلِ دُنیا کو پرکھ رہی ہوں۔ سنہرے گھونگر والے بالوں کا ہالہ اس کے چہرے کی زردی کو اگر ایک حد تک زائل کرتا معلوم ہوتا تھا تو اس کی آنکھوں کے سبز نگینوں کی جھمک میں اس کے بالوں کا بھی عکس روشن نظر آتا تھا۔

موسم بدلا تو دُنیا نورالسعادۃ پر کچھ آسان ہوئی، لیکن عارضی طور پر۔ ورنہ اس کی بیماری اس دھاگے کی

طرح تھی جو مرغ نو گرفتار کے پاؤں میں باندھ دیتے ہیں۔ وہ اڑ تو سکتا ہے، لیکن بہت دور نہیں جا سکتا۔ اٹھارہ مہینے کی عمر میں نور السعادۃ ایک بار شدید ترین کھانسی، زکام اور ضیق النفس میں مبتلا ہوئی تو اس کی بیماری طول کھینچ گئی۔ وہ اتنے دن بیمار رہی کہ معالجوں کو خوف پیدا ہوا کہ اگر سردیوں تک مرض کے یہی لیل و نہار رہے تو لڑکی زندہ نہ بچے گی۔ اب لبیبہ خانم مجبور ہوئی کہ بچی کی طبیعت کے تھوڑا سنبھلتے ہی تبریز کو خیر باد کہہ کر اصفہان کو ہجرت کر جائے۔ اس نے دو معتبر ساربانوں کے ذریعے رہنمائی، سواری کے لیے سانڈنیوں، اور بار برداری کے لیے اونٹوں کا انتظام کیا، گھر کا غیر ضروری سامان گھر کے ساتھ فروخت کر دیا اور 1145ھ کے ربیع الثانی [مطابق ستمبر 1732، یا آبان 1111، مرتب] میں اصفہان کے لیے روانہ ہو گئی۔ قبرستان شہر سے ذرا باہر، لیکن اصفہانی شاہراہ ہی پر تھا۔ اس نے خشک آنکھوں اور ویران دل کے ساتھ بایزید کے مزار پر رک کر اسے الوداع کہی اور وعدہ کیا کہ زندگی رہی تو پھر تیرے مزار پر آؤں گی، اور اس کی زیارت کر کے ہی مروں گی:

گر بمانیم زندہ بر دوزیم
دامنے کز فراق چاک شدست
ور بمیریم عذر ما بپذیر
اے بسا آرزو کہ خاک شدست

اصفہان کی شاہراہ ان دنوں میانہ، زنجان، قزوین، قم، طہران اور کاشان ہو کر جاتی تھی۔ یہ راستہ ذرا لمبا تھا، لیکن محفوظ ہونے کے ساتھ اس میں ایک اور خوبی یہ تھی کہ کوئی بڑا دریا حائل نہ تھا۔ ورنہ بارشوں کے موسم میں ایسی کسی بڑی ندی کو عبور کرنا جس پر پل نہ ہو، خطرے سے خالی نہ تھا۔ قزوین سے طہران تک کوہ البرز کی چڑھائیاں اور وادیاں، اور پھر اصفہان کے بالکل پاس کوہِ کرگس کی چڑھائی اور اتار ضرور تھے، لیکن وہاں رفتار کے سست تر ہو جانے کے سوا کوئی صعب نہ تھا۔ ان کی سواری کے ناقے عراقی النسل، انتہائی خوبصورت، سبک گام اور ہرنوں کی سی بڑی بڑی آنکھوں والے تھے۔ ان کے سارے جسم پر سرخی مائل سنہرے بال تھے، اس قدر باریک اور نرم کہ معلوم ہوتا تھا یہ بال نہیں ہیں، بلکہ ریشمی چادریں ہیں جو انھیں الگ سے اڑھا دی گئی ہیں۔ عام اونٹوں کے برخلاف ان میں بدمزاجی اور ضد بالکل نہ تھی۔

نور السعادۃ اپنی ننھی سی زندگی میں پہلی بار ایسے لطف سے دوچار ہوئی تھی، کہ ہوا تازہ اور رطوبت سے

عاری ہو۔ کھلے آسمان پر چڑیوں کی چہچہاہٹ اس کی قلقاریوں سے یک آہنگ ہو جائے، اور سواری بھی صبا رفتار ہو، لیکن جھٹکے قطعی نہ ہوں۔ لبیبہ خانم کی پیشانی پر بھی بایزید کی موت کے بعد پہلی بار شگفتگی کی پھیکی سی لہر آئی۔ اسے امید ہونے لگی کہ بیٹی کی صحت اور زندگی، جن کی خاطر اس نے اپنے بایزید کو گورستان میں تنہا چھوڑ دیا تھا، اب ناقابلِ حصول تمنائیں نہ ٹھہریں گی، پوری ہو سکیں گی۔

وہ دو ہفتے میں اصفہان پہنچے۔ لبیبہ خانم نے ساربانوں کو معاوضہ اور انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کیا، شاہی سرائے میں ایک کوٹھری اپنے رہنے کے لیے، اور ایک اپنا سامان محفوظ کرنے کے لیے کرائے پر لی اور اطمینان کا سانس لیا۔

دوسرے دن وہ رہنے کے لیے مناسب مکان کی تلاش میں نکلی۔ لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لیے اصفہان نصف جہان ہو تو ہو، اس کے لیے وہ ایک تاریک جنگل سے بدتر تھا، کہ اسے اس کی وسعتوں میں کوئی بھی گوشۂ عافیت نہ مل سکتا تھا۔ کسی مرد، یا کم سے کم کسی بوڑھی خاتون سرپرست کے بغیر اسے کسی گھر میں بار نہ تھا۔ کہیں کہیں مکانوں کے مالک اسے دزدیدہ للچائی نظروں سے دیکھتے اور یوں گفتگو کرتے کہ وہ ماں بیٹی کو بے قیمت یا بے کرایہ بھی گھر دے سکتے ہیں بشرطیکہ اس کی طرف سے بھی کچھ مزید انتظام کا وعدہ ہو۔ اگر کوئی عورت صاحب مکان ہوتی تو وہ اشاروں اشاروں میں، یا اپنے طرزِ گفتگو سے، ظاہر کر دیتی کہ اس کے خیال میں لبیبہ خانم نہ بیوہ ہے، اور نہ کبھی اس کی شادی ہوئی تھی۔

اکثر عورتوں کے خیال میں لبیبہ ایک ''گری ہوئی''، یا بے آبرو عورت تھی، جس کے عاشق نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ رہا یہ قصہ کہ وہ اپنی بیٹی کی صحت کی خاطر تبریز چھوڑ کر اصفہان آئی ہے، تو صاحب توبہ کیجیے، کہیں شہر بدلنے سے صحتیں حاصل ہوتی ہیں، اور بھلا کوئی دور دراز کے شہر میں ایسی کسی غرض سے آباد ہوتا ہے؟ مانا کہ لڑکی واقعی مریل سی تھی، لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ ہمیں تو ان بی بی کی چال ڈھال، لب ولہجہ، اور طور طریقے کی تمکنت سے صاف لگتا ہے کہ وہ ایک نہیں بلکہ کئی مردوں کی معشوق رہ چکی ہیں، نکاحی تو کہیں سے لگتی نہیں۔ عورتوں نے تو اسے یوں مسترد کیا، اور مردوں نے کچھ امید اور کچھ ناامیدی کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لبیبہ خانم کا تعلق قریب کے کسی شہر کے اربابِ نشاط سے رہا ہوگا، اور جس شخص کی ملازم وہ اب تک تھی اس سے اَن بَن ہو جانے کے بعد قسمت آزمائی کے لیے وہ اصفہان آ گئی ہے۔

بالآخر لبیبہ خانم کو جگہ ملی، لیکن محلہ باغات میں، یعنی اس علاقے میں جہاں اصفہان کے اربابِ حُسن اور

اصحابِ طرب رہتے تھے۔ لبیبہ خانم نے چھ سال کی ازدواجی زندگی میں پرانے طور طریقے بھلائے نہ تھے۔ اسے یہ بات بھی قبول نہ تھی کہ وہ کسی گھر میں نوکرانی بن کر عورتوں کی گالیاں کھائے اور ہر بوڑھے جوان مرد کی شہوت کا تختۂ مشق بنے اور کسی کی داشتہ بن کر رہنے سے تو بدرجہا بہتر یہی تھا کہ وہ اپنی مالک آپ بن کر رہے، دوسروں کی پابند بننے کی جگہ انھیں اپنا محکوم بنائے۔ عورتیں، اور خاص کر خوبصورت اور کمزور طبقوں کی عورتیں اس زمانے میں گاجر مولی کی طرح خریدی اور بیچی جاتی تھیں اور گاجر مولی ہی کی طرح کٹتی اور مزبلے پر پھینک بھی دی جاتی تھیں۔ ان ذلتوں کے اٹھانے سے تو بہتر یہی تھا کہ وہ اہلِ طائفہ بن کر رہے۔ یہ فیصلہ اس نے ہزار کراہت اور ناپسندیدگی کے ساتھ کیا:

حال آں مرغ چہ باشد کہ پس از گل ناچار
غنچۂ دل بہ خس و خار گلستاں بندد

لیکن تھوڑی بہت توقیر جو ممکن تھی وہ اسی طرزِ زندگی میں ممکن تھی، اور اسے اعتماد تھا کہ تبریز کی طرح یہاں بھی وہ اپنا وقار قائم رکھ سکے گی۔

جہاں تک سوال اس بات کا تھا کہ اس کا حُسن کب تک قائم رہے گا، اور اب وہ حُسن اس کے کیا کام آ سکتا تھا، تو یہ کہنا کافی ہے کہ کئی اعتبار سے لبیبہ خانم پر مکمل شباب تو اب آیا تھا۔ ماں بننے کے بعد اس کے چہرے مہرے، چال ڈھال، نشست و برخاست کے انداز میں اس اعتماد اور تمکنت کا اضافہ ہو گیا تھا جو عورت کو اپنا مقصدِ حیات حاصل کرنے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔ زندہ خون کی سرخی اب اس کے لب و رخسار، انگلیوں کی پوروں، پاؤں کے ناخنوں تک میں چھلکتی تھی۔ گویا خون اس کے بدن میں صرف رواں نہیں، بلکہ مدِمقابل سے ہم کلام بھی ہو۔ اس کا بدن جو پہلے ذرا چھریرے پن کی طرف مائل تھا، اب کچھ کچھ بھر گیا تھا۔ کولھے، پیڑو اور چھاتیاں ایک عجب دلفریب انداز میں نمایاں تر ہو گئی تھیں۔ بوٹے سے قد کے باوجود جب لبیبہ خانم سرو قد کھڑی ہو کر سلام کرتی یا کسی کا سلام لیتی تو اچھے اچھے لوگ اس کی شخصیت کی کرشمہ جاتی کشش کی تاب نہ لا سکتے اور اضطراری طور پر اس کے پاؤں کی جوتیوں، یا اگر وہ ننگے پیر ہوتی تو اس کے پاؤں کے انگوٹھوں کی طرف دیکھتے، گویا اس کے قدموں میں سر ڈال دینے کا موقع تلاش کر رہے ہوں۔

باغات میں گھر بسنے کی دیر تھی کہ رندان باغاتی کا ہجوم لبیبہ خانم کے دروازے پر صبح تا شام اڈنا شروع ہو گیا۔ لیکن باریابی کی اجازت سب کو نہ ملتی، اور کسی کو ملتی بھی تو مقررہ وقت پر، اس کے بعد یا پہلے نہیں۔ ایسے حالات میں کبھی کبھی بدمزگی کا بھی امکان نکل آتا۔ یہ نخ جوان تو تھا نہیں، جہاں کا بچہ بچہ سدس مصری کی معجز نما مغنیہ رقاصہ کا غلام تھا۔ یہاں تھوڑی بہت حفاظتی تدابیر ضروری تھیں۔ کردستانیوں کی وفاداری اور جاں فروشی کے قصے اس نے بہت سنے تھے۔ لہٰذا چار تنومند اور جسیم کردستانی دربان ناجنس اور ناخواستہ آئندہ و روندکی روک ٹوک کے لیے مقرر کر لیے گئے تھے۔ لیکن صدر دروازے کے باہر تو کسی پر قدغن نہ تھی۔ لبیبہ خانم کبھی کبھی سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلتی، کبھی نور السعادۃ کو سیر کرانے لے جاتی۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھڑیوں انتظار کرتے:

یاراں ہمہ پر خوں کہ مبادا روی از بزم
جمعے بہ سر رہ کہ کے از انجمن آئی

نخ جوان میں اس کی مجلس دو وقت ہوتی تھی، مگر یہاں اس نے صرف ایک وقت کی رسم رکھی۔ رقص کرنا اس نے ترک کر دیا تھا۔ اس کی مجلس زیادہ سے زیادہ دو ساعت کی ہوتی۔ بایزید سے اپنی روحانی یگانگت کی ذاتی یادآوری کے طور پر وہ مولوی اور حافظ کا کلام بیش از بیش گاتی تھی۔ لیکن تبریز کی محبت کے اظہار، اور اس شہر کو اپنے دل میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے وہ محمد علی صائب کا کلام بھی گاہے ماہے سنا دیا کرتی۔ کبھی کبھی اہل اصفہان کے لحاظ سے وہ کمال اسمٰعیل یا محسن تاثیر کے بھی شعر پڑھ دیتی۔

ایک بار جب اس نے کمال اسمٰعیل کی رباعی سے محفل کا آغاز کیا، اور مقامِ عشاق میں اس کی لے اٹھائی تو حضارِ محفل کا کیا مذکور، باہر سے کان لگا کر سننے والوں کی بھی چیخیں نکل گئیں، لیکن وہ خود یوں گاتی رہی گویا سمجھتی ہی نہ ہو کہ یہ رباعی اس سے بھی کچھ کہہ رہی ہے:

بگذشت و مرا اشک رواں بود ہنوز
و اندر تن من باقی جاں بود ہنوز
می گفت و مرا گوش بر آں بود ہنوز
بے چارہ فلانیست جواں بود ہنوز

ماہ و سال یوں ہی گذرتے گئے۔ لبیبہ خانم کی عمر ڈھل رہی تھی لیکن اس کے رکھ رکھاؤ اور ادب آداب میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس کے کمالِ حُسن، اور حُسنِ کمال کی شہرت، اور چند برس بعد اس کے ساتھ ساتھ نورالسعادۃ کی فرشتہ صورتی کے چرچے، ملک بھر میں پھیلنے لگے۔ لبیبہ خانم کو علم مجلسی اور علمِ رقص و موسیقی کے سوا کچھ سکھایا نہ گیا تھا۔ علومِ رسمیہ سے وہ بے بہرہ تھی، لیکن اپنی قوتِ حافظہ اور قوتِ آخذہ کے بل بوتے پر اس نے اتنا کچھ سیکھ سمجھ لیا تھا کہ پڑھے لکھوں کی محفل میں وہ کسی سے ہیٹی نہ رہتی۔ سخنورانِ پیشیں کا کلام نظم و نثر بھی اسے لاتحصٰی یاد تھا۔ محفلوں میں جو کچھ بھی وہ سناتی، حافظے کے بل بوتے پر اور بے ضغطہ زبان سناتی تھی۔

اصفہان کی معتدل آب و ہوا نے نورالسعادۃ کی صحت پر واقعی اچھا اثر ڈالا۔ اب اسے تنفس اور کھانسی کے دورے بہت کم پڑتے تھے، اور اگر پڑتے بھی تو کم مدت کے لیے۔ اس کی تعلیم اور تربیت اور تدریب کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ نورالسعادۃ کو ماں باپ کے حسن کے ساتھ ساتھ ان کی وہبی صلاحیتوں سے بھی حصۂ وافر ملا تھا۔ اس کی اپنی دفاعی قابلیت اس پر مستزاد تھی۔ علم موسیقی تو اس نے گویا ماں کے پیٹ ہی میں سیکھ لیا تھا۔ اس کی موزونی طبع بھی بہت بچپن میں نمایاں ہونے لگی تھی، اور دس گیارہ سال کی عمر سے اس نے شعر کہنا آغاز کر دیا تھا۔ خلوت و جلوت میں گفتگو، نشست و برخاست کے آداب کے لیے بھی اسے ماں کی گود سے آگے نہ جانا پڑا تھا۔ لبیبہ خانم نے نورالسعادۃ کے لیے علومِ رسمیہ کی بھی تعلیم میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس نے بیٹی کو خطاطی، شہسواری اور تیر افگنی کی بھی تعلیم دلائی۔ حسن کا اس کے یہ عالم تھا کہ جن لوگوں نے لبیبہ خانم کو نخ جوان میں دیکھا تھا، اب نورالسعادۃ کو اصفہان میں دیکھتے تو ایک دو لمحے کے لیے فرق نہ کر سکتے اور گمان کرتے کہ لبیبہ خانم نے کسی جادو کے زور سے اپنی عمر کم کر لی ہے۔ ان کے مزاج میں اتنا فرق البتہ تھا کہ نورالسعادۃ کی نخوت میں رعونت کا رنگ تھا۔ پھر وہ کچھ ضدی بھی تھی اور کم گفتار بھی۔ اس وجہ سے اس کے دل کی بات، یا اس کی ضد کی وجہ بھی، مشکل ہی سے جانی جا سکتی تھی۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ ماں نے بیٹی کے لیے کس قسم کے مستقبل کے منصوبے بنائے ہیں، اور بیٹی اپنی موجودہ اور آئندہ زندگی کے بارے میں کیا سوچتی یا محسوس کرتی ہے، ان معاملات پر ماں بیٹی میں کبھی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ دونوں کے دل میں چور تھا، اور ایسا چور کہ نہ دبائے دبتا تھا اور نہ روز روشن میں کھلنا چاہتا تھا۔ جیسی تعلیم نورالسعادۃ کو ملی تھی، وہ تو امیر زادیوں اور شہزادیوں کو ہی مل سکتی تھی، لیکن نورالسعادۃ کی ہتھیلی امیر زادیوں اور شہزادیوں تو کیا، اوسط درجے کی گھریلو خانم جیسی لکیر بھی شاید تھی ہی نہیں اور کیا یہ ممکن تھا (مناسب ہونا تو دور

کی بات تھی) کہ ماں کے بعد بیٹی اصفہان کے رندانِ باغاتی کے تفرج اور دل بستگی کا سامان مہیا کر سکے گی، اور اسی شان اور تمکنت کے ساتھ جو اس کی ماں کے حصے میں آئی تھی؟ بیٹی کے مزاج میں رعونت اور ضد تھی، ماں کے یہاں تمکین اور وقار۔ لیکن عزتِ نفس کو ہاتھ سے دیے بغیر وہ حالات سے سمجھوتا بھی کرنا جانتی تھی اور ماں میں جو کرشمہ جاتی صفت تھی کہ اس کی طرف عورت مرد سب کے دل خود بخود کھنچتے تھے، کیا بیٹی کو بھی اس میں سے حصہ ملا ہوگا؟ یہ بات تو کچھ دن کے بیوہار اور برتاوے کے بعد ہی کھل سکتی تھی۔

پھر یہ بھی تھا کہ ماں نے تو ایک بیٹی کو جنم بھی دیا تھا، اور چند سال سہی، لیکن اس نے معشوقی اور عورت پن، دونوں کے مناصبِ حیات بھی پورے کیے تھے، اور بڑی حد تک من مانی کر کے اپنے دن گذارے تھے۔ زندگی کے سارے نشیب و فراز کے باوجود لبیبہ خانم بہت خوش قسمت بھی رہی تھی۔ کیا ایسی قسمت بیٹی کو بھی مل سکے گی؟ ورنہ یہ کیا بات ہوئی کہ سفینۂ حیات میں وہ سوار تو شہزادیوں کے رنگ ڈھنگ سے ہو، اور ساحل مراد پر ٹھہرنے کے بجائے اس کی کشتی دور دور قعرِ مذلت میں غوطے کھاتی پھرے؟

اور نہیں تو کیا، کوئی جنوں پریوں کے دیس کا شہزادہ آکر نورالسعادۃ سے بیاہ رچا کر اسے کوہ قاف پر لے جائے گا؟ علی قلی والہ داغستانی کی معشوقہ خدیجہ سلطان تو اس کی بنتِ عم تھی۔ دونوں اعلیٰ خاندان سے تھے، اور دونوں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ کوئی دن جاتا تھا کہ ان کی شادی ہو جاتی اور ان کی زندگی ایک طویل بہاریہ کی مثال بنتی لیکن تقدیر کے ایک پلٹ نے سب کچھ پلٹ دیا۔ پہلے تو شیطان صفت افغان سردار نے اصفہان پر قبضہ کیا اور شاہ طہماسپ کو تخت سے اتار کر شہر میں لوٹ شروع کی۔ اس دارو گیر میں والہ اور خدیجہ کے گھر والے بھی آ گئے۔ خدیجہ کو افغان سردار نے بزور اپنے محل میں ڈال لیا۔ پھر جب نادر قلی خاں نے افغانیوں کو تہ تیغ کر کے شاہ طہماسپ کو ملک واپس دلایا تو خدیجہ سلطان بھی شاہ طہماسپ کے تصرف میں آ گئی۔ علی قلی والا بچارا جان کے خوف سے بھاگ کر ہندوستان جا رہا تھا۔ خدیجہ سلطان کبھی کبھی چوری چھپے اسے خط لکھتی، لیکن دونوں ہی دعا کے علاوہ کچھ بھی کرنے سے معذور تھے۔ پھر جب 1148 [1736ء، مرتب] میں نادر قلی خاں نے طہماسپ صفوی کو معزول کر کے اس کے خورد سال بیٹے عباس کو عباس صفوی سوم کے نام سے تخت نشین کیا تو بے زبان خدیجہ سلطان نادر قلی خان کے ہتھے چڑھی، اور اب بھی اس کے حرم کے کسی کونے میں پڑی وہ زندگی کی گھڑیاں سسک رہی ہے۔ نادر شاہ کے حملۂ دہلی اور قتل عام کے دوران علی قلی والہ چھپتا پھرا کہ ایرانی سپاہیوں کا سامنا ہوا تو نادر شاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ فوراً اس کی تکا بوٹی کر دیں گے۔

ایسی دُنیا اور ایسے زمانے میں نورالسعادۃ جیسی لڑکی کو شوہر یا مربی کے بغیر کون سا کنجِ عافیت مل سکتا تھا؟ یقین ہے کہ لبیبہ خانم نے بھی ان باتوں پر اسی انداز میں غور کیا ہوگا جس طرح نورالسعادۃ راتیں جاگ جاگ کر غور کرتی تھی۔ لیکن اپنی تمام مضبوطیٔ کردار کے باوجود اس میں ہمت نہ تھی کہ اس معاملے پر بیٹی کے ساتھ بابِ سخن وا کرے۔ نورالسعادۃ تیرہواں برس پورا کر رہی تھی، اور اب اس کے مستقبل کے بارے میں منصوبہ بندی بہرحال ضروری تھی، اس کا انجام جو بھی ہوتا۔

ایک دن اچانک دونوں کے دلوں کا پھوڑا ایک ساتھ ہی پھوٹ بہا۔ دوپہر کا وقت تھا، نورالسعادۃ اپنے اتالیق سے 'سیاست نامہ' کا سبق لے کر دیوان خانے سے آئی تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ خلافِ عادت وہ اپنی ماں کے کمرے میں جا کر اس سے پہلو ملا کر بیٹھ گئی اور بولی:

''اماں، آج آخوند آغا کہہ رہے تھے کہ میں نے 'سیاست نامہ' اتنی اچھی طرح پڑھ لیا ہے جتنی اچھی طرح ان کے کسی مرد شاگرد نے بھی نہیں پڑھا۔''

''ماشاء اللہ'' اس کی ماں نے مسکرا کر کہا، ''میری بیٹی ہے ہزاروں میں ایک۔ کسی کے بیٹا بھی ایسا نہ ہوگا جیسی میری یہ پیاری سی بیٹی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے لبیبہ خانم نے نورالسعادۃ کی ٹھوڑی اٹھائی کہ اس کی پیشانی کو چوم لے۔

''مگر یہ کیا؟'' وہ گھبرا کر بولی۔ ''تم تو رو رہی ہو۔ کیا ہوا، جی تو نہیں ماندہ ہے؟ بھوک لگی ہے؟ کیا بات ہے؟''

نورالسعادۃ نے بمشکل خود کو ضبط کیا اور بولی، ''آخوند آغا بھی مجھے لڑکوں سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ اماں بھی یہی کہتی ہیں، لیکن کیا واقعی میں لڑکوں سے بڑھ کر ہوں؟''

''مجھے تو اس میں کوئی شک نہیں اور یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم میری بیٹی ہو۔''

''تو پھر.... تو پھر....'' وہ رکتے رکتے اچانک بکھر گئی۔ ''پھر میں کس بادشاہ کی وزیر، کس مدرسے کی صدرِ اعلیٰ بنوں گی؟ اور کچھ نہیں تو وہ کون سا گھر ہے جو میرے قدموں سے روشن ہوگا؟ میں لڑکا نہیں ہوں اور ہوں گی میں آپ کی پیاری بیٹی، لیکن دُنیا مجھے کسی اور نام سے جاننا چاہتی ہے۔''

ایک مدت کے بعد، باغات میں آباد ہونے کے بعد شاید پہلی بار، لبیبہ خانم نے خود کو جواب سے قاصر پایا۔ وہ ہمت کر کے کچھ کہنے کے لیے منھ کھول ہی رہی تھی کہ نورالسعادۃ نے کتابوں کا بستہ ایک طرف پھینکا،

زبرجد کے قلم دان کو اس زور سے دیوار پر پٹکا کہ اس کے ٹکڑے ہو گئے، روشنائی کی چھینٹیں دیوار کے پردے اور قالین پر بکھر گئیں۔

''میں لڑکا نہیں ہوں۔'' وہ رو بھی رہی تھی اور غصے میں اپنی مٹھیاں بھی بھینچے ہوئے تھی۔ ''لڑکا ہوتی تو سب عیب چھپ جاتے اور لڑکیوں کا تقابل لڑکوں سے کیا ہی کیوں جائے؟ بولیے، میرے لیے کہاں کہاں سے پیغام آئے ہیں؟ اگر میں لڑکا ہوتی....''

''تو بھی مجھے تمھاری فکر ہوتی، لیکن اس طرح کی نہیں، جیسی اب ہے۔'' بالآخر لبیبہ خانم کو لب کشائی کا یارا ہوا۔ ''دستورِ دُنیا کو تم نہیں بدل سکتیں۔ انھیں دستوروں کے درمیان ہم عورتوں کو اپنے جینے کے ڈھنگ حاصل کرنے پڑتے ہیں۔''

''تف ہے دستورِ زمانہ پر!'' نورالسعادۃ اب بھی روئے جا رہی تھی۔ ''میں نے اتنا سب پڑھ کر کیا سیکھا، کیا پایا؟ جب مجھے ناچ گانے ہی والی بن کر جینا تھا تو یہ سب ڈھونگ کیوں رچائے گئے؟ جب میری جگہ جہنم میں ہے تو مجھے جنت کی جھلک کیوں دکھائی گئی؟''

لبیبہ خانم نے بڑی مشکل سے ضبط کیا، بولی۔ ''تو کیا میں تمھاری دشمن تھی؟''

''تھیں، تھیں، بالکل تھیں، اور اب بھی ہیں،'' نورالسعادۃ نے نرم پروں سے بھرے تکیے کو چیر کر سفید سفید پروں کو ساری خواب گاہ میں برف کے گالوں کی طرح بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر دشمن نہ ہوتیں تو مجھے اپنی ہی طرح کا کچھ بننے کی تربیت دیتیں۔ مجھے اس دھوکے میں نہ ڈالتیں کہ....''

''تم ایک رقاصہ کی بیٹی نہیں، شریف زادی ہو؟'' لبیبہ نے زندگی میں پہلی بار بیٹی پر اپنی آواز بلند کی۔

''لیکن میں رقاصہ تو نہیں پیدا ہوئی تھی۔ تقدیر....''

''تقدیر، تقدیر اللہ کی مرضی، دُنیا کا دستور، یہ سب بھی ڈھکوسلے ہیں۔ آپ کو رقاصہ کی زندگی منظور نہ تھی تو آپ نے خودکشی کیوں نہ کر لی؟''

یہ کہتے کہتے نورالسعادۃ کو خیال ہوا کہ میں حد سے بہت آگے بڑھ گئی ہوں۔ بچے انجانے میں والدین پر کس طرح ظلم کر سکتے ہیں، اسے آج اس کا احساس ہوا۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے، پلنگ کے کپڑے، تکیے برابر کرنے کی ناکام کوشش کی اور ماں کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی:

''اماں میں نے بہت برا کیا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ نہ کہنا چاہیے تھا۔ لیکن میں کیا کروں، مجھے راتوں کو

نیند نہیں آتی کہ میرا کیا ہوگا۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''اور آپ کے سوا کون ہے جو میری یہ باتیں سن سکے؟''

لبیبہ خانم کی سبزی مائل نیلگوں سحر گوں آنکھوں نے اتنے آنسو کبھی نہ بہائے تھے۔ اس نے کچھ کہا نہیں، نورالسعادۃ کا ہاتھ اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں لے لیا اور آنسو اس کے رخساروں سے بہہ کر بیٹی کے تپتے ہوئے ہاتھوں پر ٹپکتے رہے۔

ماں بیٹی میں اس معاملے پر یہ پہلی اور آخری گفتگو تھی (اگر اسے گفتگو کہا جائے) لیکن شاید دونوں نے اپنے اپنے دل میں سمجھ لیا تھا کہ فیصلہ ہو چکا ہے اور دونوں کا فیصلہ ایک ہی تھا، یہ بھی شاید ان دونوں کو معلوم تھا۔ تقدیر بھی شاید اسی کا نام ہے۔

لیکن تقدیر نے چند ہی دن بعد ایک ایک اور پانسا ان کے سامنے ڈالا۔ اس کے معنی بظاہر کچھ خاص نہ تھے، لیکن اس کے ساتھ بعض مضمرات ضرور وابستہ ہو سکتے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک شام حاجب نے محافظ خانے کی اردا بیگنی کو اطلاع دی کہ اعتمادالدولہ نواب قمرالدین خان بہادر نصرت جنگ، وزیر شہنشاہِ ہند کا ایلچی دہلی سے آیا ہے۔ خانم بزرگ کی اجازت ہو تو کل بوقت شام آداب اور نامہ وزیرِ ہند پیش کرنے کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہے۔

لبیبہ خانم کچھ حیرت اور کچھ الجھن میں پڑی۔ وزیر الممالک ہند کا ایلچی اور میرے نام وزیر کا شقہ، یہ کیا اسرار ہے؟ لیکن ایلچی سے ملاقات کیے بغیر اسرار کا حل بھی ممکن نہ تھا۔

اگلے دن وقتِ مقررہ پر لبیبہ خانم دیوان خانے میں آ کر بیٹھی۔ سارے کمرے میں، دیوار سے دیوار تک کاشان کے یک رنگ قالین کا فرش تھا۔ اس پر جگہ جگہ نائین، کرمان اور بخارا کے چھوٹے مگر بھاری قالین پڑے ہوئے تھے، گویا بے پروائی میں یوں ہی ڈال دیے گئے ہوں، حالانکہ دراصل ان کی جگہیں بہت سوچ سمجھ کر چنی گئی تھیں۔ چاروں کونوں پر پیتل کے بھاری جگمگاتے ہوئے میر فرش، ان کے سامنے خاصدان میں عطر پھول الائچیاں۔ بیچ میں ایک بہت بڑے کشتی نما تانبے کے گلدان میں موسم کے پھول، دیواروں پر کہیں کہیں وصلیاں آویزاں۔ اوپر زربفت کی چھت گیری، بیچ میں ایک سرخ پھول دے کر اس طرح چنٹیں دے کر کھنچی ہوئی، کہ لگتا تھا سرخ رنگ کے ستارے سے شعاعیں نکل رہی ہیں۔ چھت گیری سے

تعبیہ کیا ہوا چھتیس شمعوں کا جھاڑ، جس کے فانوس مختلف ہلکے رنگوں کے تھے۔ سب میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔

لبیبہ خانم کی نشست گاہ دیوان خانے کی مغربی دیوار سے ملا کر بچھائی ہوئی کوئی بالشت بھر اونچی آبنوسی چوکی نما صندلی تھی، صندلی پر دبیز ہندوستانی قالین، پھر اس پر طیلساں کی طرز کی چھوٹی یمنی چادر لیکن قالین اور چادر دونوں اس طرح بچھائے گئے تھے کہ آبنوسی چوکی کے حاشیوں اور پایوں کی نیلی روپہلی میناکاری صاف دکھائی دیتی تھی۔ لبیبہ خانم ترکی انداز کے گہرے سبز سنہرے حریر کی پیشواز پہنے ہوئے تھی۔ یعنی پیشواز ٹخنوں سے بس کچھ اوپر تک، اور وہاں نہایت تنگ تھی۔ اس کے بعد وہ کسی طوفان کی سی تیزی سے چاروں طرف اٹھتی اور پھیلتی نظر آتی۔ چنٹوں کے ذریعہ کپڑے کی قاشیں سی بن جانے کی وجہ گھیر غیر ضروری طور پر زیادہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ کمر پر پیشواز پھر بہت تنگ ہو جاتی، اس قدر تنگ کہ کمر کی تنگی نمایاں ہو جاتی۔ کمر میں سونے کے باریک تاروں سے بنا ہوا چوڑا پٹکا جس کا کھٹکا سرمئی پکھراج کے ایک بڑے سے ڈلے کا تھا۔ بدن پر بہت لطیف نیلگونی مائل کاشانی مخمل کا پوری آستینوں والا چھوٹا کُرتا جس کا گریبان سراندیپ کے سفید موتیوں کے تکموں سے بند تھا۔ کُرتے پر آدھی آستینوں والی سیاہ مخمل کی مرصع کار صدری۔ صدری میں کوئی بٹن نہ تھے، لیکن اس کے گریبان پر ننھے ننھے یاقوت اور سفید نیلم ٹکے ہوئے تھے۔ اس کی بینی و بنا گوشِ زیور سے معرا تھے، لیکن گلے میں ایک ڈال کے سرمئی ہشت پہلو پکھراجوں کا ہار تھا اور ہر پکھراج کے چاروں طرف سفید ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

صندلی کے سامنے لبیبہ خانم کی جوتیاں تھیں، سفید ہرن کے بچے کی کھال کی بنی ہوئی، جن پر نقش و نگار ہاتھ سے بنائے گئے تھے۔ جوتیاں دیکھنے میں اتنی ہلکی تھیں کہ ان پر کاغذ کا گمان ہوتا تھا۔ وہ چوکی پر اس طرح گھٹنے موڑے بیٹھی تھی کہ دونوں ایڑیاں اور پاؤں کا باقی حصہ چھپا ہوا تھا، لیکن دونوں پاؤں کی ایک ایک دو دو انگلیاں اور ان کے حنائی ناخن کبھی کبھی جھلک دکھا جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ اسی پہلو بیٹھتی تھی، اور گانے کے دوران کے علاوہ پوری مدتِ محفل میں پہلو نہ بدلتی تھی۔ اس کی پشت پر دو خواصیں ہاتھ باندھے کھڑی تھیں اور ان کے ریشمی پٹکوں سے تعبیہ ہوئے جڑاؤ خنجر صاف نظر آتے تھے۔

دیوان خانے تک پہنچنے کے لیے ایک دالان، ایک آنگن، اور پھر ایک بارہ دری سے گذرنا پڑتا تھا۔ اردابیگنی باہر سے اندر آئی، اور بارہ دری کے وسطی در پر رک کر تسلیمات بجالانے کے بعد بولی:

''خانم بزرگ کی خدمت میں عرض ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب قمر الدین خان بہادر اعتماد الدولہ نصرت جنگ، وزیر الممالک شہنشاہ ہندوستان کے ایلچی رائے کشن چند اخلاص باریابی کے متمنی ہیں۔''

لبیبہ خانم نے کوئی خفیف سا اشارہ کیا، یا بہت نیچے لہجے میں ہاں کہی۔ اگر کوئی غیر بیٹھا ہوتا تو نہ اشارہ سمجھ پاتا نہ حکم سن پاتا، لیکن اردابیگنی الٹے پاؤں باہر گئی اور اور ایک ہی دو ثانیے میں واپس آئی، اس طرح کہ وہ آگے آگے تھی اور آنے والا اس کے دو قدم پیچھے تھا۔ اس بار وہ دیوان خانے تک آئی اور ذرا بلند آواز سے بولی، ''رائے کشن چند اخلاص دہلی سے تشریف لائے ہیں۔''

پینتیس اور چالیس کے درمیان کی عمر، نو وجب [چھ فٹ، مرتب] سے کچھ نکلتا ہوا قد، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، گہرا سانولا رنگ، کشن چند اخلاص کا چہرہ ڈاڑھی سے بے نیاز تھا۔ متوسط گھنی مونچھیں البتہ اس کے دہانے کے دونوں جانب ڈھلکی ہوئی تھیں۔ ڈھلکی ہوئی مونچھوں نے نمایاں، مضبوط ٹھوڑی کو اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ سر پر کشتی نما دو پلڑی ٹوپی، جس کا منڈوا ذرا گولائی لیے ہوئے، اور سرا ذرا نوک لیے ہوئے تھا۔ پوری ٹوپی پر کڑھائی کا کام تھا۔ پٹے دار گھنے سیاہ چمک دار بالوں پر وہ ٹوپی بائیں طرف اس طرح کج رکھی گئی تھی کہ ماتھے کا ایک حصہ تو ڈھک گیا تھا، لیکن سر اور بال بڑی حد تک کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں پچ لڑا سڈول موتیوں کا ہار، جس میں بڑے زردی مائل سفید موتی کے بعد چھوٹے سیاہی مائل موتی ایک کے بعد ایک پروئے گئے تھے۔ باریک فالسئی ڈوریے کا کُرتا، اس پر نیلی مخمل کا انگرکھا، جسے اس وقت نیمہ بھی کہتے تھے۔ انگرکھے کا پردہ دائیں طرف سے کھینچ کر بائیں طرف تکمے سے بندھا ہوا، اس طرح کہ بائیں چھاتی کا حصہ کُرتے کے نیچے سے جھلکتا تھا۔ نیمے کی آستینیں کھلی ہونے کی وجہ سے چوڑی کلائیاں صاف نظر آتی تھیں۔ دونوں کلائیوں میں سونے کے کڑے۔ گلبدن کا پاجامہ ایک برکا، اس پر بڑے گھر کا سیاہ مخملی جامہ جس پر سنجاف ٹکی ہوئی تھی اور آستینیں جدید طرز کے مطابق اوپر سے کاٹ کر نیچے لٹکنے کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں۔ کمر میں سنہرا پٹکا، پاؤں میں سلیم شاہی جوتیاں۔ پیچھے دو ملازم سرپوش ڈھکے ہوئے خوانوں پر نذر کا سامان لیے ہوئے کھڑے تھے۔

رائے کشن چند اخلاص نے جوتیاں لبِ فرش اتاریں، ذرا اندر داخل ہوا تو اس نے تین بار جھک کر سلام کیا اور پھر ہاتھ باندھ کر بولا:

''دولت و اقبال زیادت باد۔ میں، شہنشاہ ہندوستان مینو نشان کے وزیر کا ایلچی، ان کا نامہ فیض شمامہ

لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' اب تک کشن چند اخلاص نے نگاہ اٹھائی نہ تھی، اردا بیگنی کے ہلکے سے اشارے پر اس نے سر اٹھایا اور کمرے میں داخل ہو کر ایک چھوٹے بخارائی قالین پر دوزانوں بیٹھ گیا، اس طرح کہ قالین نہ اتنا دور تھا کہ بات سننے میں تکلف ہو، اور نہ اس قدر نزدیک کہ دونوں حقیقی معنی میں روبرو ہو سکیں۔ اب اس نے خانم بزرگ سے آنکھیں چار کیں، اور ایک ہی نظر میں بسمل ہو گیا۔

لبیبہ خانم کے چہرے پر خفیف سی، لیکن گرم جوشی آمیز مسکراہٹ تھی۔ اس وقت اس کی عمر دو کم پچاس تھی۔ لیکن وہ یوں بھی اپنی عمر سے بہت کم، دو کم چالیس کی سی لگتی تھی، اور آج تو اس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ کشن چند اخلاص کو اپنے چہرے پر پسینہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے نگاہ جھکا کر چاہا کہ گریبان میں سے رومال نکالے کہ اس کی نگاہ خانم کی جوتیوں پر پڑی۔ پہلے تو اس نے سمجھا کہ یہ کاغذ کی بنی ہوئی سجاوٹ کی چیزیں ہیں، لیکن پھر اس نے پہچانا کہ یہ تو اس کے ہی ملک کی مشہور جوتیاں ہیں، اتنی ہلکی اور اس قدر نازک کہ انھیں ننگے فرش پر پہنچا جاتا تو دو گھڑی بھی نہ جاتی تھی کہ وہ کٹ گھس کر بے کار ہو جاتی تھیں۔ اس کا جی چاہا وہ جوتیاں اٹھا کر کلیجے میں رکھ لے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ ایک خواص نے اس کے سامنے ایک بہت نیچی میز پر ایک رومی طشتری میں میوے، ایک فنجان میں قہوہ، اور ایک منقش عطردان رکھ دیا ہے۔ ابھی وہ ادھر متوجہ ہو ہی رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ خانم بزرگ کی آنکھیں اس پر ہیں، اور وہ کچھ کہہ رہی ہے:

''اہلاً و سہلاً۔ اے آمدنت باعث دل شادیِ ما۔'' وہ بولی تو لگا کہیں پردے کے پیچھے ہلکے سر میں بلمپت جل ترنگ بج رہا ہو۔ کشن چند اخلاص سو سو جان سے قربان ہو رہا تھا۔ کاش یہ اسی طرح کوکتی رہیں اور میں سنتا رہوں۔ ''اعتماد الدولہ بہادر نے ہم دور افتادگان کی تبریک کے لیے اپنے سایۂ رافت اور راحت کا نمونہ آپ کی شکل میں بھیجا ہے۔ شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را۔ میں سراپا متشکر ہوں۔ ان کی جان پاک پر قربان ہو جاؤں تو یہ میرے نصیب کی بلندی ہوگی۔ فرمایئے، میں کس طرح بندگانِ حضور کے کام آسکتی ہوں؟''

کشن چند اخلاص کچھ اس درجہ مسحور ہو رہا تھا کہ ایک لحظہ سے احساس ہی نہ ہوا کہ سوال کا جواب دینا ہے۔ پھر ذرا ہڑبڑا کر اس نے کمر میں بندھی ہوئی ہمیانی کھولی، وزیر ہندوستان کا زرنگار شقہ نکالا اور نذر کی پانچ اشرفیوں کے ساتھ دونوں ہاتھوں پر رکھا، پھر سرو قد کھڑے ہو کر تعظیم کے ساتھ ہاتھوں کو لبیبہ خانم کی طرف بڑھایا۔ معاً ایک خواص کشتی لیے ہوئے آگے آئی، نامے اور نذر کو کشتی میں رکھا، پھر کشتی کو سر پر رکھ کر خانم بزرگ کے روبرو آکر اسے سر سے اتارا اور خانم کے ملاحظے کے لیے پیش کیا۔ لبیبہ خانم نے اپنے ہاتھ

سے شقہ کھولا، اس پر ایک غائر نظر ڈالی، پھر کچھ متبسم ہوئی، گویا مضمون اسے پسند آیا ہو۔

فارسی عبارت کا مفہوم تھا، ''اقبال نشان وسعادت آثار، رنگ و بوئے ہر گل وگلزار، زہرۂ فلک رقص و سوز وساز، مالک مملکت ناز وانداز، لیبیہ خانم کی خدمت میں اعتماد الدولہ محمد قمر الدین خان نصرت جنگ عرض پرداز ہے کہ میرے اکلوتے فرزند کی شادی میرے ہمشیر زادے رعایت خان بن ظہیر الدولہ نواب عظیم اللہ خان سے ماہ شوال 1156ء [مطابق نومبر، دسمبر 1743ء، مرتب] میں ہونا قرار پائی ہے۔ اس مبارک موقعے پر ایک جلسہ ترتیب دیا چاہتا ہوں جس کی نظیر چشم پیر فلک نے بھی نہ دیکھی ہو اور ظاہر ہے کہ ایسی محفل محفل ہی نہ ہوگی اگر آں عزیزہ وہاں رونق افزا نہ ہوں گی۔ تفصیلات سفر و اخراجات میرے ایلچی برخوردار کشن چند اخلاص بیان کردیں گے۔ امید کہ مایوس نہ کیا جاؤں گا۔''

لیبیہ خانم کے ماتھے پر تفکر کی خفیف سی شکن ایک لحظے کے لیے ابھری، لیکن اس نے سر اٹھایا اور متین لہجے میں، ہلکی آواز میں کہا:

''بندی اعتماد الدولہ بہادر کی قدر افزائی اور یاد فرمائی کے لیے سراپا سپاس ہے، مگر....'' وہ چپ ہوگئی۔

کشن چند اخلاص کو اپنا دم سینے میں اٹکتا محسوس ہوا۔ سفارت کی ناکامی کا خوف تو تھا ہی، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر یہ میرے ساتھ نہ گئیں تو پھر تا حیات کی جدائی ہوگی۔ اس وقت اس کی پوری ذہنی اور باطنی قوت لیبیہ خانم پر مرتکز تھی، کہ اس کا جواب باصواب ہو، اور ''مگر'' کہہ کر اس کے ٹھہر جانے میں انکار مرموز نہ ہو۔ قطع کلام کی جرأت تھی نہ موقع، لہٰذا ملتجی نگاہوں سے لیبیہ خانم کو دیکھتا رہا۔

دل کی پچیس تیس دھڑکنوں کی مدت تک خاموش رہنے کے بعد خانم بزرگ نے کہا، ''مگر میں وہاں کی زبان جانوں نہ وہاں کے رسوم و رواج اور ادب آداب میں کچھ درک رکھوں اور پھر میں تو سنتی ہوں کہ اعلیٰ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ سے لے کر آج چار پانچ صدیاں ہونے آئیں، ملک ہند میں ایک سے بڑھ کر ایک ماہر فن ہوا ہے، اور آج بھی ہے۔ میں تو ان میں بالکل گنگ ہو کر رہ جاؤں گی۔''

اب کی بار کشن چند اخلاص نے کھلے بندوں رومال نکال کر پسینہ خشک کیا، پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا، ''خانم بزرگ کے ارشاد سے اختلاف کی جرأت میں نہیں کرسکتا۔ لیکن ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر ست۔ آپ اپنی جگہ ہیں، اہل ہند اپنی جگہ۔ رہا سوال زبان کا تو اُردوئے معلائے شاہجہاں آباد میں حضور کو مجھ جیسی ٹوٹی پھوٹی فارسی بولنے والے بہت ملیں گے۔ پھر ارمنی بولنے والوں کی بھی کچھ ایسی قلت نہیں۔ ساز [بمعنی

آلاتِ موسیقی، مرتب] آپ اپنے ساتھ لے چلیں، سوز [بمعنی گانا، Vocal Music، مرتب] سارے کا سارا فارسی میں ہوگا اور جہاں تک سوال شاہجہاں آباد کی عام بولی کا ہے، تو اسے ہندی یا ریختہ کہتے ہیں، اور وہ فارسی سے اس درجہ قریب ہے کہ اگر مجھے ہم رکابی کا شرف حاصل رہا تو آپ اسے اثنائے راہ ہی میں سیکھ لیں گی۔''

یہ ساری تقریر کشن چند اخلاص نے خانم بزرگ کے سامنے آنکھیں اٹھا کر کی، اس طرح کہ وہ اس کی شخصیت کے جمال اور حُسنِ صورت کی لطافت، خاص کر آنکھوں کی دمکتی روشنی کے سحر میں خود بخود جکڑتا جا رہا تھا۔ خانم بزرگ کی بڑی بڑی سبزی مائل نیلگوں آنکھیں نہ صرف یہ کہ خانم کے چہرے کے تاثرات، بلکہ شاید دل کے حالات کو منعکس کرتی تھیں، بلکہ یہ بھی کہ ان میں ایک حیرت خیز زندگی کا احساس ہوتا تھا۔ رنگیں شمعوں کی لویں کچھ بھڑکتیں، یا لہراتیں تو روشنی کا ہر نیا عکس خانم بزرگ کی نگاہ کو اپنے طور پر جگمگا دیتا، گویا آنکھوں کی لو شمع کے نور کا جواب دے رہی ہو۔ رائے کشن چند اخلاص اس وقت تو فلک زہرہ میں تھا۔ ایسی روشن، زندہ آنکھیں اس نے کبھی دیکھی نہ تھیں، دیکھی کیا، کبھی ان کا خواب بھی نہ دیکھا تھا۔

''بہت مناسب، بلکہ انسب،'' لبیبہ خانم نے جواب دیا، ''لیکن سفر کی صعوبتیں، وہاں نئے ماحول سے خود کو مانوس کرنے کی مشکلیں بھی تو ہیں۔''

''سفر تو حضور کا ان شاء اللہ یوں ہوگا کہ تختِ رواں کی بھی کچھ حقیقت نہ رہ جائے گی۔ آپ اجازت دیں گی تو میں خود سارا راستہ آپ کی حفاظت کروں گا۔'' اس آخری جملے کی ادائیگی میں تمنا اور درخواست کے لہجے لبیبہ خانم سے پوشیدہ نہ رہے تھے۔ ''اور اجنبیت کا کیا سوال ہے؟ آپ خود حضرت نواب کی مہمان ہوں گی۔ وہاں آپ کی مرضی پر سارے کام ہوں گے۔ وہاں کے سب لوگ خود کو آپ حضور کے مزاج و منہاج، پسند ناپسند سے مانوس کرنے کو اپنی توقیر جانیں گے۔''

یہ کہتے کہتے کشن چند اخلاص نے پیچھے کھڑے خدام کو اشارہ کیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دونوں خوان لبیبہ خانم کی جوتیوں کے پاس رکھ کر سرپوش ہٹا دیے۔ کشن چند نے کہا:

''یہ ایک ہزار اشرفیاں اعتماد الدولہ بہادر نے آپ کی نذر کے لیے بھیجی ہیں اور یہ چند جوڑے خادمانِ بندگانِ حضور کے لیے ہیں۔ آپ میرے ملک کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے عزت بخشیں یا نہ، ان نذروں کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔''

لبیبہ خانم نے نیم قد ہو کر سلام کیا۔ ’’نصرت جنگ بہادر کو رب العزت مزید نصرتیں عطا کرے۔ ان کی دریادلی نے میرے سیاہ خانے کو گہر ہائے شب چراغ سے بھر دیا ہے۔ میں ان کی ممنون ہوں۔‘‘

’’تو پھر رختِ سفر بار کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟‘‘ اخلاص کے لب ولہجہ ہی نہیں، سارے بدن سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

لبیبہ خانم پہلی بار کھل کر مسکرائی۔ ’’اتنی بھی جلدی نہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے موقع درکار ہے۔ میں پرسوں اپنا فیصلہ بتاؤں گی۔‘‘

رائے کشن چند کا چہرہ اتر سا گیا۔ وہ اجازت کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کا رنگ پژمردہ ہوتے دیکھ کر خانم بزرگ نے کہا:

’’آپ نے کچھ قہوہ عطر وغیرہ ملاحظہ نہ کیا۔ تشریف رکھیں، آپ کی قیام گاہ بہت دور تو نہیں۔‘‘

’’بندہ پروری ہے بندگانِ حضور کی،‘‘ اخلاص نے کہا۔ ’’میں آپ کے حکم کا غلام ہوں، جا کہاں سکتا ہوں۔‘‘

اس بات میں بھی شوق اور آرزو کے کتنے ناشگفتہ غنچے پوشیدہ تھے، اس کا اندازہ خانم بزرگ کو بھی تھا، لیکن وہ صاف پہلو بچا گئی۔ اس اثنا میں خواص نے قہوے کا نیا فنجان لا کر اخلاص کے سامنے رکھ دیا، اور پرانا فنجان، جس کا قہوہ رکھا رکھا ٹھنڈا ہو گیا تھا، سامنے سے ہٹا لے گئی۔ اخلاص ابھی فنجان اٹھا ہی رہا تھا کہ خانم بزرگ نے کہا، ’’رائے کشن چند، یہ لفظ اخلاص آپ کے نام کا جز ہے، یا آپ کو شعر گوئی سے بھی کچھ لگاؤ ہے، اور یہ جناب والا کا تخلص ہے؟‘‘

لبیبہ خانم کے منھ سے اپنا نام سن کر کشن چند اخلاص کو عجب فرحت اور لطف کا احساس ہوا، جیسے اس نے نام نہ لیا ہو، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ فنجان کو منھ تک نہ لے جا سکا۔

’’اس ذرۂ بے علم کا تخلص اخلاص ہے۔ حضرت مرزا غنی بیگ قبول کشمیری مدت فیوضہم کا شاگرد ہوں۔‘‘

’’جی، شاگردی کے کیا معنی؟ علمِ موسیقی کی تعلیم البتہ استاد سے حاصل کی جاتی ہے۔ شاعر تو تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔‘‘

’’بجا اور درست۔ لیکن گذشتہ چار پانچ دہائیوں سے اردوئے معلائے سلطانی میں ریختہ کی شاعری کا

چلن ہوا ہے۔ اس اسلوب میں شعر گوئی پہلے متداول نہ تھی۔ لہٰذا حدیقۂ شعر وسخن کے طیور نو پر کو ضرورت پڑی کہ کوئی مرد زیرک و دانا انھیں ریختہ کی شاعری کے آسمان میں اڑنے کے طور سکھائے۔ یہ بات بہت مقبول ہوئی، اور دو ہی چار برس گئے تھے کہ کئی بلند مرتبہ استادوں نے اچھے اچھے شاگرد بہم کیے۔ ان کی دیکھا دیکھی فارسی گویوں نے بھی خیال کیا کہ ہم بھی کیوں نہ کسی استاد کا دامن تھام لیں جس سے ہمیں فیوض و برکات حاصل ہوں۔''

''خوب، لیکن استاد سے فیض اٹھاتے کس طرح ہیں؟''

''بسا اوقات استاد کوئی لفظ بدل کر زیادہ با معنی یا مناسب تر لفظ رکھ دیتا ہے۔ کبھی کبھی پورا مصرع نیا کہہ دیتا ہے۔ محاورے کے سقم اگر کوئی ہوں، تو انھیں دور کرنے کا مشورہ دیتا ہے، یا خود ہی درست کر دیتا ہے۔ بندش اگر سست ہو تو اسے چست کر دیتا ہے۔''

''تقصیر معاف ہو، لیکن یہ آخری بات سمجھی نہیں۔ بندش کی سستی اور چستی سے کیا مراد ہے؟''

رائے کشن چند کچھ سوچ میں پڑ گیا، کہ بندش کی سستی کو پہچاننا آسان ہے، بیان کرنا مشکل۔ سنبھل سنبھل کر بولا، ''جی مثال کے طور پر کوئی لفظ مصرعے میں بیکار ہے، یا کم کارگر ہے یا شعر میں کوئی کھلا ہوا عیب نہیں، لیکن اس میں کوئی شگفتگی نہیں، نہ ترکیب کی، نہ قافیے کی، نہ محاورے کی۔ یہ سب باتیں بندش کی سستی کی ضمن میں آتی ہیں۔''

''ان باتوں کے لیے کچھ قاعدے بھی ہیں، یا محض استاد کی فہمیدگی پر انحصار ہے؟''

''قاعدے ہیں بھی اور نہیں بھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ چیز اہم ہے جسے شاعری کی وہبی حس کہہ سکتے ہیں۔ پھر مشق و مزاولت کو یہاں بڑی اہمیت ہے۔''

''اور علم شعر؟''

''جی درست فرمایا گیا۔ یہ بات تو بدیہی ہے کہ استاد کو شعر، اور علم شعر، دونوں میں شاگرد پر تفوق ہوتا ہے۔''

''خوب، تو کیا آپ مجھے اپنے کلامِ بلاغت التیام سے کچھ حظِ اندوزی کا موقع عطا فرمائیں گے؟''

رائے کشن چند کے جسم پر ایک لرزشِ خفی طاری ہوگئی۔ اس فرمائش میں کس قدر اپنائیت تھی۔ کیا آپ، مجھے اپنے کلام، حظ اندوزی، ہر ہر فقرے کے معنی کی تہہ میں بھی ایک معنی تھے۔ یہ بات اس کے دل میں یوں

اتر گئی جیسے صبح کی پہلی کرن کسی غیر متوقع روزن سے خوابگاہ میں آجائے۔ لیکن اس وقت اسے اپنا ایک بھی شعر یاد نہ آیا اور اگر یاد بھی آتا تو سنانے کی ہمت کہاں تھی۔ شعر اگر پسندِ خاطر نہ ہوئے تو تھوڑی بہت توقیر جو اس وقت تک حاصل ہے، جاتی رہے گی۔

''میرے شعر اس لائق نہیں۔ موجبِ سمع خراشی ہوں گے۔ اجازت ہو تو ملکِ ہند کے سب سے بڑے شاعر میرزا عبدالقادر بیدل کا کلام پیش کروں۔ وہ شاید اس بابِ عالی تک پہنچنے کے قابل ہو۔''

''بہت خوب، ارشاد ہو۔''

بیدل کی کون سی غزل اس وقت مناسب ہوگی؟ اخلاص نے گھبرا کر دل میں کہا، یا ابوالمعانی، آپ کی روح پُرفتوح کے صدقے، اس وقت میری مشکل آسان کر دیجیے۔ شاہجہاں آباد پہنچ کر آپ کے مزارِ پُرانوار پر شیرینی کی نیاز دلواؤں گا اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے سامنے بیدل کی ایک غزل یوں جھلملا گئی جیسے کسی نے اس کے دماغ میں روشن اور معطر پرچہ رکھ دیا ہو۔ واللہ کیا برمحل غزل تھی۔ اس نے فنجان کو ذرا فاصلے پر رکھ دیا، اور پہلو بدل کر دوبارہ دوزانو ہو کر لحن سے پڑھنا شروع کیا:

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ ای در دل کشا بہ چمن درآ

مطلع سنتے ہی لیبہ خانم کو لگا کسی نے کوئی چیز کلیجے میں چبھا دی۔ اس نے اس سارے عرصے میں اول بار پہلو بدلا، اور خود پوری طرح دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ رائے کشن چند کی آنکھیں نیم وا تھیں اور وہ ایک فردوسی محویت کے ساتھ کہے جا رہا تھا:

پئے نافہ ہائے رمیدہ بو مپسند زحمت جستجو
بہ خیال حلقۂ زلف او گرہے خور و بہ ختن درآ
نفست اگر نہ فسوں دہد بہ تعلق ہوس جسد
زہ دامن تو کہ می کشد کہ در ایں رباط کہن درآ
ہوس تو نیک و بد تو شد نفس تو دام و دد تو شد
کہ بہ ایں جنوں بلد تو شد کہ بہ عالم تو و من درآ

غم انتظار تو بردہ ام بہ رہ خیال تو مردہ ام
قدمے بہ پرستش من کشا نفسے چو جاں بہ بدن درآ
چو ہوا ز ہستی مبہمے بہ تاملے زدہ ام خمے
گرہ حقیقت شبنمے بہ شگاف و در دل من درآ
نہ ہوائے اوج و نہ پستیت نہ خروش و ہوش نہ مستیت
چو سحر چہ حاصل ہستیت نفسے شو و بہ سخن درآ
چہ کشی ز کوشش عاریت الم شہادت بے دیت
بہ بہشت عالم عافیت در جستجو بشکن درآ
بہ کدام آئنہ مائلی کہ ز فرصت ایں ہمہ غافلی
تو نگاہ دیدۂ بسملی مژہ وا کن و بہ کفن درآ
ز سروش محفل کبریا ہمہ وقت می رسد ایں صدا
کہ بہ خلوت ادب وفا ز در بروں نہ شدن درآ
بہ درآئے بیدل ازایں قفس اگر آں طرف کشدت ہوس
تو بہ غربت آں ہمہ خوش نہ ای کہ بگویمت بہ وطن درآ

اس شام کی کیفیت کشن چند اخلاص کو ہمیشہ یاد رہی۔ باہر چنار اور سرو کے درختوں کی پتیاں شفق کے پس منظر میں اب سیاہی مائل لگ رہی تھیں۔ دیوان خانے میں روشنی باہر سے چھن کر آنا بند ہوگئی تھی اور فانوسوں میں روشن شمعیں کچھ اور بھی فروغ پر تھیں۔ کھڑکیوں کے پردوں میں شام کی ہوا سے خفیف سی سرسراہٹ تھی، جیسے کشن چند اخلاص کی گونجتی ہوئی آواز نے انھیں بھی مرتعش کر دیا ہو۔ غزل ختم ہوتے ہی دونوں خاصوں کے منھ سے بے اختیار صدائے ''مرحبا! سبحان اللہ'' بلند ہوئی اور لبیبہ خانم تو اپنے زانو پر بار بار ہلکے ہلکے ہاتھ مارتی اور کہتی:

''کیسی انوکھی بحر ہے، اور کیسے نامانوس الفاظ ہیں۔ لیکن واللہ کیا زور ہے، کیا مضامین ہیں۔ کیا روانی ہے اور کیا قوافی ہیں۔''

رائے کشن چند نے جھک کر تسلیم کی، اور پھر ایک دوسرے ہی لہجے میں رباعی پڑھی:

مرزا بیدل کہ رہنمائے سخن است
پیغمبر و غوث و پیشوائے سخن است
یکتاست در آفریدن طرز کلام
باللہ کہ پئے سخن خدائے سخن است

اس رباعی پر خانم بزرگ نے سر اٹھایا اور بولیں:

"درست کہا۔ کس کی ہے؟"

رائے کشن چند اخلاص کو اس التفاتِ فراواں نے تقریباً مدہوش کر رکھا تھا۔ پھنسی پھنسی آواز میں بولا، "بندرابن المتخلص بہ خوشگو کی۔ میرزا صاحب مبرور کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔"

"تو کیا خود میرزا بیدل اس دُنیا میں نہیں؟"

"انھیں واصل بحق ہوئی کوئی بیس برس ہوتے ہیں۔ میرے والد گرامی بھی، اللہ ان کا سایہ ہم پر سلامت رکھے، حضرت میرزا صاحب کی شاگردی کا شرف رکھتے ہیں۔"

لبیبہ خانم ایک لحہ چپ رہی، پھر بولی: "ناگوارِ طبع نہ ہو تو کچھ پوچھوں۔"

"آپ کی بات اور ناگوار ہو!" اخلاص نے مسکرا کر کہا، "شوق سے فرمایئے۔"

"میرزا بیدل تو غالباً اہلِ اسلام میں سے تھے، اور جناب....؟"

"بحمد اللہ ہندو ہوں۔ بندرابن صاحب قبلہ بھی ہندو ہیں۔ ہم اہلِ ہند، اور خاص کر صاحبانِ تصنیف و تالیف، سب فارسی بولتے لکھتے ہیں اور سب اقوامِ ہند آپس میں اپنی اپنی حد تک مواخات و مواسات رکھتے ہیں۔"

"اور یہود و نصاریٰ؟"

"سب اپنے اپنے مسالک پر ہیں۔ یہود تو مدتِ مدید سے ہند میں ہیں، نصرانی البتہ بعد میں آئے اور فردوس مکانی صاحب ثانی اعلیٰ حضرت شہاب الدین شاہجہاں شہنشاہِ ہند کے وقتوں میں انھوں نے کچھ نیچے طبقے کے لوگوں کو بجبر اپنے مذہب میں داخل کر لیا۔ بحمد اللہ اس وقت ان کی خوب سرکوبی ہوئی۔ اب ان کا دور

دورہ بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن ہم ان سے کچھ بہت میل جول نہیں رکھتے۔ بہر حال:

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

کا سا معاملہ ہے۔ میرے ملک کو جنت نشان شاید اسی لیے کہتے ہیں،'' وہ پہلی بار ذرا بے تکلف ہو کر بولا۔

''اب اجازت مرحمت ہو۔ پرسوں جب آپ طلب فرمائیں گی، حاضر ہو جاؤں گا۔''

''آپ کے لیے طلبی کی ضرورت نہیں۔ آج ہی کے وقت پر کرم گستر ہو کر قدم رنجہ فرمائیں۔ بندی کو منتظر پائیں گے۔''

اس آخری جملے کے معنی کی تہہ میں بھی شاید کچھ اور تھا۔ لبیبہ خانم رائے کشن چند کو رخصت کرنے کے لیے اٹھیں، پاؤں میں جوتی ڈال ہی رہی تھیں کہ رائے کشن چند نے تقریباً دوڑ کر انھیں جوتیاں پہنا دیں، اور اس عمل میں اس کا ہاتھ پلک جھپکنے کی مدت کے لیے گلابی انگلیوں اور ایڑی سے چھو گیا۔ اسے ایک سنسنی سی محسوس ہوئی، جیسے چاقو کی دھار پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اٹھ کر تین سلام کر کے وہ الٹے پاؤں باہر آ تو گیا لیکن اس کے پاؤں زمین پر پڑتے نہ تھے۔

اس رات اور اگلے دن کے دوران ماں بیٹی میں اعتماد الدولہ کے بلاوے کے بارے میں تین بار مشورہ ہوا۔ نور السعادۃ نے کہا:

''اماں، مجھے دہلی جانے میں تو کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ لیکن اتنا لمبا سفر کرنا، چند ہفتے قیام کرنا، اور پھر سفر کے خطرات مول لے کر واپس آنا مصلحت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ زمانہ شورشوں سے پُر ہے اور راستے جگہ جگہ مخدوش۔ جاتے وقت اگر خوبیِ قسمت سے محفوظ رہے تو رہے۔ دوسری بار پھر تقدیر کو آزمانا مصلحت سے دور معلوم ہوتا ہے۔''

''تو تمھاری رائے ہے کہ میں یہ دعوت مسترد کر دوں؟''

''نہیں....'' اس نے نہیں کی 'ہیں' کو ذرا کھینچ کر کہا، پھر چپ ہو گئی، اور ایک لمحہ بعد بولی، ''سوال یہ بھی ہے کہ مالی اعتبار سے کیا ہمیں اعتماد الدولہ کے فیوض و انعام کی ضرورت ہے؟''

''ضرورت ابھی تو نہیں۔ لیکن تم خود ہی کہتی ہو کہ زمانہ مساعد نہیں اور ہم جیسوں کا تو مساعد بالکل نہیں۔

پھر گاڑھے وقت کے لیے جتنا رکھ کیں رکھ لیں تو کیا برائی ہے؟''

''یہی کہ....'' وہ چپ ہوگئی، پھر گویا ہمت کر کے بولی، ''جنگل میں جس پیڑ پر شہد ہوتا ہے، وہیں ریچھ بھی آ جاتے ہیں....''

''لیکن بے سروسامانی میں کوئی تحفظ نہیں۔''

''اماں یہی تو میری مشکل ہے،'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی، ''ہمارے لیے نہ جلوت اچھی نہ خلوت اچھی۔''

''لیکن ہر چیز پر نظر کر کے دیکھو تو کثرت ساز وسامان بہتر ہے قلت سے۔ اگر زہرۂ مصری نے میری وجہ سے اتنی دولت نہ کمائی ہوتی، اور اس کا ایک ذرا سا حصہ میں لے کر نہ نکلتی تو میں اور تمھارے باپ بھیک مانگ کر اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر شغال وسگ سے بدتر موت مرتے،'' خانم بزرگ نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

نورالسعادۃ سہم گئی۔ ''میں آپ کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہی۔''

''نہیں۔ لیکن ضرورت سے زیادہ لاونعم کی بھول بھلیاں میں پڑنے والے کو راستہ اکثر نہیں ملتا۔ ہمیں حقیقت کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے۔''

بات کسی فیصلے کے بغیر ختم ہوگئی۔ اگلی صبح کو نورالسعادۃ نے پہل کی۔

''اماں ہندوستان کیسا ملک ہے، اور دہلی کیسا شہر ہے؟''

''اگر وہاں نہیں جانا تو یہ سوال غیر ضروری ہے۔''

اس بار نورالسعادۃ کی فطری تیز مزاجی بروئے کار آئی۔ ''اماں آپ نہ بات سنتی ہیں، نہ کھل کر کچھ کہتی ہیں۔''

''تو تم کھل کر کہو۔ میری بات تو تم سمجھنا شاید نہیں چاہتیں۔''

''میں اور آپ کی بات نہ سمجھوں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ چند دن پہلے یا چند ہفتے ہی کے بعد دہلی سے مراجعت کیا ضرور ہے۔''

لبیبہ خانم سناٹے میں آ گئی۔ دہلی سے مراجعت ضروری نہیں، ادھر اس کا دھیان ہی نہ گیا تھا۔

''مستقبل جیسا یہاں نظر آ رہا ہے، اس سے بدتر تو شاید وہاں نہ ہو اور دہلی سنتی ہوں بہت بڑا شہر ہے۔ ہمارے ہم زبان اور ہم مشرب بھی دہلی میں، اور کوئی شہر دہلی کے مشرق میں کلکتہ ہے، وہاں بہت ہیں۔ وہاں تو

ہمارے اسقف اعظم بھی رہتے ہیں۔‘‘

’’یہ سب تم نے کہاں سنا؟‘‘

’’اماں، کتابیں اور سفرنامے اور آئند و روند، ان سے بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔ ہندوستان تو بہت ہی بڑا ملک ہے، اور دولت کی تو وہاں اس قدر فراوانی ہے کہ ہماری شاہ جم جاہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ بہادر وہاں سے اتنا لے کے آئے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔‘‘

’’تمھیں دولت سے اتنا لگاؤ کب سے ہوگیا؟‘‘ لبیبہ خانم ذرا چڑ کر بولی۔

’’کل تک تو آپ ہی مجھے یہ سبق سکھا رہی تھیں.... لیکن معاملہ دولت کا نہیں اماں،‘‘ نورالسعادۃ کا بھی لہجہ کچھ تیز ہوا۔ ’’معاملہ امکانات کا ہے۔ آپ میرے لیے اتنی متفکر رہتی ہیں۔ وہاں ملک کے، مختلف قوموں اور طرزوں کے لوگ ہیں۔ اصفہان تو دہلی کا پاسنگ بھی نہیں۔‘‘

’’تو کیا میری بیٹی اصفہان سے اکتا گئی؟‘‘ لبیبہ خانم کا لہجہ کچھ شگفتگی مائل تھا۔

’’اماں جان یہ مذاق کا وقت نہیں۔‘‘ نورالسعادۃ جب دل سے ماں سے خفا ہوتی تو اسے ’اماں‘ کی جگہ ’اماں جان‘ کہتی تھی۔

’’کل تک ہمیں ان رائے صاحب کو جواب دینا ہے اور اپنے سارے حالات کو دیکھ سمجھ کر جواب دینا ہے۔ کیا پتا یہ ایک موقع ہمیں اللہ نے فراہم کر دیا ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ مجھے اصفہان سے لگاؤ کیوں ہو؟ یا کہیں سے لگاؤ کیوں ہو؟ یہ میرا وطن نہیں۔ تبریز مجھے یاد بھی نہیں۔ ہمارا اصل وطن، جیسا کہ آپ بتاتی ہیں کہیں بہت دور مغرب کے ایک ملک میں ہے جسے آپ نے ابھی چار پانچ سال کی عمر کے بعد نہیں دیکھا۔ ایک طرح سے ہم خانہ بدوش ہی تو ہیں۔ شاید دہلی ہمیں گھر دے دے۔‘‘ اس کے لہجے میں آرزو کا عجب سا حزن تھا۔

’’ہاں....‘‘ لبیبہ خانم نے لمبی سی ہاں کی۔ ’’ہو تو سب کچھ سکتا ہے۔‘‘ اچانک اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ نخ جوان کے زلزلے کی تباہیوں کے مناظر اس کے سامنے یوں تھے گویا کل کی بات ہو۔

نورالسعادۃ کچھ سمجھی نہیں۔ لیکن ماں کے آنسو دیکھ کر وہ خود بھی رو پڑی۔ ’’اماں آپ خفا نہ ہوں۔ آپ چاہیں تو ابھی انکار کہلا دیں۔‘‘

’’نہیں، یہ بات نہیں، میری منی بیٹی۔‘‘ پھر لبیبہ خانم نے کچھ نہ کہا۔ نورالسعادۃ کو بھی لب کشائی کا دم نہ تھا۔ لیکن شام ڈھلتے پھر بات شروع ہوئی۔ لبیبہ خانم کا مزاج اس وقت خلاف توقع بہت شگفتہ تھا۔ بات میں

پہل بھی اسی نے کی۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم وہاں جا کر کچھ طویل مدت قیام کر کے حالات کا جائزہ لیں۔''

نورالسعادۃ نے ماں کو شگفتہ رو دیکھا تو خود بھی کھل اٹھی۔ ''جی آپ درست کہتی ہیں اماں۔ کچھ دن رہ کر حالات دیکھ لیں اور شرط یہ رکھیں کہ اگر ہم نے واپسی کی ٹھانی تو ہمیں بحفاظت اصفہان پہنچانے کا ذمہ اعتماد الدولہ بہادر کا ہوگا۔''

''ہاں، یہی کچھ میں بھی سوچ رہی تھی۔ لیکن....'' وہ متفکر ہو کر چپ ہوگئی۔

''ارے، آپ پھر محزوں ہوئی جاتی ہیں۔ اب کیا ہوا؟''

اچانک لبیبہ خانم کے چہرے پر خدا جانے کہاں سے اتھاہ غم ٹوٹ پڑا۔ اس بار وہ صرف آنسوؤں سے نہیں روئی۔ ہاتھوں میں منھ چھپا کر اس طرح سسکیاں لینے لگی کہ نورالسعادۃ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ اٹھی کہ کسی خادمہ کو بلائے، لیکن گھبراہٹ میں ماں کی پلنگ کی پٹی سے ٹکرا کر اس طرح گری کہ ماتھے سے خون جاری ہوگیا۔

بیٹی کو زخمی دیکھ کر لبیبہ خانم نے خود کو کسی طرح سنبھالا، بیٹی کو اٹھایا، پیار کیا۔ چوٹ پر خوشبودار مرہم رکھ کر ہلکی سی پٹی باندھی۔ پھر بولی:

''غم نہ کرو بیٹی۔ مجھے اس وقت اپنا ایک عہد یاد آگیا تھا۔ تبریز چھوڑتے وقت میں نے تمھارے باپ کی قبر پر وعدہ کیا تھا کہ مرنے سے پہلے ایک بار ان کے مزار کی زیارت کو پھر آؤں گی۔ اگر ہم دہلی چلے گئے تو پھر وہ وعدہ کیوں کر پورا ہوگا؟ اور اگر پورا نہ کیا تو تمھارے باپ کو کیسے منھ دکھاؤں گی؟'' وہ پھر بے اختیار رو پڑی۔

نورالسعادۃ نے ماں کی کمر اور گردن میں ہاتھ ڈال کر اسے یوں چمکارنا اور پیار کرنا شروع کیا گویا وہ ماں ہو، اور خانم بزرگ اس کی بیٹی ہو۔

''میری اماں جانی،'' اس نے ماں کو اپنے سب سے زیادہ محبت بھرے طرز سے مخاطب کیا۔ ''میں نے تو انھیں گویا دیکھا بھی نہیں، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہر اس بات کی تائید کرتے جس میں میری اور آپ کی بھلائی کا کچھ بھی امکان ہوتا۔ اور یہ کون کہتا ہے خدانخواستہ آپ کی عمر....'' شدتِ گریہ سے اس کا گلا بھرا گیا، ''ختم ہونے کو آئی۔ دہلی اور تبریز کے درمیان آمد و رفت کوئی بند تھوڑی ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں آپ کے ساتھ

تبریز جاؤں گی....'' اب وہ زور زور سے روئی، ''اور ان کے مزار سے لپٹ کر روؤں گی۔''

اگلے دن شام کو جب رائے کشن چند باریابی کے لیے حاضر ہوا تو یہ معلوم کر کے اس کا دل بیٹھ گیا کہ خانم بزرگ سے ملاقات اِس بار نہ ہوگی۔ ایک تو نہ ملنے کا غم، اور دوسرا یہ خوف کہ جواب شاید نفی میں ہو۔ بہرحال، وہ پہلے کی سی تکریم کے ساتھ دیوان خانے میں پہنچایا گیا تو دیکھ کر متعجب ہوا کہ خانم بزرگ تو وہاں موجود تھی، اور بالکل سابق کے انداز میں صندلی پر متمکن تھی۔ اس کے منھ سے کلمۂ حیرت نکلنے ہی والا تھا کہ اس کو محسوس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کسی مزید غلط فہمی میں مبتلا ہوتا، نورالسعادۃ نے سروقد ہو کر اس کا استقبال کیا تو اس نے دیکھا کہ آج کی میزبان کی قامت خانم بزرگ سے زیادہ ہے، اور عمر بہت کم۔ پھر یہ بھی تھا کہ میزبان کے بال بہت گھنے چوٹی کی صورت میں اس کے زانو تک پہنچے ہوئے تھے۔

''تسلیمات عرض کرتی ہوں۔ میرا نام نورالسعادۃ ہے۔ اماں نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کروں۔ تشریف رکھیے۔'' آواز بھی خانم بزرگ جیسی تھی، لیکن بچپن کا ذرا سا الھڑ پن لیے ہوئے، اس لیے اور بھی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ رائے کشن چند نے لبیبہ خانم کو پہلے نہ دیکھا لیا ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ اس نے نورالسعادۃ جیسی حسینہ کوئی اور نہ دیکھی تھی۔ اب اس سے پوچھا جاتا تو وہ کہتا کہ اس نے خانم بزرگ سے بڑھ کر حسین عورت، اور نورالسعادۃ سے بڑھ کر حسین لڑکی نہ دیکھی تھی، اور نہ آئندہ ہی اس کا امکان تھا۔

رائے کشن چند اخلاص نے اپنی حیرت اور مایوسی کو چھپانے کی پوری کوشش کرتے ہوئے جھک کر نورالسعادۃ کو دوبارہ سلام کیا اور ''بہت خوب، حاضر ہوتا ہوں'' کہہ کر جوتیاں اتار کر پرسوں والی ہی جگہ پر بیٹھ گیا۔ نورالسعادۃ کی تمکین، اور تمکنت میں نوعمری کا رنگ کچھ اس طرح آمیز تھا کہ کشن چند اخلاص کی سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ بات خود شروع کرے، یا اس طرف سے مخاطبت کا انتظار کرے۔

''یہ فرمائیں کہ یہاں سے دہلی تک کے منزلیں ہوں گی؟''

نورالسعادۃ کے منھ سے یہ سوال سن کر اخلاص کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس نے ذرا رک کر کہا، ''تیس منزلیں ہیں۔'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لڑکی سے اس کا طرزِ مخاطبت کیا ہو۔ نورالسعادۃ شاید اس کے دل کی بات بھانپ گئی، بولی:

''آپ مجھے نور خانم کہہ سکتے ہیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ دہلی چلوں گی۔''

کشن چند کو اپنا بدن پھول سا ہلکا، لیکن دل پتھر سا بھاری معلوم ہوا۔ اتنی بڑی مسرت اور اتنی بڑی ذمہ داری بہ یک وقت اٹھانے کا اس کے لیے پہلا موقع تھا۔

ایک ایک کر کے تفصیلات سب طے ہوئیں۔ اخلاص نے اعتماد الدولہ کی طرف سے، اور اپنی طرف سے بھی، ہر بات منظور کی۔ انعام اور معاوضے کی کوئی بات نہیں، لیکن اس نے صاف اشاروں میں یہ کہہ دیا کہ توقع سے بہت زیادہ ہوگا۔ اس نے بر سبیلِ تذکرہ بتایا کہ بھبانئ فیل سوار نامی ایک مطربہ کو انھیں اعتماد الدولہ نے ایک بار ستر ہزار روپے کے زیور، ظروف طلائی، اور اقمشہ نذر کیے تھے۔

تھوڑی سی گفت وشنید کے بعد طے پایا کہ اب سے پانچویں روز، دن چڑھے خانم بزرگ کا قافلہ عازمِ ہند ہوگا:

تا بوئے گلے سلسلہ جنبان نسیم است
بر ما رہ آمد شد بستان نہ تواں بست
صائب پرو بالے بکشا موسم ہند است
دل را بہ تماشائے صفاہاں نتواں بست

ملازمین جو ساتھ چلنا چاہیں گے، ساتھ ہوں گے۔ جو نہ چلنا چاہیں گے، لبیبہ خانم کے دولت کدے پر حسبِ معمول مقیم رہیں گے اور نگہبانی کی خدمت انجام دیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ لبیبہ خانم کے قافلے کو گھر چھوڑے ہوئے آج پانچواں ہفتہ تھا۔ مقبول اور چلتی ہوئی شاہراہ تو طہران اور مشہد ہو کر کوہ ہندوکش کی دشوار گذار چڑھائیاں پار اتر کر ہرات اور پھر کابل پہنچ کر کابل تا دہلی کی شاہراہ بابری سے مل جاتی تھی۔ لیکن طہران اور مشہد دونوں بہت سرد علاقوں میں واقع ہیں، اور کوہ ہندوکش میں داخل ہو کر یہ شاہراہ کئی جگہ پر چار ہزار گز تک بلند تھی۔ سردی کا موسم اس سے مستزاد۔ اندیشہ تھا کہ نور السعادۃ کی بیماری پھر نہ عود کر آئے۔ لہٰذا ساربانوں اور راہبروں کے مشورے سے یہ قافلہ سیدھا جنوب کو چلا۔ یزد، بافق، کرمان اور زاہدان سے ہو کر وہ دشتِ لوط کے جنوب بعید کی سرحد سے بالکل لگے ہوئے، اور اب مشرق کی سمت میں سفر کرتے ہوئے افغانستان میں داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے دریائے ہلمند پار کر کے قندھار

میں کئی دن قیام کیا، کہ دشتِ لوط اور اس کے بعد کے سفر کی تکان نہ صرف دور ہو جائے بلکہ آئندہ سفر کے لیے وہ تازہ دم بھی ہو سکیں۔ قندہار کے بعد انھیں افغانستان کی مشکل راہوں کا سامنا تھا۔ اب وہ غزنین، کابل، جلال آباد، پیشاور اور لاہور ہوتے ہوئے سرہند پہنچے۔ یہاں ان کا قافلہ دہلی سے صرف چار دن کی راہ پر تھا۔

رائے کشن چند اخلاص اپنے کو بہ نوابی کو لیے تمام راہ ساتھ ساتھ رہا تھا، اور خانم بزرگ کے خدم و حشم ان کے گرداگرد تھے۔ رائے اخلاص ایک لحظے کو بھی لبیبہ خانم کے محافے سے الگ نہ ہوتا۔ لبیبہ، نورالسعادۃ، اور رائے اخلاص کی بات چیت ہندی میں ہوتی۔ وہ دونوں بہت جلد ٹوٹی پھوٹی ہندی بولنا سیکھ گئی تھیں۔ سرہند سے گذرتے وقت تک وہ ہندی کو کم و بیش اچھی طرح سمجھنے لگی تھیں، اگرچہ گفتگو کرنے میں انھیں ابھی تکلف تھا۔ ایک دن اخلاص نے انھیں یہ شعر سنایا:

تجھ بن دماغ صحبت اہل چمن نہ تھا
گل وا ہوئے ہزار ولے ہم نہ وا ہوئے

’’اے سبحان اللہ،‘‘ خانم بزرگ اور نورالسعادۃ نے ایک ساتھ کہا۔

’’یہ کس کا شعر ہے؟‘‘ لبیبہ خانم نے پوچھا۔ ’’یہ تو ہمارے میرزا ولی اصفہانی یا بابا فغانی شیرازی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔‘‘

’’یہ شعر ایک جوان پیر صفت کا ہے۔ عجب وارستہ اور عاشق مزاج، خوددار و خودنگر شخص ہے۔ نام اس کا محمد تقی ہے، تخلص اس کا میر ہے۔ ہم سب اسے میر صاحب یا میر جی کہتے ہیں، اگرچہ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ اس کم عمری میں بڑے بڑے استادوں کو خود سے کم تر گردانتا ہے۔‘‘

’’آپ اسے جانتے ہیں؟‘‘ نورالسعادۃ نے پوچھا۔

’’جی ہاں۔ دہلی میں ہر شاعر ہر شاعر کو پہچانتا ہے، باوجود اس کے کہ وہاں کم و بیش ہر گھر میں ایک دو شاعر ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ شعر گوئی ہمارے یہاں مشغلۂ نفیس و ظریف مانی جاتی ہے۔‘‘

رائے اخلاص نے نورالسعادۃ کو پہلی بار کسی ہندوستانی چیز میں اس طرح دلچسپی لیتے دیکھا تھا۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ یہ شعر نورالسعادۃ کے دل میں اتر کر کسی نامعلوم طریقے سے اپنی جگہ بنا گیا ہے۔

’’میر صاحب کے ایک دو شعر اور سنیے گا؟‘‘ اس نے کہا۔

''اگر زحمت نہ ہو۔ اس کے ایک شعر نے تو اشتیاق بڑھا ہی دیا،'' نور السعادۃ بولی۔

اخلاص نے پڑھنا شروع کیا:

میں کون ہوں اے ہم نفساں سوختہ جاں ہوں
اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں
جلوہ ہے مجھی سے لب دریائے سخن پر
صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں
اک وہم نہیں بیش مری ہستی موہوم
اس پر بھی تری خاطر نازک پہ گراں ہوں
خوش باشی و تنزیہہ و تقدس تھے مجھے میر
اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں

''سبحان اللہ،'' خانم بزرگ نے کہا۔ ''لگتا ہے مولوی معنوی، بابا فغانی، اور میرزا صائب کی روحیں ایک قالب میں حل ہو گئی ہیں۔''

''یہ میر صاحب تو دیکھنے اور ملنے کے قابل معلوم ہوتے ہیں۔'' نور السعادۃ بھی بے ساختہ بول اٹھی۔

''جہاں آپ جیسے کاملان فن ہوں گے، وہاں یہ شخص خود ہی حاضر ہو جائے گا۔'' رائے کشن چند نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ خدمت کا ایک اور موقع ہاتھ آیا۔ ''ورنہ میں اسے خود آپ کی زیارت اور قدم بوسی کے لیے لے آؤں گا۔''

دہلی میں ان کا داخلہ کشمیری دروازے سے ہوا۔ سب سے پہلی چیز جو خانم بزرگ نے محسوس کی وہ شہر کی وسعت تھی۔ ابھی شاہجہاں آباد کی فصیل کا پتا نہ تھا، لیکن کشمیری دروازے کے بھی بہت پہلے ہی سے شہر کی گہما گہمی، بازاروں میں خلقت کا ہجوم، مسجدوں میں اذانیں، مندروں میں گھنٹیاں، سب موجود تھیں۔ تیس ہزاری جیسا وسیع و عریض باغ بھلا کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔ شہر پناہ شاہجہاں آباد پہنچتے پہنچتے انھیں کئی

گھڑیاں لگیں۔ شہر پناہ پر کوتوالی کے سپاہیوں نے ان سے کچھ سوال جواب کیے۔ اعتماد الدولہ کا نام سنتے ہی سپاہیوں نے مزید پوچھ گچھ نہ کی اور سارے غیر ملکیوں کو اسی دم پر چہ راہداری لکھ دیا۔

شاہجہاں آباد کی شہر پناہ پار کر کے وہ سرائے جہاں آرام بیگم کی بلند اور خوشنما عمارت سے ہوتے ہوئے پھاٹک حبش خان میں پہنچے جہاں اعتماد الدولہ کی ایک آراستہ حویلی ان کے لیے تیار کر دی گئی تھی۔ لبیبہ خانم کو ایک دو روز یہ سمجھنے میں لگے کہ تغلق آباد، بدر پور سے لے کر شاہجہاں آباد تک دہلی کئی شہروں کا مجموعہ ہے، اور صرف شاہجہاں آباد میں کوئی پانچ لاکھ لوگ رہتے ہیں، اور ایک لاکھ یا کچھ کم لوگ ہر روز شہر میں داخل ہوتے، اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں یہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ رائے کشن چند اخلاص حویلی تک پہنچا کر ان سے رخصت ہو لیا تھا، لیکن وہ صبح شام حاضری ضرور دیتا۔ اعتماد الدولہ سے ابھی خانم بزرگ کی ملاقات نہ ہوئی تھی، اس لیے یہ کہنا ممکن نہ تھا کہ لبیبہ خانم اور اعتماد الدولہ کے مابین کس قسم کے تعلقات قائم ہو سکیں گے اور رائے کشن چند کی مجال نہ تھی کہ کسی ایسی ہستی سے کوئی لگاؤ رکھنے کی آرزو کرے جو اعتماد الدولہ کی منظورِ نظر ہو سکتی تھی۔ ورنہ خود اخلاص کی آنکھوں میں شوق اور آرزو کی جھلملاہٹ اس قدر واضح ہو چلی تھی کہ خانم بزرگ کے اپنے لوگوں میں کسی کو بھی شک نہ رہا تھا کہ رائے کشن چند ان کا پرستار ہے۔

اعتماد الدولہ اور خانم بزرگ کی پہلی ملاقات بہت خوش گوار ماحول میں شروع ہوئی اور طرفین کو ایک دوسرے کا خلوص و احترام فوراً حاصل ہو گیا۔ اعتماد الدولہ قمر الدین خان نصرت جنگ چھوٹے قد، دوہرے لیکن کسرتی بدن کے شخص تھے۔ وہ بے حد خلیق اور اپنے زمانے کے دیگر امرا کے مقابلے میں متشرع اور سادہ مزاج تھے۔ صوفیا کے سلسلۂ سہروردیہ کے بنیاد گذار حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ان کے جدامجد تھے۔ ان کے خاندان میں علم و فضل اور دُنیاوی ثروت و جاہ کی وراثت کئی پشتوں سے چلی آ رہی تھی۔ وہ چن قلیچ خان آصف جاہ نظام الملک کے سگے بھائی تھے۔ ہندوستان میں ان کے جداعلیٰ میر بہاء الدین کی آمد اورنگ زیب عالم گیر کے دورِ سلطنت میں ہوئی تھی۔ میر موصوف کو اورنگ زیب نے غازی الدین خان بہادر کے خطاب سے نوازا اور ان سے بڑی بڑی خدمات لیں۔ تب سے یہ خاندان اپنی شرافت و نجابت اور حُسنِ کارکردگی کے باعث سلطنت مغلیہ کے نمایاں عمائد کا خاندان رہا تھا۔

امیر الامرا سید حسین علی خان کی شکست اور موت، اور اس کے بھائی قطب الملک سید عبداللہ خان [تاریخ ہند کے بدنام سید برادران، جو ''بادشاہ گر'' کہلاتے تھے، مرتب] کی معزولی کے بعد شاہ فلک بارگاہ محمد

شاہ بہادر غازی، شہنشاہ دہلی نے قمر الدین خان کے باپ میر محمد امین خان کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر مقرر کیا [1130ھ، مطابق 1720ء، مرتب]، لیکن محمد امین خان جلد ہی واصل بحق ہوئے۔ ان کے بعد بادشاہ نے قمر الدین خان کو اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خان بہادر نصرت جنگ کے خطابات کے ساتھ وزیر مقرر کیا۔ [1137ھ، مطابق 1724ء، مرتب]

قمر الدین خان نے تب سے اپنی شہادت [1748ء، مرتب] کے وقت تک منصبِ وزارت کو بڑی خوبی اور نیک نامی کے ساتھ نباہا۔ ان کے زمانے میں منصور علی خان صفدر جنگ عرف مرزا مقیم، اور عماد الملک غازی الدین خان سوئم [جو نظام الملک آصف جاہ کا، اور اس لیے قمر الدین خان کا بھی نبیرہ تھا، مرتب] جیسے اولوالعزم، لائق، لیکن بے ضمیر اور سنگ دل امرا کو سر اٹھانے کا موقع بالکل نہ مل سکا تھا۔ قمر الدین خان کے بعد صفدر جنگ نے احمد شاہ جیسے باصلاحیت اور ہمہ صفت موصوف بادشاہ کو، جو محمد شاہ کے بعد تخت نشین ہوا تھا، بالکل بے اثر کر کے رکھا اور بالآخر اسے اندھا کرا کے تخت سے اتار دیا۔ [1754ء، مرتب] عماد الملک غازی الدین خان نے ایک قدم اور آگے جا کر احمد شاہ کے جانشین عالم گیر ثانی کو مروا ہی دیا [1759ء، مرتب] سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور ذلت و ناکامی کی موت کے اصل ذمہ دار جو سچ پوچھیے تو یہی دونوں صاحبان ہیں۔

لیکن یہ سب باتیں ابھی پردۂ خفا میں تھیں۔ نادر گردی اور نادر شاہی لوٹ کے باوجود دہلی کا تخت روشن اختر محمد شاہ پادشاہ غازی [جنھیں انگریز کے پٹھو مؤرخین نے 'محمد شاہ رنگیلا' بنا دیا، مرتب] کے زانو تلے ابھی مضبوط تھا۔ آصف جاہ نظام الملک اور اعتماد الدولہ خان کی شہرت کے آفتاب نصف النہار پر تھے۔

لیبیہ خانم کے سامنے اعتماد الدولہ نے کوئی شرطیں نہ رکھیں۔ بس یہ کہا کہ شادی کے موقعے پر جو محفلیں ہوں گی ان میں سے چند میں آپ کو غزل سرائی کی زحمت دی جائے گی۔ اس کے علاوہ آپ ہر طرح آزاد ہیں۔ یہ حویلی، اور اس کا عملہ فعلہ، سب آپ کی سرکار کے ملازم ہیں، لیکن تنخواہ انھیں ہماری سرکار سے ملے گی۔ رائے کشن چند اخلاص ہمہ وقت میری طرف سے آپ کی پیشی میں رہیں گے۔ شادی کے فرائض سے فارغ ہونے کے بعد میں آپ کو مزید تبادلۂ خیال کے لیے زحمت دوں گا۔

"ہاں، بس ایک درخواست، یا مشورہ، قبول ہو تو بندے کو عین مسرت ہوگی،" اعتماد الدولہ نے ارشاد کیا۔

"کنیز ہمہ تن گوش ہے۔" خانم بزرگ نے جواب دیا۔

''ارمنی رسم کے مطابق تو آں جناب کا لقب خانم بزرگ، اور صاحب زادی سلمہا اللہ تعالیٰ کا اسم سامی نورالسعادۃ، بہت مناسب ہیں۔ لیکن ملکِ ہند میں ایسے نام صرف امرا اور سلاطین کی مخدرات کے لیے ٹھیک سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں ان ناموں کو فی الحال ترک کر کے اپنے لیے بڑی بائی صاحب، اور صاحب زادی کے لیے نور بائی صاحب نام یا القاب منتخب فرمائے جائیں تو خوب ہوگا۔''

خانم بزرگ ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئی اور اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اعتمادالدولہ تو مجسم فراست تھے، انھوں نے خانم بزرگ کے چہرے پر کوئی اثر پیدا ہونے کے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ ناراض ہونے والی ہے۔ لیکن اس معاملے میں مفاہمت کا کوئی امکان نہ تھا۔ یہاں کی شہزادیاں اور امیرزادیاں کبھی گوارا نہ کرتیں کہ ان کے سوا کسی اور کے نام اس امیرانہ اور سلطانی ٹھاٹھ کے ہوں۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ اگر خانم بزرگ نے یہ تجویز نہ مانی تو انھیں انعام اور عزت گو ویسی ہی دی جائے گی جس کی وہ مستحق تھیں، لیکن ان سے کسی محفل میں شرکت کے لیے نہ کہا جائے گا۔

یہ بڑا کڑوا گھونٹ تھا۔ لیکن لیبیہ خانم بھی سمجھتی تھی کہ نصرت جنگ نے یہ تجویز یوں ہی نہ رکھی ہوگی۔ پھر بھی، امتحاناً اس نے کہا:

''اعتمادالدولہ بہادر، میں یہاں اپنا نام گنوانے نہیں، اسے بلند کرنے آئی تھی۔''

''میری بھی مجبوری آپ سمجھتی ہوں گی،'' اعتمادالدولہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ غور فرمائیں۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔''

''اعتمادالدولہ بہادر، میں دہلی میں آپ کی مہمان ہوں، لیکن اپنے گھر میں خانم بزرگ ہی رہوں گی۔''

''چشم ماروشن دل ماشاد،'' اعتمادالدولہ نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھا، تھوڑا جھکے، پھر داہنے ہاتھ سے فرشی سلام کیا۔ اس کے پہلے کہ وہ مڑتے، ان کے خواصی نے ان کے پاؤں میں جوتیاں پہنا دیں۔ لیبیہ خانم نے فوراً لب فرشی تک آکر سات فرضی سلام کیے۔ ''سطوت وشوکت روز افزوں، عمر و دولت و اقبال زیادت باد۔ دوبارہ بندی کو سرفراز فرمائیں، میں تا عمر ممنونِ کرم رہوں گی۔'' یہ باتیں کہتے کہتے دونوں دروازے سے باہر آگئے۔ سب گفتگو اس نزاکت کو ملحوظ رکھ کر ہوئی کہ نہ اعتمادالدولہ کی پیٹھ خانم بزرگ کی طرف ہو، اور نہ انھیں الٹے پاؤں دیوان خانے سے باہر آنا پڑے۔

اس طرح کوئی بات وضاحت سے کہے بغیر طرفین نے مان لیا کہ دہلی کے عوام وخواص لیبیہ خانم اور

نورالسعادۃ کو خواہ کسی نام سے پکاریں، لیکن اپنی چہار دیواری کے اندر انھیں خانم بزرگ اور نور خانم ہی کہا جائے گا۔

صبح ابھی ہوئی نہ تھی، لیکن فجر کی اذان ہوئے کچھ عرصہ ہو چکا تھا۔ نمازی گھروں سے نکل کر تیز تیز محلے کی مسجد کو جا رہے تھے۔ حوض قاضی کا چھوٹا سا محلہ ابھی سو ہی رہا تھا۔ صرف چند خاکروب کان منھ لپیٹے، موٹی چادریں اوڑھے اپنے کام میں لگنے کو تیار ہو رہے تھے۔ سردی اس سال تھی بھی بہت سخت، اور حوض قاضی کی مسجد کے سامنے سیدھی سڑک خانم کے بازار سے آتی تھی۔ پوری سڑک پر دورویہ بلند عمارتوں کے باعث سرنگ ہوائی کا سالطف اکثر پیدا ہو جاتا تھا، یعنی باہر سے آتی ہوئی ہوا اس طرف عام سے کچھ زیادہ تیزی سے بہنے لگتی تھی۔

حوض قاضی کی مختصر سی نہر کا پانی برف ہو رہا تھا۔ لیکن ایک نوجوان مسجد کے پائیں سے نکلا۔ اس کے قدم کبھی سست پڑتے، کبھی تیز، اور اس کی آنکھوں میں رات کا خمار تھا۔ وہ ہاتھ میں کاغذوں کا ایک جنگ لیے ہوئے تھا، اسے لبِ نہر رکھ کر وہ پانی پینے کے لیے جھکا۔ یہ شدید سردی، اور یہ سرداب، اور علی الصباح، بھلا کون پانی پینے اٹھتا ہے۔ لیکن نوجوان کو شاید بھوک لگی تھی، اور وہ اسے ٹھنڈے پانی سے مارنا چاہتا تھا یا پھر اس کا خلط ہی اس درجہ سوداوی تھا کہ اسے اس عالم میں بھی پیاس لگتی تھی۔

نہر میں چلو ڈال کر اس نے پانی اٹھایا ہی تھا کہ آواز آئی:

''اے میاں صاحب زادے! ارے میاں، تم محمد تقی میر تو نہیں ہو؟'' پوچھنے والا ایک عمر رسیدہ، شریف اور باوضع شخص معلوم ہوتا تھا۔ وہ وزیر الممالک نواب قمر الدین خان اعتماد الدولہ کی حویلی کے محافظ خانے سے نماز کے لیے نکلا تھا۔ حویلی مسجد سے کوئی پچاس قدم پر تھی، لیکن اس وقت وہاں صرف چند روشنیاں جل رہی تھیں۔

''میں محمد تقی ہوں تو سہی۔ پھر آپ کو کیا؟'' نوجوان نے کچھ تیز لہجے میں کہا۔ بائیس تیس کی عمر، کشیدہ قامت، دبلا بدن، لیکن چوڑی کلائیاں، خمار آلود تیز آنکھیں جو کچھ خاص بڑی تو نہ تھیں، لیکن ان میں غضب کی زندگی اور چمک تھی۔ ہلکی ڈاڑھی، ٹھوڑی پر اور بھی ہلکی، لیکن گھنی، چڑھی ہوئی مونچھوں کے باعث چہرہ بھرا بھرا لگتا تھا۔ ٹوپی یا چیرہ وغیرہ سے بے نیاز سر کے بال گھنے اور پٹے دار، بیچ میں مانگ کی روشن لکیر۔

ورنہ سارے بال سر کی پشت پر اس طرح پڑے ہوئے تھے گویا انھیں کھینچ کھینچ کر سیدھا کیا گیا ہو۔ گلے میں ہلکی بانات کا انگرکھا، اس کے نیچے اونی کُرتا۔ بدن پر موٹے مشروع کا جامہ، پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ کمر میں تیلیا رنگ کا دوپٹہ، جس سے کٹار آویزاں تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ غالباً بے خوابی اور تھکن سے ستا ہوا سا تھا، اچانک یوں پکارے جانے پر چڑچڑاہٹ اس پر مستزاد۔ ورنہ اس کے منھ کے گوشے تھوڑے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے، اور دونوں آنکھوں کے کونوں پر شکنیں تھیں۔ یہ دونوں باتیں ظریف الطبع ہونے کی علامت تھیں۔ مجموعی حیثیت سے اس کی پوری شخصیت میں عجب دل آویزی تھی، دیکھنے والوں کے دل خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچتے تھے۔ لہجے میں دہلی کے فوری جنوب میں بولی جانے والی برج بھاشا کا لوچ خاصا نمایاں تھا، اور اس کے منھ پر بہت بھلا لگتا تھا۔

اجنبی شخص اب قریب آ گیا تھا۔ ''مجھے کچھ نہیں میاں صاحب۔ تم مجھے نہیں جانتے، لیکن تمھارا سودائیانہ انداز تو مشہور ہے اور تمھارے شعر اس سے زیادہ۔'' محمد تقی کے چہرے پر چھوٹی سی شرمندہ مسکراہٹ آئی۔ ''میں نے تمھیں مشاعروں میں دیکھا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ نواب رعایت خان بہادر بن ظہیر الدولہ نواب عظیم اللہ خان تمھارے کلام کے، اور تم سے ملاقات کے مداح ہیں۔''

محمد تقی اچانک پھر چڑچڑا گیا۔ ''مشتاق ہیں تو باقاعدہ پرچہ بھیج بلواتے۔ یہ آدھی رات کو شارع عام پر مجھے ٹوکنے کا کیا مطلب؟''

''میاں صاحب تم تو پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتے۔ اچھا دیکھو، مجھے نماز کی دیر ہوتی ہے۔ اتنے تم میرے حجرے میں بیٹھو۔ وہ رہا وزیر الممالک کے محافظ خانے کے اوپر۔ میرا ملازم تمھیں پہچانتا نہیں ہے، میرا نام اسے بتا دینا، علیم اللہ خان مجھے کہتے ہیں۔ میں ابھی آیا۔''

یہ کہہ کر وہ شخص تو لپک جھپک مسجد میں چلا گیا، لیکن محمد تقی کوئی گھڑی اپنے خیالوں میں گم وہیں کھڑا رہا۔ خدا جانے کون بندۂ خدا ہے، اس نے اپنے دل میں کہا۔ نماز کا پابند ہے تو ٹھیک ہی آدمی ہوگا۔ شاید شعر فہم بھی ہو۔ ورنہ آج کل کون کسے پوچھتا ہے۔ رعایت خان بہادر کو میں جانتا نہیں، کوئی خرنا مشخص ہوگا، جیسے آج کے رئیس ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے تو جلاد صفت سوتیلے ماموں کی رفاقت اور مشائعت کو لات ماردی ہے۔ کب تک اپنے اشعار کی اصلاح کے پردے میں ان کے زہر بھرے جملے سنتا، اور کب تک دوسروں کے سامنے ان کے منھ سے یہ سخن سنتا کہ محمد تقی میرے مضمون اڑاتا ہے لیکن نبھا نہیں پاتا۔ مجھے کیا مضامین کی کمی ہے، اور

اگر مضمون اڑاؤں بھی تو کیا ان کے اڑاؤں کہ جن کا کوئی مصرع سست ہوتا ہے تو کوئی چست؟ اور کینہ توزی بھی واللہ ان میں کس قدر ہے۔ میرے عالمِ جنون میں مجھ پر کیا کیا ستم انھوں نے نہ ڈھائے....

''ارے میاں، تم ابھی یہیں سردی میں ٹھٹھر رہے ہو!'' علیم اللہ خان نے مسجد کے دروازے سے ہی آواز دی۔ ''اچھا شاید تکلف محسوس کر رہے تھے۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ میں نماز بھی پوری کر کے آ گیا اور تم وہیں کے وہیں ہو۔''

''چلتا تو ہوں، لیکن ایک التماس ہے،'' محمد تقی میر نے کہا۔

''کہو کہو، کیا معاملہ ہے؟''

''مجھ سے شعر سنانے کو نہ کہیے گا۔''

علیم اللہ نے زور کا قہقہہ مارا۔ ''شاید میری سخن سنجی پر شک ہے۔ صاحب زادے، تم سے شعر سننے کی فرمائش تو اور لوگ کریں گے۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کڑکڑاتے جاڑے میں تم نہر کا یخ پانی کیوں پی رہے تھے۔''

علیم اللہ خان کے حجرے میں انگیٹھی روشن تھی۔ مزے دار گرمی اور گھریلو سا بے تکلف ماحول، محمد تقی کو کھڑے کھڑے ہی جھپکی آنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا، ''معاف کیجیے، شاید کوئی تنکا وغیرہ آنکھ میں چلا گیا ہے۔''

''یہ تنکا نہیں، نیند کی کھٹک ہے میاں صاحب۔ میرا گھر خانۂ درویش ہے اور میرا دل قلبِ بے ریا۔ یہ لو کمبل، اور اس کونے میں پڑ کر سو رہو۔ وہ کیا شعر ہے تمھارا:

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منڈکری سی مار سو رہا''

''یہ شعر آپ نے کہاں سنا؟'' میر نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''یہ شعر تو میں نے ابھی دو دن ہوئے کہا تھا، اور صرف مقطع ہی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ غزل کب پوری کروں گا۔''

''کیوں، کیا تمھیں شعر کہنے میں بہت دیر لگتی ہے؟''

''لگتی بھی ہے اور نہیں بھی،'' میر نے لمبی جماہی لے کر کہا۔ ''کبھی کبھی مطلع یا مقطع پہلے ہو جائے، اور اچھا

نکلے، تو غزل پوری کرنے میں....''

اتنا کہتے کہتے میر زمین پر ڈھیر ہو کر سو گیا۔ نہ معلوم کتنی راتوں کا جاگا تھا، یا گھر کے ماحول میں بے تکلفی اور یگانگت کے فقدان نے اسے اس درجہ نڈھال کر دیا تھا کہ ذرا اُنس کی گرمی پائی تو وہیں کا وہیں سو گیا۔ علیم اللہ خان نے اسے اٹھایا نہیں، اس پر ایک کمبل ڈال دیا اور خود اپنے اوراد و وظائف میں مشغول ہو گیا۔

محمد تقی دن چڑھے تک سویا۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب اس نے خواب میں دیکھا کہ مجھے بڑی زور کی بھوک لگی ہے اور میں کہیں دعوت کھا رہا ہوں۔ خواب دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ کھل گئی۔ واقعی اسے بڑے زور کی بھوک لگی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ علیم اللہ شاید اپنے کام پر جا چکے تھے، لیکن ان کے خادم نے فوراً ہی اندر آ کر کہا:

''تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ نیچے غسل خانہ اور حمام تیار ہیں۔ آپ ضروریات سے فارغ ہو لیں، اتنے میں ناشتہ لگائے دیتا ہوں۔ خان صاحب ایک سوا ساعت میں تشریف لے آئیں گے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ ناشتے کے بعد جناب ان کا انتظار فرمائیں تو عین نوازش ہو گی۔''

جب تک غسل اور ناشتے کے معمولات ادا ہوئے، علیم اللہ خان بھی واپس آ گئے۔

''ماشاء اللہ، صاحب آپ تو خوب سوئے۔ امید ہے اب تازہ دم ہوں گے۔ شاید آپ متفکر ہوں کہ میں یہاں آپ کو کیوں لے آیا ہوں، تو عرض یہ ہے کہ میں نواب رعایت خان کا مصاحب ہوں، اور وہ، جیسا کہ میں نے رات کہا، آپ کے کلام کو نظرِ استحسان سے دیکھتے ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے مزاج میں شوریدگی بہت ہے....''

''شوریدگی نہیں، شوریدہ سری، بلکہ خیرہ سری،'' میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خدا جانے مجھے سب سے لڑنے بھڑنے میں لطف کیوں آتا ہے۔'' پھر اس نے اپنے ترکیب بند سے وہ شعر بڑے سادہ، لیکن من موہنے انداز میں پڑھے:

وہ تشنہ دہن ہوں دل جلا ہوں
لب چش جس کا نہ ہووے دریا
کہتے ہو جسے فلک ہوا ہے
میرے ہی غبارِ دل سے پیدا

کھلتا تو سہی کبھو بلا سے
دل میرا بھی کاش غنچہ ہوتا
وہ خستہ ہوں میں ہی جس کو کہیے
رونق افزائے کوہ و صحرا

"مزاج میں اتنی کڑواہٹ، اور اتنی کم عمر میں، آخر کیوں؟"

"مزاج سے زیادہ یہ معاملہ میری ضد کا بھی ہے خان صاحبِ من،" میر نے کہا۔ "مجھے میر سمجھا ہے کم یاں کسو نے۔ مجھے کسی سے کچھ لینا اچھا نہیں لگتا، خواہ فتوح ہو، خواہ ہدیہ، خواہ احسان۔ لیکن طبیعت میں اتنا استغنا بھی نہیں کہ تنگی محسوس کروں تو بھی خاموش رہوں، کسی پر اپنا حال نہ ظاہر کروں۔ میرے مخمصے کو ابو طالب کلیم بہت پہلے بیان کر گیا ہے۔"

پھر اس نے کلیم کا شعر بڑی قوت کے ساتھ پڑھا:

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سر عالم تواں گذشت

وہ ہنسا لیکن اس ہنسی میں خود پر استہزا بھی شامل تھا۔ "یہ بات تو کلیم کاشانی سے بھی نہ ہوئی، تو مجھ سے کیونکر ہو۔"

"اچھا تو کل رات کا قصہ کیا تھا؟ آپ رات بھر کہاں رہے، اور صبح سویرے اس قدر ٹھنڈا پانی کیوں پی رہے تھے؟"

وہ پھر ہنسا۔ "اگر شاعری کی زبان میں جواب دوں تو یہی کہوں گا کہ سردی میں منھ اندھیرے ٹھنڈا اس لیے پی رہا تھا کہ:

آگ سی سینے میں سلگے ہے کبھو بھڑکی تو میر
دے گی میری ہڈیوں کا ڈھیر جوں ایندھن جلا"

علیم اللہ بڑے غور سے سن رہا تھا، لیکن اس کے منھ سے ارتجالاً نکلا، ''واللہ میاں کیا غضب کا شعر کہا ہے۔''

''ہاں، لیکن عام زندگی کی زبان میں جواب دوں تو یہ کہوں گا کہ میرے پاس لونگ کے چند پھول تھے، میں رات بھر انھیں چباتا رہا تھا۔ زبان اینٹھ گئی تھی۔''

دونوں ہنسنے لگے۔ علیم اللہ خان نے دیکھا کہ میر جب ہنستا ہے تو اس کا چہرہ بالکل بدل جاتا ہے، درشتی کی تھوڑی سی بھی رمق اس پر نہیں رہ جاتی۔ روشن آنکھیں جو ہنسنے میں تھوڑی سکڑ جاتی ہیں، اور بھی تیز چمک دار بن جاتی ہیں۔ سارے بدن میں شگفتگی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے اور صاف لگتا ہے کہ یہ شخص زندگی کا لطف اٹھانا جانتا ہے، ہنسنے ہنسانے سے خوف واقف ہے۔

''مگر یہ شب گردی اختیار کیوں کی تھی، اگر بار خاطر نہ ہو تو پورا حال بتائیں۔''

میر نے ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس کھینچی۔ ''میرے سوتیلے ماموں، بلکہ نام نہاد ماموں کو آپ جانتے ہیں؟''

''کون، نواب سراج الدولہ علی خان آرزو؟ اجی انھیں کون نہ جانے گا؟ عالم بے بدل، جگت استاد، فارسی اور ریختہ دونوں میں ایک عالم ان کے علم اور نظم ونثر کا لوہا مانتا ہے۔''

''بس بس رہنے دیجیے،'' محمد تقی چڑ چڑا گیا۔ ''یہ سب ہوگا اور شاید نہیں بھی ہوگا۔ لیکن وہ شخص انتہائی کینہ پرداز، حاسد اور ہم چومن دیگرے نیست کے مرض کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹوں کا بھی حاسد ہے۔''

''اجی یہ کیا کہتے ہو میاں صاحب! وہ اور چھوٹوں سے حسد کریں، کینہ رکھیں۔ نا صاحب....''

''تو کیا میں جھوٹا ہوں؟'' میر کا پارہ پھر گرم ہونے لگا۔ ''سچ بھی برا وہ جس کو سن کر لوگ کہیں تُو جھوٹا ہے۔ اجی مشفق من، آپ نے وہ مثل نہیں سنی کہ ہاتھی کے دانت....''

''بجا، بالکل بجا، میاں صاحب،'' علیم اللہ نے جلدی سے قطع سخن کیا۔ ''میں کب کہوں ہوں کہ آپ جھوٹ بولتے ہو۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ بات ایسی ہے کہ....''

''بات جیسی بھی ہو، حقیقت یہی ہے۔ آپ مانیں، نہ سہی۔ سنیے ان سوتیلے ماموں صاحب کے کرتوت۔'' لفظ 'سوتیلے' پر خاص زور تھا۔ ''ان کا خاص مشغلہ یہ ہے کہ اپنے سے کم عمر کے شعرا کے کلام میں فی

نکالنا اور ان پر سرقہ کا جھوٹا الزام لگانا۔''

''تعجب، صد تعجب کا مقام ہے،'' علیم اللہ نے زیر لب کہا۔

''مرزا رفیع کو جانتے ہیں آپ؟'' میر نے کسی مشاق بحاث کے انداز میں کہا۔ ''چلیے ان سے پچھوا دیتے ہیں کہ ان پر کیا معاملہ گذرا۔''

''فی الحال آپ ہی سے سن لیتے ہیں میاں۔ آپ کی بات کا بھی اتنا ہی اعتبار ہے۔''

''میں اس وقت وہاں خان آرزو کے دیوان خانے میں موجود تھا۔ آخر رہتا بھی تو وہیں تھا۔ صبح شام ان کے یہاں شعرا جمع ہوتے ہیں، کلام سناتے ہیں۔ داد بیداد کا دور چلتا ہے۔ اس دن میرزا رفیع تشریف لائے، اور آتے ہی مطلع پڑھا:

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

''سب نے حسبِ توفیق تعریف کی کہ تعلیل خوب تھی۔ ہمارے خان علامہ منھ بچکائے بیٹھے رہے۔ جب داد کا زور تھما تو آپ نے فرمایا:

'شعرِ سودا حدیث قدسی ہے
چاہیے لکھ رکھیں فلک پہ ملک'

''کوئی سمجھا کوئی نہ سمجھا۔ ایمان کی یہ ہے کہ میں بھی نہ سمجھا۔ سب ایک دوسرے کا منھ تک رہے تھے۔ جب سب لوگ دل میں خود کو پوری طرح احمق گردان چکے تو آپ نے لب کشائی کی۔ 'صاحب، ہمارے میرزا جی نے تو محمد جان قدسی کو جا پکڑا۔' پھر آپ نے یہ شعر پڑھا:

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرد روئے زمین را

''اور سب لوگ تو ماموں.... ارے توبہ، خان آرزو کی جانب توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ خوب چور پکڑا، لیکن میرزا رفیع تو ایک کائیاں شخص ہیں۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''انھوں نے بھی خوب پٹخنی دی۔''

پھر کچھ توقف کے بعد محمد تقی نے کچھ ثنائیہ، کچھ طنزیہ لہجے میں کہا:

''دل میں تو خوب ہی کٹے ہوں گے، لیکن اوپر اوپر یوں ظاہر کیا گویا ان کو داد ملی ہے۔ بڑھ کر خان صاحب کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا، 'بے شک حضور کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ آپ نے میرے کلام کو بھی حدیث قدسی سے مشابہت دی۔ میں یہ شعر دیوان میں لکھوں گا تو حضور کا یہ قول بھی نقل کروں گا۔''

محمد تقی اور علیم اللہ دونوں ہی اس روداد پر خوب ہنسے اور محمد تقی نے میرزا سودا کے لہجے کی نقل ایسی اتاری کہ علیم اللہ عش عش کر گیا۔ کوئی نقال یا بھانڈ کیا بھلا ایسی نقل اتارتا۔ ایک لمحے کو لگا یہاں محمد تقی میر نہیں، میرزا رفیع سودا بول رہے ہیں۔

''اچھا، لطیفہ در لطیفہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے یہ شعر قدسی ودسی کا نہیں، خان صاحب قبلہ نے میرزا کو شرمندہ کرنے کے لیے فی البدیہہ تصنیف کر کے محمد جان قدسی کی جھولی میں ڈال دیا۔''

''ارے واللہ؟'' علیم اللہ نے حیرت سے کہا۔

''حضت قبلہ، دروغ بر گردنِ راوی، یہ میں نہیں کہہ رہا۔ میں نے حاجی محمد جان قدسی کا دیوان بھی نہیں دیکھا۔ لیکن میرزا سودا اس دن ذلیل خوب ہوئے۔''

میر محمد تقی کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے سودا کی رسوائی پر ذرا برابر افسوس نہیں۔ ''ایک اور دن کی بات ہے، میں اس وقت تھا نہیں، لیکن کئی لوگوں نے بیان کیا۔ میرزا صاحب بچارے پھر ایک مطلع کہہ لائے تھے، اور حق یہ ہے کہ لاجواب مطلع تھا:

بہار بے سپر جام و یار گذرے ہے
نسیم تیری سینے کے پار گذرے ہے

''سنا ہے داد کا شور ذرا تھا تو ما م.... خان صاحب نے بہ آوازِ بلند کہا کہ ہاں صاحب کسی اور بھی استاد نے کچھ ایسا ہی مضمون باندھا ہے:

بہار بے سپر جام و یار می گذرد
نسیم ہم چو خدنگ از کنار می گذرد''

میر تقی کھلکھلا کر ہنسا، ''اور لطف یہ ہے کہ صاحب من، کہ خان صاحب نے اس فرضی استاد کا نام بھی نہ بتایا۔ لوگوں کو صاف معلوم ہوا کہ یہ مطلع بھی سودا غریب کو ذلیل کرنے کے لیے خان صاحب موصوف نے گھڑ دیا تھا۔ لیکن میرزا رفیع اس بار بھی بات کو پی گئے۔''

''اور میاں صاحب، کیا کبھی آپ کے ساتھ بھی ایسا کوئی معاملہ گذرا؟'' علیم اللہ نے پوچھا۔ ''آپ کے ساتھ تو قرابت کا پاس کیا ہوگا؟''

''اجی توبہ کیجیے صاحب۔ معاملہ کیا، معاملہ کہیے اور ہر بار مجھے برسرِ محفل زک پہنچانے کی ترکیب تھی۔ میرزا رفیع مجھ سے عمر میں بڑے ہیں.... جاہل ہیں تو کیا ہوا، شعر تو وہ مجھ سے بہت پہلے سے کہہ رہے ہیں....''

''اماں صاحب زادے، یہ کیا کہتے ہو، سودا اور جاہل؟ میاں اتنا بھی تبختر ٹھیک نہیں، اللہ کو برا لگے ہے۔''

''اسی لیے تو میری کسی سے بنتی نہیں،'' میر محمد تقی نے بھنا کر کہا۔ ''سچ بات کوئی سننا نہیں چاہتا۔ لوگ مجھے خدا جانے کیا سمجھتے ہیں۔ میرزا صاحب کو گالی گلوچ کا فن تو آتا ہے، لیکن فن شعر میں وہ محض پیادہ ہیں، پیادہ۔ صاحبِ من، یہ بات گرہ میں باندھ رکھیے:

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن سے
یوں ہی سودا کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

قصیدہ البتہ وہ کہہ لیتے ہوں گے۔ لیکن اصل کمال تو غزل میں ہے۔''

علیم اللہ کے چہرے سے بے اعتباری ترشح کر رہی تھی، لیکن اس نے گرم مزاج نوجوان شاعر سے بحث میں الجھنا مناسب نہ جانا۔ ''تو وہ واقعات تو بیان کریں جو آپ پر گذرے۔''

''خیر، میں کہہ یہ رہا تھا کہ میرزا رفیع اپنی جگہ پر متمکن ہیں۔ ان باتوں سے ان کا کچھ نہ بگڑے گا لیکن میرے بارے میں یہ جھوٹ مشہور ہو جائے گا کہ میں دوسروں کے مضامین باندھتا ہوں تو میرے کمالِ فن کو دھبا لگ جائے گا۔''

''نہیں، میرا خیال ہے آپ کے بھی لوگ بہت قائل ہیں۔''

میر محمد تقی اس جملے پر ذرا ٹھنڈا ہوا۔ ''ایک دن میں نے خان موصوف کے مشاعرے میں غزل پڑھی۔

بیت الغزل تھا:

نشوونما ہے اپنی جوں گرد باد انوکھی
بالیدہ خاکِ رہ سے ہے یہ شجر ہمارا

''اس پر خان صاحب داد تو کیا دیتے، وہیں برسرِ محفل کہنے لگے، 'میاں محمد تقی۔' '' اس نے اب کی بار خان آرزو کے لہجے کی بے حد کامیاب نقل اتاری۔ '' 'ماموں ہی کے گھر ڈاکا ڈالا، اور وہ بھی بھونڈے پن سے۔ مال کو سنبھال نہ پائے۔' پھر جب سب مجمع متوجہ ہو گیا تو آپ نے اپنا شعر پڑھا:

افتادگیست مایۂ نشوونمائے من
نخلم چو گردباد ز خاکِ آب می خورد

''خدا کی قسم، نہ پوچھیے میں کس قدر شرمندہ ہوا، سارا مجمع ملامت بھری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اور آپ یقین کریں مشفق من، کہ قسم لے لیجیے جو میں نے ماموں.... آرزو صاحب کا وہ شعر کبھی دیکھا یا سنا ہو۔ صاف توارد تھا، لیکن انھوں نے مجھے نکو بنا دیا۔''

علیم اللہ کے چہرے بشرے سے بے اعتباری اس بار اور بھی عیاں تھی۔ بات صرف مضمون کی نہ تھی۔ دونوں شعروں کے اہم الفاظ و تراکیب بھی بالکل ایک تھے: نشوونما، گردباد، خاک، شجر/نخل۔ پھر کوئی کیسے سمجھ لیتا کہ یہ محض توارد تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے کہ محمد تقی نے خان آرزو کا جواب لکھنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ تاہم، علیم اللہ نے اس وقت چپ رہنے ہی میں عافیت جانی۔

''اور کل رات کا واقعہ تو زہر سے بڑھ کر تلخ تھا،'' میر نے کہا۔ ''ما.... خان صاحب نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا تھا، میں بھی شریک تھا۔ ابھی میں نے لقمہ اٹھایا بھی نہ تھا کہ حضرت فرماتے ہیں، 'میاں محمد تقی، تم نے ہمارے شاگرد رائے آنند رام مخلص کا مضمون اٹھا لیا اور ہمیں بتایا تک نہیں؟' ''

خان آرزو کے لہجے کی نقل اس بار اس قدر کمال کی تھی کہ علیم اللہ خان کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ لیکن میر محمد تقی کے لیے اس میں ہنسی کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ کہتا رہا، ''اور جب میں ان کا منھ تکنے لگا کہ آپ صاحب کیا فرماتے ہیں، تو انھوں نے مخلص کا شعر پڑھا:

بر دلِ ما تیرہ روزاں از صف مژگاں گذشت
آنچہ از فوج دکن بر ملک ہندستاں گذشت

میں اب نہ سمجھا کہ بات کیا ہے۔ تب انھوں نے کہا، 'اجی کیا اپنا ہی شعر بھول گئے، ایسی بھی کیا محویت، سنو یہ تمھارا ہی تو شعر ہے:

نیزہ بازان مژہ سے دل کی حالت کیا کہوں
ایک ناکسی سپاہی دکھنیوں میں گھر گیا'

''صاحب، میری تو آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کہاں وہ موٹے آنند رام مخلص کا مدرسانہ شعر، کہاں میرا پُر کیفیت شعر۔ ذرا سوچیے، 'ناکسی سپاہی' جیسا محاکاتی فقرہ، اور 'نیزہ بازان مژہ' سے اس کی مناسبت، اور کہاں مخلص کا ست اور سپاٹ 'فوج دکن'، اور اس کے مقابلے میں میرا لفظ 'دکھنیوں'۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

''میں نے اسی وقت طے کیا کہ اب یہاں نہ رہوں گا۔ کھانے میں ہاتھ ڈالے بغیر اٹھ گیا۔ اپنا سامان چھوڑ چھاڑ اسی وقت ان کے گھر سے نکلا اور جامع مسجد کی راہ لی۔ کچھ پتا نہ تھا کہ کہاں جانا، کہاں رہنا ہوگا۔ بس چلتا رہا۔ رنج اور غصے نے شاید اندھا کر رکھا تھا۔'' میر کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی۔

''راستہ ہی بھول گیا.... رات بھیگ چکی تھی، کہیں سے بھٹکتا بھٹکتا حوض قاضی کی مسجد پر آ نکلا۔ وہاں ایک حجرہ خالی پا کر اسی میں پڑ رہا۔ کوئی چار پانچ کی ساعت رہی ہوگی۔ تہجد والے اٹھ رہے تھے۔ مجھے مارے سردی اور بھوک کی نیند نہ آئی۔ جب فجر کی اذان سنائی دی تو وہاں سے نکلا۔''

اتنا کہہ کر وہ رکا، پھر ذرا سا مسکرایا۔ یہ بات صاف تھی کہ وہ اس طرح ماموں کے یہاں سے اٹھ آنے پر شرمندہ ہے، لیکن واپس بھی نہیں جانا چاہتا، اور یہ شب بھر کی شہر گردی اس کے خیال میں کوئی بری بات بھی نہ تھی۔

''باقی آپ جانتے ہی ہیں۔'' اس نے اپنی کہانی ختم کی اور علیم اللہ کی طرف کچھ یوں دیکھا گویا اس پورے قصے میں اس کا ردعمل جاننا چاہتا ہو، لیکن کسی تشویش کے بغیر۔ یعنی اگر علیم اللہ نے اس کی بات مانی تو بھی کیا، اور نہ مانی تو بھی کیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ خان آرزو نے بڑی زیادتی کی،'' علیم اللہ خان نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا، ''لیکن ایسی باتوں پر گھر نہیں چھوڑ دیتے۔ آپ چندے صبر کرتے، کوئی اچھی نوکری مل جاتی تو خوش اسلوبی سے رخصت ہو لیتے۔''

''دیکھیے جناب، آپ مجھے دُنیاداری نہ سکھائیں۔ خان آرزو سے میرا نباہ نہیں ہوسکتا تو نہیں ہوسکتا اور یہ پہلی بار نہیں کہ انھوں نے مجھے ذلیل کیا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

میر محمد تقی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی شکنیں ابھر آئیں۔ جیسے کسی ذہنی کشمکش میں ہو۔ علیم اللہ بھی چپ رہا، کہ اس وقت محمد تقی اپنے دل سے مخاطب ہے، مجھے دخل نہ دینا چاہیے۔

''سنیے جناب،'' کچھ دیر کے سکوت کے بعد وہ کچھ بادلِ ناخواستہ بولا، ''مجھ پر ایک زمانہ جنون کا سا گذرا ہے....''

علیم اللہ چونک کر گویا پیچھے ہٹ گیا۔ ''ارے! کب، اور کیسے؟''

''ان تفصیلات کا موقع نہیں،'' میر نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔ ''اور شاید ضرورت بھی نہیں۔ ویسے یہ سب باتیں کھل ہی جائیں گی۔ میں ان حالات پر مبنی ایک مثنوی لکھ رہا ہوں۔ فی الحال خاموشی ہی بہتر ہے۔

''کہنے والی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ان لوگوں نے ازخود، یا ممکن ہے میرے سوتیلے بھائی محمد حسن کے اغوا سے، مجھے جان سے مار ڈالنا چاہا۔''

علیم اللہ کے چہرے پر استعجاب ہویدا ہوا، لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ محمد تقی نے بھی اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی روداد جاری رکھی۔ ''خان صاحب ہر طرح سے میرا برا چاہنے لگے۔ اگر میں سامنے پہنچ جاتا تو پھٹکارتے۔ ادھر ادھر منھ چھپائے رہتا تو بلوا بھیجتے اور ذلیل کرتے۔ کیا بیان کروں کہ میں نے ان سے کیا پایا....''

علیم اللہ خان نے پوچھا، ''انھوں نے بیماری کے عالم میں بھی کوئی طبیب نہ بلوایا؟''

''جلاد بلواتے تو بات سمجھ میں آتی،'' میر نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ تو میرے والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ کی ایک مریدنی نہ ہوتیں تو یہ لوگ مجھے زنداں میں ڈلوا کر دم لیتے۔''

''اللہ اللہ، کیا زمانہ آ لگا ہے،'' علیم اللہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''میں آج شام نواب رعایت خان

کی بارگاہ میں حاضری دوں گا۔ وہاں آپ کا ذکرِ خیر بھی آئے گا۔ شاید اللہ کوئی سبیل نکالے۔"

"رب العزت آپ کو اس غریب نوازی کے لیے عنایاتِ عالیہ سے نوازے گا،" میر نے کہا۔ "لیکن خدا کے لیے آپ کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے آپ کی نوکری پر آنچ آئے، یا کسی ایسے انتظام پر راضی نہ ہوں جس میں میری تذلیل کا پہلو نکلے۔"

"ایسا ہرگز نہ ہوگا صاحب زادے،" علیم اللہ نے کچھ آزردگی سے کہا۔ "میں نے ان رؤسا کی نوکری میں بھاڑ نہیں جھونکا ہے۔ خیر، اس قضیے کو یہیں ختم کیجیے۔ رات ڈھلے آپ یہیں رہیں۔ شاید طلبی ہو۔"

اس رات نواب رعایت خان کی محفل میں علیم اللہ نے میر کی روداد سنائی تو نواب نے کہا:

"اماں وہ شخص کہتا خوب ہے۔ ایک دن اعتماد الدولہ ماموں حضور بھی اس کا ذکر کرتے تھے۔ لیکن یہ خان آرزو کا قصہ کیا ہے؟ اعتماد الدولہ ماموں حضور سے ان کے مراسم ہیں۔ کہیں خان موصوف برا نہ مان جائیں۔"

"نہیں...." علیم اللہ نے 'نہیں' کی "ہیں" کو ذرا کھینچتے ہوئے ادا کیا۔ "نواب کے اقبال اور اعلیٰ حضرت وزیر الممالک اعتماد الدولہ نے نصرت جنگ کے دبدبے کی بدولت ایسا نہ ہوگا۔ مجھے یقین کامل ہے۔"

"لیکن میر محمد تقی کی کہانی میں سچ کتنا ہے؟ ہم تو نواب سراج الدین علی خان کو ایسا نہ سمجھتے تھے۔"

میں نے کچھ سنا تو ہے.... سرکار تک ہی یہ بات رہے تو اچھا ہے۔" علیم اللہ نے حضارِ مجلس کی طرف دیکھ کر کہا۔ نواب نے اس کی بات سننے کے لیے اپنا سر ذرا اس کی طرف گھمایا ہی تھا کہ سب لوگ کسی نہ کسی بہانے سے دیوان خانے کے مختلف گوشوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"غلام کی تحقیق یہ ہے کہ محمد تقی کو خان آرزو کے گھرانے کی کسی حسینہ سے عشق ہو گیا تھا...."

"تو کیا ہوا؟ میر تقی سید ہے، خوبرو ہے، پڑھا لکھا ہے۔ کر دیتے دونوں کی شادی۔"

"بے شک، سرکار درست فرماتے ہیں۔ لیکن محمد تقی کا میلان رفض کی طرف ہے.... کچھ لوگ کہتے ہیں وہ تبرائی شیعہ ہے.... اور خان موصوف ٹھہرے شیخ غوث محمد گوالیاری، اور ان کے اوپر شیخ فرید الحق والدین بابا فرید گنج شکر، اور سب سے اوپر امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اخلاف میں، بھلا کیوں کر برداشت کرتے۔ انکار رہا، اور سختی سے انکار رہا۔ پھر محمد تقی نے ان کی برائیاں کرنی شروع کیں۔ اسی عالم میں، یا اس کے پہلے، ایک ہلکا سا دورہ ماخولیا کا بھی میر تقی پر پڑا۔ خان آرزو سے ان کی کوئی واقعی قرابت

تو تھی نہیں، نسبتی نہ سہی۔ پھر خان موصوف کا ہے کو علاج معالجے کی سبیل کرتے۔"

"ہوں، تو یہ بات ذرا دور تک جاتی ہے۔"

"درست فرمایا سرکار نے۔ لیکن ابھی ایک پہلو اور بھی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہ مجھ سے میر تقی نے خود بیان کیا ہے۔ خان آرزو نے اس کے بعض شعروں پر سرقے کا الزام لگایا اور الزام بھی کچھ ایسا کہ سرقہ ثابت نہیں، لیکن شعر آپس میں لڑے ہیں ضرور۔ اغلب ہے کہ میر نے جواب لکھا ہو، اور خان موصوف اسے سرقہ بتاتے ہوں۔"

"میر کو اپنے کمال شاعری پر جو غرور ہے اور بجا غرور ہے۔ اس کے مدنظر اس کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ایسے الزام کے بعد وہ ان کی چھت کے قیام کرتا، بس وہاں سے نکل لیا۔"

"تو تمھارے خیال میں ماموں جان حضور کے سامنے اسے پیش کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔"

"جی نہیں بندہ پرور، اور یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت وزیر الممالک اس بات کو نظرِ استحسان سے دیکھیں گے کہ میر تقی ایسا شاعر غرا آپ کے متوسلین میں ہو۔"

"اور خان آرزو؟"

"سرکار کا اقبال بلند ہو، وہ عالم آدمی ہیں، کینہ پرور نہیں۔ محمد تقی کہیں رہے، مرے، کھپے، ان کو کیا، اور ان کا شاگرد تو وہ بہر حال ہے، اور قرابت دار بھی ہے، نام نہاد کو سہی۔ وہ کیوں برا ماننے والے ہوتے؟"

"ٹھیک ہے، کل صبح چاشت کے وقت اسے یہاں حاضر کرو۔ اگر میری طبیعت کے موافق نکلا تو نوکر رکھ لوں گا۔ تمھارے حجرے کے سامنے محافظ خانے کے اوپر دوسرا حجرہ خالی ہے۔ ماموں حضور سے کہہ کر وہاں اس کے رہنے کا بندوبست کرا دوں گا۔ کھانا ہمارے باورچی خانے سے جائے گا۔ فرائض منصبی کچھ نہیں، دن بھر شعر کہے، گھومے پھرے، جو چاہے کرے۔ محفل شبینہ میں حاضری بے شک ضروری ہوگی۔"

رات گئے جب علیم اللہ گھر لوٹا تو محمد تقی نہ صرف موجود تھا، بلکہ جاگ بھی رہا تھا۔

"لو جی میاں صاحب، تمھارا کام تو بن گیا،" اس نے میر کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "سرکار علی مقدار نے کل بوقت چاشت حاضری کا حکم دیا ہے۔ آگے تمھاری قسمت۔ چاکری کی سب تفصیلات طے ہو گئی ہیں۔ لیکن میاں تم ٹھیرے بگڑے دل انسان۔ وہاں ذرا سنبھل کر بات کرنا۔ کوئی بات ناگوار ہو تو پی جانا۔"

''یہ تو ذری ٹیڑھی کہی آپ نے صاحب من۔ لیکن میں کوئی ایسی بات نہ کروں گا جس سے آپ پر حرف آجائے۔ آپ دیکھیے گا ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔''

''نوکری لگ گئی تو تمھارے رہنے کھانے کا بھی انتظام یہیں ہو جائے گا۔ ایسا سرکار نے فرمایا ہے۔ آج کی رات یہیں گذار لو، میں حجرے میں ایک پلنگڑی بچھوائے دیتا ہوں۔''

''علیم اللہ خان صاحب، بندہ آپ کا مرہونِ احسان ہے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے ہمیشہ شاکر و متشکر پائیں گے۔''

''میاں صاحب، شکر اللہ کے لیے واجب ہے۔ میں نے تم پر کچھ احسان نہیں کیا۔ یہ سحر خیزی اور باجماعت نمازِ فجر کے التزام کی برکت ہے کہ میں نے تمھیں وہاں دیکھ لیا۔ اب سوؤ، صبح دعائے کامرانی پڑھ کر چلنا۔''

نواب رعایت خان کی محل سرا خوب سجی ہوئی تھی۔ شادی کی تاریخ کی آمد آمد تھی۔ بارات کی تیاریاں تھیں۔ دلھن کے جوڑے زیور چوتھی سانچق بری چڑھاوے کے انتظام والے مرد عورت خود کو نہایت اہم سمجھ رہے تھے۔ اندرون حویلی سادہ کاروں، مرصع کاروں، کشیدہ کاروں، اتوگروں کی نمائندہ مغلانیوں، بوڑھے کاری گروں کی ریل پیل تھی۔ زنانہ صدر دروازے پر شہنائی بج رہی تھی۔ مردانہ دربار کے صحن میں نہریں رواں، سایہ دار درختوں کا جوش۔ ان کے سائے میں چوکیاں بچھی ہوئی، جن پر علیٰ قدر مراتب گانے بجانے والوں، تہنیت پڑھنے والوں کی صفیں جمی ہوئیں۔ اندر دیوان خانۂ خاص کے سامنے بارہ دری میں ایشک اقاصی ملنے ملانے والوں کو مناسب جگہوں پر بٹھا کر عطر پان شیرینی سے ان کی تواضع کر رہا تھا۔ علیم اللہ خان کے بارے میں اسے معلوم تھا، لہٰذا جب وہ میر کو لیے ہوئے اندر کی طرف چلتے چلے گئے تو اس نے کچھ تعرض نہ کیا۔

چوب دار نے میر محمد تقی کی آمد کا اعلان کیا تو خفیف سا اشارہ نواب کی طرف سے ہوا کہ ان کو آگے آنے دو۔ میر نے جھک کر سات سلام کیے۔

''اماں میر تقی، تم خوب آئے،'' نواب نے یک گونہ بے تکلفی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمھارے مشتاق تھے۔'' پھر اپنی مسند کے نیچے بائیں طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ ''آؤ، ادھر بیٹھو۔''

میر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ ''پیر و مرشد، حضرت ابوالمعانی میرزا بیدل فرما گئے تھے:

آتش دل شد بلند از کف خاکسترم
باز مسیحائے شوق جنبش دامان کیست

لیکن میرے لیے تو آپ مسیحائے شوق ہیں، اور آپ کا بلاوا وہ جنبش داماں ہے جس نے میری خاکستر کو پھر سے روشن کر دیا۔ بندہ آپ کی کرم گستری کے لیے دل سے ثنا خواں ہے۔"

"خوب۔ ان شاء اللہ بشرطِ وفاداری تم ہمیں بھی اپنا پشتی بان پاؤ گے۔ کہو، ادھر کچھ کہا؟ جی چاہے تو سناؤ۔"

"عالی جاہا، اس دربار میں طلبی کے انبساط نے کل رات دلِ گرفتہ کو وا کر دیا تو یہ رباعی موزوں ہوئی۔"

پھر میر نے انوکھے سادہ اور دلکش انداز میں، کچھ متبسم لبوں کے ساتھ رباعی پڑھی:

ہے تجھ سے محال جی اٹھانا مجھ کو
پھر جنی کہے کوئی سیانا مجھ کو
سر میرا لگا ہے نقش پا سے تیرے
سجدے کو خدا کے بھی بجانا مجھ کو

حاضرین نے آفرین کہی، نواب نے بھی متبسم ہو کر کہا، "درست۔" وہ اب دوسری طرف متوجہ ہونے والے تھے کہ پھر ایک بار توقف کر کے محمد تقی کی طرف رخ کیا:

"اماں میر تقی، اب نواب سراج الدین علی خان آرزو کی طرف مراجعت کا جی تو نہ چاہے گا؟" اس جملے میں تھوڑی سی چھیڑ کے ساتھ تھوڑی سی تشویش بھی تھی۔

"پیرو مرشد،" میر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "اس تردد کے لیے منت پذیر ہوں۔" پھر وحشی یزدی کا شعر پڑھا:

دل نیست کبوتر کہ چو برخاست نشیند
ما از سر بامے کہ پریدیم پریدیم

"درست،" نواب نے پھر کہا۔ "ہاں، تمھارے فرائض منصبی تمھیں علیم الدین خان بتا دیں گے۔ قیام و طعام کا بھی بندوبست سرکار سے ہو جائے گا۔ اب تنخواہ بتاؤ کیا قبول ہوگی؟"

''عالی جاہا، آپ کی غریب پروری کی بدولت اتنا سب ہے تو تنخواہ کی کیا احتیاج؟ ایک گوشۂ انزوا، اور جناب کے نیّر اقبال کی مہر پروری، اور مجھے کچھ درکار نہیں۔''

علیم اللہ خان یہ سن کر میر کی سعادت مندی اور خوش سلیقگی پر خوش تو ہوئے، لیکن دل میں یہ بھی کہا کہ عجب وارستہ مزاجی ہے۔ ارے بھائی گذارے کے لیے کچھ تو لے لیتا۔ اتنے میں نواب نے کہا:

''نہیں، کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ چلو پچیس روپے درماہہ قبول کرلو۔''

میر محمد تقی نے جھک کر تین سلام کیے۔ نواب کی آنکھ کا اشارہ پا کر علیم اللہ نے کہا، ''آج سے آٹھ دن بعد یوم الخمیس کو سرکار دولت مدار کی بارات ہے۔ میر محمد تقی بھی ہم رکاب ہوں تو....''

''مناسب ہے،'' نواب نے کہا، پھر دوسری طرف متوجہ ہو گئے۔ بنگال کا ایک جوہری کامروپ کے پہاڑوں کے اس پار بہنے والے دریائے اراودی کی گھاٹی کے یاقوت لایا تھا۔ پیازی رنگ کے یہ نگینے ساری دُنیا میں اپنی غیر معمولی چمک کے لیے مشہور ہے۔

علیم اللہ خان نے نواب کے خزانہ دار سے کہہ کر میر کو سات روپے تنخواہ میں سے علی الحساب دلوا دیے تھے۔ اس رقم میں سردی کا بستر، ایک پلنگ، ایک چھوٹی چوکی، گھڑونچی، دو چار ضروری برتن مہیا ہو گئے۔ بارات کے لیے نئے کپڑوں کا انتظام بزاز اور درزی کے یہاں سے قرض پر ہو گیا۔ محمد تقی کے دن رات چین سے گذرنے لگے، یہاں تک کہ بارات کا دن اور وقت آ گیا۔

اس وقت تک بڑی بائی صاحب اور نور بائی صاحب کے حُسن اور کمال کے چرچے ہر طرف پھیل چکے تھے۔ اور دلّی تو ہمیشہ ہی بے فکروں، گپ بازوں، افواہ اور چٹ پٹی خبریں پھیلانے والوں کا شہر رہا ہے۔ کوئی کہتا یہ فرنگنیں ہیں، اعتماد الدولہ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئی ہیں۔ کوئی کہتا اعتماد الدولہ نے بیٹی سے اپنی شادی کا پیغام دیا ہے۔ اپنی بیٹی کے بیاہ سے فرصت پالیں تو اپنا بھی نکاح رچائیں گے۔ کوئی کہتا ان کو پانچ لاکھ تو بیل دی گئی ہے، مصارفِ سفر اور اخراجاتِ شہر، اور امرا کی طرف سے انعامات الگ۔ کوئی کہتا نظام الملک کے گھرانے کی کسی بی بی نے بڑی بائی صاحبہ کو اپنی مستقل مصاحبت اور دوگانہ بنانے کے لیے دکن سے پیغام بھیجا ہے۔ غرض جتنے منھ اس سے زیادہ باتیں تھیں۔

بارات میں دو ہزار آدمی تھے، اور کوئی پانچ ہزار نوکر۔ سب سے آگے ڈھائی تین سو لوگ ہاتھیوں کی

عماریوں میں تھے، اور ان کے بعد کوئی سوڈیڑھ سو باراتی ہواداروں میں، یا رتھوں پر۔ ان کے پیچھے کوئی چار سو حضرات گھڑسوار۔ یہاں تک کہ لوگوں کو تو اپنی خبر تھی، لیکن بارات کے باقی ارکان، اور شاگرد پیشوں کو اپنے فوری گرد و پیش کے سوا کچھ پتا نہ تھا، بس اتنا معلوم تھا کہ ہم بارات میں ہیں۔ سارے راستے آرائش لٹتی آئی تھی۔ چاندی کے روپے سچے گوٹے کے پھول اور ہار، چاندی کے کڑے جن میں عقیق زرد یا عقیق سرخ جڑے ہوئے تھے، سنہلا اور کٹیلا نامی نیم قیمتی جودھپوری اور بیکانیری پتھروں کے ہار۔ چاندی اور سونے کے چھلے، اور اِکا دُکا نیم اشرفی۔ مال کو لوٹنے والے پانچ سات جیالے ہاتھ پاؤں ضرور تڑوا بیٹھے، اور ایک آدھ کی جان بھی گئی، لیکن بہت سے گھرانے اس رات خوش حال ہو گئے۔

اعتمادالدولہ کی درخواست تھی کہ بارات کے ساتھ آتش بازی ہو تو ہو، لیکن ڈھول تاشے نہ ہوں۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے لڑکے والوں نے شہنائی، نفیری، قرنا وغیرہ کو تو موقوف کیا تھا، لیکن آتش بازی اس قدر تھی کہ دھوئیں کی کثرت سے راستہ نظر نہ آتا تھا۔ اگرچہ خود بارات کے ساتھ روشنیاں بہت تھیں، اور اعتمادالدولہ نے بھی خانم کے بازار سے لے کر حوض قاضی تک بارات کے سارے راستے میں دورویہ لٹو، کنول، اور مردنگ لگوا دیے تھے لیکن سڑک پر بعض جگہ سردی کی دھندسی جمی ہوئی معلوم پڑی تھی۔

اعتمادالدولہ کے صاحب زادے میر انتظام الدین خود باراتیوں کے خیر مقدم کے لیے حوض قاضی کی گلی کے سرے پر تھے۔ دولہا، اور اس کے کچھ خاص اعزہ، یا بزرگوں کو مستثنیٰ کر کے اب لوگ وہاں سے پاپیادہ چلے۔ ان کی سواری کے سب جانور بلبلی خانے کے وسیع میدان میں اتارے گئے جہاں ان کے لیے معقول بندوبست تھا۔

دلّی والوں کا کہنا تھا کہ اس کے بعد دوسری دھوم دھام کی شادی دلّی میں راجا جگل کشور کے بیٹے کی ہوئی۔ راجائے موصوف کو دلّی کے دربار میں ناظم بنگالہ کے وکیل کی حیثیت سے بڑی عزت اور توقیر حاصل کی تھی۔ دلّی والے یہ بھی کہتے تھے کہ فلک کج رفتار کو یہ دونوں شادیاں نہ بھائیں۔ احمد شاہ، بادشاہ دہلی کے آخری برس [1165ھ، مطابق 1753ء، مرتب] میں اعتمادالدولہ کے بیٹے میر انتظام الدین، (جو آج بارات کی پیشوائی کر رہے تھے) انتظام الدولہ خان خاناں کے خطاب کے ساتھ وزیر الممالک بنے۔ لیکن عمادالملک غازی الدین خان نے سازش کر کے انھیں مروا دیا۔ [1759ء، مرتب] راجا جگل کشور پر سراج الدولہ کی شہادت کے بعد برا وقت پڑا۔ آخر وہ شجاع الدولہ کے پاس اودھ چلے گئے۔ پھر وہ فرخ آباد گئے، جہاں

ایک ہاتھی کے پاؤں تلے آ کر انھوں نے جان بحق تسلیم کی۔

بارات کی آمد کے کچھ قبل بڑی بائی صاحب اور نور بائی صاحب ہاتھی پر سوار ہو کر مہمان گاہ پہنچیں۔ ان کی عماری کھلی ہوئی تھی، یعنی ایک چتر کے سوا ان پر کچھ نہ تھا۔ دستی بردارنیاں عماری میں بھی تھیں، اور ہاتھی کے جلوو پس میں بھی۔ اس طرح نظارۂ حسن کی پھلواری لوٹنے والوں کی بن آئی۔ سب نے انھیں جی بھر کے دیکھا۔ اس وقت نور السعادۃ کے حُسن پر وہی بہار تھی جو عرصہ قبل اس کی ماں پر نخ جوان میں گذر چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس بارات کے تماشبینوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو آرائش لٹنے کے دوران نہیں، بلکہ نور السعادۃ کو دیکھ کر بے ہوش ہوئے تھے۔

ظاہر ہے کہ ماں بیٹی کی شہرت میر تک بھی پہنچ چکی تھی، اور ظاہر ہے کہ نصف دہلی کی طرح وہ بھی ان کے جمال گیتی افروز کا غائبانہ مشتاق و مداح تھا۔ براتیوں کے تقریباً آخری زمرے میں ہونے کی وجہ سے اسے جلسہ گاہ میں کسی مناسب جگہ کے ملنے، بلکہ داخل ہونے ہی کے لالے تھے۔ لیکن اس کی تقدیر ان دنوں عروج پر تھی۔ حُسنِ اتفاق سے امیر الامرا شاہ نواز خان صمصام الدولہ مرحوم کے بیٹے صمصام الدولہ عاشوری خان میر آتش نے اسے دیکھ لیا۔ امیر الامرا شاہ خاں نواز خان مرحوم سے میر کا تعارف ان کے بھتیجے خواجہ محمد عاصم کی بدولت ہوا تھا۔ اور صمصام الدولہ مرحوم نے میر کے لیے ایک روپیہ روزینہ مقرر کر دیا تھا، جو اسے صمصام الدولہ شاہ نواز خان کی حیات تک ملتا رہا تھا۔ صمصام الدولہ عاشوری خان میر آتش نے چوب دار بھیج کر میر کو بلوا لیا اور اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔ بائی صاحب لوگوں کی نشست بالکل سامنے ہی تھی۔ ایک نگاہ پڑتے ہی میر کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے یہ بھی وہم ہوا کہ نور بائی صاحب نے بھی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھا ہے:

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی — وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی — تاب و طاقت نے بےوفائی کی
کیا کہوں طرز دیکھنے کی آہ — دل جگر سے گذر گئی وہ نگاہ
چپکے منھ ان کا دیکھ رہتا میں — جی میں کیا کیا پہ کچھ نہ کہتا میں

میر کو یہ بھی خوف نہ تھا کہ اس کی بےخودی اور از خود رفتگی کوئی دیکھے تو معاملے کی تہ کو فوراً پہنچے گا۔ پھر کیا

کیا نہ فضیحتے ہوں گے۔ پھر اس کی نظر کشن چند اخلاص پر پڑی جو اعتمادالدولہ کی طرف سے بائی صاحب لوگوں کی پیشی پر مامور تھا، لہٰذا وہ ان کے بالکل پیچھے ایک کرسی پر تنہا بیٹھا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی رائے کشن چند مسکرایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے دل کا حال فوراً جان لیا۔ رائے کشن چند جن نگاہوں سے بڑی بائی صاحبہ کے سرو سینہ کو دیکھتا تھا، ان سے میر نے صاف سمجھ لیا کہ وہ اس کا رقیب نہیں۔ ایک قد آدم تیغ صفا ہانی کا قتیل ہے تو دوسرا نیمچہ بروی کا۔

میر کو کچھ یاد نہیں کہ اس رات بڑی بائی صاحب نے کیا گایا کیا سنایا۔ اسے اتنا یاد ضرور ہے کہ اگر وہ نور بائی صاحب کے حُسن پر نہ مرمٹا ہوتا تو بڑی بائی صاحب کی آواز اسے مسحور کر لیتی اور پھر، یا رائے کشن چند اخلاص اس دُنیا میں رہتا یا محمد تقی میر۔ بیان کرنے والے بیان کرتے ہیں کہ بڑی بائی صاحب نے سب سے پہلے خواجہ حافظ کی غزل گائی:

روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست
منت خاک درت بر بصرے نیست کہ نیست

سبحان اللہ وہ حسبِ حال غزل، وہ ملوک الکلام، وہ مقامِ عراق کے سوندھے عطر میں ڈوبی ہوئی، کوکتی، دور تک جاتی ہوئی آواز۔ وہ بیاض گردن، اور اس کے اوپر وہ غازہ و گلگونہ سے بے نیاز طلسماتی شہزادیوں جیسا سحر کار چہرہ۔ ایسا لگا کہ جلسے میں کوئی نہیں ہے، صرف ایک صورت ہے اور ایک آواز ہے۔ کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتا تھا، جیسے سب کے سب کمند سحر میں گرفتار ہوں۔ موسیقی سمجھنے والوں کا تو یہ عالم تھا گویا جنم جنم کے پیاسے کو پہلی بار پانی ملا ہو اور جب اس نے یہ شعر گایا:

از سر کوئے تو رفتن نہ توانم گامے
ورنہ اندر دل بیدل سفرے نیست کہ نیست

تو اس کے ساتھ صائب کا یہ شعر بھی جوڑ دیا:

ہم چو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست
رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

یہ دونوں شعر اس قدر حسبِ حال تھے، اور کچھ اس کمالِ فن کے ساتھ گائے گئے تھے کہ پھر تو سارا مجمع بے قابو ہو گیا۔ جوان سب کے سب کھڑے ہو کر اس کی آواز میں آواز ملا کر گانے لگے اور بوڑھوں نے زانو پر ہاتھ تھپک تھپک کر تال دینا شروع کر دیا۔ وہ ایک گھڑی سے زیادہ تک یہی دو شعر گاتی رہی، اور کبھی کسی طرف سے، کبھی کسی طرف سے، مجمع آواز میں آواز ملاتا یا تال دیتا رہا۔ اگر وہ ذرا بھی ٹھہرتی تو سامعین کی طرف سے ''مکرر، للہ مکرر''، ''خانم یک بار مزید'' کی آوازیں بار بار اٹھتیں۔ حتیٰ کہ لبیبہ خانم پسینہ پسینہ ہو گئی۔ مجبور ہو کر اسے شیشہ اٹھا کر ہلکے شربت گلاب سے حلق تر کرنا پڑا اور یہ غزل تو اسے بہر حال پوری ہی کرنی تھی، ورنہ سامعین رخصت نہ دیتے:

بجز ایں نکتہ کہ حافظ ز تو نا خوشنود است
در سراپاے وجودت ہنرے نیست کہ نیست

محمد تقی میر صبح ہوتے ہوتے گھر واپس پہنچا۔ علیم اللہ خان ابھی دولھا میاں کی پیشی میں وہیں تھا۔ میر کو بھی نیند اب کیا آتی۔ ایک دو گھڑی کروٹ بدل کر اٹھ کھڑا ہوا، شمع روشن کی اور سراپا لکھنے بیٹھ گیا:

کیا کہوں کیسا قد بالا ہے
قالب آرزو میں ڈھالا ہے
ایک جاگہ سے ایک جاگہ خوب
پیکر نازک اس کے سب محبوب
موئے سر ایسے جی بھر کریے نیاز
بل ہی کھایا کریں یہ عمر دراز
اس جبیں سے ہے دل کی کب جاذب
صبح صادق کے دعوے ہیں کاذب
کہوں چتون کے دیکھنے کے طور
اس قیامت پہ وہ قیامت اور

کیا جھمکتا ہے ہائے رنگ قبول
جیسے مکھڑا گلاب کا سا پھول
برگِ گل سے زبان ہے نازک تر
پھول جھڑتے ہیں بات بات اُپر
کیا کہوں کم ہیں ایسے شیریں گو
وہ زباں کاش میرے منھ میں ہو
دم بہ دم سوئے گوش اشارۂ صبح
گوہر گوش یا ستارۂ صبح
کنج لب آرزوئے جان و دل
آگے چلنا نگاہ کو مشکل
ان لبوں سے جو کوئی کام رکھے
قندِ مصری کو کیوں نہ نام رکھے
جو حلاوت انھوں کی کہیے اب
ہم دگر سے جدا نہ ہوویں لب
ایسی ہوتی نہیں ہے سرخ لبی
رنگ گویا ٹپک پڑے گا ابھی
دیکھے از بس بر آمدہ سینے
ایسا معلوم دل جوں یوں چھینے
وہ کف دست راحت جاں ہے
کاش سینے پہ رکھ دے غم یاں ہے
صدر کے تلیے سے لے تا ناف
چپ کی جاگہ ہے کیوں کہ کہیے صاف

اس سے پھر آگے غنچۂ گل ہے
یاں سخن بابت تامل ہے
ہائے اس سے خدا جدا نہ کرے
دور اس سے جیوں خدا نہ کرے

یہ اشعار موزوں ہوتے ہوتے دن چڑھ آیا تھا۔ میر کی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی اور دل میں خار خار شوق کی چبھن تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی پھاٹک جبش خان پہنچ جائے۔ لیکن وہاں دھنسنے کون دے گا؟ مسلح محافظ، دربان، اردابیگنی، سب گردن لیں گے۔ عزت سادات بھی خاک میں ملے گی، اور اس جوہر مطلوب کی جھلک دور سے بھی نہ دکھائی دے گی۔ رائے کشن چند کے پاس چلوں؟ لیکن اس وقت خدا جانے کہاں ہوگا۔ تو کیا ہوا، دو ہی تو جگہیں ہیں۔ اپنے گھر پر ہوگا تو کیا کہنا اور اگر ان کے یہاں پیشی میں ہوگا تو اس کی حویلی کے خدام سے اس کے معمولات کی تو خبر مجھے ہو جائے گی۔ آخر کبھی تو گھر آتا ہوگا۔

اور یہ اشعار؟ کیا عند الملاقات ان کو سنا دوں؟ لاحول ولا قوۃ، اس سے زیادہ بھونڈی اور احمقانہ بات کیا ہوگی۔ پہلی ملاقات اور ایسی بے تکلفی۔ اللہ اللہ کرو میر صاحب۔ عقل اور ادب دونوں ہی غرق کر آئے ہو کیا۔ چومتے ہی گال کاٹا اسی کو کہتے ہیں بلکہ یہاں تو ابھی کنار و بوس کیا، خیال بوس بھی ممکن نہیں۔

اسی ادھیڑ بن میں دو پہر ہوگئی۔ علیم اللہ کے حجرے کا دروازہ کھلا نظر آتا تھا۔ شاید ابھی کچھ دیر ہی پہلے وہ واپس آئے ہوں گے۔ میر نے سوچا، چپکے سے نکل چلیے، ورنہ خان صاحب دیکھ لیں گے تو گھڑیوں بٹھائے رکھیں گے۔

رات کا پہنا لباس اب ذرا مل دل گیا تھا، لیکن میر کو نہ شکیبائی تھی، اور نہ اس کے پاس کپڑوں کی ایسی فراوانی ہی تھی کہ روز روز نئے لباس بدلتا۔ منھ پر دو چھینٹے مار کر وہ کٹرہ نیل کو چل دیا، جہاں رائے کشن چند اخلاص کا گھر تھا۔ قسمت اب بھی یاور تھی کہ اخلاص اسے گھر پر ہی مل گیا۔

''میاں جان، مجھے معلوم ہے،'' اخلاص نے مزاج پرسی کے بعد کسی مزید تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا۔ ''مجھے معلوم ہے تم بے وقت اچانک کیوں آئے ہو۔ میاں تم خوش قسمت بھی ہو اور بد قسمت بھی۔ خیر....''

ان الفاظ نے میر کی بے صبری مضاعف کر دی۔ ''کیوں، بدنصیب کیوں صاحب من؟ اچھا پہلے خوش نصیبی

والی بات بتائیے۔''

''خوش نصیب یوں کہ نور بائی صاحب تمھیں جانتی ہیں۔''

یہ سن کر میر کو چکّر سا آ گیا۔ اسے اخلاص، اور خود اپنا بدن، ہوا میں جھولتے ہوئے سے لگے۔ ''م.... مجھے جانتی ہیں؟ کیسے؟ کیا انھوں نے میرا کلام کہیں سنا ہے؟ کل کے پہلے دیکھا تو کبھی نہ ہوگا؟ کیا وہ ریختہ سمجھ لیتی ہیں؟ مگر سنا وہ لوگ تو ایرانی ارمنی ہیں۔''

''صبر، میر جی صبر۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے،'' اخلاص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اتنے ہولے خبطے انداز میں بات کرو تو میری سنو گے کیا۔''

''بندہ عفو کا طالب ہے رائے صاحب۔ مگر للہ سب باتیں ایک سانس میں کہہ جائیے۔''

''تو تم سمجھو گے خاک،'' اخلاص نے ہنس کر کہا۔ پھر دورانِ سفر میں ماں بیٹی کے ہندی سیکھنے، میر کی شاعری معرفی حاصل کرنے، اور نور السعادۃ کی دلچسپی کی روداد اس نے مختصراً کہہ سنائی۔ میر کا تو دماغ عرشِ معلٰی پر تھا۔ اسے یہ کیا خیال آتا کہ اس ٹھنڈی چھاؤں کے ساتھ چلچلاتی دھوپ بھی لگی ہے۔ وہ ''مولا تیری شان'' جیسے فقرے بار بار کہے جا رہا تھا۔ کشن چند اخلاص نے کہا:

''اچھا اب روئے زمین پر اتر آؤ میر صاحب۔ اصل بات تو سن لو۔''

میر گویا چونک سا گیا۔ ''اصل بات؟ اب کون سی اصل بات ہوگی رائے صاحب؟''

''تم جانتے ہو میں اعتماد الدولہ بہادر کا ملازم ہوں۔ اور یہ عورتیں....'' میر کو لفظ 'عورتیں' بہت برا معلوم ہوا، لیکن کشن چند کی بات سننی زیادہ ضروری تھی، لہٰذا اس نے قطع کلام نہ کیا۔ ''اعتماد الدولہ کی مہمان ہیں، بلکہ ان کی نوکر ہیں۔ انھوں نے ان کے نام تک بدل کر لبیبہ، یا خانم بزرگ، کے بجائے بڑی بائی صاحب، اور نور السعادۃ، یا نور خانم، کی جگہ نور بائی صاحب رکھوا دیے ہیں۔''

''تو پھر؟'' میر نے ذرا جھلا کر پوچھا۔ ''ہمیں اس سے کیا؟''

''اماں بات تو سمجھو،'' رائے کشن نے بھی ذرا تیز لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ لوگ وزیر الممالک کی نوکر، میں بھی انھیں وزیر الممالک کا نوکر، ان سے کسی قسم کا تعلق قائم کرنا، یا تمھیں ان لوگوں سے ملانا میرے لیے حد درجہ معیوب بات ہوگی۔ معیوب کیا، میری اپنی نوکری خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''لیکن وزیر الممالک کی سرکار میں تو سنتا ہوں خوشحالی طوائف نوکر ہے۔''

''اماں اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ان رئیسوں کے یہاں ان جیسی درجنوں پڑی رہتی ہیں۔''

محمد تقی کو رائے کشن چند کا لہجہ پھر اہانت آمیز لگا۔ اسے گوارا نہ تھا کہ بڑی بائی صاحب اور علی الخصوص نور بائی صاحب کے لیے کوئی ایسے لفظ کہے کہ رئیسوں کے ہاں ان جیسی درجنوں پڑی رہتی ہیں۔ لیکن عمومی طور پر اخلاص کی بات میں صداقت تھی۔

''اچھا تو مشفق من، آپ ہوں گے اعتمادالدولہ کے نوکر۔ میں تو نہیں ہوں، جو جی چاہے گا کروں گا۔''

''نوکر تو ایک اعتبار سے میاں جان تم بھی ہو،'' کشن چند اخلاص نے یوں مسکرا کر کہا کہ اس کی بات کا برا ماننا محال تھا۔ ''اعتمادالدولہ کے نہ سہی، ان کے بھانجے اور سگے داماد کے سہی۔ ہم نیک و بد سبھی تمھیں سمجھائے جاتے ہیں۔ آگے تمھاری مرضی، بس اس کا خیال رکھ لیجو کہ تمھاری آتش شوق سے کوئی چنگاری مجھ غریب کے خرمن پر نہ آ گرے۔''

''بھائی جان قسم لے لیجیے۔ خدانہ خواستہ آپ پر گزند کا شائبہ بھی آنے کے پہلے میں راہ سے ہٹ جاؤں گا۔''

''میری مانو تو چندے توقف کرلو۔ اعتماد الدولہ بہادر بڑی بائی صاحب سے سات محفلوں کا وعدہ لیا ہے۔ اس کے بعد دیکھیں ہوا کس طرف بہتی ہے۔ شاید باد شرطہ ہی ہو اور ہمیں یار آرشنا سے ملا دے۔''

میر جب کشن چند کے یہاں سے اٹھا تھا تو دل میں قسم کھا کر اٹھا تھا کہ اخلاص کے مشورے پر عمل کروں گا لیکن اس کے دل میں صبر کی وہی جگہ تھی جو چھلنی میں پانی کی۔ جیسا کہ اس نے کچھ برس بعد ایک مثنوی میں لکھا:

دل کے غبار نے راہ جو پائی
شہر میں گویا آندھی آئی
سر پر اس کے سنگ ہمیشہ
جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ
بار دامن تار گریباں
دامن قرب و جوار گریباں

پامالی میں مثل جادہ
نقش قدم سا خاک افتادہ
رکھتا سدا تھا وہ دیوانہ
وردِ زباں یہ شعر دانا
صار فوادی شقاً شقا
حقاً حقا حقاً حقا
ہوش و خرد ناشاد گئے سب
دین و دل برباد گئے سب
کوئی نہ اس پر سایہ گستر
اپنا ہاتھ اپنے ہی سر پر
نے کعبے نے دیر کے قابل
مذہب اس کا سیر کے قابل

اس کے دل میں بار بار یہ بات آتی کہ نورالسعادۃ خود اس کی طرف کچھ مائل تھی اور کچھ نہیں تو اس کی شاعری ہی کی وجہ سے مائل تھی۔ اگر وہ اس مرحلے پر سست گام ثابت ہوتا ہے تو ممکن، بلکہ اغلب ہے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ان معشوقوں کا کیا ہے، انھیں چاہنے والوں کی کمی نہیں۔ یہ لوگ ہوتے بھی متلون مزاج ہیں، اور یہ تو ابھی نوعمر اور ناتجربہ کار ہیں۔ چاہے کوئی اپنی طرف راغب کر لے۔ یہ لوگ کیسہ بزر کے طلب گار ہیں اور تخت و کرسی کے پرستار۔ یہاں اپنے پاس کیا ہے؟ ایک نجابت، اور اس کی اس زمانے میں تو قیر نہیں، اور شاعری، جس سے تو پیں نہیں سر ہو سکتیں۔ مانا کہ وہ میرے نام سے واقف ہیں۔ لیکن وہاں تک پہنچوں تو کیسے؟ تعارفِ غائبانہ کو تعارفِ حقیقی میں کیسے بدل دوں؟ پھر رائے کشن چند اخلاص کا بھی پاؤں درمیان ہے۔ ان پر کوئی بات آئی تو بڑا برا ہوگا۔

ایک مشکل یہ تھی کہ نورالسعادۃ کا خیال آتے ہی میر لذت بھرے خیالوں میں ڈوب جاتا۔ بات بہت جلد مخاطبت سے بڑھ کر ہاتھ کو ہاتھ لگانے، پھر بازوؤں اور منھ کو چھونے تک پہنچتی۔ اس کے بعد تو میدان کھلا

ہوا تھا۔ وہ کبھی نور السعادۃ کا منھ چومتا، کبھی اس کے چشم وسینہ کو پیار کرتا۔ کبھی کبھی بے راہ وخیال اور بھی بے راہ ہو جاتے، پردے اٹھنے لگتے، اور وہ ان جگہوں پر جا پہنچتا جن کے تصور سے اس کا طاقتور، بے لگام، زمینی، تخیل بھی عاجز تھا۔ وہ دُنیا کی ہر لذت کا تصور کر سکتا تھا، لیکن نور السعادۃ کے جسم کی نہاں خانے تو کیا، اس کے لب و رخسار کے بھی بوسوں کی لذت کے لمسی اور بصری پیکر پوری طرح اس کے بس میں نہ تھے۔ بنتے ہی نہ تھے، بنتے بنتے ٹوٹ جاتے تھے۔ اس وقت تو احساس اس قدر زندہ، تخیل اس قدر سیال، اور تصور کا لطف اس قدر ہنگامہ گرم کن تھا کہ اسے اپنے ذہن میں جمع کرنے کے لیے لمس کے لہریے نہ ملتے تھے، الفاظ کا تو سوال کیا ہے۔

ان روز و شب کے غروب ہو جانے کے بہت دن بعد، اور ان شب و روز کے لائے ہوئے زخموں کے بھر جانے کے بھی بہت دن بعد کہیں جا کر میر کو استطاعت نصیب ہوئی کہ کھوئے ہوئے زمانوں کے ان موہومات اور ان تصوراتی لحات کی کچھ بھی شرح کر سکے:

ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت
جب سے تن نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

کیا صورت ہے کیا قامت دست و پا کیا نازک ہیں
ایسے پتلے منھ دیکھو جو کوئی کلال بناوے گا

اب کچھ مزے پہ آیا شاید وہ شوخ دیدہ
آب اس کے پوست میں ہے جوں میوۂ رسیدہ
پانی بھر آیا منھ میں دیکھے جنھوں کے ہائے
دے کس مزے کے ہوں گے لب ہائے نامکیدہ

وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پہ اس کے
سو جی گئے تھے صدقے یہ جان و مال کیا ہے

کیا لطف تن چھپا ہے مرے تنگ پوش کا
اگلا پڑے ہے جامے سے اس کا بدن تمام

جی پھٹ گیا ہے رشک سے چسپاں لباس کے
کیا تنگ جامہ لپٹا ہے اس کے بدن کے ساتھ

وے کپڑے تو بدلے ہوئے میر اس کو کئی دن
تن پر ہے شکن تنگی پوشاک سے اب تک

بو کیے کمھلائے جاتے ہو نزاکت ہائے رے
ہاتھ لگتے میلے ہوتے ہو لطافت ہائے رے

میر نے ابھی نور السعادہ کے منھ اور کلائی، کف دست اور ہاتھوں کی انگلیوں کے سواد یکھا ہی کیا لیکن اس نے نور السعادہ کے بدن کے ہر حصے پر اپنے بوسوں کے نشان ثبت کر دیے تھے۔ کب، کتنے، اور کہاں، ان سب کا حساب اس کے ذہن میں تھا، اگر چہ بار بار بدلتا رہتا تھا:

جس جائے سراپا میں نظر کیجیے اس کے
آتا ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر کر

بدن کے شوق، ہوس کے فشار، تخیل کے کوہِ آتش فشاں، ان کے ہنگاموں میں عقل بے چاری کی آواز کون سنتا۔ لیکن آخر کئی دن بعد ملاقات کی ایک راہ سوجھی، اگر چہ مخدوش اور مشکوک تھی۔ میر نے ایک پرچہ کاغذ افشانی پر خوبصورت خط شفیعا شکستہ آمیز میں ''میں کون ہوں....'' والی غزل کے وہی شعر لکھے جو رائے کشن چند ماں بیٹی کو سنا چکا تھا اور جنھیں نور السعادہ نے پسند کیا تھا۔ پھر نیچے حافظ کے مشہور مطلعے کا مصرع اولیٰ

لکھا کہ:

رواق منظر چشم من آشیانۂ تست

پھر نیچے لکھا:

رقیمۂ نیاز، میر محمد تقی المتخلص بہ میر

اب وہ اسے بند ہی کرنے والا تھا کہ خیال آیا، کیسے معلوم ہو کہ یہ مکتوب کس کے نام ہے؟ مانا کہ میں دربان پہرے دار کو تاکیداً کہلا دوں گا کہ یہ نور خانم صاحب کے لیے ہے، لیکن ان بے عقلوں کا کیا ہے، ممکن ہے وہ اسے لے جا کر خانم بزرگ کو دے آئیں، اور کچھ بتائیں بھی نہ۔ دیر تک سوچا کیا۔ پھر یہی سمجھ میں آیا کہ ماں سے تو بات چھپائی جاسکتی نہیں اور خط جس کے بھی ہاتھ میں پڑے، نورالسعادۃ کو خبر ہو ہی جائے گی۔ یہ طے کر کے رقعے کو دوبارہ سہ بارہ پڑھ کر کلید پیچ کیا، محلے کے ایک ہوشیار لونڈے کے ہاتھ پر ایک دام رکھا اور مکتوب اس کے ذریعہ بڑی بائی صاحب کی حویلی واقع پھاٹک حبش خان پر بھجوا دیا۔

ابھی خط پہنچا بھی نہ ہوگا کہ یہاں انتظار شروع ہو گیا، بلکہ نیک شگون کے طور پر ایک شعر بھی ہو گیا:

صد سحر و یک رقیمہ خط میر جی کا دیکھا
قاصد نہیں چلا ہے جادو مگر چلا ہے

لیکن کچھ بات بن نہ آئی۔ وہاں سے جواب کیا، کوئی اشارہ بھی نہ ملا کہ خط مل گیا ہے اور یہ بھی کسے پتا کہ مل ہی گیا ہو۔ میر طرح طرح کے بہانے کر کے پھاٹک حبش خان کی طرف جاتا، اس حویلی کے سامنے سے نکلتا، کہ شاید کوئی دیکھ لے اور بلاوا ہی آ جائے یا کوئی صورت مزید پیغام رسانی کی نکلے اور.... اور یہ تو شانِ سکندری ہوتی اگر نور خانم کہیں حویلی میں آتی جاتی دکھائی دے جاتیں۔ کبھی کبھی وہ دعا کرتا کہ وہاں پہنچ کر مجھے بے ہوشی آ جائے، یا کسی بے لگام دیو پیکر گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے آ جاؤں، کہ شاید اس حویلی کا کوئی ساکن مجھ پر رحم کھا کر اندر اٹھوا لے جائے۔ طبیب کے آتے تک تو میں اندر پڑا رہوں گا اور شاید وہ دیکھنے بھی آ جائیں، کہ یہ کون میرے دروازے پر حادثے کا شکار ہوا ہے۔ کبھی وہ محلے کے لونڈے سے باز پرس کرتا

کہ اب میرا خط تو کہاں اور کسے دے آیا۔

''قرآن قسم میر صاحب، میں آپ کا خط بس بالکل وئیں دے آیا جہاں آپ فرمائے تھے۔ زواب نئیں ملا کیا؟ چاہو تو اپنا پیسہ واپس لے لو۔ نئیں تو کہو اپنے خان پھر دوڑ کر چلے جاویں، زواب لے ہی کر پھریں۔''

میر کو ہنسی آجاتی، لاحول ولاقوۃ، میں بھی کیا باولا ہو ریا ہوں، وہ دل میں سوچتا۔ پھر وہ چونکتا، ''ہو ریا ہوں.... یہ میں کیا بول گیا؟ یہ اندرون سفیل والے میری زبان ہی خراب کر دیں گے۔'' وہ دل ہی دل میں مسکراتا۔ ''ٹھیک ہے، باہر والے میری عاقبت بگاڑ دیں، اور اندر والے زبان کا مثلہ کر ڈالیں۔ یہ دلّی ہے، یہاں جو ہو جائے تھوڑا ہے۔'' [میر پر دلّی کی زبان اتنا اثر کر گئی تھی کہ وہ بے خیال میں ''فصیل'' کی جگہ ''سفیل'' بول گیا اور خبر تک نہ ہوا، اسے اتنا ہی دھیان تھا کہ میں ''ہو رہا'' کی جگہ ''ہو ریا'' کہہ گیا ہوں، مرتب]

اگر میر کی حس مزاح اس کا ساتھ نہ دیتی تو شاید اسے دوبارہ جنون، یا ماخولیا کا شکار ہونا پڑتا۔ وہ خود پر ہنسنا جانتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے مقصد کی بات پر خوش طبعی سے ہنس سکتا تھا، جس طرح وہ اپنی اکبر آبادی زبان پر دہلی کی بولی کا اثر پھیلتے دیکھ کر ہنس سکتا تھا، اسی طرح وہ اپنے عشق، اور اپنی ہوس پر بھی ہنس سکتا تھا، اسے یہ گمان ہرگز نہ تھا کہ میرا عشق اس دُنیا سے باہر کسی اور دُنیا، کسی اور سیاراتی عالم، کسی اور کوکبی منطقے سے آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سب اسی دُنیا کے کھیل ہیں۔ میں نہ پہلا عاشق ہوں، نہ نور السعادۃ پہلی معشوق۔ اپنی اپنی دُنیا سب کو بہت بڑی لگتی ہے، ورنہ ہے یہ بہت ننھی سی، حقیر سی دُنیا۔ اس کے عشق کیا اور اس کی جاں کا ہیاں کیا، اس کی لیلیٰ کیا اور فرہاد کون۔ اس کی وحشتیں کیا، اس کی ناکامیاں کیا۔ یہ سب ایک بہت ہی چھوٹی سی بساط کے کھیل ہیں اور ہیں یہ سب کھیل۔ میں شاعر تو شاید بہت بڑا ہوں، مگر عاشق میں ویسا ہی ہوں جیسا کوئی بھی ہوتا ہے۔ اس میں بدن کے تقاضے بھی ہیں، انانیت کا دباؤ بھی، اور شاید.... شاید کہیں کوئی از خود رفتگی اور خود سپردگی، اپنے آپ کو مار کر کسی اور کے آپے میں کھو جانے کی تمنا بھی۔ لیکن یہ تمنا، یہ فنائے باطن بھی تنہا میری نہیں۔ مجھ سے پہلے کتنے ہی اس راہ پر چل چکے ہیں۔ کیا انسان اور کیا خدا، سب کی تلاش میں منزلیں ایک ہی سی ہیں، اور وہ سب کو طے کرنی پڑتی ہیں، مقصود ملے یا نہ ملے۔ اسے شیخ شرف الدین بوعلی قلندر سے منسوب ایک شعر یاد آیا، اور اس کے ساتھ ہی امیر خسرو کا بھی۔ حضرت بوعلی قلندر فرماتے ہیں:

غلام روئے او بودم اسیر موئے او بودم
غبار کوئے او بودم نمی دانم کجا رفتم

اور حضرت امیر خسرو کا شعر تھا:

در رہ بے نیازیت صد چو حسین کربلا
تشنہ بہ ماند بر گذر تا بہ زلال کے رسد

تو وہ ان لوگوں سے تو اوپر اڑ نہیں سکتا تھا.... آہ لیکن وہ بدن کیا بدن ہوگا جس سے ہمہ وقت خواہش کی خوشبو سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ کاش وہ بھی آنند رام مخلص کی طرح کہہ سکتا:

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبائے کیست کہ وا می کنیم ما

اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ عشق کا جنون ہو یا عقل کی عشوہ گری، یہ سب چلتی پھرتی چھاؤں ہیں۔ یہ سارا عالم ہی کوئی خواب ہے، جسے کوئی عظیم الشان ہستی کہیں دیکھ رہی ہے۔ کسی لامکانی دشت کو اپنا بستر بنائے، قاف تا قاف، بلکہ اس سے بھی وسعت کا دشت ہے، اور وہ ہستی، وہ وجود، جان بوجھ کر خواب بافی کر رہا ہے، اور ہم سب اسی خواب کی مملکت میں سایوں کی طرح دوڑتے پھرتے ہیں یا شاید پھر اس وجود کو بھی اپنے خوابوں پر قابو نہیں؟ کیا یہ سب کسی اور کے خواب ہیں جو وہ ہستی دیکھ رہی ہے۔ موت اور زیست میں کچھ فرق نہیں۔ خواب کے اندر سونا جاگنا برابر ہیں۔ ویدانت والے کہتے ہیں ساری کی ساری کائنات ایک اتھاہ شعور میں ہمہ وقت موجود ہے اور وحدت الوجودی کہتے ہیں لاموجود الا اللہ۔ تو پھر یا تو سب کچھ ہے، یا کچھ بھی نہیں۔ میں کسی سے عشق کروں، وہ میرے جال میں آئے نہ آئے، میں کسی کا شکار ہوں یا نہ ہوں۔ سب برابر ہے۔ میں کسی کو دیکھوں، یا کوئی مجھے نہ دیکھے، دونوں ہی برابر ہیں۔

لیکن.... شکار ہونے، خاک وخون میں نہانے، جامۂ عقل چاک کرنے، پھر جامہ بلباسی اتار پھینکنے اور پھر جامۂ ہستی کو قبا کرنے کا الگ مزہ کیوں ہو؟ مزہ الگ تو یقیناً ہے۔ روز کی زندگی سے بھاگ کر، عزت اور توقیر تج کر، کوئی ادھر کیوں جاتا ہے؟ یہ آندھی جو اس وقت میرے وجود کو اس طرح ہلا رہی ہے، جھنجھوڑ رہی ہے جس

طرح بید لرزاں کے پیڑ کو سمندری طوفان جھکاتا، پھر اٹھاتا، پھر جھکاتا ہے، کیا یہ اپنے آپ ہی اتر جائے گی، سو جائے گی؟ کیا یہ اپنا جواز آپ ہے، یا محض خود فریبی ہے؟ لیکن جو بھی ہو، جینے کا جواز، جینے کی لذت، جینے کی قیمت، یہیں ملتی ہے۔ یہی آندھی کچھ نہ کچھ گوہر مقصود کہیں نہ کہیں سے اڑا لائے گی۔

انسانوں کو کسی سے لگاؤ کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ میثاقِ ازل کا تقاضا ہے، یا انسان کے اس وحشی عہد کی یادگار ہے جب اسے قدم قدم پر نئی اور اجنبی موتوں کا سامنا تھا، اور افزائش نسل نہ ہوتی تو گھر، خاندان، اور پھر قبیلہ، سب مٹ جاتے؟ تو کیا عشق کچھ نہیں، بس بقائے نسل کا بہانہ ہے؟ نہیں، بقائے وجود بھی تو کوئی شے ہے، وہ خود سے کہتا۔ لسان الغیب نے کیوں کہا:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

لیکن وہ کون سے عشق ہیں جو دل کو زندہ کر دیتے ہیں، اور وہ کون سے دل ہیں جنھیں عشق اس طرح زندہ کر دیتا ہے؟ مجھے تو نور السعادۃ کا دل چاہیے، صرف اس مدت کے لیے کہ وہ اپنے بدن کو میرا بدن بنا دے۔ میں اسے بے لباس کروں، خود رات بھر جاگوں اور میرے بازو اس کے پہلو کی عریانی کے نیچے سو جائیں۔ اسے شہیدی قمی کا شعر یاد آیا:

خوش آں شبے کہ در آغوش گیرمت تا روز
بزید پہلوئے تو دست من بہ خواب رود

توبہ ہے، یہ بھی کوئی آرزو ہے، اس نے اپنے دل میں کہا۔ اگر کچھ ہے ہی نہیں، اس کے دل نے جواب دیا، تو جو تمنا رکھو، جس حسرت کو حسرت سے دل میں تکتے رہو، سب ایک ہے۔ میر کے یہ شعر اسی زمانے کے ہیں:

مجھ سا بے تاب ہووے جب کوئی
بے قراری کو جانے تب کوئی
اب خدا مغفرت کرے اس کو
صبر مرحوم تھا عجب کوئی

اور مخزوں بھی ہم سنے تھے ولے
میر سا ہو سکے ہے کب کوئی
کہ تلفظ طرب کا سن کے کہے
شخص ہوگا کہیں طب کوئی

مندرجہ بالا اشعار میں میر کی خودداری کے ساتھ اس کا باطنی کرب، اور سب سے بڑھ کر اس کے حس مزاح کی صفت بھی صاف جھلکتی ہے۔ اب یہ شعر دیکھیں:

ہستی اپنی احباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے
بارہا اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے
چشمِ دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

آیا جو واقعے میں درپیش عالم مرگ
یہ جاگنا ہمارا دیکھا تو خواب نکلا

مقام فنا واقعے میں جو دیکھا
اثر بھی نہ تھا گور منزل کا اپنے

مر کر بھی ہاتھ آوے تو میر مفت ہے وہ
جی کے زیان کو بھی ہم سود جانتے ہیں

گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا
اس طور دل سی چیز کو میں نے لگا دیا
تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے
دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا
سب شور ما و من کو لیے سر میں مر گئے
یاروں کو اس فسانے نے آخر سلا دیا

عشق وہ ہے کہ جو تھے خلوتی منزل قدس
وہ بھی رسوائے سر کوچہ و بازار ہوئے

یہ سب تو تھا، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ آنا تھا، نہ آیا۔ دن، بلکہ ہفتے، اور پھر کئی مہینے گذر گئے۔ بڑی بائی صاحبہ کی ساتوں محفلیں بھی ہو چکیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے اب وہ واپس ایران کو سدھاریں گی، کچھ کہتے تھے نہیں، اب وہ ہندوستان، بلکہ دہلی ہی میں رونق افزائے حیات ہوں گی۔ محمد تقی میر کے دل میں امید ایک لہر اٹھتی تو دس لہریں مایوسی کی، اس کے سارے وجود کو کھولتے ہوئے پانی سے نہلا دیتیں۔ رائے کشن چند کے پاس جانے کی ہمت نہ تھی۔ اسے سید خواجہ میر درد کے شاگرد قیام الدین قائم کا ایک شعر بہت پسند تھا۔ کیا طرفہ بات تھی کہ وہ شعر اسے اب یاد آیا، اور ایسے لمحے میں، جب اس کی بھی ہمت جواب دے رہی تھی:

نہیں کہتا میں دل ترک تمنا
پہ جتنی ہو سکے اتنی ہوس کر

اور لطف بالائے لطف یہ کہ اسی شعر کے مربیانہ لہجے نے اس وقت اسے جھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ اس رات اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ کل صبح پھاٹک حبش خان کی حویلی کا پھاٹک ضرور کھٹکھٹاؤں گا، ہو سو ہو۔

رات بھر اسی ادھیڑ بن میں اسے نیند نہ آئی تھی لیکن صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کی تقدیر کا سورج برج شرف میں پہنچ گیا۔ ابھی وہ گھر سے نکلنے کی تیاری ہی میں تھا کہ رائے کشن چند اخلاص کا پیغام پہنچا کہ جلد آ کر مل جاؤ۔

محمد تقی میر نے رائے کشن چند کے گھر تک کی راہ دھڑکتے ہوئے دل اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ پاؤں کے ساتھ طے کی لیکن وہاں پہنچ کر تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ اخلاص کہیں جانے کو تیار تھا، لیکن اس نے فوراً بڑی آؤ بھگت کے ساتھ میر کو بٹھایا۔

''آؤ میاں جان، عید ملو،'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مجھے وزیر الممالک بہادر کی پیشی میں دیوانِ خاص پہنچنا ہے اس لیے دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔ بس مطلب کی بات سن لو۔ مبارک ہو۔''

''کاہے کی مبارک دے رہے ہو رائے صاحب؟ شرحِ حال تو فرماؤ۔''

''میاں جان، اعتماد الدولہ نصرت جنگ بہادر نے بڑی بائی صاحب سے فرمایا کہ جس مقصود کے لیے انھیں سواد اصفہان سے دہلی جنت نشان تک آنے کی زحمت دی گئی تھی، وہ بفضلہٖ بخوبی پورا ہوا۔ اب انھیں آزادی ہے، دہلی سارے ہندوستان و دکن کا دل ہے، خلد منزل ہے۔ اگر وہ یہاں تشریف رکھنا چاہیں تو حویلی ان کی، ملازمان سرکار بھی ان کے۔ لیکن اب وہ خود کو اعتماد الدولہ بہادر کا پابند نہ سمجھیں، بس کبھی ان کی دعوت کو قبول کر کر رونق افزائے محل سرائے وزارت ہو جایا کریں تو کرم گستری ہوگی۔''

میر کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا، اور جب وہ بولا تو اس کی زبان میں لکنت تھی۔ ''یہ، یہ.... ک.... کیسے ہوا اور کیوں؟ کوئی ب.... بے مزگی تو نہیں پیدا ہو گئی؟''

''اماں نہیں۔ وزیر الممالک نواب قمر الدین خان جیسے فرشتہ صفت اور شائستہ مزاج شخص سے ایسی کسی بات کا سوال ہی نہیں۔'' پھر اس نے کچھ سرگوشی کے لہجے میں کہا، ''دو باتیں ہیں، لیکن ایک ذرا راز کی ہے۔''

''مطمئن رہیں، آپ میری طبیعت سے واقف ہیں۔''

''اسی لیے تو دونوں باتیں بتا رہا ہوں میاں جان،'' اخلاص نے میر کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ ''اول بات تو یہ کہ عمدۃ الملک نے اعتماد الدولہ سے درخواست کی کہ اجازت ہو تو وہ بھی کبھی کبھی ماں بیٹی کو اپنے زحمت دیں، یا ان کی حویلی پر محفلوں میں شریک ہوں۔''

''کون عمدۃ الملک، نواب امیر خان کا انجام؟''

''ہاں، اور کون یہاں عمدۃ الملک ہے؟ وہی صوبہ دار الٰہ آباد، فوجدار کوڑہ جہاں آباد، فوجدار کڑا مانک پور، قلعۂ معلیٰ میں اعلیٰ حضرت خدیو ہند محمد شاہ پادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ کے منھ لگے امیر۔''

''بھئی سبحان اللہ،'' میر نے کہا، ''تو ت پھر اعتماد الدولہ بہادر نے دست کشی ہی اختیار کر لی؟ بڑا جگرا ہے ان کا۔''

''اجی ان بائی صاحب لوگ جیسی کتنی تو ان کی جیب میں پڑی رہتی ہیں۔'' رائے کشن چند کی یہ بات میر کو بری لگی، لیکن اس بار بھی سکوت مناسب جان کر وہ چپ رہا۔

''اور دوسری بات؟'' میر نے بھی ذرا پست آواز میں پوچھا۔

کشن چند اخلاص نے اِدھر اُدھر دیکھا، گویا اطمینان کر رہا ہو کہ پاس کوئی ہے تو نہیں۔ پھر میر کی طرف بالکل جھک کر اس نے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ میر انتظام الدین خان بہادر کا رجحان نور بائی صاحب کی طرف دکھائی دیتا تھا۔ حضرت وزیر الممالک کو یہ بات پسند نہ تھی کہ اس نوعمری میں وہ یہ شوق شروع کر دیں اور خود اعتماد الدولہ بہادر کا ربط ضبط ماں بیٹی سے رہا تو میر انتظام الدین خان بہادر کو لازمی موقعے ملتے۔ لہٰذا سرکار نے وہ جڑ ہی کاٹ دی۔''

کشن چند اخلاص نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ادھر میر کے بھی دل میں پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں، دونوں دوستوں کے لیے راستہ پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر اور گفتگو کر کے دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔

گھر پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد، اس کے پہلے کے میر اپنی خوش نصیبی پر دل کھول کر ناز کرتا، اور نور السعادۃ کی حویلی کو جانے کے بارے میں کوئی منصوبہ بناتا، ایک چوبدار نے دستک دی، سلام کیا اور ایک مہر بند رقعہ میر کے ہاتھ میں دے کر یہ کہتا ہوا واپس چل دیا کہ جواب درکار نہیں ہے۔ میر نے رقعہ کھولا تو وہ اس کا اپنا ہی پرچہ تھا۔ لیکن حافظ کے مطلعے کا مصرع اولیٰ جو اس نے لکھا تھا، اس کے ٹھیک نیچے اسی مطلعے کا مصرع ثانی انتہائی خوش خط لکھا ہوا تھا:

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

میر کو شادیٔ مرگ ہوتے ہوتے بچی۔ لیکن جب ذرا اوسان ٹھکانے ہوئے تو اس نے عملی باتوں پر غور شروع کیا۔ کب جاؤں؟ پہلے سے اطلاع بھیج کر، ملاقات کا وقت متعین کرا کے جاؤں؟ کوئی تحفہ لے جاؤں؟ اگر لے جاؤں تو کیا لے جاؤں؟ تحفہ دونوں کے لیے ہو یا ایک کے لیے؟ اگر ایک کے لیے تو کس کے لیے؟ کیا معلوم ان کی منشا یہ ہو کہ ابھی آ جا، تحفے تحائف، یا تعین وقت کا اہتمام نہ کر، لیکن وہاں مجھے کوئی پہچانتا تو ہے

نہیں، ابھی چلا جاؤں تو اپنے بارے میں کیا کہوں، کیا کہہ کر خبر بھجواؤں، یہ کہوں کہ نور خانم کے بلائے ہوئے میر تقی، جو شاعر ہیں، وہ آئے ہیں؟ اور اگر کوئی پوچھے کہ ثبوت کیا ہے، تو کیا یہ پرچۂ کاغذ دکھا دوں؟ مگر وہ کہیں برا نہ مان جائیں کہ میرا خط دوسروں کو کیوں دکھایا؟

میر محمد تقی ان خیالوں میں گم تھا کہ اچانک آواز سنائی دی، ''بچیے گا جناب۔ ذرا ہٹ کے، میاں صاحب ہوت، ذرا بچ کے!'' اس نے گھبرا کر سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہ لال کنویں کے بازار سے گذر رہا ہے، اور کچھ ہی دور پر پھاٹک حبش خان، اور پھر بڑی بائی صاحب کی حویلی ہے۔ اے لو، میں یہاں کیسے اور کیوں پہنچ گیا؟ اس نے اپنے دل میں کہا۔ میں گھر سے نکلا کب؟ اب جو ذرا اور عقل ٹھکانے آئی تو دیکھا کہ وہی پرچۂ کاغذ ہاتھ میں ہے۔ شاید اسے دیکھتے ہی میں نکل کھڑا ہوا، گھر کو کنڈی بھی نہیں لگائی۔ اس نے دل میں کہا کہ یہ کوئی تائید غیبی معلوم ہوتی ہے۔ اب ان کی حویلی پر چلوں، ہو سو ہو۔

بڑی بائی صاحب کی حویلی کے عظیم الشان پھاٹک پر عام سے زیادہ چہل پہل تھی۔ لیکن آنے جانے والے زیادہ تر اہل حرفہ معلوم ہوتے تھے۔ شاید کسی جلسے یا جشن کا اہتمام تھا۔ کہیں چوکی پہرے والے مجھے بھی اہل حرفہ میں نہ سمجھ لیں، اس نے کچھ گھبرا کر دل میں کہا۔ لیکن اب تو پھاٹک سامنے ہی تھا، اور محافظ خانے سے باہر نکل کر ایک تنومند غیر ملکی سے شخص نے فارسی میں کسی سے کچھ کہا۔ لیکن نہیں، وہ تو اسی سے مخاطب تھا۔

''آں جناب کا اسم گرامی شاید میر محمد تقی المتخلص بہ میر ہے۔'' اس میں استفسار سے زیادہ خبر کا پہلو تھا، گویا وہ شخص محض تصدیق کر رہا ہو۔

''جی ہاں، میں ہی میر محمد تقی، شاعر ہوں،'' وہ کچھ اتنا حواس باختہ ہو رہا تھا کہ پہلے یہ جواب اس نے فارسی کے بجائے عربی میں دیا، لیکن فوراً ہی رک کر فارسی میں وہی بات دہرائی۔

''تو تشریف لائیں، جناب کا انتظار ہے۔''

یا مولا، یہ میں کیا دیکھ سن رہا ہوں؟ اس نے دل میں کہا۔ لیکن وہ قد آور محافظ اسے تیز تیز قدم چلا کر اندر کی ڈیوڑھی تک لے آیا۔ وہاں اس نے دق باب کیا، ایک اردا بیگنی باہر نکلی۔ محافظ نے میر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کسی اجنبی زبان، شاید ترکی میں کچھ کہا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ ادھر اردا بیگنی نے میر کو جھک کر سلام کیا، اور اسے اپنے پیچھے پیچھے اندر تک لے آئی۔

میر کو گمان تھا کہ مجھے دیوان خانے میں جایا جائے گا، لیکن نہیں، اردا بیگنی اسے دیوان خانے کے متصل

بائیں جانب کے ایک تنگ سے دروازے پر لے گئی۔ وہ دروازہ پردے میں اس طرح چھپا ہوا تھا کہ پہلی نظر میں معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ وہاں کوئی دروازہ ہے۔ دروازے کے پیچھے کوئی ایک گز چوڑی اور پانچ سات گز لمبی راہ داری تھی جس کے آخری حصے میں دونوں طرف دروازے تھے۔ ایک دروازے کو اردا بیگنی نے آہستہ سے کھولا، اور جھک کر سلام کرتے ہوئے میر سے فارسی میں کہا کہ اندر تشریف لے چلیے۔

کمرے میں دیوار تا دیوار قالین تھا۔ ہلکے سبز کنول روشن تھے، اور لونگ کی عطر کی لطیف خوشبو ہوا میں تھی۔ کمرے کے پرلے سرے پر قالین ہی کی طرز و قماش کا بھاری پردہ تھا۔ شاید اس کے پیچھے کوئی دروازہ ہوگا، میر نے خیال کیا۔ ایک دیوار سے ملا کر ترکی طرز کا دیوان بچھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہی اس سے مختلف، لیکن خدا جانے کیوں بالکل مناسب لگتی ہوئی دو کرسیاں تھیں۔ میر کو بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ نہایت قیمتی، اور محبت سے رکھی پڑھی جانے والی کتابیں ہیں۔

میر کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یوں ہی کھڑا ہونقوں کی طرح ہر چیز تکتا رہوں، یا کسی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ بظاہر یہ غیر رسمی سا و شاق ملاقات تھا، جہاں نور السعادۃ اپنی ہمجولیوں سے ملتی ہوگی۔ میرا بے تکلف بیٹھ جانا شاید مناسب نہ ہو، اس نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن یوں کھڑے کھڑے کب تک.... وہ نگاہ جھکا کر اپنے جوتوں کو دیکھنے لگا جو یوں بھی کچھ بہت اچھی قسم کے نہ تھے، اور اب تو ان پر راستے کی گرد بھی خوب جمی ہوئی تھی۔ مجھے جوتے اتار کر....

''تسلیمات،'' کسی نے فارسی میں کہا۔ ''تاخیر کے لیے شرمندہ ہوں۔ لیکن آپ تشریف تو رکھیں۔''

میر نے سراسیمہ ہو کر سر اٹھایا۔ کمرے کے دوسرے سرے کا پردہ اٹھا کر نور السعادۃ اندر آگئی تھی لیکن اسے خبر بھی نہ تھی۔ نہ معلوم کب سے وہ مجھے اس گنواروں کی طرح کمرے میں چاروں طرف تاکتے اور پھر اپنے گندے جوتوں پر غور کرتے دیکھ رہی ہوں گی۔ اس کے پاؤں لڑکھڑائے، اور وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ ڈھیر نہ ہوا، اس نے اپنے دل میں کہا۔ پسینہ بھی خشک کرنے کی ہمت نہ تھی۔

''م.... معافی کا خواستگار ہوں،'' اس نے نور السعادۃ کے قدموں پر نظر جمائے ہوئے کہا۔ ''م.... میں ک.... کچھ کھ.... کھو سا گیا تھا۔''

نور السعادۃ آگے بڑھ کر، نہیں بلکہ زمین سے ایک قدم اوپر ہوا میں تیرتی ہوئی سی آئی اور میر کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے اس قدر نزدیک کیوں آگئیں....؟ میر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے جھک کر

نورالسعادۃ کے پیروں اور جوتیوں کو بوسہ دیا، آنکھوں اور پیشانی سے لگایا، اور پھر انھیں اپنے سینے سے چمٹا کر یوں جکڑ لیا گویا اب زندگی اسی جگہ اور اسی طرح گذار دے گا۔ وہ بار بار دونوں پیروں کو چومتا رہا اور اس کے آنسو ٹپک ٹپک کر کبھی نورالسعادۃ کے پاؤں اور کبھی اس کے اپنے گریبان کو تر کرتے رہے۔ نورالسعادۃ بھی یوں ہی بے تعرض بیٹھی رہی، گویا وہ میر کے پاس والی کرسی پر اسی مقصد سے آ بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی وہ اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے ہلکی ہلکی کنگھی کرتی، کبھی اس کے بالوں کو تھوڑا الجھا کر پھر ہاتھ سے برابر کر دیتی۔ کہا لیکن اس نے کچھ بھی نہیں، گویا الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔

میر یہ کبھی نہ بتا سکا کہ کتنا عرصہ اس عالم میں گذرا، شاید اسے جھپکی سی آ گئی تھی۔ اتنا اسے یاد ہے کہ جب بھی اس نے اپنا ہاتھ نورالسعادۃ کے پاؤں سے آگے بڑھانا چاہا، اس کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ حتیٰ کہ وہ نورالسعادۃ کے ہاتھ بھی نہ چوم سکا۔ بس اتنا ضرور تھا کہ نورالسعادۃ نے اپنی بے حد لمبی چوٹیاں اپنی کمر پر دوپٹے سے کس رکھی تھیں۔ کبھی کبھی ان نیلگونی مائل سیاہ گیسوؤں کا کوئی طرہ میر کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے بھی آنکھوں سے لگاتا اور بوسہ دیتا۔

ان دونوں میں اس وقت کی پہلی بات چیت جو اسے یاد رہی، شاید دراصل پہلی نہ تھی۔ ممکن ہے دونوں نے کچھ خواب گوں انداز میں اظہارِ محبت، یا اظہارِ شوق کیا ہو۔ میر نے ایک شعر اس واقعے کے کوئی پچاس برس بعد، اور پھر ایک اور شعر ساٹھ باسٹھ برس بعد کہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پہلی ملاقات کی پائے بوسی نے اس کے دل پر کیسا گہرا اثر ڈالا تھا:

پاؤں چھاتی پہ میری رکھ چلتا
یاں کبھو اس کا یوں گذارا تھا

پاؤں پہ سر رکھنے کی مجھ کو رخصت دی تھی میر ان نے
کیا پوچھو ہو سر پر میرے منت سی منت ہے اب

''تمھیں میں نے بہت یاد کیا، اور تم نے....؟'' اس نے ہندی میں کہا۔ اس کی آواز میں لبیبہ خانم کی آواز کی جھمک تھی، لیکن نوعمری کے باعث اس میں چاندی کی گھنٹیوں جیسی صفائی تھی، گویا سنگِ مرمر کا مجسمہ،

جس کی ہر لکیر انتہائی صفائی اور نزاکت سے تراشی گئی ہو۔ اس کی ہندی رواں تھی، لیکن اس کے لہجے پر ایرانیت غالب تھی۔ مذکر مونث میں بھی ایک آدھ بار غلطی کر جاتی تھی۔ ہندی کی مخلوط اور ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ آوازیں وہ ابھی ادا نہ کر سکتی تھی، اور یہ ذرا سا توتلا پن اس کے منھ سے اس قدر بھلا لگتا تھا کہ جی چاہتا تھا ہر لفظ پر منھ چوم لیجیے۔

''یاد نہیں کیا، جان اور ایمان اور محبت کو دعا کرتا رہا۔''

''یہ کیا بات ہوئی، کیا یہ کوئی نیا انداز ہے بھولنے بھلانے کا؟''

''نہیں۔ تمھاری جان کو دعا کرتا رہا کہ تم نے مجھے اتنی بڑی دولت بس اٹھا کر دے دی۔ سخاوت ہو تو ایسی ہو اور ایمان کو دعا کرتا رہا کہ میرے دل میں یا وہ رہتا یا تمھاری صورت۔ اس نے چپ چاپ تمھارے لیے جگہ خالی کر دی اور محبت کو دعا کرتا رہا کہ میری جان نہ لے جائے کہ میں محبت کرتا رہوں۔''

''باتیں اچھی کر لیتے ہو۔'' اس نے میر کے رخسار پر ہلکی سی چپت لگائی۔

''نہیں، سچ یہ ہے کہ یاد کرتا بھی کیونکر:

تیرے بےخود جو ہیں سو کیا چیتیں
ایسے ڈوبے کہیں اچھلتے ہیں''

''چیتیں؟'' اس نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ذرا سوچنے کے لہجے میں پوچھا۔ ''چیتیں چہ معنی دارد؟''

''اہل ہندی 'بہوش آمدن' را 'چیتنا' می گویند،'' اس نے جواب دیا۔

''درست۔ تم مبالغے کے ماہر لگتے ہو،'' اس نے فارسی میں کہا۔ ''مگر شعر اچھا کہتے ہو۔''

''مجھے اپنی شاعری بہت پیاری ہے، کہ اسی نے مجھے تم تک پہنچایا۔''

''سو تو ہوا،'' اس نے عجب اندازِ دلربائی سے کہا، ''لیکن اگر تم اچھے عاشق ثابت نہ ہوئے تو تمھاری شاعری کس کام کی؟''

''اچھا عاشق، یعنی....؟'' وہ پھر کچھ گڑبڑا گیا۔

''یہ پھر بتاؤں گی۔'' میر نے سمجھا کہ نور السعادۃ ہی مطایبہ کر رہی ہے۔ لیکن جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے پر بلا کی متانت تھی۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ کیا جواب دوں۔ بے ساختہ اس کی زبان پر اپنے یہ شعر رواں ہوئے:

خورشید صبح نکلے ہے اس نور سے کہ تو
شبنم گرہ میں رکھتی ہے یہ چشم تر کہ ہم
یہ تیغ ہے یہ طشت ہے یہ ہم ہیں کشتنی
کھیلے ہے کون ایسی طرح جان پر کہ ہم

میر کا خیال تھا ان شعروں پر نور السعادۃ کچھ شگفتہ ہوگی، لیکن وہ یہ دیکھ کر کانپ گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اسے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی اور نہ وہ سمجھ ہی سکا کہ نور السعادۃ کا مدعا کیا ہے۔ اس نے اس کا ہاتھ تھام کر دلجوئی کے کچھ لفظ کہنے کی کوشش کی، لیکن نور السعادۃ نے اپنا ہاتھ جھٹک کر چھڑا لیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

''میرے دل میں کچھ خوف ہیں۔'' بالآخر اس نے مہر سکوت توڑی۔ میر چونک کر کچھ کہنے والا تھا کہ نور السعادۃ نے ذرا سخت سے کہا۔ ''چپ، بس چپ سنتے رہو، ورنہ میں بھی چپ ہو جاؤں گی۔''

میر نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنے کا اشارہ کیا۔ اس پر اچانک وہ تھوڑی سی شگفتہ ہوئی، ''یہ طریقہ ہم ہندیوں کا اچھا ہے، عفو طلب کرنے کا۔ منھ سے کچھ نہ بولو، بس کفِ دست جوڑ کر رہ جاؤ۔ اگلا کچھ بول ہی نہ سکے۔'' وہ فوارے کی طرح کھلکھلائی۔ ''اور تم لوگ بات بات پر کان کیوں پکڑتے ہو؟''

میر نے سوچا، میں بھی تھوڑا ہنسا دوں، شاید یہی سلسلہ چل نکلے۔

''ہاں، ہم لوگ کان پکڑتے ہیں مگر کھاتے نہیں....'' نور السعادۃ مسکرائی، لیکن بات کاٹ کر بولی، ''اچھا میری بات سنو۔ بس۔''

وہ اچانک پھر محزوں ہو گئی۔ ''بچپن ہی سے میں کچھ خواب دیکھتی رہی ہوں۔ کچھ دھندلے، کبھی دھوپ کی سوئی کی طرح تیز اور روشن۔ اور اب وہ خواب یقین میں بدل گئے ہیں۔''

اس کے بدن میں ہلکی سی لرزش تھی، جیسے تپ آنے والی ہو۔ اس نے اپنے پاؤں کھینچ کر گھٹنے موڑ لیے اور نیم زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس طرح بیٹھنے میں اس کے نازک نازک پاؤں زانوؤں کے نیچے چھپ گئے، کبھی کبھی ایڑی یا انگلی جھلک جاتی۔ صراحی دار بیاض گردن اٹھی تو جوبن کچھ تن گئے، کمر کی تنگی اور گات کا ابھار نمایاں ہو گئے۔ یہ سب ادائیں، جو نور السعادۃ نے غیر شعوری طور پر اپنی ماں سے حاصل کی تھیں، میر کو بہت اچھی لگیں۔

اس نے نور السعادۃ کی جوتیوں کو اور بھی اپنائیت کے ساتھ اپنی گود میں بھر لیا۔

نور السعادۃ کی آنکھوں کے گوشے سے آنسو سے جگمگا رہے تھے، لیکن اس نے اپنی نظریں میر کے چہرے پر گاڑ دیں، اور کہنے لگی:

''مجھے رسوا ہونا ہے۔ میں تنہائی کی موت مروں گی۔ اور میری ماں.... میری ماں مجھ سے آزردہ رہیں گی۔''

''شاہ زادی، یہ تم کیا کہہ رہی ہو، کیا کسی منجم....'' لیکن اس نے پھر میر کی بات مکمل نہ ہونے دی۔ ''میری تمنا ہے کہ وہ میرا عاشق ہو جو مجھے رسوائی سے، تنہائی کی موت سے، اور میری اماں کی آزردگی سے بچا لے۔''

میر سکتے میں آ گیا۔ نوشتۂ تقدیر ہو تو کوئی اسے دعا تعویذ سے بدلنے کی سعی کرے۔ جو مرض ہو کوئی دوا کرے، جو بلا ہو کوئی دعا کرے۔ لیکن یہاں تو جہانِ دیگر تھا۔

''تمھارے آسمان ناز پر رسوائی کے خفیف ترین بادل کا سایہ بھی نہ آنے پائے گا کہ میں تمھاری دُنیا سے نکل جاؤں گا،'' میر نے بالآخر سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ''اور تنہا تو تم کبھی ہو ہی نہیں سکتیں نور خانم۔ تم تو اپنے آپ میں خود مکمل ہو۔ تنہا نہ ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عاشقوں کا ہجوم ہو۔ تنہا نہ ہونے کے معنی ہیں نفس مطمئنہ حاصل ہونا، اور وہ تمھیں شروع سے حاصل ہے اور ہمیشہ حاصل رہے گا۔''

پھر میر نے جامی کی 'یوسف زلیخا' کے شعر بڑے جوش سے پڑھے۔ یہ شاہد مطلق کی شان میں تھے:

جمال مطلق از قید مظاہر
بہ نور خویش ہم بر خویش ظاہر
دل آرا شاہدے در حجلۂ غیب
مبرا دامنش از تہمت عیب
صبا از طرہ اش نگسستہ تارے
نہ دیدہ چشمش از سرمہ غبارے
نوائے دلبری با خویش می ساخت
قمار عاشقی با خویش می باخت

''تم بھی تو اسی وجود کا ظل ہو، اسی نور کا ایک ٹکڑا ہو۔ تمھیں زوال کہاں، تمھیں تنہائی و رسوائی کا کیا خوف؟''

نورالسعادۃ کا چہرہ دمک اٹھا۔ ''سچ کہا تم نے۔ یہ کس کے شعر ہیں؟ مجھے اور بھی سناؤ۔''

میر نے اس موقعے کے اور بہت سے شعر پڑھے۔ نورالسعادۃ کے دل کی دھڑکنیں شاید تیز ہو گئی ہوں، لیکن اس کے چہرے پر دلجمعی کا فروغ تھا۔

کچھ دیر بعد نورالسعادۃ نے میر کی گود سے اپنی جوتیاں کھینچ کر پہنیں، لیکن چلنے کے لیے اٹھی نہیں۔ میر نے جوتیوں کے پہننے کو اپنے لیے اشارہ جانا، اور اٹھنے کا ارادہ کیا تو نورالسعادۃ نے اس کے شانے کو دبا کر اسے بٹھائے رکھنے کا عندیہ ظاہر کیا، اور بولی:

''جانتے ہو میں نے تمھیں کیوں بلوایا؟''

''مجھے سرفراز کرنے کے لیے، اور کاہے کو؟''

''ہشت، تم مردوں کو صرف سبز اندر سبز ہی دکھائی سنائی دیتا ہے۔ بھولے بے وقوف....'' اس خطاب پر میر نہال ہی تو ہو گیا۔ سر جھکا کر بولا، ''بجا ارشاد، جانی و جہانی۔''

''سنو، عمدۃ الملک نے اماں سے بات کی تھی۔ میں ان کی پابند ٹھہرا دی گئی ہوں، لیکن گانے کے سوا کوئی خدمت نہ ہو گی۔ عمدۃ الملک کو یہاں آنا ہو گا تو کہلا کر آئیں گے اور اگر بلانا ہو گا تو کئی دن پہلے بتا دیں گے۔ عام محفلوں میں تم مجھ سے مل سکتے ہو، عام لوگوں کی مانند۔ لیکن یہاں آنے کے لیے تمھیں میرے بلاوے کا انتظار کرنا ہو گا اور....''

''تو کیا روز ملنا نہ ہو گا؟'' میر نے گھبرا کر پوچھا۔

''بہت خوب میر صاحب۔ آئینے میں آج منھ نہیں دیکھا کیا؟ وہ ہنسی، لیکن اس میں کوئی تمسخر نہ تھا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی، ''اور دیکھو، ہمارے یہاں کب جاتے ہو، کب آتے ہو، اس کی خبر کسی کو نہ ہو۔''

''مجال نہیں جو اس حکم سے سرِ مو تجاوز کروں۔'' وہ مسکرایا، ''اور اپنے خزانے کی تشہیر، احمق ہی ہو جو یہ کام کرے۔''

''اب سدھارو، بہت باتیں نہ بناؤ، مرد بچوں کے چھچھورے پن کا حال میں خوب جانتی ہوں۔ لیکن سن رکھو، مجھے رسوا کیا تو پچھتاؤ گے۔''

یہ کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”دیکھو، پرسوں شب آدینہ کو میرا اس شہر، بلکہ ساری زندگی کا پہلا مجرا ہے، عمدۃ الملک کے یہاں۔ آسکو تو آنا۔“

”جان درمیان ہو تب بھی آؤں گا۔“ میر نے سر جھکا کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ نورالسعادۃ نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا کہ خدا جانے کس طرح وہ ایک قدم آگے بڑھ آئی اور اس نے خود کو میر کی آغوش میں پایا۔

میر نے اس کے منھ، پیشانی، ناک، کان، گردن، رخسار پر درجنوں بوسے دے ڈالے۔ نور خانم تھوڑی دیر تو کسمسائی، پھر اس نے چپکے سے میر کے منھ کو خود پیار کر کے اپنا سر اس کے سینے پر ٹکا دیا۔ لیکن جب میر نے 'اے کاش وہ زبان ہو اپنے دہن کے بیچ' پر عمل کرنا چاہا تو نورالسعادۃ نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے آہستہ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا، ”اب جاؤ، نکلو۔ نہیں تو چانٹا مار دوں گی۔“

میر کو کچھ یاد نہیں کہ وہ کس طرح باہر آیا، اور اس وقت کیا ساعت تھی۔ نہ اس ملاقات کا کوئی حال ہی وہ اس وقت، یا اس کے کچھ دن بعد بھی، قلم بند کر سکا۔ لیکن اس پہلی بغل گیری اور ہم آغوشی کی لذت اور فرحت اسے شاید کبھی نہ بھولی۔ وہ اس پر تا حیات مباہات کرتا رہا جیسا کہ اس کے مندرجہ ذیل شگفتگی آمیز شعروں سے مترشح ہوتا ہے جو برس ہا برس بعد اس نے لکھے:

آخر عدم سے کچھ بھی نہ بگڑا مرا میاں
مجھ کو تھا دستِ غیب پکڑ لی تری کمر

کب تلک یوں لو ہو پیتے ہاتھ اٹھا کر جان سے
وہ کمر کولی میں بھر لی ہم نے کل خنجر سمیت

بخت برگشتہ پھر جو یار ہوئے
اس طرح مجھ سے وے دو چار ہوئے

وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے
پر تصرف میں ایک اور کے تھے

کرتے ظاہر میں احتیاط بہت
مجھ سے بھی رکھتے اختلاط بہت

رفتہ رفتہ سلوک پیچ آیا
ہاتھ پاؤں کو اپنے لگوایا

گاہ بے گاہ پاؤں پھیلاتے
میری آنکھوں سے تلوے ملواتے

ہنس کے سینے پہ پاؤں رکھ دیتے
دل مرا یوں بھی ہاتھ میں لیتے

گہ گہے دست دی ہم آغوشی
ہم سری ہم کناری ہم دوشی

جس دن محمد تقی میر اور نور السعادۃ کے درمیان راز نیاز ہوئے، اس کے اگلے دن سہ پہر کو رائے کشن چند اخلاص عام سے زیادہ سج دھج اور آن بان کے ساتھ پھاٹک حبش خان کی حویلی پر پہنچا۔ پیچھے ایک نوکر جھلی سر پر رکھے ہوئے، اس کے پیچھے دو اور، سروں پر خوان دھرے ہوئے۔ جھلی اور خوان سب پر زرکار سرپوش۔ رائے اخلاص کو فوراً دیوان خانے میں بٹھایا گیا۔ تینوں نوکر دیوان خانے کے دروازے پر بارہ دری میں رہے۔ کشن چند کو اصفہان کی پہلی ملاقات یاد آئی۔ اس نے دل میں دعا کی کہ جس طرح اُس ملاقات کا انجام اچھا ہوا، اسی طرح اس کا بھی انجام بخیر ہو۔

چند ہی لمحوں بعد لبیبہ خانم دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ رائے کشن چند نے سرو قد ہو کر تین بار تعظیم دی اور کہا:

''خانم بزرگ، آزادی نسیم مبارک ہو۔''

لبیبہ کو رائے کشن چند کا مطلب سمجھنے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ لیکن اس نے تجاہل عارفانہ سے کہا، ''بہت

خوب، آپ کو بھی مبارک ہو۔ لیکن بطور خاص مجھے یہ مبارک باد کیوں؟'' شاید وہ چاہتی تھی کہ رائے کشن چند کی زبان سے حرف مدعا صاف صاف ادا ہو، اور شروعات بھی وہیں سے ہو۔

''جناب عالیہ، دلوں پر ایک قدغن تھی، وہ ہٹ گئی۔ اب آپ کسی کی پابند نہیں، اور میں غل و زنجیر وفاداری میں بندھا ہوا نہیں۔ دست و پا آزاد ہیں۔''

وہ ہنسی۔ ''بندھے ہوئے دست و پا شل ہو جاتے ہیں تو کھلے ہوئے دست و پا ٹوٹتے بھی ہیں، خاص کر جب وہ گستاخ ہوں۔''

''جو گستاخ ہوتے ہیں، وفادار نہیں ہوتے۔''

''درست، ہمیں گوئے ومیداں۔'' اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس گفتگو سے خوش ہوئی ہے۔ رائے کشن چند نے اشارہ کیا تو تینوں نوکر ایک ایک کر کے اندر آئے۔ انھوں نے اپنے سروں کا بوجھ اتار کر قالین پر رکھا، پھر سات سلام کر کے الٹے پاؤں باہر چلے گئے۔

''رائے صاحب، آج کیا لے آئے، اور کس کے لیے؟'' خانم بزرگ اب بھی اسے چھیڑنے ہی کے انداز میں تھی۔

''اس کے لیے جس کے لیے مجلس آفاق کی ہر چیز ہے۔ جس کے پاس سب کچھ ہے لیکن ایک شے نہیں۔''

''وہ کیا شے ہے، اور آپ کیا وہی لے کر آئے ہیں؟'' لبیبہ خانم نے پہلی بار کچھ ایسے لہجے میں بات کی جس میں ذرا لگاوٹ کی مہک تھی۔

''وہ تو میں روز ہی لاتا ہوں، لیکن آپ اعتنا ہی نہیں کرتیں۔''

''اچھا، ایسی کون سی شے ہے؟ آپ تو اچھے خاصے شاعر تھے، میر حیدر معمائی کے شاگرد کب سے ہو گئے؟''

رائے کشن چند کا دل زور سے دھڑکا، کہوں کہ نہ کہوں، اس نے اپنے دل سے پوچھا۔ دل نے کہا، کہہ دے۔ اس سے بہتر موقع کون سا ہوگا؟ اور اگر کہنا نہیں تھا تو اس طرح تیار ہو کر آیا کیوں تھ؟ ان کی خفگی کا خطرہ ہے؟ وہ تو ہے ہی۔ کب نہ تھا؟ 'سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا'، اسے محمد تقی میر کا مصرع یاد آیا۔

''کیا ہوا، چپ کیوں ہو گئے جناب؟ بات شروع کی تو اسے ختم بھی کرتے یا کیا اہل دہلی کے رواج ان معاملات میں کچھ اور ہیں؟''

اخلاص کو ان الفاظ میں صاف صاف اجازت، بلکہ دعوت نظر آئی۔ آخر وہ بول پڑا:

''آپ کے یہاں جو شے نہیں ہے وہ کشن چند اخلاص کے نقش قدم ہیں، کہ آپ کی چوکھٹ کے آگے ان کو بار ہی نہیں۔''

خانم بزرگ یقیناً ایسی ہی کسی بات کی متوقع تھی، لیکن جب وہ بات کہی گئی تو اس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اسے کچھ خوف اور خطرے کا بھی احساس ہوا، اور مسرت کے اہتزاز کا بھی۔ اس کا چہرہ ان مختلف کیفیات کی آئینہ داری کرنے سے قاصر تھا، اور یہ آسان تھا کہ وہ چپ ہو کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔

رائے کشن چند گھبرا گیا کہ اب کیا کروں، کیا کہوں۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر لبیبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینے کی ہمت کر رہا تھا کہ وہ بہت دھیمی آواز میں بولی:

''رائے کشن چند، آپ نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا۔ میں خود کو اس اعزاز کا مستحق نہیں سمجھتی۔''

''یہ آپ کیا فرماتی ہیں؟ میں البتہ....''

لبیبہ خانم نے عجب شاہانہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر اخلاص کو مزید کچھ کہنے سے روکا، پھر وہ کہنے لگی:

''مجھے بایزید شوقی کے بعد، اور اس کے پہلے بھی، کوئی شخص نہ ملا جس کی طرف دیکھنے کا بھی میرا دل چاہے۔''

اچانک اس کے لہجے میں لگاؤ کی ہلکی سی گرمی پیدا ہو گئی۔ ''تم کو دیکھنے اور تم سے بات کرنے پر جب میرا جی مائل ہونے لگا تو میں بہت ڈری۔ میں تو ہمیشہ کے لیے بایزید سے بیاہی جا چکی ہوں، ایک بار نہیں، زندگی کی ہر سانس کے ساتھ۔ تمھارا میلان بھی مجھ پر کھل چکا تھا، لیکن مجھے اس سے کوئی خوف نہ تھا۔ خوف تو مجھے اپنے سے تھا، اور ہے....''

اس نے رک کر اپنے آنسو خشک کیے۔ ''میں کاروبار شوق میں مفلس اور تہی ہوں، لیکن تمھاری باتیں نہ جانے کہاں سے خزانے لے کر آجاتی ہیں اور میرے قدموں اور دامن کو گوہر تمنا سے بھر دیتی ہیں۔ میں نہ چاہتی تھی کہ پردہ کھلے اور بات آگے بڑھے۔ میرے دل کا، میری روح کا، بڑا حصہ خاکستری ریگ رواں بن چکا ہے۔ وہاں کچھ ٹھہر نہیں سکتا، اگ نہیں سکتا۔ لیکن جو سلامت ہے اس کے گلی کوچوں میں تم مجھے آواز دیتے

ہوئے سے لگتے ہو۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ شاید وہ کشن چند کی طرف سے کسی جواب، کسی وعدے، کسی اقرار واعلان کی توقع کر رہی تھی، یا شاید اس میں اب مزید کہنے کی تاب نہ تھی۔ کشن چند اخلاص بت بنا بیٹھا اپنے دل کی دھڑکن سنتا رہا۔ ایک لمبے سکوت کے بعد وہ بولی:

"کیا جانے ریت اور راکھ کی یہ بستی تمھیں راس بھی آئے گی، کہیں تم اس کی ویرانیوں سے گھبرا نہ اٹھو۔"

"ایسا نہ کہو، ایسا ہرگز نہ ہوگا۔"

"میں تمھیں چوکھٹ کے پار تو بے شک بلا لوں،" اس نے گویا رائے کشن چند کی بات سنی ہی نہیں تھی، "لیکن وہاں ویرانی بہت ہے۔"

"اس ویرانی میں جان دے دینا مجھے دلّی پر راج کرنے سے بہتر ہے،" اخلاص نے بڑے عزم سے کہا۔ "ہم دونوں ہی اکتاہٹ کی منزلوں سے بہت دور آچکے ہیں اور طفلانہ دل آرامیوں کے رنگ بھی ہمارے دلوں سے کب کے اڑ چکے ہیں۔ ہوس تم میں کبھی تھی نہیں، اور اس شہر ہوس کے ہر کوچے میں مدتوں آیا گیا ہوں۔ اب وہاں میرے لیے کشش کا کوئی سامان نہیں۔"

وہ دفعتاً اٹھ کھڑا ہوا۔ "پھر اب کاہے کا ڈر؟ تم آفتاب ہو، میں ذرہ۔ ذرہ کتنا ہی مٹ میلا ہو چکا ہو، آفتاب کے محاذ میں آخر روشن ہو ہی جاتا ہے اور آفتاب کتنا ہی گہنا گیا ہو، لیکن جیب کفن کی زینت بھر کے لیے داغ تو دے ہی سکتا ہے۔"

رائے کشن چند اخلاص کا اگلا قدم اسے لبیبہ خانم کے برابر لے آیا۔ وہ جھجک کر ذرا پیچھے ہٹی، لیکن اخلاص نے اس کی ٹھوڑی اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، اسے اپنی طرف کھینچا۔ کسی مزاحمت کے بغیر وہ گویا بے ارادہ اس کے سینے سے آلگی۔

عمدۃ الملک نواب محمد امیر خان انجام کے باپ کا نام میر خان تھا، لیکن اورنگ زیب نے ازراہِ لطف اس میں ایک الف کا اضافہ کر کے امیر خان کر دیا۔ شاہ نعمت اللہ ان کے جد اعلیٰ تھے۔ نواب امیر خان کو بارگاہِ عالم گیری میں تقربِ خاص حاصل تھا۔ وہی صورت اب ان کے بیٹے کی تھی جو عمدۃ الملک کے خطاب سے مخاطب، اور محمد شاہ پادشاہ غازی کے مقربین خاص میں تھے۔

محمد امیر خان انجام چھوٹے قد کے دبلے پتلے شخص تھے۔ ان کی بوٹی بوٹی سے ذکاوت ٹپکتی تھی۔ چھوٹے ڈیل کے باوجود وہ اپنی روشن آنکھوں، متبسم چہرے، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے باعث ہر محفل میں ممتاز نظر آتے تھے۔ معاملات ملکی ومالی، حُسن انتظامِ ریاست، اور کارہائے سفارت میں اس وقت کوئی ان کا حریف نہ تھا۔ اس پر مستزاد ان کی شعرفہمی، شعرگوئی اور سخاوت۔ سینکڑوں ہی اربابِ علم وفن کی سرپرستی اور پرورش ان کی سرکار سے ہوتی تھی۔

شعرا اور ارباب طرب پر وہ خاص مہربانی فرماتے۔ موسیقی کے اتنے بڑے ماہر کہ بڑے بڑے ڈوم اور کلاونت ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ خود وہ فارسی کے شاعر تھے، ریختہ بہت کم کہتے تھے، لیکن اس فن کے بھی رموز سے وہ خوب باخبر تھے۔ نگاہ اکثر نیچی رکھتے اور جتنا گرم فقرہ کہتے اسی قدر متانت سے، نگاہ نیچی رکھ کر، رواداری میں کہتے تھے۔ چھوٹے قد اور نازک ہاتھ پاؤں کے باعث بعض اوقات وہ زنانہ لباس پہن لیتے تو لوگوں کے لیے انھیں پہچاننا محال ہو جاتا۔

صفر 1147ھ [مطابق جولائی 1734ء، مرتب] میں جب شیخ علی حزیں لاہیجی باحال پریشان، جان بچا کر ایران سے دہلی آئے تو سب سے پہلا آستانہ جس پر انھوں نے جبہ سائی کی، عمدۃ الملک کا ہی تھا اور نواب موصوف نے علی حزیں کی اعلیٰ ترین توقعات سے بڑھ کر ان کی مربی گری کی۔ خود جو کچھ سلوک انھوں نے علی حزیں کے ساتھ کیا وہ تو الگ، سب سے بڑی بات یہ کہ عمدۃ الملک نے انھیں بارگاہ محمد شاہی تک رسائی دلوا دی جہاں سے شیخ علی حزیں کو بیس لاکھ روپے کی خطیر رقم شاہی خزانے سے یک مشت عطا کی گئی۔

اب اسے شیخ کے مزاج کی ٹیڑھ اور سبھاؤ کی کڑواہٹ کہیں، یا ان کی احسان فراموشی اور تنگ جبینی، کہ اس کے باوجود وہ ملک ہند کو 'شبستان تیرہ روز'، اور یہاں کے شعرا کو 'پوچ گو' کہتے تھے اور ہندوستان کے فارسی گویوں کو مستند سمجھنا تو دور رہا، ساقط المعیار، اور زبان کی لطافتوں سے بے بہرہ جانتے تھے۔

ایک بار شہزادہ احمد شاہ کے دودھ شریک بھائی نواب اشرف علی خاں فغاں نے محمد شاہ پادشاہ کے حضور مطلع پڑھا:

شمع رو مت راہ دے خلوت میں پروانے کے تئیں
اے ترے قربان ہم کیا کم ہیں جل جانے کے تئیں

سب نے تحسین کی۔ عمدۃ الملک نے کہا، ''نواب صاحب، شعر یوں تو نہایت رنگین، اور مضمون نہایت روشن ہے۔ لیکن اگر 'اے ترے قربان' کی جگہ 'اے ترے بل جائیں' ارشاد ہو تو مطلع کسی اور ہی رتبے کا ہو جاتا، کہ 'بل جائیں ہم' کا فقرہ سوختن پروانہ کے ساتھ مناسبت کلی رکھتا ہے۔''

سب یہ اصلاح سن کر پھڑک اٹھے، یہاں تک کہ حضرت ظل سبحانی بھی زبانِ معجز بیان سے گویا ہوئے:

''سبحان اللہ، اے ترے بل جائیں ہم۔ عمدۃ الملک درست گفتید۔ جان در قالب شعر دمیدہ شد۔''

خان دوراں صمصام الدولہ عبدالصمد خان بہادر جنگ، جنھوں نے اپنی بہادری، حُسن تدبیر، اور حکمتِ عملی تینوں کے باعث بڑا نام پیدا کیا تھا، ہمیشہ اس فکر میں رہتے کہ عمدۃ الملک کو لاجواب کر دیجیے۔ چنانچہ ایک بار بھرے دربار میں انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک بات کہی:

''ظل سبحانی، تحریر شاہد ہے کہ ہر فرقہ جس کے نام کے آگے 'بان' لگا ہوتا ہے، اس کے لوگ مفسد اور اکثر غدار ثابت ہوئے ہیں، مثلاً شتربان، گاڑی بان، بہلی بان، وغیرہ۔''

بادشاہ نے عمدۃ الملک کی طرف دیکھا۔ انھوں نے دایاں ہاتھ سینے پر بائیں طرف رکھا اور خان دوراں کو مخاطب کر کے کہا، ''درست ہے مہربان۔''

بہ آواز بلند ہنسنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا، کہ دابِ شاہی کے منافی تھا۔ لیکن خان دوراں کی شرمندگی کے خیال سے کسی نے آنکھ بھی اونچی نہ کی۔ نادر شاہ کے حملے میں جن محمد شاہی سرداروں نے دفاع دہلی میں اپنی جان قربان کی، ان میں خان دوراں عبدالصمد خان بھی تھے۔

عمدۃ الملک کا دست سخا میر محمد تقی تک بھی گاہے ماہے پہنچ جایا کرتا تھا۔ لہٰذا دونوں میں معرفی تو تھی ہی، اور اس وقت تو نواب رعایت خان کا توسل بھی تھا، لہٰذا میر کو وقتِ مقررہ پر عمدۃ الملک کی عالی شان محل سرا میں داخل ہونے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

اس وقت نور بائی کی شہرت، اور خاص کر یہ بات، کہ یہ ان کا پہلا مجرا ہے، دہلی کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ بہت سے امرا تو بن بلائے پہنچ گئے تھے، اور پھاٹک کے باہر کان لگا کر سننے والوں کی تو گنتی نہ تھی۔ میر کو حسن اتفاق سے اعتمادالدولہ کے متعلقین اور متوسلین میں جگہ ملی، اس لیے وہ محفل کا لطف بخوبی اٹھا سکا۔ اس نے اپنی خوش طالعی پر شکر کیا کہ جہاں وہ تھا وہاں مطربہ کی آواز، اور ہر ساز کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔

نور خانم کی طرف نظر بھر کر دیکھنے کا تو خیر امکان ہی نہ تھا، لیکن میر کی نشست اور مطرب اور سازندوں کی نشست میں کچھ خاص فاصلہ نہ تھا، لہٰذا وہ اِدھر اُدھر نظریں کرنے کے بہانے اسے بھی دیکھ لیتا تھا۔ نور السعادۃ نے ایک بار اس سے آنکھیں چار کیں، لیکن اس طرح، جیسے یہ بات اتفاقیہ پیش آ گئی ہو۔ خانم بزرگ بھی موجود تھیں، لیکن انھوں نے میر اور میر ہی کیا، کسی کی طرف نہ دیکھا۔ وہ صرف عمدۃ الملک، اور اعتماد الدولہ کے سلام کو سروقد اٹھیں۔ باقی عمائد و رؤسا کو انھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے جھک کر تسلیم کی۔

جب محفل آراستہ ہو چکی تو لبیبہ خانم نے دوزانو ہو کر اہلِ محفل کو سلام رسمی کیا اور فارسی میں مختصر سی تقریر کی، جس کا اردو ترجمہ حسب ذیل ہے:

''قبلہ گاہی نواب عمدۃ الملک بہادر، مربیان و محبانِ کرام، آپ سب اربابِ فن اور اصحابِ علم ہیں۔ یہ بچی ہر اعتبار سے طفلِ مکتب ہے، اور یہ اس کی پہلی محفل ہے۔ جو کچھ یہ پیش کرے، اسے بنظرِ اصلاح ملاحظہ فرمائیں اور اس کی خطاؤں کو درگذر فرمائیں۔ بالعموم بڑوں کے پہلے چھوٹوں کو غزل سرائی و نوا سنجی کا موقع دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ وقت خاص ہے، اس لیے میں اس ہمہ کہکشاں مجلس کا آغاز مولوی معنوی کی ایک رباعی سے کرتی ہوں۔ یہ بچی بھی مولوی ہی کا کلام پیش کرے گی۔''

عمدۃ الملک نے کوئی اشارہ ضرور کیا ہو گا، لیکن کوئی اسے دیکھ نہ سکا۔ ایسا لگا کہ ایشک اقاصی از خود آگے آیا، اس کے پیچھے دو عصابردار دو خوان لیے ہوئے۔ عمدۃ الملک نے ایک خوان پر سے کشمیری جامہ دار کا دوشالہ اتار کر نور خانم کو پہنایا۔ دوسرے خوان پر سے انھوں نے ڈھاکے کی ململ کا ایک تھان اٹھایا جسے گول لپیٹ کر موٹائی میں مردانہ انگشتِ شہادت کے برابر کر دیا گیا تھا، اور جس کے دونوں سروں پر سونے کے چھلے چڑھا دیے گئے تھے۔ یہ تھان انھوں نے خانم بزرگ کو پیش کیا۔ دونوں نے سروقد ہو کر اپنے تحفے قبول کیے۔

ہر طرف سناٹا ہو گیا۔ خانم بزرگ نے عمدۃ الملک کو مخاطب کر کے مولانا روم کی رباعی راگ بھیروی میں گائی:

آں را کہ خدائے چوں تو یارے دادست
او را دل و جان بے قرارے دادست
زنہار طمع مدار ز آں کس کارے
زیرا کہ خداش طرفہ کارے دادست

سامعین کی صفوں سے بے ساختہ تحسین کا شور بلند ہوا۔ خواجہ ناصر عندلیب کے صاحب زادگان سید خواجہ میر درد، اور سید محمد میر اثر، جنھوں نے ابھی خانقاہی زندگی نہیں اختیار کی تھی، عمائد کی صف میں بالکل آگے بیٹھے تھے۔ داد دیتے ان کی زبان نہ تھکتی تھی۔ دریں اثنا اندر سے اردابیگنی نے آکر عمدۃ الملک سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ عمدۃ الملک اپنی جگہ سے اٹھے اور انھوں نے بڑی بائی صاحب سے کچھ کہا۔ معلوم ہوا کہ اندر بیگمات، خاص کر اعتمادالدولہ کی بہو، یعنی میر معین الدین خان بہادر عرف میر منو کی حلیلہ مغلانی بیگم کی فرمائش ہے کہ مخدرات علیا کی نشست گاہیں ٹھیک جگہ نہیں ہیں، نغمہ سرائی صاف سنائی نہیں دیتی۔ نشستیں دوبارہ مرتب کی جا رہی ہیں۔ اتنے کہ نشستیں دوبارہ قائم ہوں، نور بائی صاحب کو زحمت نوا سنجی نہ دی جائے۔

جتنی دیر میں یہ سرگوشیاں ختم ہوئیں، پیغام آگیا کہ اب سب ٹھیک ہے، محفل آغاز ہو۔ نور خانم نے سرو قد ہو کر حضارِ محفل کو سلام کیا اور فارسی میں کہا کہ میرے گانے میں کوئی کمی پائی جائے تو اسے میری کم عمری پر محمول ٹھہرا کر عفوِ تقصیر فرمائی جائے۔ پھر اس نے مولانا روم کی رباعی میر خسرو کے ایجاد کردہ راگ ایمن کلیان میں گائی:

> کے باشد و کے باشد و کے باشد و کے
> نے باشد و مے باشد و مے باشد و مے
> من باشم و من باشم و من باشم و من
> وے باشد و وے باشد و وے باشد و وے

سید خواجہ میر اور سید محمد میر صاحبان پر تو وجد طاری ہو گیا۔ میر کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ گئے اور محفل میں گویا کہرام مچ گیا۔ خانم بزرگ کی پختہ، پرانے تانبے کی گھنٹیوں جیسی سچی اور تھکی ہوئی آواز کے مقابلے میں نور خانم کی ذرا دوشیزہ پن لیے ہوئے، کچھ باریک، چاندی کے گھنگھروؤں جیسی آواز، راگ اگرچہ نسبتاً سادہ، لیکن ادائیگی بالکل سچی اور گت نہ بلمپت نہ درت، بلکہ کہیں بیچ کی سی، اور کلام کا پیمبرانہ زور و جوش۔ بعد میں معلوم ہوا کئی بیگمات بے ہوش ہوئیں، انھیں لخلخہ سنگھانا پڑا، اور کئی بزرگوں کی خدمت میں خمیرۂ مروارید پیش کیا گیا۔

جب ہنگامہ کچھ فرو ہوا تو سازندوں نے دوبارہ ساز درست کیے اور نورالسعادۃ نے راگ جوگیا میں

مولانائے روم کی غزل آغاز کی:

اندر دو کون جانا بے تو طرب نہ دیدم
دیدم بسے عجائب چوں تو عجب نہ دیدم
گویند سوز آتش باشد نصیب کافر
محروم آتش تو جز بولہب نہ دیدم
من بر دریچۂ دل بس گوش جاں نہادم
چنداں سخن شنیدم اما دو لب نہ دیدم
اے ساقی گزیدہ مانندت اے دو دیدہ
اندر عجم نیامد اندر عرب ندیدم
چنداں بریز بادہ کز خود شوم پیادہ
کاندر خودی و ہستی غیر تعب نہ دیدم
اے شیر و اے شکر تو اے شمس و اے قمر تو
اے مادر و پدر تو جز تو نسب نہ دیدم
پولاد پارہایم آہن رباست عشقت
اصل ہمہ طلب تو در تو طلب نہ دیدم

اس محفل کا حال بیان کرنے کے لیے رومی ہی کا قلم کام آ سکتا ہے۔ میر نے کئی برس بعد کچھ محفلوں میں اپنی غزلوں کے گائے جانے کے بارے میں کچھ شعر لکھے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا فیضان نورالسعادۃ کی وہ پہلی محفل تھی جس کی کچھ روداد اوپر بیان ہوئی۔ میر نے لکھا:

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو
پھرتے ہیں چنانچہ لیے خدام سلاتے
درویشوں کے پیراہن صد چاک قصب کو

اس غزل پر شام سے تو صوفیوں کو وجد تھا
پھر نہیں معلوم کچھ مجلس کی کیا حالت ہوئی
مطرب سے غزل میر کی کل میں نے پڑھائی
اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی

اس محفل کے بعد نور بائی صاحب کی شہرت اور عزت پر لگا کر اڑی۔ عمدۃ الملک سے خانم بزرگ اور نور خانم کا ربط ضبط بھی اتنا بڑھا کہ رئیس اور مغنیہ کے رسمی رشتوں سے بڑھ کر کچھ ایسا معاملہ ہوا جیسا متوسل اور مربی میں ہوتا ہے۔ دابِ امیرانہ کو بالائے طاق رکھ کر بے تکلف گفتگوئیں، بلکہ ہنسی ٹھٹھول بھی ہونے لگے۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، عمدۃ الملک کو زنانہ لباس پہننے کا بھی ذوق تھا یا پھر وہ مردانہ کپڑے بھی ایسی وضع یا رنگ کے پہن لیتے جو عام طور پر طبقۂ اناث سے منسوب سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار وہ اپنی ایک محفل میں یوں تشریف لائے کہ ایک برکاریشمی پاجامہ پہنے ہوئے تھے، شوخ نارنجی رنگ کے کپڑے پر طاؤسی نیلے رنگ کی ذرا نمایاں دھاریاں اور بھی بہار دے رہی تھیں۔ جب وہ محفل میں داخل ہوئے تو بڑی بائی صاحب کے منھ سے بے ساختہ نکلا:

''عمدۃ الملک نے آج تو بڑا کافر پاجامہ زیب تن فرمایا ہے۔''

فقرہ ذرا دھیمی آواز میں کہا گیا تھا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ کوئی سن نہ سکے۔ مطلب بھی یہی تھا کہ براہ راست پھبتی کا انداز نہ ہو اور عمدۃ الملک سن بھی لیں۔ چنانچہ انھوں نے سن لیا، اور شرکائے محفل نے بھی۔ ہنسنا تو بہر حال خلاف تہذیب تھا۔ بزرگ مسکرا دیے، اور نوجوانان منھ میں رومال ٹھونس کر اپنے اپنے گریبان دیکھنے لگے۔

عمدۃ الملک نے یہ سب دیکھا، پھر نگاہیں نیچی کیے کیے متانت سے بولے:

''جی، مگر اس میں تھوڑی سی مسلمانی بھی ہے۔''

ہنسنا تو اب بھی ممکن نہ تھا، لیکن داد و تحسین کے فقروں پر کوئی پابندی نہ تھی، اور وہ بھی اس وقت جب خود نواب نے اس قدر چبھتا ہوا جملہ سر کیا ہو۔ داد تو بڑی بائی صاحب کی بھی طرف سے آئی، لیکن خانم بزرگ صرف داد دے کر چپ رہنے والی نہ تھی جب تحسینی صدائیں دھیمی پڑیں تو بول اٹھی:

''اسی دورنگی کے باعث تو نواب ہر وقت آنکھیں نیچی کیے رہتے ہیں۔''

'دورنگی' کا لفظ یہاں قیامت ڈھا رہا تھا۔ عمدۃ الملک نے یہ جملہ اتنا پسند کیا کہ گلے کی زمردی ہیکل اتار کر خانم بزرگ کی نذر کر دی۔

عمدۃ الملک کبھی کبھی ماں بیٹی کو مشاعروں میں بھی بلاتے۔ دونوں، اور خاص کر نور السعادۃ، ریختہ میں بھی اس غضب کی شعر فہم نکلی تھیں کہ ان کی داد نہ ملنے پر شعرا کی نظر میں خود اپنا کلام حقیر ہو جاتا۔

ایک بار عمدۃ الملک کے مشاعرے کا منظر قران السعدین سے بھی بڑھ گیا۔ شاہ حاتم کے سوا دلی کے تمام بڑے ریختہ گو موجود تھے، شرف الدین مضمون، نجم الدین سلام اور اشرف علی خان فغان بزرگوں میں، مانے ہوئے نئے استادوں میں میرزا رفیع سودا، میر محمد تقی میر، سید خواجہ میر درد۔ فارسی گویوں میں بھی میرزا مظہر جان جاناں کو چھوڑ کر اکثر بڑے لوگ شریکِ محفل تھے۔ آنند رام مخلص، شیخ علی حزیں، شاہ نور العین واقف، ٹیک چند بہار، میر شمس الدین فقیر، بیدل کے شاگرد سکھراج سبقت، میر افضل ثابت الٰہ آبادی، اور خود خان آرزو۔ سامعین میں خانم بزرگ اور نور خانم کے علاوہ بھی بعض باذوق اربابِ طرب حاضر تھیں۔ شیخ علی حزیں کا ارادہ ان دنوں بلاد اودھ کا تھا، اور ایک طرح یہ ان کی الوداعی محفل تھی۔ بعض ریختہ گویوں نے ریختہ کے ساتھ فارسی بھی سنائی، فارسی والوں نے صرف فارسی۔ ریختہ اور فارسی دونوں میں طرح مقرر کی گئی تھی، لیکن بزرگ استادوں کو غیر طرح میں بھی پڑھنے کی اجازت تھی۔

مشاعرے کا آغاز شاید کسی بری ساعت میں ہوا تھا، کہ کسی کی غزل نہ جمی۔ بڑے بڑے شعرا خفیف ہوئے جا رہے تھے۔ اس پر ظلم یہ کہ فارسی ہو یا ریختہ، علی حزیں کبھی دبی زبان سے کبھی ذرا اونچی آواز میں اکثر شعروں پر ایراد بھی کرتے چلے تھے۔ لوگ اس خیال سے طرح دیتے چلے گئے کہ شیخ ہند میں ہمارے مہمان ہیں، اور پھر اب وہ دہلی چھوڑ کر جانے ہی والے ہیں۔

مشاعرہ شاہ نور العین واقف کے کلام پر ختم ہونا تھا۔ وہ شعرا میں سب سے بزرگ نہ تھے، لیکن گھر سے اس قدر کم نکلتے تھے کہ کسی بھی جگہ ان کی موجودگی بانی محفل اور حاضرین کے لیے افتخار کا باعث ہوتی۔ انھوں نے بڑے والہانہ انداز میں جھوم جھوم کر لحن کے ساتھ غزل پڑھی۔

میر کو اس کے چند شعر یاد رہ گئے:

گہ می فشارد گہ می گذارد
یا رب چہ دارد غم با دل من
رحمے نہ داری با یک مسلماں
کافر دل من ترسا دل من
گفتی کہ دارد ایں گونہ خوارت
مرزا دل من آقا دل من

ایک تو بولتی ہوئی ردیف، پھر کلام کی غیر معمولی روانی، اور لہجے کی وارفتگی۔ مشاعرہ پہلی بار گویا جاگ اٹھا۔ لیکن شیخ علی حزین منھ بنائے سنتے رہے۔ شاید انھیں اس بات پر آزردگی تھی کہ اوروں کی طرح خود ان کی غزل بھی سرسبز نہ ہوئی تھی۔ لیکن جب درست، واہ واہ، سبحان اللہ کا شور تھما تو اس بار شیخ نے بہ آواز بلند کہا:

''شاہ صاحب، غزل خوب تھی، مگر واللہ فارسی نہ تھی۔''

نور العین واقف تو بے نیاز شخص تھے، انھوں نے کچھ جواب نہ دیا، اگر چہ تیوری پر ان کے بھی بل آ گئے تھے۔ مجمع ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گیا۔ وہ جو رخصت ہونے کے لیے اپنی پاپوشیں اور عصا ڈھونڈ رہے تھے، وہیں رک گئے۔ اچانک میرزا رفیع نے تیکھے سروں میں کہا:

''جناب شیخ صاحب، غزل ہندوستان میں بھی ہوتی ہے۔''

شیخ علی حزیں کو اب بھی مجمعے کی صورتِ حال کا اندازہ نہ ہوا تھا، چمک کر بولے:

''بے شک، لیکن ایران کی زبان اور ہے، ایران کا مذاق اور ہے۔ شعرائے ہند کو محاورۂ ایران پر کما حقہ عبور نہیں۔''

''ایران کے صاحبانِ قدرت نے ہندی اور عربی میں تصرف کیے ہیں،'' خان آرزو اب تکلف کو بالائے طاق رکھ کر بحث میں شریک ہونے پر مجبور ہوئے۔ ''ہند کے صاحبانِ قدرت بھی حسبِ توفیق فارسی میں تصرف کر سکتے ہیں۔''

''ہند میں صاحبانِ قدرت محال ہیں۔''

''ایران میں غلط گو ممکن ہیں تو ہند میں صاحبانِ قدرت بھی ممکن ہیں۔ انصاف کی نظر چاہیے،'' خان

آرزو نے کہا۔

''جس کی زبان ہو وہی اسے برت سکتا ہے۔'' علی حزیں نے تنتنا کر جواب دیا۔

''معاملہ روز کی معمولی عام زبان کا نہیں شیخ علی حزیں، ادبی زبان کا ہے۔ ادبی زبان کتابوں سے سیکھی جاتی ہے،'' خان آرزو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''اہل زباں، صاحبِ محاورہ، یہ سب بکواس ہے۔'' اچانک محمد تقی میر نے محفل کے بیچ میں کھڑے ہو کر اعلان کے انداز میں کہا، ''زبان اس کی ہے جو زبان کے ساتھ اس طرح کھیل سکے جس طرح بچہ ماں سے کھیلتا ہے۔ معاف فرمائیں جناب علی حزیں، زبان کوئی مقدس بیوہ نہیں کہ اس کی طرف ذرا سی چشمک ہو تو اس کی عفت مخدوش ہو جائے۔ آپ اہل ایران کی شاعری ٹھٹھرتی جا رہی ہے، کہ آپ لوگ تصرفات و محاوراتِ اہل ہند سے گریز کرنے لگے ہیں۔ سنیے، یہ شعر سنیے، اور لائیے جواب ان کا۔''

پھر میر نے میرزا بیدل کے حسبِ ذیل شعر اپنی معمولی آواز میں نہیں، بلکہ مشاق شعر خوانوں کی سی دور دور تک پھیلتی ہوئی آواز میں پڑھے:

از دلم بگذشت و خوں در چشم حیرت ساز ماند
گرد رنگے یادگارم زاں بہار ناز ماند
شمع یکرنگی ز فانوس خموشی روشن است
نیست جز تار نفس چوں نالہ از آواز ماند
اے بسا معنی کہ از نامحرمی ہائے زباں
با ہمہ شوخی مقیم پردہ ہائے راز ماند

تمام لوگ ان اشعار کی کیفیت اور قوت، اور بالخصوص آخری شعر کی پُراسرار، معنی پرور فضا میں محو تھے۔ میر نے کہا، ''آپ کا ننھا سا، مدرسانہ ذہن اسی میں الجھا رہے گا کہ 'چشم حیرت ساز' درست ہے کہ نہیں، 'گرد رنگ'، 'معنی شوخ'، اور 'نامحرمی ہائے زباں' جیسی تراکیب کے لیے آپ فرہنگیں ڈھونڈیں گے۔ لیکن یہ شعر لوگوں کے دلوں میں، ان کی زبانوں پر قائم رہیں گے۔ آپ کی چشم تنگ نہ مضمون دیکھے گی، نہ کلام کی روانی پر نظر رکھے گی....''

''محمد تقی خیرہ سر اور خود بیں ہے، لیکن حق یہ ہے کہ اس وقت اس نے جو بھی کہا سچ کہا،'' خان آرزو نے رائے آنند رام مخلص کو مخاطب کر کے کہا۔

''بجا ہے پیر و مرشد،'' آنند رام مخلص نے مؤدبانہ کہا۔ وہ موٹے اس قدر تھے کہ بیٹھ جاتے تو اٹھنا محال ہو جاتا، لیکن ان کی آواز باریک تھی۔

علی حزیں اکیلے، اور ساری محفل ایک طرف، لیکن تھے وہ بلا کے ضدی۔ بھنا کر بولے، ''ہم نے سعدی و حافظ کے کلام میں 'مرزا دل من، آقا دل من'، کہیں نہیں دیکھا۔ بابا فغانی کے یہاں بھی 'چشم حیرت ساز' جیسی مہملیات کا گذر نہیں۔ سب ٹکسال باہر، سب ہندی۔''

''گستاخی معاف شیخ صاحب، سعدی و حافظ پر شاعری ختم ہوئی نہ بابا فغانی کے بعد زبان تھک کر بیٹھ گئی۔ طبائع موزوں وطینت ہائے بہار ایجاد نے ہر زمانے میں نئی نئی گل کاریاں کی ہیں،'' ٹیک چند بہار نے تیز لہجے میں کہا۔ ''ہم اگر آپ کے قائل ہیں تو آپ سے بڑھ کر بیدل و سرخوش و ناصر علی کے بھی قائل ہیں، اور آپ کے کلام کو بھی انھیں کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔''

سامعین میں سے ایک صاحب، جو شاید حزیں کے شاگرد تھے، بولے، ''آخر ہندیوں میں مولانا ابوالبرکات منیر لاہوری بھی تو ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ظہوری اور عرفی اور زلالی وغیرہ کی خیال بندیاں شعر پارسی کے جسدِ نازک پر بار ہیں۔ ہمیں طرزِ حافظ و سعدی کو اختیار کرنا چاہیے۔''

بحث میں مداخل ہونے والے نئے صاحب کو خان آرزو نے گھور کر دیکھا، کہ صحبتِ اہلِ علم میں یہ بے علم کون آ گھسا۔ انھوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آں عزیز نے اس حقیر کا رسالہ 'سراج منیر' شاید نہیں دیکھا، ورنہ اس باب میں زحمتِ لب کشائی نہ فرماتے۔''

''اور جب استادی و مرشدی جناب سراج المحققین اپنی کتاب لاجواب 'تنبیہ الغافلین' مکمل فرمائیں گے تو شیخ صاحب کی بھی سب شیخی نکل جائے گی،'' آنند رام مخلص نے کہا۔

یہ بحث نہ معلوم کب تک چلتی، جنھیں گھر جانے کی جلدی تھی، وہ پہلو بھی بدل رہے تھے کہ نکلنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے تو اچھا، لیکن بانی محفل کے احترام میں جگہ سے اٹھنے کا یارا نہ تھا۔ اتنے میں عمدۃ الملک کے ایشک اقاصی نے آ کر خبر دی کہ سرکار نواب صاحب کو ظل سبحانی نے قلعۂ معلیٰ میں یاد فرمایا ہے۔ نواب مجلس برخاست کر کے جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے، ورنہ محمد تقی میر تو ابھی اور بھی کچھ کہنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ شیخ

علی حزیں کی پیشانی پر سے بل نہ جاتا تھے، نہ گئے۔ شاہ نور العین واقف البتہ خوش تھے کہ انھیں لب کشائی کی ضرورت ہی نہ تھی۔

مشاعرہ برخاست کر کے جب عمدة الملک سوار ہونے کے لیے باہر نکلے تو صبح کاذب ہو چکی تھی۔ لوگ نماز کے لیے تیز تیز قدم اٹھاتے جا رہے تھے۔ وہ جمعہ کا دن تھا اور ذی الحجہ 1159ھ کی 23 تاریخ [مطابق 6 جنوری 1747ء، مرتب] جلدی کی وجہ سے نواب نے اپنا معمولہ کوکبۂ نوابی ساتھ نہ لیا تھا۔ وہ خود اپنے ہاتھی پر صرف ایک خواصی کے ساتھ تھے، پیچھے چار مسلح شہسوار۔ عمدة الملک ان چند امرا میں سے تھے جنھیں دیوانِ خاص کے صدر دروازے تک ہاتھی پر آنے کی اجازت تھی، لہٰذا وہ تو سواری پر بیٹھے بیٹھے آگے نکل گئے، اور ان کے شہسوار سعد اللہ خان کے چوک پر گھوڑے سے اتر کر پیدل چلے۔ ایوانِ شاہی میں یوں بھی کوئی خطرہ نہ تھا۔

دیوانِ خاص کے صدر دروازے پر عمدة الملک کا ہاتھی رکا، نقارے پر چوٹ پڑی۔ قاعدے کے مطابق خواصی کو پہلے اترنا چاہیے تھا، لیکن عجلت کے مارے عمدة الملک ہی پہلے اتر آئے۔ ان کے اترتے اترتے محافظ خانے کے اندر سے ڈھاٹا باندھے ہوئے دو شخص کود کر باہر آئے اور خنجر کے ایسے سدھے ہوئے ہاتھ انھوں نے عمدة الملک کو مارے کہ ایک نے دل کو، اور دوسرے نے جگر کو دو نیم کر دیا۔ زمین پر آتے آتے وہ لاشۂ بے جان ہو چکے تھے۔

پیچھے سے آتے ہوئے شہسواروں نے عمدة الملک کو گرتے دیکھا تو کچھ نے ان کو سہارا دینا، اور کچھ نے دوڑ کر قاتلوں کو پکڑنا چاہا۔ سہارا دینے کے لیے تو وہاں تھا ہی کچھ نہیں، اور لال قلعہ جیسی لق و دق عمارت میں، جس میں راہداریوں، کھڑکیوں، اور چور دروازوں کی کمی نہیں، کسی بھاگتے کو پکڑ لینا کہاں ممکن تھا۔

عمدة الملک کی موت پر دلّی کے کئی گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کئی بیواؤں نے دوبارہ خود کو بیوہ، اور کئی یتیموں نے دوبارہ خود کو یتیم پایا۔ واردات چونکہ دیوانِ خاص کے عین سامنے ہوئی تھی، اور قاتل ہاتھ نہ آسکے تھے، اس لیے بہت لوگ علانیہ بادشاہ کو اس واقعے میں ملوث ٹھہراتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عمدة الملک بادشاہ کے بہت منھ لگے تھے، حتیٰ کہ ان کی باتیں کبھی کبھی گستاخی کی حد کو چھو لیتی تھیں، اس لیے بادشاہ ان سے آزردہ تھے اور بادشاہ کی آنکھ کا اشارہ پا کر روز افزوں خان خواجہ سرا نے کرائے کے دو قاتلوں کو پیدا کیا۔ انھیں زرِ کثیر انعام میں دیا گیا، وہ ادھم بائی (بادشاہ بیگم) کے خزانے سے آیا تھا۔

کچھ کا کہنا تھا کہ ادھم بائی نے عمدۃ الملک کو اس لیے مروا دیا کہ نواب موصوف کو ادھم بائی کے بطن سے پیدا محمد شاہ پادشاہ کے بیٹے شاہزادہ مجاہد الدین ابو نصر احمد (جو احمد شاہ کے نام سے بادشاہ بنا) کی ولی عہدی سے اتفاق نہ تھا۔ کچھ، بلکہ اکثر لوگ اس خیال کے تھے کہ دربار خسروی میں عمدۃ الملک کی مقبولیت بعض امرا کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور عماد الملک غازی الدین خان [جس نے 1759ء میں بادشاہ عالم گیر ثانی کو قتل کرایا، مرتب] یا صفدر جنگ [جس نے 1754ء میں خود احمد شاہ کو تخت سے اتار کر اندھا کرایا، مرتب] کے اغوا سے بعض پیشہ ور ڈاکوؤں کو اس کام پر لگایا گیا تھا۔

ایک خیال یہ تھا کہ نواب امیر خان کا قتل محض اتفاقیہ تھا۔ ایک مدت سے ان کے بعض معزول شدہ نوکر ان سے بدلہ لینے کے لیے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس رات بادشاہ کے غیر متوقع بلاوے نے انھیں موقع فراہم کر دیا۔

حقیقت جو بھی ہو، دلی میں عام خیال یہ تھا کہ عمدۃ الملک محمد امیر خان انجام جیسا بیدار مغز، صاحب الرائے، لائق فائق رئیس اب شاہانِ مغلیہ کے ہاتھ نہ لگے گا۔ 'غم عمدہ' کسی نے تاریخ کہی۔ چونکہ نواب مرحوم کو عورتوں کی طرح کپڑے زیب تن کرنے کا بھی ذوق تھا، اس لیے کسی نے زنانہ اسلوب میں فقرہ کہا جس سے تاریخ نکلتی تھی، 'اوہی لوگو امیر خان موا۔' بعض لوگوں نے یہ بھی کہا کہ یہ تاریخ نور بائی صاحب نے کہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ اس فقرے سے نواب کی تاریخ وفات نکلتی ہے، اور نہ یہ فقرہ نور السعادۃ کا تصنیف کردہ ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ لبیبہ خانم اور نور السعادۃ نے گیارہ دن تک عمدۃ الملک کا سوگ کیا۔

دلی پھر دلی ہے۔ امیر خان انجام کی موت پر چند دن سنسنی اور افواہ بازیاں رہیں۔ پھر حالات اپنی پرانی مستانہ چال پر آ گئے:

کھو گئے دُنیا سے تم ہو اور اب دُنیا ہے میاں

عمدۃ الملک کے بعد پھاٹک حبش خان کی حویلی کے مکینوں کے معمول میں تبدیلی ضرور آ گئی۔ خانم بزرگ نے نور بائی صاحب کو اب کسی کا پابند نہ کیا، لیکن تمکنت اور رکھ رکھاؤ پہلے سے زیادہ بڑھا دیا۔ ان دونوں کی شہرتیں پہلے سے ہی بام ثریا کو چھو رہی تھیں۔ اب نور بائی صاحب دوسرے رؤسا کی محفلوں میں بھی جلوہ افروز ہونے لگیں۔ خود ان کی حویلی پر بھی غزل وغنا کے مواقع ہوتے رہتے تھے۔ ان کے یہاں دولت وثروت کی

اب وہ فراوانی ہوئی کہ دلّی والوں کی بھی آنکھ چکاچوندھ ہو گئی۔

نور خانم کا چشم دیدہ حال نواب درگاہ قلی خان سالار جنگ اول نے، جو درآں زماں حیدرآباد سے وارد دہلی تھے، یوں لکھا ہے:

''نور بائی دلّی کی ڈومنیوں میں سے ہے۔ اس کی شان کی بلندی اس قدر ہے کہ امرا اس کے دیدار کی التجا کرتے ہیں، اور بعضے اس کے گھر بھی جاتے ہیں۔ اس کا گھر ارباب دول کے گھروں کی آن بان رکھتا ہے۔ دربار کی زیب و زینت اور تجمل، اور اس کی سواری کے ساتھ چلنے والے خدام میں چاؤشوں اور چوبداروں کی ریل پیل، یہ سب ویسی ہے جیسی امرا اور رؤسا کے ساتھ ہوتی ہے۔

وہ عام طور پر ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتی ہے اور جس رئیس کے گھر جاتی ہے، وہ اسے کم از کم ایک نگ قیمتی پتھر نذر کرتے ہیں اور جب اسے کہیں بلایا جاتا ہے تو ایک بیش قرار رقم اس کے گھر پہلے سے بھیج دی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب وہ رخصت ہوتی ہوگی تو اس وقت اسے کیا اور کتنا پیش کیا جاتا ہوگا۔ نہ جانے کتنوں نے اپنا سارا مال و متاع اس پر قربان کر دیا ہے۔''

''نور بائی سخن فہم بے نظیر اور نکتہ دان خوش تقریر ہے۔ اس کے روزمرہ کی صفائی کا کیا کہنا، سامعہ جوئے بہار میں غوطہ کھاتا ہے اور وہ محاورے اس قدر برجستہ و برمحل بولتی ہے کہ گویا اس کی زبان پھولوں کی پنکھڑیاں تراشتی ہے۔

''علم مجلسی کی وہ اس درجہ ماہر ہے، اور اس کے یہاں نشست و برخاست کے آداب و رسوم ایسے ہیں کہ اچھے اچھے استاد اس سے سبق لیں اور جمیع حاضرینِ محفل کی خاطروں کا لحاظ وہ اس قدر رکھتی ہے کہ بڑے بڑے صاحبانِ تہذیب و اخلاق اس کے شاگرد بنیں۔

''وہ اپنے طائفے کے ساتھ، کہ ان میں ہر ایک کو بیگم یا خانم کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں، بزم آرائے محفل ہوتی ہے۔''

محمد تقی میر اور رائے کشن چند اخلاص کا آنا جانا حسبِ سابق تھا، احتیاط اب پہلے سے کچھ کم تھی، لیکن ایسا

بھی نہ تھا کہ دونوں دڑانہ حویلی میں آئیں جائیں۔ میر کے عشق کی تو پھر بھی لوگوں کو سن گن لگ گئی تھی، لیکن رائے کشن چند کے بارے میں کسی کو خبر نہ تھی کہ وہ شروع ہی سے حویلی میں آتا جاتا تھا۔ میر کے تعلقات نورالسعادۃ سے ابھی بغل گیری و ہم آغوشی سے آگے نہ بڑھے تھے۔ وہ اس کی طرف دیکھتی تو ایسی نگاہوں سے تھی گویا چاہتی ہو کہ پہل میر کی ہی طرف سے ہو، لیکن اس کے بیوہار اور لہجہ ایسا کبھی نہ ہوتا کہ میر کی ہمت کھلتی۔

تعلقات کی اس غیر اطمینان بخش صورتِ حال میں، جہاں اختلاطِ باطنی تو کیا، اختلاطِ ظاہری بھی بہت محدود قسم کا تھا، میر کو بڑی گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ اگر چہ وہ خوش تھا کہ آمد و رفت اور بے تکلف بات چیت، اور ہنسی مذاق کے تو مواقع مہیا تھے، لیکن اس کی بے صبر طبیعت اسے کسی بھی کل چین نہ لینے دیتی۔ ایک عرصے کے بعد اس نے اپنی مثنوی میں کچھ شعر اپنی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کے بارے میں لکھے:

صورت ان کی خیال میں ہر دم   خواب میں ہوں جو وہ مژہ باہم
میں تو بستر پر دل شکستہ اداس   چاند سا منھ انھوں کا تکیے پاس
میں بچھونے پہ بےخود و بےخواب   ایک پیکر پری کا سا ہم خواب
شب کٹی صورت خیالی سے   دن کو ہوں میں شکستہ حالی سے
آشنا یار سارے بےگانے   کہ ہوئے میر جی تو دیوانے
رشتہ و ربط انھوں نے توڑ دیا   ملنا جلنا سبھوں سے چھوڑ دیا
شوق سے ان کا حال دیگر گوں   پارہ پارہ دل و جگر سب خوں
جی پڑا ترسے ساتھ سونے کو   دل پریشان جمع ہونے کو

لیکن نورالسعادۃ اپنی روش پر قائم تھی۔ ایسا نہیں کہ وہ میر کا امتحان لے رہی ہو۔ بات شاید یہ تھی کہ اس کے دل کا خوف ویسے کا ویسا تھا۔ میر کا مزاج سوداوی تو تھا ہی۔ اس کی شعر گوئی بھی زور پر تھی، اور اس کی شہرت بھی۔ اس کی خورد بینی ایک طرف، اور نورالسعادۃ کی دورگردی ایک طرف، یہ دونوں مل کر اس کے داغ سودا کی چمک کو روز افزوں کیے دیتی تھیں۔ اسی اثنا میں اس نے نواب رعایت خان سے بھی بگاڑ کر لیا۔

ایک رات نواب کے باغیچے میں بے تکلف صحبت تھی۔ شعر پڑھے اور سنے جا رہے تھے۔ میر نے اس

وقت تازہ غزل سنائی تھی۔ غزل حسبِ معمول بہت کامیاب ہوئی، حتیٰ کہ نواب نے بھی اس کے ایک دو شعر گنگنا کر پڑھے۔ سوئے اتفاق کہ اسی وقت ایک نوجوان ڈوم بھی حاضرِ دربار ہوا جس کا گانا انھیں بہت پسند تھا۔ رعایت خان نے بے ساختہ کہا:

''اماں میر محمد تقی، اپنی اس تازہ غزل کے کچھ شعر ہمارے سلطانا کو بھی یاد کرادو۔ جب تم نہ ہوگے تو اس سے سن لیا کریں گے۔''

میر کو برا تو بہت لگا کہ میرا کلام اور یہ کم بخت مجہول النسب کل کا چھوکرا گاتا پھرے۔ ضبط کر کے عرض کیا:

''قدر افزائی ہے سرکار والا تبار، لیکن یہ صاحب زادے ہیں، ابھی انھیں ہدو میاں کی بندشیں یاد کرنے دیں تو مناسب، بلکہ انسب ہو۔''

''اماں تم بھی کیا باتیں کہو ہو محمد تقی۔ ہدو خان صاحب کی بندش اور ہے، غزل کے بول اور ہیں۔ تمھیں ہمارے سر کی قسم کچھ ردوقدح نہ کرو۔''

میر نے مجبوراً پانچ شعر سلطانا کو یاد کرادیے۔ لیکن اس دن سلام کر کے وہ جو اٹھا ہے تو پھر نواب رعایت خان کی نوکری پر نہ گیا۔ کچھ دن بعد اعتماد الدولہ کی حویلی والا گھر بھی اس نے خالی کر دیا اور کوئی حیلہ ڈھونڈ کر نواب امیر خان مرحوم کی حویلی میں اٹھ رہا۔

کچھ دن پھر بے کاری میں گذرے۔ بے روزگاری، اور خاص کر اس کے احساس نے کہ نور السعادۃ اسے نکھٹو سمجھتی ہوگی، اس کے مزاج کا حرارہ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ اس زمانے کی کیفیت اس نے ایک مقطعے میں لکھی تھی، لیکن غزل عرصے بعد تمام ہو سکی تھی۔ ان دنوں شعر گوئی کے لیے طبیعت کہاں سے حاضر ہوتی:

اتنی بھی بد مزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسمان سے

اس دوران کچھ اچھی باتیں بھی ہوئیں۔ رعایت خان نے ازراہِ لطفِ مربیانہ، میر کے ایک بھائی کو اس کی جگہ نوکر رکھ لیا۔ بعد میں میر کی خفگی بھی دور ہوگئی۔ ایک بار جب میر کا سامنا رعایت خان سے ہوا تو خان مذکور نے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ میر نے کہا، ''سرکار والا مقدار، گذشتہ راصلواۃ۔ اب میں اپنی جگہ خوش ہوں۔ اپنے ایک دوست اسد یار خان کی وساطت سے نواب بہادر جاوید خان خواجہ سرا بہادر کی ڈیوڑھی پر نوکر ہو گیا ہوں۔''

کچھ دن آرام سے گذرے۔ پھر اچانک ایک بہت ہی آرام کی بات ہوئی۔ میر کے سارے گلے شکوے خواہ آسمان سے، خواہ زمین سے، ڈھل گئے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ پیدا ہوا ہے۔

میر نے تسنگ کا کبھی نام نہ سنا تھا، اور نہ ہی ایسی کسی مجہول الاسم جگہ پر جانے کی اسے توقع ہوسکتی تھی۔ لیکن ایک دن رائے کشن چند اخلاص اور میر دونوں ہی دلّی سے میرٹھ جانے والی تنگ اور تکلیف دہ سڑک پر رواں تھے، کہ تسنگ نامی قصبہ میرٹھ کے ذرا آگے واقع تھا۔ بات یہ ہوئی کہ نواب بہادر جاوید خان خواجہ سرا کی کچھ املاک وہاں تھی جس پر مقامی زمیندار قابض ہوگیا تھا۔ نواب بہادر نے اسے بے دخل کرنے کے لیے سپاہی بھیجے تو وہ گڑھی خالی کر کے بھاگ گیا۔ اب نواب بہادر نے گڑھی پر دوبارہ قبضہ کرنے اور مال گذاری کی وصولی کے لیے وہاں کا سفر اختیار کیا۔ جشن منانے کے لیے خانم بزرگ، نور خانم، میاں بینگا امرد، اور کئی اور اربابِ نشاط کو زحمت دی گئی۔ میر اس قافلے میں نواب بہادر کی ہمراہی کے باعث شریک تھا اور رائے کشن چند کے بغیر خانم بزرگ کہیں باہر نکلتی نہ تھی۔

قافلے میں کوئی سوا ڈیڑھ سو افراد تھے۔ صفر 1161ھ [مطابق فروری 1748ء، مرتب] کی کوئی تاریخ تھی۔ تھوڑی تھوڑی تیز ہوتی ہوئی دھوپ بہار دے رہی تھی کہ اچانک ابر گندہ بہار گھر آیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بارش کوئی گھنٹہ بھر رہی، لیکن جب قافلہ صاحب آباد سے گذر کر میرٹھ والی سڑک پر مڑا تو معلوم ہوا کہ ہنڈن ندی میں اچانک بارش کی وجہ سے باڑھ آگئی ہے۔ کشتیوں تک پہنچنے کے لیے جو چہ باندھا گیا تھا، وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب چھوٹی بجرہ نما ناؤوں میں بیٹھ کر بڑی ناؤ تک جانا ہوگا۔ اس درمیان شام بھی ہو چکی تھی۔ کوئی مناسب جگہ نزدیک نہ تھی جہاں اتنا بڑا قافلہ آرام سے شب باش ہو سکے۔ دریا سے اترنا ہی اترنا تھا۔

ہنڈن چھوٹی سی ندی تھی، اور تمام چھوٹی ندیوں کی طرح جب وہ باڑھ پر آتی تو قیامت کے طوفان اٹھاتی۔ میر نے واپس آ کر اس کا حال یوں لکھا:

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی　　پانی کی سطح پر نگاہ پڑی
دامن ابر پاٹ دریا کا　　دے گرہ تو کہے کہ باندھا تھا
آب تہہ دار اور تیرہ بہت　　لہرا اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان
جزر و مد سب حواس کھوتا تھا خضر کا رنگ سبز ہوتا تھا
کسو درویش کا تھا یمن قدم جا کے پہنچے جو اس کنارے ہم
ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا گوہر جاں سے ہاتھ دھویا تھا

بقیہ سفر کا حال طوالت سے خالی نہیں۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ غازی آباد ہوتے ہوئے دو دن میں تسنگ پہنچے۔ زمیندار کی وسیع و عریض گڑھی میں سارا قافلہ سما گیا۔ نواب بہادر نے البتہ اپنے، اور بعض مخصوصین کے لیے خیمے نصب کرائے۔ خانم بزرگ کو بھی ایک خیمہ ملا۔ لیکن شام ہوتے ہوتے ہوا اچانک تیز ہوگئی، نورالسعادۃ نے ضد کی کہ ہمیں حویلی میں کمرہ دیا جائے، مجھے ڈر لگتا ہے کہ یہ خیمے آندھی میں کہیں اڑ نہ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی مرضی پوری کی گئی۔

اس رات سفر کے کسل کے باعث محفل بہت مختصر رکھی گئی۔ قصبے میں کہیں سیر وتفریح کا سوال نہ تھا۔ دن ڈوبنے کے ڈھائی تین گھڑی بعد ہر طرف نیند اور سکوت کا دور دورہ تھا۔ اس رات میر کی تقدیر نے یاوری کی۔ نیند اسے آتی نہ تھی۔ نورالسعادۃ اتنی پاس اور میں اتنی دور۔ کاش نیند ہی آجاتی۔ لیکن تقدیر جاگتی تب تو آنکھ سوتی۔

چارپائی کے سرہانے کچھ دور پر ایک طاق میں دھیمی روشنی کی شمع جل رہی تھی۔ میر نے دروازے کی طرف پیٹھ موڑ کر اپنے ہی مصرعے پر عمل کیا تھا:

چل اب کہ سوویں منھ پر دوپٹے کو تان کر

اچانک اسے محسوس ہوا کہ شمع اور اس کے درمیان کوئی آ گیا ہے۔ کسی چور کا تو امکان تھا نہیں۔ بھوت پریت میں اسے یوں ہی سا یقین تھا۔ اس نے چادر کا ایک کونا کھول کر گوشۂ چشم سے دیکھا تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ شمع گل ہو چکی تھی اور دروازہ بند تھا۔ کمرے میں وہی لطیف سی خوشبو تھی، جس کے بارے میں وہ کبھی فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ نورالسعادۃ کے بدن کی اپنی خوشبو ہے یا اس نے کوئی عطر لگا رکھا ہے۔

اب تو اسے ڈر لگا۔ کون ہے یہ ہستی؟ مجھ سے کیا چاہتی ہے؟ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا یہاں کوئی جادو چل رہا ہے؟

اس نے ایک ہی ساتھ چادر سر سے اتار پھینکی اور چارپائی بھی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ باہر کے کسی چراغ کی

بہت دھندلی سی روشنی دروازے کی جھری سے چھن رہی تھی۔ نورالسعادۃ نے ہاتھ بڑھا کر اس کا منھ چھوا.... نورالسعادۃ؟ اس کا دل اس زور سے دھڑکا گویا اب رک ہی جائے گا۔ ہلکی سی ہنسی، چوڑیوں کی بہت دھیمی سی کھنک۔ وہ آکر چارپائی پر بیٹھی تو پرانے پٹی پایوں نے ذرا سی آواز کی۔ تو میں خواب میں یہ سب سن سکتا ہوں؟ اس کا گلا خشک تھا۔ اس نے کہنا چاہا، ''نورالسعادۃ، تم یہاں کہاں؟'' لیکن اس کے حلق سے صرف ایک پھنسی پھنسی آواز نکلی، جیسے پھانسی کا پھندا لگ گیا ہو۔ اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ پلنگ کی پٹی تھام کر زمین پر بیٹھ گیا۔ میں بیٹھ گیا ہوں کہ ڈھیر ہو گیا ہوں؟ وہ اندر ہی اندر مسکرایا۔ یہ خواب بھی خوب ہے کہ مجھے معلوم ہے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میرا ہاتھ یہ کس کی جوتیوں پر ہے؟ اور ان جان سے زیادہ پیاری جوتیوں میں ان سے بھی بڑھ کر پیارے پاؤں کس کے ہیں؟ اس نے ایک جوتی کو آنکھوں سے لگانا چاہا تو وہ پھسل کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ نورالسعادۃ کا پیر ٹھنڈا ہو رہا تھا____ نورالسعادۃ کا؟ نورالسعادۃ یہاں.... لیکن اس نے پاؤں کو آہستہ آہستہ ملنا چاہا کہ ذرا گرمی پہنچے تو اس کا ہاتھ پھسل کر نورالسعادۃ.... اس وجود رؤیائی کی پنڈلی تک پہنچ گیا۔ وہ ایک برکا، بہت ہی ہلکے کاشانی مخمل دوخوابہ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کا ہاتھ نورالسعادۃ کی پنڈلی تک پہنچ سکا تھا۔ پھر اس نے بہت خوف زدہ لیکن وفورِ شوق سے بے قرار ہو کر ہاتھ اوپر لے جانا چاہا۔ آئینۂ زانو، اور پھر زانو.... لیکن نورالسعادۃ تو مخملی پاجامہ کبھی نہ پہنتی تھی؟ اس نے سر اٹھایا تو دروازے کی جھری سے چھن کر ایک کرن اس کی آنکھ پر پڑی۔ پھر نورالسعادۃ نے بھی سر اٹھا کر اس کا دوسرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو کسی اور زاویے سے ایک کرن نے اندر آکر اس کی بھی آنکھوں میں اگیاری سی روشن کر دی۔ میر کی سانس بے قابو ہو رہی تھی، اور نورالسعادۃ.... نہیں، اس وجود خواب کی بھی سانسیں تہہ و بالا تھیں۔ دو صدی سے اوپر گذر جانے کے بعد، جب دونوں وجود واقعی خواب بن چکے تھے، کسی کہنے والے نے اس بات کو یوں بیان کیا: 'ملائمت ہے اندھیرے میں اس کی سانسوں سے/ دمک رہی ہیں وہ آنکھیں ہرے نگیں کی طرح'۔ میر نے وہ منظر خود دیکھا تھا، لیکن اس وقت اس کے پاس سادہ الفاظ بھی نہ تھے، موزوں مصرعوں کی توفیق کہاں سے ہوتی۔ لیکن اپنے بارے میں اس نے کچھ دن بعد کہا، 'آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو/ حیران چشم عاشق دمکے ہے جیسے ہیرا'۔ لیکن اس وقت.... اس کا ہاتھ زانوؤں کے بیچ میں کہیں تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اس کی مہمان کے ہاتھ میں اب بھی تھا۔ وہ جو ایک پل کے لیے کرن اندر چمکی تھی، اب جا چکی تھی۔ شاید ہوا کا رخ بدل جانے کی وجہ سے باہر کے چراغ کی لو بھی کسی اور سمت میں لہرا

رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ پر ہلکی سی کشش محسوس کی۔ اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی، خود کو پلنگ کی طرف کھنچنے دیا، اور پھر پلنگ کی پٹی کو بالکل چمٹا لیا، گویا اسے بھی اپنی آغوش میں بھر لے گا۔ اب کیا کروں، اس نے سوچا۔ شاید وہ (لڑکی؟ وجود؟ نور السعادة؟) چاہتی تھی کہ میر اسے ہم آغوشی اور اس کے بعد کی منازل اور طور طریقوں سے آشنا کرے۔ شاید میر بھی اس سے یہی چاہتا تھا۔ شاید میر بھی ان راہوں کا اجنبی مسافر تھا، یا شاید اس کی ہمت نہ پڑتی تھی اور وہ چاہتا تھا ہر قدم کے ساتھ اجازت بھی حاصل ہو۔ بہ سوئے خویشتن از لطف گستاخانہ کش دستم / کہ من بسیار مجوبم ہم آغوشی نمی دانم۔ اچانک میر کو اپنا ہاتھ چشمۂ نوش تک پہنچتا محسوس ہوا۔ اسے نور السعادة کے بدن کے بارے میں کچھ پتا تھا نہیں، کہ پہلے کے دیکھے ہوئے خطوط اور نشانات کے سہارے وہ پہچانتا کہ یہ بدن اسی کا ہے یا کسی اور کا۔ جہاں جہاں اس کا ہاتھ پہنچتا، وہ جگہ پہلے سے زیادہ نرم اور گرم لگتی تھی۔ دل میں عرصے سے کرید تھی کہ کوہ زہرہ تختۂ عطار کی طرح پھسلواں ہوگا یا وہاں سبزۂ لبِ جُو کی کیفیت ہوگی۔ اسے خسرو کی دو رباعیاں یاد آئیں جنھیں دل میں بھی دہرانے کی ہمت اس میں نہ تھی.... جہاں اس کا ہاتھ تھا وہ مخمل دو خوابہ تھا یا.... نور السعادة (اگر وہ نور خانم نہیں تو پھر کون ہے وہ؟) کا سر تکیے پر تھا، بائیں کلائی اور ہتھیلی کچھ نیند اور کچھ تھکن کے انداز میں اس کے ماتھے پر، اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ رخ تھوڑا سا میر کی طرف، لیکن چہرے پر توقع یا لطف آئندہ کی پیش آمد کے تاثر کی جگہ متانت آمیز تناؤ، گویا وہ خود نہیں جانتی کہ یہاں کیا ہونے والا ہے یا شاید جانتی تھی لیکن پوچھ نہ سکتی تھی۔ مگر اس موہوم خواب خاتون کے گلے میں آواز تو تھی ہی نہیں، پوچھتی کیسے.... تو کیا وہ چاہتی تھی کہ عملاً اسے بتایا جائے؟ اندھیرے میں بھی اس کے چہرے پر روشنی سی تھی۔ اس روشنی میں اس کے گھنے بال تکیے اور پلنگ کی پٹی پر، اور فرش پر بکھرے ہوئے۔ میر نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکال کر اس کے شانے پر، پھر گردن کے پاس سینے پر رکھا۔ ہلکی سی لرزش تھی، وہاں سینے کا ابھار نرم لیکن مضبوط محسوس ہوتا تھا۔ میر نے سرگوشی میں کہا، ''نور السعادة، تمھیں سردی لگ رہی ہے؟'' وہ کچھ نہ بولی۔ اتنا لمبا اور مربوط خواب کسی نے بھلا کاہے کو دیکھا ہوگا۔ میر نے اپنے دل میں کہا۔ اس کی ڈھونڈتی ہوئی انگلیوں کو گہرائی کا راستہ شاید ملنے والا تھا۔ وہاں اترائی اور ریشمی صنوبر کے جنگل تھے اور اصل راستہ چشم بخیل کی طرح تنگ تھا۔ اس لڑکی نے آنکھ بھی نہ کھولی۔ میر نے دھیرے سے نور السعادة خواب خانم کا سر ذرا سا اٹھایا اور اپنا دوسرا ہاتھ اس کی گردن میں یوں جھک کر حمائل کر دیا کہ دونوں کے منھ پاس پاس آ گئے۔ اسے لگا کہ موہوم وجود کے لب بہت ذرا سے وا ہوئے ہیں، اتنے کہ دانتوں کی گوہریں جھمک دکھائی

دیتی ہے۔ میر نے اس کے منھ پر منھ رکھ دیا، لطیف زعفرانی سیب جیسی خوشبو اس کی زبان پر تھی۔ لب برلب من نہادہ می گفت/ جان تو بہ لب رسیدہ خاموش۔ سارے بدن میں نرم گرمی کی سی لہر۔ بے زبان بدن شاید اپنے اظہار کے لیے بے قرار تھا، اور لباس اس کے عجز بیان کی دلیل تھا۔ میر نے ذرا جھک کر اور آگے بڑھ کر ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے اتارا۔ وہ اس قدر ہلکی تھی کہ ہاتھ کا نیچے کھسکا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ (وہ لڑکی موہوم تھی نہ، سب کچھ آسان تھا۔) میر کا ہاتھ اب اس کی کمر اور کولھوں پر تھا۔ وہ پشتۂ دیوار خلد، وہ شمسین محشر زا، وہ قبہ ہائے گلناری، اور وہ ان کی نرمی۔ کاش یہ دیوار کاشانی درمیان نہ ہوتی۔ اب میر کا دھڑ پلنگ پر تھا۔ آگے کے لیے جگہ کم تھی، مگر نور خانم.... خواب موہوم نے اپنا بدن شاید چرا لیا، یا جسم نے خود بخود راہ ہموار کر دی کہ میر کو بھی اس ذرا تنگ سے بستر پر جگہ مل گئی۔ اب اس دوسرے بدن کے خطوط کچھ نمایاں ہو چلے تھے۔ میر کا ہاتھ کمر اور کولھوں کے نیچے سے (لامحالہ) کھسک کر سامنے کی طرف سینہ و بغل کی لطیف وادی میں سرگرداں تھا۔ دو پستاں ہر یکے چوں قبۂ نور/ حباب خاستہ از عین کافور۔ میر کو جامی کا شعر یاد آیا۔ کاش ذرا روشنی ہوتی۔ تھوڑی سی روشنی گریبان سے تو پھوٹ رہی تھی، گویا صبح ہونے والی ہو۔ پستان ہمہ نور و سینہ اش جملہ لطیف/ یک صبح دو آفتاب نشنیدہ کسے۔ کمال ہے یہ شعر میر محمد علی حشمت کا کب اور کہاں یاد آیا۔ میر صاحب تو خود زنانہ اور مردانہ دونوں سامانِ حُسن کا مکمل نمونہ تھے۔ کاش یہ سب شعر میں بآوازِ بلند پڑھ سکتا۔ مگر لوگ جاگ جائیں گے اور نہ بھی جاگیں تو یہ موہوم بیگم تو شاید سن بھی نہیں سکتیں۔ کسی اور عالم کی مخلوق معلوم ہوتی ہیں۔ بدن میں اس کے تھی ہر جائے دل کش/ بجا بے جا ہوا ہے جا بہ جا دل۔ میر نے ایک عمر کے بعد اسی لمحے کو یاد کر کے یہ شعر کہا تھا۔ نور السعادۃ خواب.... خاتون کا ہاتھ جو ماتھے پر تھا، منھ سے منھ ملتے ہی اب میر کی پیٹھ پر آ رہا تھا، پھر جب میر کا ہاتھ سامانِ حُسن کے میر فرش تک پہنچنے کی کوشش میں تھا تو کسی طرح وہ نوری ہاتھ.... نور السعادۃ.... نور کا ٹکڑا ہاتھ نور..... اجنبی لڑکی اور میر کے جسموں کے بیچ میں تھا جہاں دونوں کا سینہ اور شکم ایک دوسرے سے چسپاں تھے۔ پھر وہ ہاتھ چپکے سے اندر تک رینگ گیا۔ میر کو وہم سا ہوا کہ نیچے جو بدن ہے اس نے اپنے عجز بیان پر قابو پا لیا ہے۔ بند ڈھیلے ہو رہے ہیں۔

میر کی آنکھ کھلی تو دن نکل چکا تھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ حسب سابق کھلا ہوا تھا، صبح کی گلابی کرنوں کے ساتھ طیورِ صبح کی صبوحی بھی جان و شعور کو سیراب کر رہی تھی۔ طاق میں شمع بجھ چکی تھی.... بجھا دی گئی تھی؟

ابھی تین انگل موم باقی تھی، اس لیے یہ امکان کم تھا کہ اپنے آپ بجھ گئی ہو۔ رات کی مہمان (نور السعادۃ) کی کوئی نشانی نہ تھی۔ حتیٰ کہ چوڑی کی کرچ، یا چوٹی کا کوئی بادلہ، یا مخمل کا ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ بستر پر پسینے کی نمی البتہ کہیں کہیں موجود تھی۔ مگر خود میر کو بستر پر پسینہ بہت آتا تھا۔ طبیب کہتے تھے یہ فشارِ قلب کے کم ہو جانے کی علامت ہے۔

میر نے تا زندگی ہمیشہ قسم کھا کھا کر کہا کہ وہ اس رات جاگا بالکل نہ تھا۔ اگلی صبح جب دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تھی تو اس وقت کے بعد پہلی بار کھلی تھی جب اس نے بھاری چادر سے اپنا منھ ڈھک کر پیٹھ دروازے کی طرف کر لی تھی۔ لیکن وہ اس بات پر بھی قرآن مجید اٹھانے کو تیار تھا کہ اس رات کوئی معاملہ پیش آیا تھا ضرور۔ وہ ماہ پارہ جو بھی رہی ہو، لیکن تھی ضرور اور یہ بھی نہیں کہ سب کچھ محض خواب میں واقع ہوا ہو۔ انسان سوتے میں بھی جاگنے کے خواب دیکھتا ہے، اور جاگنے میں بھی بخوبی سو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص سوتے میں اٹھ کر چل سکتا ہے، دوڑ سکتا ہے، عام زندگی کے وظائف انجام دے سکتا ہے، تو سوتے میں وہ معشوق سے بھی یوں ہم آغوش ہو سکتا ہے کہ سب لطف جاگنے کے ہوں۔ رات کوئی آیا تھا، اس کی واحد طبیعی دلیل ادھ جلی شمع تھی۔ شمع کا ادھ جلی رہ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے کسی نے رات میں کسی وقت بجھا دیا تھا۔ اگر شمع کو اپنی طبیعی زندگی پوری کرنے دیا جاتا تو وہ پگھل کر، موم کی ایک چھوٹی سی چھپڑی کی شکل میں بجھتی۔

لیکن شمع کو ہوا کا جھونکا بھی تو بجھا سکتا ہے؟ میر کے حجرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، یہ خود میر کا قول ہے اور اس رات ہوا تیز تھی، اس کی شہادت سب دیتے ہیں۔ رہی بستر پر پسینے کی نمی، تو اس کا حال اوپر بیان ہو چکا اور یہ بھلا کیوں کر ممکن تھا کہ اجنبی جگہ میں اپنا محفوظ کمرہ چھوڑ کر نور السعادۃ قریب قریب ساری رات کہیں اور رہے؟ اس میں اتنی جرأت تھی اور نہ خانم بزرگ ایسی بے خبر سونے والی تھی کہ یہ سب آنا جانا ہو اور وہ باخبر نہ ہو؟ اور یہ بات تو بالکل بعید القیاس تھی کہ یہ سب ماں کے علم میں رہا ہو۔

نور السعادۃ اس دن دردِ سر اور تپ کی وجہ سے اپنے کمرے ہی میں رہی۔ شام کی محفل میں بھی صرف خانم بزرگ اور میاں ہینگا نے نغمہ سرائی کی۔ اگلی صبح قافلہ دہلی کے لیے روانہ ہوا تو نور السعادۃ جیسا کہ طریقہ تھا، زنانی ڈیوڑھی سے اپنے محافے میں سوار ہوئی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کون سے محافے میں ہے۔

نور السعادۃ کا بخار کئی دن تک نہ گیا۔ محمد تقی میر اور کشن چند اخلاص باہر سے خیریت معلوم کر کے واپس ہو جاتے۔ آٹھویں دن جب محمد تقی میر کو باز یابی ملی تو دونوں معمول کی گرم جوشی کے ساتھ ملے، لیکن زیادہ تر

گفتگو نور السعادة کی بیماری کے حوالے سے ہوئی۔ اس رات کے باب میں لب کشائی کا یارا میر کو نہ تھا اور نہ اسے اب بھی پوری طرح یقین تھا کہ کوئی آیا بھی تھا۔ ایک خوف اسے یہ کھائے جا رہا تھا کہ اگر واقعی نور السعادة ہی اس رات کو آئی تھی تو کیا رات کے تعب اور روحانی تکان کی وجہ سے اس کو بخار آ گیا تھا؟ وہ اس قدر نازک مزاج اور نازک بدن تھی کہ اس کے وجود پر جسم سے زیادہ جان کا گمان ہوتا تھا۔ میر نے اس زمانے میں بھی، اور چالیس پچاس برس بعد بھی نور السعادة کی شخصیت کے اس پہلو کو بار بار نظم کیا:

لطف بدن کو اس کے ہرگز پہنچ سکے نہ
جا پڑتی تھی ہمیشہ اپنی نگاہ جاں پر

لبالب ہے وہ حُسن معنی سے سارا
نہ دیکھا کوئی اس نزاکت سے اب تک

لطف اس کے بدن کا کیا کہوں میر
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے

کیا تن نازک ہے جان کو بھی حسد جس تن پہ ہے
کیا بدن کا رنگ ہے تہ جس کی پیراہن پہ ہے

نازک بدن ہے کتنا وہ شوخ چشم دلبر
جان اس کے تن کے آگے آتی نہیں نظر میں

سچ تو یہ ہے کہ کئی سال بعد میر نے جو ایک شعر معشوق کی نازکی کے مضمون پر کہا تھا، وہ نور السعادة کی ہی نزاکت پر مبنی تھا:

ہوں داغ نازکی کہ کیا تھا خیال بوس
گل برگ سا جو ہونٹھ تھا وہ نیلگوں ہوا

یہ بات میر کے تجربے کی تھی۔ نور السعادۃ کو بوسہ دیتے وقت جس جگہ بھی وہ ذرا دباؤ ڈال دیتا وہاں چند لمحوں کے لیے ہلکا سا نیل پڑ جاتا تھا۔

وہ مہینہ گذر گیا۔ موسم ذرا گرم اور خشک ہوا تو نور السعادۃ کی طبیعت پوری طرح بحال آئی۔ لیکن یہ چار ہی دن کی چاندنی تھی۔ اسے رہ رہ کر ہلکا بخار ہو جاتا۔ بھوک کم ہو گئی تھی۔ بظاہر ضعفِ کبد کے علامات تھے، اسی کا علاج ہوتا رہا۔

اٹھارویں صدی کی تاریخ ہند سچ پوچھیے تو دغابازیوں اور غداریوں کی تاریخ ہے۔ ایسی ہی ایک دغابازی اعتمادالدولہ کے بھانجے شاہ نواز خان نے کی جب اس نے احمد شاہ درانی [اسے احمد شاہ ابدالی بھی کہتے تھے، مرتب] کو ہندوستان پر حملہ اور فتح کی دعوت دی۔ فتح دلانا شاہ نواز خان کا ذمہ تھا، شرط بس یہ تھی کہ بعد فتح، ملک کی وزارت مجھے ملے۔

احمد شاہ درانی نے سمجھا تھا کہ جنگل میں جب ہاتھی مرتا ہے تو ان کرگسوں، گیدڑوں، اور کفتاروں کی بن آتی ہے جو سب سے زیادہ ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ لیکن پیل بیمار پر پہلا حق اسی کا ہوتا ہے جو اس کا رشتۂ حیات منقطع کرے۔ درانی کی نظر میں شاہ نواز خان کی حقیقت کرگس لنگ سے زیادہ نہ تھی۔ محمد شاہ پادشاہ غازی ان دنوں بستر علالت پر تھا، اور درانی اسے پیل بیمار سمجھ کر اس پر اپنا حق قرار دے رہا تھا۔ لیکن یہ خبر اسے شاہ نواز خان سے نہ ملی تھی کہ بادشاہ کی اولوالعزمی اور صلابتِ فہم میں کوئی کمی نہ آئی تھی اور وہ احمد شاہ کے مقابلے کے لیے لشکرِ جرار ترتیب دے رہا تھا۔

دو لاکھ کی فوج اعتمادالدولہ کی سربراہی میں دہلی سے سرہند پہنچی اور احمد شاہ کی افواج کے دوبدو ہوئی۔ اعتمادالدولہ کا نائب کماندار ان کا بیٹا معین الملک عرف میر منو تھا۔ اعتمادالدولہ کے خیام کی حفاظت رائے کشن چند اخلاص کے ذمہ تھی۔ محمد تقی میر بھی نواب بہادر کے عملے کے ساتھ شاہی جیوش میں موجود تھا۔ پہلے دن کی لڑائی صرف ہلکی جھڑپوں پر مشتمل تھی، نہ ایں راظفر نہ اور اخطر۔

اتفاق کہ اس دن بھی جمعہ تھا جب اگلے دن 22 ربیع الاول 1161ھ [مطابق 22 مارچ 1748ء، مرتب] کو درانی کو فوجوں نے پو پھٹتے ہی محمد شاہ کی فوجوں پر سخت گولہ باری شروع کر دی۔ اعتمادالدولہ اپنے خیمے کے اندر چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ بالکل اتفاقیہ ایک گولہ براہِ راست ان کے اوپر گرا، اور انھوں

نے اسی عالم میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔ رائے کشن چند اخلاص اس وقت خود پہرے پر تھا۔ غنیم نے اپنی توپ کے نشانے اور مار کا شاید صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ اگلے چار پانچ گولے بھی تابڑ توڑ خیمے کے محاذ ہی میں گرے۔ رائے کرشن چند اخلاص کا دایاں پاؤں گھٹنے پر سے، اور بایاں بازو کندھے کے پاس تک اس درجہ مضروب ہوئے کہ بالآخر انھیں فوری طور پر کاٹنا پڑ گیا۔

لیکن جنگ کا نقشہ سنبھالنا اس وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ معین الملک نے کمال حاضر دماغی اور جرأت سے کام لے کر اعتماد الدولہ کی موت کو چھپائے رکھا اور خود ان کے ہاتھی پر سوار ہو کر مقابلے کو نکلا۔ ادھر کارسازِ حقیقی نے یہ انتظام کیا کہ محمد شاہی فوج کا ایک گولہ براہِ راست درانی کے بارود خانے میں پڑا۔ گولے کے دھمک اور تکان سے بارود خانے میں آگ لگ گئی۔ سینکڑوں سپاہی تو چشم زدن میں کوئلہ ہو گئے۔ آگ جب پھیلی تو درانی کے پاؤں اکھڑ گئے۔ افواجِ شاہی نے لاہور تک اس کا پیچھا کیا اور اسے بلادِ ہند سے نکال کر ہی دم لیا۔

شہنشاہِ ہند نے بستر علالت سے معین الملک کے ناظم لاہور مقرر کیے جانے اور شاہ نواز خان کی بذلت معزولی کا حکم بھیجا۔ معین الملک اپنی موت [محرم 1167، مطابق نومبر 1753، مرتب] تک اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ ان کی موت کے بعد عماد الملک پھر اپنی چال چل گیا۔ اس نے معین الملک کی بیوہ مغلانی بیگم کو بے دخل کرا کے آدینہ بیگ خان کے نام پروانہ جاری کرا دیا۔ اب کی بار غداری کا افتخار مغلانی بیگم کو نصیب ہوا۔ اس نے نظامت لاہور کے عہدے پر تقرر کی شرط پر احمد شاہ کو دوبارہ ہندوستان پر دھاوے کی دعوت دے دی۔

[لیکن یہ واقعات ہمارے افسانے سے تعلق نہیں رکھتے، مرتب۔]

رائے کشن چند کو میر اور دوسرے ساتھی چارپائی پر ڈال کر بہزار دقت دلی لائے۔ ربیع الثانی 1167ھ [مطابق اپریل 1747ء، مرتب] کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ خانم بزرگ نے حکم دیا کہ علاج میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے۔ لیکن گرمی کی آمد آمد تھی، ہزار احتیاط کے باوجود زخم پر کھیاں ایک دو بار آ ہی جاتی تھیں۔ کشن چند کے زخم بگڑنے لگے، ان میں پیپ پڑ گئی اور پٹی نہ بندھ سکنے کے باعث انھیں دن رات ٹھنڈی ہوا اور صاف جگہ کی ضرورت تھی۔ یہ سب کشن چند اخلاص کے کٹرہ نیل والے مکان میں میسر نہ تھا۔ ایک مہینہ یوں ہی گذرا۔ پھر خانم نے رائے کشن چند کے والد اچل داس کی اجازت سے کشن چند کو اپنی حویلی میں اٹھوا لیا۔

ادھر محمد روشن اختر محمد شاہ پادشاہ غازی کا طالعِ حیات بھی مائل غروب تھا۔ شہنشاہ کا بسترِ علالت بہت جلد ہی مبدل بہ بسترِ مرگ ہو گیا۔ 27 ربیع الثانی 1161ھ [مطابق 16 اپریل 1748ء، مرتب] کو اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اٹھتیس سال حکومت کی، اور حق یہ ہے کہ نادر گردی کے زمانے کے علاوہ اس نے بڑی شان سے حکومت کی۔ احمد شاہ درانی کے خلاف اس کی کامیاب مہم اس کی آخری مہم تھی، اور وہ تاریخ کے صفحات پر 'فتح خداساز' کہلائی۔ موت کے وقت اس کی عمر کوئی چھیالیس سال تھی۔ دو دن بعد اس کا بیٹا مجاہد الدین ابونصر احمد شاہ کے لقب سے پانی پت میں تخت نشین ہوا۔

مئی 1748ء کی آخری تاریخیں تھیں جب شاعر نغز گو رائے کشن چند اخلاص نے بھی آخری سانس لی۔ 22 مارچ 1748ء کے حادثۂ توپ کے بعد سے اسے ہوش نہ آیا تھا۔ جب اس نے جان دی ہے تو خانم بزرگ اس کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی، اگر چہ اس وقت تک رائے کشن چند کے زخم اتنے متعفن ہو چکے تھے کہ طبیب اور جراح بھی پاس آنے سے گریز کرتے تھے۔

کشن چند اخلاص کی چتا کو جب آگ دی گئی تو دہلی کے کئی فارسی گو اور قدر دان شعر وسخن نگمبودھ گھاٹ پر موجود تھے۔ میر بھی ان میں تھا۔ بوڑھے اچل داس نے جوان بیٹے کا سوگ دس دن منایا، پھر کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ خانم بزرگ نے کشن چند اخلاص کا سوگ بظاہر اکیس دن منایا، دل کا حال اللہ جانتا ہے۔ میر بھی دیگر اراکین حویلی کی طرح خانم بزرگ کے ساتھ ماتم داروں میں تھا۔ نور السعادہ کی مسلسل علالت پر تشویش کے ساتھ اب اسے خانم بزرگ کی بھی فکر لاحق تھی کہ اخلاص کا رنج انھیں بیمار نہ ڈال دے۔

جون 1748ء کا وسط تھا جب ایک ملاقات میں نور السعادہ نے میر سے کہا:

''آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ پھر ملنا نہ ہو گا۔''

میر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟ میں سمجھا نہیں۔''

''یہی کہ اماں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں تبریز جا کر ابا کی قبر کی مجاوری کریں گی،'' اس نے بے رنگ لہجے میں، لیکن ذرا سی اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

''اور یہ سارا گھر، یہ ساز و سامان، اور سب سے بڑھ کر تم؟''

''حویلی، اور اس کا جو سامان اعتماد الدولہ مرحوم کا ہے، ان کے ورثا کو واپس ہو جائے گا۔ باقی سب کچھ

مہینے دو مہینے میں اونے پونے بیچ کر ہم گھر کی راہ لیں گے۔''

لفظ ''گھر'' نورالسعادة نے عجب تلخ اور طنز بھرے لہجے میں ادا کیا تھا۔

''مگر کیوں؟ آخر یہاں کیا نہیں ہے جو تبریز میں ہوگا؟'' میر نے کہا۔ ''اور وہاں کی ہوا بھی تو تم کو موافق نہیں آتی؟'' وہ دلّی نہ چھوڑنے کی موافقت میں ممکن دلائل ڈھونڈ رہا تھا۔

''اب میں بڑی ہوگئی ہوں اور اگر تبریز اب بھی موافق نہ آیا تو میں اصفہان چلی جاؤں گی۔''

اتنی بات کرتے کرتے وہ ہانپ گئی تھی۔ ''ذرا وہ شربت صدر کا شیشہ اور صاف پیالہ اٹھادو،'' وہ بولی۔ ''اس سے فوری آرام ہوجاتا ہے۔''

''مگر تم اس قدر بیمار ہو۔ اتنا لمبا سفر کیسے طے کروگی؟''

''میں ایسی بیمار بھی نہیں۔ ویسے، سفر میرے پوری طرح صحت مند ہونے پر آغاز ہوگا اور ایک طبیب ساتھ چلے گا۔''

''مگر کیوں؟ کیوں؟'' وہ زانو پر ہاتھ مار کر تقریباً چلّا کر بولا۔

''شش! دھیمی آواز میں بولو، ورنہ چپ رہو،'' یہ کہتے ہوئے اس نے میر کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور اس طرح اس کے جملے میں جو ذرا سی درشتی تھی وہ مٹھاس میں بدل گئی۔

''مگر کیوں؟ جانی وجہانی، آخر کیوں؟''

''اماں کہتی ہیں کہ اعتمادالدولہ نے ہمیں بلایا، گھر دیا، توقیر دی۔ عمدۃ الملک نے ہر طرح کا سلوک کیا۔ رائے کشن چند مثل پروانہ فدا رہا۔ اب یہ تینوں نہیں ہیں تو دہلی میں کاہے کا رہنا۔ اب ہمیں گاڑھے وقتوں میں امان کون دے گا۔''

''اور تم؟ تم بھی ان سے متفق ہو؟ میرے بغیر تم رہ لوگی، یا ان معاملات میں تمھاری کوئی رائے نہیں؟''

نورالسعادة کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ سروقد کھڑی ہوگئی، لڑکھڑائی، لیکن پھر بھی سہارا لیے بغیر کھڑی رہی۔

''میر محمد تقی، میں مرد کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ اپنی ماں کے بغیر نہیں۔ تم نے میرے وجود میں رنگ بھرے۔ لیکن یہ وجود ان کا دیا ہوا ہے۔''

وہ ایک لحظہ چپ رہی۔ میر کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا اب رو پڑے گا۔ ''میں جانتی ہوں مجھے صحت نصیب نہ ہوگی۔ تبریز ہو یا دلّی، میرے لیے سب برابر ہیں۔ گذشتہ ہفتوں میں اماں نے رائے کشن چند

کے سڑتے ہوئے زخموں کی جس جس طرح نگہداشت کی، مرہم پٹی کی، ان کے بھائی اور باپ کے بھی بس کی بات نہ تھی۔ جراح تک ناک پر عطر کا پھاہا رکھ لیتے تھے، اور وہ دن کے آٹھ پہر میں ایک ہی بار آتے تھے۔ میری اماں کی نزاکت طبع کا حال تم جانتے ہو۔ لیکن میں اگر پٹی سے لگ گئی تو کیا تم میری بیمارداری کرو گے؟"

"ک.... کروں گا۔ ضرور کروں گا۔"

"ہونہہ،" اس نے پیار بھری نظر سے میر کو دیکھا۔ "تم مردوں کو میں خوب سمجھتی ہوں۔ چلو، جانا، تم نے کہہ دیا، یہی بہت ہے۔"

آج اس نے میر کو پہلی بار 'جانا' کہا تھا۔ اس کے بدن کا ہر ذرہ جھوم اٹھا۔ لیکن یہ وقت لگاوٹ کی باتوں کا نہ تھا۔ "تم مجھے آزما کے تو دیکھ لیتیں۔"

وہ تھوڑا ہنس دی، لیکن اس ہنسی میں استہزا نہ تھا۔ "خطا معاف، تم آزمائش کے بھی لائق نہیں ہو۔ اچھا یہی بتاؤ مجھے کہاں رکھو گے، کس کا علاج کراؤ گے؟"

میر چپ ہو کر رہ گیا۔ وہ بولی: "اور دیکھو، میں نے تم سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ مجھے تنہائی کی موت کے خواب آتے ہیں۔ میں تنہا نہیں مرنا چاہتی۔ نہ اماں کو خفا کرنا چاہتی ہوں۔ ان کی خفگی بھی تنہائی کی موت لے کر آئے گی۔"

"تو کیا میں نے تمھاری شرطیں نہیں نبھائیں؟ میں نے تمھیں رسوا نہیں ہونے دیا۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ لیکن میں نے اگر تمھاری زمام اپنے ہاتھ میں نہ رکھی ہوتی تو تمھارا عشق مجھے کو چہ و بازار کی دھوپ میں لا کر ڈال دیتا۔ سب دیکھتے کہ نور خانم پابند کسی کی ہے اور معشوق کسی کی۔ تم میں صبر تو ہے نہیں۔"

وہ مسکرائی۔ اس بار اس تبسم میں شوخی بھی تھی۔ "اپنے شعر بھول گئے تم؟ تم ہی نے تو کہا ہے:

مستوری خوب روئی دونوں نہ جمع ہوویں
خوبی کا کام کس کی اظہار تک نہ پہنچا

"خیر چلو، یہ تو ٹھٹھول کی باتیں تھیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں تمھاری احسان مند ہوں.... اور حق یہ ہے کہ تم شعر خوب کہتے ہو۔ تم کہتے ہو شعر کی دُنیا اور ہے، شاعر کی دُنیا اور ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ جو باتیں شعر

کی دُنیا میں سچ ہوں وہ شاعر کی دُنیا میں بھی سچ ہوں۔ ہوگا، لیکن شعر کی دُنیا شاید زیادہ سچی ہوتی ہے۔ کیوں؟''

''نور خانم، اب مزید شرمندہ نہ کرو۔ میرا بس چلے تو میں تمھیں اپنی کھال کی جوتیاں پہناؤں۔''

''میری ماں کو دیکھو، انھیں تقدیر نے ساری زندگی ستایا۔ ایک میں ان کا سرمایۂ زیست ہوں، میں انھیں کیسے چھوڑ دوں، خاص کر جب میری بھی حیات اب جتنی ہے انھیں کے دم سے ہے۔''

''میں تمھیں نہ جانے دوں گا۔ مجھے خانم بزرگ سے ایک بار مل لینے دو۔ میں انھیں منالوں گا۔''

''خانم بزرگ سے ملنے کی راہ میں کوئی حائل نہ ہوگا۔ لیکن تم نے میرے سوالوں کا جواب نہ دیا۔ مجھے کہاں رکھو گے، کیا علاج کرو گے میرا، میں پلنگ سے لگ گئی تو کیا میرا بدن صاف کرو گے، میرے گندے کپڑے دھوؤ گے....؟''

''یہ سب فرضی سوالات ہیں۔ بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگذرد۔ میں سب سہار لوں گا۔''

نور السعادة بولی، ''کہنا آسان ہے.... اور ایک بار کا بوجھ ہو تو شاید چیونٹی بھی اٹھا لے۔ لیکن روز صبح شام رات اس رنگ میں گذارنا.... تم بھی انسان ہو، مرد ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم ہزار دل و جان سے میری خدمت کرو، لیکن کبھی بے خیالی میں، بھولے سے بھی تمھارے بشرے پر ناگواری یا اکتاہٹ یا تھکن کا سایہ بھی مجھے دکھائی دے گیا تو میں.... میں خدا جانے کیا کر ڈالوں، خود زہر کھالوں یا تمھیں ہی زہر دے دوں۔ وہ تمھارے ہی تو بزرگ تھے، منصور حلاج کو خلق خدا کے بے شمار پتھروں نے وہ جراحت نہ پہنچائی جو انھیں شبلی کے ایک پھول سے پہنچی....''

میر بے صبری سے بولا، ''تم امتحان لیے بغیر ہی مجھے نااہل قرار دے رہی ہو۔ یہ بڑا ظلم ہے....''

نور السعادة کے منھ پر پہلی سی مسکراہٹ آئی۔ ''بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو۔'' یہ اس نے کچھ ایسی دلسوزی اور محبت بھرے تردد سے کہا جیسے کوئی ماں اپنے چھوٹے سے بچے کو کسی مشکل کام سے منع کرے کہ یہ تیرے بس کا نہیں، تو مفت ہلکان ہوگا۔ ''میں تمھیں نااہل نہیں ٹھہراتی، ہرگز نہیں، جانا۔ لیکن میں بشریت کی مجبوریوں اور تقدیر کے جبر، دونوں سے خوب واقف ہوں۔ میری ماں، اور ان کے باپ دادا کے گذشتہ حالات سے تم نابلد نہیں ہو۔ ہماری قوم کی تقدیر ہی میں دربدری ہے تو کوئی کیا کر لے گا۔ ہمارا گھر بننے سے پہلے ہی اجڑے گا۔''

''لیکن نور السعادۃ، چار دن خوش رہ کر جی لینا دکھ بھری عمرِ خضر سے بہتر ہے،'' میر نے کہا۔

''خوشی کسے کہتے ہیں؟ اور کس کی خوشی؟ کیا تم بھول گئے کہ ہم یہاں خوش رہنے کے لیے نہیں، کٹنے مرنے اور بھبک بھبک کر جلنے بجھنے کے لیے لائے گئے ہیں؟''

میر سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ''جسم اور جان میں مسرت کی ایک بوند زہر بھرے سمندر کو بھی ٹھنڈا کر سکتی ہے،'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا، ''لیکن....''

''ہاں! یہی لیکن تو سب کچھ ہے۔ کب تک کے لیے کوئی جیے اور کس کی خوشی کے لیے جیے؟ میری ماں کی خوشی میری زندگی میں ہے اور تم جانتے ہو میں اماں کے ساتھ رہی تو شاید کچھ دن اور جی لوں گی، اور انھیں خوش رکھ کر جی لوں گی۔ تمھارے پاس رہی تو شاید اور کم جیوں، اور اماں کو ناخوش الگ کروں۔ تم ہزار میرا ساتھ دو لیکن جب مجھے موت آئی اور میں تنہا رہی، تو میں تمھیں بددعا بھی نہ دے سکوں گی۔''

اس نے آنسو خشک کیے، پہلے میر کے، پھر اپنے۔ ''دیکھو! اب مجھ سے ملنے نہ آنا۔ اماں بلائیں تو بھی نہ آنا'' وہ زار و قطار روئی۔ ''اس بار تو میں نے کسی طرح اپنے دل کو سمجھا لیا۔ دوسری بار تمھیں دیکھوں گی تو مجھے کسی چیز پر قابو نہ رہے گا۔''

وہ دیوان کے تکیے میں منھ ڈال کر روتی رہی۔ میر کب اٹھ آیا، اس نے دیکھا نہیں۔

اس گفتگو کے اگلے ہی دن نور السعادۃ پلنگ پر پڑ گئی۔ کئی دن بعد اطبا نے تشخیص کی کہ اسے بھی اپنے باپ کی طرح رنج باریک لگ گیا ہے اور بایزید کی تو صرف ہڈیاں متاثر تھیں، نور السعادۃ کا پیٹ بھی اس کی زد میں آ چکا تھا۔ اب اس کی زندگی سال چھ مہینے سے زیادہ نہ رہ گئی تھی۔ اسے روز شام کو تپ آ جاتی، لیکن جس وقت تپ نہ ہوتی اس وقت بھی اس کا جی نڈھال رہتا۔ بھوک اسے بالکل نہ لگتی تھی۔ اس پر ظلم یہ کہ ہر دوا اسے فائدے کے بجائے نقصان کرتی تھی۔ دوا پیتے ہی اسے قے ہو جاتی۔ ایک مہینہ مشکل سے گذرا ہوگا کہ وہ ہڈیوں کی مالا بن کر رہ گئی۔ اس کی غذا صرف ابالے ہوئے تازہ انجیر تھے، اور اس کی دوا شیخ الرئیس کی قرابادین کے مطابق تیار کیا ہوا شربت صدر۔ یہ دو چیزیں تو وہ حلق سے اتار لیتی، اور کسی شے کی طرف دیکھنا بھی اسے گوارا نہ تھا۔

لبیبہ خانم رو رو کر نور السعادۃ سے کہتی کہ میر محمد تقی کو بلوا دوں، میرے بچے کا دل بہل جائے گا۔ لیکن

نور خانم کی ایک نہیں تو ہزار نہیں تھی۔ آخر ایک دن لبیبہ خانم نے کہا کہ تبریز جانے کا ارادہ ملتوی کر دیں تو کیسی رہے؟ ''اور میرا چاند، میری گڑیا اگر چاہے تو ارادہ منسوخ ہی کر دوں۔''

''اماں آپ کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ دہلی ہمارے رہنے کی جگہ نہیں اور آپ کو ابا کے ساتھ اپنا وعدہ بھی پورا کرنا ہے،'' وہ رو کر بولی، ''اور میں آپ کی آغوش میں مرنا چاہتی ہوں۔ ابا کو آپ نے جو سکون ان کے مرتے وقت پہنچایا اس کی میں بھی مستحق ہوں۔''

''تیرا حق سب حق ہے جانا۔ میری جان کوئی لے لے اور تجھے اچھا کر دے، اچھا نہ کر دے تو دو چار برس تیرے لیے آرام کی زندگی اور بڑھا دے، تو یہ بھی حق ہو گا۔''

''اب میں جینا بھی نہیں چاہتی اماں جانی۔ دہلی چھوڑ کر جینا کوئی جینا نہیں اور آپ کو دتی سے نہ جانے دوں تو یہ تیسری موت آپ پر عائد کرنے کا مجھے حق کیا؟ اور آپ نہ ہوں گی تو میں پھر بھی اکیلی ہو جاؤں گی۔ ہم سب ایک دوسرے سے اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ نہ آزاد ہو سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کو آزاد کر سکتے ہیں۔''

وہ بڑی دیر چپ رہی، پھر کہنے لگی، ''اماں، رختِ سفر جلدی تیار کرا لیتیں تو خوب تھا۔ میں یہیں مر گئی تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ ہو سکے تو مجھے ابا کے پاس ہی گاڑیے گا اماں۔''

سامانِ سفر طے کرتے ایک مہینہ اور لگ گیا۔ سب سے بڑا سامان تو کوئی مناسب قافلہ تھا جو انھیں تبریز نہیں تو اصفہان یا طہران تک لے جاتا۔ پھر اس قافلے کا، رہبروں اور محافظوں کا انتظام بھی ہو گیا۔ ایک تجربہ کار طبیب بھی ساتھ چلنے کو راضی ہو گئے۔ محمد تقی میر سب خبر رکھتا تھا، جس دن یہ لوگ دہلی سے چلے ہیں، وہ پھاٹک حبش خان کی نکڑ پر آدھی رات سے آ کر ٹھہر گیا تھا۔ صبح ہوئی تو جانے والوں نے کوچ کیا۔ لیکن نور السعادۃ کا محافہ ہر طرف سے بند تھا۔ میر کو اس کی ایک جھلک کیا، چوڑی کی کھنک تک نہ سنائی دی:

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر اک چیز سے دل اٹھا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

اعتماد الدولہ اور عمدۃ الملک کے یہاں سے بھی کچھ لوگ الوداع کہنے آئے تھے۔ حویلی کے متوسلین اور متعلقین تو تھے ہی، پاس پڑوس کے بھی لوگ تھے۔ کشن چند اخلاص کا بوڑھا باپ آنکھوں سے معذور ہو چکا تھا، لیکن پالکی میں سوار ہو کر آیا تھا۔ فضا میں دور تک سسکیوں کا طویل سلسلہ تھا۔

سفر کے بیسویں دن وہ ہرات سے تین دن کے فاصلے پر تھے۔ نور السعادۃ پر اب غشی سی طاری تھی۔ اس کے طبیب نے خانم بزرگ سے کہا کہ اگر دھاوے کے طور پر چلیں تو ایک دن ایک رات میں ہرات پہنچ سکتے ہیں۔ مریضہ کو قیام اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔ پھر ہرات میں بعض نامور اطبا بھی ہیں۔ انھیں شاید کوئی بات سوجھ جائے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ صاحب زادی تیسرے دن کا سورج نہ دیکھیں گی۔

اپنے لوگوں کو، جن کی تعداد تیس تھی، قافلے سے الگ کر کے خانم بزرگ نے دھاوے کا حکم دیا۔ وہ سارا دن چلتے گئے۔ شام ہوتے ہوتے چڑھائی کی راہ ختم ہو کر اتار شروع ہوتا تھا۔ لیکن ابھی وہ کچھ ہی دور گئے تھے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اتار کی راہ، رات کا وقت، ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا، مگر خشک راہ پر سفر کسی نہ کسی طرح جاری رہ سکتا تھا۔ بارش میں تو اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ رکنے میں بھی جوکھم تھے، لیکن کسی محفوظ جگہ پر خدا کے سہارے رات گذاری جا سکتی تھی۔

قافلے کو وہیں روک کر خانم بزرگ نے دو تجربہ کار رہبروں کو آگے بھیجا کہ پہاڑ کا کوئی محفوظ غار، یا کسی پہاڑی کا چھجا ایسا ڈھونڈیں جو بارش اور ہوا سے انھیں کچھ عافیت دے سکے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد انھوں نے واپس آ کر خوش خبری سنائی کہ محفوظ جگہ مل گئی ہے۔ ممکن حد تک تیز قدم رکھتے سارے اہل قافلہ نے مقامِ مصئون پر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ بارش بھی اب ہلکی پڑتی معلوم ہوتی تھی۔ اگر تقدیر اچھی رہی تو صبح کاذب کے پہلے پہلے وہ سفر دوبارہ شروع کر سکتے تھے۔ نور السعادۃ پر غشی ویسی ہی تھی، لیکن اب شاید سرد رات کی بارش اور ہوا کی وجہ سے اس کی سانس کھڑکھڑاتی ہوئی سی آ رہی تھی۔ طبیب نے خرمہرہ گھس کر اور کچھ دعا پڑھ کر ایک ذرا سا اس کی زبان پر رکھا تو اس کی حالت بظاہر کچھ بہتر ہوئی، سانس کے عمل کا شور کم ہو گیا۔

لبیبہ خانم ساری رات بیٹی کا منھ تکتی رہی۔ جب نور خانم کی سانس کی آواز ہلکی پڑنے لگی تو اس نے سمجھا کہ دوا نے پورا اثر دکھا دیا ہے۔ دفعتہً نور السعادۃ نے اپنا ہاتھ بڑھایا، جیسے کچھ ٹول رہی ہو۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دعا پڑھنی شروع کی۔ وہ صبح تک دعائیں پڑھتی رہی۔ نور السعادۃ کی جان کب نکلی، اسے معلوم نہ ہوا۔

نورالسعادۃ کی قبر ہرات میں بنی۔ لوح مزار پر اتنا لکھا گیا:

نورالسعادۃ

بعمر ہفدہ سال وہفت ماہ از دامن مادر برفت

گشتہ جدا از دیدہ و داماں چگونہ ای

لبیبہ خانم نے قبر پر ایک چھوٹا سا، لیکن پُرفضا اور خوبصورت روضہ بنوالیا۔ اسی کے پاس ایک حجرے میں وہ بھی دن رات رہتی۔

قافلے والوں، اور طبیب کو اس نے دونے چوگنے انعام و اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ محمد تقی میر کے لیے چاندی کی تارکشی کے صنوبری شکل کے ڈبے میں نورالسعادۃ نے اپنے بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ پہلے سے رکھ چھوڑی تھی۔ اس کے ساتھ اپنی بے مثال خطاطی میں اس نے بیدل کے یہ شعر ایک پرچۂ کاغذ پر لکھ دیے تھے کہ میری موت کے بعد انھیں بھی محمد تقی میر کو بھجوا دیں:

ز جنس شکستہ آنچہ پیدا شود
بریں آستاں قیمتش وا شود
شکست تو ایں جا درستی نماست
کہ بحر کرم سربسر مومیاست
محیطے کہ رنگ گہر نقش بست
ہ خواہد ز امواج غیر از شکست
سلامت نمی زیبد از ساز موج
شکست است انجام و آغاز موج
برآں گل کند گریہ ابر بہار
کہ رنگ شکستن نہ کرد اختیار

داستان گل و سنگ کی یہ آخری متاع دہلوی طبیب نے بچشم نم خانم بزرگ کے ہاتھوں سے لے کر بحفاظت محمد تقی میر کو پہنچا دی۔

میر نے کئی بار ارادہ کیا کہ اپنی جان دے دیجیے۔ لیکن جب بھی وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا، نورالسعادۃ کی شبیہ اس کے سامنے آجاتی، اور ہر بار اس طرح، جیسے وہ اسے کوئی کاغذ، یا خط دے رہی ہو۔ میر نے پہلے تو اس کو محض واہمے کا کھیل اور جیتے رہنے کی فطری خواہش کے لیے ایک بہانہ سمجھا۔ لیکن کچھ مدت بعد وہ نورالسعادۃ کو خواب میں بھی دیکھنے لگا۔ شروع میں اس کا خواب بس یہی ہوتا کہ نورالسعادۃ اسے کوئی کاغذ دے رہی ہے۔ پھر وہ دیکھنے لگا کہ صرف ایک کاغذ نہیں، بلکہ پورا دفتر ہے۔ آخر آخر میں وہ نورالسعادۃ کو کاغذ قلم لے کر کچھ لکھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ہر خواب میں وہ یہ بھی دیکھتا کہ میں نورالسعادۃ کے پیچھے جا کر اس کے شانوں پر سے جھانک کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا لکھ رہی ہے۔ کہیں وہ مجھے خط تو نہیں لکھ رہی؟ کہیں وہ کچھ پیغام تو نہیں کہلانا چاہتی؟ لیکن جیسے ہی وہ اس کے قریب آتا، وہ ہوا میں گھل کر غائب ہو جاتی۔

نورالسعادۃ کے جانے کے بعد میر کی شعر گوئی ترک ہو گئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ باب سخنوری و سخن رانی اس پر تیغا ہو چکا ہے اور یہ ٹھیک بھی تھا، کہنے کے لیے اب کچھ رہا نہ تھا۔ دل کی داستان کو کاغذ پر لانے کے لیے آدمی کا نہیں، شیر کا جگر درکار ہوتا ہے، اور بات پھر بھی ٹھیک سے کہی نہیں جاتی۔ رفتہ رفتہ خودکشی کے ارادے دھندلے پڑتے گئے اور اسی لحاظ سے اس کے خواب بھی دھندلاتے گئے۔ اسی زمانے میں، نورالسعادۃ کی سناونی سننے کے سوا ڈیڑھ سال بعد، اس نے پہلی بار شعر کہا:

نشاں اشک خونیں کے اڑتے چلے ہیں
خزاں ہو چلی ہے بہار گریباں

یہ شعر کہہ کر وہ اس قدر رویا کہ نورالسعادۃ کے جانے پر بھی اس قدر نہ رویا تھا۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ دُنیا اس پر حاوی آ گئی ہے۔ اب اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی نورالسعادۃ کی خدمت اور تیمارداری اس طرح نہ کر سکتا تھا جس طرح کی خدمت اور تیمارداری کا حق وہ اس پر رکھتی تھی۔

لبیبہ خانم بھی کچھ دن کے بعد بیٹی کے روضے پر نظر نہ آئی۔ شاید وہ تبریز چلی گئی، شاید نہیں گئی یا شاید گئی اور وہاں کچھ دن شوہر کے مزار پر راز و نیاز کے بعد کہیں اور جا رہی یا شاید وہ گئی مگر راستے ہی میں کہیں مر کھپ گئی۔ اصفہان اور ہرات میں وہ بہر حال پھر نہ دکھائی دی۔

آفتابِ زمیں

آفتابِ زمیں ہوں میں لیکن
مجھ سے روشن ہے آسمانِ سخن

مصحفی، دیوان نہم

آفتابِ زمیں

۱

حیات النسا بی بی عرف بھورا بیگم.... یہ ان مخدرہ کا نام تھا اور گھر کا پتا.... لیکن اسی میں تو مشکل تھی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دن کا تیسرا پہر ہونے کو آیا تھا اور وہ گھر نہ ملنا تھا نہ ملا۔ کہنے کو تو بالکل آسان سی راہ تھی، جھوائی ٹولے میں حکیم منن صاحب کے احاطے کے پچھواڑے سے ایک گلی پھوٹتی ہے، بتانے والوں نے مجھے بتایا تھا۔ گلی آگے چل کر بند ہو جاتی ہے کہ وہاں معتمد الدولہ بہادر آغا میر وزیر اعظم مملکت اودھ کے کسی دشمن کی حویلی تھی۔ جب وہ صاحب دربارِ شاہی میں معتوب ہوئے تو معتمد الدولہ بہادر کو موقع ہاتھ آیا۔ جس شخص نے مسجدیں اور بے گناہ غریب غربا کے مکانات گروانے میں کوئی تامل نہ کیا ہو، اس کے لیے بادشاہ کے معتوب بدنصیب کی حویلی گروانا کیا مشکل تھا۔ بہرحال، مجھے بتایا گیا تھا کہ اس منہدم حویلی کے کھنڈروں کے ذرا پہلے ایک تاریک سی گلی اور ہے۔ اس میں داخل ہو جائیں، وہ آپ کو تھوڑے خم و پیچ کی سیر کرائے گی، لیکن بالآخر گندہ نالہ نامی محلے کے پھاٹک پر لا کر چھوڑ دے گی۔ وہاں پہنچ کر پوچھ لیجیے گا کہ راجہ جھاؤلال کے داروغہ کے اخلاف کہاں رہتے ہیں۔ کچھ تو نالے کے اِدھر ہیں، اور کچھ نالے کے پرلی طرف۔

''انھیں کے گھروں میں سے ایک گھر میں وہ بی بی رہتی ہیں، شاید۔ شاید اس لیے کہا کہ استاد مصحفی کی اہل خانہ ایک ضرور تھیں جو استاد کے فردوسِ مکانی ہونے کے بعد یہاں سے نکلیں، لیکن خدا معاف کرے، آپ کو شاید خبر ہو، استاد مغفور کے مراسم اور آشنائیاں.... سو پتا نہیں کہ یہ وہی ہیں یا کوئی اور۔ امکان اور گمان دونوں کہتے ہیں کہ وہی ہوں گی۔ نام ان کا میں نے بتا ہی دیا ہے۔ اب جناب خود جا کر معلوم کر لیں۔''

مشکل یہ تھی کہ منہدم شدہ حویلی کے آس پاس کوئی گلی پھوٹتی نظر نہ آتی تھی۔ میں حکیم منّن صاحب کے احاطے کے دو تین چکّر لگا چکا تھا۔ کئی آنے جانے والوں سے پوچھا، لیکن کسی نے بھی حسبِ دل خواہ اطلاع بہم نہ پہنچائی۔ برسات کے دن، شدید حبس والی گرمی، راہوں کا تعفن اور کیچڑ اس پر مستزاد۔ میں تو ہلکان تھا ہی، میرے ساتھ جو مزدور تحفہ جات کا خوان اٹھائے چل رہا تھا، وہ بھی میری آوارہ گردی سے اب دل برداشتہ ہوتا نظر آتا تھا۔

کہنے کو تو میں بھی لکھنؤ کا تھا، لیکن محض برائے نام۔ صفر 1208ھ [ستمبر 1793ء، مرتب] میں جب میں اس شہر مینو سواد میں پیدا ہوا تو اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ہماری شومیٔ قسمت سے میرے والد ماجد لالہ کانجی مل صبا، جو عوام میں 'چاندی والے' کے نام سے مشہور تھے، اچانک لقمۂ اجل ہوئے۔ 'چاندی والے' وہ اس لیے کہلاتے تھے کہ چاندی کی خرید و فروخت ان کا پشتینی کاروبار تھا۔ میرے دادا جان مرحوم دہلی کے مشہور چھنّامل چاندی والوں کے چھوٹے بھائی تھے۔

بڑے بھائی سے کسی بات پر ناچاقی ہوئی تو انھوں نے سیدھے لکھنؤ کی راہ لی۔ یہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہزبر جنگ کا عہدِ سخاوت مہد تھا۔ دادا جان نے ایک ہی دو برس میں کاروبار کو اس قدر ترقی دی کہ دولت، عزت، شہرت، ہر بات میں وہ دلّی میں مقیم اپنے بڑے بھائی سے بڑھ گئے۔

نئی جگہ کی مشقت اور دہلی چھوڑنے کے تعب نے میرے دادا مرحوم کی زندگی کے کئی برس کم کر دیے۔ شعبان 1204ھ [اپریل 1790ء، مرتب] میں بعمر پچاس سال وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان کے بعد سارا مال و کاروبار میرے خلد مآب فرشتہ صفات باپ کانجی مل صبا کے ہاتھ لگا کہ وہ دادا جان مرحوم کے اکلوتے نورِ نظر اور ساری املاک و اموال کے وارث تھے۔ افسوس کہ کانجی مل صبا کو بھی اس دارِ فانی میں بہت دن قیام پذیر نہ ہونا تھا۔

لالہ کانجی مل صبا کے کچھ مرنے کے ایسے دن نہ تھے۔ لیکن اجل گرفتہ کے لیے ہزاروں بہانے ہیں۔ انھیں کئی مہینے سے ہلکا بخار رہتا تھا۔ کبھی کبھی کمر میں درد کی بھی شکایت کرتے۔ اطبا نے عمومی کمزوری کو ان

شکایتوں کا باعث قرار دے کر مقویات دینا شروع کیے، لیکن کچھ خاص افاقہ نہ ہوا۔ بیماری کے باوجود وہ روزمرہ، عام لوگوں کی زندگی گذارنے سے گریز نہ کرتے۔

ہولی کی تیسری شام تھی۔ والد صاحب مرحوم نہا دھو سج بن کر دوستوں سے ملنے کے لیے گھر سے نکلے۔ محبوب عراقی سمندر کو سواری کے لیے انتخاب فرمایا۔ خدمت گار، دستی بردار، ساتھ تھے۔ چند ہی قدم گئے ہوں گے کہ اچانک سامنے سے کسی کے یومِ پیدائش کا جلوس نکلا۔ میرے باپ کی جان جانا آج ہی کے دن کے لیے لکھا تھا۔ یکے می رود دیگر آید بجائے شاید ایسے ہی موقعے کے لیے کہا گیا تھا۔

سیر تفریح کرنے والوں اور تماش بینوں کے گروہ در گروہ، چہار جانب چرخ، بان، انار، ہوائی برج کا جوش۔ ہر چند کہ ایسے مواقع پر جنگی آتش بازی نہیں، گل کاری آتش بازیاں کام میں لاتے ہیں، لیکن اس دن اور اس وقت خدا جانے کس ظالم کو شیطنت سوجھی کہ ایک ہاتھی چنگھاڑ روشن کر کے اس نے میرے والد کے صبا رفتار کے بالکل قدموں ہی میں تو ڈال دیا۔ زور کا دھماکا ہوا۔ اصیل گھوڑا نازک مزاج، بے اختیار الف ہوا۔ والد مرحوم نے ران باگ بنائے رکھنے اور پٹری جمائے رکھنے کی ہزار کوشش کی لیکن فرس بے لگام ہو چکا تھا۔ مرحوم نے گھوڑے کے ساتھ ایک چکّر کھایا اور آن کی آن میں بیس قدم دور سر کے بل گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو بخار کے ساتھ کمر میں سخت درد تھا۔ کئی دن کے تصفح اور متعدد قاروروں کے معائنے کے بعد تشخیص یہ ہوئی کہ اصل مرض ریڑھ کی ہڈی کا تپ دق تھا، گھوڑے سے گرنے کی تکان نے اس میں شدت پیدا کر دی تھی۔ اب بستر پر بے حس و حرکت لیٹے رہنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

والد صاحب تین مہینے بستر سے لگے رہے، بہت رنج جسمانی اٹھا کر انھوں نے آخر کار جانِ شیریں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

میری والدہ کی آنکھوں میں دُنیا اندھیری ہو گئی۔ مجھ شیر خوار کو گود میں لے کر حویلی کی باؤلی میں چھلانگ لگانا چاہتی تھیں لیکن خاد ماؤں اور عزیزوں نے دوڑ کر مضبوطی سے ان کی کمر تھام لی۔ طبیب بلائے گئے، والدہ کو تیز سے تیز تر مسکنات دیے گئے، لیکن ہوش میں آنے پر ان کی ایک ہی رٹ تھی، میں اب نہ جیوں گی۔ میں ستی ہو جاؤں گی۔ وہ تو کہیے کہ میرے ماموں جان اور کچھ اور ننہالی داد یہاں لوگ بہت جلد پہنچ گئے۔ دہلی سے آنے والوں میں والد مرحوم کے ہم عمر ایک ماموں زاد بھائی لالہ اجے چند بھی تھے۔ والد مرحوم کے کوئی سگا بھائی تو تھا نہیں، وہ انھیں ماموں زاد بھائی کے ساتھ پلے بڑھے تھے، اور انھیں سگے بھائی سے بڑھ کر متصور

کرتے تھے۔ بلوغ کو پہنچنے پر لالہ اجے چند دہلی واپس چلے گئے، لیکن ان کے اور میرے والد کے درمیان مواخات یوں ہی قائم رہی۔ اب میرے نانہالی اعزہ نے سارا کاروبار لالہ اجے چند کو سونپ دیا اور خود میری والدہ کو اور مجھے اپنے ساتھ عظیم آباد لے گئے۔

اس وقت کی پریشاں حالی اور پراگندہ طبعی میں کچھ ٹھیک سے طے بھی نہ ہو سکا کہ میرے چاچا کب تک ہمارے کاروبار اور جائداد کے نگراں کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم رہیں گے۔ ہم لوگ افتاں وخیزاں عظیم آباد پہنچے، اور پھر مجھے اور میری والدہ کو بہت جلد عظیم آباد شہر کے شور غل سے بھری ہوئی مرطوب ہوا سے دور میرے نانا کے دیہی بنگلے میں منتقل کر دیا گیا۔

ہزاری باغ کے تاریک سرسبز جنگلات کے باہری سرے پر، ایک ننھے سے پہاڑی چشمے کے دامن میں بنے ہوئے اس مختصر لیکن خوش نما بنگلے میں پہنچ کر والدہ پھر وہیں کی ہو رہیں۔ انھوں نے پھر لکھنؤ، اور لکھنؤ ہی کیا، عظیم آباد کا بھی منھ نہ دیکھا۔ رجب 1240ھ [فروری 1825ء، مرتب] میں ان کی آنکھ بند ہوئی۔ اس ساری مدت میں لکھنؤ کے املاک وتجارت پر میرے چاچا اور ان کی اولادیں قابض رہیں۔ نہ انھوں نے کبھی پوچھا کہ تم کیسے ہو، اور نہ ہم نے کبھی سوچا کہ لکھنؤ واپس جائیں۔

میرے والد مرحوم کو اپنے استاد حضرت شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے بہت محبت تھی۔ دہلی سے تشریف لانے کے بعد حضرت شیخ نے ان کے یہاں چندے قیام بھی کیا تھا۔ لیکن فی مابین سلوک ورافت کے لیے قیام کی شرط نہ تھی۔ حضرت شیخ کی لکھنؤ تشریف آوری کے ہی وقت سے میرے والد کی طرف سے نیاز مندی اور خدمت گذاری، اور حضرت استاد کی طرف سے شفقت وتعلیم وتدریب کا سلسلہ جو شروع ہوا تو وہ میرے والد مبرور کے اللہ کو پیارے ہونے ہی پر مختتم ہوا۔

والدہ مرحومہ کے داغ مفارقت دینے کے کچھ بعد حضرت شیخ کی سناونی ہم تک پہنچی۔ ان کا وصال تو 1240ھ [1824ء، مرتب] کے شروع ہی میں ہو چکا تھا، لیکن اطلاع ہم لوگوں کو تاخیر سے ملی۔ ظاہر ہے کہ میں نے ان کا نام ہی نام سنا تھا۔ لیکن لکھنؤ کی بات چلتی تو میری والدہ حضرت شیخ کا ذکر اکثر درمیان لاتی تھیں اور قرائن سے ایسا لگتا تھا کہ وہ ان سے پردہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ ان کا درجہ وہی تھا جو حضرت استاد کی کسی چہیتی بہو کا ہوتا، لیکن حضرت شیخ کی شخصیت میں ایسی دلچسپی، ایسی جاذبیت تھی، اور ان کا سارا وجود ایسا سحر خیز تھا کہ اماں جی خواہی نخواہی ان کی بیٹی بن بیٹھی تھیں۔

اماں کے جانے کے بعد ننہال میں میرے لیے کوئی خاصی دلکشی نہ رہ گئی تھی۔ حضرت شیخ کی باتیں اماں کی زبانی سن سن کر مجھے بھی حضرت سے یک گونہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی موت کی خبر سن کر ایک دھکا سا لگا۔ رائے صاحب رام خاموش نے خوب تاریخ کہی تھی:

گفت صاحب رام تاریخ وفات
مصحف معنی ز دُنیا گشت گم

اتالیقوں کی توجہ اور ماموں صاحب کی سختی کی دولت سے میں نے فارسی، ریختہ، تھوڑی بہت عربی، ریاضی، سیاق، اور دیگر علومِ ضرور یہ سیکھ لیتے تھے۔ اساتذۂ فارسی میں میرزا بیدل، شیخ فیضی، آنند رام مخلص، نظیری، صائب، علی حزیں، خان آرزو وغیرہ کے کلام سے خوب واقف تھا اور اساتذۂ ریختہ میں سے اکثر ہم کا کلام اچھی طرح دیکھ بھال اور سوچ سمجھ کر پڑھا تھا۔ بالخصوص رائے سرب سکھ دیوانہ، خدائے سخن حضرت میر تقی، مالک الملک سخن میرزا سودا، حضرت خواجہ میر درد اور پھر حضرت شیخ مصحفی کے دواوینِ متعددہ سے اچھی مزاولت پیدا کر لی تھی۔ والد مرحوم کی اتباع میں اپنے نام درباری مل کے ساتھ 'وفا' تخلص بھی میں نے ٹانک لیا تھا۔ لیکن حق بات یہ تھی کہ میں نے اس وقت تک دو ہی چار قطعے اور ایک دو مخمس موزوں کیے ہوں گے، اور وہ بھی کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر۔ غزل یا رباعی کہنے کی ہمت نہ تھی، مثنوی اور قصیدہ کہنے کے لیے نہ مضمون تھے نہ ممدوح۔

حضرت شیخ کے ارتحال پر رائے صاحب رام خاموش کی تاریخ سن کر میرے دل میں عجب ہوک سی اٹھی۔ جی چاہا کہ میں بھی لکھنؤ جاؤں، حضرت استاد کے کسی نامور شاگرد، مثلاً جناب خواجہ آتش صاحب یا منشی مظفر علی صاحب اسیر کے رشتۂ تلمذ سے خود کو کمر بستہ کروں۔ ناقص ہی دُنیا سے اٹھوں، لیکن کسی کامل کی شاگردی کی کلاہ آفتاب جناب تو سر پر ہو۔ یوں تو حضرت شیخ کے شاگردوں میں حضرت میرزا امان علی خان ذبیح عظیم آبادی گویا ہمارے پڑوس ہی میں تھے، کہ ہزاری باغ سے عظیم آباد صرف چار دن کا سفر تھا، لیکن مجھے تو لکھنؤ کی کشش لیے جاتی تھی۔ حضرت استاد الشعرا خدائے سخن میر صاحب اعلی اللہ مقامہ کیا خوب فرماتے ہیں:

جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے
شہر ہے یا کوئی تماشا ہے

چشم بد دور ایسی بستی ہے
یہی مقصد ہے ملک ہستی ہے
لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے
کہ کسو دل کی لاگ ایدھر ہے

اسے سنجوگ ہی کہیے، یا خلطے کی خوبی، کہ لکھنؤ جانا، جو بہت مشکل اور مستبعد معلوم ہو رہا تھا، درحقیقت بہت آسان نکلا۔ میں نے اپنے چاچا کو لکھا کہ میں بغرضِ تعلیم لکھنؤ آنا چاہتا ہوں۔ جائداد اور دکان کے بارے میں ایک حرف نہ لکھا، اور سچ یہ ہے کہ مجھے ایک حبہ بھی واگذار ہونے کی امید نہ تھی۔ لیکن خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ میرے خط کا جواب آیا اور جلد آیا۔ چاچا نے لکھا کہ جب چاہو آ جاؤ، ہم تمھارے منتظر ہیں۔ کہو تو زادِراہ بھیج دیں۔ اپنی طویل خاموشی پر ان کی طرف سے کوئی اعتذار تو نہ تھا، لیکن میری ہلکی سی شکوہ سنجی بے شک تھی کہ میری اماں نے سسرال والوں کو، اور میں نے اپنے دادیہال کو بالکل ہی فراموش کر دیا تھا۔

''خیر یہ سب باتیں تو ہو رہیں گی،'' انھوں نے لکھا،''اب تم بس آ ہی جاؤ، کھانا وہاں کھاؤ تو پانی یہاں پیو۔ سب کی آنکھیں تمھاری معاودت پر لگی ہیں۔''

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ میں نے سازِ سفر مہیا کیا، کچھ سامان، کچھ تحفے تحائف بہلی پر بار کیے۔ دو نوکر ساتھ لیے، انھیں بہلی پر رکھا اور خود کے لیے دو عمدہ گھوڑے منتخب کیے۔ مجھے عورتوں سے کوئی خاص طوع نہ تھا۔ اپنی عمر کے مردوں میں رہنا اور مردانہ مشاغل، مثلاً شکار بازی، بنوٹ، بندوق اور طمنچے کی مشق، تھوڑا بہت علم رمل، یہ میرے ان دنوں کے شوق تھے۔ شادی میں نے کی نہ تھی، لہٰذا کثم قبیلے کا کوئی جھگڑا اٹنا نہ تھا۔ اپنے ہی علم کے زور پر نقشہ کھینچا اور مبارک و مسعود گھڑی متعین کر کے ماموں صاحب اور ہزاری باغ کو سلام کر کے نکل چلا۔ ہزاری باغ سے عظیم آباد کا سفر تین ہی دن میں پورا کیا۔ پھر ایک دن وہاں ٹھہر کر لکھنؤ کے لیے ہرچہ باداباد کہہ کر روانہ ہوا۔

مہندرو گھاٹ پر گنگا جی کی وہ شان تھی کہ بس۔ چمکتی چمکیلی لہروں کا وفور، گھاٹ کی وسعت، پاٹ کی سر چکرا دینے والی چوڑائی، کشتیوں، چھوٹے بڑے بجروں، نواڑوں کا ہجوم، روٗسا کی مور پنکھیوں اور پنسوئیوں کی جھکا جھک کرتی چہل پہل، بار برداری خلاصیوں کا شور، اونٹوں کا اڑنا اڑانا، گھوڑوں کی ہنہناہٹ، گدھوں کا

ریکنا، بچوں کی چیخ پکار، ناؤوں پر چھڑائی جاتی بیل گاڑیوں، بہلیوں اور رتھوں کی چرخ چوں، بعض بڑی کشتیوں سے صبح کے ناشتے کی تیاری کا دھواں اب تک اٹھتا ہوا، کہیں برہمن دیوتا لوگ سورج دیوتا اور گنگا میا کی عبادت کے سنسکاروں میں محو، ایک پوری دُنیا تھی جس سے میں اب تک بے خبر رہا تھا۔ جی میں لہر سی آئی کہ میں بھی کشتی سے کیوں نہ سفر کروں۔ لیکن پوچھنے پر معلوم ہوا کہ بنارس پہنچ کر پھر خشکی ہی کی راہ پکڑنی ہو گی۔ لہٰذا یہیں سے زمینی قافلوں کے ساتھ لگے رہنا بہتر ہے۔

۲

جمعے کا مبارک دن تھا اور 21 ذی قعدہ 1240ھ [مطابق 7 جولائی 1825ء، مرتب] کی تاریخ، جب ہم رشک خلخ ونوشاد، ثانی دولت گاہ بہشت سواد شاہ جہان آباد، شہر لکھنؤ پایۂ تخت مصر رنگ و بو میں وارد ہوئے۔ اللہ اللہ کیا شہر اور کیا سوادِ شہر، سب ہلکے گلابی رنگ میں رنگے ہوئے سے لگتے تھے۔ رفعت الدولہ، رفیع الملک، شاہ زمن غازی الدین حیدر خان بہادر بادشاہ غازی کی جہانبانی اور انتظامِ دولت و کامرانی کے دن تھے۔ سارے جہان کے لوگ اور چاردانگ عالم کی خلقت اس ایک شہر میں یکجا و یک رنگ تھی۔ میں نے عالمِ شیر خوارگی میں لکھنؤ چھوڑا تھا اور آج جب ادھر کو مراجع ہوا ہوں تو اٹھائیس تیس سال کا جوان تھا، اگرچہ ذرا ناکردہ کار و ناجہاں دیدہ تھا۔ لکھنؤ کی رونق دیکھ کر دیدے پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔ یقین ہے کہ میں اگر جہاں دیدہ ہوتا تو بھی اسی حال میں ہوتا اور اسی حال کو پہنچتا۔

ایسا نہیں کہ غریب غربا لکھنؤ میں نہ تھے۔ بے شک تھے، اور بعض راہوں میں، جہاں سے میں گذرا، بہت تھے اور اسے اتفاق کہیے یا یہ کہ شہر لکھنؤ کو منظور تھا کہ مجھے یہاں پہنچتے ہی میرے والد کا خلد آشیانی ہونا یاد دلایا جائے۔ ہم لوگ جس قافلے کے ساتھ تھے وہ چھپرہ، بلیا، غازی پور، بنارس، گوپی گنج، الہ آباد، سورام، سلون، اور اناؤ ہوتا ہوا شہر کی جنوبی مغربی سرحد پر نکلا تھا۔ یہاں پہنچ کر قافلے کا بڑا حصہ تو چارباغ ہو کر دلکشا کی طرف نکل گیا، اور ہم عیش باغ کے قبرستان کا چکر کاٹ کر اکبری دروازے کی طرف چلے۔

ہم تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ برات کا شور سنائی پڑا۔ معلوم ہوا نواب مستطاب گورنر جنرل بہادر

کے دربار میں وکیل شاہی نواب محمد خلیل الدین خان کے بھتیجے کی برات ہے۔ ہاتھیوں اور اونٹوں کی وہ کثرت تھی کہ الاماں۔ ہم تو ایک گھنے درخت کے نیچے دبک کر محفوظ رہے لیکن آرائش لوٹنے والوں کی وہ گت دیکھی کہ خدا یاد آ گیا۔ نوعمر لڑکیاں میلے چیکٹ دوپٹے اوڑھے، پاجامے لیر لیر، اکثروں کے بدن کُرتے یا شلوکے سے بے نیاز، بالوں کی جگہ بئے کی بھوری جھونجھ سی بنائے۔ ادھر سے لونڈے لفنگے، بھیک منگے جن کا حال ان لڑکیوں سے بھی بدتر۔ چہروں سے وحشت ٹپکتی ہوئی، بالوں کا رنگ شدتِ غبار آلودگی سے سیاہ کے بجائے گندہ ماشی۔ بعضوں کے بر میں صرف ایک سیاہ یا سیاہی مائل گزی کی لنگوٹ، ایک آدھ اس سے بھی بے نیاز۔ سب کے بدن سے پسینے اور میل اور چیکٹ تیل کا تعفن پھوٹتا ہو۔ انھیں ہاتھیوں کے پاؤں تلے آنے کا خوف تھا نہ اونٹوں کے چوڑے کھائی جیسے جبڑوں کے درمیان سر دینے کا۔ دو چار تو ہمارے سامنے زخمی ہوئے۔ ایک کا کاسۂ سر گھوڑے کی ٹاپ سے چور چور ہوا اور پھر جب روپیہ اشرفی پھلواری لوٹنے والے کامیاب ہو کر برات کے محاذ سے باہر نکلے تو شرابی لچوں نے اکثر کمزور عورتوں اور ضعیفوں کو چاقو دکھا کر، یا محض ڈپٹ کر ان کی ساری لوٹ خود ہتھیا لی۔ کسی نے مقاومت کی تو اسے دو ٹھوکریں اوپر سے رسید کیں۔ یقین ہے کہ گھر پہنچتے پہنچتے، اگر ان کا گھر کوئی تھا، تین چار بوڑھے عورت مرد تو یقیناً جاں بحق تسلیم ہو چکے ہوں۔

کہتے ہیں اس زمانے میں لکھنؤ جیسا متمول شہر ساری دولتِ ہند میں بلادِ بنگالہ سے لے کر تا سواحل کرناٹک کوئی نہ تھا۔ پھر میں برات کی سج دھج کیا لکھوں۔ خیموں اور شامیانوں کا ایک محلہ تھا جو پہیوں، رتھوں، اونٹوں، اور پالی برداروں کے سہارے تختِ سلیمانی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ برات کے ساتھ خدم و حشم بھی بے شمار تھا۔ مجھے اکبری دروازے سے ذرا ادھر ہی ایک گلی سے ہو کر خیالی گنج اپنے آبائی مکان تک پہنچنے میں کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ شام اچھی طرح بھیگ چکی تھی لیکن سب لوگ وہاں میرے منتظر تھے۔ چچا چچی نے پوری آؤ بھگت کے ساتھ مجھے اتارا۔ رہنے کے لیے پرانی حویلی کے کمرے جو میرے باپ کے وقتوں سے بند پڑے تھے، پہلے ہی سے کھلوا دیے گئے تھے۔ ہر آسائش موجود تھی، لیکن چاچا کے اصرار پر وہ رات میں نے انھیں کی حویلی میں گذاری۔

صبح ہوتے ہی چچا نے میرے باپ کی دکان کی کنجیاں، زمینات کے قبالے اور حساب کتاب کے کواغذ میرے حوالے کیے اور فرمایا:

''لو میاں، یہ سب آج سے پھر تمھارا ہے۔ بھائی مرحوم کی جاداد اور دکان سے جو نفع ہوا اس کا پائی پائی کا

حساب موجود ہے۔'' وہ ذرا چپ رہے، لیکن مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ تھی۔ ''یہ ضرور ہے کہ وہ سارا نفع ہم نے اپنے اوپر صَرف کیا۔ اب تم اسے ہماری تنگ داشت کا معاوضہ سمجھو، یا قرض کے طور....''

اب مجھے قطعِ کلام کے سوا چارہ نہ تھا۔ ''چاچا جی، میں اسے معاوضہ سمجھوں گا نہ قرض۔ جس کا حق تھا وہ متصرف ہوا۔ آپ میری امانت مجھے واپس دے رہے ہیں۔ مجھے اور کیا درکار ہو سکتا تھا؟''

۳

کسلِ راہ کو دفع کرنے، لکھنؤ میں قدم جمانے اور دکان کے معاملات سمجھ لینے کے بعد مجھے حضرت شیخ کے اعقاب کی تلاش ہوئی۔ میرے چاچا کے گھرانے سے کوئی شاعر نہ تھا، اور نہ کسی کو شعر و سخن سے کوئی لگاؤ ہی تھا۔ وہ حضرت شیخ کے نام سے تو واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ اب وہ اس دُنیا میں نہیں ہیں، لیکن اس سے زیادہ انھیں کچھ نہ معلوم تھا۔ حُسنِ اتفاق سے میری دکان میں ایک نائب منشی سالار بخش عرف سلارو میاں نکل آئے جنھیں شیخ صاحب مرحوم کے مسکن اور مدفن کا علم تھا۔ سلارو میاں نے بتایا کہ شیخ مصحفی مرحوم نے کوئی جسمانی یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کی آخری قیام گاہ منصور نگر کے پاس کلیتا گنج کے ایک ذاتی مکان میں تھی۔ [اب نہ وہ محلہ باقی ہے نہ وہ مکان، مرتب] منصور نگر کے پاس ہی درگاہ حضرت عباس کے پچھواڑے ایک قبرستان ہے، وہاں انھیں دفن کیا گیا۔ مکان میں اب کون رہتا ہے، یہ انھیں خبر نہ تھی۔

سلارو میاں کی رہنمائی میں مجھے کلیتا گنج پہنچنے اور استاد مغفور کا مکان ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ذرا نیچی کرسی کا، لیکن پختہ مکان تھا۔ صدر دروازہ بالکل سرِ راہ کھلتا تھا، کوئی احاطہ یا پھاٹک نہ تھا، اور نہ کوئی ڈیوڑھی یا سہ دری جہاں بیٹھ کر آنے جانے والے شیخ صاحب کے برآمد ہونے کا انتظار کر سکتے تھے۔ دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی لیکن مجموعی طور پر ماحول کچھ اجڑا اجڑا لگتا تھا۔ میں نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی، خیال تھا کہ استاد مرحوم کی بیوہ یہیں رہتی ہوں گی تو کوئی ماما، دائی وغیرہ بھی ساتھ ہو گی۔

کئی بار کی دستک اور کنڈی کھٹکھٹانے کے بعد میں مایوس ہو چلا تھا کہ اندر سے کچھ پھنسی پھنسی ہانپتی سی آواز آئی، گویا بولنے والا دمے کا مریض ہو۔ ''آتے ہیں، آتے ہیں۔ کاہے کو دنگا مچاتے ہو صاحب۔''

پھر دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، گویا بہت کم کھلتا ہو۔ ایک دبلے پتلے عمر رسیدہ بزرگ برآمد ہوئے۔ چگی ڈاڑھی، چوندھیائی ہوئی سی آنکھ، بدن میں ملگجا موٹے کپڑے کا کُرتا، اسی طرح کے کپڑے کا ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے، انگرکھے صدری سے بے نیاز۔ ان کی آواز میں بھی دروازے کی سی چڑچڑاہٹ تھی۔

''فرمایئے، کون صاحب ہیں؟''

''استاد مصحفی کا دولت کدہ یہی ہے؟''

''تھا تو سہی، لیکن اب یہاں ہم رہتے ہیں،'' وہ کھیسیں نکال کر گنواروں کی سی عجب شانِ تفاخر سے بولے۔ ''استاد کے دن لد گئے۔''

''اور.... آپ؟'' میں نے ذرا اٹک اٹک کر پوچھا۔

''میں ان کے چھوٹے بھائی غلام صمدانی مرحوم کے برادرِ نسبتی کا بھانجا ہوں۔ اوائلِ عمری سے لکھنؤ میں رہتا آیا ہوں۔ استاد کا تنہا وارث میں ہی ہوں۔''

''اور ان کی اہلِ خانہ محترمہ استانی بیگم....؟''

''اہلِ خانہ، کون اہلِ خانہ؟'' وہ بھِر کر بولے۔ ''کون ہیں آپ اس مالزادی کو اہلِ خانہ بتانے والے؟ نہ نکاح نہ رخصتی نہ ملنکے کا پتا نہ باپ ماں کی خبر۔'' وہ کھانسنے لگے، لیکن جوشِ بیان میں کمی نہ آئی تھی۔

''میں نے اسے چلتا کر دیا، سنتے ہو میاں صاحب زادے؟ اور اب تم کون ہو اس کا پتا نشان ڈھونڈنے والے؟ کیا وہ تمھاری کوئی لگتی ہے؟''

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کو کیسے آگے بڑھاؤں۔ یہ تو طے تھا کہ ان حضرت نے صرف اس چھوٹے سے مکان کی خاطر بے چاری بیوہ کو زبردستی بے دخل کر دیا اور دھونس یہ رکھی کہ وہ نہ نکاحی تھی نہ متاعی، اس کا کوئی حق ہی نہ تھا۔ لیکن وہ گئیں تو گئیں کہاں؟ یہاں ان کا پوچھنے والا والی وارث بھلا کون ہوگا۔ چگی ڈاڑھی والے صاحب تو کہہ رہے تھے کہ ان کے باپ ماں کا پتا نہیں۔ خدا معلوم یہ صحیح ہے یا جھوٹ۔ شاید بچارے مر ہی کھپ گئے ہوں۔ آج کل مرتے کسے دیر لگتی ہے۔

''لیکن آپ نے انھیں کہاں بھیج دیا؟'' میں نے ہمت کر کے پوچھا۔

''بھیج دیا؟ میں کیوں بھیجتا؟ چلی گئی ہوگی چوک کے کسی کوٹھے پر۔ ہم شرفا کو ان باتوں کی کچھ خبر نہیں۔'' یہ کہتے کہتے انھوں نے دروازہ جھٹکے سے بند کر لیا۔ میرے جی میں تو آئی کہ دروازہ دوبارہ اس زور سے

بھڑ بھڑاؤں کہ ایک پٹ ٹوٹ ہی تو جائے اور ان ذات شریف کی گردن میں ہاتھ دے کر ایک پٹخنی بتاؤں، لیکن ایک اور بزرگ جو سرِ راہے یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے، آگے آئے اور بولے:

''میاں صاحب، کیا حضرت شیخ کی بی بی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟''

''جی، مگر یہ ولد الابلیس پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتا۔'' میں نے بھنا کر کہا، لیکن یہ نکتہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رہا تھا کہ ان صاحب نے 'بی بی' کہا تھا، 'بیوہ' یا 'بیگم' نہیں۔

''وہ کیا بتائے گا، ذات سے مجہول، نسب سے معدوم۔ خود کو شیخ صاحب کا سبھی رشتہ دار بتاتا ہے۔ یہ سب ہتھ کنڈے اس ذرا سے مکان کو ہتھیانے کے تھے۔ کوتوال کے گرگوں کو چاندی کے چند سکے دے کر اپنا اُلو سیدھا کر لیا۔ غریب بی بی روتی ہوئی گھر سے نکلی۔''

''تو اب وہ بھلا کہاں ملیں گی؟'' میں نے تقریباً مایوس ہو کر پوچھا۔ اس کے جواب میں ان بزرگ نے گندے نالے اور راجہ جھاؤلال کے اخلاف کے گھروں کا وہی پتا بتایا جس کی تلاش میں اب مجھے کئی پہر ہو چکے تھے۔

اس دن تو نہیں، لیکن دو تین بعد کے دن میں نے دوبارہ لکھنؤ کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کی ٹھانی۔ اس دن سلارو میاں ساتھ نہ تھے۔ شہر میں آشوبِ چشم کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور سلارو میاں بھی دیدے پٹم کر اپنی کوٹھری میں پڑ گئے تھے۔ میں نے ایک مزدور کے سر پر تحفہ جات کا خوان دھروا لیا تھا۔ خیال تھا کہ اس سے راہ باٹ ڈھونڈنے میں بھی مدد ملے گی۔ لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ بلبلا نکلا۔ اسے مچھی بھون، شیش محل، خیالی گنج، امام باڑہ حسین آباد، رستوگی محلے وغیرہ سے زیادہ کی کچھ خبر نہ تھی۔

بالآخر راستہ مل ہی گیا، اور اپنے آپ ہی ملا۔ ہوا یوں کہ کچھ تو بتانے والے کی بھول تھی، اور کچھ میرا سہو۔ اصل صورت یہ تھی کہ حکیم منن صاحب کے احاطے کے پچھواڑے نہیں، بلکہ ان کے مکان اور اگلی حویلی کے بیچ میں ایک پتلی سی گلی تھی، اتنی پتلی کہ اس میں دھوپ بھی شاید ہی کبھی پہنچ پاتی ہو۔ اس گلی کے پرلی طرف ایک اور احاطہ تھا، اور اس احاطے کے پچھواڑے وہ نالہ بہتا تھا جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ مطلوبہ گلی کے دہانے پر کسی نے دیر سے ایک چھکڑا کچھ یوں کھڑا کر دیا تھا کہ گلی پر نظر جاتی نہ تھی۔ جب وہ چھکڑا ہٹا تو گلی بھی نظر آئی اور باقی سارا راستہ بھی آئینہ ہو گیا۔

چھوٹا سا گھر تھا، کچھ کچا کچھ پکا۔ نالے کے اوپر ایک کمزور سی محرابی پلیا، پلیا کے سرے پر تین سیڑھیاں

جو اسے گھر کی تنگ ڈیوڑھی سے ملاتی تھیں۔ نالے کا پرلا کنارہ ذرا اونچائی پر تھا، اور خود وہ گھر نالے کے دوسرے کنارے سے کوئی چار پانچ ہاتھ اوپر ایک چھوٹے سے ٹیلے پر اٹکا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ نالے کی بدبو، کوڑے کے ڈھیر، جن پر بھینسوں، سوروں، اور کتوں کے مسکن۔ مجھے حضرت استاد کے محب صادق الوداد میر حسن مرحوم کے شعر یاد آئے:

زبس یہ شہر ہے بہر پہ بستا
کہیں اونچا کہیں نیچا ہے رستہ
کسی کا آسماں پر گھر ہوا میں
کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
ہر اک کوچہ یہاں کا تنگ تر ہے
ہوا کا بھی بمشکل واں گذر ہے

پلیا کی اینٹوں کو لونی لگ چکی تھی، اور اس گھر کی کرسی بھی لونی اور کائی سے بدرنگ ہو رہی تھی۔ مجھے پلیا کو پار کرنے میں تکلف ہو رہا تھا کہ کہیں ڈھہ ہی نہ جائے۔ لیکن پھر میں نے دل میں کہا یہ کیا احمقانہ بیان ہے۔ روز و شب یہ پلیا استعمال میں ہے، اسے گرنا ہوتا تو اب تک گر چکی ہوتی اور سچ پوچھیے تو اس علاقے میں بیشتر مسکن ایسے ہی تھے، اور مجھے بہر حال اس ڈیوڑھی پر پہنچ کر دروازے پر دستک دینی تھی۔

مزدور کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے میں نے ذرا لپک جھپک پلیا اور سیڑھیاں طے کیں اور ڈیوڑھی کے دروازے پر صحیح و سالم اترا۔ دروازہ بند تو شاید نہ تھا لیکن اس پر ٹاٹ کا بھاری پردہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے حضرت شیخ کا شعر یاد آیا:

پڑتی نہیں ہے اس پہ ترے نور کی چمک
اے ماہ رو نہ پردۂ در اپنا ٹاٹ کر

میں نے بڑھ کر دروازے پر دستک دی تو معاً ایک دس بارہ سال کا لونڈا اغرقی اور صدری پہنے ہوئے، پاؤں جوتیوں سے بے نیاز، باہر آیا۔

''جی، فرمایئے۔'' اس کی آواز میں ہمارے مشرقی اطراف کے لہجے کی مٹھاس تھی۔

میں دبدھا میں تھا کہ غلط دروازے پر تو نہیں آ گیا، لیکن اب آ گیا تھا تو عرضِ مدعا کرنا ہی تھا۔ ''وہ.... مجھے.... استانی جی صاحب تشریف رکھتی ہیں؟'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''جی کون؟ استاد شیخ مصحفی صاحب کی گھر میں سے ملنے کو تشریف لائے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ مجھے اطمینان ہوا کہ صحیح گھر پر دستک دی ہے، اور یہ بھی کہ میری طرح شاید اور بھی نیازمندوں کی آمد و رفت یہاں تھی، لہٰذا میرا اس طرح اچانک آ جانا شاید کچھ بہت معیوب نہ تھا۔

''اگر انھیں زحمت نہ ہو تو ذرا سلام کرنا چاہتا ہوں،'' میں نے کہا۔ ''اور کوئی خاص کام نہیں ہے۔''

''کیا کہہ دوں، جناب کہاں سے تشریف لائے؟''

''بیٹا، بس یہ کہہ دو کہ لالہ کانجی مل صبا مرحوم کا بیٹا دریاری مل وفا علاقۂ بہار سے سلام کو حاضر ہوا ہے۔''

''بہت مناسب'' کہہ کر وہ لڑکا جھپٹ کر اندر گیا، پھر فوراً ہی باہر نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ سی چٹائی اور دوسرے میں کچھ اتنا ہی سال خوردہ مونڈھا تھا۔ چٹائی بچھا کر اس نے مونڈھا اس کے سامنے رکھا، مجھے بیٹھنے کا اشارہ کر کے وہ پھر اندر گیا۔ اس بار باہر آیا تو وہ ایک چھوٹی سی تپائی لیے ہوئے تھا۔ تپائی میرے سامنے رکھ کر وہ پھر اندر گیا۔ اس بار وہ ہمارے لیے پانی لایا تھا، تانبے کے بڑے سے گلاس میں میرے لیے، اور مٹی کی چھوٹی سی گڑوی میں میرے مزدور کے لیے۔ اس کی ساری حرکات و سکنات اس قدر سدھی ہوئی تھیں کہ ان میں کسی چھوٹے سے چشمے کی لہروں جیسی روانی تھی۔

''بھئی بہت خوب،'' میں نے کہا۔ ''تم تو اپنے کاموں میں مشاق ہو۔ کیا نام ہے تمھارا، کہاں کے ہو؟''

''میرا نام محمد راجا ہے جناب،'' اس نے جواب دیا، ''میں کنتت ضلع مرزا پور کا ہوں۔'' مجھے یاد آیا کہ کنتت میں مسلمان شرفا اور اصفیا کی بڑی بستی ہے۔ جلال الدین ابوالمنصور خان شجاع الدولہ بہادر اسد جنگ کے مفتی اعظم علامہ محمد ابراہیم بناری جو خان علامہ کے استادوں میں تھے، اصلاً کنتت کے تھے۔ میں ابھی محمد راجا سے کچھ اور پوچھتا لیکن جس کام سے آیا تھا اسے سرانجام دینا ابھی باقی ہی تھا۔ میں نے اپنے مزدور کو اشارہ کیا تو اس نے بڑھ کر اپنے سر سے خوان اتارا اور محمد راجا کو تھما دیا۔ خوان میں سرپوش کے تلے ایک بھاگل پوری ریشمی تھان، ایک تھیلی میں لکھنوی بادشاہی ٹکسال کے ایک سو ایک روپے، اور ایک ٹوکری میں شیخ کولی کے یہاں کی مٹھائی تھی۔ بھاگل پوری تھان میں عظیم آباد سے حضرت شیخ کے گھر پر نذر کے لیے بطورِ خاص لایا تھا۔

اندر سے اب حقہ تازہ ہونے کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ نہایت لطیف خمیرے کی خوشبوؤں کی لپٹ سے میری طبیعت معطر ہونے لگی تھی۔ محمد راجا نے بدقت خوان کو سنبھال کر اندر کی راہ لی، پھر لحظہ بھر بعد حقہ اٹھائے ہوئے باہر آیا۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی آہٹ سی ہوئی۔ میں نے نگاہیں اپنی جوتیوں پر مضبوطی سے جمائے رکھیں کہ غضِ بصر ملحوظ تھا۔ ہلکی سی کھانسی کے بعد پردے کے پیچھے سے آواز آئی:

''میاں صاحب زادے، آپ نے تشریف آوری کی زحمت کی، یہی بہت تھا۔ اس پر اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو آپ کی تقدیم کا کچھ بھی بندوبست نہ کر سکوں ہوں۔ مجھے ناحق شرمندہ کیا آپ نے۔ کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں، شیخ صاحب ہی آپ کا حق ادا کر سکتے تھے۔''

آواز ہلکی سی گلوگیر تھی، جیسے بعض بہت نازک مزاج لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، کہ صوتِ بلند میں کلام نہیں کر سکتے، تقریباً سرگوشی کے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں، یا شاید اس وقت حضرت شیخ کی یاد میں رنج کا غلبہ ہو گیا ہو۔ بولی میں پورب کا لوچ لہریں لے رہا تھا۔ اس باعث صاحبِ صوت کی عمر کا بھی اندازہ نہ ہوتا تھا۔ بوڑھوں کی سی آواز تو ہرگز نہ تھی۔

میں ذرا سنبھل کر بولا، ''قبلہ استانی صاحب، شرمندہ تو میں ہوں کہ آپ پر اتنی بپتا پڑی اور میں یہاں نہ تھا کہ آپ کے کسی کام ہی آتا۔ بس چند ہی دن ہوئے اطرافِ عظیم آباد سے حاضر ہوا ہوں۔''

''افسوس کہ آپ کے والد میرے زمانے کے پہلے تھے۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا، لیکن شیخ صاحب کبھی کبھی ان کا ذکر کرتے تھے۔ اس بات کو انھوں نے اکثر کہا کہ وہ ایک مدت تک آپ کے والد کے یہاں قیام پذیر رہے تھے۔'' انھوں نے اپنی بپتا کی بات بیچ سے اڑا دی۔ بظاہر وہ کسی اجنبی کے سامنے اپنی ذلت کا حال زیرِ بحث لانا پسند نہ کرتے تھیں۔ مجھے حفظِ نفس کی یہ ادا اچھی لگی۔ میں نے بھی انھیں کی بات کا انداز اختیار کیا:

''جی ہاں، ان کے انتقال پُرملال کے وقت میں بھی بہت چھوٹا تھا۔ بیوہ ہوتے ہی میری والدہ مجھے لے کر مائکے چلی گئی تھیں۔ ابھی چند مہینے ہوئے وہ بھی جنت کو سدھاریں۔''

''انا للہ و انا الیہ راجعون۔ رہے نام اللہ کا۔'' انھوں نے اسی سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ''تو صاحب زادے اب آپ بالکل تنہا رہ گئے، افسوس۔''

''جی اس قدر تنہا بھی نہیں۔ یہاں واپس آ کر میں نے آبائی کاروبار سنبھال لیا ہے۔ ارادہ ہے کہ یہیں

رہوں گا، خواجہ آتش سے مشورۂ سخن کروں گا اور آپ کی اجازت ہوگی تو کبھی کبھی سلام کو حاضر ہو جایا کروں گا۔''

''میاں صاحب آپ جگ جگ جئیں۔ ضرور قدم رنجہ فرماتے رہیں۔ بندی پر کرم ہوگا۔''

''اماں جی مرحومہ کو حضرت شیخ اپنی بہو کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ غالباً ان سے پردہ بھی نہ فرماتی تھیں۔ مجھے حضرت شیخ کے حالات سننے کا بہت شوق ہے۔ اگر آپ کرم ارزانی فرمائیں۔''

''لال میاں، آپ تو میرے بیٹے کی طرح ٹھہرے۔ جب جی چاہے تشریف لائیں، شیخ صاحب کے ذکر اذکار سے میرا بھی جی بہلے گا۔''

''بہتر ہے، اب میں اجازت چاہتا ہوں،'' میں اٹھتا ہوا بولا۔ ''چندے پھر قدم بوسی کو حاضر ہوں گا۔''

''لال میاں صاحب....'' لہجے میں ہلکی سی ہچکچاہٹ، کچھ شرمندگی سی جھلک رہی تھی۔ ''ایک عرض سنتے جایئے۔''

میں ذرا متوحش ہوا کہ اب تک تو یہ اتنے اعتماد سے حرف زن رہی تھیں، پھر اچانک یہ عدم تیقن کیوں؟ میں مونڈھا چھوڑ چکا تھا، وہیں رک کر بولا، ''ارشاد۔''

''آپ یہ اتنا قیمتی ریشمی تھان جو لائے ہیں، میں بیوہ عورت، یہ میرے کس کام کا؟ اور اس کے جوڑے بنواؤں بھی تو کہاں پہنوں....'' وہ پھر ٹھہر گئیں۔

''اب رکھ ہی لیجیے، میں اسے واپس تو لے نہ جاؤں گا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''جی میں کچھ اور کہہ رہی تھی.... اگر آپ برا نہ مانیں تو میں اسے.... اسے فروخت کر دوں....''

مجھے اطمینان سا محسوس ہوا کہ اور کوئی بات نہ تھی۔ ''جناب عالیہ، آپ کا مال ہے۔ جس طرح چاہیں تصرف میں لائیں۔''

۴

شہر میں سہالگیں چل رہی تھیں۔ غربا کے گھروں میں چاندی کے زیوروں اور امرا کے یہاں چاندی کے ظروف کی خریداریوں کا بازار گرم تھا۔ مجھے حضرت شیخ کے یہاں جانے کی فرصت کوئی ایک ماہ بعد ہی مل سکی۔

شرمندگی مٹانے کے لیے اس بار بھی کچھ تحائف ساتھ لیتا گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر پہلی بات یہ دکھائی دی کہ گھر پہلے کی بہ نسبت کچھ صاف ستھرا لگ رہا تھا، سفیدی بھی تازہ تازہ ہوئی تھی۔ محمد راجا نے مجھے دیکھ کر تین فرشی سلام کیے، تحفہ جات لے جا کر اندر گیا اور فوراً ہی باہر آکر بولا، ''بی بی صاحب آپ کو اندر بلوا رہی ہیں۔''

میں گڑبڑا گیا۔ اندر بلوا رہی ہیں؟ اچانک یہ بے تکلفی کیسی؟ مرتا کیا نہ کرتا، پردہ ہٹا کر محمد راجا کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا۔

بہت چھوٹی سی انگنائی، اس کے ایک طرف جائے ضرور، ایک طرف باورچی خانہ۔ انگنائی سے متصل دوسرے سرے پر بہت تنگ سا دالان۔ اس میں ایک پلنگڑی بچھی ہوئی جس پر معمولی فرخ آبادی چادر کا پلنگ پوش۔ اس کے سامنے نماز کی چوکی کے برابر ایک تخت جس پر ہلکا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ دالان کے بعد صرف ایک تنگ سا کمرہ۔ یہی کچھ اس گھر کی بساط تھی۔ کمرے کا دروازہ بند، دالان میں کوئی نہ تھا۔ میں تھوڑے سے تذبذب کے بعد تخت پر بیٹھ گیا، اس طرح، کہ میری پشت کمرے کے دروازے کی طرف تھی۔

محمد راجا حقہ تازہ کرنے میں لگا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ میں اضطراراً اٹھ کھڑا ہوا، مڑ کر دیکھا تو بھورا بیگم سامنے تھیں۔ میں نے جھک کر آداب کیا۔

''جیتے رہیں لال میاں۔ اچھے تو رہے؟ بہت دن بعد یاد کیا۔'' ان کی آواز اب بھی پہلے جیسی ذرا گلوگرفتہ پھنسی پھنسی ہوئی سی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ نگاہ کہاں رکھوں، آنکھ اٹھائے بغیر بات کرنا بھی نامناسب تھا۔ انھوں نے شاید میری مشکل سمجھ لی۔ خود آکر پلنگ پر بیٹھ گئیں، مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہوئی بولیں:

''میاں وفا صاحب، آپ کے جانے کے بعد میں بہت دیر تک شیخ صاحب کے اس زمانے کو سوچتی رہی جب میں نہ تھی۔ آپ نے کہا تھا نہ کہ آپ کی والدہ کا ان سے پردہ نہ تھا اور آپ نے مجھ پر اتنا احسان کیا کہ میرا اپنا بیٹا بھی اس سے زیادہ کیا کرتا.....''

ان کی آنکھیں کچھ چھلکنے لگی تھیں اور بات بھی تھوڑی بہت میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ انھیں کچھ سسکی سی آئی جسے روک کر وہ بولیں، ''میں بوڑھی بیوہ عورت، آپ کے باپ میرے وارث کے خاص لوگ تھے۔ آپ میرے بچے کی طرح ہیں۔ اب آپ سے پردہ کیا کروں۔''

انھوں نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کیں۔ مجھے سر اٹھانے کی ذرا ہمت ہوئی تو میں نے انھیں بھرپور دیکھا۔

ان کا سن یہی کوئی پینتالیس چھیالیس کا رہا ہوگا۔ بوٹا سا قد، گداز بدن، بہت گورا رنگ، گول چہرہ، چہرے کے نقوش نازک اور چہرہ جھریوں سے عاری۔ پتلے پتلے ہونٹوں پر پان کا لاکھا جما ہوا، ناک ذرا دبی ہوئی سی، جیسی بعض نوعمر لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ سر پر دوپٹہ، لیکن خاصی بھاری چوٹی پیٹھ پر لٹکتی ہوئی۔ بالوں کا رنگ کبھی بھورا سنہرا رہا ہوگا، اب کہیں کہیں سے ملگجا ہونے لگا تھا۔ بہت بڑی بڑی سبزی مائل بھوری آنکھیں۔ اب سمجھ میں آیا کہ انھیں بھورا بیگم کیوں کہتے تھے۔ چہرہ کسی خاص تاثر سے معرا، لیکن آنکھیں گویا بولتی ہوئی سی تھیں۔ دوسری بار نظر اٹھائی تو لگا کہ بائیں آنکھ کی پتلی اپنی جگہ سے تل برابر ہٹی ہوئی ہے، لیکن آنکھوں میں سخن گوئی کی شان اتنی ہے کہ یہ عیب بھی بھلا لگتا ہے۔ مجھے حضرت شیخ کی غزل یاد آئی، کیا پتا انھیں کے لیے کہی ہو:

ہیں تری سحر سامری آنکھیں
نہ کریں کیوں کہ کافری آنکھیں
زہر کھاتے ہیں ان پہ کیا کیا لوگ
ہیں جو کیری سی بس ہری آنکھیں
مصحفی کتنی زیب دیتی ہیں
گورے چہرے پہ سانوری آنکھیں

میں تو انھیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ موٹی سفید ململ کا ڈھائی گز ا دوپٹہ اوڑھے، ملاگیری رنگ کی محمودی کا تنگ پاجامہ اور اسی کپڑے کا لمبا ڈھیلا کُرتا پہنے۔ ناک کان سب زیور سے عاری، صرف دونوں سڈول کلائیوں میں سونے کی ایک ایک ہلکی چوڑی۔ اگر ان کے چہرے پر شرافت کی شان نہ ہوتی تو میں انھیں کسی رئیس زادی کی خادمہ سمجھتا۔

میرے دل میں ہزاروں سوال گونج رہے تھے۔ یہ بیگم میرے دادا استاد کی منکوحہ تھیں کہ متوعہ؟ حضرت شیخ تو شاید سنت جماعت تھے۔ تو کیا یہ بی بی اثنا عشری تھیں؟ اگر منکوحہ تھیں تو انھیں اسی چگی ڈاڑھی

والے نے اتنی آسانی سے بے دخل کیسے کر دیا؟ اور یہ مکان انھیں کہاں سے ملا؟ حضرت شیخ کے پاس یہ کتنا عرصہ رہیں؟ کہاں کی ہیں؟ بولی سے تو میرے نانہالی اطراف کی معلوم ہوتی ہیں۔کوئی خانگی یا ویشیا تو ہرگز نہیں لگتیں۔ یاالٰہی معاملہ کیا ہے۔

میرے چہرے پر آتے جاتے رنگوں کو انھوں نے شاید ٹھیک پڑھ لیا۔محمد راجا سے دوبارہ حقہ تازہ کرنے اور شربت پان حاضر کرنے کو کہہ کر وہ بولیں:

''آپ کے باپ کو میں نے نہیں دیکھا،لیکن شیخ صاحب کے تذکرے میں ان کا ذکر پڑھا ہے۔ان کے انتقال کے وقت میں شیخ صاحب کو جانتی بھی نہ تھی۔''

میرے والد مرحوم کا ذکر کچھ اسی نہج سے وہ پہلے بھی کر چکی تھیں۔اس وقت وہی بات چھیڑنے سے ان کی منشا غالباً یہ تھی کہ میں اسی تعلق سے سخن آغاز کروں۔

''آپ کا اور حضرت دادا استاد کا ساتھ تو بہت طویل رہا ہوگا؟''میں نے سوچ سوچ کر یہ لفظ ادا کیے۔

''ہاں''انھوں نے مختصراً کہا،پھر چپ ہوگئیں۔شاید وہ چاہتی تھیں کہ وہ خود سے کوئی بات نہ کہیں،میں کرید کرید کر معلوم کروں۔

''تو آپ کا ان سے نکاح،یا....یا،ت....تعلق....؟''مجھے لفظ''متعہ'' کا تلفظ کرتے خود شرم سی آ رہی تھی۔خدا جانے یہ سنّی ہیں کہ شیعہ ہیں۔سنّی ہوں گی تو برا مان سکتی ہیں۔

ان کے چہرے پر زردسی مسکراہٹ آئی۔''لال میاں،آپ تو کلیتا گنج والے مکان پر جا چکے ہیں۔''

ان کا مطلب شاید یہ تھا کہ وہاں سب کچھ سن ہی چکے ہوں گے،پھر لحاظ کیسا۔''جی،گیا تو تھا لیکن....''

''اچھا تو سنیے''ان کے لہجے میں اچانک ذرا قوت آگئی تھی۔''میں شیخ صاحب کے ساتھ کوئی چھبیس ستائیس برس رہی۔شیخ صاحب خود سنّی تھے،لیکن نام کے۔وہ شیعوں میں شیعہ،سنیوں میں سنّی،حتیٰ کہ لامذہبوں میں لامذہب تھے۔''وہ پھر چپ ہوگئیں۔میری سمجھ میں نہ آیا کہ اب کون سی بات پوچھوں کہ سلسلۂ کلام کو دوبارہ قائم کرنے میں معاون ہو۔پھر انھوں نے دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کیا اور بولیں:

''اچھا،شیخ صاحب کے عقائد کے بارے میں پھر کبھی بتاؤں گی۔لیکن میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتی کہ شیعہ ہوں یا سنی۔یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمان بھی ہوں کہ نہیں۔''میں نے کچھ کہنا چاہا،لیکن میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔بھورا بیگم نے محسوس بھی نہ کیا کہ میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔اب ان کی گفتگو میں روانی کچھ زیادہ تھی:

''میں سوا ڈیڑھ سال کی تھی جب میری ماں نے مجھے جنت آرامگاہ مرزا منگلی مرحوم کی حویلی پر بیچ دیا۔ سنہ و سال مجھے یاد نہیں، لیکن اس زمانے میں وہ بنارس ہی میں تھے، نواب وزیر بننے میں دیر تھی۔ بعد میں کسی نے مجھے بتایا کہ ہم لوگ غازی پور کے ہیں۔ وہاں صاحب بہادر لوگوں نے نیل کی کاشت بڑے پیانے پر شروع کی تو غلہ مہنگا ہوتے ہوتے قحط کی نوبت آگئی۔ بہت سی ماؤں نے اپنے بچے بیچ دیے کہ بچے کی جگہ اپنا پیٹ پال لیں اور بچے کو بھی ایک وقت پانی ملا دودھ میسر ہو جائے۔''

''ارے، ہائے افسوس، اللہ رحم کرے،'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔ لیکن بھورا بیگم نے سنا بھی نہیں۔

''جنت آرام گاہ کی بیگم نے میرا نام حیات النسا بی بی رکھا۔'' ان کے چہرے پر عجب دردناک سی ہنسی کی رمق آئی۔

''قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ قحط میں فاقہ زدہ ماں کی بھوکی مرتی شیر خوار بچی اور نام حیات النسا۔'' وہ ایک لحظہ چپ رہیں۔ ''لیکن میرے بھورے بالوں اور آنکھوں کے رنگ کی بنا پر مرزا بیگم نے مجھے بھورا بیگم کہنا شروع کر دیا۔ پھر یہی نام چل نکلا۔''

''تو آپ کی تربیت اور تعلیم اثنا عشری طرز پر نواب وزیر مرحوم کی حویلی میں ہوئی؟'' میں نے کچھ کہنے کی خاطر کہا۔

''ہاں، ایک طرح سے یہ درست ہے۔ لیکن میں جب پانچ سال کی ہوئی تو مرزا منگلی نے مجھے اپنے محافظ دستۂ ذات کے کپتان فتح علی خان اور ان کی بیگم کے سپرد کر دیا۔ وہ میاں بیوی لاولد تھے۔ ان لوگوں نے بھی میری پرورش شیعہ طرز پر کی۔ تعلیم دلوائی، مرثیہ خوانی، نوحہ خوانی کے نکات بتائے، نشست و برخاست کے آداب سکھائے۔ عام رواج کے برخلاف مجھے فارسی اور تھوڑا بہت سیاق بھی سکھایا گیا۔ میں وہاں رہی تو کپتان بیگم کی خادمہ کے طور پر، لیکن مجھے آسائشیں سب گھر کی سی حاصل تھیں۔''

''تو آپ حضرت شیخ کے نکاح میں اس وقت آئیں جب نواب سعادت علی خاں یہاں مسندِ وزارت پر متمکن ہوئے؟''

انھوں نے کچھ روہانسا منھ بنایا، دیر تک چپ رہیں۔ پھر اور بھی دھیمی آواز میں بولیں:

''نہیں، ایسا نہیں ہوا۔'' وہ کچھ کھوسی گئیں، پھر انھوں نے بظاہر غیر متعلق بات کہی۔ ''مرزا منگلی کو بادشاہ

دہلی نے کیا کیا خطابات دیے تھے۔ اشرف الوزرا، اعظم الامرا، یمین الدولہ، مبارز جنگ۔ لیکن ان کی حکومت کا علاقہ آصف الدولہ عدن مقام کی اقالیم سے بس آدھا تھا۔''

''جی ہاں، انگریز بہادر نے وزیر علی خاں سے مسند لے کر انھیں عطا کی اور قیمت پوری وصول کی۔'' میں نے تلخ لہجے میں حضرت شیخ کا شعر پڑھا:

مالک الملک نصاریٰ ہوئے کلکتہ لے
یہ تو نکلی عجب اک وضع کے جنجال کی کھال

''خیر، تو مرزا منگلی کی وزارت میں کپتان فتح علی خاں کو بڑا عروج ہوا، ظفر الدولہ خطاب ملا، افواج ریاست کے کمیدانِ اعظم مقرر ہوئے۔ میں نے بھی اچھے ہاتھ پاؤں نکالے تھے۔ شیخ صاحب کے روابط کپتان صاحب سے تھے، آنا جانا بھی تھا، لیکن میں نے انھیں کبھی دیکھا نہ سنا تھا۔''

''تو کیا انھوں نے آپ کے لیے رقعہ بھیجا؟'' میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر دوبارہ کچھ کرب، کچھ کبیدگی کے آثار ہویدا ہوئے۔ ذرا ٹھہر کر وہ بولیں:

''میں بڑی ہو چکی تھی لیکن مجھے عورت مرد کے معاملات کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ کپتان بیگم کا ایک بھتیجا تھا، شفیع بیگ اس کا نام تھا۔ تھا تو بالکل نکھٹو لیکن بہت بنا ٹھنا رہتا۔ وہ جب بھی ہمارے گھر آتا، مجھے چھیڑتا۔ کبھی کولھے پر بکٹا بھر لیا، کبھی دوپٹہ کھینچ لیا، کبھی گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس کے ڈر سے بھاگی بھاگی پھرتی۔ کبھی کبھی وہ رات کا کھانا دیر میں کھا کر ہمارے یہاں ہی سونے کو ٹھہر جاتا۔ ایسی راتیں تو مجھے عاشورے کی رات ہو جاتیں۔ میں ادبدا کر کپتان بیگم کے پلنگ کے نیچے اپنا بستر لگا لیتی۔ وہ ہزار بگڑتیں کہ مردار مجھے اس طرح نیند نہ آئے گی۔ لیکن میں اور کیا کرتی۔ شفیع بیگ کی شکایت کرتی تو اپنی ہی ناک چوٹی خطرے میں پڑ جاتی۔''

میں نے بڑی ہمت کر کے پوچھا، ''تو کیا بالآخر.... آپ کو اس سے کوئی لگاؤ پیدا ہو گیا، یا....؟''

''توبہ ہے۔ مجھے اس کی شکل سے نفرت تھی۔ موا خواجہ سراؤں کی طرح سجا بنا رہتا تھا۔''

''تو پھر.... دادا استاد....؟'' میں نے سوالیہ لہجے میں، لیکن ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔

''وہی تو بتا رہی ہوں،'' انھوں نے کچھ اس طرح کہا گویا بات بتانے والی نہ ہو لیکن وہ بتانا چاہتی بھی

ہوں۔ ''ایک دن کپتان بیگم نے کہا کہ دروازے کے ملازم خدا جانے کہاں مر گئے تھے۔ بھورا، تو ذرا استاد مصحفی کو دیوان خانے میں یہ خاصدان تو پہنچا آئیو، اور دیکھ وہاں رکنا ہرگز نہیں۔''

میرے بدن میں ہلکی سی تھرتھری پیدا ہوئی۔ مجھے ایسا لگا جو کچھ ان پر ہوا، یا ہونے والا تھا، وہ مجھ پر بھی گذر رہا تھا۔

''وہ 1214ھ [مطابق 1799ء، مرتب] کا سال تھا، سردیوں کا موسم۔ رمضان شریف شروع ہونے والے تھے۔ چند دن پہلے ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں کی سالگرہ کے موقعے پر مجھے اورنگ آبادی ہمرو کا جامہ بنوا دیا گیا تھا۔ جامہ پہننے کا زندگی میں یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اس ہمرو کی ریشمی نرمی، طاؤس جیسے رنگ، مجھے اب تک یاد ہے۔ میں خود سے زیادہ اپنے جامے کو دیکھتی رہتی تھی۔ کپتان بیگم کا حکم سن، خاصدان ہاتھ میں لے، جھٹ دہلیز پار کر، دیوان خانے کا پردہ اٹھا جھپاک سے اندر پہنچ ہی تو گئی۔

''سارے وقت میری نگاہ اپنے جامے پر تھی۔ اب جو اندر آئی ہوں تو شیخ صاحب کو وہاں بیٹھا ہوا دیکھا، گھبراہٹ اور شرم سے میری سانس پھولنے لگی۔ اوئی اللہ یہاں تو کوئی ہے، بے ساختہ میرے منھ سے نکلا۔

''اس وقت ان کا حلیہ کیا بیان کروں۔ عجب سحر طراز شخصیت تھی ان کی۔ کپتان صاحب کے یہاں ایک سے ایک لوگ آتے جاتے تھے، ان میں مندراجے اور بیسواڑے کے راجپوت، فرخ آباد کے لمبے تڑنگے کانکج برہمن، کابل کے خان، کبھی کبھی ایران کے آغا لوگ بھی ملنے آ جاتے۔ سبھی کو چھپ چھپا جھانک تاک کر ہم لوگ دیکھ بھی لیتے تھے۔ لیکن شیخ صاحب جیسا جامہ زیب، متناسب ہاتھ پاؤں والا مرد کبھی نہ دیکھا تھا۔ گورا رنگ، لمبا قد، چوڑی کلائیاں، بھرے بھرے ڈنڈ۔ عمر ان کی پچاس سے کم کیا رہی ہوگی، لیکن سر پر پٹے دار بال اور ترشی ہوئی ڈاڑھی بالکل سیاہ، بالوں میں عجب طرح کی چمک۔ ہلکی گول چکن کی ٹوپی اندازِ بے پروائی سے سر پر دھری ہوئی، دو چار بالوں کی لٹیں کلاہ سے نیچے اتر کر ماتھے اور کانوں پر پریشان۔ ایک ہاتھ میں حقہ کی نے، دوسرے ہاتھ میں قلم، کسی موٹی سی کتاب میں کچھ لکھ رہے تھے۔ حقہ ٹھنڈا ہو چکا تھا لیکن انھیں خبر نہ تھی۔

''میری آواز سن کر انھوں نے آنکھیں اٹھائیں۔ میں منھ پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی لیکن پاؤں قالین کی سلوٹ میں الجھ گیا۔ وہ مجھے بھرپور دیکھ رہے تھے۔ ستواں ناک، متبسم آنکھیں۔ اللہ کیا آنکھیں تھیں، بڑی

گہری سیاہ آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں کیا بھلا عورتوں کی ہوں گی۔ میں جلدی سے سلام کر کے الٹے پاؤں واپس آ گئی۔''

''حضرت شیخ اس وقت پچاس سے ایک ہی آدھ ماہ کم کے رہے ہوں گے،'' میں نے لقمہ دیا۔''ان کی بیوی، میرا مطلب ہے منکوحہ بیوی، شاید جوانی ہی میں مر گئی تھیں۔''

''نہیں، معاملہ کچھ زیادہ پیچیدہ تھا۔لیکن مجھے ان باتوں کی کیا خبر ہوتی، اور مجھے ان سے مطلب ہی کیا تھا۔'' وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ ان کے دل میں اس زمانے کی یادیں شاید عام سے زیادہ ملگجی تھیں اور ان میں انبساط اور محزونی دونوں کے رنگ مل جل کر یکجان ہو گئے تھے۔

''کچھ دن بعد میں نے سنا کہ شیخ صاحب نے مجھے متوعہ بنا کر گھر لے جانے کے لیے نواب ظفر الدولہ سے بات کی ہے۔ مجھے متعہ اور نکاح کا شرعی فرق کچھ نہ معلوم تھا، نہ ہی کوئی مجھ سے پوچھنے آیا کہ تو کیا چاہتی ہے۔ میرے ساتھ کی بعض خواصیں بہت کچھ کھائی کھیلی تھیں، انھوں نے کبھی میری تعلیم قولاً اور عملاً مکمل کرنی چاہی تو میں انھیں جھڑک دیتی اور جہاں تک متعہ نکاح کا معاملہ تھا تو ہم میں سے اکثر بس یوں ہی گھر میں ڈال لی جاتی تھیں۔ نکاحی تو بڑی چیز ہے، متاعی بھی خوش نصیب شمار ہوتی تھی۔''

''آپ کے والدین پھر کبھی آپ کو دیکھنے یا آپ کو لینے واپس نہ آئے؟'' میں نے سر جھکائے ہوئے پوچھا۔ نہ معلوم کیوں اس وقت ان کو روبرو دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔

''والدین....'' انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔''والدین تھے ہی نہیں۔ کپتان صاحب کے کسی نوکر نے بعد میں مجھے بتایا کہ میرے باپ نے میری ماں کو چھوڑ کر راپٹ گنج [رابرٹس گنج، ضلع مرزا پور، مرتب] کے کسی بن مانس [قبائلی، مرتب] عورت کو گھر میں ڈال لیا تھا اور وہ ادھر ہی کہیں مر کھپ بھی گیا۔ میری ماں کسی اور کے گھر پڑ رہی۔

''پھر پتا نہیں اس پر کیا بیتی۔'' ان کی آواز بالکل پست ہو گئی تھی۔''مجھے تو اس کی صورت بھی تھوڑے ہی دن بعد بھول گئی۔''

''تو آپ کو پتا نہ لگا کہ اصلاً آپ کس مذہب و ملت کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اصل نقل میں نہیں جانتی۔ انسان کی پرورش جس ملت والوں میں ہو وہی اس کی بھی ملت ہے۔'' ان کے لہجے میں ذرا تیزی تھی۔''شیخ صاحب کہا کرتے تھے یہ سب دُنیا میں جینے اور آدم کی اولاد سے باہم نباہ

کرنے کے لیے ڈھکوسلے ہیں۔''

''طالبِ عفو ہوں۔ میں نے بس یوں ہی پوچھ دیا تھا،'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''نہیں، کوئی بات نہیں،'' انھوں نے بظاہر دلجمعی سے کہا، لیکن ان کی آواز میں کچھ لرزش تھی۔ ''سچ تو یہ ہے کہ میری اصل ذات پات مجھ سے چھپائی گئی۔ شاید اس لیے کہ میرے والدین کسی نیچی ذات کے تھے۔ ممکن ہے مسلمان بھی نہ رہے ہوں۔''

انھوں نے محمد راجا سے پانی منگا کر ٹھہر ٹھہر کر، گھونٹ گھونٹ پیا، گویا گلے میں کچھ اٹک گیا ہو۔ تنفس برابر نہ تھا۔ میں گھبرا گیا کہ کہیں غش نہ کھا جائیں۔ میں اٹھا تھا کہ کسی طبیب یا عطار کے یہاں سے دوا کا انتظام کروں کہ وہ اچانک خود ہی اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں:

''اچھا لال میاں، آج میری طبیعت کچھ خراب سی ہو رہی ہے۔ اب تم جاؤ۔ جیتی رہوں گی تو میر تقی صاحب کی طرح میں بھی یہ قصہ موبمو کہوں گی۔'' وہ کمرے میں چلی گئیں۔ محمد راجے نے مجھے ملامت بھری آنکھ سے دیکھا، اور میں خود پر نفرین کرتا ہوا گھر لوٹا۔ بھلا مجھے ان کے والدین اور مذہب و مشرب کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟

۵

کچھ شرمندگی اور کچھ تشویش کی بنا پر مجھے واپس جانے کی جلدی تھی۔ میں ان کی امداد بھی کرنا چاہتا تھا کہ عسرت ان کے کلھیا بھر مسکن کے چپے چپے سے تراوش کرتی تھی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ مجھے دادا استاد کی باتیں جاننے، ان کے طور طریقے سمجھنے کی چینک تھی۔ ان کا کلام مجھے لکھنؤ کے چوک اور بنارس کے دساسمیدھ گھاٹ سے بھی بڑھ کر دلچسپ اور چہل پہل سے بھرپور معلوم ہوتا تھا اور انھیں جگہوں کی طرح دادا استاد کا کلام بھی غیر متوقع احوال اور وقوعہ جات، خم و پیچ اور تاب و تب سے عبارت تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ خود وہ شخص کیسا ہوگا جس نے ایسا کلام لکھا ہے۔

میں نے آج تک کسی استاد شاعر کو دیکھا نہ تھا، اسے بخوبی جاننا تو دور کی بات تھی۔ دادا استاد کا کلام

میرے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا اور بھورا بیگم کے ذریعے مجھے حضرت شیخ کی ذات وصفات کو جاننے کا جو موقع مجھے مل رہا تھا اسے گنوانا بڑی بے عقلی ہوتی۔ لیکن 'کارِ دُنیا کسے تمام نہ کرد' کے باوجود کارِ دُنیا کو ہر شخص مکمل کر کے ہی اٹھنا چاہے۔ میں بھی دکان کی دُنیا میں اتنا الجھا کہ کوئی مہینے سوا مہینے کے بعد ہی ادھر کا رخ کر سکا۔

اس بار جو میں پہنچا تو بھورا بیگم کو جوڑی میں مبتلا پایا۔ باری کی تپ تھی، ہر تیسرے دن چڑھتی تھی اور اس قدر ہلہلا کر چڑھتی تھی کہ جان کے لالے سے پڑ جاتے تھے۔ ایک بار آتی تو کم سے کم دو دن رہتی۔ سولہ سترہ دن سے یہی لیل ونہار تھے۔

بارشیں جا چکی تھیں اور لکھنؤ کا حابس، بخاراتی موسم شروع ہو چکا تھا۔ جدھر دیکھیے گھروں پر تپ لرزہ کی یلغار تھی۔ بھورا بیگم کا گھر تو نالے پر تھا، وہاں سے اٹھنے والے مرطوب بخارات اس پر مستزاد۔ سارے شہر میں مفلس مریضوں کے لیے کوئی شاہی شفاخانہ نہ تھا۔ ایک دو انگریز اپنے طور پر معالجہ کرتے تھے لیکن شہر کے لوگ، کیا مرفہ الحال کیا مفلوک الحال، وہاں کم جاتے تھے کہ مذہب، یا ذات، یا جان جانے کا خطرہ تھا۔ باقی رہے عام اطبا اور بید، تو وہ با قاعدۂ قدیمہ کے پابند تھے، مریض کے گھر نہ جاتے تھے۔ مطب جا کر نبض دکھانا ضروری تھا۔ بھورا بیگم اکیلی کہیں جانے کے لائق تو تھیں نہیں، محمد راجے کی بیمارداری اور حکیم منن صاحب کو حال کہلا کر عطار کے یہاں سے دوا بنوا لانے پر علاج کا انحصار تھا۔

اس دن ان کی تپ کی باری تھی۔ تقریباً بے سدھ پڑی تھیں، گورا رنگ شدتِ تپ سے کلونس گیا تھا۔ باربار پانی مانگتی تھیں، لیکن شاید حکیم نے پانی کم پلانے کو کہا تھا۔ کمزوری کے باعث اٹھنا بیٹھنا دوبھر تھا۔ پلنگ کے پائنتی پیشاب کے لیے چینی رکھی ہوئی تھی اور اس کی کھراند سارے کمرے میں تھی۔ میں نے علاج کے لیے کچھ رقم ان کے سرہانے رکھ دی، محمد راجا کو بیمار داری کے طریقے سمجھائے اور یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ ضرورت پڑنے پر مجھے فوراً اور بے تکلف بلوا لینا۔ محلے کے ایک لونڈے کے ہاتھ پر میں نے ایک روپیہ رکھا اور خوب سمجھا دیا کہ بھورا بیگم اگر مجھے بلوائیں تو کہاں اور کس طرح مجھے خبر کرنی ہے۔

بہت آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہوئیں۔ ہماری باہم سخن رانی کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ بیماری کی نقاہت کی وجہ سے اول اول تو دیر تک بات نہ ہو سکتی، لیکن جوں جوں مجھ سے ان کی مانوسی بڑھتی گئی، ان کی جھجک بھی گھٹتی گئی اور وہ اپنے اور حضرت شیخ کے حالات زیادہ مکمل کر بیان کرنے لگیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ ان کے بیان میں قصہ

کہانی کا سارا ربط نہ تھا۔ جس وقت جدھر چاہتیں گفتگو کا رخ موڑ دیتیں۔ مثلاً انھوں نے پہلا سلسلۂ کلام اس موقعے پر منقطع کیا تھا جب وہ حضرت شیخ کے یہاں متوعہ کی حیثیت سے جانے والی تھیں۔ لیکن وہاں پہنچنے کے فوراً بعد کی باتیں انھوں نے بہت بعد میں بتائیں۔ میں اب ان کی بکھری ہوئی حرف و حکایت اپنے طور پر تالیف کر کے پیش کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ تو کم و بیش سارے ان کے اپنے ہیں، لیکن ان کا ہم سخن، یعنی میں، اس میں موجود نہیں ہوں۔

٦

رمضان شریف شروع ہو چکے تھے جب میں شیخ صاحب کی متوعہ ہو کر آئی، اسی گھر میں جہاں سے ایک عمر کے بعد مجھے نکالے جانے کے بڑے فضیحتے ہوئے۔ کپتان بیگم صاحب نے چار جوڑے میرے ساتھ کر دیے تھے، اور چاندی، کندن کے وہ ہلکے پھلکے زیور جو مجھے وقتاً فوقتاً انعام میں ملتے رہے تھے۔ میرے جانے پر کوئی رویا نہ کسی نے کلیجے سے لگا کر رخصت کیا۔ بس چپ چاپ، نہ ہنستی نہ روتی، ڈولی پر سوار ہو گئی۔

مجھے معاملاتِ بدن کا کچھ پتا نہ تھا۔ اتنا ضرور مجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ عورت کے بدن کو برتنے کے لحاظ سے نکاح اور متعہ دونوں ایک ہیں۔ شیخ صاحب نے کپتان صاحب کی حویلی ہی میں متعہ کا صیغہ پڑھ دیا تھا، اس لیے میرا ان سے پردہ نہ رہا تھا۔ ڈولی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انھوں نے ایک آدھ بار مجھ سے بات کرنی چاہی، لیکن مجھے شرم، اور شرم سے زیادہ الجھن تھی کہ اب میرا کیا ہوگا۔

میں روزے سے تھی۔ یوں تو عموماً شیعہ گھرانوں میں روزہ نماز کا ذکر اذکار کم ہوتا تھا، لیکن نصیر آباد والے سرکار [مولوی سید دلدار علی غفران مآب، 1752ء تا 1819ء، مرتب] کا دور دورہ جب ہوا تو اکثر وضیع و شریف لوگوں نے ان کی ہدایت پر مجلس و ماتم کے ساتھ فرائض کی طرف بھی توجہ کی۔ کپتان صاحب کے یہاں بھی ان باتوں کا اہتمام ہونے لگا۔ ان کی وجہ سے ہم لوگ بھی روزے رکھتے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ شیخ صاحب کو جب معلوم ہوا کہ میں روزے سے ہوں تو ان کے چہرے سے کچھ ناگواری، کچھ مایوسی ظاہر ہوئی۔ شاید انھوں نے کچھ اور منصوبے بنا رکھے تھے۔ پھر بھی، انھوں نے مجھے گود میں اٹھا کر پلنگ پر لا بٹھایا،

کہاروں کی چھٹی کر دی اور دست درازیاں آغاز کر دیں۔ میں انھیں بار بار پرے ہٹاتی اور وہ بار بار کچھ ظریفانہ، کچھ چھیڑ چھاڑ کے فقرے کہتے اور دوبارہ کوشش کرتے۔ ایک بار انھوں نے ذرا جھنجھلا کر کچھ بلند آواز میں کہا:

''افوہ بھئی بھورا بیگم، کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا۔''

میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہنسوں یا خفا ہوں۔ اچھے تو وہ مجھے بھی بہت لگتے تھے، لیکن روزے کا کفارہ کون بھرتا اور روزہ توڑنے کا گناہ کون مول لیتا۔ دفعتاً وہ ہنس کر بولے، ''لو بھئی یہ تو مصرع ہی ہو گیا:

کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

اچھا لیجیے میں آپ کی خدمت میں کچھ گہر پارے حاضر کرتا ہوں، بس ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' وہ میری طرف پیٹھ کر کے پلنگ پر بیٹھ گئے اور کچھ گنگنانے لگے۔

ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ جائے ضرور کے پاس چھوٹا سا آبدار خانہ تھا۔ میں نے چپ چپاتے اٹھ کر وضو کیا۔ جانماز کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔ جہاں تک نگاہوں نے تلاش کیا، سارے گھر میں جانماز کیا، تیسوں کلام بھی نہ تھے۔ میں نے انکل سے قبلہ معلوم کیا، اور زمین پر ہی، جہاں چٹائی بچھی ہوئی تھی، نماز شروع کر دی۔

جیسے تیسے میں نے سلام پھیرا ہی تھا کہ شیخ صاحب نے پیچھے سے آ کر میرے رخسار میں ہلکی سی چٹکی لی، پھر اچانک میرا منھ اپنی طرف پھیر کر بوسہ لے ہی تو لیا۔ ''توبہ ہے!'' باآوازِ بلند میرے منھ سے نکلا، ''میرا روزہ خراب کر دیا۔'' لیکن شیخ صاحب نے سنی اَن سنی کر دی۔ ''لیجیے، ملاحظہ فرمائیے''، انھوں نے کہا۔ میں دوپٹے سے اپنا منھ اور ہونٹ رگڑ رہی تھی اور ان کی طرف سے منھ پھیرے ہوئے تھی کہ انھوں نے عجب دلفریب، لہراتی ہوئی سی آواز میں پڑھنا شروع کیا:

کیا میں فرض کہ آیا ہے سر پہ ماہِ صیام
جہاں میں پھیری ہے اس نے صلائے عصمت عام
ہماری چاہ کا دیکھیں تو ہووے کیا انجام
ولے کرے ہے یہی عرض بندگی میں غلام

اسیر رنج کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

میں اپنے شوق کو دوں طول اب کہاں تک جان
غرض یہی ہے مری مصحفی کا کہنا مان
ترا تو اب بھی ہے قابو سمجھ نہ ہو نادان
گلے میں ڈال دے بانہیں کہ نکلے ٹک ارمان
اسیر رنج کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

مجھے اس وقت شعر و شاعری کی مطلق سمجھ نہ تھی لیکن اتنا تو میں بھی دیکھ سن رہی تھی کہ شیخ صاحب بات بات میں بے عیب شعر کہہ دیتے ہیں۔ بہت دن مجھے میر تقی صاحب کا یہ مصرع سننے کو ملا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ تو شیخ صاحب پر صادق آتا ہے:

صد رنگ مری طبع ہے میں موج رواں ہوں

اس دن انھوں نے اس نظم (مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اسے مسدس ترجیع بند کہتے ہیں) کے درجنوں بند دو تین گھڑی میں کہہ ڈالے، لیکن سب مجھے سنائے نہیں۔ مجھے بعد میں اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ اس ترجیع بند میں میرے علاوہ اور بھی کسی کی طرف اشارے تھے۔ لیکن اس وقت تک مجھے پتا چل گیا تھا کہ شیخ صاحب گذشتہ حسینوں کو فراموش کبھی نہ کرتے تھے، اور زندگی کے ہر موقعے پر حسینوں کا جمگھٹ ان کے لیے مہیا رہتا تھا۔ اس باب میں وہ کچھ مجبور سے تھے۔ جو عورت انھیں دو چار بار دیکھ سن لیتی، ان کی گرویدہ ہو کر رہ جاتی تھی۔ ان کی حُسن پرستی کے چلتے کچھ برس میں نے بڑی ذہنی اذیت میں گذارے، پھر دل پر پتھر رکھ لیا۔

بات کچھ آگے نکل گئی۔ میں دن بھر شیخ صاحب کے شعر سنتی رہی، ان کے فقروں پر دل ہی دل میں مسکراتی رہی۔ ان کی آتش شوق کی گرمی سے میرا بھی بدن تمتمانے لگا تھا۔ میں نے اسی رات انھیں کامیاب اور شاد و نہال ہوتے دیا۔

ان دنوں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، پھر بھی میں نے بہت جلد اٹھ کر مارے باندھے آب دار خانے کے یخ پانی سے غسل کیا۔ سحر گہی کا انتظام کر رہی تھی کہ شیخ صاحب نے اچانک آکر میری پیشانی چوم لی اور یہ بند پڑھے:

حال پر اس کے ہوئی تھی لطف کی تیری نظر
ورنہ بخت ایسے کہاں رکھتا تھا یہ خستہ جگر
ایک گستاخ لگا کرنے وہ جب ہو کر نڈر
اور لگا رخ پر ترے آنے خجالت کا اثر
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

جب کہ پھرتا تھا بدن پر ترے پیارے اس کا ہات
تھرتھراتی تھی پڑی جوں موجِ دریا تیری گات
خوش نصیبی کی کہوں اس کی و لے کیا تجھ سے بات
یک دیگر کی کشمکش ہی میں جو آتی آدھی رات
رات تجھ کو مصحفی جی سے دعائیں دے گیا
سر سے لے پاؤں تلک تیری بلائیں لے گیا

اف وہ اس رات کی ٹھنڈک، وہ سرد پانی سے میرا غسل، اور اس پر یہ اشعار۔ شرم کے مارے مجھے کپکپی چھوٹ گئی۔ ''بس چپ رہیے''، کہہ کر میں نے اپنا بدن چرانا چاہا کہ لرزش کچھ کم ہو۔ شیخ صاحب نے اپنا دوشالہ لاکر میرے پنڈے پر ڈال دیا۔ (مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس مسدس کی بھی محرک کوئی اور ہستی تھی، اور اصل میں شیخ صاحب نے

بے نصیبی کی کہوں اس کی و لے کیا تجھ سے بات

لکھا تھا۔ ہمارے حسبِ حال کرنے کے لیے انھوں نے اسے 'خوش نصیبی' کر دیا۔)

پھر رمضان بھر یہی دستور رہا کہ رات بھر میں ان کی خدمت کرتی، سحر کے وقت سے لے کر رات تک اللہ کی بارگاہ میں روزے نماز بندگی بجالاتی۔ لیکن ابھی میں یہ سمجھ پائی تھی کہ شیخ صاحب کی متوعہ ہو کر رہنے، اور اس طرح ان کی سراسر توجہ اور لگاؤ کا مرکز ہو کر جینے کو اپنی خوش نصیبی گمان کروں یا نہ۔ کپتان صاحب کی حویلی میں مجھے یہاں سے زیادہ آسائشیں تھیں، لیکن وہاں سلامت نہ تھی، کوئی میرا والی وارث نہ تھا۔ لیکن یہ شیخ صاحب بھی کچھ ہری چگ سے لگتے ہیں، جب تک میری جوانی ہے شاید مجھے اپنے سے الگ نہ کریں، یوں ہی تیل ماش ہوتے رہیں۔ لیکن کیا بھروسا جوانی کب تک کی ہے۔ میں نے بڑی بیماری، یا پیٹ کے پھوڑے، یا پھر اولادیں جننے اور مرد کی خدمت کرنے کی وجہ سے اچھی اچھی کھنچا کھنچا یا کسا کسا یا بدن رکھنے والی لڑکیوں کو بائیس چوبیس کی عمر میں سوکھی چھوئی موئی کی ڈال سا مرجھاتے دیکھا تھا، بدن ہڈیوں کا ہار، گوشت نام کو نہیں اور عورت کی صورت جہاں ذرا کجلائی، بدن ذرا ڈھیلا ہوا، وہاں وہ مرد کے دل سے اتری۔ پھر تو نکاحیوں تک کا اللہ حافظ ہے، ہم جیسی متاعیوں اور نگھریوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

شیخ صاحب مجھے اچھے تو بہت لگتے تھے، لیکن ان میں محبوبی کی شان تو تھی ہی۔ اس کی مجھے آرزو ہی ہو سکتی تھی، امید نہیں، کہ جس دل سے میں انھیں چاہوں گی اسی دل سے وہ بھی مجھے چاہیں گے۔ میں ہزار جان کھپی سے ان کی خدمتیں کروں، لیکن وہ اس کا صلہ دیں جب تو۔ اندھا تب پتیائے جب وہ آنکھیں پائے۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ شیخ صاحب اگرچہ بالکل قلاش نہ تھے لیکن کچھ خاص فارغ البال بھی نہ تھے۔ یہ وہ دن تھے جب صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر کے یہاں ان کی نوکری ختم ہو چکی تھی۔ سید انشا سے ناچاقیاں بھی اب دور ہو چکی تھیں۔ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کی آنکھ بند ہوتے ہی سید انشا پر لکھنؤ کے دروازے کھل گئے تھے۔ خان علامہ کے توسط سے وہ نواب سعادت علی خاں کے دربار تک پہنچ چکے تھے۔ ان کے دن رات نواب کا دل موہنے میں گذرتے، ایسے میں شیخ صاحب جیسے بگڑ کر بننے والے دوست کی دلداری کی فرصت انھیں کہاں ہوتی اور نہ یہی ممکن تھا کہ سید انشا انھیں نواب کے دربار میں بار دلا دیں۔

میرزا سلیمان شکوہ بہادر کی ناانصافیوں سے آزردہ ہو کر شیخ صاحب ایک مدت خانہ نشین رہے تھے۔ پھر محمد عیسیٰ تنہا، نور الاسلام منتظر، حیدر علی گرم، اور پنڈت بدیادھر کے اصرار و ترغیب سے اب وہ شہر کے باہر روشن آرا باغ میں ماہانہ مشاعروں میں شریک ہوتے۔ شاگردوں سے کچھ فتوح آجاتی، ظفر الدولہ کپتان فتح علی خاں اور ایک دو نمودی رئیس تھوڑا بہت سلوک کر دیتے۔ اجلے خرچ نہ سہی، لیکن دو وقت کی روٹی آرام سے

مل جاتی تھی، اوقات بسری کے لیے بہت تھا کہ میں کون سی بھونرے میں پلی ہوئی تھی۔

کبھی کبھی مجھے لگتا تھا کہ شیخ صاحب نے اپنے افلاس کی بنا پر مجھ سے نکاح نہ کیا تھا، یا شاید وہ اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتے ہوں۔ لیکن ان دنوں تو سارا سارا دن گھر بیٹھے مجھ سے چہلیں کرتے، میری تعریفیں کرتے۔ کبھی مجھے بلا کا جامہ زیب بتاتے، کبھی میرے ہاتھ پاؤں کے تناسب کی بات کرتے، کبھی آنکھوں اور بالوں کی ثنا کرتے۔ لگتا تھا اب وہ میرے علاوہ کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں گے۔ میرا پہلی عید کا جوڑا کپتان بیگم نے بھیجا تھا۔ میں جب اسے پہن کر ان کے یہاں جانے کو تیار ہوئی تو انھوں نے فی البدیہہ کہا:

ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اتاریے
پہنا کریں گر آپ اسی وضع کا لباس

میں شرما کے کمرے کی طرف بھاگنے لگی تو انھوں نے شعر پڑھا:

چھپ کر کے دیکھ تو بھی کسی ڈھب سے مصحفی
پہنا ہے آج یار نے تیرے نیا لباس

یہ سب تو تھا، لیکن مجھے اور بھی خلشیں تھیں۔ شیخ صاحب کا مذہب مجھ پر کچھ بھی کھلتا نہ تھا، نہ وہ کبھی اس باب میں بابِ سخن وا کرنا پسند کرتے تھے۔ سارے رمضان بھر انھوں نے نہ کوئی روزہ رکھا نہ کسی وقت کی نماز پڑھی۔ حدیث، قرآن، دہ مجلس، مرثیہ، ایسی کوئی کتاب گھر میں ڈھونڈے نہ ملتی تھی۔ میں نے ان کی زبان سے کوئی فقرہ ایسا نہ سنا تھا جس سے ان کے اثنا عشری ہونے کا گمان ہوتا، اور نہ کبھی کسی صحابی، کسی پیر، یا اولیاء اللہ کا ذکر ان کے لب پہ آتا تھا۔

عید کی نماز وہ ضرور پڑھنے گئے۔ پنڈت بدیا دھر نے انھیں ایک بڑا پیارا چلبلا سا کاٹھیاواڑی ٹانگن شروع رمضان میں تحفے کے طور پر دیا تھا۔ میرے دل میں شک تھا کہ وہ نماز پڑھنے سے زیادہ ٹانگن کی نمائش کرنے گئے ہیں۔ مجھے کپتان بیگم نے ڈولی بھیج کر بلوا لیا تھا۔ شیخ صاحب جب نماز کو نکلے تو میں ڈولی میں بیٹھ لی۔ طے پایا تھا کہ بعد نماز وہ مجھے کپتان صاحب کی حویلی سے لے لیں گے۔ لیکن انھوں نے سارا دن یار دوستوں سے ملنے ملانے میں لگا دیا۔ میں کپتان کی حویلی میں پڑی سوکھتی رہی۔ جب انھیں بہت دیر

ہوئی تو مجھے رونا آنے لگا۔ اپنی ساتھی سہیلی گوئیاں کی دلجوئیوں کے باوجود میں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں۔ اگر میں منکوحہ ہوتی تو وہ بھلا اس طرح کا سلوک میرے ساتھ کرتے؟

گئی رات وہ مجھے لینے آئے۔ کچھ مجوب سے تھے، کہ انھیں شاید قلماقنی سے میری آزردگی کی سن گن ہو گئی تھی۔ لیکن راستے بھر میں کچھ نہ بولی اور نہ انھوں نے ہی منھ کھولا۔ گھر پہنچ کر میں نے یہ کہتے ہوئے زور سے کمرے کے پٹ اندر سے بند کر لیے کہ ''کھانا تو آپ کھا ہی چکے ہوں گے۔ مجھے نیند آرہی ہے، میں اب سوتی ہوں۔'' گھر میں ایک کوٹھری سی اور تھی، شیخ صاحب وہاں سوئیں یا ٹہل کر رات کاٹیں، میری بلا سے۔ میں تو رنج اور غصہ میں بھن کر کوئلہ ہو رہی تھی۔

شیخ صاحب نے ''ارے ارے، بی بی ذرا سنو تو سہی'' کہہ کر دروازے کو بند ہونے سے روکنا چاہا، لیکن میں نے دھڑام سے کنڈی لگا لی۔ انھوں نے وقفے وقفے سے بار بار دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن میں نے سن کے نہ دیا۔ آنسو میری آنکھوں میں امڈے آرہے تھے۔ آج زندگی میں پہلی بار میں نے تمنا کی کہ کاش میرے بھی باپ ماں ہوتے۔ روتے روتے مجھے بالکل خلافِ امید نیند آگئی۔ شیخ صاحب نے خدا جانے کب تک دروازہ بھڑ بھڑایا، مجھے کچھ پتا نہ چلا۔

سحر کے لیے اٹھنے کی عادت تو مجھے تھی ہی، میں کوئی چار بجے کچھ گھبرائی ہوئی سی اٹھی تو شیخ صاحب کو پلنگ پر نہ پایا۔ ایک لمحے کے لیے میں سمجھی نہیں کہ ماجرا کیا ہے۔ پھر اچانک رات کی بات یاد آئی تو شرمندگی اور خوف سے کانپتے ہوئے میں نے چپکے چپکے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مولا کریں وہ کوٹھری میں آرام سے سو گئے ہوں۔ کہیں گھر چھوڑ کر چلے نہ گئے ہوں، میں نے سراسیمگی کے عالم میں اپنے دل میں کہا۔ میرے اندر سے خوف کی ٹھنڈی لہریوں ابھری کہ میری ہونٹ ایک دم میں پپڑا گئے، حلق سوکھ گیا۔

دروازہ باہر کو کھلتا تھا، لیکن میں نے اس کے پٹ ہلکے سے دھکیلنا چاہے تو وہ کھلا ہی نہیں، جیسے کوئی چیز اڑ رہی ہو۔ میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ہائے میرے مولا مشکل کشا، کوئی بدروح بھوت پریت نہ ہو جس نے مجھے اس کمرے میں بند کر دیا ہے۔ شیخ صاحب بے شک گھر چھوڑ گئے ہیں۔ اب میں یہیں سر ٹکرا ٹکرا کر مروں گی۔ مجھ کمبخت ماری کو اتنا غصہ کاہے کو آگیا تھا۔ مرد لوگ ادھر ادھر سیریں کرتے ہی رہتے ہیں۔ کیا عید کیا محرم، ان کے لیے سب برابر ہیں۔ میں نے جلدی جلدی میں غلط سلط نادِ علی پڑھ کر دروازے کے پٹوں کے بیچ کی جھری سے جھانکنا چاہا۔ کوئی بھاری سی چیز بے شک اڑ رہی تھی لیکن وہ کیا چیز تھی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے

دوبارہ مزید ہمت جوڑ کر دروازے کو دھکیلا تو اس بھاری چیز میں حرکت ہوئی، پھر شیخ صاحب کا مسکراتا ہوا لیکن نندا سا چہرہ نمودار ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر دروازہ پورا کھول دیا۔ یا اللہ وہ اسی پہلی رات والا دوشالہ اوڑھے ہوئے وہیں میری چوکھٹ پر سو گئے تھے۔

خوف اور شرمندگی سے میرے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ شیخ صاحب نے دروازہ پوری طرح کھل جانے دیا، پھر سرو قد کھڑے ہو کر شعر پڑھا:

''جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی
ناچار میر منڈکری سی مار سو رہا

کہیے بھورا بیگم مزاج کیسے ہیں؟'' میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔

''یہ آپ نے کیا کیا؟ سردی لگ جاتی تو؟''

''تو کیا دروازہ توڑ ڈالتا؟'' وہ زور سے ہنسے۔ ''آپ کا کیا جاتا، میرا ہی دروازہ ٹوٹتا۔''

عجب طرح کے آدمی تھے۔ مرد ذات اور اسے غصہ نہ آئے، اچانک مجھ پر پھر جھلاہٹ کا دورہ پڑا:

''آپ کو ہنسی سوجھی ہے اور میری جان آدھی رہ گئی،'' میں ان سے لپٹی ہوئی بولی۔ ''دن بھر آپ کی راہ دیکھا کی۔ لیکن آپ نے تو عید اپنے ہوتوں سوتوں میں گذار دی۔ میں کون لگتی ہوں آپ کی۔'' میں نے رونا شروع کر دیا لیکن وہ ایک لفظ نہ بولے۔

''بتائیے ابھی بتائیے، آپ شیعہ ہیں کہ سنی ہیں؟ آپ نے مجھ سے نکاح کیوں نہ کر لیا؟'' میں نے آنسوؤں کے ہجوم اور رنج کے جوش میں ان کے سینے پر مکے مارتے ہوئے پوچھا۔ وہ اب بھی کچھ دیر چپ رہے، پھر آہستگی سے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولے:

''ہاں میں پیدائشی سنی ہوں، لیکن اصلاً.....''

''اصلاً کیا ہے کیا نہیں، میں نہیں جانتی۔ آپ کے مذہب میں متعہ نہیں ہوتا، بس یہ جانتی ہوں۔ آپ کے یہاں متعہ حرام ہے۔''

''لیکن تمھارے یہاں تو جائز ہے۔''

''لیکن آپ جب متعہ مانتے ہی نہیں تو میں بس آپ کی رکھیل ٹھہری۔ پھر میں یہاں کیوں ٹھہروں،

چوک میں جا کر بیٹھ جاؤں گی۔'' میں نے اپنے کو چھڑانا چاہا، لیکن وہ مجھے بہت مضبوط تھامے ہوئے تھے۔

''چھی، ایسی بات نہیں کہتے۔'' وہ ایسے لہجے میں بولے گویا میں کوئی ننھی سی بچی ہوں۔ ''اچھا میں تم سے نکاح کر لوں گا، قسم کھا کر کہتا ہوں۔ کہو جناب عباس کی قسم کھاؤں، کہو جناب خدیجہ کی سوگند اٹھا لوں....''

مجھے نہ جانے کیوں ان پر پیار سا آ گیا۔ لیکن برہمی ابھی اس پر حاوی تھی۔ ''یہ سب گناہ کی باتیں ہیں۔ آپ بڑی روٹی بھی ہاتھ میں لے لیں تو مجھے اعتبار نہ آئے گا۔'' مجھے ان کے چہرے پر شرمندگی کی سنولائی سی لہر دوڑتی دکھائی دی۔ شاید نکاح کی بات انھوں نے میرا دل رکھنے کے لیے کہہ دی تھی، ورنہ ان کا کوئی ارادہ ایسا نہ تھا۔ لیکن انھوں نے بھی یہ بے شک محسوس کر لیا تھا کہ میں ان کے جھوٹ کو پا گئی ہوں۔ انھوں نے میری ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر میرا منھ اٹھایا اور بولے:

''ذرا صبر کرو۔ نکاح بھی ہو جائے گا، تم پر کوئی عیب نہیں اور میں کہیں بھاگا تھوڑی جاتا ہوں۔'' مجھے ان کے لہجے میں صداقت کی خوشبو محسوس ہوئی یا شاید وہ میرا وہم تھا، کہ میں تو ان پر اعتبار کرنے کے لیے دل و جان سے راضی تھی مگر وہ لفظ، وہ وعدہ، وہ تازہ کشمیری سیبوں جیسی رس ٹپکاتی آواز، وہ من موہنی مسکراہٹ، شاید انھوں نے چپکے سے مجھ پر موہنی پڑھ بھی دی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اس آواز کی مٹھاس اور اس وعدے کے دلفریب بہلاوے کی بھول بھلیاں میں گم ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

''اس وعدے سے عقب گذاری ہرگز نہ ہو گی صاحب۔ یہ خیال رہے کہ میں آپ کو تا قیامت پابند ٹھہراؤں گی۔'' میں نے کچھ اس طرح کہا گویا مجھے یقین تو تھا ہی، بس بات کی خاطر بات کہہ رہی تھی۔

پھر وہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی ہی کیا جو نارضامند سے زیادہ نارضامند مطلوب اور کٹھور دل سے کٹھور دل معشوق کو دارو مدار کیے بغیر ہی دم بھر میں رجھا نہ لیں۔ انھوں نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا، سر اپنے سینے سے لگایا، پھر دھیرے دھیرے قدم چلتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے جس کی چوکھٹ سے لگ کر انھوں نے رات گذاری تھی۔

سارا دن وہ مجھے لیے پڑے رہے۔ دروازے پر بار ہا دستک ہوئی، کبھی حلال خورنی، کبھی بہشتی، کبھی کوئی شاگرد یا دوست۔ لیکن یہاں کھانے پینے تک کی سدھ تو تھی نہیں، کنڈی کون اتارتا اور دروازہ کون کھولتا۔ دن کب چھپا، رات کب آئی، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ ٹانگن کے لیے پڑوس کا ایک اصطبل وہ پہلے سے طے کر چکے تھے، ورنہ وہ بچارہ سردی اور بھوک پیاس سے مر ہی گیا ہوتا۔

گئی رات وہ باہر نکلے۔ میں دل میں سوچی، لو اب یہ خدا جانے کب کی خبر لائیں گے۔ لیکن نہیں وہ تو اکبری دروازے سے نکلے، پکے پل کی طرف دورویہ نانبائیوں کی معطر دکانیں جھانکیں۔ اپنی پسند سے شیرمال اور کباب بنوائے، سید حسن خان کے کٹڑے پر عبداللہ عطر فروش سے حنا کی تیل کی ایک کپی خریدی اور دم کے دم میں واپس آئے تو شعران کی زبان پر رواں تھے:

آدمیت سے بھرا ہو جو سراپا آدمی
کیوں بچھڑ جاوے یکایک ہائے ایسا آدمی
خوبرو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں
آج تک ہم نے دلے تجھ سا نہ دیکھا آدمی
عشق کا کوچہ وہ کوچہ ہے کہ جس میں ہم نشیں
بات کہتے ووہیں ہو جاتا ہے رسوا آدمی
اے زلیخا جان اس سودے کو تو سودائے مفت
چرخ نے یوسف سا تیرے ہاتھ بیچا آدمی
خاک کو میری بھی گر چاہے کرے باغ و بہار
وہ جو مشتِ خاک سے کرتا ہے پیدا آدمی

۷

نکاح تو انھوں نے مجھ سے کیا، لیکن کئی برس بعد۔ 1229ھ کے سال کا آغاز تھا اور سردی اچھی خاصی پڑ رہی تھی [آغاز 1229ھ، 24 دسمبر 1813ء، مرتب]۔ شیخ صاحب سویرے ہی کہیں کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ دن کے کھانے پر ایک دو دوستوں کو بھی لاؤں گا۔ میں کھانا پکا، نہا دھو، صاف کپڑے پہن، دھوپ میں بال سکھا رہی تھی کہ کنڈی کھڑکی۔ شیخ صاحب ایک خاص انداز میں زنجیر کھڑکاتے تھے، میں فوراً پہچان گئی کہ وہیں ہیں۔ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دوڑی، دروازہ کھولا تو کیا دیکھتی ہوں کہ شیخ صاحب

آگے آگے، ان کے پیچھے شیخ ناسخ، ان کے ساتھ میاں حیدر علی۔ میں حق دق رہ گئی کہ یا اللہ ان لوگوں کو لانا تھا تو کچھ خاص اہتمام کیا ہوتا۔ اب کیا کرتی، جلدی سے دالان میں چٹائیوں کا فرش کر دیا اور خود پان بنانے میں مصروف ہو گئی۔

شیخ ناسخ اور خواجہ حیدر علی سے میرا پردہ نہ تھا۔ شیخ ناسخ کو شیخ صاحب اپنا شاگرد بھی تصور کرتے تھے اور مربی بھی، اور خواجہ آتش پر تو ان کی وہ ساری چاہتیں قربان تھیں جو وہ اپنی کسی اولادِ نرینہ پر صَرف کرتے۔ انھوں نے مجھ سے شروع دن ہی سے کہہ دیا تھا کہ ان دونوں کو اپنا بڑا بھائی گردانو۔ بلکہ جو بات مجھ سے بھی نہ کہہ سکو ان سے بے تکلف کہہ سکتی ہو۔

میں چوکی پر بیٹھی سر جھکائے پان لگا رہی تھی اور دل میں کچھ مشوش تھی کہ آج ان لوگوں میں وہ چہلیں، شعر و شاعری کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں جو ان کا معمول ہیں۔ پھر میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ تینوں ایک ایک کر کے آبدار خانے میں گئے، وضو کیا، پھر چٹائی پر دوزانو بیٹھ گئے، گویا کوئی دینی جلسہ آغاز ہونے والا ہو۔ اچانک شیخ صاحب نے قدرے بلند اور کچھ کھرکھراتی ہوئی آواز میں کہا:

''حیات النسابی بی، آؤ یہاں ہمارے پاس بیٹھ جاؤ۔''

میں نے کان کھڑے کیے۔ وہ مجھے حیات النسا کبھی نہ کہتے تھے، کجا کہ حیات النسابی بی۔ یا اللہ کیا ہونے والا ہے۔ کہیں یہ مجھے چھوڑ تو نہیں رہے ہیں؟ کسی اور کے تو سپرد نہیں کر رہے ہیں؟ میں خاصدان وہیں چھوڑ چھاڑ لرزتے قدموں سے آکر شیخ صاحب کے برابر بیٹھ گئی۔

''نہیں، سامنے بیٹھو،'' انھوں نے کہا۔ چاروناچار میں اٹھ کر چٹائی کے ایک کونے پر ان کے سامنے ٹک گئی، اس طرح کہ شیخ ناسخ اور میاں حیدر علی ایک طرف تھے، ان سے کچھ دور پر شیخ صاحب، اور ان کے سامنے میں۔ اچانک شیخ ناسخ اٹھے اور انھوں نے ایک نہایت نفیس کامدانی کا سرخ دوپٹہ مجھے یوں اڑھا دیا کہ گھونگھٹ سا نکل آیا۔ پھر شیخ صاحب نے سنیوں کی طرز کا خطبۂ نکاح عربی میں پڑھا۔ خطبہ ختم کر کے وہ بے حد نرم آواز میں بولے:

''حیات النسابی بی عرف بھورا بیگم، میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی، تین سو روپے سکۂ سلطانی مہر معجّل کے عوض شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی گواہیوں کے ساتھ تم سے نکاح کرتا ہوں۔ تمھیں قبول ہے؟''

میری سسکی چھوٹ گئی، اور فوراً ہی یہ سسکیاں بآوازِ بلند گریہ میں تبدیل ہو گئیں۔ شیخ ناسخ عورت سے

نا آشنا، اور میاں حیدر علی فرشتہ صفت، مجھ سے آنکھ تک ملاتے ڈرتے تھے، ان کی سمجھ میں کیا خاک آتا کہ میں کیوں رو رہی ہوں۔ شیخ صاحب بھی ایک لحظے کے لیے گڑبڑا گئے۔ پھر بولے، ''گھبراؤ نہیں۔ بس یہ کہہ دو کہ نکاح تمھیں قبول ہے۔'' لیکن میں تو روئے جا رہی تھی۔ لگتا تھا ہاتھ پاؤں میں جان نہیں رہ گئی، زبان گنگ ہو گئی ہے۔ شیخ صاحب نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پر رکھا تو میں کچھ گھبرا کر، کچھ سہم کر پیچھے سمٹ گئی۔

''کیا ہوا، ڈرتی کیوں ہو؟'' شیخ صاحب کا لہجہ نہ تھا، کسی راہ گم کردہ بچے کے سر پر چمکار بھرا ہاتھ تھا۔ ''نہیں منظور تو کوئی بات نہیں، یوں ہی کہہ دو۔''

مگر میرے آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ ''ن..... نہیں..... قبول ہے،'' میں نے بدقت یہ لفظ ادا کیے۔

شیخ صاحب کے لہجے میں اس بار تھوڑا سا تبسم تھا۔ بولے، ''نہیں قبول کہ ہاں ہے؟ کچھ صاف تو کہو۔''

''قبول ہے،'' میں نے سسکی اور سرگوشی کے درمیان کہا۔ تینوں صاحبان نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دیر تک عربی میں دعائیں پڑھتے رہے۔ میرا رونا کچھ ہلکا پڑا تو میں نے بڑھ کر شیخ صاحب کے پاؤں پکڑے اور ان کے شانے سے اپنا سر ٹکا دیا۔ شیخ صاحب نے بازو تھام کر مجھے اٹھایا اور کہا:

''آج تم پلنگ پر بیٹھو۔ ہم لوگ دسترخوان لگائیں گے اور تمھیں کھانا کھلائیں گے۔ نویلی دلہن کام نہیں کرتی۔'' پھر انھوں نے شیخ ناسخ کی طرف دیکھا۔ شیخ ناسخ نے اپنی کمر میں بندھی ہوئی مخملی تھیلی کھول کر میرے شیخ صاحب کی طرف بڑھائی۔ انھوں نے اسے آہستہ آہستہ میرے قدموں میں رکھ دیا۔ جب یکسوئی ہوئی تو میں نے تھیلی کے پیچ کھولے۔ پورے تین سو روپے سکۂ سلطانی کے تھے، بالکل تازہ تازہ ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہوئے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ روپے شیخ ناسخ نے بطور قرضِ حسنہ دیے تھے۔

میں نے تھیلی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کوئی کاغذ یا نکاح نامہ نہ تھا۔ مجھے خیال بھی نہ آیا کہ پوچھوں کوئی کاغذ لکھا جائے گا کہ نہیں۔

۸

اس وقت تک میں شیخ صاحب کے فیضِ صحبت سے سخن فہمی اور سخن شناسی میں طاق ہو چکی تھی۔ تمام

بڑے استادوں، شیخ صاحب کے دوستوں اور خاص شاگردوں کے نام اور کلام سے آشنائی بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ میں نے بہت سے شعر حفظ بھی کر لیے تھے۔ میرا حافظہ شروع ہی سے اچھا تھا، شیخ صاحب کے کلام سے لطف اندوزی کے موقعے ملے تو اور بھی چمک اٹھا۔ شیخ صاحب کے مضامین کی کثرت مجھے ہمیشہ متحیر کرتی، اوران کی یہ صفت تو غیر معمولی تھی کہ وہ کسی بھی بات کو مضمون بنا سکتے تھے۔ ایک دن بڑھاپے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے باتوں باتوں میں کہا کہ 'بوڑھے چونڈے' کا مضمون غزل میں کسی نے نہ باندھا ہوگا۔ شیخ صاحب بولے کسی نے نہیں باندھا تو نہ سہی، ہم تو باندھ سکتے ہیں۔ پھر بس ذرا سے تامل کے بعد انھوں نے شعر پڑھا:

اگر پروانہ اس سے لگ چلے ہے پیار میں آکر
کہے ہے شمع میرے بوڑھے چونڈے پر کرم کیجیے

کمال کا شعر تھا، بے ڈھب مضمون پر معنی کی تازگی سونے پر سہاگے کا کام کر رہی تھی۔ میرے منھ سے نکل گیا، ''پہلے سے کہہ رکھا تھا کیا؟''

اس دن وہ پہلی بار مجھ پر خفا ہوئے۔ ''پہلے سے کہہ رکھنا کیا معنی؟ کیا میں کسی مضمون میں بند ہوں؟ معاف کیجیے میں آپ کے لکھنؤ کا کوئی پرو پوچ نہیں ہوں مضمون جس کے ہاتھ نہ لگتے ہوں۔ یہ پورب کے صحرائی مضمون باندھنا کیا جانیں۔''

وہ اچانک بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر انھوں نے یہ شعر یوں ڈپٹ کر سنائے گویا مشاعرے میں پڑھ رہے ہوں:

جاں ڈالتا ہے مصحفی قالب میں سخن کے
مشکل ہے کہ تم اس کی طرح شعر کو ڈھالو
کو زمزمۂ دہلی و کو لہجۂ پورب
کیوں اس کی طرف ہوتے ہو ناحق کو رزالو

میں نے گھبرا کر معافی مانگی، ''ہائے اللہ یہ میرا مطلب تھوڑی تھا۔ کون آپ کو کہے گا کہ کسی مضمون میں عاجز ہیں؟ اور لیجیے تاؤ میں آکر مجھے بھی رزالوں میں ڈال دیا۔''

میں نے آخری فقرہ انھیں چھیڑنے کو کہا تھا۔ لیکن انھیں میری بات واقعی لگ گئی تھی، وہ کچھ دیر تک مجھ سے کھنچے رہے۔ آخر انھیں خوش کرنے کے لیے میں نے وہی ترکیب استعمال کی جو کبھی خالی نہ جاتی تھی۔

شیخ صاحب کے مزاج کا خمیر چار عناصر سے اٹھا تھا۔ اول تو خودنگری اور خودداری، دوسرا شعر گوئی اور سخن سنجی، تیسرا حسن پرستی، اور چوتھا خوش طبعی اور ظرافت۔ وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان میں اس درجہ ظرافت نہ ہوتی تو ان کی خودبینی ناقابلِ برداشت ہو سکتی تھی۔

ہندی میں میر تقی صاحب اور فارسی میں میرزا قتیل کے سوا کسی معاصر کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ میاں جرأت اور سید انشا کی علمیت پر انھیں شک تھا۔ وہ کہتے تھے کلاونتوں کی طرح بین کاری اور بھانڈوں کی طرح نقلیں بھرنے سے کوئی استاد نہیں بن جاتا۔ غیر ضروری فارسی عربی کی نمائش کو بھی وہ معیوب سمجھتے تھے کہ شعریت اور شے ہے، ملان پن اور شے۔ ایک بار انھوں نے کسی شخص کی فرمائش پر مفتی غلام حضرت کی تاریخ وفات کہی۔ میاں بیتاب نے وہ تاریخ دیکھی تو فرمایا کہ یوں تو مادۂ تاریخ عمدہ ہے، لیکن 'مفتی' کی تحتانی گرتی ہے، مصرعے میں لفظ 'مفت' پڑھا جاتا ہے۔ شیخ صاحب نے بھی یہ بات سنی لیکن ان سنی کر دی۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ایک بار میاں بیتاب ہمارے گھر بغرضِ ملاقات تشریف لائے تو انھوں نے یہ بات دہرائی کہ لفظ 'مفتی' کی تحتانی ساقط ہو رہی ہے، اسے ٹھیک کر دیتے تو خوب تھا۔ شیخ صاحب کی تیوری پر بل آ گئے۔ انھوں نے فرمایا کہ خود میرے تخلص (مصحفی) میں تحتانی سو جگہ دبی ہو گی، کسے دماغ ہے جو درست کرے۔ بیتاب صاحب بولے، ''تو کیا آپ فارسی عربی الفاظ میں سقوطِ حروفِ علت کو جائز سمجھتے ہیں؟'' شیخ صاحب نے فرمایا:

''فارسی عربی کوئی آہوئے حرم ہے کہ اسے ہاتھ لگانا جرم ٹھہرے؟ لفظ تو لفظ ہے۔ جس طرح اچھا لگے اسی طرح باندھیے۔ یہ سید انشا کے چھوڑے ہوئے اشقلے ہیں کہ عربی فارسی لفظوں کے ساتھ کچھ خاص سلوک کیا جانا چاہیے، اور یہ سب اس لیے کہ علمیت کی بے جا نمائش ہو سکے۔ فارسی والے تو دھڑلے سے اپنی زبان اور غیر زبان دونوں کے الفاظ کے حروفِ علت دباتے ہیں، توڑ موڑ لیتے ہیں۔'' پھر انھوں نے یہ چار مصرعے پڑھے:

اے مصحفی قدر مرغ بستاں ہرگز
رکھتا نہیں گو کہ ہووے سیانا کوا

الفاظ متین اور لغت لا لا کر
ناحق نہ بنا تو ریختے کو ہوا

میاں بیتاب نے دل میں کچھ پیچ وتاب کھائے ہوں گے، لیکن شیخ صاحب کے سامنے یارائے گفتگو نہ رکھتے تھے۔ انھیں دنوں شہر میں یہ بات چل رہی تھی کہ میر تقی صاحب بہت ضعیف ہو گئے ہیں، ان کے بعد ملک سخن کی بادشاہی کسے ملے گی۔ یہی باتیں سن کر ایک دن شیخ صاحب گھر آئے تو مجھ سے کہنے لگے، ''یہ احمقانِ کوچہ کوتاہ بیناں اتنی سی بات نہیں جانتے کہ ان کے کہنے سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو وہ ملک الخلاق طے کرے۔ ورنہ میر کیا چیز ہے، سودا کیا ہے۔ مجھ کو ان لوگوں کی پروا کیا ہے۔''

پھر اچانک وہ ہنس کر بولے، ''لو بھئی یہ تو مطلع ہی ہو گیا:

میر کیا چیز ہے سودا کیا ہے
مجھ کو ان لوگوں کی پروا کیا ہے''

پھر انھوں نے اس پر غزل کہی۔ لیکن سچ یہ ہے کہ میر تقی صاحب، اور پھر میرزا سودا کا ادب وہ بہت کرتے تھے اور یہ بھی ہے کہ عزتِ نفس انھیں بہت پیاری تھی۔ صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر کی کدورت دور کرنے میں وہ اسی لیے ناکام رہے کہ کہنے کو تو عذر معذرت کے شعر نہیں لکھتے، لیکن دراصل اپنی ہی توصیف کرتے اور شہزادے سے یوں کلام کرتے جیسے وہ ناسمجھ بچہ ہو۔ ایک بار جب سید انشا والے معاملے میں مرشد زادۂ آفاق ان سے بہت برہم تھے تو شیخ صاحب نے قصیدے میں لکھا کہ آپ کان کے کچے ہیں اور آپ کے درباری سب نااہل:

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کیا تقریر
مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اس کی رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر
ولے مزاج مقدس جو لاابالی ہے
نہیں خیال میں آتا خیالِ حرفِ حقیر

وہ قصیدہ یوں لکھتے گویا ممدوح سے زیادہ اپنی مدح کر رہے ہوں۔ حضرت امیر المومنین کی ثنا میں ایک قصیدہ یوں شروع کیا ہے گویا اپنی شان میں لکھ رہے ہوں:

ہو چکا دور میر اور مرزا
اب زمانے میں ہے مرا دورہ

اور انھیں میرزا سلیمان شکوہ بہادر کو مخاطب کر کے انھوں نے ذرا دیکھیے کس شان سے کہا:

مجھ کو نہ دیکھ دیکھ تو میرے کلام کو
قولِ امیر کو نہ سمجھ اتنا سرسری
مادح کو مجھ سے تجھ سا ہی ممدوح تھا ضرور
تو حیدری اگر ہے تو ہوں میں بھی قنبری
انصاف کو تو ہاتھ سے مت دے تو وہ خدا
گر بندہ پرورا نہ کنی بندہ پروری

ان کی زندگی کا بڑا حصہ مربی کی تلاش اور دُنیاوی روزی رسانوں کی مدح میں گزرا، لیکن یہ پیشہ انھوں نے اپنی پسند سے اختیار نہ کیا تھا۔ ان کا شعر ہے، اور یہ محض مضمون نہیں، حسبِ حال ہے:

سارے حصولِ زر کے سب اسباب جل گئے
ناچار ہم نے شاعری ہی اختیار کی

انھیں عقل و دانش کی توقیر کا بہت لحاظ تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کسی کے دامنِ دولت سے منسلک نہ ہوتے، آزاد جیتے اور آزاد رہتے۔ یہ بھی انھیں کا شعر ہے:

حیف اس کا مجھ کو آتا ہے ارسطو سا بشر
ملک دانش چھوڑ کر جاہ و حشم میں جا پھنسا

یہ غزل انھوں نے میرے سامنے کہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ ارسطو کون تھا تو انھوں نے کہا بی بی وہ ہم

سب کا معلم اور رہبر تھا۔ ہم عالم کو جتنا کچھ سمجھتے ہیں اس کے اور اس کے شاگردان معنوی شیخ الرئیس ابن سینا اور ابن رشد اور عبدالحکیم سیالکوٹی اور ملا محمود جونپوری کی ذواتِ بابرکات کے باعث سمجھے ہیں۔ خان علامہ کو دیکھو کس مرتبے کے عالم تھے۔ درباداری نے انھیں کسی کام کا نہ رکھا۔ سعادت علی خان کو نوابی دلانے میں ان کی مساعی پیش پیش تھیں۔ لیکن مسجد پر متمکن ہو کر نواب وزیر نے خان علامہ کو کلکتہ کمپنی دربار میں بعہدۂ وکالت ٹالا۔ اسے ایک طرح کی جلاوطنی ہی سمجھو۔ آخرکار وہ وطن سے دور مرشدآباد میں مرے، ابھی چند دن کی بات ہے۔ [خان علامہ کا انتقال 1216ھ مطابق 1801ء میں ہوا، مرتب۔]

میں یہ باتیں کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی۔ پھر بھی ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھ ہی لیا:

''دُنیا کو جاننے کے لیے نبی کے احکام اور امامانِ معصوم کی حدیثیں کافی نہیں کیا؟''

وہ مسکرائے۔ ''صرف دُنیا نہیں، عالم۔ اور عالم کو سمجھنے کے لیے نقل اور عقل دونوں ضروری ہیں بھورا بیگم۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں افلا تعقلون۔ اللہ نے انسان کو قوتِ ادراک بھلا کیوں عطا کی؟ قوتِ ادراک کی زیرنگیں سب کچھ ہے۔ شعر سنو:

لوح و قلم و کرسی و عرش اور یہ افلاک
اونچے ہیں پہ ہیں قوتِ ادراک کے نیچے''

میں کچھ سمجھی نہیں، لیکن یہ شعر مجھے بڑا ڈراؤنا لگا۔ یہ کنونڈا ادراک کیا ہوا نعوذ باللہ، امامانِ ذی شان اور حدیث و قرآن سے بھی بڑھ گیا۔ کیا معلوم مولا اور اللہ میاں ان کے ساتھ اس شعر کی بنا پر کیا معاملہ کریں۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ان کا مذہب مجھ پر کھلتا نہ تھا۔ کبھی امامانِ عالی مقدار کی مدح میں شعر کہتے تو کبھی سنیوں کے بزرگوں کی ثنا کرتے۔ کبھی سنیوں کو برا کہتے تو کبھی شیعوں کو جاہل اور گمراہ ٹھہراتے۔ رہی نماز و تلاوت و روزہ، تو یہ اعمال ان سے کبھی سرزد نہ ہوئے۔ عربی وہ خوب جانتے تھے، لیکن میں نے ان کے ہاتھ میں کوئی مذہبی کتاب کبھی نہ دیکھی۔

آخری دنوں میں وہ کلامِ پاک کی تلاوت ضرور کرنے لگے تھے، اور کبھی کبھی سنیوں کی طرز کی نمازِ عشا پڑھ لیتے۔ خیر، یہ تو آخری زمانے کی بات تھی۔ جس وقت کا میں ذکر کر رہی ہوں، ایک دن بیٹھے بیٹھے کہنے لگے: ''سنتی ہو، دُنیا میں اتنی برائی، اتنی ناانصافی، اتنا ظلم ہے۔ ایمان داری اور حق پرستی کبھی کبھی ہی ظہور میں

آتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ اللہ میاں نے اپنے سب کام شیطان کے سپرد کر دیے ہیں۔'' پھر انھوں نے شعر پڑھا، اور شعر کیا پڑھا میری تو جان ہی لے لی:

فتنے لاکھوں یہ اسی نے تو اٹھائے جس کے
کُن کے کہنے میں ہوا عالم امکاں تیار

''اللہ، توبہ کیجیے توبہ۔ یہ باتیں میرے سامنے آپ بکتے ہیں اور مجھے بھی گنہ گار کرتے ہیں؛'' میں اپنے کلوں پر ہاتھ مار کر کان پکڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ رہ رہ کر آخر آپ کو ہو کیا جاتا ہے؟ اللہ کو منھ دکھانا نہیں ہے کیا؟''

''بھورا بیگم، اللہ کے یہاں انصاف ہوتا تو نہ یہاں فرنگی ہوتے اور نہ ٹیپو سلطان کی شہادت ہوتی اور نہ مجھ سا یگانۂ روزگار نان شعیر اور ٹھنڈے آبخورے کی دھن میں دن رات ایک کرتا:

مصحفی میں تو تہی دست رہا کیا حاصل
گو موئے پر مرا دیوان مطلا ہووے''

ان کے لہجے میں تھوڑا بہت حرمان لیکن بہت سارا کڑوا پن تھا۔

''للہ اب چپ رہیے، اللہ سب دیکھتا اور سنتا ہے، اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ چاہے گا تو آپ کے در و دیوار تک کو سونے سے لپوا دے گا۔''

''اللہ میاں کو اتنی فرصت کہاں بھورا بیگم۔'' وہ کچھ چیں بجبیں ہو کر بولے۔ ''بوعلی کہتا تھا کہ اللہ کو جزئیات کا علم نہیں....''

''خدا جانے کون موا بے حیا بے مذہب بوعلی آپ کا دوست ہے۔ ایسوں کی صحبت سے قیدِ فرنگ بھلی؛'' میں جل کر بولی۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسے۔ ''ہاں اس کی دوستی میں گمراہی ہی ہے۔'' پھر اچانک ان کے ماتھے پر شکن آئی، جیسے کسی گتھی کو سلجھانے کی کوشش میں ہوں۔ ''لیکن سوچو کہ وہ تو عالم تنزیہہ میں قائم بالذات ہے۔ اسے تنزل کیوں کر ممکن ہے کہ بادشاہوں اور کوتوالوں کی طرح محکمۂ عدالت آراستہ کرے؟ دُنیا کے کام بندے کی تدابیر

سے وابستہ ہیں، اور اہل صفا کی تدبیریں دُنیا پرستوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث پٹ پڑتی ہیں۔''

میں نے انگلیوں میں کان دے لیے۔ ''میں اب کچھ نہ سنوں گی۔ جائیے آپ بھی کلیاں کیجیے، منھ صاف کیجیے، توبہ کیجیے کہ کفر کا زنگ آپ کے دل سے دور ہو۔''

وہ ہنستے رہے اور طرفہ تماشا یہ کہ ایک طرف تو ایسی باتیں کہ شیطان سنے تو پناہ مانگ جائے، اور دوسری طرف یہ بھی کہ وہ دیانت داری، امانت داری، چھوٹوں پر محبت اور ان کی خاطر ایثار، بزرگوں کا احترام، ان باتوں میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ خواجہ حیدر علی تو خیر ان کے شاگرد ہی تھے، ان کی تعریف میں وہ مبالغہ کر سکتے تھے۔ لیکن شیخ ناسخ کے باب میں انھوں نے یہاں تک کہا اور لکھا کہ بایں پیرانہ سری اور ضعف، میں نے اپنا رنگ سخن بدل کر امام بخش ناسخ کا رنگ اختیار کر لیا ہے۔ سید انشا سے لڑائی کے زمانے میں شاید انھوں نے سید موصوف اور ان کے حواریوں کو سخت سست کہا ہو تو مجھے اس کی خبر نہیں، لیکن میں نے اپنے پچیس تیس برس کے ساتھ میں ان کی زبان کو کسی کی غیبت سے آلودہ نہ دیکھا۔ ان میں خود بینی بہت تھی، لیکن خود نمائی نہ تھی۔ کچھ ایسا تھا کہ انھیں اپنے کمال اور حکمت دونوں پر اعتمادِ کلی تھا، لہٰذا وہ اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے کہ اپنے کمال کو ثابت کرنے کے لیے نمائشی انداز اختیار کریں۔

میں سمجھتی ہوں کہ وہ اگر اتنے خوددار اور خودنگر نہ ہوتے تو امیروں رئیسوں سے اچھی نباہ کر لیتے اور ہماری زندگی زیادہ آسودگی سے گذرتی۔ حق یہ ہے کہ عام شاعروں کو جیسا میں نے ظفرالدولہ کپتان فتح علی خان کے آستانے پر ناک رگڑتے، اپنے مدمقابل شعرا کی عیب جوئی کرتے اور عمومی طور پر خود کو رذیل ثابت کرتے دیکھا اور سنا تھا، اس کی بنا پر میں شاعروں کے طبقے کو ارذل کونین ہی سمجھتی تھی۔ شیخ صاحب نے میری آنکھیں کھول دیں۔ ان کے جو شعر مجھے سب سے پہلے یاد ہوئے ان میں یہ بھی تھا، اور میں نے ہمیشہ اسے بالکل سچ مانا:

ہم مصحفی غنی ہیں شعر و سخن کی دولت
رتبہ ہمارے آگے رکھتا ہے سیم و زر کیا

یہ شعر انھوں نے اس وقت پڑھا تھا جب میں نے ایک بار دبی زبان سے تمنا کی تھی کہ ہم تونگر ہوتے تو میں اپنے ہونے والے بچے کے گلے میں سونے کی ہیکل ڈلواتی۔ بچہ تو خیر جاتا رہا، لیکن یہ شعر یادگار رہ گیا۔

رہی شعر گوئی اور سخن سنجی، تو ان کی پرگوئی اور زود گوئی کی تو سارے زمانے میں دھوم تھی ہی۔ میں کہہ ہی

چکی ہوں کہ وہ کسی مضمون، کسی صنف میں بند نہ تھے۔ کبھی کبھی کوئی دبی زبان سے کہتا کہ مرزا رفیع کا قصیدے اور میر تقی کا غزل میں جواب نہیں، تو کبھی وہ چپ ہو جاتے اور کبھی کہتے:

آفتاب زمیں ہوں میں لیکن
مجھ سے روشن ہے آسمان سخن
ہے غزل میری گرچہ سحر حلال
پر قصیدے میں دیکھ شانِ سخن
دیکھ کر رتبۂ سخن کو مرے
سجدہ کرتے ہیں سرکشانِ سخن

اور سچ یہ ہے کہ وہ میر تقی اور مرزا سودا کے قائل بھی تھے۔ یہ بھی انھیں کے شعر ہیں:

غرور شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا
تجھے کیا میر و مرزا سے ہے جب اے بے ادب نسبت

گو کہ تو میر سے ہوا بہتر
مصحفی میر پھر بھی میر ہی ہے

مصحفی دلّی کو لکھ بھیجی تھی میں نے یہ غزل
سچ بتا سن کر اسے درد و اثر نے کیا کہا

اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اپنے سے کم عمر یا کم رتبہ شاعر کو حقیر نہ سمجھتے تھے۔ حتی الامکان وہ نوواردوں اور نوآموزوں کا دل بڑھاتے تھے، ان کے کلیجے میں چھریاں نہ مارتے تھے۔ تنگی ترشی کے زمانے میں بھی وہ ضرورت مندوں کو سہرا، رخصتی، تہنیتی غزل وغیرہ بے اجرت ہی لکھ دیا کرتے۔ ہاں کسی نے خوشی سے کچھ نذر کیا تو انھیں تکلف بھی نہ تھا۔

زود گوئی اور پر گوئی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ کسی کا کلام سراپا انتخاب نہیں ہوتا۔ ان کا تو ہو ہی نہ

سکتا تھا، کہ وہ شعر اس روانی اور بے تکلفی سے کہتے تھے جس طرح اور لوگ گفتگو کرتے ہیں۔ انھوں نے جلال الدولہ مہدی علی خان کے مشاعرے میں ایک غزل پر بڑی داد پائی، اس میں دو شعر یہ تھے:

آخر تو عرش پر ہے ارواحِ شاعراں بھی
جاویں گے واں تو ان کی گرم انجمن کریں گے
بعد از فنا بھی ہم سے اے مصحفی نہ ہوگا
ہم اس زباں کے ہوتے ترکِ سخن کریں گے

مجھے خوب یاد ہے جب یہ شعر سن کر میں نے کہا، 'اس زباں' سے آپ کی مراد زبان ریختہ بھی ہے، اور اپنے منھ کی زبان بھی، تو انھوں نے اس محبت اور استحسان سے دیکھا کہ مارے خوشی کے کپکپا اٹھی۔ شعر اور فن شعر کے بارے میں ان کی وہبی فہم ان کی اکتسابی فہم سے بھی بڑھ کر تھی۔ ایک طرف تو وہ یہ بھی کہہ گئے:

اے مصحفی مشکل ہے غزل ایک سی کہنا
اک بیت کہیں اچھی بھی ہو جاتی ہے دس میں

تو دوسری طرف انھوں نے گویا خود سے مخاطب ہو کر کہا:

کارگاہِ سخن کا فرق نہ پوچھ
جیسی جس کی ہے بافت بنتا ہے

میں کبھی کبھی سوچتی ان سے پوچھوں، آپ کون سی بافت کی کہتے ہیں، شاعر کے مزاج کی، قوتِ شعر گوئی کی، استاد کی تربیت اور تعلیم کی، یا پھر تقدیر کی؟ لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ اپنے شعر کا مطلب بتانے سے گریز کرتے تھے۔ اگر کسی نے بہت اصرار کیا تو کہتے، مجھ سے معنی مطلب کی بات نہ کرو۔ میں شعر میں گم ہوں اور شعر مجھ میں:

صدقے ہوں سخن کے مصحفی میں
صدقے ہے مرے سخن ہمیشہ

۹

ان کی حُسن پرستی؟ اس باب میں اور کیا کہوں۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ بس مزید یہ سن لیجیے کہ عشق ان کی زندگی تھا اور حُسن اس زندگی کا محور۔ ان کا آخری وقتوں کا شعر ہے:

شریفِ کعبہ سے لے تا فقیہِ دانش مند
رکھے ہے دل میں ہر اک چاہ خوبصورت کی

انھیں چاہے جانے سے زیادہ چاہنے کی چاہ تھی۔ ان کے گھر میں مجھے محبّت اور عاشقانہ توجہ ہمیشہ ملی، لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ گھر کے باہر ان کے لگاؤ کس سے تھے، لاگ کہاں کہاں لگتی تھی۔ مجھ سے پہلے تو یقیناً ان کے معشوق بہت سے تھے۔ بہ یک وقت بھی کئی جگہ انھوں نے دل اٹکا رکھا تھا، ایسا بھی مجھے ان کے کلام سے شک کبھی کبھی گذرا۔ ان کی بات چیت میں رندی اور شاہد بازی ہمیشہ جھلکتی تھی لیکن تہذیب کے دائرے سے باہر وہ کبھی نہ ہوتے تھے۔ میں نے کچھ دن پہلے آپ سے کہا تھا نہ کہ شاید ہی کوئی ایسی عورت ہو جسے وہ اپنی طرف ملتفت نہ کر لیتے ہوں، کچھ دیر ہی کے لیے سہی۔ مجھے لگتا ہے مردوں، خاص کر بننے ٹھننے والے مردوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔

اشعار پر جایئے تو لگتا ہے انھوں نے شاہدان بازاری سے لے کر جوانانِ نو خاستہ کو وقتاً فوقتاً تاک رکھا ہوگا۔ ان کی جوانی کا شعر ہے، شاید دہلی میں کہا ہوگا:

چھوڑا نہ میاں مصحفی تم نے کوئی لونڈا
تم کام میں اپنے غرض استاد ہو کوئی

اب خدا ہی جانے سچ ہے کیا جھوٹ کیا ہے۔ ان کے بعض اور شعروں سے بالکل الٹا ہی مطلب نکلتا ہے اور ایمان کی کہوں تو اس مضمون سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں کہ انھوں نے کے عشق کیے اور کس کس سے۔ عشق

میں ان پر جو گذرتی تھی وہ میرے لیے زیادہ اہم بات ہے۔ ان کے وجود کا ایک رخ شعر تھا تو ایک رخ عشق بھی تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے کمک پہنچتی تھی۔ سید انشا سے وہ اس لیے بھی دل ہی دل میں الجھتے تھے کہ ان کے کلام میں معشوق کا جلوہ انھیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

''عجیب شخص ہے،'' ایک دن وہ مشاعرے سے کچھ تاؤ کھائے ہوئے سے آئے اور دروازے میں داخل ہوتے ہی بولے۔ ''پتا نہیں کیوں اسے نہ ہاتھ پاؤں منھ دکھائی دیتے ہیں، نہ دل دکھائی دیتا ہے۔ حد یہ ہے کہ وہ خود کو بھی نہیں دیکھتا، صرف محفل کو دیکھتا رہتا ہے۔'' پھر انھوں نے سید انشا کی غزل کے شعر سنائے:

مانگا جو میں نے بوسہ ان سے چمن کے اندر
بولے کہ یاں نہیں چل مچھی بھون کے اندر
کیا گھات کی جگہ ہے چپے کی جھاڑ نیچے
مہندی کی ٹٹیوں کے اوجھل چمن کے اندر
بل بے ترا اکڑنا ہے ہاتھ میں طمنچہ
اور آ کے بیٹھنا یوں مجلس میں تن کے اندر

پھر وہ کہنے لگے، ''دیکھو کلام میں کیا زور ہے، کیا صفائی ہے۔ لیکن کیفیت، معنی، شورش، یہ سب نام کو نہیں۔ اس مرد آدمی نے دو غزلہ پڑھا تھا، بعض مضامین رنگیں بھی تھے لیکن زیادہ تر شعر ایسے ہی تھے، واہ واہ کی حد سے آگے نہ تھے۔''

یہ بحث میری استعداد سے اونچی تھی اس لیے میں کچھ نہ بولی۔ انھوں نے اپنی طرحی غزل کی شعر مجھے نہ سنائے اور نہ میں نے فرمائش کی جرأت کی لیکن بعد میں ان کی بیاض میں ڈھونڈا تو وہ غزل مل گئی۔ دو شعر آپ بھی سنیں، مطلع تھا:

تھا سرخ پوش کوئی شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو و سمن کے اندر
گورے بدن کا اس کے عالم میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا تھا پیرہن کے اندر

چھوٹی سی غزل تھی، لیکن ان شعروں کو انشا صاحب کی غزل کے سامنے رکھ کر دیکھا تو میں سمجھی کہ شیخ صاحب نے جو یہ کہا کہ انشا صاحب معشوق کو بھی نہ دیکھتے، محفل کو دیکھتے رہتے ہیں، تو اس کا کیا مطلب تھا۔ مجھے لگا کہ شیخ صاحب کی آنکھیں تو ساری عمر ہی معشوق کے نور کا جھمکڑا دیکھتی یا ڈھونڈتی رہی تھیں۔ فارسی عربی میں نہیں جانتی، ولی کا مجھے پتا نہیں، لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں کہ لکھنؤ کے شعرا میں، حتیٰ کہ خود میر تقی صاحب کے یہاں بھی میں نے ایسی تلاش اور ایسی دید نہ دیکھی:

اک بجلی کی کوند ہم نے دیکھی
اور لوگ کہیں ہیں وہ بدن تھا

ہر چند کہ تھا قابل دیدن بدن اس کا
پر آنکھ نہ ٹھہری جو کھلا پیرہن اس کا

کون آیا تھا نہانے لطفِ بدن سے جس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش ہو گیا ہے

برق کی طرح جلا خاک کیا مزرع دل
کر گئی ہم سے یہ دھانی تری پوشاک سلوک

سینہ صافوں سے خبر عالم علوی کی تو پوچھ
عرش و کرسی ہے یہاں عکس فگن آئینے میں

جمنا میں کل نہا کر اس نے جو بال باندھے
ہم نے بھی جی میں اپنے کیا کیا خیال باندھے

رنگینی بدن کا کروں کیا بیان کہ ہائے
اک تہہ گلابی سی ہے ترے پیرہن میں زور

شمع کو کیا اس سے نسبت ہے فروغ حُسن میں
یعنی ہے وہ نور کا شعلہ سراپا تن چراغ

مانند حبابِ لبِ جُو جسم کہاں ہے
اک روح ہے تو جامۂ نازک بدنی میں

کیا عجب ہرگز ترے حُسنِ سپید و سرخ سے
ہو گلابی پردۂ چشم تماشائی کا رنگ

جس وقت کہ دیکھا ہے کھلا یار کا سینہ
اے مصحفی ہم لطفِ سحر بھول گئے ہیں

محتاجِ عطر کب ہیں وہ پیراہن بتاں
جوشِ عرق سے جن کی مہکتی ہیں چولیاں

بکھری لٹوں میں اس کا یہ عالم ہے دل فریب
ہو جوں اساوریٔ میں کٹی مار کی شبیہ

لکھنا کمر کا اس کی علاقہ سریں کے ساتھ
اک مو سے کھینچنی ہے دو کہسار کی شبیہ

اتنے شعر ہیں کہ وہ پڑھیں اور سنا کرے کوئی اور یہ آخری شعر تو جب بھی مجھے یاد آتا ہے، میں شرم کے مارے منھ چھپا کر دوہری ہو ہو جاتی ہوں، لیکن مسکرائے بغیر بھی نہیں بنتی۔

آپ پوچھتے ہیں کوئی تو ہوگی جس نے ان کا دل دکھایا ہوگا۔ کوئی تو ہوگی جس پر ان کا جادو نہ چلا ہوگا۔ تو سچ بات یہ ہے کہ مجھے نہیں پتا اور سچ بات یہ بھی ہے کہ مجھے یہ کرید ہوتی ہی کیوں۔ ایک دو رباعیوں میں کسی مخفی کا نام میں نے ضرور دیکھا۔ شیخ صاحب نے انھیں ''قصائی کی بیٹی'' کہا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے یہ مخفی بی بی ان

کے شاگرد سعادت یار خان رنگین کی شاگرد اور منظور نظر رہی ہوں۔ میں نے سنا ہے ایک زمانے میں رنگین صاحب کا دل جگر ایک قصائی کی بیٹی کے ہاتھوں قیمہ ہو رہا تھا۔ سارے لکھنؤ میں ان کے قصے تھے کہ ایک طرف تو قصائی کا باپ میاں رنگین کی تکابوٹی کرنے کے در پے تھا اور دوسری طرف بیٹی پر رنگین جیسے امیرزادے کباب ہو رہے تھے، یا ہو سکتا ہے ان مخفی بیگما پر شیخ صاحب ہی تیل ماش ہو رہے ہوں۔ مردوں کی باتیں مرد ہی جانیں۔

ایک اور تھیں جو ان کے ساتھ سوا ڈیڑھ سال رہیں۔ لیکن شیخ صاحب کی مفلسی انھیں بہت سالتی تھی، شیخ صاحب کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ آخر کسی کٹنی کے بہلاوے میں آ کر وہ حُسن جھلسی انھیں چھوڑ ہی گئی۔ ایک اور بھی تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ کوئی خادمہ یا مہری رہی ہو۔ میں نے اپنی بہشتن سے سنا کہ شیخ صاحب نے بدنامی کے خوف سے اس کا پیٹ گروایا۔ کس کی بدنامی، کیسی بدنامی؟ شیخ صاحب کو بدنامی کا ڈر کاہے کو ہوتا؟ خیر ہو گا۔ نہ جانے آپ مرد لوگوں کو ان معاملات کی کرید کیوں رہتی ہے۔

لو آپ کو پھر عصمت کی یاد ستانے لگی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں اس کا زمانہ وہ تھا جب میں ماں کے پیٹ میں بھی نہ آئی تھی۔ میں ان بازاری آبرو باختہ چھنالوں کے بارے میں کیا جانوں؟ ویسے تو محفلوں میں وہ ضرور ہی گانے بجانے والیوں کو دیکھتے ہوں گے۔ ان کے اشعار میں گنا اور گلو جیسے نام بھی میں نے سنے ہیں۔ لیکن وہ نظرے خوش گذرے کے قائل نہ تھے۔ وہ بدن کے معاملات میں بھی دل کے لگاؤ کو اہمیت دیتے تھے۔

آپ کہتے ہیں شیخ صاحب کے بعض بہت پرانے دوستوں کی زبان سے عصمت جہاں کا نام سنا گیا ہے کہ انھوں نے واقعی شیخ صاحب کو بہت تنگ کیا تھا۔ میں تو اتنا ہی جانتی ہوں جتنا شیخ صاحب نے مجھے از خود بتایا۔ ہوا یوں کہ ایک بار تپ کی تقریباً سرسامی کیفیت میں انھوں نے رباعی کا یہ مصرع پڑھا، پڑھا کیا، بس رک رک کر زیرِلب ادا کیا:

مر جاویں گے یوں ہی عصمت عصمت کرتے

اب مجھے کیا خبر یہ منہ چڑھی عصمت کون ہیں، الھڑپن کی گھبراہٹ میں میرے منہ سے نکلا، ''کہاں رہتی ہیں، بلوا دوں؟''

انھوں نے اچانک آنکھ کھول کر غور سے مجھے دیکھا۔ تھوڑی سرخی لی، پہ اتنی روشن آنکھیں کہ لگتا تھا بیمار ہی

نہیں ہیں۔ اشارے سے پانی مانگا۔ میں کٹورا بھر کر لائی، دھیرے دھیرے کر کے تین چار گھونٹ میں نے انھیں پلائے۔ اچنبھے کی بات یہ ہوئی کہ پانی پیتے ہی وہ سو گئے۔ میں گھبرائی کہ کہیں پانی کا کانٹا تو نہیں لگ گیا، لیکن کرتی کیا۔ اکیلی اور ناتجربہ کار۔ ایک آدھ بار انھیں ہلکے ہلکے جھنجھوڑا تو ان کی آنکھ پھر کھلی تو لیکن نیم وا ہی رہی۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ سب ٹھیک ہے۔ شام ہوتے ہوتے وہ جاگے تو تپ کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ میں ان کے پاس ہی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر میری ہتھیلی پر عجب اندازِ دلربائی سے انگلیاں پھیریں، جیسے کچھ لکھ رہے ہوں۔ پھر جو کچھ انھوں نے بتایا وہ انھیں کی زبان میں کہتی ہوں۔

۱۰

وہ بھی کیا دن تھے کہ بہر یک نگہ اے مصحفی
سالہا ڈھونڈا کیے دلّی میں ہم عصمت کا گھر

میرا دلّی میں شروع کا زمانہ تھا۔ تقدیر کی خوبی کہ فکرِ معاش اور یادِ رفتگاں کے ساتھ عشقِ بتاں کی علت وہاں بھی درپے آزار ہوگئی۔ میں کسی سے روٹھ کر امروہے سے آنولے کے لیے نکلا تھا۔ افسوس کہ آنولے کی صحبتوں کا چراغ سحر ہونے سے پہلے ہی گل ہوگیا۔

ذوالفقارالدولہ اور مراٹھوں کے دستِ تطاول نے مژہ برہم زدن میں اس سارے چمن کو تاراج کر دیا، روہیلوں نے پچاس برس جس کی آرائش اور تقطیع کی تھی۔ وہ مجلس بہشت آئین زمہریر سے سرد تر اور مرگھٹ سے ویران تر ہوگئی۔ میں وہاں سے اٹھا اور افتاں و خیزاں لکھنؤ پہنچا۔ مرزا سودا کی خدمت میں باریابی ہوئی تو دیکھا کہ انھیں سگانِ ابریشم پشم کی مشاطگی سے فرصت نہیں۔ ویسے بھی ان کا اور میرا جوڑ ہی کیا تھا۔ وہ چار دانگِ عالم کے مانے ہوئے استاد، امرا اور خود نواب وزیر کے پسندیدہ شاعر، مدح میں طاق، ہجو میں شہرۂ آفاق۔ عمر میں مجھ سے کوئی پینتالیس پچاس برس بڑے، ان کی مدتِ شعر گوئی میری اپنی عمر سے کوئی دو چنداں تھی۔ کچھ ہی

دن میں لکھنؤ سے اکتا کر میں نے شاہجہاں آباد کا رُخ کیا۔

امروہے کے کسی آہوئے سیہ چشم کی برہم زنی مژگاں لکھنؤ میں تو نیش زنی کرتی ہی تھی، دلّی میں بھی اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ کچھ اس بات کا غم بھی تھا کہ میں اس کے پاس سے چلا کیوں آیا۔ اس نے میری بے کاری کی جو کبھی تو وہ کوئی طعنہ نہ دیا، یہ اور بات کہ دل میں چور ہونے کے باعث مجھے وہ کلمۂ طعن خنجر سے بڑھ کر لگا۔

ان دنوں میری علمی استعداد کچھ نہ تھی۔ سارا لڑکپن، ساری جوانی میں نے گولیاں کھیلنے، کنکوے اڑانے اور محلے والیوں سے آنکھیں لڑانے کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔ لیکن جس لعلِ سخن ساز نے باتوں میں لگا کر زلفِ گرہ گیر کے ڈورے ڈال کر اس بار میرا رشتۂ دل صاف کاٹا تھا اور اب اپنی انگشتِ حنائی میں پیچ دے کر اسے جھولے جھلا رہی تھی، وہ چیزے دیگر تھا:

دل نذر کر چکے ہیں پری وش کے ہو سو ہو
اے مصحفی اب آگے مقدر ہے اور ہم

میرا تو جی چاہتا تھا ہر وقت اسے سامنے بٹھائے اس کا منھ دیکھتا رہوں، اور وہ گھر والوں کے ہاتھوں مجبور تھی۔ چوری چھپے کی ملاقاتوں میں جی کے ارمان کہاں نکلتے ہیں۔ ایک دن میں باتوں باتوں میں ٹوہ لینی چاہی کہ ہم شادی کیوں نہ کرلیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی، ''اور کھاؤ گے کیا، کھلاؤ گے کیا؟ خالی پیٹ کے چونچلے کب تک چلیں گے؟''

مجھے ایسا لگا جیسے زنبور نے ڈنک مار دیا ہو۔ ''تو کیا تمھارا جی نہیں چاہتا....؟'' میں پوری بات نہ کر سکا۔

''ہاں، چاہتا تو ہے،'' وہ ہر کلمے پر زور دے کر بولی۔ ''لیکن میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں۔ تم اگر کسی لائق ہوتے....''

''میں شاعر تو ہوں۔ ایک دن بڑا استاد بنوں گا۔ بڑے بڑے رئیس میرے شاگرد ہوں گے، دیکھ لینا۔''

وہ پھر ہنسی۔ ''تب آنا۔ تب دیکھیں گے۔''

میں اٹھا اور اٹھ کر چل دیا، وہ مجھے بلاتی رہی۔ ''ارے میں تو تمھیں چھیڑ رہی تھی، سنو تو سہی۔ تمھیں میری جان کی قسم۔'' لیکن مجھے زندگی میں پہلی بار غصہ آیا تھا اور ذلت محسوس ہوئی تھی۔ گھر میں مجھے روکنے والا

بھی کوئی نہ تھا۔ دو بھائی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے، تیسرا تارک الدنیا تھا۔ میں نے بھی امروہہ ترک کیا اور بھری دُنیا سے اکیلا نبرد آزما ہونے کو نکل کھڑا ہوا۔ لطف یہ کہ سامان نبرد کیا، سامانِ سفر بھی کچھ نہ تھا، بس یہ دلکش خودفریبی تھی کہ مجھے استاد الشعرا بننا ہے۔ کاش کہ میں مستقبل بیں ہوتا اور یہ شعر جو میں نے کوئی نصف صدی بعد کہے، انھیں اپنی سرنوشت میں لکھا دیکھ لیتا:

ہے شاعروں کی اب کے زمانے میں یہ معاش
پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے
خفت اٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

لیکن تب تو حوصلے بلند تھے اور مایوسی سرنگوں۔ لکھنؤ میں ناکامی بھی امید کی ریسماں کو قطع نہ کر سکی تھی، اور کچھ نہیں تو مشق سخن کے رنگ چوکھے ہو چلے تھے۔ لوگ مجھے مشاعروں میں بلاتے، میرے گھر کے مشاعرے میں اپنے شعر سنانے کے لیے آتے۔ ایک دن سید خواجہ میر صاحب کی ایک محفل میں ان کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ان کی صورت تو کچھ خاص نہ تھی لیکن پور پور، بوٹی بوٹی سے ڈومنی پن ٹپکتا تھا۔ ان کی نشست و برخاست، گردن کے خم، ڈھلکے ہوئے دوپٹے کو ہاتھوں سے درست کرنے کے طور، ہر چیز میں ایک ادا نکلتی تھی، اور ہر ادا پکار پکار کر کہتی تھی کہ ہم کلیجے میں کھبنے کے لیے بنے ہیں۔ تس پر جامہ زیبی تو اس قدر کہ بس گویا کپڑوں نے ان کا بدن پہن لیا تھا:

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای
در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ ای
آرام کردہ ای بہ نہاں خانۂ علم
خلقے بدیں گماں کہ بہ محفل نشستہ ای

میں ہمت مجتمع کر رہا تھا کہ اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے ان کا نام پوچھوں کہ کسی نے کہا، ''اچھا تو آج عصمت جہاں بھی قدم رنجہ فرما ہیں۔'' مجھے وہ نام اتنا اچھا لگا کہ جی چاہا اب ساری غزلیں اسے ہی ردیف بنا کر

لکھوں۔ زیور اور لباس کا سراپا تو میں نے وہیں کہنا شروع کر دیا:

کانوں میں جڑاؤ اس کے بالا ہو جیسے ستارہ دار ہالہ
بینی کی چمک جبیں پر ایسی جو ڈانک نہ ہو نگیں پر ایسی
نتھ ناک میں ہالۂ قمر تھی یا قلزم حسن کی بھنور تھی
کانوں میں وہ بالیاں طلائی کرتی تھیں ادا سے کج ادائی
الماسی کڑے کلائیوں میں حل کردہ قمر صفائیوں میں
ہاتھوں میں وہ پور پور چھلے تھے جن سے بخوں طپاں محلے
جگنو وہ گلے میں ماہ پارہ جوں ماہ کے پاس ہو ستارہ
جوڑا وہ برنگ زعفرانی ہو دیکھ جسے پری دوانی
پھر تس پہ وہ سینہ بند گلدوز جو دل سے فرشتے کے چنے سوز
پھر نیم تنہ وہ دام بلبل کاڑھے ہوئے جس میں سیکڑوں گل
پھر کفش وہ رشک ماہ و خورشید ہم پنجہ بہ تاج فرق جمشید

کس نے کیا پڑھا، خود میں نے کیا پڑھا، معلوم نہیں۔ بس میں ہر ہر بہانے سے انھیں دیکھتا رہا۔ گھر واپس آیا تو دوستوں شناساؤں سے ان کا حال پوچھا۔ لوگوں نے کہا، ''میاں غلام ہمدانی، بڑے خراب گھر میں تمھاری گوٹ اٹکی۔ یہ امرو ہہ نہ باشد۔ اس آستانے پر بار پانا ہے تو سونے کے بن کر آؤ، یہ مٹی کی ٹوکری وہاں نہ چلے گی۔'' لوگوں کی نصیحتوں پر مجھے شیخ ابو سعید ابی الخیر کی رباعی یاد آئی، کاش میں نے ان کی بات سن لی ہوتی:

پرسید ز من کسے کہ معشوق تو کیست
گفتم کہ فلاں کس است مقصود تو چیست
بنشست او ہائے ہائے بر من بگریست
کز دست چنیں کسے چساں خواہی زیست

لیکن مجھے دوں سی لگ گئی تھی۔ کسی کل چین نہ تھا۔ کئی مہینے کی کھوج کے بعد میں نے عصمت جہاں کے

گھر کا پتا تو لگا لیا تھا لیکن وہاں جانے کی ہمت نہ تھی۔ بقول میر تقی، شاہد پرستوں کا ہم پاس زر کہاں تھا۔ جی تھا کہ امڈا آتا تھا۔ یہ غزل انھیں وقتوں کی ہے:

آتی ہے یہی جی میں فریاد کروں روؤں
رونے ہی سے ٹک اپنا دل شاد کروں روؤں
اس واسطے فرقت میں جیتا مجھے رکھا ہے
یعنی میں تری صورت جب یاد کروں روؤں

کبھی کبھی اس کی طرف جا نکلتا تو دیکھتا امرا کی سواریاں ایک سے ایک آراستہ پیراستہ گلی کے دورویہ لگی ہیں، اور مجھ جیسے قلاش تماش بینوں کو عصمت جہاں کے شیدی اور تلنگے ڈنڈے مار مار بھگا رہے ہیں۔ میں چپ چاپ بدن چرائے سر جھکائے نکل جاتا۔ آخر ایک دن دیدار ہو ہی گیا، اگر اس کو دیدار کہیں کہ میں نے اسے دور سے دیکھا اور اس کو میرے وجود سے خبر بھی نہ ہوئی:

کیا اس کی چشم مست کی دیتا نہ کچھ بھی داد
ہوتا جو کوئی مردم ہشیار درمیاں

میری خوش بختی یہ کہ اس کے شیدیوں میں ایک جو سب سے بڑھ کر جلاد صفت تھا، اس دن صدر دروازے پر نہ تھا، ورنہ اس گلی کا کتا کسی کے استخوان توڑتا نہ توڑتا، وہ کم بخت سدا اسی کام میں لطف لیتا تھا۔ خیر، میں گلی کے دوسری جانب ایک تنبولن سے جھوٹ موٹ کی چہلیں کر رہا تھا کہ ایک ذرا غل سا ہوا۔ معلوم ہوا افراسیاب خان بہادر نے خاص اپنی سواری کی رتھ بھیجی ہے، عصمت جہاں کئی بار منائی کر چکی ہیں لیکن آج تشریف لے جاویں گی۔ میں نے لپک کر گلی پار کی اور صدر دروازے سے بالکل متصل کھڑا ہو گیا۔ جب تک کہ دربان لاٹھی اٹھا کر مجھے وہاں سے کھسکائے وہ برآمد ہی تو ہو گئیں۔ اف وہ بدن اس قدر لطیف کہ ٹپکا پڑتا تھا، وہ زلف اس قدر سرکش کہ اس کے ہاتھوں سے اڑی جاتی تھی:

ز تری خواست اندامش چکیدن
ز بازی زلفش از دستش پریدن

زندہ بلند اقبال کی خوشبو کا لطیف، بہت لطیف نفس مجھ تک پہنچا تو میں بیہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میاں جرأت کے شعر کا مطلب اس وقت سمجھ میں آیا:

کہاں ہے گل میں صفائی ترے بدن کی سی
بھری سہاگ کی تس پر یہ بو دلھن کی سی

میں نے جھک کر سلام کیا۔ ایک نگاہِ غلط انداز تھی، خدا جانے میرے لیے یا کسی اور دریوزہ گرِ حسن کے لیے۔ میں تو سر جھکا کر ہی خوش تھا:

نیاز آرد کسے کہ عشق باز است
کہ عشق از بے نیازاں بے نیاز است
نہ سازد عاشقی با سرفرازی
کہ بازی بر نہ تابد عشق بازی

یقین ہے کہ وہ میرے وجود سے بے خبر رہیں لیکن میرے دل میں بھڑکتے ہوئے ہوس اور شوق کے شعلوں کی گرمی شاید انھیں ضرور ہی پہنچی ہو۔ مجھے یارائے نگاہ تو تھا نہیں، یارائے گفتگو کہاں سے ہوتا۔ اس کے بعد کئی بار ایسا ہوا کہ حویلی میں آتے جاتے میں انھیں دیکھ کر دل خوش کر لیتا۔ دیکھنے سے تسلی کیا ہوتی، بس سمندِ شوق کو ایک اور مہمیز لگ جاتی۔ کبھی کبھی شعرا کی محفل آراستہ ہوتی تو میں خیال وخواب کے قلعے تعمیر کرتا کہ مجھے بھی بلایا جائے گا لیکن وہاں تو:

در بزمِ او کسم بہ بدی ہم نہ برد نام
ہر چند گوش در پسِ دیوار داشتم

والا رنگ تھا۔ میں نے اتنی ٹوہ لگائی تھی کہ عصمت جہاں کسی کی پابند نہیں، لیکن کسی سے ان کی ملاطفت بھی نہیں۔ سب یہی کہتے کہ میاں اس کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر وہ تم کو سر پر بٹھائے گی بھی تو صرف اس لیے کہ اس طرح بالاخانے کے چھجے سے تمھیں نیچے پھینکنے میں آسانی ہوگی اور یہاں امیدواری کی یہ محویت کہ جب بھی انھیں دور سے دیکھتا اور ان کی بے توجہی کا تیر دل پر کھاتا تو دل یہی کہتا کہ صبر کر، شاید آئندہ ان کی

آنکھ تجھ پر پڑ ہی جائے:

آں بے مروتی کہ تو ہر روز می کنی
خود را دہم فریب کہ فردا نمی کند

اور آخر ایک بار سامنا ہو ہی گیا، آنکھیں چار ہونے کی نوبت آ گئی۔ چھڑیوں کا میلہ تھا، میں بھی آشفتگیٔ دل سے تنگ آ کر، اور اس امید کے ساتھ میلے کو چلا کہ شاید وہ دکھائی دے جائیں اور اس بار سرحرف وا کرنے کا موقع ملے۔ میر محمد تقی خوب کہتے ہیں:

وا اس سے سر حرف ہو ہر چند کہ سر جائے
ہم حلق بریدہ ہی سے تقریر کریں گے

اور ہوا بھی کچھ ایسا ہی۔ وہ ایک گل فروش کی دکان پر اپنی رتھ رکوا کر گجرے خرید رہی تھی کہ ادھر سے میں آ نکلا۔ خوف اور رعب اور امید کی ایک لہر بجلی کی طرح میرے دل سے میری کمر تک دوڑ گی۔ لگا میں آج ہی سن بلوغ کو پہنچا ہوں۔ قریب سے دیدار اور گھل مل کر گفتار اور شوق کے بے تکلف اظہار کی ہوس مجھ پر کچھ اس طرح چھا گئی جیسے کوئی بھیگی لکڑی دیر سے سلگ رہی ہو، دھواں دے رہی ہو، اور اچانک بھڑک اٹھے۔

قبا کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو شکرِ ایزدی بجالایا کہ کچھ رقم نکل آئی جس سے میں گلدستہ نہیں تو دستنبو تو خرید کر اس دربار میں گذران سکتا تھا۔ جلد پیسہ پھینک کر مال اٹھایا، رتھ کے پاس پہنچا تو وہ پردہ گرانے ہی والی تھیں۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر سلام کیا، پھول پیش کیا۔ سلام کا جواب ایک خفیف سی چین جبین اور ہاتھ کے ہلکے سے اشارے سے ملا۔ دستنبو رتھ بان کے پیچھے بیٹھی ہوئی خادمہ کے ہاتھ میں گیا۔ یہی رتھ بان کو آگے بڑھنے کا اشارہ بھی تھا، ہائے میں کیا کروں کہا جاؤں۔ رتھ چلنے ہی والی تھی۔ میں نے تہذیب اور احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور ہاتھ باندھ کر بآوازِ بلند، اور بڑے لحن سے مولانا جمالی کا شعر پڑھا:

ما را بہ خاک کویت پیراہن یست بر تن
آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

تیر نشانے پر بیٹھا، ہونٹوں پر خفیف ولطیف مسکراہٹ آئی گو کہ آنکھوں تک نہ پہنچی۔ انھوں نے جھک کر

خادمہ سے کچھ سرگوشی کی۔ خادمہ نے میری طرف کالی بھونرا سی آنکھیں اٹھائیں اور بولی:

''بی بی جی فرماتی ہیں، آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ لیکن اس وقت یہاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ کبھی حویلی پر قدم رنجہ فرمائیں۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہوتے رتھ آگے بڑھ گئی، لیکن میرے قدم تو آسمان پر بادلوں کے ساتھ تھے۔ گھر کا سارا راستہ میں نے ہنستے، مسکراتے، راہ چلتے بچوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے، گنگناتے گذارا:

خوش آں زمانہ کہ نکویاں کنند غارت شہر
مرا تو گیری و گوئی کہ ایں اسیر منست

اگلے دن کی صبح ہوئی تو نشے کچھ اترے، فکریں دامن گیر ہوئیں۔ کس طرح جاؤں، کیا لے کے جاؤں، کوئی غزل، رباعی کہہ کر پیش کروں، کپڑے کیا پہنوں؟ سوچتے سوچتے سوجھی کہ حکیم میر قدرت اللہ قاسم سے پوچھوں۔ وہ میرے کرم فرما بھی ہیں اور صاحب تجربہ بھی۔ ان کی رائے صائب ہوگی۔ حکیم صاحب سے یک گونہ بے تکلفی بھی تھی، کہ میں اور حکیم صاحب دونوں مرشدنا وسندنا حضرت مولانا فخر الدین صاحب قدس سرہ العزیز کے حلقہ بگوشوں میں تھے۔ علاوہ بریں، مولوی نور احمد اور حکیم ثناء اللہ فراق کی بھی دوستی ہم دونوں میں قدرِ مشترک کا حکم رکھتی تھی۔ پھر خیال کو عمل میں لانے میں کیا دیر تھی۔ حکیم صاحب کا دولت کدہ میرے گھر کے پاس ہی چیلوں کے کوچے میں تھا۔ میں بات کی بات میں وہاں جا پہنچا۔

حکیم صاحب کی ایک بات تو دل خوش کن تھی اور ایک بات دل خراش۔ انھوں نے فرمایا:

''میاں مصحفی، وہاں جانا تو کچھ مشکل نہیں۔ میں خود تمھیں لے چلوں گا۔ لیکن عصمت جہاں کے یہاں تمھاری دال گلنی ممکن نہیں۔ وہ صرف دولت کی بندی ہے، اور دولت مندوں کو بھی وہ انگلیوں پر نچاتی ہے۔ یہ تو شاہدانِ بازاری کا شیوہ ہی ہے۔ لیکن اس کی نس نس میں بے وفائی اور بے مروتی بھری ہوئی ہے۔''

ان کی بات پر مجھے کچھ زیادہ یقین نہ آیا۔ ''کیوں آخر ایسی خاص وجہ کیا ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا ایک مختصر سا فسانہ ہے،'' حکیم صاحب بولے۔ ''مدرسۂ غازی الدین خاں کے ایک نوجوان مولوی تھے، خیر الدین نام کے۔ نہ جانے کیوں اور کیسے عصمت جہاں ان پر مائل ہوگئیں۔ مولوی صاحب کا بھی میلان بظاہر عصمت کی طرف تھا۔ لیکن کچھ ایسا الجھاؤ پڑا کہ ان کا نخل امید سرسبز نہ ہوسکا۔ تب سے

عصمت جہاں نے جو رنگ بدلا تو قتالۂ عاشقانِ جہاں بن بیٹھیں۔ اب وہ ہر دولت مند کو کچھ دن منھ لگاتی ہیں پھر دھتا بتا دیتی ہیں۔''

''اللہ اللہ۔ اور وہ مولوی بچارہ؟''

''بس وہ خانہ نشین ہو گیا، عصمت تخلص رکھ کر شعر کہتا ہے۔''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ میرے پاس وفورِ شوق اور اٹھتی جوانی کے جوش سوا کیا تھا جو عصمت جہاں مجھ پر التفات کرتیں۔ صورت شکل میری ان دنوں بہت اچھی ضرور تھی، لیکن دلی میں ان دنوں ارمن سے لے کر خطا و ختن تک کے گبھرو موجود تھے۔ خاص کر ان کرغیزیوں کا کیا کہنا تھا جو ابدالی کے ساتھ آئے اور یہیں رہ پڑے تھے۔ لمبے تڑنگے، ہاتھ پاؤں ایسے گویا شاہ بلوط کا ٹہنا۔ فولادی صندوق سا سینہ، بادام کی سی نوک دار اور عقاب کی سی، سوئی سے بھی زیادہ تیز بھوری آنکھیں۔ پھر دولت ان کے پاس فراواں۔ مجھے کون چارہ ڈالتا اور مجھے کون پوچھتا کہ بھیا کیستی۔

''کہو کس سوچ میں پڑ گئے میاں صاحب؟'' حکیم صاحب نے میرے خیالات میں دخل اندازی کی۔ ''جو ہو گا، ہو گا۔ کل میں تمھیں اس کے یہاں لے چلوں گا۔ پھر دیکھیں گے۔''

اگلے دن میں اپنے حسابوں لباسِ فاخرہ پہن کر چلنے کو تیار ہوا۔ حکیم صاحب نے مجھے دو نیم اشرفیاں شاہ عالمی بطور قرض عطا کیں کہ وہاں پیش کر دیجو۔ ہم ہوادار پر بیٹھے۔ حکیم صاحب تمام راستہ لوگوں کے سلام لیتے اور دوست آشناؤں کی مزاج پرسی کرتے چلے۔ عصمت جہاں کی حویلی پر اس وقت بھی سواریوں کا ہجوم تھا۔ میرا دشمن جانی وہ شیدی حکیم صاحب کے لیے پشہ کاہ سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا اور ہم اندر تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اندر زینے طے کر کے بالائی منزل پر ایک اور محافظ خانہ تھا۔ وہاں ترکنوں اور حبشنوں کی عمل داری تھی۔ انھوں نے بس اشارہ کیا کہ زینوں کے ادھر اتر جایئے۔

ہم زینوں سے اترے تو ایک وسیع و عریض صحن سامنے تھا۔ ہرا بھرا سبزہ زار، نارنگی اور لیموں، فالسے اور کھرنی، کروندے اور آموں کے چھوٹے چھوٹے پیڑ۔ رات کی رانی اور چمپا اور چاندنی کی جھاڑیاں۔ بیچ صحن میں مہتابی، مہتابی کے چاروں طرف نہر بہتی ہوئی۔ نہر کے دو رویہ رنگین فوارے۔ کچھ درختوں پر باریک جالی مڑھی ہوئی، اتنی باریک کہ بہ یک نظر دکھائی نہ دے۔ ان جالی مڑھے پیڑوں میں بلا مبالغہ ہزاروں سرخ

رنگ کے لاہوری لال، ہرے رنگ کے بھوپالی لال، صندلی رنگ کے بنگالی لال اس قدر انہماک سے چہچہاتے ہوئے کہ سارا آنگن گونج رہا تھا۔ اس میں لقا اور نقاب پوش اور ریشم پرے کبوتروں کی غٹرغوں جو سارے آنگن میں آزاد گھومتے تھے۔ ایک ملازمہ پیچھے پیچھے ان کی بیٹ اور چونچ سے گرے ہوئے تنکے اٹھاتی ہوئی۔

صحن کے پرلی طرف پر سفید جھکا جھک کرتی ہوئی بارہ دری، بارہ دری کی چھت پر آنگن جس میں مور اور سنہرے رنگ کے لمبی دم والے کچھ پرندے ٹہلتے ہوئے، جنھیں میں پہچان نہ سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ چینی تیتر ہیں اور ملک چین میں صرف بادشاہ اور امرا انھیں پالنے کے مجاز ہیں۔ [وہ غالباً Chinese Golden Pheasant تھے، مرتب]

آنگن کے ایک کونے میں ایک مرصع پردہ پڑا ہوا دروازہ تھا، اس کے پیچھے کمرہ۔ میں ہونقوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ حکیم صاحب نے مجھے ہلکے سے اندرونِ کمرہ کے کوائف پر متوجہ کیا۔

کمرہ کیا تھا پورا دیوانِ عام تھا۔ بس فرق یہ کہ لوگ جگہ جگہ قالینوں پر کھڑے نہ تھے، بیٹھے تھے۔ حقے اور پان کا دور تھا۔ ایک طرف سپڑدے اور سپڑدائیاں سازوں کی درستی میں مصروف۔ صدر میں مسند خالی تھی، لیکن پیچھے ایک خادمہ زرنگار پنکھا لیے کھڑی تھی۔ سارے میں عطر حنا کی لطیف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہوش بجا ہونے پر میں نے دیکھا کہ چھت کے چاروں کونوں پر جو فانوس تھے ان میں مہین مہین سوراخ تھے، اور اوپر کہیں سے کسی آلے کے ذریعے ان سوراخوں سے پانی اور عطر حنا کے لطیف آمیزے کی پھوار وقفے وقفے سے برسائی جاتی تھی۔ میرا تو وہ حال تھا جو الف لیلہ میں ابوالحسن کا نہ ہوا ہوگا۔ اس پر یہ مایوسی اور یہ غم کہ ایسے آستانے پر تو مجھے جبہ سائی بھی نصیب نہ ہوگی، تا بہ وصل و وصال چہ رسد۔

میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کمرے کے جس سرے پر مسند تھی اور جہاں خادمہ مروحہ جنباں تھی، اس کا پردہ ہٹا اور عصمت جہاں اندر داخل ہوئیں۔ سب کو چھوڑ کر ان کی نگاہ حکیم صاحب ہی پر پڑی۔ وہ ایک دو قدم ان کی طرف استقبال کو بڑھیں اور بولیں:

''تسلیمات عرض کرتی ہوں۔ اللہ حکیم صاحب، آپ نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا۔''

''ایسا تو نہیں عصمت بیگم، لیکن دُنیا ہے، کام لگے ہی رہتے ہیں۔ ورنہ تم سے ملنے کو کس کا جی نہ چاہے گا۔'' حکیم صاحب آگے بڑھتے بڑھتے بالکل ان کے ہم بغل کھڑے ہو گئے تھے اور میں بھی ان کے دامن

سے لگا کچھ دبکا سا کھڑا تھا۔ مجھے انھوں نے دیکھا، لیکن معرفی چاہنے کی کوئی بات نہ کی۔ میں تو ان کی آواز میں گم تھا، گویا کسی اونچی جگہ ہوا میں ہچکولے کھا رہا ہوں۔ ایسی سدھی ہوئی، تھکی ہوئی لیکن سریلی آواز کیا کسی شاما کی ہوگی۔ سب زیر و بم بے حد سنبھل کر ادا ہو رہے تھے، لہجے میں خفیف سی خیر مقدمی مسکراہٹ لہریں لے رہی تھی، لیکن اس میں بے تکلفی کی دعوت نہ تھی۔ ہر چیز ایک فاصلے پر تھی۔

''اور یہ میرے دوست شیخ غلام ہمدانی ہیں۔ امروہے سے آئے ہیں، اچھے شاعر ہیں۔ مصحفی تخلص کرتے ہیں۔ تمھارے درِ دولت تک رسائی کے مشتاق تھے۔''

''بہت خوب۔'' اب ان کے لہجے میں گرم جوشی کا نام نہ تھا۔ انھوں نے مجھے نظر بھر کر دیکھا نہ اس بات کی ہوا لگنے دی کہ کل ہی کی بات ہے، انھوں نے مجھے حاضری کا حکم دیا تھا۔ میں نے جھک کر سلام کیا تو انھوں نے ''آداب گذارش کرتی ہوں، تشریف رکھیے،'' کہا۔ اس اثنا خادمہ پان پھول الائچی کی کشتی لے کر آگے آ گئی تھی۔ میں نے ایک گلوری اٹھائی اور دونوں نیم اشرفیاں آہستہ سے کشتی میں دھر دیں۔ حکیم صاحب نے بھی کچھ ہدیہ پیش کیا، لیکن میں اسے دیکھ نہ سکا۔

سب لوگوں کو سلام کر کے اور ان کے سلام لے کر عصمت جہاں مسند پر آئیں۔ جب تانپورا سدھ گیا تو انھوں نے خسرو کی غزل سے محفل کا آغاز کیا:

مسلماناں برفت از دستِ من دل
چو دیدم آنچناں شکل و شمائل
زہے صانع خدا کز لطف بنگاشت
ازینساں صورتے از آب و از گل
نہ باشد چوں جمالت مجلس افروز
اگر خورشید بنشیند بہ محفل

اب میری حماقت مآبی دیکھیے کہ میں سمجھا یہ غزل خاص کر کے میرے لیے گائی جا رہی ہے۔ آواز اور فن دونوں عروج پر تھے ہی، حق یہ ہے کہ غزل سرائی داد سے مستغنی تھی۔ لیکن میں ان اشعار کا مخاطب خود کو سمجھ کر خوش ہو رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر عصمت جہاں کو داد دے رہا تھا۔

محفل ختم ہوئی اور سب چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیوان خانہ خالی ہونے لگا۔ میں اور حکیم صاحب بھی اٹھے، لیکن میرا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے جاؤں۔ کیا خبر انھیں مجھ سے کوئی بات کہنی ہو، یا مجھے روک کر کچھ مزے مزے کی باتیں کریں۔ زیادہ تر لوگ اپنی اپنی جوتیاں خادماؤں کے ہاتھ سے پہن کر باہر جا چکے تھے، باقی دروازے کی طرف رواں تھے۔ حکیم صاحب میری وجہ سے بادلِ ناخواستہ ٹھہرے رہے، لیکن کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہے تھے، گویا اشارہ کر رہے ہوں کہ اب چلو۔ جب عصمت جہاں نے انھیں دوبارہ تسلیمات کہی تو حکیم صاحب سے نہ رہا گیا، میری کہنی پر سختی سے ہاتھ رکھ کر انھوں نے مجھے گویا باہر کی طرف دھکیلا۔ عصمت جہاں اندر جانے کے لیے مڑیں، اور اسی وقت ایک سوداگر بچہ، جو سر سے پاؤں تک الماس و مروارید میں غرق تھا اور جس کی شخصیت سے دولت کی سخت مہک آ رہی تھی، ان کے ساتھ ساتھ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ بات ظاہر تھی کہ انھیں کے یہاں شب باش ہوگا۔

مجھ پر ایک طرف تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا، اور دوسری طرف ایسی آگ لگی کہ محسوس ہوا میرے کپڑے سب ابھی اسی وقت جل اٹھیں گے۔ توبہ، یہ بے حیائی اور یہ بے مروتی! کاش کہ زمین پھٹ جاتی اور میں یہیں اس میں سما جاتا۔ لیکن دیوان خانے میں اب صرف نوکر رہ گئے تھے۔ میں بھی ہڑبڑا کر حکیم صاحب کے ساتھ باہر نکلا۔ راستے بھر وہ اپنے خیالات میں گم رہے اور میں اندر ہی اندر جوش کھاتا رہا:

جاں بر ہو کس طرح تب سودائے مصحفی
ہانڈی سا کھدبدائے ہے کچھ اس جواں کا مغز

والا حال تھا۔ حکیم صاحب کو میرے حال کی کچھ خبر ہو گئی ہو گی کہ مجھے گھر پہنچا کر ہوادار میں بیٹھتے ہوئے انھوں فرمایا: ''میاں مصحفی، راجہ چندر بھان برہمن کے ایک شعر کا لطف اٹھاؤ، کہتا ہے:

متاعِ حُسن ترا طرفہ روز بازار است
کہ کس نہ یافتہ و عالمے خریدار است

اچھا خدا حافظ، پرسوں مشاعرے میں تو آؤ گے؟''

میں نے بجھی ہوئی آواز میں ''جی ہاں'' کہا اور سلام کر کے اپنے حجرے کے اندر ہو گیا۔

حکیم صاحب کی نصیحت کیا خوب نصیحت تھی، لیکن ہائے میرزا جلال اسیر کس مقام سے کہتا ہے:

دل را چگونہ منع محنت کند کسے
گیرم کہ بشنود چہ نصیحت کند کسے

ان دنوں دل پر جو گذرتی تھی اسے میں نے ان شعروں میں ادا کیا تھا:

جو پری بھی روبرو ہو تو پری کو میں نہ دیکھوں
مری آنکھیں بند کر دو کہ کسی کو میں نہ دیکھوں
دل گرم خونِ الفت مرے بر میں رکھ دیا ہے
سوئے گل تو ملتفت ہوں جو کلی کو میں نہ دیکھوں
مرا دل لگا ہے جس میں مرا جی گیا ہے جس پر
مری کیوں کہ زندگی ہو جو اسی کو میں نہ دیکھوں
مری تجھ سے زندگی ہے تو مرا جگر ہے جی ہے
کسے دیکھ کر جیوں پھر جو تجھی کو میں نہ دیکھوں

میں نے تواتر سے وہاں جانا شروع کیا۔ اکثر تو باریابی ہی نہ ہوتی، اور جو ہوتی بھی تو محفل عام میں، اور محفل کے انجام پر وہی منظر سوئی کی طرح آنکھ میں چبھتا کہ کبھی کوئی امیر زادہ، کبھی کوئی سوداگر بچہ، کبھی کوئی مرانٹھا سردار، انھیں لے کر اندرون حویلی چلا جاتا۔ میں اپنی قلیل حیثیت کے مطابق تحفے تحائف بھی لے جاتا، لیکن ان کی نگاہ نہ مجھ پر کبھی ٹھہری نہ میرے حقیر تحائف پر۔ بہت ہوا تو کبھی کسی موقعے کے حسبِ حال فی البدیہہ شعر سنانے کا حکم ہوتا، اور وہ میرے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن شعروں کی داد بھی کبھی ٹھیک سے نہ ملی۔ ہر بار اگر نہیں تو ہر تیسرے چوتھے بے حیائی کے یہ کھیل دیکھتا اور ضرور قصد کرتا کہ اب نہ جاؤں گا۔ لیکن توبہ کیجیے کیسا ارادہ اور کہاں کی نیت، ہوتا وہی کہ جہاں ذرا سا موقع لگتا، میرے قدم بس ادھر ہی کو اٹھتے:

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی
ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر گیا

دو ڈھائی سال یہی لیل و نہار رہے۔ اس پوری مدت میں صرف ایک بار بوس و کنار کی لذت ملی اور وہ بھی یوں کہ بارہ دری کی سیڑھیاں اترنے میں خوش نصیبی سے میرا ان کا دو لمحے کے لیے تنہائی میں ساتھ ہو گیا تھا اور انھوں نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا تھا گویا ان کا بھی جی چاہ گیا ہو۔ اس تنگ مدت میں بھلا جی کے ارمان کیا نکالتا، ذرا سی دست درازی کی ہمت کی تھی کہ سختی سے میرا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔

لیکن آہ اس ذرا سے اختلاط کی لذت میرے دل نے ہزاروں بار تو اٹھائی ہوگی۔ دن رات اٹھتے بیٹھتے اسی لمحے کو بار بار دل میں دہراتا، طرح طرح سے حافظے میں تازہ کرتا۔ میں ان چند لمحوں کو توڑ کر اور بھی مختصر پلوں میں بانٹتا اور ہر پل کا الگ لطف لیتا۔ وہ ان لبوں کی نرم تازگی، اس بیاض گردن کی ٹھنڈی لطافت، میرے ہاتھ کے نیچے اس شانے کی لطیف گرمی، اس نرم لیکن سخت گات کی میری چھاتی پر چبھن، وہ میرے منھ کے نیچے ان کے ذرا سے وا ہوتے ہوئے ہونٹوں اور زبان کی تری کا شیریں فردوسی ذائقہ، وہ میرا ہاتھ ان کی چوٹی کو چھو کر نیچے کچھ تلاش کرتا ہوا اور اس کا جھٹک دیا جانا وہ پہلی بار نزدیکی کی گرمی اور لمس کی تھرتھری۔ میں نے اس ساری واردات کو، جو چار سیڑھیاں اترتے تمام ہو گئی تھی، دل میں اتنی بار دہرایا تھا کہ اس کی مدتِ وصل کی طویل ترین رات سے بھی طویل ہو گئی۔

یہ تو بعد کی باتیں تھیں، اس دن ان سب سے مستزاد تھا امید کی افزائش کا لطف، کہ اب تو راہ کھل گئی ہے، اب اس پر جہاں تک سفر ہو سکے گا، اپنی ہمت پر منحصر ہے۔ اس کی منزل آخر تو جنت کی بارہ دری ہی ہوگی۔

میں سب ضروری کام چھوڑ کر اگلے ہی دن وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ راجا جگل کشور کے صاحب زادے کنور مہندر کشور انھیں ابھی ابھی اپنے ساتھ لوا لے گئے۔

"کہاں، اور کیوں؟"

"کیوں سے تمھیں کیا مطلب ہے شیخ جی؟" ان کا شیدی دربان منھ بگاڑ کر بولا۔ "رہا سوال کہاں کا، تو قطب صاحب کے آگے کوئی جگہ ہے سلطان پور، وہاں کی جھیل میں بجرے کی سیر اور مرغابی کے شکار کی ٹھنی ہے۔"

"اور واپسی کب ہوگی؟"

"یہی کوئی پان سات دن لگ جاویں گے۔ امیروں کی باتیں امیروں ہی کو سہاویں۔ تم کاہے کو کرید میں پڑے ہو۔ چلو لمبے پڑو، اپنا راستہ ناپو۔"

میرے دل میں کس قدر غصہ تھا، کیا بتاؤں۔ بس یوں کہیں کہ پچھلے تمام ماہ و سال ان کے فسق و فجور اور بے شرمیوں کے تمام مناظر کے میزان کا حساب کر کر بھی اتنا غصہ نہ آتا جتنا اس وقت آیا۔ کمال بے غیرتی ہے کہ مجھ سے بوس و کنار کے بعد کسی کھتری بچے کو نواز نا پسند کیا۔ میں جلا بھنا اور تقریباً نم دیدہ گھر لوٹا۔ راستے ہی میں یہ رباعی ہوگئی:

ہے حیف تو یہ کہ با جمال چوں حور
عصمت اور ہووے مائلِ فسق و فجور
یہ وہ ہے مثل کہ مصحفی کہتے ہیں
برعکس نہند نام زنگی کافور

گھر پہنچا تو حکیم ثناء اللہ خاں فراق سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیے، کہ میری ملاقات کو آئے تھے۔ عصمت جہاں پر میری فریفتگی کی بات کوئی کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی، میں نے چھوٹتے ہی اپنی رباعی پڑھ دی۔ اب وہ بچارے گویم مشکل و گرنگویم مشکل میں پڑے کہ ایسی رباعی کی داد کیا دیں۔ پھر بھی، چوتھا مصرع اس برجستگی سے چسپاں ہوا تھا کہ انھیں داد دیے ہی بنی۔ میں نے غصے کی جھونجھل میں یہ بھی نہ خیال کیا کہ اس رباعی کو نشر کر کے میں اپنے لیے گڈھا کھود رہا ہوں اور حماقت بالائے حماقت یہ کہ اگلے دو چار دن میں جو بھی دوست مجھے ملا، میں نے اسے یہ رباعی سنائے بغیر نہ چھوڑا۔

ناعاقبت اندیشی اسے کہتے ہیں کہ میں یہ بھی فراموش کر گیا کہ اسی دہلی میں مجھ جیسے کتنے ہی اور تھے جو میری ہی طرح ناکامی کے باعث عصمت پر زہر کھائے ہوئے تھے۔ ان کی زبانی یہ میری رباعی خوب مشتہر ہوئی۔

کئی دن کے انتظار اور خبر گیری کے بعد مجھے ان کی مراجعت کی خبر ملی۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، وقتِ مقررہ پر ان کی حویلی پر جا پہنچا۔ اس دن محفل کچھ زیادہ ہی آراستہ تھی۔ شاید اسی لیے عصمت جہاں بھی وقت سے ذرا پہلے جلوہ افروز ہوئیں۔ کہاں تو ان کی آنکھ ہی مجھ پر نہ پڑتی تھیں، کہاں اب مجھے دیکھا تو فوراً بولیں:

''آئیے جناب شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی،'' انھوں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا کہ اس توجہ خاص کی تہہ میں دال میں صاف کچھ کالا نظر آرہا تھا۔ ''فرمایئے، آج کل شعر گوئی تو خوب چمکی ہوئی ہے؟''

میں سر جھکائے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر غور کر رہا تھا کہ وہ کس قدر بے ڈول لگ رہے تھے۔ سر جھکائے ہی جھکائے میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا، ''جی، سب کرم ہے آپ کا۔'' اب مجھے پورا پورا شک ہو گیا تھا کہ اس پرسش کا مدعا کیا ہے، لیکن نہ جائے رفتن تھی نہ پائے ماندن۔ دل ہی دل میں اپنی حماقت اور عجولی کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

''اور یہ رباعی جناب ہی کے کلامِ معجز نظام کا نمونہ ہے؟''

اب مجبوراً میں نے سر اٹھایا تو ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیکھا۔ رباعی کا کلمہ سنتے ہی میرا تو سارا لہو خشک ہو گیا تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا، آہستہ سے بولا، ''جی، میں سمجھا نہیں۔'' اب تک تو محفل کا ہر فرد بشر، کیا سازندے کیا تماش بین، کیا خادمائیں، حتیٰ کہ ان کی حبشی بلی بھی، مجھی پر متوجہ ہو چکے تھے۔ سب کی آنکھیں گویا مجھ پر گڑی ہوئی تھیں۔

''جی، یہ برعکس نہند نام زنگی کافور جناب کی ہی تصنیف لطیف ہے؟''

میں چپ رہا۔ اچانک انھوں نے ایک عجب ادائے قاتلانہ سے اس کاغذ کو پارہ پارہ کیا، پھر ان بے چارہ پرچہ ہائے بے قیمت کو پاؤں تلے رگڑتی ہوئی بولیں:

''اب آپ وہیں تشریف لے جائیں جہاں سے سر کے بھل رینگ کر نکلے تھے۔ اب میں پھر آپ کو یہاں نہ دیکھوں۔''

میری دُنیا اندھیری تو ہو ہی گئی تھی، لیکن اس وقت اس سے بھی زیادہ غم اس بے توقیری اور بے آبروئی کا تھا جو وہاں میرا مقدر بنی تھی اور پھر یہ کہ یہ معاملہ تدارک پذیر بھی نہ تھا۔ میں کہتا تو کیا کہتا، ایک لحہ یوں کھڑا رہا گویا میرے پاؤں میں جڑیں نکل آئی ہوں۔ اچانک میرے پیچھے کوئی کھانسا، بلکہ لگا کہ کھانسی کو ضبط کرنے کے لیے کسی نے دوپٹہ منھ میں ٹھونس لیا ہو۔ مجھے مڑ کر دیکھنے کا یارا نہ تھا، لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ کھانسی نہیں، ہنسی تھی جسے کوئی روکنے کی سعی کر رہا تھا۔

میں اس اندھے کی طرح مڑا جس کے ہاتھ کی لکڑی چھن گئی ہو۔ خدا کا شکر ہے دروازے تک بخیریت پہنچ گیا، کسی سے ٹکرایا نہیں۔ باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے پیچھے سے میری آستین کھینچی۔ میں چونک کر مڑا تو وہی بھونرا سی سیاہ آنکھوں والی خادمہ تھی۔

''بی بی جی نے فرمایا ہے کہ گلی کے دونوں سروں پر شیدی اور تلنگے آپ کو دیکھتے رہیں گے۔'' اس کا لہجہ

میں نہ پڑھ سکا کہ تاسف کا تھا یا ترحم کا لیکن پیغام بالکل صاف تھا، حویلی تو کیا، گلی بھی میرے لیے ارضِ ممنوع تھی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ اب کہنے کو رہا ہی کیا تھا۔

اس کے بعد میں کئی سال دلّی میں رہا لیکن عصمت جہاں کے دیدار سے آنکھیں پھر نہ روشن ہوئیں۔ اس واقعہ مفاجعہ کے کچھ دن تک میں نے مختلف ذرائع سے معافی نامے بھجوائے۔ کوئی جواب نہ ملا، گویا میرا وجود ان کی دیوار پر کوئی دھبا تھا جسے انھوں نے کھرچوا کر صاف کر دیا تھا۔ عصمت بہرحال میرے دل پر نقش کالحجر کی طرح تھیں۔ دن تو جوں توں گزر جاتا لیکن رات کو جتنی بار آنکھ کھلتی، اور آنکھ بارہا کھلتی، تو زبان پر عصمت کا ہی نام ہوتا۔ دن میں بھی ان کی یاد آنے اور میرے دل کا پیمانہ بھر آنے کے بہانے ہر دم ہی مہیا رہتے۔ مجھے اپنے تئیں بڑے زعم تھے۔ میرا کہنا تھا کہ بھلا ایسا کون سا غم ہوگا جو وقت کے بہاؤ کو دریائے خوں بنا ڈالے۔ مرد سب کچھ سہ جاتے ہیں۔ لیکن اب مجھے معلوم ہوا کہ عشق جب گل کھلاتا ہے تو چاروں کھونٹ آگ ہی لگتی ہے۔ مرزا رفیع نے کیا خوب کہا ہے:

داغ مت کھائیو تیں عشق کا ہم کہتے تھے
کیوں ولا کی ہے نہ اس گل نے بہار آخر کار

لیکن یہ بھی کب تک چلتا؟ رونے کی عادت پڑ جائے تو رونا گانا سب ایک ہو جاتے ہیں۔ یہی عشق کا سچ بھی ہے اور یہی عشق خود بہت بڑا جھوٹ بھی ہے۔ جب دل ہی پس جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا:

دیارِ فشار مرے دل کو عشق نے یاں تک
کہ اس میں خون تو کیا رنگ آرزو نہ رہا

۱۱

’’آپ نے سید انشا اور حضرت شیخ کے اختلافات کا کچھ ذکر نہ کیا،‘‘ میں نے ایک دن باتوں باتوں میں پوچھا۔

''میں کیا ذکر کرتی، ان دنوں میں ان کے ساتھ نہ تھی۔ جو کچھ ہوا وہ باتیں شیخ صاحب کے مزاج کے بہت خلاف تھیں اور میرا خیال ہے سید انشا بھی انھیں اپنے لیے کچھ بہت موجب مباہات نہ جانتے تھے۔''

''لیکن دونوں میں باقاعدہ میل تو نہ ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میل نہ ہوا تو دشمنی بھی نہ رہی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں حضور وزیر الممالک آصف الدولہ عدن مقام نے شیخ صاحب کی فریاد پر ان کی دادرسی کی اور انشا صاحب کو شہر بدر کر دیا تھا۔ وہ تو اس واقعے پر کچھ ہی زمانہ گذرا تھا کہ حضور وزیر الممالک کو مولا نے اٹھالیا۔ انشا صاحب پھر ہنسی خوشی لکھنؤ آ کر رہ بس گئے۔''

''ملاقاتیں تو ہوتی ہوں ہی گی؟ ساتھ ساتھ مشاعرے بھی پڑھتے ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری دانست میں تو کبھی کوئی خاص موقع ملاقات یا ساتھ رہنے کا نہ آیا۔ ہاں انشا صاحب اور مرزا قتیل صاحب کی یاد میں شیخ صاحب نے ایک مقطع ضرور کہا تھا:

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگ قتیل و مردن انشا مجھے''

''حضرت شیخ اور سید انشا صاحب میں بنائے مخاصمت کیا ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔ ''آپ تو کہتی ہیں حضرت شیخ کی ذات ایسی من موہنی تھی کہ وہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے؟''

وہ کچھ شرما کر مسکرائیں۔ ''ہر ایک تو میں نہیں کہتی، لیکن معشوقوں پر ضرور ان کا نقش بہت جلد چڑھتا تھا۔''

میں ان کی شرماہٹ کا لحاظ کر کے ایک لحظہ چپ رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بات کا سلسلہ کس طرح جاری رکھوں، کہ زمین پر نگاہ جمائے جمائے وہ خود ہی بولیں، ''مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوا کہ شیخ صاحب کے دل میں مرزا قتیل کے لیے زیادہ جگہ ہے، سید انشا صاحب کے لیے کم اور یہ بات تو ہے ہی کہ شیخ صاحب سارے لکھنؤ میں مرزا قتیل کے سوا کسی کو اپنا حریف نہ گردانتے تھے۔ ان کا شعر ہے:

اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں
مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

کہنے کو تو انشا صاحب اور قتیل صاحب میں بھی بہت خلا ملا تھا، لیکن وہ قتیل کو خود سے کمتر سمجھتے تھے۔ ممکن ہے انھیں یہ بات بری لگی ہو کہ شیخ صاحب ان کے مقابلے میں قتیل کو ترجیح دیتے ہیں۔ ویسے، میں نے ظفر الدولہ بہادر کے یہاں کسی کو کہتے سنا تھا کہ سید انشا میں ہزار خوبیاں ہیں، لاکھ لیاقتیں ہیں، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ہر شخص ہر وقت ان کے گن گاتا پھرے۔" وہ مسکرائیں۔ "انھیں کا تو مصرع ہے، میری طرف تو دیکھیے میں نازنین سہی۔"

"گویا سید مبرور کے دل میں کہیں چور تھا،" میں نے کہا۔

"چور تو میں کیسے کہوں، لیکن ہو سکتا ہے ان کا مزاج ایسا رہا ہو کہ وہ لوگوں کو بہت جلد اپنا مخالف سمجھ لیتے ہوں۔ مجھے تفصیل تو نہیں معلوم، لیکن شاید دلّی میں بھی انشا صاحب کے ساتھ ایسا کچھ معاملہ گذرا تھا۔"

"جی ہاں، ایک واقعہ ہوا تو تھا لیکن مرزا صاحب مغفور اور حضرت شیخ کی دوستی زیادہ گہری شاید مزاجوں کی موافقت کی بنا پر بھی تھی،" میں نے کہا۔ "اور یوں بھی ہے کہ جب حضرت شیخ دوسری بار لکھنؤ تشریف لائے اور دوبارہ بددل ہو کر یہاں سے جانے لگے تو مرزا قتیل نے حضرت شیخ کی ہر طرح امداد اور دلجوئی کی اور انھیں لکھنؤ چھوڑنے سے روکا۔"

"جی، درست ہے۔ باہم دگر ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک قصیدے کے عنوان میں شیخ صاحب نے مرزا صاحب کو اپنا معشوق کہا ہے،" وہ بولیں، "لیکن یہ بھی حق کی بات ہے کہ آپ کے والد صاحب نے بھی ان دنوں شیخ صاحب کی بہت خدمت کی۔ سعادت مند شاگرد ہو تو کانجی مل صبا یا رائے ٹیکارام تسلی جیسا ہو۔"

"حضرت شیخ نے بھی تو رائے ٹیکارام کی مدح میں قصیدہ لکھ کر اور میرے والد مرحوم کا محبت آمیز احوال اپنے تذکرے میں درج کر کے انھیں ثباتِ دوام بخش دیا۔"

"لال میاں یہ آپ کی سعادت مندی ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر کس باپ کے بیٹے ہیں۔"

"آپ مجھے شرمندہ فرماتی ہیں۔" اب میرے سر جھکانے اور شرمندہ ہونے کی باری تھی۔ "میں نے آپ کی جو کچھ شمہ برابر خدمت کی وہ اس فیض کا عشر عشیر نہیں جو مجھے آپ کی ملازمت سے حاصل ہوتا رہتا ہے۔"

وہ سر جھکا کر چپ ہو گئیں۔ میری بھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب اصل موضوعِ سخن پر کس طرح مراجع ہوں، کہ راجا میاں بول اٹھے، "میاں صاحب، پان دوبارہ حاضر کروں؟"

مجھے سلسلۂ گفتگو دوبارہ قائم کرنے کا یہ اچھا موقع ملا۔ میں نے کہا، ''پان تو نہیں، لیکن پانی پلوا دو تو لطف رہے۔ پر بیٹا، ذرا ٹھنڈا پانی ہو۔''

''ابھی لیجیے جناب،'' کہہ کر وہ پلک جھپکتے جالی سے ڈھکے ہوئے تھالی جوڑ گلاس میں پانی لے آیا۔ پانی پیتے پیتے میں نے استانی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا،'' آپ کو حضرت شیخ کا وہ شعر یاد ہوگا، پانی کی مناسبت سے مجھے ابھی یاد آیا، وہی اختلافاتِ دین وملت کے مضمون والا، شاید آخری کسی دیوان میں ہے۔''

واللہ، حضرت استاد کے شعر انھیں خوب ہی یاد تھے۔ میرا جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ وہ معاً بول اٹھیں،''جی، ساتویں دیوان میں فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:

اختلافاتِ مذاہب نے صفا سب کھو دی
گرچہ صد ظرف میں تھا بر لبِ جو پانی ایک''

''سبحان اللہ،'' بے ساختہ میرے منھ سے نکلا،'' آپ حضرت شیخ ہی کی نہیں ان کے کلام کی بھی عاشق تھیں۔''

ان کا منھ کان کی لوؤں تک سرخ ہو گیا۔ اس وقت ان کی صورت اتنی بھلی لگ رہی تھی کہ کیا بتاؤں۔ لیکن مجھے یہ احساس ہوا کہ میں حد سے بڑھ گیا ہوں۔ میں نے فوراً بات کا رخ بدل دیا،''تو آپ کی رائے میں حضرت شیخ کی طبیعت میں کینہ اور کھوٹ بالکل نہ تھا اور وہ کسی سے خفا بھی ہوتے تو محض وقتی طور پر خفا ہوتے تھے۔''

''میرا ان کا ساتھ جتنا رہا اس کی بنا پر تو میں یہی کہتی ہوں،'' انھوں نے ذرا رک کر جواب دیا۔

''لیکن حق یہ ہے کہ وہ شروع ہی سے بالکل صاف باطن تھے۔ شعر کہنے اور شعر پڑھنے کے سوا انھیں معاملاتِ دُنیا سے کوئی غرض نہ تھی۔ جناب امیر المومنین کی خدمت میں ان کا جوانی کا قصیدہ ہے، اس میں فرماتے ہیں:

میں مدح کروں اپنی تو کچھ غم نہیں اس کا
پر مجھ سے کبھی ہجو نہ کہوائے طبیعت
کس واسطے یہ شیوہ ہے مذموم اکابر
ہوتا ہے سخن موجب ایذائے طبیعت''

''گستاخی معاف، کبھی آپ پر تو خفا ہوئے ہوں گے؟'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سچ بات یہ ہے کہ شاذ ہی ایسا لفظ ہوا۔ لحظہ دو لحظہ کی خفگی کی بات اور ہے، لیکن ایک بار وہ مجھ سے دو تین پہر خفا رہے تھے۔'' وہ ذرا سا مسکرائیں، لیکن اس بار تبسم کچھ محجوب سا تھا۔

''ارے واللہ۔'' میں نے ذرا اشتیاق سے کہا۔ ''بھلا کب اور کہاں....''

انھوں نے میری بات پوری ہونے نہ دی۔ ''کبھی اور وہ قصہ سناؤں گی۔ اس وقت مگر یہ بتا ہی دوں کہ ایک ذات ایسی تھی جس سے انھیں دائمی پرخاش رہی۔''

''اے لیجیے،'' میں پھر ذرا بے تکلف ہو کر بولا، ''کون تھے وہ ذات شریف اور اب تک ان کا ذکر آپ چھپائے کیوں رہیں؟''

وہ پھر ہنسیں، لیکن اس بار اس میں ایک لطیف سی شوخی تھی۔ ''کوئی ذات شریف نہیں، صرف ایک ذات تھی، فرنگیوں کی ذات۔ میری دانست میں تو انھیں تا زندگی فرنگیوں سے نفرت رہی۔''

''اچھا، کیوں؟ کیا اس کے پیچھے کوئی خاص بات تھی؟ ان کے زمانے کے لوگ تو فرنگیوں سے کچھ زیادہ سروکار رکھتے نہ تھے؟''

''نہیں، سروکار تو ان لوگوں کا کچھ نہ تھا۔'' ان کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔ ''اور اگر خاص بات سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ کبھی کسی موئی لچنی افرنگن یا لال کُرتی والی پر مائل ہوئے اور مطلب برآری میں ناکام ہوئے، تو ایسی بھی کوئی بات میرے علم میں نہیں۔''

''معافی کا خواستگار ہوں،'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''حاشا یہ میرا مطلب نہ تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ شاید کبھی کسی فرنگی شاگرد سے انھیں تکلیف پہنچی ہو....''

''فرنگیوں سے وہ دور دور ہی رہتے تھے۔'' انھوں نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ ''اور فرنگیوں کی صورت انھیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ ان کی صورت کو بے نمک اور پھیکی قرار دیتے تھے۔ ان کا شعر ہے:

مجھ کو اتنا بے نمک بھی حسن بھاتا ہی نہیں
کیا کہوں پھیکا ہے کیسا قوم عیسائی کا رنگ''

مجھے بھی اچانک ایک شعر یاد آ گیا، ان کی بات کو کم و بیش کاٹتے ہوئے میں بول اٹھا، کہ کہیں شعر نہ

بھول جاؤں، یا وہ بات بھول جاؤں جسے پوچھنا مقصود تھا۔''واہ، سبحان اللہ، خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ آپ نے حضرت استاد کے ایک شعر کے بارے میں میری ایک مشکل تو چٹکی بجاتے حل کر دی۔''

''جی میں سمجھی نہیں۔''

''جی، شعر ملاحظہ ہو:

ہے یہ فلک سفلہ وہ پھیکا سا فرنگی
رکھتا ہے مہ وخور سے جو پاس اپنے دو بسکٹ''

'''پھیکا سا فرنگی' تو آپ کے اقبال سے اب سمجھ میں آ گیا، لیکن یہ 'دو بسکٹ' کیا شے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ عجب انداز سے ہنسیں، جیسے کوئی بڑی بہن چہیتے چھوٹے بھائی کے بھولے پن پر ہنسے، یا جیسے کوئی مہربان خاتون.... لاحول ولاقوۃ، میرا ذہن کدھر بہک گیا۔ انھوں نے فرمایا:

''صاحب کو کیا فرنگی کھانوں کا کچھ ذوق نہیں رہا؟''

''جی نہیں، فرنگی کھانے کہاں اور ہم کہاں، اور ہاں میرے ایک انگریزی داں دوست کے پاس شیکسپیر صاحب کا لغت بھی ہے جس میں لغات ریختہ کے معنی بزبان انگلیسی درج ہیں۔ اس میں بھی یہ لفظ نہ ملا۔''

''ارے میاں، انھیں انگریزی ٹکیاں سمجھیے، کچھ نمکین ہوتی ہیں تو بعض میٹھی۔ فرنگیوں کے کارخانوں میں ہزاروں کی تعداد میں بنتی ہیں اور لوہے کے ڈبوں میں بھر کر صاحبانِ انگلستان کے کھانے کے لیے ولایت سے آتی ہیں۔ ان میں نہ گھی نہ زیرہ نہ سونف نہ میدہ نہ زعفران، ہاں ایک لطیف سی بھینی بھینی خوشبو ضرور ہوتی ہے جو کسی ولایتی پھول سے بنتی ہے۔ زیادہ ٹھہرتیں نہیں، بہت جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ کھانے میں یہ ٹکیاں کرکری اور بھربھری ہوتی ہیں۔ کھایئے تو کٹ کٹ کی آواز نکلتی ہے، شاید اسی لیے انھیں بسکٹ کہا جاتا ہے۔''

''تو کیا آپ کو یا حضرت شیخ کو ان کا ذوق تھا؟''

''اللہ، توبہ کیجیے صاحب۔ وہ تو یوں ہوا کہ اعلیٰ حضرت شاہ زمن [غازی الدین حیدر، مرتب] کے کچھ انگریز مصاحبوں نے انگریزی کھانوں کی ایک دکان دلکشا میں کھولی تو وہاں یہ ٹکیاں بھی دستیاب تھیں۔ ایک دن شیخ صاحب ایک ڈبہ میرے لیے بھی لائے تھے۔ جیسے صاحبانِ ولایت بے رنگ ویسے ہی ان کے کھانے

بھی بے رنگ۔ شہر میں نکلیں تو نہ چلیں، ہاں یہ لفظ چل گئی۔''

''اچھا، حضرت شیخ کی طبیعت انگریزوں سے شاید اس لیے بھی ابا کرتی ہوگی کہ وہ علاقہ روہیل کھنڈ کے تھے،'' میں نے کچھ سوچ کر کہا، ''اور اس علاقے کے رؤسا اور رعایا دونوں کو فرنگی تدبیروں کے چلتے انھوں نے کٹتے مرتے بہت دیکھا تھا۔''

''ہاں یہ ممکن تو ہے،'' انھوں نے 'ہاں' کو ذرا کھینچ کر ادا کیا۔ ''انھیں یہ خیال تو خیر تھا ہی کہ یہاں کی دولت، اور خاص کر اہل حرفہ کی حرفت و صنعت، سب انگریزوں کے کٹے چڑھ رہی ہے یا ان کی تدبیریں ایسی ہیں کہ ملک ہند سارے کا سارا ان کے جال میں پھنس رہا ہے۔ ان کے شعر ہیں:

افسوس کہ لی چھین نصاریٰ کے سگوں نے
یوں ہاتھ سے اس فرقۂ اسلام کی روٹی

ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ بھی تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

مالک الملک نصاریٰ ہوئے کلکتہ لے
یہ تو نکلی عجب اک وضع کی جنجال کی کھال

توڑ جوڑ آوے ہے کیا خوب نصاریٰ کی تئیں
فوج دشمن سے وہیں لیتے ہیں سردار کو توڑ

تب جانوں میں کہ دین محمدؐ کے ہیں حریف
جب روز حشر ہو رخ اہل فرنگ سرخ

دیکھیے ایسے شعر تو وہی کہے گا جس کے دل کو لگی ہو۔''

''ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن حضرت شیخ نے ایک آدھ جگہ فرنگیوں کا ذکر شاید ذرا نرم لہجے میں بھی تو کیا ہے؟''

"بے شک کیا ہوگا۔ لیکن ایسے شعروں میں بھی لہجہ اگر غور سے دیکھیں تو تمسخر کا ہے۔ بھلا اس طرح کے شعروں کو توصیفی کون کہے گا، سنیے:

اے مصحفی لیلام میں کل ہم بھی گئے تھے
کر آئے ہیں اک طرفہ فرنگن کا نظارہ
زخم شمشیر نگہ حیف کہ اچھا نہ ہوا
کرنے کو اس کی دوا ڈاکٹر انگریز آیا

ان شعروں میں توصیف سے زیادہ طنز و تعریض کے پہلو ہیں۔" انھوں نے منھ بنا کر کہا، "بھلا کون شریف زادے اور شریف زادیاں اپنے گھروں کے سامان لیلام میں خریدتی یا بیچتی ہیں؟"

مجھے ایک دو شعر ایسے یاد آرہے تھے جن میں "گوروں" کے رنگ کا ذکر صاف توصیف کے لہجے میں تھا، لیکن میں نے سکوت بہتر جان کر ایک اور پہلو سے بات بڑھائی۔ "تو گویا فرنگیوں کے تئیں حضرت استاد کا طرز سید انشا جیسا نہ تھا۔"

"میں سید انشا صاحب کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" وہ کچھ ذرا بے دلی سے بولیں۔ "شاید آپ ٹھیک کہتے ہوں۔"

"میرا مطلب یہ ہے کہ سید موصوف کی طبیعت میں جو ہنسوڑ پن تھا اس کی جھلک صاحبانِ عالیشان کے بارے میں ان کی باتوں میں ملتی ہے۔ بیلی صاحب ریزیڈنٹ تھے اور ان کے میر منشی علی نقی خاں جب صاحب ریزیڈنٹ کے ساتھ دربار سے رخصت ہوتے تو سید انشا بڑے متین لہجے میں بآوازِ بلند کہتے: میر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔"

"ہوگا۔" وہ ذرا اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔ "میں نے میر منشی صاحب کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔"

مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ تھک سی گئی ہیں، یا شاید سید انشا کا ذکر انھیں کچھ خاص بھایا نہیں۔ میں نے کہا، "اب اجازت چاہتا ہوں، لیکن پہلے وہ واقعہ سنا دیں جب حضرت شیخ آپ سے پہر دو پہر ناراض رہے تھے۔ میری اس عرض کو گستاخ پر محمول نہ لیں۔ میں...."

انھوں نے پہلی بار میرا قطع سخن کیا۔ "نہیں، گستاخی کی کوئی بات نہیں، لیکن کبھی اور سہی۔ آج کے لیے

معافی کی درخواست قبول کریں۔'' ان کا چہرہ خدا معلوم کیوں کچھ اترا ہوا سا لگ رہا تھا۔

میں نے جھک کر آداب کیا۔ محمد راجا مجھے گلی کے نکڑ تک چھوڑنے آیا۔ میں نے اسے ایک روپیہ انعام دیا اور گھر کے لیے سوار ہو گیا۔

۱۲

مجھے اس بات کو جاننے کی لو لگی ہوئی تھی جس کی بنا پر حضرت شیخ کو اتنی خفگی ہوئی کہ وہ بھورا بیگم سے پہروں ناراض رہے۔ لہٰذا دوسرے ہی دن سب ضروری کام چھوڑ کر میں گندہ نالہ جا پہنچا۔ لیکن راہ میں مجھے خیال آیا وہ خدا جانے کوئی بہت پردے والی بات رہی ہو اور بھورا بیگم اسے ظاہر کرنا پسند نہ کریں۔ کل ان کے چہرے پر ہلکا سا تناؤ شاید اسی باعث تو نہ تھا کہ میں ان باتوں کی کرید کر رہا تھا جنھیں وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہوں؟ اور پھر حضرت شیخ کے بارے میں بہت سے سوال میرے ذہن میں اور تھے، پہلے وہی سب پوچھ لوں، پھر دیکھا جائے گا۔

یہ باتیں سوچ کر جب میں نے ان کے دروازے پر دستک دی تو جواب ملنے میں خلافِ معمول دیر ہوئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں نامطبوع بات نہ واقع ہو گئی ہو۔ بارے راجا میاں نے دروازہ کھولا تو پتا لگا کہ ''باجی بیگم کا جی کل رات سے کچھ ماندہ ہے، لیکن آپ اندر چلے چلیے۔ آپ سے تو کوئی تکلف نہیں۔''

میں اندر گیا تو وہ چادر اوڑھے کمرے سے باہر آئیں۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور بڑی بڑی آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ میرے ہزار پوچھنے پر انھوں نے اتنا ہی بتایا کہ رات ٹھیک سے نیند نہ آئی تھی۔ میں نے تفصیل پوچھی تو ہر بار ٹال گئیں، لیکن میں نے واپس جانا چاہا تو انھوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے اپنا ہاتھ پیڑو اور پشت کمر پر لے جاتی ہیں اور بار بار ہلکے سے دباتی ہیں، گویا وہاں درد ہو۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ وہ کہیں کپڑوں سے نہ ہوں۔ ہر چند کہ ان کی عمر کی عورتوں کو ایامِ یاس عارض ہو جاتے ہیں، لیکن یا تو ان کے ساتھ ابھی ایسا نہ ہوا تھا، یا میں نے شروع میں ان کی عمر کا اندازہ جو لگایا تھا وہ درست نہ تھا اور وہ اپنی اصل عمر سے زیادہ کی لگتی تھیں۔ بناؤ سنگار سے انھیں کوئی ربط نہ تھا،

یا کم سے کم اب نہ تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی ان کی عمر اصل سے زیادہ لگتی ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں گڑبڑا کر اٹھا اور بولا کہ آج اجازت دیجیے، پھر کبھی حاضر ہوں گا۔

''نہیں نہیں لال میاں صاحب، بیٹھیے تو سہی،'' وہ بولیں۔ ''راجا حقہ تازہ کر رہا ہے، پھر چاہ بنائے گا۔ میں نے آپ کے لیے رکاب گنج سے چاہ منگوائی ہے۔''

''اچھا، چاہ کا آپ کو شوق کب سے ہوا؟'' میرے منھ سے نکلا، پھر میں دل ہی دل میں شرمندہ ہوا کہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

ان کے سوکھے ہوئے چہرے پر زندگی کی ہلکی سی رمق آئی۔ ''شیخ صاحب کبھی کبھی میرے لیے لایا کرتے تھے۔ وہ خود تو قہوہ پیتے تھے، لیکن فرماتے تھے کہ.... کہ دردوں کے لیے چاہ بہت مفید ہے،'' انھوں نے جملہ ذرا ہڑبڑاہٹ میں ختم کیا۔

''دردوں'' کی لفظ سن کے میں بھی ذرا محجوب سا ہوا، اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ ان کے ایامِ گل کے بارے میں شاید میرا اندازہ درست تھا۔ لیکن اچانک ان کے چہرے پر ہلکی سی شگفتگی دکھائی دی تو میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا۔

''چاہ کے بارے میں آپ کو ایک لطیفے کی بات بتاؤں،'' وہ بولیں۔

''بہت خوب، ماشاء اللہ۔ ارشاد ہو۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے 'چاہ' کو 'چائے' بھی کہتے ہیں، اور عربی میں اسے 'صائے' کہتے ہیں؟''

''جی نہیں، میں نے اس لفظ اور اس شے کی کبھی تحقیق نہیں کی۔''

''شیخ صاحب کے پاس طب کی ایک پرانی کتاب تھی، قرابادین معصومی سا کچھ اس کا نام تھا۔ اس کے اخیر میں بہت سے خالی ورقوں پر کتاب کے کسی پچھلے مالک نے کئی نسخے، ٹوٹکے اور مفردات کے صفات لکھ رکھے تھے۔ ایک ورق پر چاہ کے بارے میں لکھا تھا کہ ملکِ خطا میں کوئی لڑکی تھی۔ وہ نچلے دھڑ سے مفلوج تھی اور اس کی زبان لکنت کرتی تھی۔ ایک دن وہ یوں ہی بستر پر پڑی تھی کہ اچانک ایک کوا آیا اور اس کے بستر پر چند سبز پتیاں گرا کر چلا گیا۔ ایسا کئی بار ہوا۔''

''بڑی اعجوبہ بات ہے، سبحان اللہ۔''

''ابھی اصل بات تو آپ نے سنی ہی نہیں۔ لڑکی نے یوں ہی پان سات پتیاں اٹھا کر منھ میں ڈال لیں

اور ان کو چبایا تو بالکل نیا ذائقہ لگا، کچھ کسیلا تو کچھ بنفشہ و عناب جیسا۔ دھیرے دھیرے وہ ایک دو کے سوا ساری پتیاں چبا گئی۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ چند گھڑی میں اسے اپنے پنڈے میں طاقت محسوس ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی اور اس کی لکنت بھی جاتی رہی۔''

''ارے واللہ، کرتار کے بھی کھیل نرالے ہیں۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ خیر، تو پھر اس لڑکی کے والد اور بھائیوں نے اس کوے کا گھونسلا ڈھونڈ نکالا، اور کوے کا پیچھا کرتے ہوئے وہ ایک جنگل تک پہنچے جہاں بے شمار جھاڑیوں میں وہی پتیاں اگ رہی تھیں۔ اس بوٹی کا نام تو انھیں معلوم نہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے اسے 'چائے' کہہ دیا، کہ زبانِ خطا میں 'کوے' کو 'چائے' کہتے ہیں۔''

''واللہ عجب بے نظیر قصہ ہے۔ بالکل گل بکاولی یا بدر منیر جیسا محیر العقول'' میں نے کہا۔

''اب حقیقت جو بھی ہو، لیکن یہ تو ہے کہ شیخ صاحب جب میری ضرورت دیکھتے تو چاہ پینے کی تلقین کرتے تھے۔''

''تو حضرت دادا استاد آپ کی ہر چیز کا خیال رکھتے تھے.... تنگیٔ حالات اس میں مانع نہ آتی تھی۔''

''وہ غریب یا مفلس تو نہ تھے، لیکن میں نے انھیں صحیح معنی میں خوش حال کبھی نہ دیکھا۔ خوشامد سے انھیں نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اصلاً تو سب انسان برابر ہیں، خاص کر اس زمانے میں، جب اولیا ہیں نہ پیغمبر نہ امام، اور میں بھی اپنی جگہ اپنی اقلیم کا مالک ہوں۔ پھر کسی کی خوشامد کیوں کروں؟''

اتنے میں چاہ بن کر آ گئی تھی۔ یہ وہ چاہ تھی جسے لکھنؤ میں 'کشمیری چاء' کہتے تھے، خدا معلوم کیوں، یا شاید اس وجہ سے کہ صاحبانِ انگریز کی چاہ کے برخلاف اس میں دودھ، شکر، اور بعض مسالے بھی پڑتے تھے۔

''راجا میاں مجھے بھی ذری سی چاہ دے دینا'' کہتے ہوئے وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں، ''اور وہ سخی بھی بہت تھے۔ کسی نے کچھ مانگا تو حسبِ مقدور اس کو دیا ضرور۔ میں ان کی اس خصلت سے عاجز بھی ہوتی، لیکن وہ یہی کہتے کہ بھورا بیگم دینے والے ہی کو ملتا ہے۔''

''دادا استاد کے آخری برسوں کا کلام مگر کچھ بہت نہیں۔ کیا ایسا تو نہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنا کلام بیچتے تھے....''

میں نے ان کے چہرے کا رنگ بدلتے ہوئے دیکھا اور مجھے خیال آیا کہ میں نے پھر غلط بات کہہ دی۔ بھورا بیگم صاحب کو تو بس طرارہ آ گیا۔ چادر انھوں نے بدن سے الگ اتار پھینکی، دوپٹے کا بھی ہوش نہ تھا کہ ٹھیک سے سنبھالیں۔ ''جن لوگوں نے منھ سے ایسے کلام نکالے مولا کرے گا تو قبر میں ان کو دو مونہی رسی ہی ڈسے گی۔ بڑے آئے کمبخت کہنے والے کہ ان کا آخری وقتوں کا کلام سارا ایک گیا....''

''میں معافی چاہتا ہوں استانی صاحب،'' میں نے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑے اور کہا، ''میری ایسی کوئی منشا نہ تھی۔ میں تو صرف ایک بازاری بات کا ذکر کر رہا تھا۔''

''جی بھاڑ میں جائیں ایسے بازاری لوطی کمبخت،'' وہ چہرہ اور آنسو پونچھتی ہوئی بولیں۔ ''سنیے صاحب، انھوں نے سید انشا والے واقعے کے بعد دو چار برس گوشہ نشینی ضرور اختیار کر لی، لیکن اپنی طبیعت کو کہاں لے جاتے؟ انھوں نے اسی زمانے میں اپنا دوسرا تذکرۂ شعرا مکمل کیا، نظیری کے جواب میں پورا دیوانِ فارسی لکھا، ایک اور دیوانِ فارسی جو پہلے سے زیرِ ترتیب تھا، اسے مکمل کیا۔ ہندی کا چوتھا اور پانچواں، دونوں دیوان اسی زمانے کے ہیں۔ ایک نثر کی کتاب فارسی میں 'مجمع الفوائد' نام کی لکھی۔ مضمون تو ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ انھیں شعروں کی کیا کمی تھی۔''

'مجمع الفوائد' کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہوئے یہ کتاب تو آج تک شاید کسی نے بھی نہ دیکھی تھی۔

''یہ 'مجمع الفوائد' کیا کوئی پند و نصائح کی کتاب ہے؟'' میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔ لیکن انھوں نے سنی اَن سنی کر دی۔

''وہ بڑے مروت والے شخص تھے۔ وہ ریجھ پچاؤ نہ تھے اور نہ ہی اپنی پسند ناپسند ظاہر کرنے میں انھیں کوئی تکلف تھا۔ چھوٹوں کی مرضی اور خوشی کا خیال جیسا وہ رکھتے تھے، کیا کسی اور استاد نے رکھا ہوگا،'' وہ ذرا گرم لہجے میں بولیں۔ ''اگر کسی شاگرد یا حاضر باش نے ان کا کوئی شعر پسند کیا، یا کسی غزل کی دل کھول کر ثنا کی تو وہ بے تکلف وہ شعر، بلکہ ساری غزل اس کی نذر کر دیتے تھے۔''

وہ سانس لینے کو ذرا رکیں تو میں نے کہا، ''بے شک، میرے حضرت کی سخاوت تو ضرب المثل ہے۔'' لیکن وہ یوں بے تکان بولتی چلی گئیں گویا میں موجود ہی نہیں ہوں، اور وہ کسی وقائع نویس کو اظہار لکھا رہی ہوں۔

''اور لوگوں کو اپنے اشعار سے اس درجہ محبت ہوتی ہے کہ وہ انھیں اپنی اولادِ معنوی کہتے ہیں۔ ایسے

لوگ اپنے شعروں کو یوں سینے سے لگائے رہتے ہیں جیسے بندریا اپنے مردہ بچے کو چمٹائے چمٹائے گھومتی ہے اوران کا یہ عالم کہ ان کا کلام گویا ستر خوان تھا اور ساری دُنیا ان کی مہمان۔ اب اگر کوئی قدردان یا شاگرد ایسے میں اظہارِ تشکر کے طور پر ایک دو روپے ان کے قدموں میں رکھ دیتا تو کیا یہ شعر بیچنا ہوا؟ کیا شاگردوں پر استاد کا اتنا بھی حق نہیں؟''

''کیوں نہیں، بے شک اس سے بھی زیادہ حق ہے۔''

''تو پھر یہ شعر بیچنے کی بات کہاں سے اڑادی آپ لوگوں نے....؟''

''میں نے نہیں، حاشا وکلا میں نے ایسی کوئی بات خود سے نہیں کہی۔ میں تو بس سنی سنائی عرض کر رہا تھا،'' میں نے ہاتھ ملتے ہوئے سر جھکا کر کہا،''شرمندہ ہوں کہ ایسی بات زبان پر لایا ہی کیوں۔''

اب ان کا طرارہ کچھ کم ہونے لگا تھا۔ کچھ لحظہ خاموش رہ کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولیں، ''صاحب، آپ میرے بچوں کی طرح ہیں۔ عمر میں نہ سہی لیکن رشتہ تو وہی ہے۔ آپ کے دادا استاد تو وہ شخص تھے کہ مانگنے والے کو تن کے کپڑے اتار کر بخش دیتے۔ اشعار کی کیا بات ہے، شعر تو وہ جب جتنے چاہتے کہہ لیتے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا:

ہے مصحفی وہ شخص جو آوے اسے ٹوٹا
تنخواہ میں نوکر کو یہ دیوان لگا دے''

''سبحان اللہ، کیا مضمون ہے اور کیا زورِ کلام!''

اب وہ ذرا اور نرم پڑیں۔ '''مجمع الفوائد' میں انھوں نے اپنے خاندان کے قدیمی حالات اور اپنے افکار وسوانح بیان کیے ہیں۔ جس زمانے میں وہ یہ کتاب لکھ رہے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے ایک غزل کہی جس کے بعض شعروں پر میں نے کچھ الٹی سیدھی بات کہہ دی تھی....''

یقیناً یہ وہی واقعہ رہا ہوگا جس پر حضرت شیخ کو ان سے خفگی ہوئی تھی، میں نے اپنے دل میں کہا۔ لیکن پوچھوں تو کیسے۔ آج تو میں انھیں کئی جنم کی ناراضی کا سامان پہلے ہی مہیا کر چکا ہوں۔ میں نے چپ ہی رہنے میں عافیت جانی۔ ایک دو لمحہ بعد وہ خود ہی بولیں۔ ''شیخ صاحب کے مذہبی عقائد کا میں تذکرہ کر ہی چکی ہوں....''

''جی،'' میں نے دلچسپی کا کوئی پُرجوش اظہار کیے بغیر عام سے لہجے میں کہا، کہ انھیں یہ گمان نہ ہو کہ میں کسی خاص چیز کے تجسس میں ہوں۔

''کبھی کبھی وہ مجھ سے کہتے، بھورا بیگم، انسان سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں گھبرا کر کہتی کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ اللہ، نبی، امامت، قیامت، قرآن، کعبہ، یہ سب کچھ نہیں؟ تو وہ کہتے، بیگم صاحب، میں کسی شرعی نقطۂ نظر سے نہیں، عام انسانی نقطۂ نظر سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ انسان کو آخر اشرف المخلوقات کسی وجہ سے ہی تو کہا گیا تھا؟ میں کہتی کہ یہ باریکیاں آپ امام اور مجتہد لوگوں کے لیے چھوڑ دیں۔ ہمیں ان باتوں سے کیا لینا دینا۔ وہ ہنس کر چپ ہو جاتے۔''

میں ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ بیچ میں لقمہ دینے کی بھی ہمت نہ تھی کہ خدا معلوم کیا بات ان کی کیفیت کو متغیر کر دے۔

''گرمی کے دن تھے، نیند نہ انھیں ٹھیک سے آ رہی تھی نہ مجھے۔ مچھروں اور کھٹملوں کی افراط، ہوا بند، اور ہمارا چھوٹا سا گھر۔ میں انھیں پنکھا جھلتی تو وہ پنکھا میرے ہاتھ سے لے کر مجھے جھلنے لگتے۔ گرمی سے تنگ آ کر میں نے دوپٹہ الگ کر دیا تھا اور صرف اونچی چولی کا شلوکہ ململ کا اور ڈھیلا سوسی کا پائجامہ پہنے لیٹی تھی۔ پائجامے کے بھی پائینچے میں نے تھوڑے بہت اٹھا رکھے تھے۔ ایک بار انھوں نے پنکھا ذرا زور سے ہلایا تو میرا ایک پائینچہ ذرا اور اٹھ گیا۔ بس فی البدیہہ انھوں نے مطلع پڑھ ہی تو دیا:

شب پیشِ نظر حُسن کا بازار تو رکھا
کھٹمل کا میں ممنون ہوں کہ بیدار تو رکھا

''چلیے ہٹیے، میں نے تنک کر منھ پھیرتے ہوئے کہا۔ آپ کو تو ہر وقت ہر مضمون پر شعر ہی سوجھتے ہیں۔ یہاں گرمی کے مارے جان جا رہی ہے.... میں نے کروٹ لے کر سونے کی کوشش کی، اور خدا معلوم کب مجھے نیند آ بھی گئی۔ لیکن جب جب آنکھ کھلتی تو چراغ کو روشن اور شیخ صاحب کو لکھتا ہوا دیکھتی۔ وہی موئی کھٹمل والی غزل پوری کر رہے ہوں گے، میں نے دل میں کہا۔

''صبح ہوتے ہوتے مجھے اچھی نیند آ گئی۔ فجر کی نماز بھی قضا ہوتے ہوتے رہ گئی۔ شیخ صاحب اب بے خبر سو رہے تھے، ان کے جاگنے کا وقت بھی ابھی نہ تھا۔ وہ کاغذ جس پر وہ رات غزل لکھ رہے تھے، ان کے

تکیے کے نیچے سے جھانک رہا تھا۔ وہ مجھے اپنا کلام اکثر خود ہی سناتے، یا پڑھنے کے لیے دے دیتے تھے، لہٰذا میں نے آہستہ سے، اس طرح کہ ان کی نیند نہ اچٹے، وہ کاغذ ان کے سرہانے سے کھینچ لیا۔

''لمبی غزل تھی، تقریباً دوغزلے کے برابر، لیکن زمین وہ نہ تھی جس میں انھوں نے رات مطلع کہا تھا۔''

وہ ایک لمحہ چپ رہیں، گویا اس صبح کی باتیں یاد کر رہی ہوں۔ پھر انھوں نے محمد راجا کو آواز دی کہ میرے پلنگ کے نیچے جو صندوقچہ رکھا ہے اسے اٹھالا۔ راجا میاں نے صندوقچہ لا حاضر کیا تو انھوں نے اس میں ٹٹول کر کچھ پارینہ کاغذ نکالے۔

''اٹھارہ شعر کی غزل تھی۔ اس میں سات شعروں کا قطعہ تھا جسے پڑھ کر میری تو جان ہی نکل گئی۔''

انھوں نے پڑھنا شروع کیا۔ آواز میں خفیف سی لرزش اور مضامین اشعار کے ناپسندیدہ ہونے کا تاثر تھا:

یک شب جو اشک سے بھی میں آگے نکل گیا
اس جستجو میں دیکھوں تو ہے لامکاں کہاں
ناگہ سروش غیب نے یہ دی مجھے ندا
آتا ہے یاں بھٹکتا ہوا اے جواں کہاں
میں نے کہا میں خانۂ صناع خلق کو
دُنیا میں ڈھونڈتا نہ پھرا تھا کہاں کہاں
آخر پتا ملا تھا مجھے بر فرازِ عرش
پر دل کہے تھا مجھ سے تو پہنچا وہاں کہاں
ہمت دلیل بن کے لے آئی تو ہے مگر
بتلاویں تو یہ بات ہے اس کا نشاں کہاں
جھنجھلا کے تب یہ اس نے کہا مجھ سے بے شعور
کیا لامکاں کو ڈھونڈے ہے ہے لامکاں کہاں
جا ملک تن کی عالم ہستی میں سیر کر
تجھ کو وہیں ملے گا نشاں یاں نشاں کہاں

وہ اشعار پڑھ کر چپ ہوگئیں، گویا سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کو کس طرح آگے بڑھائیں اور میں ادھر دم بخود تھا کہ اگر میں غلط نہ سمجھا تھا تو ان اشعار سے صاف خود پرستی یا مادی اشیا کو لامکانی حقائق پر ترجیح دینے کا رجحان نمایاں تھا۔ لیکن ان کی خاموشی سے یہ بات بھی ظاہر تھی کہ وہ ان اشعار کے بارے میں مجھ سے کچھ سننا چاہتی ہیں۔ مجبوراً میں نے مہر سکوت توڑی اور ٹھہر ٹھہر کر کہا:

''اگر میں غلط نہیں سمجھا تو اس قطعے میں حضرت شیخ نے مادے کو روح پر ترجیح دی ہے، یا صورت کو اشیا کے اصل جوہر کا حامل قرار دیا ہے۔''

انھوں نے گہری سانس لی، جیسے انھیں کوئی الجھن تھی جو میری بات سے دور ہوگئی۔ ''یہی تو اس وقت میں نے بھی اپنے دل میں کہا تھا،'' وہ بولیں۔ ''میں فیلسوفوں کی موشگافیاں کیا جانوں، لیکن میں ڈر رہی تھی کہ یہ اشعار اگر عام ہوئے تو جناب لوگ اور مولوی لوگ ان کا مطلب وہی نکالیں گے جو شیخ صاحب کے خلاف جائے گا اور فرض کریں ایسا نہ بھی ہو تو اللہ تو ہے، وہاں اس کے دربار میں شیخ صاحب کیا عذر داری کریں گے۔''

''لیکن یہ تو شاعری ہے، مضمون آفرینی ہے۔ شعرا ایسے مضامین لکھا ہی کرتے ہیں،'' میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

''بجا ہے،'' وہ بولیں۔ ''لیکن یہ شعر اس وقت تو مجھے بالکل خود پرستی اور خلاف دین معلوم ہوئے۔ کلام کا زور تو دیکھیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ....''

''یہ محض مضمون آفرینی نہیں ہے،'' میں نے تصدیق کی۔ ''لیکن پھر بھی، شعر تو شعر ہے۔''

انھیں میری بات سے اطمینان کے بجائے کچھ اور بے چینی سی ہوئی۔ ''نہیں نہیں، ایسا ہرگز نہیں، ان کے خیالات سراسر بے دینی پر محمول ہو سکتے تھے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر چپ ہوگئیں، گویا اپنے اندر کسی کشمکش سے دوچار ہوں اور مجھے، ظاہر ہے کچھ اور کہنے یا پوچھنے کی مجال نہ تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ اس وقت ان پر ذہنی کوفت بہت ہے اور طبیعت بھی درست نہیں، آج بات کو یہیں ختم کر دیں تو اچھا ہو۔ یہ خیال کر کے میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے اشارے سے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔

دفعتاً ان کی آنکھ سے آنسو رواں ہو گئے۔ دونوں آنکھیں چشمے کی طرح بہہ نکلیں، لیکن نہ سسکی تھی نہ آواز۔ بس سر جھکائے وہ روئے چلی جا رہی تھیں۔ میں اور بھی متوحش ہوا کہ اب کیا کروں۔ وہ دوپٹے سے آنسو خشک کرتیں اور جس تیزی سے وہ خشک ہوتے اسی تیزی سے پھر بہہ نکلتے۔ محمد راجا دوڑ کر کٹورے میں

پانی لایا۔ انھوں بدقت رک رک کر دو چار گھونٹ پیے۔ تھوڑا سا پانی ایک چلو میں لے کر منھ پر چھڑکا۔ میں چپ چاپ سارا منظر دیکھتا رہا۔ اچانک انھوں نے بہت دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔ لہجہ اس قدر پست تھا کہ مجھے بعض اوقات کانوں پر زور دینا پڑتا تھا۔

''اس دن خدا جانے کون سی کمبختی مجھ میں سما گئی تھی۔ شیخ صاحب کے عقیدوں کی خرابی پر رنج اور غصہ تھا، یا ان کو آخرت کے عذاب سے بچانے کی دھن تھی، یا اس بات کا ڈر تھا کہ ان پر مولوی مولانا لوگوں کا عتاب نازل نہ ہو۔ ان کے عقائد کا حال تو مجھے تقریباً روزِ اوّل سے معلوم تھا اور جہاں تک سوال ان کے عذاب ثواب کا تھا، تو یہ معاملہ ان کے اور ان کے اللہ کے درمیان تھا۔ میں کون ہوتی تھی ان پر داروغہ ہو کر بیٹھنے والی....''

میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ ایک لمحہ بعد میں نے صرف اتنا کہا، ''مگر حضرت شیخ کی بہی خواہی تو آپ کا حق اور فرض تھی۔''

''تھی، یا شاید نہیں تھی۔ وہ اچھا برا مجھ سے بہتر جانتے تھے۔ اب تو میں یہی کہتی ہوں کہ کاش اس بات کو میں نے طول نہ دیا ہوتا۔''

انھوں نے صندوقچے میں ٹٹول کر کاغذ کے دو ٹکڑے نکال کر میری طرف بڑھائے۔ میں نے اُٹھ کر ان کے ہاتھ سے وہ کاغذ لیے تو دیکھا کہ نہایت پختہ خوبصورت خط شکست میں وہی غزل تھی، اور کاغذ دو نیم تھا۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھی۔

''یہ.... یہ حضرت شیخ کی تحریر ہے، اور آپ نے غصے کے عالم میں اس کاغذ کو....''

ان کی آنکھ میں پھر آنسو بھر آئے۔ انھوں نے سر کے اشارے سے ہاں کہی۔ میں سکتے کے عالم میں رہ گیا۔ حضرت شیخ جیسا خوددار اور عالی دماغ شخص، اور اپنے کلام کا اپنی ہی بیگم کے ہاتھوں یہ حشر دیکھے۔ عیاذاً باللہ۔ وہ جتنا بھی خفا ہوتے، کم تھا۔

روہانسی آواز میں بھورا بیگم نے کہا۔ ''جب وہ جاگے تو میں ان سے خوب ہی لڑی۔ پھر میں نے یہ کاغذ.... یہ کاغذ.... ان کے سامنے چ.... چاک کر دیا۔ میں نے کہا کہ آپ کو خدا کا خوف نہ ہو، مجھے تو ہے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک رنگ جاتا، لیکن انھوں نے صرف اتنا کہا، بھورا بیگم آپ کو یہ حق نہ تھا۔ نہ میری غزل پھاڑنے کا، نہ میرے عقائد پر محتسب بن کر بیٹھنے کا۔ میں انسان کو سب کچھ سمجھتا ہوں اور

ہمارے خیر البشر روحی فداہ بھی تو انسان تھے.... قرآن میں ہے....

''میں نے بات کاٹ کر کہا، میں یہ سب باریکیاں کیا جانوں، میرے حسابوں تو اللہ کے نبی اور نبی کے بعد امام، بس یہی سچا دین ہے، یہی سب کچھ ہے۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ خدا جانے آپ اپنا ایمان کس شیطان کے پاس گروی رکھ آئے ہیں، میں تقریباً روتی ہوئی لیکن تیز آواز میں بولی۔ شیخ صاحب اب تک پلنگ ہی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اب وہ ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے، آپ کا دماغ چل گیا ہے۔ اس وقت آپ سے بات کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے کھونٹی پر سے اپنا چغہ اتارا، دروازے کی کنڈی کھولی، اور یہ جا وہ جا۔ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔''

''انا للہ و انا الیہ راجعون''میرے منھ سے نکلا۔''یہ تو بڑا برا ہوا۔''

''یہ آپ مجھ سے کہہ رہے ہیں،'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولیں۔''اس وقت جو عالم مجھ پر گذر گیا اس کا حال میں آپ سے کیا بتاؤں۔''

کچھ دیر تک سر جھکائے وہ صندوقچے میں کچھ تلاش کرتی رہیں، پھر بولیں:

''میں پہلے تو گم سم بیٹھی رہی۔ مجھے ایک احمقانہ سی امید تھی کہ وہ ابھی واپس آ جائیں گے۔ لیکن تھوڑی دیر گذرنے کے بعد میں نے اچانک دروازہ بند ہونے کی آواز گویا دوبارہ سنی۔ دروازے کا کھلنا تو میں نے خود ہی دیکھا تھا، پھر جب انھوں نے زور سے دروازہ بند کیا تو وہ آواز بھی میں نے سنی، لیکن اس وقت شاید میرے ذہن نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، میں سمجھی ہی نہ تھی کہ کیا ہوا۔ اب کوئی ایک گھڑی بعد اس آواز کے معنی مجھ پر ظاہر ہوئے کہ شیخ صاحب باہر چلے گئے ہیں۔ اب وہ کب آئیں گے.... آئیں گے بھی کہ نہیں؟ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ضرور آئیں گے، مجھے اس طرح چھوڑ کر وہ جا نہیں سکتے۔ لیکن میری عقل کہہ رہی تھی کہ شاید کئی دن تک نہ آئیں، یا خدانخواستہ کبھی نہ آئیں.... تو میں کیا کروں گی۔''

ان کے آنسو پھر بہہ نکلے۔''میں گھر میں بالکل اکیلی، پاس پڑوس کے گھروں سے بھی ہمارا ملنا جلنا بہت نہ تھا۔ شیخ صاحب کو شعر سے فرصت نہ تھی، اور ہم اتنے خوش حال بھی نہ تھے کہ لوگوں کے یہاں آتے جاتے، دعوتیں کرتے، ملتے ملاتے۔ پھر ابھی تک میں متاہل ہی تھی، ایسی عورتوں کو لوگ اپنے گھروں میں بلاتے ہی کم تھے۔''

''ظفر الدولہ بہادر کے یہاں سے تو آپ کا ربط قائم رہا ہوگا،'' میں نے کہا۔''پھر خواجہ آتش تھے، اور

دوسرے شاگرد تھے....''

''مگر میں اکیلی جان، عورت ذات، گھر سے باہر کیسے نکلتی؟ اور مان لیا میں نکل بھی جاتی تو کہیں اتنی دیر میں شیخ صاحب واپس آگئے اور میں انھیں گھر میں نہ ملتی....؟''

''جی، یہ بات تو ہے۔'' میں نے سر جھکائے جھکائے آہستہ سے کہا۔

''ایک دو گھڑی اور ان کی راہ میں صبر سے دیکھی، پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ لیکن محلے والے بھی شاید بہرے تھے کہ کوئی پوچھنے کو نہ آیا کہ تجھے کیا آزار ہے۔ جب میں خوب رو چکی تو اپنے دل کو میں نے یہ کہہ کر سمجھانا شروع کیا کہ بھورا، تجھے تیری ماں کی گود سے چھڑا کر بھی مالک نے پالا جلایا، کھلا پلا کر بڑا کیا۔ مولا مشکل کشا چاہیں تو کیا نہیں ہو سکتا، تو نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہے، اور ابھی شیخ صاحب کو گئے دیر ہی کتنی ہوئی۔ بجا تو ان کی مجرم ہے، لیکن تو نے جو کیا ان کی خیر خواہی میں کیا۔

''اس طرح اپنے دل کو تسلی دے، میں نے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے اور اس بیچ میں پیر دیدار کونڈہ، پیر یکایک کا روزہ، چہل کنجی کے طاق، اور خدا جانے کتنی منتیں مان ڈالیں۔ آدھی تہی دعائے صباح جیسی مجھے یاد تھی، پڑھ ڈالی۔ پھر اچانک دل میں ایک بات آئی۔ مجھے لکھنا تو آتا تھا، لیکن خوش خط میں نہ تھی، ہاں اور لڑکیوں سے کچھ بیس ہی لکھ لیتی تھی۔ میں نے صاف کاغذ ان کے قلمدان سے نکالا، پرانے قلم کو دھو دھا کر صاف کیا، پھر مولانا کا نام لے کر وہی ساری غزل کاغذ پر صاف صاف اتاری۔''

انھوں نے اپنے صندوقچے میں پھر ڈھونڈا اور اس بار ایک بڑا کاغذ، جو کئی بار کا تہہ کیا ہوا اور کھولا ہوا معلوم ہوتا تھا، یوں ہی تہہ کیا ہوا میری طرف بڑھایا۔ میں نے جو اسے کھولا تو وہی غزل تھی، ذرا خام لیکن دلکش شفیعا آمیز نستعلیق خط میں لکھی ہوئی۔ مقطع کے ذرا نیچے سرخ روشنائی میں لکھا تھا: 'معافی کی خواستگار آپ کی کنیز حیات النساء عرف بھورا'، اور اس کے بھی نیچے حضرت شیخ کے خوبصورت خط شکستہ میں لکھا تھا، لیکن ذرا مٹا مٹا سا: 'مصحفی تم سے خفا ہی کب تھا'۔ میں سمجھ تو گیا تھا کہ یہ حرف مٹے سے کیوں ہیں، لیکن ان کی طرف دیکھ کر میں نے تصدیق چاہی تو انھوں نے کہا، ''جی ہاں۔'' پھر وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتی ہوئی بولیں:

''میں نے ظہر کی نماز کا سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی پھر اسی انداز سے کھنکی۔ میں تو بالکل سن ہو کر رہ گئی، لگتا تھا یہیں جانماز پر ڈھیر ہو جاؤں گی۔ پھر عقل نے آڑے ہاتھ لیا کہ ہوش میں آ، یہ موقع دیر کرنے کا نہیں۔ میں لرزتے پاؤں سے اٹھی، جوتی پہن رہی تھی کہ بڑے زور کا چکّر آیا۔ پھر میں کچھ اس طرح

بے طرح گری کہ چوکی کا کونا ماتھے میں چبھ گیا اور خون بہنے لگا۔ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو شیخ صاحب نے میرے چہرے کو خونم خون دیکھا اور کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے۔"

میں نے آج پہلی بار ان کے چہرے پر تبسم کی سچی روشنی دیکھی۔ انھوں نے آنچل ذرا سرکایا تو میں نے پیشانی کے عین بیچوں بیچ بندیا کی طرح کا گول نشان دیکھا۔ انھوں نے اس پر اس طرح ہاتھ پھیرا گویا وہی داغ ان کے لیے سارے چہرے میں سب سے پیاری چیز ہو۔

۱۳

945ھ اور 946ھ کے برس [1539ء/1540ء، مرتب] اعلیٰ حضرت محمد نصیر الدین ہمایوں بادشاہ دہلی کے لیے بڑے سخت تھے۔ ان کی افواج کو جا بجا ہزیمت ہو رہی تھی۔ سنہ 946ھ کے آغاز میں ان کے لاتعداد جیوش و سرداران کو چوسا کے مقام پر شیر خان سوری شیر افگن نے شکستِ فاش دی۔ نہ صرف یہ کہ وہ بچے کھچے لشکر و بھیر و بنگاہ شاہی کو دھکیلتا ہوا گنگا کے اس پار بہت دور تک لے گیا، بلکہ اس نے فوراً ہی شیر شاہ کے نام سے اپنی بادشاہت کا بھی اعلان کر کے دہلی و آگرہ کا رخ کیا۔ ادھر آستانۂ ہمایونی کے وفادار جیالے مجتمع ہو کر شیر خان سوری سے آخری معرکے کی خاطر اسباب و آلاتِ حرب مہیا کر رہے تھے، خزانہ اکٹھا کر رہے تھے، اور ان افغان قبائل کے سرداروں سے رابطہ قائم کر رہے تھے جو ابھی شیر خان کے تصرف اور دباؤ سے دور تھے۔

اسی سنہ 946ھ کے اواخر میں محمد نصیر الدین ہمایوں کی راہیں اور فتح و نصرت کی شاہراہیں الگ الگ ہونے والی تھیں۔ قنوج کے مقام پر فیصلہ کن معرکہ گرم ہونے والا تھا۔ ملک کی رعایا عالم سراسیمگی میں تھی اور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ مرجھاتے ہوئے تیموری طرے کو سلام اور عقیدت کے پھول پیش کرے یا جنگ کی سرخی سے تر و تازہ ہوتے ہوئے گل سوری کو مہیسر چڑھائے۔

شیر خان نے ایک نیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا کہ وہ جرأت مندی، وفاداری اور سپاہ سالاری کی صفت کے حامل غیر افغانوں کو بھی افغان قرار دے دیتا۔ اس موقعے پر ایک باقاعدہ اور خاصی مفصل رسم داخلہ انجام دی جاتی۔ پھر نو داخل سردار اور اس کے قبیلے کو ایک نیا افغانی نام دیا جاتا۔ یہ غیر افغان سردار یا قبیلے صرف

راجپوتوں کے نہ تھے۔ ان میں کئی مسلمان غیر افغان قومیں، اور غیر مسلموں میں برہمن اور ویش بھی داخل کر لیے جاتے۔ مذہب یا ذات پات کی شرط نہ تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ نو داخل شخص یا قبیلے میں ''افغانی'' صفات ہیں کہ نہیں۔

ان نو داخل افغانوں کی وفاداری شیر خان کے ساتھ تو بنیانِ مرصوص کی طرح مستحکم تھی، لیکن آپس میں ان کے تناؤ، آویزشیں اور رقابتیں ابھی ویسی کی ویسی تھیں، بلکہ بعض قبائل اور سرداروں کے یہاں تو اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ لوہانیوں میں تکبر بہت تھا، وہ اپنے آگے کسی کو سمجھتے نہ تھے۔ جنوبی بہار کے سلطان کا بیٹا جلال خان لوہانی اگرچہ نو عمر تھا، اور شیر خان اس کا اتالیق، لیکن وہ خود کو تمام افغانوں سے برتر سمجھتا تھا۔ شیر خان نے چند ہی برسوں میں اس کے بل نکال دیے۔ دوسری طرف سارنگ خان پٹھان تھے، جو اصلاً ''ترک بچے'' یعنی ترک اور غیر ترک امرا کے غلاموں کی اولاد تھے اور اپنی جواں مردیوں کے باعث آہستہ آہستہ فرقۂ افغاناں میں داخل ہو گئے تھے۔ سارنگ خانیوں اور فرمولیوں میں بالکل نہ بنتی تھی۔ فرمولی اصل کے اعتبار سے شیخ زادے تھے۔ لیکن فرمولیوں کی سب سے گھنی دشمنی قائم خانیوں سے تھی جو نسلاً راجپوت تھے۔

[شیر خان نے ان سب کو ایک سپہ سالار کے، یعنی خود اپنے، جھنڈے تلے کس طرح جمع کیا، یہ شیر شاہ کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے، لیکن ہمیں یہاں اس سے غرض نہیں، مرتب۔]

قنوج کی جنگ کو ابھی کچھ دن باقی تھے، اور امروہہ، سنبھل، حاتم سرائے وغیرہ کے فرمولی اور قائم خانی ابھی اپنی ہی دشمنیاں نکالنے میں مصروف تھے۔ انھیں ہمایوں کا ساتھ دینا منظور نہ تھا، اور شیر شاہ کے ساتھ ہونے کے پہلے وہ بساطِ سلطنت پر آخری بازی کے انجام کے منتظر تھے۔

امروہہ سے کوئی پندرہ کوس کے فاصلے پر ایک طرف موضع شیخ پور ہے، جہاں فرمولیوں کا طوطی بولتا تھا۔ اس کے جنوب مشرق میں کوئی تین کوس پر موضع منجھاولی واقع ہے، جہاں کے باشندے اس وقت زیادہ تر راجپوت اور دیگر قوموں کے لوگ تھے۔ منجھاولی اور شیخ پور کو ملاتی ہوئی ایک کچی سڑک تھی جو قوس کی شکل میں دونوں مواضع کے پاس سے گذر کر ایک چھوٹے سے گاؤں پر ختم ہوتی تھی جس کا نام گھرورہ ملکانوں تھا۔ یہاں کی آبادی تمام و کمال فرمولیوں کی تھی۔ منجھاولی اور شیخ پور کو ملانے والی قوس نما سڑک سے ذرا ہٹ کر میرے اجداد کا وطن اکبر پور تھا۔ ''تھا'' میں اس لیے کہتا ہوں کہ اب وہ خطۂ زمین صفحۂ ہستی سے محض ایک تاریک اوسر کی شکل میں ہے جس پر کہیں کہیں پلاس یا ڈھاک کے پیڑوں سے ہریالی، اور موسم میں ان کے پھولوں سے

کچھ خوفناک ہی سرخ روشنی نظر آنے لگتی ہے۔

یوں تو ہم لوگ بھی شیخ قوم کے تھے، لیکن فرمولی شیخ زادہ پٹھانوں کا دستِ تطاول ہمیں چین سے جینے نہ دیتا تھا۔ آئے دن کے جھگڑے، کسی کی زمین کو زبردستی جوت لینے کا کسی دوسرے پر سچا یا جھوٹا الزام، کسی فرمولی کی لڑکی کسی شیخ زادے کے ساتھ بھاگ گئی، تو یہ اتہام کہ اسے بھگا لیا گیا ہے، کسی کا بیل کسی نے بجبر باندھ لیا اور دعویٰ کیا یہ میری زمینیں چر رہا تھا۔ یہ روز کے جھگڑے تھے۔ کبھی کبھی خون خرابے کی نوبت آجاتی۔

ہم شیخ زادگان کتاب اور مزارع کے لوگ تھے، اور فرمولیان خود کو اصحابِ سیف کا سرخیل سمجھتے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ بھی وافر تھا۔ شکست اکثر ہم ہی لوگوں کی ہوتی۔ جب سے تخت وتاج کے لیے پٹھانوں اور خدیوِ ہند اعلیٰ حضرت نصیر الدین ہمایوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تھی، ملکی انتظام درہم برہم تھا اور پٹھانوں کے خلاف شکایت سننے کا یوں بھی کوئی مشکل ہی سے روادار ہوتا تھا۔

شیخ قوام الدین ہمارے موضع اکبر پور کے سرکردہ لوگوں میں تھے۔ ایک دن خبر آئی کہ گھرورہ ملکانوں کے ایک شورہ پست زمین دار بلال خان کے جوان بیٹے کا پُراسرار حالات میں قتل ہو گیا ہے۔ اس کا دھڑ کہیں ملا ہے اور سر کہیں اس پگڈنڈی پر، جو گھرورہ ملکانوں سے شیخ پور کے ایک ذرا گھنے جنگل جلیبی اور ببول، بھٹ کٹیا اور خاردار جھڑ بیریوں کے جنگل سے ہو کر ملاتی تھی۔ اب خدا معلوم سچی غلط فہمی کی بنا پر، یا موقعے کا فائدہ اٹھا کر ہم لوگوں کو نیست و نابود کر ڈالنے کے اچھے بہانے کے طور پر گھرورہ ملکانوں کی طرف سے افواہ اڑی کہ یہ قتل شیخ قوام کے ایک بیٹے نے بوجوہ رقابت کیا ہے اور بنائے رقابت ایک چرواہی دوشیزہ کا عشق بتائی گئی، کہ دونوں ہی اس کے عنایات کے طلبگار تھے، لیکن اس کا میلِ طبع بلال خان کے بیٹے کی طرف زیادہ تھا۔

شیخ قوام ابھی تدابیر سوچ رہے تھے کہ کس طرح اور کس کی ایلچی گری کے ذریعے بلال خان کو باور کرایا جائے کہ میرا بیٹا اس قتل میں ہرگز ملوث نہیں، کہ دوسری افواہ یہ اڑی کہ گھرورہ ملکانوں کی طرف سے کئی سو پٹھانوں کی جمعیت ہمارے گاؤں کو تباہ و تاراج کرنے کو چل پڑی ہے۔ شیخ قوام الدین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا سوا اس کے کہ اس افواہ کی تصدیق کے لیے کسی ہرکارے کو بھیجیں۔ شام ہوتے ہوتے ہرکارے نے آ کر خبر دی کہ کچھ تیاریاں سی تو ہو رہی ہیں، لیکن جو بھی ہو گا کل بلال خان کے بیٹے کی تدفین کے بعد ہو گا۔

افسوس کہ شیخ قوام الدین اور دوسرے بڑے بوڑھوں نے اب بھی کوئی حفاظتی تدابیر نہ کیں۔ اتنا بھی نہ

کیا کہ اپنی عورتوں اور بچوں کو کہیں محفوظ جگہ نکال لے جاتے۔ عورتیں پکانے ریندھنے میں مصروف ہوئیں اور مرد لاٹھیاں اور دیگر ہتھیار جمع کرنے لگے، لیکن ہر چیز بڑی سستی، بلکہ بے دلی سے ہو رہی تھی۔

یہاں شام کا سناٹا ذرا گہرا ہوا تو گاؤں کے چاروں طرف سے مشعلوں کی روشنیاں ہماری طرف بڑھتی دکھائی دیں۔ ہم ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ یہ ڈاکو ہیں یا پٹھان، یا کوئی اور پاجی قوم، کہ گھروره ملکانوں کے سارے بوڑھے جوان، حتیٰ کہ نوعمر لڑکے ایک ہاتھ میں مشعل اور دوسرے ہاتھ میں ننگی تلوار لیے ہمارے درمیان تھے۔ حملہ آوروں نے پورے انصرام وانتظام سے منصوبہ بندی کی تھی۔ مضبوط قوی ہیکل ادھیڑ عمر کے جنگویوں نے پورے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا تھا، کسی کو راہ فرار نہ تھی۔ ادھر گاؤں کے اندر گھس آنے والے جم غفیر نے بہ یک وقت بیسیوں گھروں کو آگ دے دی۔

چشم زدن میں آگ ہر گھر، ہر کھلیان، ہر دالان، ہر بنگلے تک پھیل گئی یا پھیلا دی گئی۔ شیخ قوام کی بیوی اپنے شیر خوار بچے نظام کو بھسیلے میں چھپا آئی، کہ شاید اس کی جان بچ جائے۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ بچہ اگر اس دار و گیر سے مصئون بھی رہا تو جائے گا کہاں، اور بھوسے کے ڈھیر میں اس کا دم گھٹ کر مر جانا بھی کچھ عجب نہ ہوتا، لیکن اس وقت کسی کو کچھ سوجھتا نہ تھا۔ مشعلوں اور جلتے ہوئے چھپروں کی سرخ لپلپاتی روشنی میں محض سائے اور دھندلی خون آلودہ لاشیں نظر آتی تھیں اور ہوا میں کچے گوشت کے جلنے کی بھیانک چراندھ پھیلی ہوئی تھی۔ شیخ قوام الدین تو پہلے ہی ہلے میں قتل ہو چکے تھے، اب ان کی بیوی کو بھی تہ تیغ کر کے حملہ آوروں نے بھسیلے میں آگ لگانے کی ٹھانی۔

بھس میں ابھی آگ پوری طرح لگی نہ تھی۔ یوں بھی اس عالم میں دھواں زیادہ تھا، آگ کہاں کتنی لگی ہے، یہ صاف نظر نہ آتا تھا۔ حملہ آوروں کو اہالیان اکبر پور کا قتل عام کرتے ایک پوری ساعت گذر چکی تھی۔ مظلوموں کے شور اور شعلوں کی لالی اور دھویں کے بھورے ملگجے بادلوں نے شیخ پور اور منجھاولی کے لوگوں میں بھی یہ بات پھیلا دی کہ یہ رات اکبر پور کے باشندوں پر آخری ہے۔ پھر کچھ تو لوٹ مار کی غرض سے، اور اکثر تماشا دیکھنے کے لیے، یہ لوگ گھروں سے نکلے اور گھوڑیوں، سانڈنیوں پر سوار دھاوا مارتے ہوئے سواد اکبر پور میں پہنچے۔ بعض تو اپنی بہوؤں اور بیویوں کو بھی موت کی تفریح سے بہرہ اندوز کرانے لائے تھے۔ انھیں میں شیخ پور کے ایک زمیندار شیخ ممو کی بیوی بھی تھی۔ اس نے بھسیلے میں آگ لگتے دیکھی تو پکار کر کہا، ''ارے ذرا رکو، لوگو ذرا رکو۔ کہیں اس میں کوئی بے زبان ڈھور ڈنگر نہ ہو۔'' یہ کہتی ہوئی وہ بھاگا ہوا دوپٹہ منھ پر لپیٹ کر بھس خانے

میں گھس پڑی۔

وہاں جانور تو کوئی نہ تھا۔ لیکن جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے خلیل کے حق میں آتشِ برافروختہ کو حکم دیا تھا کہ یا نار کونی برداً وسلاماً علی ابراھیم، اسی طرح وہاں شیخ قوام کا بیٹا نظام پیال کے ایک ڈھیر تلے آدھا دبا ہوا چسر چسر اپنا انگوٹھا پستانِ مادر کی طرح پی رہا تھا۔ شیخ ممو کی عورت لاولد تھی۔ آتما کی آنچ بہائم صفت انسان کی لگائی ہوئی آگ پر حاوی آگئی۔ وہ اس آتش نمرود میں بے خبر کود کر معصوم شیر خوار کو بھیگے دوپٹے میں لپیٹتی نکال لائی۔ کشافِ دقائق لطیف وصناع نکات ظریف کا ادنیٰ کرشمہ دیکھیے کہ زن شیخ نے اس مولودِ آتش ناک کا نام نظام رکھا، جبکہ اسے بالکل خبر نہ تھی کہ اس بچے کے والدین نے بھی اس کا نام یہی رکھا تھا۔

بارہ سال گذر گئے۔ نظام نے اپنی مادرِ مجازی کی گود میں وہ آسائشیں اور وہ الفتیں پائیں کہ اس کی مادرِ حقیقی بھی اس سے زیادہ کیا کرتی۔ لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ خدائے ذی القدور اولی الامر کے بھید کون جان سکتا ہے۔ ایک دن شیخ نظام کے ہم مکتبوں نے اسے بے پدری کا طعنہ دیا۔ وہ روتا ہوا گھر واپس آیا اور اپنی ماں سے احوال واقعی کے لیے مستفسر ہوا۔ بچے کی ہٹ اور اس کا درد دیکھ کر زنِ شیخ ممو بے قابو ہو گئی اور اس نے سارا حال نظام کو کہہ سنایا۔

نظام جو تا ایں دم مہدِ مباہات میں پلا تھا اور جو خود کو شیخ ممو اور ان کی بیوی کا فرزندِ حقیقی سمجھ کر دوسروں کو اپنے سے کمتر اور حقیر گردانتا تھا، اب اسے پتا لگا کہ میں نہ صرف یتیم و یسیر ہوں، بلکہ ان لوگوں کے خانۂ تلطف میں پلا بڑھا ہوں جو کسی نہ کسی حد تک میرے والدین کی موت میں شریک تھے۔ سارا دن اور ساری رات غیرت اور غم کا زہر اس کی دیگ میں کھولتے پانی کی طرح جوش مارتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اٹھا اور گھر والوں کی آنکھ بچا کر آوارۂ وطن ہو گیا۔

راہ کے ہرج مرج کھینچتا، کبھی فاقہ کشی، کبھی محنت مزدوری کرتا، نوجوان نظام نے شبانہ روز شیخ پور کی خاک اپنے دامن سے جھاڑی اور وہاں کی تلخ یادوں کو بھی ذہن میں محو کرنے کی کوشش کرتا وہ آخر کار ملک دکن پہنچ گیا۔ یہاں اس نے ایک سقے کے گھر قیام کیا۔ سقے نے مہمان داری اور غریب نوازی کے تمام فرائض بخوشی انجام دیے، حتیٰ کہ بیگانگی کی جگہ یگانگی، اور اجنبیت کی جگہ مودت پیدا ہو گئی۔ شیخ نظام کو بے وطنی کی جگہ وطنی ملا، اور ایک والدِ مجازی کا نعم البدل اس سعید سقے کی شکل میں ملا۔ سعید نے نظام کو اپنا پسر خواندہ کیا۔

چاہِ مصیبت اور دریائے مذلّت سے نکل کر اب شیخ نظام نے سعید سقے کے ساتھ ایک عالی تبار سید گھرانے میں سقائی اختیار کر لی۔

دن گذرتے گئے۔ نظام کے دل میں علاقۂ ہند کی تاریک یادیں محو ہونے لگی تھیں۔ کم سنی کے باعث نظام کو کبھی کبھی سید عالی مدار کی محل سرا کے اندر بھی سقائی کی خدمت انجام دینے کا موقع مل جاتا تھا۔ تغیرِ حالات اور وطن اور گہوارۂ محبت والدین سے دوری کے باوصف لمعہ سعادت اور نور شرافت نظام کی سیمائے روشن سے ہویدا تھا۔ ایک بار خاتونِ خانہ سیدہ نے نظام کو دیکھا اور قیافے سے پہچان لیا کہ یہ گوہر یکدانہ صدف نہر سقائی سے نہیں نمودار ہوا اور ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا کہ نظام تو کس ذات اور کس قوم کا ہے؟

''میں سید زادہ ہوں،'' نظام کے منھ سے نکلا۔ یہ سنتے ہی سیدہ خاتونِ خانہ کے تو دل کی کلی کھل اٹھی۔ اس نے بہزار منّت سماجت سعید سقے کو راضی کر کے نظام کو اپنے زاویۂ عاطفت میں لے کر اپنا فرزندِ خواندہ مقرر کیا۔ نظام کو لباس فاخرہ سے ملبس کر کے مکتب میں بٹھایا گیا، اور الگ سے بھی ایک ادیب [استاد، مرتب] کی خدمت میں بھیجا گیا۔ بعد چندے نظام کے دل دماغ میں شجرِ حکمت وعلم وفن کی جڑیں گہرائی تک سرایت کر گئیں۔ اس کی شاخوں کی مروحہ زنی نے نظام کے چہرے کو سکون، طمانیت اور بشاشت کا وہ رنگ بخشا کہ وہ محسودِ خلائق ٹھیرا۔

مکتب سے جب فارغ ہوا تو نظام حلیۂ علم وفضل سے مجلّی اور ہمہ علوم وآداب اور فوائد تہذیب کے اسرار کا جامع ہو چکا تھا۔ سید عالی تبار کی ایک دختر تھی کہ جس کا حُسن ماہ تاباں کو شرماتا تھا اور جو ہر طرح کی سگھڑپن، اسبابِ جمال وزیبائی، اور معاملاتِ خانہ داری میں طاق تھی۔ سید نے وہ دختر نظام کے حبالۂ نکاح میں دے دی۔

دُنیا میں حاسدوں اور پیغارہ جویوں کی کیا کمی ہے۔ اس دیار میں ایسے لوگ بھی تھے جو دختر سید کے بدل طلبگار تھے۔ انھوں نے نظام کے حالات میں تحقیق کی تو اس کی ذات و دودمان کا معاملہ دیگر پایا۔ رقیبوں نے جا کر سید سے لگائی بجھائی کی کہ آپ کا داماد سید نہیں، شیخ زادہ بھی نہیں، نزا نو مسلم ہے، اور سوئے اتفاق یہ کہ اس کا ثبوت یوں بھی فراہم ہو گیا کہ اس زمانے میں موضع شیخ پور کے بعض بے روزگار نوجوان تلاشِ معاش میں ادھر آ پہنچے تھے۔ انھوں نے جب نظام کو اس طرح محوِ عیش وعشرت دیکھا تو آتشِ حسد ان کے کانونِ سینہ میں موجزن ہوئی۔ انھوں نے بھی یہ خبر اس دیار میں مشتہر کر دی کہ نظام نہ سید ہے نہ شیخ، وہ نو مسلم ہے۔

سید عالی مقدار کے فرزندوں کو اپنی یہ ہتک برداشت نہ ہوئی۔ انھوں نے چاہا کہ نظام کو بفور تہہ تیغ کریں اور اسے کیفرِ کردار کو پہنچائیں کہ اس نے ہماری بہن کو بہ فریب سیادت رشتۂ عقد میں باندھ لیا ہے۔ لیکن جنابِ عالیہ خاتونِ خانہ مانع ہوئی کہ جو ہوا، ہوا۔ کسی بھی آدم کی اولاد کو، جو ہمارا خویش بن چکا ہے، جان سے مار دینا بہت نامناسب ہے۔ ہاں یہ کرتے ہیں کہ دونوں میاں بی بی کو نظام کے وطن بھیج دیتے ہیں کہ انسان اپنے وطن ہی میں خوش رہتا ہے۔

پھر کچھ دن بعد یہی کیا گیا۔ نظام اور اس کی بی بی کو بصد تزک و احتشام ملکِ ہند کے لیے سوار کیا گیا۔ اثنائے راہ میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ نظام کی ثروت اور حشمت اور دبدبہ روز افزوں ہونے لگے، حتیٰ کہ اس کا توقیر و تمول دونوں دوش سلاطین سے دوش زد ہوئے۔ چار دانگ میں نظام کی امارت اور وجاہت کا غلغلہ پھیلا۔ جہاں جہاں سے اس کا قافلہ گذرتا، لوگ گمان کرتے کہ کوئی لشکرِ جرار کسی سلطان یا سپہ سالار کی قیادت میں یہاں سے گذر رہا ہے۔

قضائے کار اس قافلے کا گذر ایسے دیار سے ہوا جہاں رانگڑ، کہ راجپوتوں کی ایک قوم ہیں، بہت حاوی تھے۔ رانگڑوں کے ایک سرگروہ شخص نے نظام کی شوکت و عظمت سے متاثر ہو کر اپنی ناکتخدا لڑکی اسے پیش کی۔ سیدۂ مخدرہ کی اجازت سے نظام نے وہ دختر قبول کر لی اور اس سے اولادِ بسیار تولد ہوئی۔

لیکن بی سیدانی کی گود سونی کی سونی رہی۔ شیخ نظام کو اس بات کا بہت غم تھا۔ جب مدتِ مدید گذری اور اس کی امیدواری مبدل بہ یاس ہوئی تو بی سیدانی کے امتثالِ امر میں شیخ نظام نے ایک شیخ زادی نو مسلم سے عقدِ مناکحت باندھا۔ ایک سال ہی گذرا تھا کہ شیخ زادی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا۔ سب نے خوشیاں منائیں، لیکن شیخ زادی کے دماغ میں تکبّر کا دودِ غلیظ پیچیدہ ہونے لگا۔ صاحبِ اولاد ہونے کے زعم میں اس نے خود کو سیدانی بی بی پر راجح قرار دینا شروع کر دیا۔

جب شیخ زادی کا تبختر بہت بڑھا اور سیدانی بی بی نے اس کے ہاتھوں بہت توہین اٹھائی تو بدرجہ مجبوری انھوں نے شیخ زادی کے لیے بددعا کی۔ چند ہی دنوں میں شیخ زادی کا بیٹا مرا اور پھر اس نے بھی اپنی ودیعت حیات کو فرشتۂ مقتضا کے سپرد کر دیا۔ قریب کے دیار و امصار میں سیدانی بی بی کی کرامت کی دھاک بیٹھ گئی۔ شیخ نظام اور ان کے تمام عملہ اور متوسلین بی سیدانی سے ڈرتے اور ہر کام ان کے اشارۂ ابرو پر کرتے تھے۔

کچھ مدت بعد سیدانی بی بی نے نظام کو حکم دیا کہ اپنی ہی قوم میں ایک نکاح اور کرو۔ چنانچہ یہ نکاح ہوا،

اور مرضیٔ الٰہی سے وہ زن بھی حاملہ ہوئی اور وقتِ مقررہ پر ولادتِ اولادِ نرینہ سے اس کا حمل وضع ہوا۔ ماں نے بیٹے کو سیدانی کے قدموں میں لا ڈالا کہ آپ ہی اس کی ماں بھی ہیں اور باپ بھی، میں تو محض خدمت گذار ہوں۔ بی سیدانی نے نوزائیدہ کو گود میں لے کر ماں کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور کہا یہ میرا بیٹا ہے لیکن تم اس کی دایہ ہو۔ لو اسے دودھ پلاؤ، پالو، پوسو۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

اب اس فرزندِ ارجمند پر بارہ پشتیں گذر چکیں، اور اس کا سلسلہ مجھ مسکین پر منتہی ہوتا ہے۔ میں لاولد ہوں، میرے بھائیوں کے بھی کوئی اولاد نہیں۔ اس طرح اب اس دودمان کی بقا کا انحصار اس عاصی کی فرزندان طبیعت پر ہے۔ اللہ باقی من کل فان و یبقی وجه ربک ذوالجلال والاکرام۔

میں، شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی ثم دہلوی ثم لکھنوی، اپنے احوالِ اب وجد پر مبنی یہ تحریر اپنی اس کتاب موسوم بہ 'مجمع الفوائد' میں لکھے جاتا ہوں کہ ازمنۂ آئندہ کے لوگ سبق حاصل کریں اور یہ حالات میں اس لیے بھی لکھ رہا ہوں کہ لوگوں کو معلوم رہے کہ میں صاحب حسب ونسب ہوں، اس زمانے کے عوام کالانعام کی طرح مجہول الاصل نہیں ہوں۔

۱۴

'مجمع الفوائد' کہنے کو تو چھوٹی سی کتاب تھی، لیکن اس میں حضرت شیخ کے قدیمی خاندانی حالات (جن کی ترجمانی انھیں کی زبانی میں نے بابِ گذشتہ میں پیش کی) کے علاوہ ان کے ذاتی کوائف وعقائد کے بارے میں بھی بہت سی نئی اطلاعات تھیں۔ بعض باتیں مجھ پر ٹھیک سے واضح بھی نہ تھیں۔ چنانچہ جب میں یہ کتاب استانی صاحب کو واپس کرنے گیا تو یہ خیال رکھ کر کہ موقع ملے گا تو وہ باتیں پوچھ لوں گا۔

'مجمع الفوائد' میں تاریخ تصنیف درج نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخ کا اندازہ میں نے 1228ھ/1229ھ [1812ء/1813ء، مرتب] لگایا تھا، کہ حضرت شیخ نے اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت انھیں لکھنؤ میں رہتے تیس برس ہو رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کتاب میں بھورا بیگم کا ذکر ان کے نام کے ساتھ نہ تھا، صرف یہ کہا گیا تھا کہ ایک متوعہ میرے ساتھ کوئی بارہ سال سے ہیں۔ ان سے بھی کوئی اولاد

نہیں ہے۔

''اگر گراں خاطری نہ ہو تو ایک دو باتیں پوچھوں،'' میں نے عرض کیا۔ اس دن ان کا چہرہ بشاش تھا۔

''جی، لال میاں صاحب، میں آپ سے تو گراں خاطر کبھی نہ تھی۔ ضرور پوچھیے۔''

''کرم گستری میں خردنوازی ہے آپ کی۔ میں پوچھنا یہ چاہتا تھا کہ 'مجمع الفوائد' کب مکمل ہوئی؟''

''صحیح تاریخ تو مجھے یاد نہیں، لیکن سال یہی 1228ھ کا شروع ہوا تھا، یہ ٹھیک سے دھیان میں ہے۔''

''اور اس وقت تک آپ حضرت شیخ کے حبالۂ عقد میں نہ آئی تھیں؟''

''نہیں۔ عقد جس سال ہوا وہ 1229ھ تھا، مہینہ ربیع الاول، صحیح تاریخ پوچھیں تو یکم ربیع الاول، دوشنبہ کا دن [21 فروری 1814ء، مرتب] تھا۔''

''تو آپ ان کے ساتھ کوئی ستائیس برس تھیں؟''

''جی یہی سمجھ لیجیے، ایک دو مہینے کا فرق ہو سکتا ہے۔''

''افسوس کہ حضرت شیخ نے کتاب 'مجمع الفوائد' میں کوئی اضافہ نہ کیا، ورنہ شاید آپ کے ساتھ نکاح کا ذکر اس میں آجاتا۔''

''آ بھی جاتا تو کیا تھا؟'' وہ ذرا افسردہ ہو کر بولیں، ''اصل چیز تو نکاح نامہ تھی۔ ورنہ گواہیاں تو شیخ ناسخ اور میاں حیدر علی کی موجود ہی تھیں۔''

''آپ کی بے دخلی کے وقت یہ لوگ کھڑے نہیں ہوئے، اور ان لوگوں نے کوئی مقاومت نہ کی؟''

''انھیں وقت ہی کہاں ملا؟'' وہ اسی عالم محزونی میں بولیں۔ ''سوئم کی شیعہ مجلس، سنیوں کی قرآن خوانی، سب چیزیں اپنے طریقے اور وقت سے ہوئیں۔ ہر انتظام میں شیخ صاحب، خواجہ صاحب، پنڈت بدیا دھر، خواجہ صاحب کے شاگرد دوست علی خلیل، اور بہت سے لوگ آگے آگے تھے۔ جب تدفین اور پھر یہ رسوم انجام پا گئیں تو ذرا دم لینے کے لیے سب اپنے اپنے ٹھکانوں کو چلے گئے۔ اگلے دن کو یہ شیاطین آدھمکے کہ ابھی گھر خالی کرو۔'' وہ آنسو پونچھنے لگیں۔

''تو کیا آپ کو رات کی رات نکلنا پڑا؟''

''یہی سمجھیے۔'' وہ کچھ دیر تک سر جھکائے رہیں۔ ''شیخ صاحب کے آخری دنوں میں ایک بیوہ خادمہ رکھ لی گئی تھیں۔ میں اپنے بدن کے کپڑوں کے سوا ایک دو صاف جوڑوں کا بقچہ اور شیخ صاحب کے کاغذات والا

صندوقچہ لے کر انھیں بیوہ مہری کے گھر چلی گئی۔ اللہ بخشے بڑی نیک عورت تھی۔''

''افسوس، محلے والے سب دیکھا کیے؟''

''کوئی سامنے بھی نہ آیا، نہ ہی شیخ صاحب کے ان نام نہاد عزیز نے مجھے اگلے دن کچھ اور سامان لے جانے یا دینے کی بات کی۔ بعد میں کپتان بیگم سے معلوم ہوا وہ لوگ تھانے کے داروغہ اور سپاہیوں کو پہلے ہی ہموار کر چکے تھے۔''

''ظفر الدولہ بہادر نے آپ کی کوئی مدد نہ کی؟''

''انھوں نے تفتیش کرائی تو معلوم ہوا کہ بے دخل کرنے والوں کی پشت پناہی میں بعض بڑے لوگ بھی ہیں، لہٰذا معاملہ آگے بڑھانے میں ان لوگوں کی بدنامی ہوگی۔ کپتان بیگم نے اگلے دن شیخ ناسخ کے ذریعے یہ مکان مجھے تین سو روپے میں خریدوا دیا۔ قیمت میں نے مہر کے روپیوں سے ادا کی۔ بیگم صاحب نے اوپر سے بہت کچھ سلوک کیا، محمد راجا کو بھی انھیں نے میرے یہاں کام پر لگایا۔ تب سے یہیں پڑی ہوں۔''

''کاش کہ حضرت شیخ نے کوئی تحریری، یا زبانی ہی سہی، وصیت نامہ چھوڑا ہوتا۔ لیکن نکاح نامے کا نہ ہونا ان کی بہت بڑی بھول تھی۔'' یہ آخری جملہ میرے منھ سے بالکل بے ارادہ نکل گیا۔

''بھول؟ اس میں بھول کی کیا بات ہے؟'' وہ فوراً خفا ہو گئیں۔ ''نکاح نامہ ہوتا بھی تو اتنے دن رکھا رہ جاتا؟ آخر کاغذ ہی تو تھا، بڑی بڑی چیزیں ادھر اُدھر ہو جاتی ہیں۔''

ان کی خفگی اپنی جگہ پر، لیکن میں اس بات پر پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔ آخر میرے یہاں قیمتی اشیا کا پشتینی کاروبار تھا۔ بے شک وہاں اعتبار اور پت بڑی چیز تھی، لیکن کاغذ وہاں بھی سب سے اہم تھا۔ حضرت شیخ کو نکاح نامہ ضرور ہی لکھنا تھا۔ جب میں کچھ دیر چپ رہا تو انھوں نے خود ہی بات چھیڑی:

''خیر، ہم آپ شیخ صاحب کے قول فعل پر حرف رکھنے والے کون ہوتے ہیں؟ سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی اصرار کیا، کہ اس میں مجھے ایک طرح کی بدشگونی نظر آتی تھی، گویا میں خدانخواستہ ان کے دُنیا سے جانے کے بارے میں کوئی انتظام کر رہی ہوں۔ مہر تو انھوں نے اسی وقت دے ہی دیا تھا، اور میں ان روپیوں کو آخر تک سینت کر رکھے رہی۔''

''اور وصیت نامہ.....''

''آپ کو شاید شیخ صاحب کے مرضِ موت کے بارے میں کچھ خبر نہیں،'' وہ قطع کلام کر کے بڑے دکھ

سے بولیں۔ اس بار ان کے لہجے میں اس قدر غم تھا کہ ان کے ہونٹ بالکل خشک اور چہرہ سنولایا ہوا لگ رہا تھا۔

''جی معافی چاہتا ہوں، اس طرف میرا خیال نہ گیا تھا۔''

''زندگی کے آخری ڈھائی تین مہینے وہ الفاظ بھول گئے تھے۔'' اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ''اپنے وقت کا سب سے بڑا شاعر اور اسے معمولی معمولی چیزوں کے لیے لفظ یاد نہ آئیں۔ یا اللہ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

میں احمقوں کی طرح ان کا منہ تک رہا تھا۔ لفظ بھول گئے تھے؟ معمولی معمولی چیزوں کے لیے لفظ یاد نہ آئیں؟ یہ بیماری تھی یا کوئی آسیب؟

''وہ..... وہ..... پ.... پڑھ تو لیتے ہوں گے، یا ش.... شاید ل.... لکھ.... لیتے ہوں؟ یہ بیماری کیسی تھی؟ کیا اس کی کوئی دوا نہیں؟''

''حکیم، وید، سیانے، اوجھے، یہاں تک کہ ایک مواب دین ناپاک خوار انگریز ڈاکٹر بھی آیا۔ کسی سے کچھ نہ ہوا۔ کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ بیماری ہے کہ بلا ہے، کیا ہے۔''

''میں ابھی سمجھا نہیں کہ لفظ بھولنے سے آپ کا کیا مطلب ہے، معافی چاہتا ہوں، آپ کے لیے یہ باتیں دکھ سے بھری ہوئی ہیں لیکن....''

''نہیں نہیں۔ جو ہو چکا جو کچھ میں بھوگ چکی وہ میرے لیے آخرت کا سرمایہ ہے۔ اس مرض میں ان کی تیمارداری میرے لیے گونگے کے ڈراؤنے خواب کی طرح تھی۔ میں اندر ہی اندر سہمی تھی اور بیان نہ کر سکتی تھی۔ اللہ اسی بیماری کے صدقے ان کے اور میرے گناہ بخش دے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں، بلکہ آپ سے یہ باتیں کہہ کر کچھ دل ہی ہلکا ہوتا ہے۔'' وہ اب آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ منہ سے ایسا لگتا تھا پرانے بخار سے اٹھی ہیں۔

''بھلا کوئی شخص، اور وہ بھی ان جیسا طلیق اللسان شخص، لفظ کیسے کھو سکتا ہے؟ کیا وہ بالکل گونگے ہو گئے تھے؟''

''نہیں۔ کاش کہ گونگے ہی ہو جاتے۔ گونگے لوگ پڑھ لکھ تو سکتے ہیں۔ وہ تو حرف پہچانتے ہی نہ تھے۔ بولنے کا عالم یہ تھا کہ چیزوں کے اصل نام کی جگہ ان سے ملتی جلتی چیزوں کے نام سوچ کر وہ ٹوٹے

پھوٹے جملوں میں اپنی بات ادا کرتے تھے۔ ادا کیا کرتے تھے، بس بات سمجھا دیتے تھے کہ انھیں یہ چاہیے ہے۔''

''یعنی وہ بولنے سے معذور نہ تھے؟''

''نہیں، لیکن وہ چیزوں کے نام بھول گئے تھے۔ مثلاً انھیں میرا نام یاد نہ تھا۔'' وہ پھر رونے لگیں۔ ''جب پہلی بار اس مرض کا دورہ پڑا تو وہ دیر تک مجھے اے.... اے.... اے مادیان.... لال مادیان کہہ کر پکارتے رہے۔ میں کچھ سمجھی نہیں، اور مجھے غصہ بھی آیا کہ یہ کون سا مذاق ہے۔ لیکن جب میں ان کے قریب آگئی.... جب میں ان کے قریب گئی تو.... تو ڈر گئی۔''

بھورا بیگم کے بدن پر رعشہ طاری تھا۔ محمد راجا دوڑ کر خمیرۂ گاؤزبان عنبری کا مرتبان لایا۔ اس نے ان کا منھ کھول کر خمیرہ چٹانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے منھ سختی سے بند کر رکھا تھا، جیسے دانت بھینچ گئے ہوں۔ محمد راجا نے میری طرف ملامت بھری لیکن رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ میں ان کا منھ کھول دوں تو وہ خمیرہ چٹائے۔ میں عجب گومگو میں تھا۔ پھر میں نے دل میں کہا، غیر عورت ہیں تو کیا، دادا استاد کی بیوی ہیں اور بیمار ہیں۔ میں نے بڑھ کر ایک ہاتھ سے ان کی ٹھوڑی مضبوط پکڑی اور دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی کو دانتوں کے درمیان کسی طرح داخل کر کے ذرا سا منھ کھلوایا کہ محمد راجا نے خمیرے کی بڑی خوراک ان کے منھ اور زبان میں گویا ٹھونس دی اور اوپر سے دو چمچے پانی کے پلائے۔

بڑی دیر بعد ان کی طبیعت ٹھہری۔ پھر انھوں نے گفتگو یوں جاری کی کہ گویا خاموش ہی نہ ہوئی ہوں۔

''ان کے چہرے پر سخت تشنج کے آثار تھے، آنکھیں ابلی آرہی تھیں۔ ماتھے پر ایک رگ نمایاں ہو کر پھڑک رہی تھی۔ ان کا سارا منھ سرخ ہو رہا تھا اور مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، جیسے کسی زبردست ذہنی اور جسمانی محنت میں مبتلا ہوں۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ ذرا سا ڈھیلا ہوا، ٹیڑھی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آئی۔ پھر انھوں نے بارہ پندرہ مہینے کے بچے کی طرح کلکاری مارنے کی کوشش کی، اور پھر انھوں نے آں.... آں.... کر کے بڑی مشکل یہ الفاظ ادا کیے:

'ت.... تاپ.... آپ،.... تام، توم.... لال.... ب.... بائی.... مادہ.... مادیان.... ب.... بھائی.... مادیان.... تاپ.... آپ.... تام، توم.... لال.... ب.... بھائی.... مادہ.... مادیان.... ب.... بائی.... مادیان.... بی.... بی بی....'

''میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ انھیں ایک مہینے سے تیز بخار ضرور تھا، لیکن بات چیت میں اچھے خاصے تھے۔ سرسام وغیرہ انھیں کبھی نہ ہوا تھا اور نہ یہ سرسام کی علامت ہی تھی۔ وہ تو پورے جوش سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی عقل ساتھ نہ دے رہی تھی۔

''میں گھبرا کر قرآن اٹھا لائی کہ انھیں قرآن کی ہوا دوں۔ قرآن کی ہوا دیتے میں انھوں نے میرا شانہ مضبوط پکڑا اور اسے تقریباً جھنجھوڑ کر مجھے ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں، بات کو سمجھو تو سہی۔ اب اسے قرآن کا معجزہ کہیے یا مولا کا کرم کہ ان کی بات اچانک میری سمجھ میں آ گئی۔ میرے دل میں کسی نے کہا کہ معاملہ یہ ہے کہ وہ لفظوں کو بھول گئے ہیں۔ جب وہ کہنا چاہتے ہیں تو انھیں اصل لفظ نہیں، لیکن اس سے معنوی یا لفظی مشابہت والا لفظ، اور وہ بھی بڑی مشکل سے، یاد آتا ہے اور وہ انھیں لفظوں پر اپنے اظہار کی دیوار کھڑی کر رہے ہیں۔''

''معاف کیجیے، جو گفتگو حضرت شیخ کی آپ نے سنائی وہ تو سراسر ہذیانی تھی۔''

انھیں پھر غصہ آ گیا، ''تو پھر آپ میں اور ان نا سمجھ طبیبوں میں کوئی فرق نہیں۔ آپ ذرا سمجھیے تو سہی۔''

''جی مجھے اپنی کم فہمی پر شرمندگی ہے۔ آپ وضاحت فرمائیں، میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

''دیکھیے، وہ لفظ 'تم' ادا کرنا چاہتے ہیں، لیکن انھیں تم کی جگہ 'آپ' یاد آتا ہے، اور وہ بھی ادھورا۔ لہٰذا وہ کبھی 'تاپ' کہتے ہیں، کبھی 'تام'۔ آخر انھیں 'توم' کہنا آ جاتا ہے۔ پھر وہ میرا نام 'بھورا' لینا چاہتے ہیں لیکن 'بھورا' انھیں بھول گیا ہے۔ انھیں یہ خیال ہے کہ میں عورت ہوں، لیکن یہ لفظ انھیں یاد نہیں، یہ ضرور یاد ہے کہ مرد نر ہے اور عورت مادہ۔ ان کا ذہن انھیں یہ بھی بتا رہا ہے کہ میرا نام کسی رنگ سے متعلق ہے۔ اس رنگ سے نزدیک ترین نام 'لال' ان کی سمجھ میں آتا ہے، شاید اس لیے بھی کہ میں اس وقت جاتی سردیوں کا ہلکا قرمزی دوشالہ اوڑھے ہوئی تھی۔''

بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی، لیکن پوری طرح صاف نہ تھی۔ ''اور وہ.... وہ مادیان، اور بائی، بھائی وغیرہ'' میں نے پوچھا۔

''عورت یا بیوی کی جگہ انھیں 'بائی، بھائی، بی' یاد آیا، اور نر کے مقابل مادہ، اس کے اعتبار سے گھوڑی، جسے 'مادیان' کہتے ہیں،'' وہ کچھ شرماتی ہوئی بولیں۔ اب انھیں خود پر کچھ قابو آ چلا تھا۔

''گویا ان کی ہر بات کو سمجھنے کے بجائے اسے حل کرنا پڑتا تھا؟''

''جی ہاں اور اگر حل کرنے میں دیر ہوئی تو ان کی بے چارگی اور اپنی نا اہلی، حلق میں گویا دو دو خنجر پیوست ہو جاتے تھے۔ لیکن کئی دن کی مشق اور ذہنی کاوش نے مجھے ان کے نئے مزاج کا تھوڑا سا مزاج شناس بھی بنا دیا تھا۔ اوّل تو میں کوشش کرتی کہ ہر ضروری چیز ان کے سامنے رکھی ہو، تا کہ وہ اس کی طرف اشارہ کر سکیں، اور ایسا اگر نہ ہو سکے تو میں خود یاد کر کے پوچھ لوں کہ انھیں کیا فلاں چیز درکار ہے؟''

''ان کے نئے مزاج کی مزاج شناس ہو جانے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مثلاً یہی کہ اگر انھیں پانی مانگنا ہوتا تو تیل کہتے 'تیل'، کہ پانی سے نزدیک ترین لفظ ان کے ذہن میں یہی تھا۔ اگر کھانا مانگنا ہوتا تو کہتے 'چڑیا، دانہ، بوری۔' یا یہ پورا جملہ کہنے کے لیے مجھے بہت پیاس لگی ہے، پانی پلوا دو، وہ عام طور پر اس طرح کے فقرے استعمال کرتے: 'دھوپ.... سوکھ.... نالی.... ترخ.... تیل.... تیل.... تر.... ترخ.... تیل.... تیل.... تیل.... بھرو بھرو بھرو۔' اب میں آپ سے کیا بتاؤں ان کی زبان سے ایسی باتیں سن کر مجھے کیسا معلوم ہوتا۔

''ان دنوں سب سے بڑا خوف مجھے اس بات کا رہتا کہ اگر میں ان کی بات نہ سمجھ پائی، یا رات کسی وقت میری آنکھ لگ گئی اور انھیں کوئی بات کہنا ہوئی تو میں کیا کروں گی۔ اس خوف سے میں چوبیس گھنٹے میں شاید گھڑی دو گھڑی کسی مناسب موقعے سے جھپکی لے لیتی، ورنہ میرا سارا وقت ان کا منھ ہی تکتے گذرتا تھا۔''

ان پر پھر گریہ طاری ہو گیا۔ پھر وہ اپنے کو مجتمع کر کے بولیں، ''اب آپ سمجھے وصیت کے بارے میں آپ کا سوال کس قدر بے محل تھا؟''

بے محل تو نہ تھا، میں نے دل میں کہا۔ کیا ضرور کہ انسان آخری وقت ہی میں وصیت کرے۔ حضرت شیخ اگر ان کے حق میں وصیت کر جاتے تو انھیں اس طرح اپنے گھر سے نکلنا نہ پڑتا۔ لیکن ان سے بحث کا یارا مجھے کہاں تھا، اور شاید کسی کو بھی نہ ہوتا۔

''واقعی آپ نے بڑی کڑی اٹھائی۔ مجھے یقین ہے حضرت شیخ آپ سے راضی گئے اور جس بی بی کا شوہر اس سے راضی ہو اس کا خدا بھی اس سے راضی ہو گا، اس میں کچھ شک نہیں۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے،'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

میں کچھ دیر اور بیٹھا غیر متعلق باتیں کرتا رہا کہ شاید ان کا دل کچھ بہلے۔ اگلے ہفتے پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے میں آداب بجالایا اور راجا میاں کو انعام دے کر رخصت ہوا۔

۱۵

لیکن میں اگلے ہفتے وہاں نہ جا سکا۔ سوداگر کہنے کو کسی کا نوکر نہیں اور سچ پوچھو تو ادنیٰ ترین گاہک کا بھی وہ زرخرید ہوتا ہے۔ پھر اگلا ہفتہ اس سے بھی اگلے ہفتے میں بدلا، یہاں تک کہ دو مہینے گذر گئے۔ اس درمیان میں اپنے منشی یا دوسرے متوسلین کے ذریعے ان کی خبر گیری کرتا رہا۔ ہر دس پندرہ دن پر میں انھیں کچھ زر نقد و جنس بھجوا دیا کرتا۔

اس سال بارشیں بہت سخت ہوئیں اور دیر تک رہیں۔ برسات کے تھمتے ہی کئی دن ایسی چلچلاتی دھوپ نکلی کہ بارش سے تر بوسیدہ مکانات بیٹھنے لگے، یا اس کی دیواریں تڑخنے لگیں۔ کئی لوگ انہدامِ مکانات میں مرے۔ اس پر مرے پہ سو درے کے مصداق بارشوں میں تربتر پھلوں، ترکاریوں اور کوٹھیوں میں بند غلے کی بوریوں کو گرم ہوا نے پھپھوند لگا کر متواتر سڑانا شروع کر دیا۔ شہر کی نالیاں، چو بچے، بڑی بدرویں پہلے ہی پانی اور غلاظت سے بھر رہی تھیں، اب جو انھیں دھوپ لگی تو وہاں کیڑے مکوڑوں اور سڑاندھ کا دور دورہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے شہر میں، خاص کر نخاس کے اس طرف کے شہر میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ روزانہ ہر محلے میں دو دو چار چار آدمی چھیجنے لگے۔ عورتوں اور بچوں پر اس مرض کا خاص حملہ تھا، اور سب سے زیادہ مجبور یہی لوگ تھے۔ ان تک رسائی بھی آسان نہ تھی، اور نہ ہی وہ اپنی بات باہر کے لوگوں کو ٹھیک سے بیان کر سکتے تھے۔ عورتیں باورچی خانوں، گھروں اور کارخانوں میں اچانک امتلا میں گرفتار ہوتیں، کام چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہوتا۔ اکثر تو یہ سمجھ بھی نہ پاتیں کہ انھوں نے ہیضہ کیا ہے۔ بات جب تک سمجھ میں آتی، پانی سر سے اونچا ہو چکا ہوتا۔ بچے باہر گلیوں باغوں میں کھیلتے کھیلتے متلی اور اسہال کی نقاہت سے ڈھیر ہو جاتے۔ انھیں فوراً گھر پہنچانے والا کوئی ملا تو ملا، ورنہ دیر تک گھسٹ گھسٹ کر رو رو کر گھر پہنچنے والے بچوں کے لیے تو موت ہی مقدر تھی۔

طبیب اور وید، جھاڑ منتر کرنے والے پیر اور سیانے، وضیع و شریف، ہیضے نے کسی کے باب میں امتیاز نہ برتا۔ شہر میں معالج بھی گھٹنے لگے اور دوائیں بھی۔ اعلیٰ حضرت دیں پناہ شاہ زمن غازی الدین حیدر بہادر نے

کانپور، الٰہ آباد، سیتاپور سے دوائیں منگوا کر مفت تقسیم کرائیں۔ لیکن ہیضے کا علاج ہی کیا تھا؟ رفع تپ کے لیے جوشاندے کی پڑیاں، پیٹ کا نظام درست کرنے کے لیے جوارش شاہی کی ڈبیاں۔ شاید ہی کسی کو ان سے نفع ہوا ہو۔ مرکبات جو گھر یا دواخانے میں تیار ہو سکتے تھے، ان کے اجزا نہ ملتے، اور اگر ملتے بھی تو ان کے لیے قوتِ خرید سب میں نہ تھی۔ فرنگی معالجوں کے پاس بھی اس وبا کی کچھ دوا نہ تھی، اور بہر حال اہلِ ہند کو انگریز ڈاکٹر کے پاس جانے میں سو طرح کے تکلف درپیش ہوتے تھے۔

ہیضہ پھیلنے کے تیسرے دن میں نے بھورا بیگم صاحب کی خبر گیری کو جانے کی ٹھانی۔ احتیاطاً کچھ دوائیں بھی ساتھ رکھ لیں۔ میں سوار ہونے ہی کو تھا کہ دو باتیں ایک ساتھ واقع ہوئیں۔ ایک تو یہ خبر تھی کہ میرے چاچا کو شاید ہیضہ لگ گیا ہے اور دوسری بات یہ ہوئی کہ بچارا محمد راجا ہانپتا کانپتا دوڑتا پہنچا کہ باجی بی کی طبیعت کل سے بہت خراب ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے بھی ہیضہ کیا۔

میں نے پانچ سیر برف منگوا کر بگھی پر لدوائی، جوارش شاہی کا ایک مرتبان اور جوشاندے کی پڑیاں رکھوائیں۔ محمد راجا کے ہاتھ پر دس روپے رکھے کہ تو گاڑی میں بیٹھ یہ سامان لے چل، میں ابھی آیا۔ اس بیچ برف کچلی کی پوٹلی بنا بنا کر استانی بیگم کے منہ میں رکھتے جائیو۔ جوارش شاہی اور جوشاندے کی ایک خوراک بھی پلا دیجو، اور اگر تپ زیادہ ہو تو برف کے پانی میں رومال بھگو کر ہلکے ہلکے بدن پونچھتے رہیو۔

بچارہ بارہ تیرہ برس کی جان، اس سے اتنے کام اور اتنی ذی دماغی ممکن بھی شاید نہ تھی۔ لیکن پردے کا معاملہ درمیان تھا، ورنہ میرا سائیس بھی مدد کر سکتا تھا۔ میں نے محمد راجا کو بگھی پر رخصت کیا اور دوسرے بوچے پر بیٹھ کر چاچا کے گھر کو روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ انھیں دیکھ کر استانی صاحب کی طرف جلد نکل لوں گا۔ لیکن وہاں طبقۂ اناث پر گریہ کا عالم تھا۔ لڑکوں میں بھی سب کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔ بارے چاچا جی کی طبیعت کچھ بہت بگڑی نہ تھی، تپ کی شدت کم ہو چلی تھی، اور استفراغ بھی ہلکے ہو رہے تھے، پھر بھی، میں ان کے پاس ایک ڈیڑھ پہر بیٹھا رہا کہ سب کو اطمینان ہو لے تو چلوں۔

شام ہوتے ہوتے میں گندہ نالہ پہنچا۔ راستے میں حکیم منن صاحب کو بضد ہو کر گاڑی میں بٹھوا لایا تھا۔ بھورا بیگم کا دروازہ کھلتے ہی اسہال اور پسینے کی بدبو اور استفراغی مادے کی تیز کھٹی مہک کے بھپکے میری ناک تک پہنچے۔ خدا کا شکر ہے کہ ناک پر رومال رکھنے کی بدتوفیقی نہ مجھے ہوئی نہ حکیم صاحب کو۔ کمرے کے اندر بھورا بیگم بے سدھ پڑی تھیں۔ ان کے کپڑے اور پلنگ کے بھی کپڑے سب آلودہ تھے۔

محمد راجا نے رو کر کہا دوپہر کے بعد سے اٹھنے کا نام نہیں لیا ہے، بدن میں جان نہیں رہ گئی۔ میں نے آپ کی دی ہوئی دوائیاں سب کھلائیں لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ ان کے کپڑے کیسے بدلوں، بستر کیسے صاف کروں؟ یہ تو میرے پکارنے پر بولتی بھی نہیں ہیں۔

حکیم صاحب نے نبض دیکھی، ان کے سر کی خفیف سی حرکت سے میں نے سمجھا کہ نبض بہت کمزور ہے۔ بھورا بیگم کا چہرہ بالکل زرد تھا، آنکھیں بند تھیں۔ میں نے بار بار پکارا تو انھوں نے آنکھیں نیم وا کیں۔ خود کو مردوں کے سامنے اس حال میں دیکھ کر ان کے منھ سے سسکی سی نکلی اور انھوں نے ہاتھوں سے اپنا منھ ڈھانپنے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا کہ ایک ہی ڈیڑھ دن کی بیماری میں ان کی کلائی میں چوڑی ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ناخن بالکل سفید تھے۔ حکیم صاحب نے آنکھوں کا نچلا پپوٹا اٹھا کر دیکھا تو حدقۂ چشم کی رگوں میں خون کی ایک چھینٹ بھی نہ تھی، آنکھیں سفید ہو چلی تھیں، ان کی کریلیوں جیسی سبزی اور چمک ماند پڑ چکی تھی۔ ہر چند کہ ان کا گریبان پسینے اور شاید پانی سے تر تھا، لیکن ان کے بستر سے تپ کی گرم لہریں سی اٹھتی محسوس ہوتی تھیں، جیسے گرم مرطوب زمین سے بخارات اٹھتے ہیں۔

حکیم صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بھورا بیگم کو زور کا استفراغ ہوا، پھر ان کے شکم میں شدید پیچش اٹھی، وہ تقریباً دہری ہو کر کراہیں، اسہال پھر شروع ہو گیا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر آ گئے۔ حکیم صاحب نے جلد جلد حسبِ ذیل نسخہ لکھا: گلقند یاقوتی شش تولہ، سکنجبین سادہ چار تولہ، عرق گلاب ہشت تولہ، عرق بادیان یک پاؤ، باہم حل کردہ حسب ضرورت فرو برند۔ نسخہ انھوں نے میرے سائیس کو دیا کہ جلد میرے مطب جا کر بندھوا لا۔ پھر بہت مدھم آواز میں انھوں نے مجھ سے کہا: ''یہ نسخہ بعض حالات میں مجرب ہے لیکن....''

''کوشش آپ بہر حال کریں۔ باقی مالک کے ہاتھ ہے۔ ویسے امید تو مجھے بھی نہیں۔''

''دوا کی خوراک ایک بڑا چمچہ بھر ہے۔ میں ایک خوراک خود پلا کر جاؤں گا۔ اس کے بعد ہر سوا گھڑی یہ خوراک دی جائے گی۔ رات کو حال کہلا دیجیے گا۔''

''بہتر ہے،'' میں نے کہا۔ پھر میں نے اپنے سائیس کو بھیج کر محلے سے ایک سقنی اور ایک حلال خوری بلوائی۔ دونوں کے ہاتھ پر میں نے پچیس پچیس روپے رکھے کہ گھر کی دھلائی کرو، بیگم صاحب کا بستر بدلو، ان کے کپڑے تبدیل کراؤ۔ جب تک خدمت کرو گی پچیس روپے روز پاؤ گی، لیکن دل لگا کر کام کرنا۔ یہ رقم ان

لوگوں کے لیے بارہ بارہ مہینے کی کمائی کے برابر تھی، دونوں بخوشی تیار ہو گئیں۔

تھوڑی دیر میں نسخہ تیار ہو کر آ گیا۔ حکیم صاحب ایک خوراک پلا کر میری بگھی پر رخصت ہوئے۔ میں مریضہ اور گھر کی دھلائی صفائی اور تبدیل لباس کے انتظار میں اپنے بوچے میں ٹھہرا رہا۔ کوئی ایک ساعت بھر کے بعد سقنی نے باہر آ کر کہا کہ بی بی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔

شاید ٹھنڈے پانی سے صفائی دھلائی اور تبدیلی لباس و بستر کی وجہ سے، یا شاید دوا کے اثر سے، یا شاید دونوں کی مجموعی تاثیر کی بنا پر ان کی حالت کچھ سنبھلی ہوئی لگتی تھی، اگرچہ منھ کی زردی ویسی ہی تھی۔ ان کی آنکھیں خفیف سی کھلی ہوئی تھیں۔ میں اندر پہنچا تو ان کے چہرے پر پھیکی مسکراہٹ آئی، لرزتا ہوا ہاتھ وہ سلام کے لیے بدقت ماتھے تک لے گئیں۔ پھر انھوں نے پلنگ پر اپنے پہلو میں رکھے ہوئے صندوقچے کی طرف اشارہ کیا، اور محمد راجا کو آنکھ کے اشارے سے پاس بلا کر التجا بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے دھیمی لیکن صاف آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا، کہ انھیں میرا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو:

''میں آپ کا عندیہ سمجھ گیا بھورا بیگم صاحب۔ حضرت شیخ کے کاغذات جو اس صندوقچے میں ہیں، میں انھیں اپنی تحویل میں لے لوں گا اور محمد راجا کے لیے مناسب بندوبست بھی کر دوں گا۔'' میری آنکھ چھلکنے لگی، میں نے بمشکل اپنی آواز قابو میں کی اور کہا، ''لیکن ابھی عجلت کیا ہے، ان شاء اللہ آپ اچھی ہو جائیں گی۔''

ان کی بھی آنکھیں بہہ نکلیں۔ انھوں نے کچھ اس انداز سے مجھے دیکھا گویا میری طفل تسلیوں کے لیے متشکر، لیکن حقیقت حال سے باخبر ہیں۔ ''یہ.... یہ.... ابھی، اسی وقت....'' انھوں نے صندوقچے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''بہتر ہے، آپ جو ارشاد فرمائیں۔ میں اسے ابھی اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے محمد راجا کے سر پر ہاتھ پھیرا، دونوں عورتوں کو چوکس رہنے اور پوری خدمت کرتے رہنے کی تاکید کی۔

''میں اپنا سائیس یہاں چھوڑے جاتا ہوں۔ کوئی بھی بات ہو، کوئی ضرورت ہو، مجھے فوراً خبر کرنا۔ میں اپنے چاچا کی بیماری سے مجبور ہوں ورنہ رات یہیں رہتا۔''

یہ کہہ، اور بھورا بیگم کو سلام کر، صندوقچہ اٹھا، میں نے بوچے میں بیٹھ کر چاچا کے گھر کی راہ لی۔ میرا دل

کہہ رہا تھا کہ اب بھورا بیگم کو زندہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا اور یہی ہوا۔ میں رات دو ڈھائی بجے چاچا کے یہاں سے واپس آیا، ابھی سونے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ محمد راجا ان کی سناونی لے کر روتا ہوا آیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میرے دل سے دعا نکلی کہ داتا کرتار انھیں وہاں بھی حضرت شیخ سے واصل رکھے:

مصحفی اک جسم کا پردہ جہاں یکسو ہوا
یہ سمجھ تو درمیاں سے اٹھ گئے حائل تمام

صبح ہوتے ہی میں نے شیخ ناسخ، خواجہ حیدر علی صاحب، دیوان درگا پرشاد مضطرب، پنڈت بدیا دھر، میر مستحسن خلیق، اور حضرت شیخ کے دوسرے قریبی احباب اور شاگردوں کو خبر بھجوائی۔ میر مستحسن خلیق اور منشی مظفر علی صاحب اسیر کے گھر کی مستورات نے میت کے غسل، تجہیز اور تکفین کا انتظام کیا۔ درگاہ حضرت عباس کے قریب والے قبرستان میں حضرت شیخ کی پائینتی مدفون ہوئیں۔

سوئم کی مردانہ مجلس کے بعد میں نے حاضرین کو مطلع کیا کہ مرحومہ نے محمد راجا کی سرپرستی کا ذمہ مجھے سونپا تھا۔ اگر صاحبان اقرب کی رائے ہو تو میں ان کا مکان اور دیگر اسبابِ دُنیاوی فروخت کر کے جو رقم حاصل ہو اس میں کچھ اور ملا کر محمد راجا کو اس کے وطن واپس بھجوا دوں۔ سب نے اس تجویز پر احسنت کہا۔

وبا کے ذرا فرو ہوتے ہی میں نے بھورا بیگم کا مکان اور اثاث البیت ساڑھے تین سو روپے میں فروخت کرا دیے۔ وبا کی تباہیوں کے باعث املاک کی قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ میں نے ڈیڑھ سو روپے ڈال کر پان سو کی تھیلی محمد راجے کے ہاتھ میں دی۔ مرزا پور جانے والے ایک قافلے کا معتبر نگہبان دیکھ کر پورا زادِ سفر اس کے حوالے کیا اور محمد راجا کو بہت کچھ نصیحت وصیت کے ساتھ رخصت کیا۔ بھرائی ہوئی آواز اور بھیگی ہوئی آنکھ کے ساتھ محمد راجا نے لکھنؤ کو خیر باد کہا۔ مجھے حضرت شیخ کے قصیدے کا مطلع یاد آیا، اور یہی راجا میاں کو میری آخری نصیحت تھی:

دم میں دم ہے جب تلک لازم ہے ہم کو پیچ و تاب
موج سے پہلو تہی ٹوٹے پہ کرتا ہے حباب

۱۶

زلزلے کے بارے میں کہتے ہیں کہ ایک صدمے کے چند لمحہ بعد لوٹ کر آتا ہے، اور دوسری بار اس کا صدمہ پہلے سے کچھ زیادہ تباہ کن ہوتا ہے۔ اس سال لکھنؤ میں ہیضے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ پچھلی وبا کو فرو ہوئے دس ہی بارہ دن ہوئے ہوں گے کہ دوسری نے آدابا۔ اس بار اس کی ضرب پہلے سے سخت تر اور زیادہ دور تک تھی۔

درباری مل وفا کے چچا تین چار دن میں ٹھیک ہو گئے تھے، اور بھورا بیگم کی موت کا غم بھی اب ہلکا ہو چکا تھا۔ وفا نے بھورا بیگم سے اپنی گفتگوؤں پر مبنی جو یادداشتیں تیار کی تھیں، اب وہ انھیں مرتب کر کے کتابی شکل دینے کے لیے ذہن کو تیار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا اپنے دادا استاد کے حالات کا ایک مبسوط اور معتبر تذکرہ لکھے، ایسا تذکرہ جس میں ان کے بارے میں تمام ضروری معلومات مثلاً شاگردوں کی فہرست، ان کے مجمل حالات اور بعض نمایاں شاگردوں کے کلام پر اصلاحوں کے نمونے بھی موجود ہوں۔ اپنے حضرت شیخ کی خانگی زندگی اور گھریلو حالات کا سب ماجرا لکھنا تو اس کے نزدیک مناسب نہ تھا، لیکن 'مجمع الفوائد' میں مندرج حالات کو مزید تفصیل اور تحقیق کے بعد اپنے تذکرے میں شامل کرنے کا خیال اسے ضرور تھا۔

درباری مل وفا نے مصحفی کی اصلاحیں اکٹھا کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس کام میں اسے اپنے حضرت شیخ کے بڑے شاگردوں مثلاً خواجہ حیدر علی آتش اور منشی مظفر علی اسیر سے تو مدد ملی ہی، لیکن بعض دوسرے شاگردوں مثلاً کنور سین مضطر، درگا پرشاد مضطرب، شاہ الفت حسین فریاد وغیرہ سے بھی معاونت حاصل ہوئی۔

شیخ ناسخ کا مشورہ تھا کہ بھورا بیگم کے بھی کچھ خاص خاص حالات اس کتاب میں درج کیے جائیں۔ شیخ صاحب کا فرمانا تھا کہ اگرچہ مستورات خانہ کی بابت کچھ زیادہ طول بیانی ایسی کتاب کے لیے ناروا ہے جس کے بارے میں توقع ہو کہ اسے باہر کے لوگ اور دور دور کے لوگ بھی پڑھیں گے، لیکن شیخ مصحفی کی ذات اور شاعرانہ کمالات دونوں کی تشکیل میں بھورا بیگم کا بھی حصہ تھا، بلکہ معتد بہ حصہ تھا۔ لہٰذا شیخ صاحب مصر تھے کہ بھورا بیگم کا حال بھی اس کتاب میں اگر مطولاً نہیں تو موجزاً ضرور لکھا جائے۔

کئی دن کے حیص بیص کے بعد درباری مل وفا نے شیخ ناسخ کے مشورے پر پورا پورا عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہرچند شیخ ناسخ نے تاعمر عورتوں سے کوئی سروکار نہ رکھا تھا، لیکن طبقۂ نسا کے مزاج و منہاج، ان کی باطنی اور نفسیاتی کیفیات، ان کی پسند ناپسند اور خوب ناخوب کے بارے میں شیخ صاحب کو فطری اور وہبی فراست تھی۔ ہرچند کہ شیخ صاحب کشتی، بنوٹ اور پنجہ کشی جیسے مردانہ فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ان کا منڈا ہوا سر، نمایاں نوک دار مونچھیں، اور بھاری گول سیاہ فام چہرہ ان کی پہلوانی اور مردانہ صفات پر دال تھے، لیکن درباری مل کو ان میں نسائیت کے بھی انداز نظر آتے تھے۔ درباری مل کا یہ مفروضہ غلط بھی ہوسکتا تھا، لیکن بہرحال شیخ ناسخ کو یہ فن تو خوب ہی آتا تھا کہ وہ جس بات کو لوگوں سے منوانا چاہتے تھے، اسے منوا کر چھوڑتے تھے۔

ان باتوں کے پیش نظر درباری مل وفا کو بھورا بیگم کا احوال اپنی کتاب میں شامل کیے بغیر چارہ بھی نہ تھا اور یہ تو تھا ہی کہ وہ خود بھورا بیگم سے بے حد متاثر تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے اسے بھورا بیگم میں بے حد دلکشی محسوس ہوتی تھی اور یہ لگاؤ اس درجہ تھا کہ اسے خوف تھا لطیف بود حکایت دراز تر گفتم کے مصداق وہ اپنے بیان میں بھورا بیگم کو غیر معمولی اہمیت نہ دے بیٹھے۔

بھورا بیگم سے اسی قلبی لگاؤ کی بنا پر درباری مل نے فیصلہ بھی کیا کہ شیخ مصحفی کے وصال کے بعد ان کے مکان میں بھورا بیگم کے غیر منصفانہ اور سنگ دلانہ اخراج کا بھی پورا پورا حال رقم کیا جائے، خواہ اس میں ان بااثر حضرات کی بدنامی ہی کیوں نہ ہو جو ظفر الدولہ کے بقول غاصبوں کی پشت پناہی پر تھے۔ اس بات کے ثبوت میں، کہ بھورا بیگم اور شیخ مصحفی میں رشتۂ مناکحت باقاعدہ منعقد ہوا تھا، درباری مل وفا نے خواجہ آتش اور شیخ ناسخ سے دستخطی تحریر لے لی تھی کہ وہ نکاح کے وقت بطور گواہان موجود تھے، اور شیخ مصحفی نے مہر بھی اسی وقت ادا کردیا تھا۔

بھورا بیگم کے صندوقچے میں جو کاغذات وفا کو ملے تھے ان میں 'مجمع الفوائد' کے علاوہ شیخ کا آٹھواں دیوانِ اردو، اور ایک مبسوط دیوان قصائد بھی تھا۔ آٹھواں دیوان تو مرتب و مدون تھا، صرف اس کی نقلیں کرانے اور شائع کرنے کی دیر تھی۔ (اس صندوقچے میں ایک تحریر ایسی بھی تھی جس میں اس بات کا اشارہ ملتا تھا کہ بھورا بیگم نے اس دیوان کی اشاعت کے لیے مہدی علی خاں سے درخواست کی تھی، لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔) دیوانِ قصائد مرتب و مدون نہ تھا، اور وفا کا ارادہ تھا کہ ان دونوں کو بہ یک وقت منظرِ عام پر لایا جائے۔

دیوانِ قصائد سے الگ ایک چھوٹا سا بستہ ان ہجویات کا تھا جو شیخ مصحفی اور ان کے شاگردوں نے سید انشا والے جھگڑے کے دوران لکھے تھے۔ اس بستے سے الگ ایک طومار تھا جو لپیٹ کر اور مضبوط باندھ کر رکھا گیا تھا۔ وفا نے اسے کھولا تو معلوم ہوا شیخ مصحفی کے مشہور تیز مزاج شاگرد نورالاسلام منتظر کا تصنیف کردہ قصیدہ ہے۔ سرسری قیاس کے مطابق اس میں آٹھ سو سے کچھ اوپر شعر تھے۔ یہ قصیدہ میرزا رفیع سودا کے جواب میں، اور ہجویہ انداز میں کہا گیا تھا۔

درباری مل وفا نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا کہ سید انشا والے قضیۂ نامرضیہ سے متعلق تمام منظومات کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے کہ ان کو شائع کرنے میں کسی کی منفعت نہ تھی۔ رہا نورالاسلام منتظر کا ہجویہ قصیدہ، تو منتظر نے عرصہ ہوا [1801ء/1802ء کے آس پاس، مرتب] دُنیائے فانی سے انتقال کر کے دارالبقا کی راہ لی تھی۔ ان کے اخلاف کوئی نہ تھے، یا اگر تھے تو وفا کو ان سے واقفیت نہ تھی۔ لہٰذا اس کی نظر میں اس قصیدے کا اب کوئی وارث نہ تھا، اور نہ وہ کچھ ایسا بلند رتبہ کلام تھا کہ اسے دُنیا کے سامنے لایا جائے۔ بدیں وجوہ اس نے یہ قصیدہ بھی اس صندوقچے میں علیٰ حالہ رہنے دیا۔

درباری مل کا ارادہ تھا کہ وبا کا زور فرو ہوتے ہی حضرت شیخ کے دواوین کی کتابت شروع کرا دوں گا۔ اس غرض سے اس نے اس وقت کے مشہور خوش نویس حافظ محمد ابراہیم اور ان کے شاگردِ رشید منشی منسارام کشمیری سے بات بھی کر لی تھی۔ یہ طے پایا تھا کہ تحریر تو زیادہ تر منشی منسارام کی ہوگی، لیکن رباعیاں، قطعے اور تمام عنوانات حافظ صاحب لکھیں گے۔ علاوہ بریں، جتنے اوراق مطلا کیے جائیں گے، وہ بھی حافظ صاحب قبلہ کے ذمے ہوں گے۔

لیکن ما درچہ خیالم و فلک درچہ خیال، بلکہ ما درچہ خیالیم و بلا درچہ خیال کے مصداق، پچھلی آفت کے فرو ہونے پر ابھی چند دن ہی گذرے تھے کہ وہی وبا پھر پھوٹ پڑی۔ شہر کے بہت سے لوگ جو جان کے خوف سے اناؤ، موہان، کانپور، سنڈیلہ، سیتاپور، دریاباد، ردولی اور ہردوئی وغیرہ کو چلے گئے تھے، واپس آکر عجب مخمصے میں پڑے کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مضمون سامنے تھا۔ واپس آنے والوں میں بہتوں کو وبا نے سب سے پہلے دبوچا۔ اس بار حکامِ شاہی بھی وبا کا تدارک کرنے میں اس درجہ مستعد نہ تھے، کہ گذشتہ کئی دن کی محنت نے انھیں کسل مند کر دیا تھا، اور وبا کے اچانک عود کر آنے کے لیے وہ نہ ذہنی طور پر تیار تھے اور تدبیر و معالجہ کے لیے نہ ان کے پاس سامان ہی تھا۔

بھورا بیگم کی موت کے بائیس دن بعد لالہ درباری مل وفا نے ہیضہ کیا۔ رات کے تین بجے اسے استفراغ شروع ہوئے، صبح ہونے کے پہلے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ دن کے ڈھائی تین کا عمل ہوگا جب اس نے آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند کر لیں۔ دادا استاد کے کلام کو محفوظ اور شائع کرنے، خود شاعر بننے اور ناموری حاصل کرنے، اس کے یہ سارے منصوبے اور ارادے اس کے ساتھ جل کر خاک میں مل گئے:

جوہر بینش من در تہہ زنگار بماند
آں کہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت دریغ

درباری مل وفا کی ایک روغنی تصویر اس کے چچا کے دیوان خانے میں کئی سال تک آویزاں رہی۔ 1858ء کی لوٹ میں یہ تصویر ایک انگریز سپاہی کے ہاتھ لگی۔ اس نے اسے ایک قدردان فوجی افسر کے ہاتھ پندرہ روپے میں بیچ دیا۔ پھر ایک دو اور مالکوں کے ہاتھ سے گذرتی ہوئی یہ تصویر لندن کے مشہور وکٹوریہ اور البرٹ میوزم (Victoria and Albert Museum) کی زینت بنی، اور آج بھی وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔ میوزم کی وضاحتی فہرست کا اقتباس جو تصویر کے پاس اطلاعی کارڈ پر درج ہے، اس میں لکھا ہے:

A Hindoo Businessman of Lucknow, by Muhammad A'zam, circa 1825, 30"x24", oil on canvas, British-Indian style.

مصور کے نام، تصویر کی تقطیع، اور طرزِ مصوری کے بارے میں جو اطلاعات ہیں وہ درست ہیں۔ انگریزی طرز کی شبیہ سازی اور کینوس پر روغنی رنگوں کے استعمال کا رواج لکھنؤ میں عہدِ آصف الدولہ ہی سے ہو گیا تھا، لیکن ہندوستانی مصوروں نے کینوس اور روغنی رنگوں کا استعمال غازی الدین حیدر کے بادشاہ بننے کے بعد شروع کیا۔ ہندوستانی مصوروں کو اس طرف راغب کرنے میں غازی الدین حیدر کا شوق بھی شامل رہا ہو گا۔ بہرحال، چند ہی برسوں میں ہندوستانی مصوروں نے مغربی (یا یوں کہیں کہ برطانوی) محاورۂ شبیہ سازی میں اس قدر مہارت حاصل کر لی کہ ان کا عمل اور اس وقت کی مشہور برطانوی شبیہ سازوں، مثلاً زافنی (Zoffany) ولیم ڈینیل (William Daniel)، تھامس ڈینیل (Thomas Daniel)، اور رابرٹ ہیوم (Robert Hume) وغیرہ کے عمل سے کسی طرح کم نہ تھا۔

ہندوستان میں مغربی مصوری کی مشہور مورخ ملڈرڈ آرچر (Milderd Archer) نے مندرجہ بالا

انگریز مصوروں کو ''کمپنی مصور'' کا نام دیا ہے، لیکن یہ بات دو طرح سے غلط ہے۔ اول تو یہ کہ یہ مصور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم یا ماتحت نہ تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی بنائی ہوئی شبیہوں کا تعلق ہندوستانی مصوری کے اس ''اسکول'' سے نہ تھا جسے ''کمپنی اسکول'' کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمپنی اسکول میں شبیہ سازی نہیں، بلکہ بیانیہ مصوری، اور واقعاتی مصوری پر زور دیا جاتا تھا۔

بہر حال، محمد اعظم کی شبیہوں پر زافنی اور ہیوم کے طرز کا اثر نمایاں ہے، لیکن اس معنی میں نہیں کہ اعظم نے بس ان کی نقل کر دی ہے۔ زافنی اور ہیوم کے طرز میں خاص بات یہ تھی کہ وہ صاحب شبیہ کی داخلی شخصیت پر زور نہ دیتے تھے، لیکن اسے پورے رسومیاتی وقار و متانت کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی شبیہوں میں صاحب شبیہ کے چہرے پر طمانیت کی ایسی فضا ہوتی تھی جس سے پتا لگتا تھا کہ صاحبِ شبیہ اپنے ماحول میں پوری مستحکم اور قائم ہے۔ علاوہ بریں ان لوگوں نے مخمل، ساٹن، پوت، زربفت وغیرہ کپڑوں کی مصوری میں بھی درک حاصل کیا تھا۔

محمد اعظم نے درباری مل وفا کی جو تصویر بنائی، اس میں یہ صفات نمایاں ہیں۔ وی اینڈ اے میوزم کے فہرست ساز نے یہ سمجھا کہ تصویر چونکہ لکھنؤ کے ایک تاجر کے گھر سے آئی تھی، اس لیے صاحبِ شبیہ کوئی لکھنوی تاجر ہی ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ وفا نے یہ تصویر دہلوی روپ میں کھنچوائی تھی، اور اس تصویر سے اس کا مقصد اپنے علمی اور شاعرانہ شغف اور اپنی دہلوی اصل کو قائم کرنا تھا۔

محمد اعظم کی تصویروں میں کپڑے، بالخصوص مخمل، ململ، اور ساٹن کو یوں بیان کیا جاتا ہے گویا دیکھنے والا انھیں چھو کر محسوس کر رہا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی درباری مل وفا نارنجی مخمل کی دہلوی قبا زیب تن کیے ہوئے ہے۔ اس میں اور مسلمانوں کی قبا میں صرف یہ فرق ہے کہ وفا کی قبا کے تکمے بائیں طرف ہیں، اور اس کا گھیر دائیں سے بائیں آتا ہے۔ سر پر سیاہ مخمل کی دہلوی چوگوشیہ ٹوپی، جس میں جدت یہ ہے کہ پھندنے کو ذرا اونچا کر کے اس میں جیغے کی طرز پر ایک بہت بڑا سنہرا پکھراج نصب کیا گیا ہے۔ کمر میں آسمانی ململ کا بلدار دوپٹہ جس سے خنجر آویزاں ہے۔ خنجر کا دستہ زرنگار اور اس کی ڈاب آسمانی مخمل کی ہے۔ درباری مل وفا دوزانو بیٹھا ہوا ہے اور اس طرح بیٹھنے میں اس کی قبا کا دامن ذرا کھل گیا ہے، لہٰذا قبا کے نیچے ہلکی فالسئی ململ کے کُرتے کا دامن اور اس کے اوپر آسمانی مخمل کے نیم تن کا ذرا سا کنارہ صاف نظر آتے ہیں۔

صاحبِ تصویر کا رنگ کھلتا ہوا سانولا ہے۔ ڈیل دبلا لیکن کشیدہ قامت، چہرہ ڈاڑھی سے بے نیاز اور

ٹھوڑی مضبوط ہے۔ متوسط گھنے پن کی ذرا چوڑی مونچھیں سیدھی ناک کے نیچے نمایاں ہیں۔ آنکھیں سیاہ، پلکیں لمبی، اور چہرے کا مجموعی تاثر متین تفکر کا ہے۔

وفا کی پشت پر زربفت مڑھا ہوا گاؤ تکیہ ہے لیکن وہ اس کی ٹیک لگانے کے بجائے چوڑے شانوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ پیچھے ایک کھڑکی کھلتی ہے جس میں سے پائیں باغ کے کچھ درخت، اور باغ میں کھلتے ہوئے گلابوں کے پودے نظر آتے ہیں۔ ان کے پیچھے دور پس منظر میں تاک کی دار بست ہے جس پر انگوروں کے خوشے دھندلے دکھائی دیتے ہیں۔ وفا کے سامنے، لیکن ذرا فاصلے پر کچھ بائیں جانب خط لکھنے کی چوکی نما قلمدان ٹھوس چاندی کا، اور اس کے داہنے ہاتھ میں سیہہ کے کانٹے کا قلم اور بائیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے۔ کتاب کے سرورق پر 'عمدۃ الرسائل در احوال و فضائل رشک سحبان وائل استاد الشعرا شیخ غلام ہمدانی مصحفی دہلوی ثم لکھنوی' صاف پڑھا جاتا ہے۔

تجارتی سامان یا سوداگری کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی شے تصویر میں نہیں، ہاں ایک بھاری سی کنجی درباری مل وفا کے دائیں ہاتھ کی جانب ضرور رکھی ہے۔ ممکن ہے اس کنجی کی وجہ سے بھی صاحبان میوزیم کو صاحب شبیہ پر سوداگر ہونے کا التباس ہوا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کنجی کلید گنج حکمت کی علامت ہے، کلید گنج سوداگری کی نہیں:

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا
چوں لالہ رخ و چو سروِ بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طرب خانۂ خاک
نقاش ازل بہرچہ آراست مرا

عرضِ مرتب

مندرجہ بالا بیانیہ درباری مل وفا کی یادداشتوں اور اس کے خاندانی کاغذات، اور خود مصحفی کے کلام نظم و نثر کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے، لیکن مصحفی کے بارے میں کوئی تحریر نورالحسن نقوی کے کام سے استفادہ کیے بغیر معتبر نہیں ہو سکتی، چنانچہ پروفیسر نورالحسن نقوی کی تحریریں بھی پیش نظر رہی ہیں۔ یہ بات مصنف و مرتب کے اظہارِ تشکر کے طور پر عرض کی جا رہی ہے۔

A writer can never invent any thing more

beautiful and powerful than the truth.

-Yuri Tynyanov

لاہور کا ایک واقعہ

یہ بات 1937ء کی ہے۔ میں ان دنوں لاہور میں تھا۔

ایک دن میرے جی میں آئی کہ چلو علامہ اقبال سے مل آئیں۔ اس زمانے میں میرے پاس ہلکے بادامی سفید (off white) رنگ کی امبیسڈر (Ambassador) تھی۔ میں اسی میں بیٹھ کر علامہ صاحب کی قیام گاہ کو چلا۔ ان کی کوٹھی کا نمبر اور وہاں تک پہنچنے کا صحیح راستہ مجھے ٹھیک سے نہ معلوم تھا، لیکن میکلوڈ روڈ، جہاں وہ رہتے تھے، اس کی جائے وقوع سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ لہٰذا کسی خاص مشکل کے بغیر میں علامہ کے بنگلے تک پہنچ گیا۔

سڑک کچھ گرد و غبار سے بھری ہوئی لگتی تھی۔ فٹ پاتھ، یا یوں کہیں کہ فٹ پاتھ کی جگہ سڑک کے دونوں طرف کی چوڑی پٹی، خشک اور گرد آلود تھی۔ علامہ کے بنگلے کا پھاٹک اچھا خاصا اونچا، لیکن لکڑی کا تھا۔ اس پر سلیٹی رنگ کی لوہے (یا ٹین) کی چادر تھی، جس کے باعث پھاٹک بہت بھاری اور کسی پُراسرار سی عمارت کا پھاٹک معلوم ہوتا تھا۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا، اور سامنے مختصر سی اندرونی سڑک (drive way) تھوڑا بل کھاتی ہوئی اصل عمارت کی طرف جاتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ عمارت بلند و بالا، لیکن سال خوردہ اور ذرا بوسیدہ معلوم ہوتی تھی۔ جگہ جگہ مرمت اور ایک جگہ تعمیرِ نو کے آثار بھی باہر سے دکھائی دیتے تھے۔ مجھے احسان دانش

کی نظم "علامہ اقبال کی کوٹھی" یاد آئی جو ایک دو مہینہ پہلے "خیام" یا "عالم گیر" میں چھپی تھی۔ نظم میں کوٹھی کی خستہ حالی پر افسوس اور رنج کا اظہار تھا۔ آخری شعر تھا:

سنتا ہوں اب ہو گئی کوٹھی کی مرمت
احسان اسے دیکھنے جاؤں گا دوبارہ

میں کچھ دیر اس شش و پنج میں رہا کہ گاڑی اندر تک لیے چلا جاؤں، یا فٹ پاتھ ہی پر چھوڑ دوں۔ پھر میں نے دل میں کہا، ممکن ہے پورٹیکو میں اور کوئی گاڑی کھڑی ہو، اور میں اپنی گاڑی اندرونی سڑک پر کھڑی کر دوں تو شاید کسی کا راستہ رک جائے۔ لہٰذا میں نے گاڑی وہیں سڑک کے کنارے لگا دی اور باہر آیا۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے مقابل فٹ پاتھ پر دو تین گمٹیاں ہیں، جیسی کہ پان سگریٹ والے رکھتے ہیں۔ ان گمٹیوں پر نوجوانوں اور بے فکروں کا مجمع سا تھا۔ کچھ نوعمر لڑکے بھی تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ ان کمبختوں کو لکھنے پڑھنے سے مطلب نہیں کہ یہاں پان کی دکان پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔

میں ابھی گاڑی کو تالا لگا ہی رہا تھا کہ اچانک سڑک پار کر کے پانچ سات نوعمر لڑکے میری طرف لپکے۔ ان کے انداز اور ہاتھوں کے اشارے سے مجھے ایسا لگا کہ وہ کچھ مانگ رہے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ تو اور بھی برا ہے۔ یہ لونڈے پیشہ ور بھکاری معلوم ہوتے ہیں۔ یقیناً منظم اور مجرمانہ طور پر بھیک منگوانے والوں کا کوئی گروہ ہوگا جو انھیں اس طرح استعمال کر رہا ہوگا اور ان کی زندگیوں کو بھاڑ میں جھونک رہا ہوگا۔ جب تک میں گاڑی کے دروازے سے چابی نکالوں نکالوں، کوئی چار پانچ لڑکے اور ایک دبلا پتلا منحوس صورت شخص، جس کی شکل سے ہی خباثت ٹپک رہی تھی، اچانک میرے پاس پہنچ گئے، اور قریب تھا کہ ان کے ہاتھ میرے کوٹ تک پہنچ جائیں۔

میں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ وہ لڑکے نہ محلے کے اَن پڑھ بے فکرے آوارہ گرد تھے اور نہ بھیک منگے۔ وہ تو کسی قسم کے پیشہ ور معلوم ہوتے تھے، اپنے جسم کی تجارت کرنے والے۔ میں نے دل میں کہا، معاذ اللہ، یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں؟ یہ بھرا پرا شہر، دن کا وقت، شریفوں کا محلہ اور یہ پیشہ ور لونڈے؟

اب میں نے جانا کہ وہ ہاتھ میرے کوٹ کی جیبوں تک پہنچنا نہیں بلکہ میرے دامن کو تھامنا چاہتے تھے۔ وہ لوگ مجھ سے کوئی سودا کرنا چاہتے تھے۔ دس دس بارہ بارہ سال کے لونڈے، جن کی آنکھوں میں

لڑکپن کی معصومیت کی جگہ عجیب شیطانی چمک تھی، چہروں پر وہ پختگی اور پھیکا پن تھا جو بڑے عمر کے لوگوں کے چہروں پر بھی شاذ ہی نظر آتا ہے۔ میں نے نفرت سے انھیں جھٹک کر ایک طرف ہو جانا چاہا تو وہ میرے پیچھے لپکے۔ توبہ! ایسا تو سنسنی خیز افسانوں میں بھی نہ ہوتا ہوگا۔ یہ واقعہ ہے یا کوئی دیوانہ پن جس میں سے دوچار ہوں، میں نے دل میں کہا۔ پھر تقریباً جست لگاتا ہوا ان کے نرغے سے نکل کر علامہ کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

خدا کا شکر ہے کہ اندر آنے کی ہمت ان بدمعاشوں کو نہ ہوئی۔ پھاٹک تو کھلا ہی ہوا تھا، لیکن وہ پھاٹک کے کھمبے کے پاس آ کر یوں رک گئے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں نفرت سے اپنے ہاتھ اور کپڑے جھاڑتا ہوا دوڑ کر بنگلے کے پورٹیکو میں داخل ہو گیا۔

اب واللہ اس ملاقات کی تفصیل کچھ یاد نہیں۔ اتنا خیال میں ہے، اور وہ بھی دھندلا سا، کہ حضرت علامہ بڑی شفقت سے پیش آئے۔

میں نے گھنٹی بجائی تو ایک بڑے میاں جو وضع سے ملازم اور رشتہ دار کے بین بین لگتے تھے، فوراً برآمد ہوئے۔ میری اطلاع لے کر اندر گئے، اور تقریباً الٹے ہی پاؤں واپس آ کر مجھ سے کہا کہ علامہ صاحب گول کمرے میں تشریف رکھتے ہیں، آپ آ جائیں۔ کچھ یاد نہیں کہ باتیں کس موضوع پر ہوئیں۔ میں ریلوے کا انجینئر، مجھے شاعری سے ذوق تو تھا (اب بھی ہے) اور مجھے علامہ کا بہت سا کلام زبانی یاد بھی تھا، لیکن اس ذوق کے سوا میرے پاس کچھ نہ تھا جو مجھے علامہ سے ہم کلام ہونے کا اہل بناتا۔ یہ بخوبی یاد ہے کہ علامہ نے مجھے بالکل احساس نہ ہونے دیا کہ میری ملاقات ان کے لیے ایک کارِ فضول سے زیادہ نہیں اور نہ ہی انھوں نے کوئی ایسی بات کہی جس سے مجھے اپنے جہل کا احساس ہوتا۔

ملاقات کوئی آدھ گھنٹہ رہی۔ پھر میں نے اجازت لے کر سلام کیا۔ علامہ صاحب کمرے سے باہر تک مجھے چھوڑنے آئے۔ ایک بار جی میں آئی ان سے درخواست کروں کہ آپ کے دروازے کے باہر سڑک کی پرلی طرف جو طائفہ شیاطین ہے، اس کا کچھ تدارک کریں، لیکن میری ہمت نہ پڑی اور پھر اس معاملے سے ان کا مطلب ہی کیا تھا؟ یہ کام تو پولیس والوں کا تھا۔ علامہ کو شاید خبر بھی نہ رہی ہو کہ سڑک پار کی گمٹیوں پر کس طرح کا ہجوم رہتا ہے۔

میں پورٹیکو سے باہر آیا تو اندرونی سڑک (drive way) پر سرمئی رنگ کی ایک پرانی آسٹن اے چالیس

(Austin-A40) کھڑی تھی۔ علامہ کی تو نہ ہوگی، کیونکہ میں نے کہیں سنا تھا کہ ان کے پاس ان دنوں ایک بڑی سی فورڈ تھی۔ خیر، کوئی ملنے والا آیا ہوگا، میں نے دل میں کہا۔ اچھا ہی ہوا جو میں نے اپنی کار باہر کھڑی کی۔

میں علامہ صاحب سے ملاقات کی خوشی میں مگن باہر نکلا۔ ایک لمحے کے لیے میں بھول گیا تھا کہ ان لوگوں سے پھر سابقہ پڑسکتا ہے۔ لیکن باہر سڑک پر آکر میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کئی لڑکے میری کار کے پاس کھڑے تھے، اور کار کو ڈھکیل ڈھکال کر اس کا رخ مخالف سمت میں کر دیا گیا تھا۔ میں کچھ حواس باختہ سا، لیکن ہمت کر کے گاڑی کی طرف بڑھا تو وہ لونڈے مجھ سے تقریباً چمٹ گئے۔ ان کے بدن سے عجیب طرح کی حیوانی اور چکٹے تیل کی سی بو آرہی تھی۔ ابھی میں یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ان سے کس طرح نپٹوں، کہ ایک لمبا سا دبلا پتلا شخص، جو خاکی مائل ملگجے پیلے رنگ کی لمبی قمیص اور اسی کپڑے کی شلوار پہنے ہوئے تھا، میری طرف لپکا۔ اس کے چہرے پر بداخلاقی اور بے حیائی کے آثار اس قدر نمایاں تھے کہ میری طبیعت گنگنا گئی، جیسے میں نے کسی بھیگی لجلجی چیز کو چھولیا ہو۔ اس وقت میں سڑک کی جانب تھا، اور وہ میرے دائیں ہاتھ پر فٹ پاتھ کے رخ پر تھا۔

میں نے پلٹ کر اسے ایک ٹھوکر لگانی چاہی تو اس نے اپنی ٹانگ میری طرف بڑھا کر مجھے روکنا چاہا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ میری ٹانگ کچھ اس طرح اس کی ٹانگ سے الجھی کہ وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور اچھل کر چھپاک سے فٹ پاتھ کے نیچے گہری نالی میں جا رہا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر لپکتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا، دل میں دعا کر رہا تھا کہ گاڑی فوراً اسٹارٹ ہو جائے۔ بارے دعا قبول ہوئی۔ چابی لگاتے ہی گاڑی بڑی خوبی سے اسٹارٹ ہوگئی۔ میں نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور ایکسیلیٹر پر پاؤں پورے زور سے داب دیا۔

گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی۔ میرا ارادہ تھا کہ چند ہی لمحے بعد فرسٹ گیئر سے سیکنڈ میں آجاؤں گا، کیونکہ سیکنڈ میں طاقت بہت تو ہوتی ہی ہے، ساتھ ہی اس میں رفتار تیزی سے بڑھانے کا بھی امکان رہتا ہے۔ حسبِ ارادہ میں نے گاڑی سیکنڈ میں ڈالی ہی تھی کہ محسوس ہوا گاڑی چل نہیں پا رہی ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی طاقت اسے پکڑ کر الٹی طرف کھینچ رہی ہو۔ میں نے پیچھے نگاہ کی تو دیکھا کہ کئی لونڈے کار کے بمپر اور بوٹ سے چپکے ہوئے پورا زور لگا کر گاڑی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں مصروف تھے۔ ادھر میں ایکسیلیٹر پر پاؤں پورے زور سے دبائے ہوئے ہوں، اور ادھر وہ دس بارہ بچے گاڑی کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں، اور اس کامیابی سے، کہ گاڑی کی رفتار چیونٹی کی رفتار سے آگے نہیں بڑھ رہی تھی۔

میں نے کندھے سکوڑ کر سر کو یوں جھکا لیا گویا خطرہ میرے پیچھے نہیں، بلکہ سامنے ہے، اور میں پوری قوت کے ساتھ سامنے کسی چیز سے ٹکرانے والا ہوں۔ سر جھکا کر اور بدن چرا کر میں نے اپنی پوری قوت ارادی و جسمانی اس بات پر لگا دی کہ گاڑی کو اتنی ریس دوں کہ ان غول بچوں کو جھٹکتا ہوا نکل جاؤں۔ لیکن ان پلیدوں میں خدا معلوم کتنی طاقت آ گئی تھی کہ میرا پندرہ ہارس پاور کا انجن، میری اپنی قوتِ مدافعت، سب بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ گاڑی بس گھسٹتی ہی رہی اور سو پچاس گز ہی کے اندر مجھے یقین ہو گیا کہ یا تو گاڑی اب بہت جلد بند ہو جائے گی، یا ان لونڈوں کی طاقت اسے آگے بڑھنے سے روک ہی دے گی۔

میں اب سراسیمہ ہو چلا تھا۔ میرے ذہن میں بس یہ بات گردش کر رہی تھی کہ یہ گاڑی جسے میں اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے کافی سمجھ رہا تھا، میرے لیے موت کا پھندا، یا فنا کا جال ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر میں اسی میں بند رہ گیا تو چند ہی منٹ جاتے ہیں کہ غولانِ شیطانی مجھے آگے بڑھنے سے روک دیں گے، مجھے گاڑی سے کھینچ لیں گے اور پھر خدا جانے میری کیا درگت بنائیں۔ وہ شخص، جسے میں نے نالی میں ڈھکیل دیا تھا، وہ تو شاید میری تکا بوٹی کر کے پھینک دے۔

[اب، کئی سال بعد جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت میرا استدلالی، ترقی یافتہ دماغ، جسے اصطلاح میں "یمینی دماغ" یا Right Brain کہتے ہیں، معطل ہو چکا تھا، اور میں اپنے "یساری دماغ" یعنی Left Brain کے قبضے میں تھا۔ یساری دماغ، جسے Repitilian Brain بھی کہتے ہیں، انسانوں، رینگنے والے جانوروں، اور انڈا دینے والے جانوروں میں مشترک ہے۔]

[کہا گیا ہے کہ ارتقائی عمل کے کروڑوں برس نے اس دماغ کو پیدا کیا اور چونکہ یہ دماغ رینگنے والے جانوروں اور پھر انڈا دینے والے جانوروں سے ہو کر انسان تک پہنچتا ہے، اس لیے اسے حشراتی دماغ (Repitilian Brain) بھی کہا جاتا ہے۔ ہماری بنیادی اور 'سفلی' جذبات سب اسی دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ شہوت، خوف، بھوک کا احساس، تشدد، تحفظِ جان، خطرے سے فرار اختیار کرنا، وغیرہ سب جبلتیں اسی دماغ کی دین ہیں۔ دُنیا میں زیادہ تر جرائم پیشہ لوگوں، خاص کر قاتلوں اور زنا بالجبر کے مرتکب لوگوں میں یساری دماغ کو یمینی دماغ سے زیادہ فعال پایا گیا ہے۔ اس کی جگہ چونکہ سر کے بائیں اور نچلے حصے میں ہے، اس لیے اسے 'یساری' کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف، یمینی یا Right Brain کا ارتقا اور بھی کئی کروڑ برس میں ہوا۔ استدلال، دروں بینی اور تعقل کی صفات اس یمینی دماغ کی پیداوار ہیں۔

[یساری دماغ کو استدلال اور تعقل اور پچھتاوے سے کوئی علاقہ نہیں۔ جب یہ دماغ حاوی ہو جاتا ہے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔ بعض دماغی مریضوں میں بھی یمینی دماغ کی کمزوری اور یساری دماغ کی مضبوطی کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔]

بہر حال اس وقت مجھے ایک ہی دھن تھی، کہ کسی طرح اس گاڑی سے نکل بھاگوں۔ گاڑی میں جائے قیام نہ تھی تو باہر جائے فرار ضرور ہوگی، یہ میرا 'استدلال' تھا۔ لیکن گاڑی کس طرح چھوڑوں، اور کس مقام پر، یہ ابھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

اچانک میں نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ سڑک پر کوئی راہ گیر نہ تھا۔ خالی راستہ قطعاً سنسان، بھائیں بھائیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔ خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور، میرے ذہن میں کبیر کا مصرع آیا۔ میکلوڈ روڈ پر زیادہ بھیڑ بھاڑ تو کبھی نہ ہوتی تھی، لیکن بالکل سناٹا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دو موٹریں تو منٹ دو منٹ پر گذر ہی جاتی تھیں۔ علامہ صاحب کے مکان سے ذرا آگے علامہ کے مشہور دوست سر جگندر سنگھ کا عظیم الشان بنگلہ تھا۔ (کیسے پتے کی بات جگندر نے کل کہی۔) ان کے پھاٹک پر ایک دو ملازم بھی ہمیشہ کھڑے نظر آتے تھے۔ سردار صاحب کے بنگلے کے ذرا ہی فاصلے پر بہرام جی خدائی جی کی دکان ایک بنگلہ نما مکان میں تھی۔ یہ لوگ ولایت سے عمدہ قسم کی شرابیں اور سگار منگاتے تھے۔ کوئی ایک دو فرلانگ پر وہائٹ وے، لیڈلا (Whiteway, Laidlaw) کی عالی شان دو منزلہ دکان تھی۔ اس کے سامنے دو چار موٹریں، ایک دو شکرمیں، پانچ سات بگھیاں، تو ہر وقت ہی کھڑی رہتی تھیں۔ آج خدا جانے کیا بات تھی کہ نہ وہ کوٹھیاں دکھائی دیتی تھیں، نہ کوئی دکان ہی نظر آئی تھی۔ حتیٰ کہ پولیس کا کوئی سپاہی بھی ٹریفک چوراہے پر نہ تھا۔

[اب جو غور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میری رفتار اس قدر دھیمی تھی کہ بس چیونٹی کی چال سمجھیے اور جن عمارتوں، دکانوں کا میں نے اوپر ذکر کیا، وہ مجھ سے چند فرلانگ تو تقریباً دور تھیں، اس وقت کہاں سے دکھائی دے جاتیں؟ لیکن میں نے کہا نا کہ اس وقت میرا انسانی دماغ نہیں، بلکہ حشراتی (Reptilian) دماغ مجھ پر حاوی تھا۔ آج مجھے یقین ہے کہ اگر میں ہمت کر کے اس گاڑی کو چلاتا رہتا، اسپیڈ چاہے جو بھی رہتی، تو دس پانچ منٹ میں کسی محفوظ یا آبادی والی جگہ پر ضرور پہنچ سکتا تھا۔ میرا پیچھا کرنے والے مجھ پر ہرگز ہاتھ نہ ڈال سکتے تھے۔ گاڑی کو وہ بالکل روک سکتے نہ تھے اور اگر وہ گاڑی کو چھوڑ کر کھڑکی کی راہ سے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے تو میں بآسانی اتنی دیر میں گاڑی کی رفتار بڑھا کر ان کے خطرے سے آزاد ہو سکتا تھا۔ لیکن

اس وقت تو یہ لگ رہا تھا کہ یہ گاڑی نہیں موت کی کوٹھری (Death Cell) ہے۔ اگر میں اسی میں بیٹھا رہا تو موت کا شکار ہو جاؤں گا۔]

میں نے دل میں کہا کہ اگر کوئی مضبوط کھمبا، یا دیوار، راستے میں ملے تو گاڑی اس سے ٹکرا دوں۔ دھما کا ہوگا تو دس پانچ لوگ لامحالہ جمع ہو جائیں گے۔ ممکن ہے کوئی پولیس والا بھی آ نکلے یا شاید میں زخمی، یا بے ہوش ہی ہو جاؤں۔ تب تو یہ طائفۂ بیابانی میرا پیچھا چھوڑے گا۔ اس وقت میرے (حشراتی) دماغ میں یہ بات نہ آئی کہ موٹر کو واقعی کارگر ایکسیڈنٹ کرنے کے لیے رفتار ضروری ہے۔ بیس بائیس کی رفتار تو ہو، اور اس وقت میری رفتار چار پانچ سے متجاوز نہ تھی اور نہ ہی مجھے یہ بات سوجھی تھی کہ زخمی یا بے ہوش ہو کر تو میں اور بھی ان کے رحم و کرم پر ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے ہسپتال لے جانے کے بہانے اٹھا کر کہیں بھی لے جا سکتے تھے، یا وہیں کا وہیں مجھے مزید گزند پہنچا سکتے تھے۔ اسے میری خوش قسمتی کہیے کہ اس وقت میرے سامنے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ٹکرا کر میں اپنا یہ عقل مندی پر مبنی 'منصوبہ' پورا کرتا۔

اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ وہ پیلی ملگجی قمیص والا گھناونا شخص بھی ان لونڈوں کا معاون ہو کر میری گاڑی کو پیچھے سے روکنے میں شامل ہو گیا ہے۔ ''اس کی بھی طاقت شامل ہو گئی ہے، اب تو میں بچ نہ سکوں گا،'' میں نے دل میں کہا۔ ابھی گاڑی کی رفتار میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ ملگجی قمیص والا گاڑی کو رکوانے میں جان لڑا دے گا۔

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی،'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ مجھے اپنے والد مرحوم کا ایک خادم یاد آیا جو ایسے موقعوں کے لیے حسبِ ذیل شعر پڑھا کرتا تھا:

کب تک چھپیں گی کیریاں پتوں کی آڑ میں
آخر کو آم بن کے بکیں گی بزار میں

عام حالات میں مجھے جب بھی یہ شعر یاد آتا تو ہلکی سی ہنسی بھی آتی۔ لیکن آج رونا آ رہا تھا۔ یہی نہیں، اپنا بچپن بھی اس وقت مجھے بڑی آرزو بھری ارمان انگیز گلابی نارنجی روشنیوں کے سائے میں گھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا، حالانکہ دراصل میرا بچپن خاصا ناخوشی سے بھرا ہوا اور بھلا دینے کے لائق تھا۔

[کہتے ہیں ایک بار بسمل سعیدی نے جوش صاحب سے کہا تھا کہ جوش صاحب آپ کے کلام میں سوز و

گداز کی اک ذرا کمی نہ ہوتی تو آپ اور بھی بڑے شاعر ہوتے۔ جوش صاحب نے کہا، ''ہرگز نہیں، میرے یہاں سوز و گداز کی کمی ہرگز نہیں۔ لو یہ شعر سنو:

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے
عمر کا بہترین حصہ ہے''

بسمل سعیدی نے قہقہہ لگا کر کہا، ''واللہ جوش صاحب بچپن کے مضمون پر اس سے بہترین شعر میں نے نہیں سنا تھا۔'' خیر، جوش صاحب اور بسمل صاحب کے مخول ایک طرف، لیکن سچ بات یہ ہے کہ میرا بچپن اپنے بڑوں سے پٹتے، اور روتے ہی گذرا تھا۔ پھر بھی] کاش میں ابھی سات ہی آٹھ برس کا ہوتا، میں نے دل میں تقریباً روتے ہوئے کہا۔ اس صورت میں آج اس موٹر میں نہ تو ہوتا، جہاں میری عزت اور جان دونوں کے لالے پڑے ہیں۔ آخر میں نے کسی کا بگاڑا بھی کیا ہے؟

مجھے صغر سن کے وہ دن یاد آ گئے جب ذرا ذرا سی بات پر، اور اکثر بے وجہ ہی، مجھ پر ڈانٹ یا مار پڑتی تھی یا اگر کوئی وجہ ہوتی ہو گی تو میرا ننھا سا ذہن اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ کسی بات کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ ان دنوں میرے محدود دماغ کا فیصلہ تھا۔ بعد میں، جب مجھے علت یعنی Cause اور سبب، یعنی Reason کا فرق معلوم ہوا تو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ لازماً ایسا نہیں کہ کسی چیز کی علت معلوم ہو جائے تو اس کا سبب بھی معلوم ہو جائے۔ مثلاً کسی شخص کا قتل ہو جائے، اور لاش کا معائنہ کر کے ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ وہ پستول کی گولی سے مرا ہے، تو یہ محض علتِ قتل معلوم ہوئی۔ اس سے یہ کہاں معلوم ہوا کہ اس کے قتل کا سبب کیا ہے؟

اس وقت جو میں اپنی جان کے خطر میں ہوں، تو اس کی علت یہ ہے کہ میں کسی مقام پر کسی وقت موجود تھا۔ اگر نہ ہوتا تو یہ بات بھی نہ ہوتی۔ لیکن میرے وہاں موجود رہنے کی کچھ علت تھی، اور اس علت کی بھی کچھ علت ہو گی، اور پھر اس علت کی بھی....

تو کیا ساری دُنیا محض علل کی داستان ہے؟ اسباب کہیں نہیں؟ یا شاید ہمارا یہاں آنا کسی سبب سے ہو؟ 'اسباب پڑے یوں کہ کئی روز سے یاں ہوں،' میر تقی میر نے چپکے سے میرے کان میں کہا۔ کون ہے اسباب؟ ہمیں یہاں کیوں لایا گیا؟ کیا اس لیے کہ میں اپنی موٹر میں بیٹھا ہی بیٹھا جسم فروش لونڈوں اور ان کے سرخیل

کی ناپاک حرکتوں کا ہدف بنوں؟ میں نے تقریباً ہسٹیریائی انداز میں اپنے آپ سے کہا۔

اچانک مجھے کار کے پیچھے، اور باہر سڑک پر سے کچھ غلغلہ سنائی دیا۔ معلوم ہوا کچھ لوگ اور بھی میرے دشمنوں کی امداد کو آ گئے ہیں۔ گاڑی کی رفتار اب مزید پست پڑ گئی تھی یا شاید وہ میرا وہم رہا ہو۔ لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں ایک لمحہ بھی رکنا کسی برے انجام کو دعوت دینا ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے شیطان صفت متعاقبوں نے علامہ صاحب کی کوٹھی میں قدم نہ رکھا تھا۔ شاید وہ گھروں کے اندر آنے سے ڈرتے ہوں؟ لہٰذا سب سے اچھا یہ ہوگا کہ میں گاڑی کو کسی مناسب پھاٹک میں اڑا دوں، اور خود نکل بھاگوں۔ نکل بھاگوں گا کس طرح، وہ لوگ جھپٹ کر مجھے پکڑ تو نہ لیں گے؟ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سڑک پر میری جانب، یعنی بائیں جانب، ایسی ہی محفوظ سی ایک کوٹھی دکھائی دی۔ ''وہ مارا''، میں نے دل میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک زبردست جھٹکے سے اسٹیرنگ کو بائیں گھما کر گاڑی کو پھاٹک میں ترچھا ڈال کر پوری طاقت سے بریک لگائی۔ بائیں گھومنے کے جھٹکے، اور پھر بریک لگنے کے جھٹکے سے گاڑی پھاٹک کے بیچ میں ترچھی ہو کر بند ہو گئی۔ تعاقب کرنے والے بھی ان جھٹکوں کی مرکز گریز (Centrifugal) قوت کی تاب نہ لا کر پیچھے ادھر ادھر گر پڑے۔ میں نے مڑ کر نگاہ کی تو میرا نزدیک ترین متعاقب مجھ سے کوئی دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کھینچ کر چابی گاڑی میں سے نکال لی اور اندھا دھند دوڑتا ہوا اس کوٹھی، یعنی اپنی پناہ گاہ میں داخل ہو گیا۔

بڑا سا بنگلہ تھا، لیکن ذرا سنسان سا۔ سامنے کوئی نوکر، مالی یا چوکی دار نہ تھا۔ اونچی کرسی کا برآمدہ، جس میں پرانی وضع کی آرام کرسیاں اور مونڈھے تھے۔ دیوار سے لگی ہوئی سنگار میز اور قد آدمی آئینہ، اس کے پاس ہی ہیٹ وغیرہ رکھنے کا اسٹینڈ۔ زیادہ دیکھنے کا موقع تھا نہ ہمت۔ میں مکان کی لمبائی میں دوڑتا چلا گیا۔ برآمدے کے اختتام پر ایک کمرہ سا دکھائی دیا۔ اس کا دروازہ کچھ نیم وا، کچھ بھڑا ہوا سا تھا۔ میں نے جھٹ سے اس میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

کمرے میں فنائل کی ہلکی سے بو تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ باتھ روم ہے۔ ٹٹول کر بجلی کا سوئچ تلاش کیا۔ زرد زرد روشنی ہوئی تو دیکھا کہ آٹھ سات فٹ لمبا، اسی قدر چوڑا، باتھ روم اور غسل خانہ ہے۔ کموڈ کی جگہ نئے ڈھنگ کا فلش تھا۔ اوپر لوہے کا ٹینک، اس سے زنجیر لٹکتی ہوئی۔ اس طرح کے فلش اس وقت ہندوستان میں بہت کم تھے۔ میں اس لیے واقف تھا کہ ریلوے کی دو بڑی کمپنیاں، جی آئی پی

ریلوے (G.I.P. Railway) اور بی بی اینڈ سی آئی ریلوے، (B.B. & C.I. Railway) اپنے اسٹیشنوں پر فرسٹ کلاس ویٹنگ روموں میں ایسے باتھ روم بنوا رہی تھیں۔ میں خود جی آئی پی ریلوے میں ملازم تھا۔

مجھے بری طرح پیشاب محسوس ہو رہا تھا۔ خدا معلوم ڈر کی وجہ سے، یا واقعی۔ لیکن ابھی میری پوزیشن بالکل غیر محفوظ تھی۔ ادھر ایسا لگ رہا تھا کہ پیشاب ضرور کرنا چاہیے، پتا نہیں پھر موقع ملے نہ ملے۔ میرا ہاتھ پتلون کی بیٹی کی طرف گیا ہی تھا کہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ پتا نہیں وہ میرے دشمن تھے، یا گھر کا کوئی فرد جسے شک ہو گیا تھا کہ کوئی باہری آدمی باتھ روم میں گھس آیا ہے۔ میں بہر حال خود کو اس حالت میں نہ سمجھتا تھا کہ دروازہ کھول کر باہر آؤں۔ لیکن باتھ روم میں خود کو چھپائے رہنے کا امکان کہاں؟ اور نکلوں تو جاؤں کہاں؟ پھر میری نگاہ پرلی طرف کی دیوار پر پڑی تو معلوم ہوا کہ ادھر بھی ایک دروازہ ہے۔ اب وہ جہاں بھی کھلتا ہو، میرے لیے وہی دروازہ نجات کا دروازہ تھا۔

میں نے آہستہ سے پرلی طرف کی کنڈی کھول لی۔ دل میں خدا کا شکر بجالایا کہ دروازہ دوسری طرف سے بند نہ تھا۔ اول تو دو دو دو دروازے توڑنے میں ان لوگوں کو وقت لگے گا، دوسری بات یہ کہ جب اتنا شور وغل اور توڑ پھوڑ کا ہنگامہ ہو گا تو گھر میں کوئی تو متوجہ ہو گا۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہ رہا تھا کہ میرے اپنے خیال کے مطابق ان شیطینوں کا طائفہ گھروں میں گھس نہ سکتا تھا۔ لہٰذا اغلب تھا کہ دروازہ پیٹنے والا (والے) اہل خانہ سے ہی متعلق ہو(ں)۔

دروازے سے باہر آ کر میں نے دیکھا کہ وہی برآمدہ اور آگے تک چلا گیا ہے۔ میرے دائیں جانب چار دیواری تھی، لہٰذا برآمدے کی شکل اب راہداری کی سی تھی۔ باتھ روم کے دروازے سے متصل ہی چار دیواری میں ایک دروازہ تھا جو سڑک کی طرف کھلتا ہو گا۔ دروازے کا ایک پاٹ کھلا ہوا تھا، اور اس میں سے تین ملازم صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ دہلیز اور سیڑھی پر بیٹھے ہوئے باتوں میں اس قدر محو تھے کہ انھوں نے میری موجودگی بالکل محسوس نہ کی اور ظاہر ہے کہ میں بھی ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔

راہداری میں گربہ قدم چلتا میں کوئی دس گز گیا ہوں گا کہ ایک دروازہ نظر آیا جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ ادھر باتھ روم کا باہری دروازے ٹوٹنے کی سی آواز ہلکی سی میرے کان میں آئی۔ میں نے مزید توقف کے بغیر گھر کے دروازے میں قدم رکھ دیا۔

وہاں کمرہ نہ تھا، بلکہ ایک وسیع برآمدہ، سہ دری نما، جس میں کسی مصروف گھر کا تاثر صاف محسوس ہوتا تھا۔

ایک جوڑے پلنگ پر دو عورتیں بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔ ان کی شکلیں اور وضع قطع اب بالکل نہیں یاد رہی۔ لیکن پلنگ کے پاس ایک بڑی سی گدے دار آرام کرسی (Frog Chair) پر دوہرے، گداز بدن کی ایک ادھیڑ، قبول صورت خاتون تھیں جو ساڑی میں ملبوس تھیں۔ ان کے سامنے کرسیوں پر دو نسبتاً نوجوان عورتیں سویٹر بن رہی تھیں۔ میں نے قیافہ کیا کہ ادھیڑ عمر خاتون ہی ان میں صاحب اقتدار ہیں۔ میں نے انھیں سلام کیا۔ وہ میرے انداز، لب ولہجہ اور میری حواس باختگی سے یہ تو شاید سمجھ ہی گئیں کہ میں کوئی چور اچکا نہیں ہوں۔ باقی لڑکیوں/عورتوں میں ضرور ایک طرح کی گھبراہٹ نظر آئی، لیکن کسی نے شور وغیرہ کچھ نہ مچایا۔ ممکن ہے کہ وہ ان خاتون کی وجہ سے خود کو محفوظ سمجھ رہی ہوں۔ خاتون نے میرے سلام کا جواب نہ دیا، بلکہ ذرا درشت لہجہ میں کہا:

''کون ہو تم؟ یہاں کیسے آئے؟ چلو، فوراً چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ خوف زدہ سے زیادہ جھنجھلائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

''خدا کے لیے مجھے پناہ دیجیے، میں بڑے خطرے میں ہوں،'' میں نے سرگوشی کی سی آواز میں کہا۔

''کیوں؟ کیا پولیس تمھارے پیچھے ہے؟''

''یہ سب بعد میں بتاؤں گا۔ پولیس وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔ میں ایک باعزت انجینئر ہوں۔ کچھ بدمعاش میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔''

''بدمعاشوں ہی کے پیچھے تو بدمعاش لگتے ہیں۔ شریفوں کو ایسے لوگوں سے کیا کام؟ چلو نکلو۔ ابھی نکلو۔ نہیں تو میں نوکروں کو بلواتی ہوں۔''

''پھر میرا خون ہو جائے تو آپ اللہ کو کیا منھ دکھائیں گی؟'' اچانک میرے دل میں بجلی کی طرح یہ خیال کوندا کہ یہ خاتون ہزار باعزت سہی، لیکن خاتونِ خانہ نہیں ہیں۔ ''للہ آپ کسی ذمہ دار شخص کے پاس لے چلیں۔''

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ پہلو بدل کر بولی، ''ذمہ دار؟ ذمہ دار اور کون ہے یہاں؟ تم بتاؤ، تمھارا معاملہ کیا ہے؟'' اس کا لہجہ اب ذرا تیز تر تھا، اور زور لفظ 'تم' پر تھا۔

میں نے اٹک اٹک کر اپنا حال بتانا شروع کیا۔ یہ بھی ڈر تھا کہ بات کچھ ایسی عجیب ہے کہ ان لوگوں کو یقین شاید ہی آئے گا۔ اگر ایسا واقعہ کوئی مجھ سے بیان کرتا تو میں اسے مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دیتا۔ اس خوف کے باعث میرا لہجہ خود مجھے ہی تیقن سے عاری لگ رہا تھا، اور میری روداد اور بھی ناقابلِ یقین معلوم

ہو رہی تھی۔ لیکن خیر، وہ لوگ تو توجہ سے سن رہے تھے، اور داستان تھی ہی کتنی لمبی؟ چند منٹ سے بھی کم میں تمام ہو جاتی۔ میں نے بولنا شروع کیا، اور دل میں دعا کرتا رہا کہ ان لوگوں کو اعتبار آ جائے۔

وہ دروازہ، جس سے میں داخل ہوا تھا، یوں ہی کھلا ہوا تھا۔ سب کے دھیان میری کہانی کی طرف تھے۔ اچانک پیلی ملگجی قمیص والا شخص بڑے اطمینان سے اسی دروازے سے داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا پستول تھا۔

میں نے دوڑ کر ادھیڑ عمر خاتون کی کرسی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کی۔ لیکن اس شخص نے پستول کا رخ انھیں خاتون کی طرف کر دیا اور عجیب نخوت بھرے، سرد، سفاک، حقارت آمیز لہجے میں بولا:

''بول، میں تیرا کون لگتا ہوں؟''

میرے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ تو کیا یہ سب لوگ ایک ہی تھے؟ میں نے سراسیمہ ہو کر دل میں کہا۔

ابھی ہم میں سے کوئی اس حال میں نہ تھا کہ اس نئے خطرے سے دفاع کے لیے کچھ کرتا۔ ان سب عورتوں کے بدن بالکل ساکت تھے، جیسے پتھر کی مورتیں ہوں۔ میں جس جگہ چھپنے کی سعی ناکام کر رہا تھا، اس کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ اس دروازے کے پیچھے بھی کوئی ہے۔

میں ابھی یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ دروازے کے پیچھے واقعی کوئی ہے بھی کہ نہیں، اور وہ میرا دوست ہے کہ دشمن۔ دفعتاً وہی دروازہ دھڑاکے کی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک سیاہ سی چیز سائیں سائیں کرتی ہوئی اس میں سے نکلی اور باہر آنگن میں گردباد کی طرح قائم ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ وہ ساری عورتیں منھ کو دوپٹے سے ڈھانکے بے ہوش سی پڑی ہیں۔ پستول والا گھٹنوں کے بل تھا، اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ ہاتھ کچھ اس طرح سینے پر تھے گویا بندگی بجا لا رہا ہو۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ادھیڑ عمر خاتون کے قدموں میں آ رہا تھا۔ لیکن خود انھیں کسی چیز سے مطلب نہ رہ گیا تھا۔ وہ گردن ڈھلکائے، ساڑی کے پلو میں منھ کو چھپائے آرام کرسی پر کپڑے کی گڑیا کی طرح ڈھیر تھیں۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ دل گویا بیٹھ کر جوتے کے تلے میں آ گیا تھا۔ لیکن دماغ (وہی حشراتی دماغ؟) تھوڑا بہت حاضر تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ بھاگ نکلنے کا اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ ممکن ہے اپنی گاڑی کو بھی اس گھر کے پھاٹک سے نکال لے جا سکوں۔

میں ڈرتا، چوروں کی طرح قدم رکھتا، بلکہ تقریباً گھسٹتا ہوا، اپنی پناہ گاہ سے باہر آیا۔ [یہ 'پناہ گاہ' کی بھی

خوب رہی!] آنگن میں وہ سیاہ گرد باد ابھی اسی طرح قائم تھا۔ سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ آواز کچھ ماتمی سی لگی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ خیال تھا کہ مجھے قطعاً کسی قسم کی آواز نہ کرنی چاہیے۔ بھلا وہ گرد باد کیا تھا، کیا کوئی بدروح تھی، یا کوئی خدائی قہر؟ لیکن میرے شور کرنے نہ کرنے سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ شاید یہ بھی میرے حشراتی ذہن کا کرشمہ تھا، کہ اکثر رینگنے والے جانور خطرے کے سامنے دم سادھ کر پڑ جاتے ہیں، گویا مردہ ہوں۔

ململجی قمیص والے کے پاس گذرتے ہوئے میرے جی میں آئی کہ اس کی پسلیوں پر اپنے بوٹ سے ایک زوردار ٹھوکر لگاؤں۔ حرام زادہ مر تو چکا ہی تھا۔ لیکن نہ مرا ہو تو؟ اور وہ سیاہ گرد باد؟ میں اس ارادے سے باز رہا۔ پھر میں نے دل میں کہا کہ پستول ہی اٹھا لوں، شاید وہ اخوان الشیاطین ابھی باہر بیٹھے ہوں۔ مگر تھوڑی سی عقل جو واپس آ رہی تھی، اس کا مشورہ تھا کہ تم نہ پستول چلانا جانتے ہو اور نہ اس کا لائسنس ہی تمھارے پاس ہے۔ کیوں خواہ مخواہ ایک اور مصیبت کو دعوت دیتے ہو؟ ایک مشکل سے تو مر مر کے جینے کی نوبت آ رہی ہے، اب اور کوئی حماقت نہ کرو۔ چپکے یہاں سے نکل چلو۔ ''مگر وہ عورتیں، اور یہ ململجی قمیص والا، کہیں یہ سب مر نہ گئے ہوں۔ کہیں پولیس میرا پیچھا نہ کرے،'' میں نے اپنے دل میں کہا۔

''بے وقوف آدمی،'' میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈانٹا۔ ''اب دیر کرو گے تو پولیس نہ آتی ہوگی تو بھی آ جائے گی۔ اگر یہ لوگ مر بھی گئے ہیں تو تم سے کیا مطلب؟ ہاں اگر پولیس نے یہاں تمھیں دیکھ لیا تو البتہ مشکل ہوگی۔ بندھے بندھے پھرو گے۔ نوکری سے الگ ہاتھ دھونا پڑے گا۔ چلو، یہاں سے فوراً چل نکلو۔''

میں اس قدر آہستہ آہستہ وہاں سے نکلا گویا انڈوں پر چل رہا ہوں۔ گلیارے کے دروازے پر اندھیرا تھا۔ وہ تینوں نوکر بھی شاید سو گئے تھے، کہ بے ہوش تھے، پتا نہیں۔ میں ان کو چپکے سے پھاند کر اس آسیب سے باہر آ گیا۔

سڑک پر روشنیاں جل اٹھی تھیں، ایک آدھ سواری بھی خراماں خراماں گزر رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، لیکن کچھ بدلا ہوا سا بھی تھا۔ میری سمجھ میں فوراً یہ بات نہ آئی کہ کیا تبدیلی آ گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ میکلوڈ روڈ اب صبح کی طرح سنسان نہیں تھی اور یہ بھی کہ جب میں پیچھے کے گھر میں پناہ لینے کے لیے گھسا تھا تو اس وقت دھوپ نکلی ہوئی تھی، دن کے گیارہ کا عمل رہا ہوگا اور میں ہرگز ہرگز اس گھر میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہ رہا تھا۔ پھر اس وقت یہ شام کیسی؟

گھبراہٹ اور خوف کے باعث مجھے بڑے زور کی متلی آئی۔ سارا منھ نمکین پانی سے بھر گیا اور جب تک میں خود کو سنبھالوں سنبھالوں، مجھے ایک ابکائی، بلکہ بھینسے کی سی ڈکراتی ہوئی آواز کے ساتھ استفراغ ہوا۔ لیکن ایک تلخ، زرد سیاہی مائل گھونٹ کے سوا کچھ نہ نکلا۔ میں نے صبح کئی پیالے چائے کے ساتھ بہت معمولی ناشتہ کیا تھا اور تب سے اب تک تین چار گھنٹے ہو چکے تھے (یا شاید سارا ہی دن گذر چکا تھا)۔ پھر متلی میں نکلتا گیا۔ میں نے گرمی زدہ کتے کی طرح ہانپتے ہوئے اپنا سینہ اور پیٹ سنبھالنا چاہا۔ اس قے کے باوجود میری ابکائیاں کم نہ ہوئی تھیں۔ مجھے 'توبۃ النصوح' کے شروع کا بیان یاد آیا کہ نصوح کو بھی بڑے زور کا استفراغ ہوا تھا۔ ('جیسے کوے کا پر'؛ مجھے بچپن کی پڑھی ہوئی ایک کہانی بھی یاد آئی، 'استفراغ اتنا سیاہ جیسے کوے کا پر')۔ ''تو کیا مجھے بھی ہیضہ ہو رہا ہے؟ یا میں نے کہیں سے زہر تو نہیں منھ میں ڈال لیا؟'' میں نے گھبرا کر اپنے دل میں کہا۔

چکر سے بے حال ہو کر میں بے تحاشا پاس کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ چوٹ بچانے کی فکر میں ہاتھ جو دیوار پر زور سے مارا تو کوئی چیز بچھو کی ڈنک کی طرح چبھی۔ گھبرا کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ دیوار میں ایک موٹی کیل نکلی ہوئی تھی، اور وہ کوئی آدھ انچ بھر میری ہتھیلی میں اتر گئی ہے۔ ہتھیلی سے خون بری طرح بہہ رہا تھا۔ میری آستین اور پتلون پر بھی جگہ جگہ خون ٹپک گیا تھا۔ خوف اور خلجان کے ساتھ یہ چوٹ مجھے اور بھی بدحال کر گئی۔

مجبوراً اسی دیوار کو دیکھ بھال کر اور اسی سے ٹیک لگا کر میں ٹھہر گیا۔ رومال سے ہتھیلی پر پٹی کس کے باندھ لی کہ جریانِ خون کم ہو۔ دیر بعد طبیعت ذرا بحال ہوئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا، ''یہ سب جناتی کارخانہ معلوم ہوتا ہے۔ آیت الکرسی پڑھو۔'' آیت الکرسی اس وقت ٹھیک سے یاد نہ آئی تو قل ھو اللہ احد اور لا حول ولا قوۃ کا ورد شروع کیا۔ کچھ دیر بعد دل ذرا ٹھہرا۔ میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں پانی کہاں۔ میں نے دل میں کہا اب ہمت کر کے سڑک پر نکلو، اپنی گاڑی اٹھاؤ اور بھاگ لو۔ یہ پانی کے لیے ٹھہرنے کا موقع نہیں ہے اور نہ ہتھیلی کی مرہم پٹی کی فکر اس وقت مناسب ہے۔

میں بوجھل قدموں سے اس بنگلے کے پھاٹک کی طرف چلا، جہاں میں نے گاڑی چھوڑی تھی۔ کچھ خوف اس بات کا بھی تھا کہ کہیں وہ موذی لونڈے ابھی موجود نہ ہوں۔ لیکن ان کا سرخیل تو وہاں اندر (مرا؟) پڑا تھا۔ وہ ناپاک حرام زادے بھی بھاگ گئے ہوں گے۔ دل میں یہ کہہ کر میں کوٹھی کے پھاٹک کی طرف الٹے پاؤں چلا۔

جب میں پناہ کے لیے بھاگ رہا تھا اس وقت تو وہ کوٹھی مجھے بہت کشادہ محسوس ہوئی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اس کا باہری برآمدہ، اور اندر کی راہداری ملا کر کوئی ڈھائی سو فٹ کی طوالت رہی ہوگی۔ خلافِ توقع اب وہ فاصلہ بہت کم نکلا۔ میں چند ہی قدم چلا ہوں گا کہ عمارت کا پھاٹک نظر آ گیا لیکن میری کار وہاں کہیں نہ تھی۔ میں ایک لمحے کو سناٹے میں آ گیا۔ پھر میرے خیال میں آیا کہ چونکہ گاڑی میں نے پھاٹک میں اس طرح اڑا کر کھڑی کی تھی کہ راستہ بند ہو گیا تھا، اس لیے شاید کسی نے اسے ڈھکیل کر کنارے کر دیا ہو۔

لیکن گاڑی تو وہاں کہیں نہ تھی۔ حتیٰ کہ پھاٹک پر ٹائروں کا نشان، بریکوں کی گھسٹنی، کچھ بھی ایسی علامت نہ تھی کہ کوئی کار یہاں جھٹکا دے کر موڑی، اور پھر اسی طرح جھٹکے سے روکی گئی ہے۔ کار وہاں سے اس طرح مفقود تھی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ کوئی چور تو نہیں لے گیا؟ میں نے دل میں سوچا۔ لیکن کاروں کی چوریاں اس زمانے میں قطعاً نہ ہوتی تھیں۔ کار کی چوری کرنے والا اسے بیچتا بھی کس کے پاس؟ اس زمانے میں معدودے چند لوگ کار رکھتے تھے، اور وہ زیادہ تر وکیل، ڈاکٹر، یا سرکاری افسر تھے۔ بہر حال، اگر کوئی چور بھی لے گیا تو مجھ سے اتنی ہمت اس وقت نہ تھی کہ اس چوری کی رپورٹ لکھاؤں۔ پولیس والوں کو کیا بتاتا کہ میں اس گھر میں کیا کرنے گیا تھا؟ اور کار کا تو وہاں نشان بھی نہ تھا، صرف چابی تھی جو میرے جیب میں تھی۔ میں نے جیب ٹٹولی تو چابی واقعی موجود تھی۔

ریلوے کے اسسٹنٹ انجینئر کے لیے کار کی چوری کوئی معمولی حادثہ نہیں۔ مجھے فوراً تفتیش کرانی چاہیے تھی اور یہ تو ظاہر ہے کہ میں دوسری کار بآسانی نہ خرید سکتا تھا، بلکہ شاید اب دوسری کار نصیب ہی نہ ہوتی۔ لیکن اس وقت میرے لیے چارہ ہی کیا تھا۔ پھر یہ بھی خیال میں آیا کہ گاڑی کوئی چھوٹی سی سوئی تو نہیں کہ کھو جائے تو دکھائی نہ دے۔ فی الحال تو یہاں سے چل دینا چاہیے، اور بہت جلد۔ انسان کی عقل معمولی چیزوں کو سمجھنے سے اکثر عاری رہتی ہے، اور یہ تو یقیناً کوئی مافوق الفطرت معاملہ ہے۔ اس میں زیادہ چھان بین بھی ٹھیک نہیں۔ خدا نے بڑا فضل کیا جو میں محفوظ رہا۔ ورنہ اکثر لوگ تو سنا ہے خوف کے مارے مخبوط الحواس ہو جاتے ہیں، یا جان ہی سے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی اپنی فکر کرو، کار کی فکر بعد میں ہوگی۔

میں اپنے دل کو اس طرح سمجھا کر سڑک کی روشنی میں آیا۔ مجھے اپنے کپڑے خدا معلوم کیوں کچھ زردی مائل لگ رہے تھے۔ شاید میونسپلٹی کی بجلی ایسی ہی چندھیائی سی ہوتی ہے۔ سامنے سے ایک تانگہ آ رہا تھا، میں اسے روک کر سوار ہو گیا۔ میرے کپڑے اب اور بھی پیلے لگ رہے تھے۔ لاحول ولاقوۃ، کیا مجھے یرقان ہو گیا

ہے؟ اتنے میں تانگے والے نے مڑ کر مجھے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ شاید اس کی نگاہ میرے لباس کی سرخ چھینٹوں پر پڑ گئی تھی یا پھر کیا میرے کپڑے سچ مچ پیلے ہو رہے تھے؟ اچانک مجھ پر بخار کا سا لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں تانگے والے سے کہا، ''مجھے اسٹیشن لے چلو۔ جلدی کرو گاڑی پکڑنی ہے۔'' مغل پورہ کا اسٹیشن وہاں سے قریب ہی تھا۔ تانگے نے مجھے منٹوں میں پہنچا دیا۔ اسی وقت پٹھان کوٹ ایکسپریس پلیٹ فارم پر داخل ہو رہی تھی۔ میں پٹھان کوٹ کا ٹکٹ لے کر ایک ڈبے میں دھنس پڑا۔ پٹھان کوٹ میں میرا کوئی نہ تھا تو کیا ہوا، ململی قمیص والا اور سیاہ گرد باد بھی تو وہاں نہ تھے۔

○

اوپر میں نے جو کچھ لکھا ہے، اسے میرے ایک دوست نے پڑھ کر کہا:

''یہ کیا بکواس فضول تم نے لکھ ماری ہے؟ تم اپنی خودنوشت لکھ رہے ہو یا خواب میں دیکھے ہوئے اور دل سے گھڑے ہوئے واقعات لکھ رہے ہو؟''

''تم جانتے ہو میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ اپنی خودنوشت میں ایک حرف بھی جھوٹ نہ لکھوں گا اور اسی لیے ہر صفحہ تم کو پڑھوا دیتا ہوں کہ اگر کوئی غلطی ہو تو اسے ٹھیک کرا دو۔''

''ہوگا۔ لیکن میں ٹھیک کراؤں کیا خاک؟ اس بار تو تم نے حد ہی کر دی۔ تم کہتے ہو ان دنوں تمھارے پاس امبیسڈر کار تھی۔ ابے احمق، یہ کار تو تقسیم ہند کے بعد برلا نے پہلی بار 1957 میں بنائی تھی۔ انھوں نے انگلینڈ کی Morris Oxford کے نقشے ان کی اجازت سے حاصل کر کے پہلے تو Hindustan 14 نامی کار بنائی۔ دو تین سال بعد مارس کا ماڈل بدلا تو انھوں نے نئے نقشے کے مطابق Landmaster اور پھر چند سال بعد جدید تر ڈیزائن کے مطابق Hindustan Amabssador کا روجود میں آئی۔ 1937 میں امبیسڈر کہاں تھی جس پر بیٹھ کر تم علامہ سے ملنے گئے تھے؟''

میں نے چڑچڑا کر کہا، ''کار کا ماڈل بھول گیا ہوں گا۔ تم تو جانتے ہو کہ میرے پاس شروع نوکری ہی سے کار رہی ہے۔''

''بڑے آئے کار کا ماڈل بھولنے والے۔ بھلا اپنی پہلی کار کا ماڈل تم اس قدر بھول گئے کہ عدم کو وجود میں لے آئے؟ اور بیٹے ذرا یہ تو بتاؤ کہ 1937ء میں علامہ صاحب میکلوڈ روڈ پر کہاں رہتے تھے؟ 1936ء

کے اکتوبر میں یا اس کے کچھ پہلے حضرت علامہ نے میوروڈ پر جاوید منزل کی تعمیر مکمل کر لی تھی اور فوراً ہی وہ اس میں منتقل ہو گئے تھے۔تم 1937ء میں میکلوڈ روڈ پر ان سے کس جنم میں ملے ہو گے؟''

''ہو سکتا ہے میکلوڈ روڈ نہیں، میوروڈ ہی ہو،'' میں نے جھنجھلا کر کہا۔''نام میں ذرا ہی سا تو فرق ہے۔کیا آدمی اتنی چھوٹی چھوٹی بات یاد رکھ سکتا ہے؟ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے سر جگندر سنگھ کا بنگلہ اور وہ دکانیں وہاں نہیں مل رہی تھیں۔''

''بے شک آدمی ذرا ذرا سی بات یاد نہیں رکھ سکتا۔لیکن یہاں تو اہم تفصیلات کا سوال ہے.... ہاں اگر خودنوشت کے نام پر داستانِ امیر حمزہ لکھنی ہو تو اور بات ہے۔''

''داستانِ امیر حمزہ کو کچھ نہ کہو۔اس سے بڑھ کر تاریخی کتاب ممکن نہیں۔'' میں نے بپھر کر کہا۔

''خیر یہی سہی۔لیکن عام پبلک کے سامنے ایسی بات نہ کہنا، ورنہ لوگ تمھیں پاگل خانے بھجوا دیں گے۔ او بھائی صاحب، وہ لونڈے جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، ان کے بارے میں آپ نے کہیں اخبار میں پڑھا ہو گا۔وہ لوگ جرائم پیشہ کنجر، یعنی ایک طرح کے خانہ بدوش تھے۔ایک زمانے میں ان کا ایک قبیلہ لاہور میں کہیں سے آ گیا تھا اور اس کے افراد، خاص کر لڑکے بالے، چھوٹی موٹی چوریوں میں اکثر ماخوذ ہوتے رہتے تھے۔میکلوڈ روڈ یا میوروڈ تو نہیں، باغبان پورہ والی سڑک پر ضرور انھوں نے اپنے ڈیرے لگا رکھے تھے۔ آپ کبھی وہاں سے گذرے ہوں گے، پھر اسی کے بارے میں آپ نے کوئی خواب دیکھ لیا اور اب زیبِ داستان کے لیے اسے اپنی خودنوشت میں ڈالے دے رہے ہیں۔''

''اچھا یوں ہی سہی۔تو یہ لو!'' یہ کہہ کر میں نے اپنی داہنی ہتھیلی اپنے دوست کی ناک کے نیچے اس کی آنکھ کے بالکل پاس تقریباً ٹھونس دی۔ہتھیلی پر اب بھی چوٹ کا داغ بہت گہرا اور صاف تھا۔''حرامزادے، یہ کیا ہے؟'' میں نے دانت پیس کر کہا۔''کہو تو پٹھان کوٹ کے اس ڈاکٹر کا نام پتا بتا دوں جس نے اس چوٹ کا علاج کیا تھا۔''

میرا دوست ایک لمحے کے لیے سن ہو کر رہ گیا۔صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ گڑبڑا گیا ہے مگر وہ بھی مجھ سے کم بے حیا نہیں۔ذرا رک کر بولا،''اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ہتھیلی پر یہ چوٹ تمھیں اسی وقت اور اسی جگہ لگی تھی جس کا ذکر تم نے افسانے.... میرا مطلب ہے خودنوشت میں کیا ہے؟''

''نہ سہی، لیکن وہ ڈاکٹر اگر ہو گا تو وہ وقت اور زمانے کی تصدیق تو کر دے گا۔''

''پچاس سے اوپر برس ہو رہے ہیں۔ خدا معلوم وہ ڈاکٹر وہاں ہے بھی کہ مر کھپ گیا۔''

''وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہ تھا، اور ضد کے علاج سے سقراط بھی معذور تھا۔''

''مانا۔ لیکن میں تم سے جرح اس لیے کر رہا ہوں کہ تمھیں نے کہا تھا، اس کتاب کو دشمن کی نظر سے دیکھو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس میں ایک بھی بات غلط راہ پا جائے۔''

''ہاں، اور اب تک تمھیں کچھ نہ ملا تو فرضی ہی الزام گڑھنا شروع کر دیے۔''

''سچی بات یہ ہے کہ تمھارے بیانیے میں اور باتیں بھی کھٹکی تھیں، لیکن وہ اتنی نمایاں نہ تھیں۔ اس باب میں تو تم نے واقعے کے نام سے ایک بھی حرف نہ لکھا۔''

''کچھ اور، مثلاً؟'' میں نے بڑی کوشش سے غصہ ضبط کر کے پوچھا۔

''تم نے علامہ صاحب کی آواز کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اس وقت تک ان کی آواز بالکل بیٹھ چکی تھی۔''

''میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے اس ملاقات کی تفاصیل نہیں یاد۔''

''مگر اتنی اہم بات.....''

''چپ رہو۔ جانتے ہو، لفظ 'واقعہ' کے معنی حقیقت بھی ہیں، اور خواب بھی، اور موت بھی۔'' میں نے بڑے فخر سے کہا، گویا کوئی بڑی دریافت بیان کر رہا ہوں۔

''پھر تو مجھے کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ لیکن یہ بتاؤ تم نے منیر نیازی کا مصرع کبیر کے سر کیوں مڑھ دیا؟''

''کیا بکتے ہو؟'' میں دہاڑا۔

''یہی کہ 'خالی شہر ڈراؤنا کھڑا تھا چاروں اور' منیر نیازی کا مصرع ہے اور یہ بات اس کے مجموعے 'دشمنوں کے درمیان شام' مطبوعہ 1968ء کے صفحہ 25 پر موجود ہے۔ تم نے 1937ء میں یہ مصرع کبیر کے نام سے کہاں دیکھ لیا؟ چلو اب بھی مان جاؤ کہ تم نے اپنی خودنوشت میں ایک افسانہ بھی ڈال دیا ہے۔''

''سب افسانے سچے ہوتے ہیں! سب افسانے سچے ہوتے ہیں!'' ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں چیخ کر بولا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

قفصِ زماں

مرتب کے قلم سے

شمس الرحمٰن فاروقی کی فکشن کے باب میں دلچسپیاں ہمہ پہلو ہیں تاہم یوں لگتا ہے کہ اپنی تاریخ اور تہذیب کی کھوج میں نکلی کہانی انھیں ہمیشہ مرغوب رہی ہے۔ یہ رغبت انھیں اس باب میں دُور تک لے جاتی ہے۔ محض تہذیبی اور ادبی مظاہر ہی ان کا علاقہ نہیں ہیں وہ جست لگا کر ایک سے زیادہ زمانوں میں پہنچتے ہیں اور وقت کی مختلف قاشوں سے کہانی کا مواد اخذ کر لیتے ہیں۔ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' جیسے تہذیبی دستاویز ہو جانے والے شہرہ آفاق ضخیم ناول لکھ لینے کے بعد بھی وہ اندر سے خالی نہیں ہوئے تھے۔ ان کا قلم رواں رہا اور ''قبضِ زماں'' جیسا مختلف ناول لکھ کر پوری ادبی دُنیا کو ایک بار پھر متوجہ کر لیا۔

''سوار اور دوسرے افسانے'' اور ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے بعد ''قبضِ زماں'' کی اشاعت پر جو میں نے لکھا تھا کہ ''یوں تو شمس الرحمٰن فاروقی کے فکشن کو پڑھنا علمی، ادبی اور تہذیبی زندگی سے چھلکتے ہوئے ایک عہد میں جا کر بس جانے کا نام ہے مگر ان کے مختصر ناول ''قبضِ زماں'' کا مطالعہ یوں مختلف ہو جاتا ہے کہ یہ کسی ایک عہد کی تہذیبی زندگی پر محیط نہیں، اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس ناول میں ایک ایسا شخص ہے جس سے اس کا اپنا زمانہ اور وہ اپنے زمانے سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ عجیب اور ناقابلِ یقین حالات سے گزرتے ہوئے ایک اور زمانے میں جا پڑتا ہے۔ یوں یہ ناول ہمیں ایک سے زیادہ زمانوں اور زمینوں کی سیر کراتا اور زندگی کے ان بھیدوں کے مقابل کرتا ہے جو سے کی سمتن سے نکلتے اور حیرت کی پھیلی آنکھ پر کھلتے چلے جاتے ہیں۔''

انتظار حسین نے فاروقی صاحب کے تخیل پر اتری اس ناول کی کہانی کو ایسا عجیب تجربہ قرار دیا تھا جسے لفظوں کی گرفت میں لانا مشکل تھا مگر فاروقی صاحب اس تجربے کو بڑی مہارت کے ساتھ گرفت میں لے آئے تھے۔ انتظار حسین ہی کے الفاظ میں: ''اس صورت حال کا بیان بھی حیرت ناک ہے اور اس کو پڑھنے کا تجربہ بھی انوکھا ہے۔''

فاروقی صاحب نے یہ ناول 2011ء میں لکھا تھا۔ یہ پہلے پہل ''اثبات'' ممبئی میں چھپا تھا اور پھر ''دنیا زاد'' کراچی میں۔ کتابی صورت میں چھپنے کے لیے فاروقی صاحب نے اسے 2014ء میں آصف فرخی کو دیا جسے انھوں نے اپنے ادارے ''شہر زاد'' کراچی سے شائع کیا تھا۔ بعد ازاں بہ قول فاروقی صاحب کے ''تھوڑا بہت حک و اضافہ کیا'' اور اس کا مفصل دیباچہ لکھا جسے دہلی کے عرشیہ پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ اسی ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن کی تازہ ترین اشاعت ''بک کارنر'' جہلم سے اسی برس یعنی 2021ء ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔

محمد حمید شاہد

سعادت حسن منٹو

کی یاد میں، اور ان کو
ایک حقیر خراج عقیدت
کے طور پر

ابروے دیگراں نہ رسد ابروے ترا
ہر ماہ نو مقدمہ عیش عید نیست

(افتخار بخاری، معاصر آزاد بلگرامی)

جراحت زار عشق است ایں رقم نیست
صدائے تیغ می آید قلم نیست

(ناصر علی سرہندی)

شیخ ابن سکینہ نے فرمایا... اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اپنے کسی بندے کے لیے زمانے کو پھیلا دے اور وقت کو دراز کر دے، جب کہ وہ دوسروں کے لیے بدستور کوتاہ رہے۔ اسی طرح، اللہ تعالیٰ کبھی قبضِ زماں فرماتا ہے کہ زمانۂ دراز کوتاہ معلوم ہوتا ہے۔

(کنز الکرامات، یعنی مولانا جامی کی نفحات الانس سے
چند کرامات کا اُردو ترجمہ، از: حامد حسن قادری)

o

Thous hast, and more, Miranda, But how is it
That this lives in thy Mind? What thou seest also
In the dark backward and abysm of time?

Shakespeare, 'The Tempest', Act 1, Scene 2, II. 48-50

o

Time travels in diverse paces with diverse persons. I'll tell you who Time ambles withal, who Time trots withal, who Time gallops withal, and who Time stands still withal.

Shakespeare, 'As You Like It', Act 3, Scene 2, II. 302-305

پیش لفظ

''قبض زماں'' کے پڑھنے والوں کو دو باتیں ضرور یاد آئیں گی۔ اوّل تو اصحاب کہف کا قصہ جو قرآن پاک کی سورۃ کہف میں مرقوم ہے (آیت 3 تا 26) اور دوسرا امریکی مصنف واشنگٹن ارونگ (Washington Irving, 1783-1859) کا مشہور افسانہ ''رپ فان ونکل'' (Rip Van Winkle)۔ قرآن مجید کے قصے میں اصحاف کہف کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے، لیکن یہ کہا گیا ہے کہ وہ تین سو نو (309) برس سوئے، ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا اور اللہ انھیں کروٹ پھرا کر اور دوسرے طریقوں سے ان کے جسموں کو سوکھنے یا خراب ہونے سے محفوظ رکھتا تھا۔ یہ لوگ خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے اور خوفِ جان وخوفِ ایمان سے ایک غار میں جا چھپے تھے۔ وہاں اللہ نے ان کی حفاظت کی۔

نصرانی روایتوں کے بموجب یہ واقع سنہ 250 میں پیش آیا۔ وہ سات صاحبان تھے اور خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے اور خوفِ جان وخوفِ ایمان سے مجبور ہو کر ایک غار میں جا چھپے تھے جہاں اللہ نے انھیں سلا دیا اور اور وہ دو سو برس تک سوتے رہے۔

واشنگٹن ارونگ کا نام میری عمر کے اُردو خوانوں کو اس کی کتاب Tales from Alhambra کی وجہ سے یاد ہوگا، غلام عباس نے جس کا ترجمہ ''الحمرا کی کہانیاں'' کے نام سے کیا تھا۔ واشنگٹن ارونگ کا رپ فان ونکل اپنی بیوی اور بچوں کی ذمے داری سے تنگ آ کر ایک جنگل کی راہ لیتا ہے جہاں اسے بعض دلچسپ حالات کا سامنا ہوتا ہے اور پھر وہ سو جاتا ہے۔ جب وہ جاگتا ہے تو بیس سال گذر چکے ہوتے ہیں۔

اس کی ڈاڑھی ایک فٹ لمبی ہوگئی ہے، اس کی بندوق مٹی ہو چکی ہے اور اس کا پیارا کتاّ Wolf جو اس کے ساتھ تھا، وہ مر چکا ہوتا ہے۔ واشنگٹن ارونگ کو اسلامی روایات سے کچھ واقفیت تھی۔ اس نے رسول مقبول ﷺ کی ایک سوانح عمری بھی لکھی تھی۔ لہٰذا ممکن ہے کتے کا خیال اس نے قرآن سے لیا ہو، کیونکہ کسی اور روایت میں (حتیٰ کہ نصرانی روایت میں بھی) کتا مذکور نہیں ہے۔ اصحاب کہف (کہف = غار) کہاں سوئے تھے، یہ قرآن میں نہیں بتایا گیا ہے، لیکن نصرانی روایتوں کے اعتبار سے یہ واقعہ شہر افیسس (Ephesus) کا ہے۔ اس شہر کے آثارِ جدید ترکی کے شہر سلجوق کے پاس موجود ہیں اور زائرین وہاں بکثرت جاتے ہیں۔

لمبی نیند والوں کے بارے میں اور بھی قصے یا روایتیں دوسری تہذیبوں (مثلاً چینی تہذیب) میں بھی ہیں لیکن سب سے قدیم قصہ ہمارے یہاں کی ''شریمد بھاگود'' میں ہے۔ سنسکرت میں اسے ''بھاگوتم'' (Bhagvatam) کہتے ہیں، عام لوگوں میں ''شریمد بھاگوت'' نام بھی رائج ہے۔ ہندی میں عموماً اسے ''بھاگوت پران'' کہتے ہیں۔ اس طویل سلسلۂ روایات میں مہابھارت سے پہلے کی روایتیں ہیں اور سری کرشن جی ان میں مشترک ہیں۔ طویل نیند والا واقعہ بادشاہ مچکند (Muchkund) سے منسوب ہے۔ ایک بار جب آسروں نے دیوتاؤں پر چڑھائی کر دی اور دیوتا ان سے عاجز آ گئے تو انھوں نے بادشاہ مچکند کو طلب کیا، جو شری رام چندر جی کے اسلاف میں ہے۔ مچکند نے گھمسان جنگ کی اور آسروں کو پسپا کر دیا۔ چونکہ وہ جنگ میں بہت تھک گیا تھا اس لیے راجا اندر نے اسے سلا دیا اور یہ نیند اتنی لمبی ہوئی کہ جب وہ جاگا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ زمانہ اس قدر آگے نکل گیا تھا کہ انسان اور جانور، جو اس کے زمانے میں عظیم الجثہ ہوتے تھے، وہ آج کل کی طرح کے چھوٹے قد کے ہو گئے تھے۔ گویا مچکند کی نیند پر کئی یگ بیت گئے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ راجا اندر نے مچکند کو جاگنے سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ حکم لگایا تھا کہ جو کوئی اسے جگائے گا وہ جل کر خاک ہو جائے گا۔ چنانچہ ایک بار ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد شری کرشن جی نے مچکند کو کسی بہت محفوظ دور دراز جگہ پر ایک غار میں پہنچا دیا۔

ہر چند کہ ''شریمد بھاگوت'' کا زمانہ متعین نہیں ہے، لیکن عموماً اسے 3000 قبل حالی (3000 B.C.) یا اور بھی کچھ پہلے کا بتایا جاتا ہے۔ اس طرح مچکند کا قصہ طویل نیندوں کے قصوں میں سب سے قدیم ہے اور مچکند کی نیند کا دوران بھی نہ صرف یہ کہ طویل ترین ہے، بلکہ ناقابلِ حساب بھی ہے۔

جس واقعے، یا روایت پر ''قبضِ زماں'' کی بنیاد ہے، اس میں دیگر تمام روایتوں سے بالکل مختلف بات ہے، کہ یہاں جو وقت گذرا ہے وہ نیند میں نہیں بلکہ جاگتے میں گذرا ہے۔ خدا نے اپنی قدرت سے ڈھائی تین سو برس کی مدت کو چند گھنٹوں میں محصور کر دیا۔ اسے صوفیوں کی اصطلاح میں ''قبضِ زماں'' کہتے ہیں۔ اسی طرح، تھوڑی مدت بھی خدا چاہے تو طویل بن سکتی ہے۔ اگرچہ دیکھنے والوں کو احساس نہ ہوگا، لیکن جس پر یہ واقعہ گذرے گا وہ جان لے گا کہ کتنی مدت دراصل گذری ہے۔ صوفیوں کی اصطلاح میں اسے ''بسطِ زماں'' کہتے ہیں۔

میں نے یہ افسانہ مسودے کی صورت میں نیر مسعود کے تفنن کے لیے بھیجا۔ ان دنوں بھی وہ بیمار تھے لیکن آج کی طرح نہیں۔ نیر مسعود نے جواب لکھا کہ میں نے یہ افسانہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا اور مجھے عنوان کے سوا ہر چیز بہت اچھی معلوم ہوئی لیکن جب دوسری بار افسانہ پڑھا تو اب بھی وہ اتنا ہی اچھا لگا اور عنوان بھی اب بالکل ٹھیک محسوس ہوا۔ اللہ انھیں صحت دے۔ ہم دونوں اکثر ایک دوسرے کے افسانوں کے اولین قاری رہے ہیں۔ افسوس کہ اب نیر مسعود اس قدر بیمار ہیں اور زندگی سے ان کی دلچسپی اب اس قدر کم ہے کہ میں اُمید نہیں کرسکتا کہ کتابی صورت میں بھی وہ اسے پڑھیں گے۔ میں دعا ضرور کرسکتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ انھیں صحت عطا فرمائے۔

''بھاگوتم'' کو صرف قصوں ہی کا نہیں، بلکہ حقائق و معارف کا بھی گنجینہ قرار دیا گیا ہے۔ ''قبضِ زماں'' میں ایسا کچھ نہیں، صرف قدرتِ الٰہی کا کرشمہ ہے۔ میں نے اس واقعے کو اپنی افسانہ گوئی کے لیے استعمال کرلیا ہے، اس میں کوئی مذہبی نکتہ نہ فرض کیا جائے۔ جب میں نے مولانا حامد حسن قادری مرحوم کے رسالے میں یہ قصہ پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ یہ میرے طرز افسانہ گوئی کے لیے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اٹھارویں صدی کے رنگ آمیز کر دیے جائیں تو مزہ اور چوکھا ہوگا۔ اصل قصے میں یہ کچھ مذکور نہیں ہے کہ اپنے وقت سے ڈھائی تین سو برس بعد اٹھارویں صدی میں وارد ہو کر سپاہی پر کیا گذری۔ میں نے افسانے میں وہ باتیں فرض کر کے اضافہ کر دی ہیں۔ پندرہویں، سولہویں صدی کا انسان کس طرح دریافت کرتا ہے کہ اب وہ اٹھارویں صدی میں ہے، اور وہ اس صدمے کو کس طرح جھیلتا ہے اور پھر کس طرح خود کو نئے زمانے کے موافق ڈھالتا ہے، خود کو نئی تہذیب میں ضم بھی کر دیتا ہے اور اپنا راز بھی مخفی رکھتا ہے، یہ

قصہ گوئی کے مسائل تھے جنھیں میں نے اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ خیال رہے کہ یہ افسانہ سفر در وقت (Time Travel) کی قبیل کی چیز نہیں ہے۔ سفر در وقت (اگر ایسی کوئی شے ہے بھی، یا ممکن بھی ہے) کے مسافر کو معلوم رہتا ہے کہ وہ زماں میں کہاں سے کہاں، اور مکاں میں کس جگہ سے کس جگہ سفر کر رہا ہے۔ سفر خواہ ارادی ہو یا اتفاقی، ہوش میں ہو یا بے ہوشی میں، مسافر کو نوعیتِ سفر کی خبر رہتی ہے۔

یہ افسانہ (یا ناولیٹ) پہلے پہل اشعر نجمی کے رسالے ''اثبات'' ممبئی اور آصف فرخی کے رسالے ''دنیازاد'' کراچی میں چھپا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آصف فرخی اب اسے کتابی شکل میں لا رہے ہیں۔ آصف فرخی کے پہلے اسے عرشیہ پبلی کیشنز کے ہونہار مالک اظہار احمد ندیم نے چھاپا تھا۔ اس اشاعت میں یہ دیباچہ شامل نہ ہوسکتا تھا۔ اب کتابی صورت میں اشاعتِ ثانی کے موقعے پر میں نے یہ دیباچہ تو شامل کیا ہی ہے، کچھ اور اصلاحات اور ترمیمات بھی کی ہیں۔ ایک اہم ترمیم یہ ہے کہ ''اثبات'' اور ''دنیازاد'' میں اشاعت کے وقت میں نے افسانے کے آخر میں مولانا حامد حسن قادری کے حوالے سے شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا ایک اقتباس نقل کیا تھا، انتظار حسین نے جب یہ افسانہ پڑھا تو انھوں نے اپنے ایک انگریزی کالم میں لکھا کہ اس اقتباس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ افسانہ نگار کو اپنے افسانے کا ماخذ یا منبع ظاہر نہ کرنا چاہیے۔ غور کرنے پر، اور پنگوئن انڈیا میں اپنی ایڈیٹر شیوا پریا (Sivapriya) سے مشورہ کر کے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انتظار صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ لہٰذا اس ایڈیشن میں، اور اس کے انگریزی ترجمے میں بھی مَیں نے شاہ صاحب کا وہ اقتباس حذف کر دیا ہے جس سے افسانے کی اصل پر کچھ روشنی پڑتی تھی۔ انگریزی ترجمہ ابھی حال میں پنگوئن نے میرے دوسرے افسانوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

میں عزیزی آصف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس افسانے یا مختصر ناول کی پاکستانی اشاعت اپنے ذمے کر لی اور اس بہانے سے مجھے اس میں تھوڑا بہت حک و اضافہ کرنے اور یہ دیباچہ بھی اضافہ کرنے کا موقع ملا۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد، نومبر 2014

دیباچہ طبع سوم

''قبض زماں'' میں نے سنہ 2011 میں لکھی تھی۔ میں اسی زمانے میں ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا انگریزی ترجمہ بھی کر رہا تھا۔ گویا حسرت موہانی مرحوم کے الفاظ میں ''مشق سخن'' بھی جاری تھی اور ''چکی کی مشقت بھی''۔ اگر ''کئی چاند......'' کے انگریزی ترجمے کو ''چکی کی مشقت'' قرار دیں تو ''قبض زماں'' کی تحریر کو ''مشق سخن'' کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن وہ دن بھی کیا تھے کہ دونوں کام ایک ساتھ رواں تھے اور مجھے کسی تعب کا احساس نہ تھا۔ چار ہی پانچ برس میں صورتِ حال اتنی بدل گئی ہے کہ یہ چند سطور بھی مجھ پر بھاری پڑ رہی ہیں۔ خیر، بقول میرؔ ؎

عشق جو چاہے تو مُردے سے بھی اپنا کام لے

''قبض زماں'' پہلے ممبئی کے مشہور پرچے ''اثبات'' میں شائع ہوا۔ پھر اس کے فوراً بعد کراچی کے مشہور پرچے ''دُنیازاد'' میں۔ آصف فرخی نے اپنے ادارے ''شہرزاد'' کراچی سے اسے کتابی شکل میں شائع کیا۔ پھر اظہار احمد ندیم نے اپنے ادارے ''عرشیہ پبلی کیشنز'' سے اسے چھاپا۔ دونوں اشاعتوں میں کچھ خفیف ترمیمات بھی تھیں، بطورِ خاص کراچی والے ایڈیشن میں کتابت کے اغلاط بہت تھے اور کیوں نہ ہوتے، جب میں ہی نے اسے اپنے کمپیوٹر پر ٹائپ کیا تھا۔ کتابیں لکھتے، بناتے، شائع کرتے ایک عمر گذر جانے کے باوجود

میں یہ سبق نہ سیکھ سکا کہ اپنی لکھی ہوئی تحریر میں غلطیاں در آنا لابدی اور لازمی ہے۔ خیر، ’’عرشیہ پبلی کیشنز‘‘ کے لیے میں نے ممکن حد تک غلطیاں ٹھیک کر دیں۔ ’’عرشیہ پبلی کیشنز‘‘ کے اظہار احمد ندیم نے مجھ سے ایک دیباچہ بھی لکھوایا لیکن وہ کسی باعث شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ اس بار وہ بھی شامل ہو رہا ہے۔ ’’اثبات‘‘ اور ’’دنیا زاد‘‘ میں اس کی اشاعتوں کو شمار کر لیں تو اس چھوٹی موٹی کتاب کا یہ پانچواں ایڈیشن آپ کے ہاتھ میں ہے۔

دیباچے میں انتظار حسین اور نیر مسعود کے حوالے سے کچھ باتیں تھیں۔ انتظار صاحب کے مشورے (یا ان کے کہنے پر) میں نے متن سے کچھ عبارت نکال دی تھی۔ پھر کچھ مہینے ہوئے جب ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی رائے کا اعادہ کیا کہ قصے کی اصل کس بات یا واقعے پر ہے، اسے بتانا آپ کا کام نہیں۔ وہ دن میرے لیے بہت خوشگوار تھے جو میں نے گذشتہ نومبر میں لاہور میں انتظار صاحب کے ساتھ گذارے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے، ان جیسا مخلص دوست، نفیس و لطیف نثر نگار، غیر معمولی افسانہ اور ناول اور ڈرامہ نگار، نقاد، تہذیبی اقدار کا پارکھ، اب پیدا نہ ہوگا۔ میں نے ان کی زندگی میں کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں کہ وہ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے اور سب سے مکمل ادیب تھے اور کچھ تعجب نہیں کہ آئندہ کے ادیبوں پر انتظار حسین کا اثر اتنا ہی وسیع اور ہمہ گیر ہو جتنا وسیع اور ہمہ گیر اثر عسکری صاحب نے میری اور انتظار مرحوم کی نسلوں پر ڈالا۔

میں نے ’’ہمارے لیے منٹو صاحب‘‘ کے انتساب میں انتظار حسین کو شریک کیا تھا اور ’’قبض زماں‘‘ کی گذشتہ اشاعت منٹو صاحب کو خراج عقیدت کے طور پر پیش کی تھی۔ اب ’’قبض زماں‘‘ کی اس کج مج زبان اشاعت میں انتظار حسین کی یادوں کے نام انتساب کو بھی شریک کرتا ہوں، صائب کے اس مصرعے کے ساتھ کہ ؎

مرگ را داغ عزیزاں بر من آساں کردہ است

اللہ بس باقی ہوس۔

شمس الرحمٰن فاروقی

نئی دہلی، اپریل 2016

باب اوّل

میں بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ میرے ذہن میں کوئی خلفشار تھا یا دل میں کوئی خلش تھی۔ کبھی کبھی شام ڈھلتے ہی اور بستر پر جانے کے پہلے احساس ہو جاتا ہے کہ آج کی رات نیند نہ آئے گی۔ مجھے کیفی اعظمی کے مصرعے یاد آئے، لیکن یہ خیال میں نہ آسکا کہ میں نے انھیں کب اور کہاں پڑھا تھا۔

آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے

ہم ہندوستانیوں کے لیے گرمی سے بہت زیادہ سردی آزار رساں ہے (کم از کم میرا تو یہی خیال ہے) لیکن ہم گرم ملک کے رہنے والے، مئی جون کی کٹھور دھوپ میں چٹیل میدانوں میں ننگے پاؤں چلنے والے، ہمیں گرمی.... اُف گرمی.... لگتا ہے آسمان سے آگ برس رہی ہے.... زمین یوں تپ رہی ہے کہ دانہ ڈالو تو بھن جائے.... وہ دھوپ ہے کہ چیل انڈا چھوڑتی ہے (یہ محاورہ میں نے بچپن میں کہیں پڑھا تھا، اب تو سننے میں بھی نہیں آتا، لیکن اسی وقت سے مجھے خلجان رہتا تھا کہ آخر چیل ہی کیوں؟ اور انڈا چھوڑنے کے کیا معنی ہیں؟ اگر یہ کہ چیل انڈے پر بیٹھی تھی اور اب اسے انڈے کو سینے کی ضرورت نہیں تھی کہ گرمی کے مارے انڈا خود ہی سے جائے گا، تو پھر بہت سے پرندے ایسے ہوں گے، بچاری چیل ہی کیوں؟ شاید اس لیے کہ چیلیں

صرف مئی جون میں انڈا دیتی ہیں؟ مگر یہ بات کچھ دل کو لگتی نہیں۔ اس وقت تو نہیں سمجھ سکا تھا، لیکن ذرا علم لسان کی شُد بد ہوئی تو معلوم ہوا کہ زبان یوں ہی الل ٹپ ہوتی ہے۔ لفظ ''الل ٹپ'' سے اب شاید بہت سے لوگ واقف نہ ہوں، اس لیے اس کا انگریزی ترجمہ Arbitrary عرض کیے دیتا ہوں (گویا اس لفظ کے جاننے والے بہت سے ہوں گے)۔۔۔۔ بچپن میں ایک بار ''الف لیلہ'' (اب اس کو کیا کیجیے کہ بہت سے پڑھے لکھے لوگ اسے ''الف لیلیٰ'' سمجھتے ہیں، یعنی شاید الف ب کی وہ کتاب جسے لیلیٰ پڑھتی تھی)۔۔۔۔ خیر میں اسی ''الف لیلیٰ'' کی سند باد جہازی والی کہانی فارسی میں پڑھ رہا تھا۔ کہانی یوں شروع ہوتی تھی کہ اس دن اس قدر گرمی اور تپش تھی کہ ''جگر حربا می سوخت۔ بھلا یہ ''حربا'' کون ہے؟ مولوی صاحب نے بتایا کہ اسے اُردو میں ''گرگٹ'' کہتے ہیں (بلکہ ہماری طرف تو اسے ''گرگٹان'' کہتے تھے، شاید اس لیے کہ اس طرح گرگٹ اور زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا۔) اس وقت بھی مجھے یہ فکر لگی تھی کہ آخر بچارا گرگٹان ہی کیوں؟ اور بھی تو ایسے جانور ہوں گے جنھیں گرمی بہت لگتی ہوگی؟ لیکن یہ معما اب تک حل نہ ہوا۔ مجھے زوالوجی (Zoology) پڑھنی چاہیے تھی۔ (آج کل بہت سے لوگ اسے ''جولاجی'' کہتے ہیں۔ پھر فرق کیا پڑتا ہے؟ علم تو وہی ہے۔)

کیفی صاحب مرحوم کی نظم (اگر یہ نظم ان کی ہے) کے دو مصرعوں نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ بہر حال حقیقت تھی کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی، اور ہوا بھی کچھ گرم تھی۔ آخر اپریل کی رات تھی، مئی جون نہ سہی، اور میں اپنے آبائی گاؤں کے آبائی مکان کے دروازے پر دور تک پھیلی ہوئی کھلی زمین پر نیم کے نیچے سو رہا۔۔۔۔ نہیں، بلکہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ پرانی وضع کا بھاری پلنگ، جسے کئی لوگ مل کر میری خاطر اٹھا کر اندر میری دادی کے کمرے سے لے آئے تھے۔ اس کی نواڑ ابھی اچھی حالت میں تھی، دادی کے زمانے کی دریاں اور چادریں بھی مہیا تھیں۔ دادی کا زمانہ؟ اب ان کو غریق رحمت ہوئے چھ دہائیوں سے زیادہ گذر چکی تھیں۔ خاندان کے لڑکے لڑکیاں جو اب کم و بیش تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، ان کے لیے ساٹھ برس سے بہت کم کی مدت بھی قبل تاریخ کا زمانہ معلوم ہوتی ہے۔ فرینک کرموڈ نے کہیں لکھا ہے کہ آج کل کے طالب علم کے لیے ہر کتاب قبل تاریخ کے زمانے کی ہے اگر وہ پندرہ، یا اس سے زیادہ برس پہلے لکھی گئی تھی۔

دادی کے زمانے میں ان کے پلنگ، بلکہ سبھی کے پلنگ، کھٹملوں کا صدر مقام تھے۔ تمام رات انھیں کاٹتے گذرتی تھی مگر ہم لوگوں کی رات بے کھٹکے جاتی تھی کیونکہ ہماری نیندیں ایسی نہ تھیں کہ کوئی کھٹمل، کوئی مچھر، انھیں فتح کر سکے، یا ان کی دیواروں میں ذرا سا رخنہ ہی ڈال دے۔ لیکن میر کا شعر اکثر میرے

ایک چچازاد بھائی کی زبان پر رہتا تھا ۔

آخرش شام سے ہو شب بیدار
کھیلتا ہوں میں کھٹملوں کا شکار

خدا جانے اس پلنگ میں مچھروں کے کتنے شہر، کتنے قلعے، کتنی فصیلیں اب بھی باقی ہوں گی۔ مجھے تو ابھی کچھ خاموشی ہی لگ رہی تھی لیکن اس خاموشی کا کچھ اعتبار نہیں۔ نہ جانے کب، کس طرف سے حملہ کردیں۔ مجھے یاد آیا کہ امریکہ کے بعض جنوبی شہروں میں ہندوستان پاکستان کے لوگ ٹریفک پولیس والوں کو اسی لیے کھٹمل کہتے ہیں کہ خدا جانے کہاں سے بالکل اچانک برآمد ہو کر آپ کا پیچھا کرنے لگتے ہیں اور اگر ایک بار وہ آپ کے تعاقب میں لگ گئے تو آپ ان سے بچ نہیں سکتے۔ وہ آپ کا چالان کر ہی کے چھوڑیں گے۔

ہمارے آبائی گھر کے آگے کوئی صدر دروازہ یا چہار دیواری نہ تھی، پتا نہیں کیوں۔ دور تک بنجر زمینیں، کچھ کھیت اور دو چار پرانے پرانے درخت تھے۔ رات میں باہر سونے والوں کو وسعت، بلکہ غیر دلچسپ لیکن بے پروا وسعت کا احساس ہوتا تھا۔ (یہ بات میں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس وقت بھلا کون دس برس کے بچے پر اپنے تاثرات ظاہر کرتا، اور خود میں کبھی اکیلا کھلے میں سویا نہ تھا۔) مجھے تو وہ سارا منظر مجھ سے، لہٰذا ہم انسانوں کی زندگی سے بے نیاز لگتا تھا۔ گویا اسے کوئی غرض نہ ہو کہ یہاں کون سو رہا ہے، کون جاگ رہا ہے، کون جلد اٹھنے والا ہے، کون دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ اس زمانے میں ہمارے دروازے پر سونے والوں میں کس کی مجال تھی کہ دن چڑھے تک سوتا رہتا؟ اور کچھ نہیں تو بدلتی ہوئی ہوا کی بے خوابی، دل شب کے طے ہو جانے کے بعد اس کا بہ تدریج ہلکا پڑتا ہوا بہاؤ، اس کی بے چین آواز میں کمی، اندھیرے کی آہستہ، بہت آہستہ پسپائی، افق کے دھیرے دھیرے نزدیک آتے چلنے کا احساس، جو شعور کی کسی بہت گہری سطح پر سیاہی کی ٹھوس دیوار کا کسی بہت ہی نامحسوس لیکن یقینی عمل کے اثر سے ملگجے پتوں اور سرکنڈوں کی ڈالیوں کے گھنے اور پھر ہلکے سبز ارتعاش میں بدلتا دکھائی دیتا ہے، یہ سب اور بہت سی باتیں الفاظ میں جن کا بیان نہیں ہو سکتا، ان کے ہوتے ہوئے کھلے آسمان تلے کشادہ زمین پر سونے والا دن چڑھے تک سو بھی کہاں سکتا تھا؟

اب تو ہمارے بھی شہروں میں آسمان پردہ پوش رہنے لگا ہے۔ اور میں اس جگہ سے آیا تھا جہاں اگر

کبھی ستارے دکھائی دے جائیں تو اسے قابل ذکر واقعہ خیال کیا جاتا ہے اور یہاں کا عالم نہ پوچھیے۔ آدھا چاند آسمان پر، نیم کی چھوٹی پتیوں کا جھرمٹ بنائے ہوئے پیڑ کی شاخیں، ہوا ذرا سی بھی سنکتی تو چاند کی ایک آدھ کرن مجھ تک پہنچ ہی جاتی۔ مجھے ناسخ کا شعر یاد آیا۔

ہجر میں اب کس طرح بے یار جاؤں باغ کو
سارے پتوں کو بنا دیتی ہے خنجر چاندنی

میرے وطن اقامت واختیاری میں تو ہم لوگ کام کے لیے نکلتے تھے تو روشنی پوری طرح پھیلی نہ ہوتی تھی۔ کسی کو بیس میل جانا تھا، کسی کو پچیس میل، کسی کو اور بھی دور۔ صاحب استطاعت اور ہم لوگوں سے بھی زیادہ کاہل تر لوگوں کے پاس ہیلی کاپٹر تھے۔ وہ ہم لوگوں سے بہت بعد میں نکلتے تو تھے، لیکن لفٹ کے ذریعہ چھت پر جانے کے پہلے وہ اپنی خواب گاہوں یا طعام خانوں میں ہوتے۔ چاند انھیں بھی نہ دکھائی دیتا اور واپسی تک تو سب کے لیے شام اچھی طرح پھول ہی چکی ہوتی تھی۔ سب لوگ اوپر کی فضا سے بے خبر (بشرطے کہ کہیں آندھی نہ آئی ہو) اپنی اپنی محفوظ دُنیاؤں میں واپس چلے جاتے تھے۔

''زندہ غنودگی'' مجھے رابرٹ لوئیس اسٹیونسن (Robert Louis Stevenson) کی بات یاد آئی۔ فرانس کے نیم کوہستانی علاقوں میں تنہا گھومتے پھرنے اور جگہ جگہ کا ذائقہ چکھنے کے بعد (جس میں کھلے آسمان کے نیچے کئی راتیں گذارنے کا مزا بھی شامل تھا) اس نے ایک سفرنامہ نما چھوٹی سی کتاب لکھی۔ اس میں کھلے میں رات گذارنے کا بیان ایک جگہ لکھا ہے اور ایسا لکھ دیا ہے کہ میں سو برس بھی کوشش کروں تو نہیں لکھ سکتا۔ اسی میں یہ فقرہ Living Slumber (زندہ غنودگی) بھی ہے مگر میں کہاں کا شاعر یا افسانہ نگار کہ اسٹیونسن یا کسی اور کی طرح لکھنے کا ارمان رکھوں۔ مسعود حسن رضوی ادیب صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ انھوں نے اسٹیونسن کا اثر قبول کیا ہے۔ بے شک، ان کی نثر ایسی شستہ اور سجل اور رواں ہے کہ بس پڑھتے جائیے۔

نیند تو مجھے بہر حال نہ آرہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے گھر کے سامنے کچھ فاصلے پر، یعنی سبحان اللہ دادا کے مکان کے پیچھے ایک بڑا چھتنار اور جسیم درخت تھا۔ یہ یاد نہیں کہ کاہے کا پیڑ تھا، بس راتوں کو ایسا لگتا تھا کہ وہ درخت کچھ نزدیک آ گیا ہے۔ ہم لوگوں میں مشہور تھا کہ اس پیڑ پر ایک برم رہتا ہے جو ہر آنے جانے والے کو، اور خاص کر آٹھ دس برس کی عمر کے لڑکوں کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھتا رہتا ہے۔ تو وہ کیا چاہتا ہے؟ اس

بات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ الگ الگ قیاس آرائیاں تھیں۔ کوئی کہتا وہ جس کو پکڑ لے اسے بھی اپنی طرح کا برم بنالے گا اور اسی لیے اسے لڑکوں کی زیادہ ہوس تھی کہ وہ آسانی سے برم بن جائیں گے۔ کوئی کہتا، نہیں، اس کے بدن پر کھال اور ہڈیاں ہیں، اور کچھ نہیں ہے۔ اس کا منصوبہ ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ کسی کو پکڑ پائے تو اس کا گوشت اپنے بدن پر چڑھالے۔ لڑکوں کو پسند کرنے کا منشا یہی تھا کہ ان کا گوشت نرم ہوتا ہے۔ ایک لڑکا کہتا تھا کہ نہیں، وہ برم کسی وجہ سے اس درخت میں قید ہے۔ اسے کسی انسان کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ راتوں کو اس پر سوار ہو کر دور دور کے گاؤں جا کر مویشیوں اور انسانوں کا خون کر سکتا تھا۔ سنا گیا کہ ایک بار برم نے ایک نوجوان کسان کو پکڑ ہی لیا تھا۔ اس نے کہا کہ تو میری راتوں کی سواری بن جائے تو میں تجھے گھوڑے کی طرح طاقتور بنا دوں گا۔ دن بھر اپنی کھیتی کسانی آسانی سے کرتے رہیو۔ کسی جھگڑے لڑائی میں بھی کوئی تجھ پر قابو نہ پاسکے گا۔ وہ کسان اس کے چنگل سے چھوٹا کیسے، یہ بات کسی کو نہ معلوم تھی۔ شاید ہمارے دادا نے اسے کوئی تعویذ پہنا دیا تھا کہ ایسے ہی کسی سنکٹ میں کام آئے۔

سنا ہے بہت دن پہلے ہمارے دادا کا ایک کارندہ راتوں کو کھلیان کی حفاظت پر مامور تھا۔ ایک دن وہ ٹھٹھرتا، کانپتا آیا، جیسے اسے جاڑا دے کر بخار چڑھا ہو۔ اس نے دادا سے کہا کہ مولوی جی، میں اب کھلیان کی رکھوالی نہ کروں گا۔ سامنے والے پیڑ میں ایک بیتال آ گیا ہے۔ وہ مجھے رات بھر دانت دکھا دکھا کر کھوکھیاتا رہا اور کہتا رہا کہ کل تجھے نہ چھوڑوں گا۔ دادا نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور ایک تعویذ اسے لکھ دیا اور کہا کہ لے اسے گلے میں پہن لے۔ جا، اب وہ بیتال تیرا کچھ نہ بگاڑے گا، اور ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ایک بڑی عمر کے چچازاد بھائی قسم کھا کر کہتے تھے کہ دادا نے تعویذ میں بھوجپوری زبان میں یہ لکھا تھا کہ دیکھو جی، یہ آدمی ہمارا رکھوالا ہے۔ کوئی اس سے ہرگز کچھ تعرض نہ کرے۔

واللہ اعلم یہ بیان سچا ہے کہ جھوٹا، لیکن مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں گھر کے سامنے کا برم والا پیڑ رات کو کچھ نزدیک اس لیے لگتا تھا کہ وہ برم اسی پیڑ کو اپنی سواری بنا ڈالنے کی کوشش میں اسے کچھ آگے پیچھے کرتا رہتا تھا۔

آج رات وہ گھنا کالا پہاڑ جیسا پیڑ مجھے دکھائی نہ دیتا تھا۔ سامنے سبحان اللہ دادا کا گھر سہ منزلہ ہو گیا تھا اور پیچھے کی تمام وسعتیں، تمام شجر حجر کی آبادیاں نظر سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ صبح اگر میں بچ رہا تو دن کی چمکتی نیلی دھوپ میں جا کر اس پیڑ کو ضرور دیکھوں گا۔

بچ رہا؟ کیا مطلب؟ کیا میں خرچ ہو رہا ہوں، یا گھٹتا جا رہا ہوں کہ بچ رہنے کی بات میرے ذہن میں آئی؟ میں تو بس کل بھر کے لیے یہاں ہوں۔ شاید میں کہنا چاہ رہا تھا ''ٹھہر گیا'' اور کسی وجہ سے، شاید نیند کے کسی جھونکے میں ''بچ رہا'' کہہ گیا تھا۔ یہاں کوئی ڈر کی بات تو ہے نہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ بچپن میں ان سب بھوت، بیتال، برم، چڑیل وغیرہ کی باتوں سے ہمیں (یا کم سے کم مجھے) موت کا خوف نہ آتا تھا۔ وہ خوف تو عجب طرح کا تھا، کسی جنس غیر کے قبضے میں چلے جانے کا، گرفتار ہو جانے کا خوف، انجانی شے کا خوف۔ موت ان میں سے کسی مد حساب میں نہ تھی۔ بے شک ہم لوگوں نے سنسان یا اجنبی گھروں کے آسیب زدہ ہونے کے بارے میں کئی ڈراؤنی کہانیاں پڑھی تھیں اور ان میں سے اکثر کا انجام کسی نڈر شخص کی موت پر ہوتا تھا، لیکن اپنے اصلی اور حقیقی بھوتوں پریتوں سے ہمیں موت کا ڈر نہ تھا۔

مثلاً ایک قصہ جو میں نے پڑھا تھا، وہ اس طرح تھا کہ ایک شخص کسی اجنبی جگہ مہمان اترتا ہے، اور اسے رات رہنے کے لیے جو کمرہ دیا جاتا ہے وہ اسے ناپسند کر کے بخیال خود ایک زیادہ پُرفضا کمرہ اختیار کرتا ہے، درحالے کہ میزبان اسے متنبہ کرتا ہے کہ اس کمرے میں کوئی آسیب ہے۔ خیر، وہ مہمان ہنسی خوشی اس کمرے میں شب باشی کے لیے جا کر کمرہ اندر سے بند کر لیتا ہے۔ جب دن چڑھ آنے کے بہت دیر بعد تک دروازہ نہیں کھلتا اور نہ دروازہ کھٹکھٹانے کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو دروازہ توڑ کر لوگ اندر داخل ہوتے ہیں۔ مہمان وہاں موجود تو ہے، لیکن وہ گھٹنوں کے بل ہے، اس کے دونوں ہاتھ آگے بڑھے ہوئے ہیں، گویا وہ کسی چیز کو روکنا یا پیچھے دھکیلنا چاہتا ہے یا کسی چیز سے منت کر رہا ہے کہ اور آگے نہ آؤ۔ اس کی آنکھیں بند ہیں لیکن چہرہ وفور خوف سے ٹیڑھا ہو رہا ہے۔ میزبان اسے جلد از جلد اسپتال لے جاتا ہے لیکن راستے ہی میں مہمان کی موت ہو جاتی ہے۔

اس طرح کی خرافات سے ہم لوگوں کا دماغ ان دنوں کسی بھوت بنگلا جیسی چیز سے کم نہ تھا۔ اب میں خیال کرتا ہوں تو زیادہ خوف (کم از کم مجھے) جنون کا تھا، کہ ایسی باتیں مجھ پر گذریں تو میں ہوش حواس کھو کر پاگل یا مجذوب ہو جاؤں گا۔ مجھے سڑک پر گھومنے والے پاگل یا فاتر العقل لوگوں اور شراب کے نشے میں چور لوگوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ ہمارے شہر میں ایک عورت سڑکوں پر آوارہ پھرتی تھی، خدا معلوم بوڑھی تھی کہ ادھیڑ، لیکن اس کے سر پر تھوڑے بہت بال جو تھے وہ سیاہ تھے۔ ایک گندا، کچیلا سا کرتا اور ویسا ہی آڑا پاجامہ اس کا لباس تھے۔ وہ پان بے انتہا کھاتی، اس کے منھ سے پان کی پیک مسلسل ٹپکتی رہتی تھی اور اس کا

گریبان دور تک بالکل سرخ رہتا تھا۔ ایک بار میں اپنے خیالوں میں گم (اس وقت میں کوئی دس برس کا تھا لیکن خیالوں میں گم رہ کر راستہ چلنا میری عادت تھی۔ اس زمانے میں سڑکوں پر صرف پیدل راہگیر، یا سائیکل سوار، یا اکا دکا رکشے اور یکے ہوتے تھے) کہیں سے چلا آ رہا تھا کہ گھر کے پاس ہی اچانک کسی چیز سے ٹکرا گیا۔ چونک کر اوپر دیکھا تو وہی مجنونہ تھی۔ بظاہر اس پر اس بات کا کوئی اثر نہ تھا کہ میں اس سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ مجھے بالکل خالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی لیکن راستہ اس نے پھر بھی نہ چھوڑا تھا۔ میرے منھ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کا راستہ کاٹ کر اندھادھند گھر کو بھاگا۔

میں بھی کس قدر بچکانہ مزاج کا شخص ہوں۔ اتنی عمر ہونے کو آئی لیکن چھ ساڑھے چھ دہائی پہلے کی وہ سب باتیں کہیں نہ کہیں دل میں کھبی ہوئی ہیں۔ وہ اتنی دور بھی نہیں ہیں کہ ان کو کھینچ کر ہوش کی سطح پر آ جانے میں کچھ دیر لگے، یا سوچنا اور خود کو کھنگالنا پڑے۔ ایک زمانے میں مجھے بھوت پریت، مافوق العادت یا مافوق الفطرت باتوں اور واقعات، خوف اور گھناؤنے پن والے واقعات (مثلاً آدم خوری) پر مبنی افسانے پڑھنے کی بہت چیٹک تھی۔ اب بھی میرے پاس ایسے افسانوں کے مجموعوں اور ناولوں کا بڑا ذخیرہ ہے، اگرچہ ایک بار میں نے جگہ کی تنگی کے باعث ایسی بہت ساری کتابیں دوسروں کو دے ڈالیں (جس کا اب تک مجھے افسوس ہے) پھر بھی، اس وقت میرے پاس اچھی خاصی لائبریری باقی رہ گئی جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

مجھے نیند تو آ رہی ہے، لیکن بہت ہی ہلکی سی۔ شاید یہ نیند نہیں ہے، میرا تھکا ہوا ذہن ہے۔ انگریز شاعر ٹامس لو پیکاک (Thomas Love Peacock) کی بہت سی نظمیں بھوتوں کے بارے میں ہیں۔ (Peacock)، بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا، مگر انگریزوں میں ایسے، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر عجیب نام ہوتے ہیں۔ ایک اور شاعر صاحب کا نام تھا John Drinkwater، اور Long اور Short نام تو اب بھی بہت سننے میں آتے ہیں۔ بلیک (Black,Blake)، وائٹ (White,Wight) گرے (Gray,Grey)، ڈارک (Dark)، گرین (Green,Greene)، یہ نام بھی شاذ نہیں ہیں۔ ٹائگر (Tiger) اور اسنیک (Snake) میں نے نہیں دیکھے، لیکن اٹھارویں صدی کے مشہور ڈرامہ نگار Sheridan کے سب سے کامیاب ڈرامے میں ایک کردار اسنیک (Snake) نام کا ہے، مگر خیر وہ تو طنزیہ مزاحیہ طور پر ایجاد کردہ نام تھا۔ لیجیے میں تو ناموں کی کھتونی لے کر بیٹھ گیا (یا پڑ گیا)۔

تو پیکاک صاحب کی جو نظم مجھے بہت پسند تھی، افسوس کہ اب مجھے اس کے دو یا تین مصرعے یاد

ہیں۔ نظم میں ایک بھوت ہے جو ایک حسینہ پر عاشق ہے۔ وہ ہر رات اس کے سرہانے آ کر ایک گیت گاتا ہے کہ ''مرجا، ارے مرجا۔'' نظم کا اختتام یاد نہیں، لیکن شروع کے چند مصرعے یاد ہیں:

A ghost that loved a lady fair,
Soft by midnight at her pillow stood,
Ever singing, "Die, Oh Die"

اس وقت، بلکہ آج بھی جو بات مجھے اس نظم میں سب سے حیرت ناک لگتی ہے، وہ یہ نہیں کہ کوئی بھوت کسی لڑکی پر عاشق ہو جائے۔ ہمارے یہاں تو عورتوں پر آسیب، شیخ سدو، جن، پری، آتے ہی رہتے ہیں۔ (حضرت غوثی علی شاہ صاحب کے یہاں لوگ ایسے معاملات میں تعویذ مانگنے آتے تھے۔ آپ تعویذ دے تو دیتے، لیکن اکثر فرماتے کہ انگریز کی عورتوں پر کوئی جن یا آسیب کیوں نہیں آتا؟ انگریز کا اقبال بلند ہے اس لیے اس کی عورتیں بھی محفوظ ہیں۔ بات تو مزے دار ہے، لیکن میرے خیال میں اصل معاملہ عقیدے کا ہے، اور ایک بات یہ بھی ہے کہ غوثی علی شاہ صاحب کا بھی مطلب شاید یہ رہا ہوگا کہ یہ سب عقیدے کی بات ہے۔ انگریز کو جن اور پری اور شیخ سدو وغیرہ پر نہیں، لیکن بھوت اور روح پر عقیدہ ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ ان کا اثر عورتوں یا مردوں پر نہیں بلکہ گھروں پر ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ، اسلامی عقیدے کے مطابق، بھوت پریت پر نہیں، لیکن جنات، پری وغیرہ پر ہے۔)

میرے لیے پیکاک صاحب کی نظم میں اصل حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس بھوت کو پورا یقین تھا کہ اس کی معشوقہ مر کر بھوت (یا بھوتنی؟) ہی بنے گی۔ واللہ اعلم۔ ان کی ایک نظم اور تھی جس میں دو بھوتوں کی ملاقات ہوتی ہے تو ایک پوچھتا ہے، کہو کیا حال ہے؟ دوسرا کہتا ہے، پتا نہیں جی، میں تو کل ہی مرا ہوں۔ اُردو میں یہ معاملہ اضحوکہ لگتا ہے، لیکن انگریز شاعر نے خفیف سے مزاح کے ساتھ خوف یا سنسنی کی تھرتھری بھی رکھ دی تھی (شاید اس لیے کہ انگریز قوم کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی بھوتوں پر اعتقاد رکھتی ہے۔)

ابھی صبح نہیں ہونے والی۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک خاصا بڑا تالاب تھا جسے لوگ ''گڑھی'' کہتے تھے۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ ''گڑھا'' کی تانیث کے اعتبار سے تو ''گڑھی'' بمعنی ''بہت چھوٹا گڑھا'' ہونا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے تالاب کو ''گڑھی'' کہنا چہ معنی دارد؟ لیکن میری مرحومہ جنت نشین بھی اپنے آبائی

تالاب کو، جس میں مچھلیاں وافر ہوتی تھیں، ''گڑھیا'' کہتی تھیں۔ زبان کے کھیل نرالے ہیں۔ بہرحال، ہماری گڑھی میں مچھلیاں نہیں، لیکن جونکیں، گھونگھے، اور پانی کے چیونٹے بے شمار تھے۔ یہ پانی کے چیونٹے بھی خوب تھے، نہایت دبلے پتلے، بالکل جیسے وہ تنگ اور پتلی اور لمبی، ہلکی بادبانی کشتیاں جنھیں Pinnace کہتے ہیں، یا جیسے کشمیری شکارے، بے حد ہلکے پھلکے۔ سیاہ بھورا رنگ، جسے Steel Grey کہیے، اور اس قدر لمبی لمبی ٹانگیں جیسے وہ سرکس کے جوکروں کی طرح پاؤں میں بانس باندھے ہوئے ہوں۔ وہ پانی کی سطح پر اس قدر تیز دوڑتے جیسے دوڑ کے میدان میں گرے ہاؤنڈ کتے دوڑتے ہیں۔ مجھے اب یہ تو نہیں یاد کہ وہ کتنی دور تک دوڑتے نکل جاتے تھے (گڑھی خاصی چوڑی تھی، یا مجھے وہ چوڑی لگتی تھی۔) مجھے یاد نہیں کہ کوئی چیونٹا کبھی اِس پار سے اُس پار پہنچتا ہوا دکھائی دیا ہو لیکن وہ جانور بالکل ننھے منے اور ہلکے پھلکے تھے اور گڑھی کا پانی بھی کچھ بہت روشن نہ تھا، اس لیے اگر وہ اس پار نکل بھی گئے ہوتے تو مجھے نظر نہ آ سکتا تھا کہ وہ اس کنارے پر پہنچ ہی گئے ہیں لیکن جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ان کی دوڑ یہی کوئی دو ڈھائی فٹ کی ہوتی تھی اور مجھے ایک چھوٹے سے آبی منطقے میں دوڑتے بھاگتے نظر آتے تھے، اپنے تئیں ایک عجب اہمیت کا احساس اور خودنگری کا رنگ لیے ہوئے، گویا وہ سارا پانی انھیں کے لیے بنایا گیا تھا۔ اکثر میں دیکھتا کہ وہ ایک طرف دوڑتے ہوئے گئے، پھر دفعتاً کنی کاٹ کر کسی اور طرف نکل گئے۔ چراگاہوں میں کلیلیاں کرتے ہوئے آہو بچوں اور الل بچھیروں کی طرح انھیں ایک دم قرار نہ تھا۔

اپنی دوڑ میں منہمک چیونٹوں کو کبھی کبھی میں فرض کرتا کہ وہ جنگی جہاز ہیں اور جنگی تیاریوں میں مشغول، یا سمندر پار کرنے والے ہلکے جہاز ہیں جنھیں کچھ گنے چنے مسافروں کو لے آنا اور واپس لے جانا ہو گا۔ ایسے مفروضے میں جہاز رانی اور مہم جوئی اور جوکھموں کو ہنستے کھیلتے انگیز کر لینے کا بھی سنسنی آمیز احساس بھی شامل ہو جاتا تھا۔ چونکہ میں نے انھیں کبھی ڈوبتے نہ دیکھا تھا، اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ بڑے ماہر جہازی ہیں، سند باد جہازی کی طرح نہیں ہیں کہ جس کا جہاز آئے دن طوفانی ہو جایا کرتا تھا۔

گھونگھے وہاں بہت تھے، گول، لمبے، ٹیڑھے بدنوں والے، جیسے کسی سادھو کے سر پر لپیٹی ہوئی لمبی جٹائیں۔ مجھے کبھی ان سے دلچسپی نہ ہوئی۔ کہاں وہ میرے جری اور خوبصورت اور صبا رفتار چیونٹے اور کہاں یہ بھونڈے، بھدیسل، ایک جگہ پڑے رہنے والے گھونگھے۔ کبھی کبھی میرا ہاتھ لگ جاتا تو بڑے چپچپے اور گیلے معلوم ہوتے۔ (نہیں، ان میں سے کچھ خشک بھی ہوتے تھے۔) آخر وہ تھے ہی کس مصرف کے؟ پانی میں

رہنے والے (ایسا میرا خیال تھا) لیکن پانی پر تیرنے سے کترانے والے۔ دریا کے کنارے وہ لمبوترے، ہلکے پھلکے اور سفید گلابی رنگ کے گھونگھے اور ہی چیز تھے جن کے درشن مجھے بہت ہی کم ہوتے تھے کیونکہ ہمیں دریا پر جانے کی سخت ممانعت تھی اور ان دریائی گھونگھوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مردہ ہوتے تھے، لہٰذا ان سے کوئی خطرہ، یا کسی چپچپاہٹ، کسی گھن کے احساس کا خطرہ نہ تھا۔

جونکیں تو میں نے شاید وہاں دیکھیں نہیں، لیکن گول، مندر نما گھونگھوں کے نیچے سے دو لمبی، سرخ، مٹ میلی بھوری پتلی زبانیں سی کبھی کبھی نکل آتی تھیں۔ میرے گاؤں والے ساتھی مجھے خبردار کرتے تھے کہ انھیں کبھی ہاتھ نہ لگانا، کیونکہ یہ بھی جونک کی طرح خون نکال لیتی ہیں، سرپت کی تیز پتی کی طرح یا چھوٹے سے دھاردار چاقو کے پھل کی طرح یہ تمھارے بازوؤں یا ہاتھ پر لمبی سی خونی لکیر چھوڑ جائیں گی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ یہ سب بچوں کا جھوٹا خوف یا شرارت بھرا ڈھونگ تھا، کیونکہ اب مجھے معلوم ہے کہ وہ لمبی سی دھاگے جیسی چیزیں دراصل گھونگھے کے پاؤں ہیں۔

اس گڑھی کے کنارے، ہمارے مکان کے پچھواڑے کی طرف، اور اتنا نزدیک کہ میں راتوں کو اس کی (دن کو) چمکیلی (رات کو) سیاہ پتیوں میں ہوا کو غل مچاتے، لمبی لمبی سانسیں بھرتے، بند کمرے میں اپنے پلنگ پر سے گذرتے سنتا اور محسوس کرتا تھا۔ وہ راتیں میرے لیے بڑی قیامت کی ہوتی تھیں۔ میری ماں تو دادی کے گھر میں دوسری بہوؤں کے ساتھ کھانا پکانے، کھلانے اور کھانے میں لگی رہتیں اور میرے باپ رات کی نماز (شاید عشا، شاید مغرب) کے بعد دادا کی محفل میں دیر تک بیٹھے رہتے۔ خدا معلوم کیا کیا باتیں کرتے ہوں گے۔ لڑائی کے دن تھے (میرا خیال ہے وہ سال 1943 یا 1944 رہا ہوگا)، اس لیے لڑائی میں انگریزوں کی فتح یا پسپائی کے چرچے ضرور ہوتے ہوں گے، اور چونکہ سارا گھرانا بہت مذہبی تھا، اس لیے اللہ رسول کی باتیں بھی ہوتی ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ سب لوگ مجھے اپنے باپ کے گھر میں پوری طرح محفوظ اور گہری نیند میں ہر خوف اور ہر وجود سے بے خبر سمجھتے ہوں گے۔ گھر، جس کے ایک سرے پر، گڑھی کی پرلی طرف ایک سنسان بیت الخلا تھا جسے کوئی استعمال نہ کرتا تھا، لیکن وہ بند بھی نہ رہتا تھا، مگر گڑھی کی جانب اس میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہ تھا، لہٰذا اسے ہر طرح محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ چاروں طرف اونچی دیوار بھی تھی، خاص کر پیپل کے درخت اور گڑھی کے رخ پر، اور جس کا دروازہ شاید کھلا رہتا ہوگا، لیکن اس گھر کی جائے وقوع ایسی تھی کہ دروازے پر آنے والا کئی لوگوں کی نگاہ میں رہتا (یا کم سے کم میرے باپ ماں کا یہی خیال رہا ہوگا۔) ایسی

صورت میں آٹھ نو سال کے سمجھ دار، اسکول جانے والے اور انگریزی پڑھنے والے لڑکے کے لیے کسی خوف کی بات واقع ہونے کا امکان ہی کہاں تھا؟

لیکن آہ، میرے والدین کو کیا معلوم تھا کہ وہی پیپل کا درخت جو دن کو انتہائی دوست دار اور خوشگوار اور ہریالا سایہ دار پڑوسی تھا، شام پھولتے ہی دشمن، اور مجھ سے خدا جانے کس قصور کا بدلہ لینے یا خدا جانے کب کی دشمنی نکالنے پر آمادہ، خون خشک کر دینے والا آسیبی وجود بن جاتا تھا اور وہ ہوائیں، جنھیں وہ بار بار مجھے دھمکانے کے لیے میرے سر کے اوپر، میری چھت کے اوپر، سرپٹ دوڑنے والے گھوڑے کی طرح دوڑاتا تھا اور کیا رات کے وقت وہ سارے گھونگھے اور وہ میرے دوست چیونٹے، اور شاید پانی کی تہ میں خفیہ زندگیاں گذارنے والی مخلوق، سب اس پیپل پر چڑھ کر چڑیل اور جنات بن جاتے تھے؟ یا شاید وہ پیپل کا گھنا، لمبا، گرانڈیل پیڑ ہی کوئی جنات بن جاتا تھا؟ یا ہواؤں کے شور کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کوئی چڑیل، کوئی برم، کوئی پشاچ، چپ چاپ پیپل سے اُتر کر مجھ کو دبوچنے ہی والا ہے؟

خدا جانے پیپل کے پیڑ میں اتنی قوت کہاں سے آتی تھی۔ آج بھی اس قوت کا مظاہرہ میں اس طرح دیکھتا ہوں کہ شہر میں جہاں اب میں رہتا ہوں، ایک پیپل وہاں سے کم سے کم ایک ڈیڑھ میل کی دوری پر سڑک کے اُس پار کھڑا ہے۔ وہاں کئی درخت اور بھی ہیں، جیسے کہ سڑکوں پر ہوتے ہیں۔ آندھی تو ایک طرف، تیز ہوا بھی شہر کے اس حصے میں کبھی کبھی ہی بہتی ہے لیکن میرے گھر کی کوئی دیوار، لان کا کوئی گوشہ، اندرونی آنگن کا کوئی بھی حصہ ایسا نہیں جہاں پیپل کے پودے تکلیف دہ اور پریشان کن تواتر سے نہ اُگ آتے ہوں۔ ہزار بار اکھڑواتا ہوں، سینکڑوں بار خود نوچ کر پھینکتا ہوں، لیکن توبہ کیجیے، وہ کہاں ہار مانتے ہیں۔ میں ہار مانتے مانتے رہ جاتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ ان پودوں کو اگر بڑھنے دیا گیا تو یہ موذی دیوار، چھت، سب کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے۔ اس لیے ہر مہینے دو مہینے مالی کو تاکید کرتا ہوں، دوسروں کی ہمت افزائی کرتا ہوں کہ بھائی انھیں ٹھہرنے مت دینا مگر وہ پھر آ جاتے ہیں۔ پیپل نہ ہوا، ایڈگر ایلن پو (Edgar Allen Poe) کی نظم The Raven کا وہ کچھ شیطانی سا پربت کاگ ہوا جسے نظم کا متکلم ہزار کوشش اور ترغیب کے باوجود اپنی کھڑکی، بلکہ یوں کہیں کہ اپنے سینے سے ہٹا نہ سکا تھا۔

ہر رات میری اور پیپل کے چھتنار، دشمن، بھوت جیسے سیاہ فام، غیر انسانی وجود اور پچاسوں ریل گاڑیوں کے ایک ساتھ کسی پل پر گذرنے کے شور جیسا ہنگامہ کرنے والی ہواؤں سے جنگ ہوتی اور ہر صبح کو وہ

پیپل وہی پہلے جیسا سایہ دار، ٹھنڈا اور ہلکی شیرینی لیے ہوئے گول گول چھوٹے چھوٹے پھلوں والا گھر بن جاتا۔ نہ جانے کتنی دوپہریں اپنے والدین کی آنکھ بچا کر وہاں میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیپل کی گوندنیاں چننے اور مزے لے لے کر کھانے میں گذاری ہیں۔ ایک بار میرے ایک ساتھی نے غلطی سے بکری کی ایک مینگنی بھی گوندنی سمجھ کر منھ میں ڈال لی تھی (میں آپ کو یقین دلاتا ہوں وہ میں نہیں تھا۔) یہ واقعہ ہم لوگوں کے لیے تھوڑی بہت تفریح کا سبب بنا ضرور تھا، لیکن ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی خبر ہمارے بڑوں کو لگ گئی تو بڑی ڈانٹ (اور اغلب یہ کہ مار بھی) پڑے گی، اس لیے ہم لوگوں نے بہت جلد ہی اس موضوع کو اپنی گفتگو سے خارج کر دیا۔

آج خدا جانے کتنی مدت بعد میں گاؤں واپس آیا ہوں۔ کل مجھے دادا کی زمین پر نو تعمیر اسکول کا افتتاح کرنا ہے۔ دادا کے دروازے پر نیم کا پیڑ، جس کے نیچے خاندان کے لوگوں کے ساتھ گاؤں کا ہر اجنبی مسافر کھانا کھاتا تھا، اب نہیں ہے۔ جس درخت کے سائے میں اس وقت میں لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا ہوں، اس کی عمر بمشکل تیس چالیس برس ہوگی۔ وہ گڑھی اور وہ پیپل تو اس طرح صفحۂ وجود سے محو ہو چکے ہیں گویا کبھی تھے ہی نہیں۔

ہم تو جیسے یہاں کے تھے ہی نہیں
خاک تھے آسماں کے تھے ہی نہیں

جون ایلیا نے ہجرت کے پس منظر میں کہا تھا۔ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ جو یہیں کے تھے اور کہیں نہ گئے، ہم لوگوں کا سارا بچپن، سارا لڑکپن، تمام اٹھتی ہوئی جوانیاں، تمام دوستیاں اور رقابتیں ان اشجار کے ساتھ گئیں، جو کٹ گئے، ان تال تلیوں کے ساتھ ڈوب گئیں جو سوکھ گئے، ان راہوں سے اٹھا لی گئیں جن پر گھر بن گئے۔ اے تُو جو شہر کے باہر کھڑا اس طرح بے تحاشا رو رہا ہے، بول، تُو نے اپنی جوانی کے ساتھ کیا کیا؟ مجھے ورلن کے مصرعے یاد آئے لیکن میں نے تو کچھ کر کے دکھا دیا ہے، میں آج دور شہر سے بلایا گیا ہوں کہ اسکول کی عمارت کا افتتاح کروں۔ میں تو اب کچھ خاصا اہم آدمی ہوں، وہ چھوٹا سا لڑکا نہیں جو دل ہی دل میں اپنے باپ سے ناراض رہتا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد مجھے آم اور خربوزوں میں سے اتنا حصہ کیوں نہیں ملتا جتنا میں چاہتا ہوں؟ لیکن اس گلی سے کسی نے نہ کہا تھا کہ جانے والے یہاں کے تھے ہی

نہیں۔ میں تو یہیں کا تھا، یا شاید نہیں تھا۔ بھلا کون اپنے دل میں اور سر پر ان بھوت پریتوں، چڑیلوں، جناتوں، تیز چل کر ڈراتی ہوئی ہواؤں اور بھیانک مسکراہٹ مسکرا کر دور سے اشارہ کر کے بلانے والی بلاؤں کا پیلا، گندا، سیاہ خون لیے لیے پھر سکتا تھا؟

مگر وہ دُنیا ہر طرف متحیر کرنے والی، ہر طرح سے جرأتوں کو آواز دینے والی، ہر لمحہ وسعتوں اور گہرائیوں کا احساس دلانے والی دُنیا تھی۔ جس بیت الخلا کا ذکر میں نے ابھی کیا (خدا جانے کیوں ہم لوگ بھی اسے بیت الخلا کہتے تھے، پاخانہ نہیں)، اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اگر کوئی چالیس دن تک متواتر اس میں جا کر ''سلام علیکم'' کہے تو اکتالیسویں دن اس کی ملاقات ایک جنات سے ہو جائے گی جو وہیں رہتا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ ایک بار ایک صاحب نے چالیس دن تک ''سلام علیکم'' وہاں جا کر کہا تو اکتالیسویں دن واقعی ایک شخص انھیں نظر آیا، جو تھا تو انسانوں جیسا، لیکن اس کا قد آسمان کو چھوتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ بیت الخلا کی چھت بہت اونچی نہ تھی، لیکن اس وقت اتنی اونچی، اتنی اونچی ہو گئی تھی کہ ٹھیک سے نظر نہ آتی تھی۔ ''وعلیکم السلام'' ایک بڑی گونجتی ہوئی سی آواز آئی، جیسے بہت بڑا نقارہ بج اٹھا ہو، یا جیسے کوئی بہت بڑا، بہت ہی بڑا سانڈ ڈکار رہا ہو۔

اس کے بعد کیا ہوا، یہ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ لیکن وہ پیپل اب پھر میرے سامنے ہے.... نہیں، پیپل نہیں، لگتا ہے کوئی شخص کہیں بلندی سے اتر رہا ہو، شاید نیم کے اس پیڑ سے جس کے تلے میں سو رہا ہوں۔ دھندلی، لمبی صورت، نہیں بہت لمبی نہیں، لیکن کچھ گھنی گھنی سی، اور وہ پیپل اب اس کے پیچھے ہے اور اس پیپل سے اب کچھ نیلی، کچھ سیاہ سی روشنی پھوٹ رہی ہے۔ بہت ہلکی روشنی، لیکن وہ صورت، وہ پیپل کا پیڑ.... نہیں، وہ انسانی صورت، مجھے صاف دکھائی دیتی ہے۔ کوئی انسان ہے، ڈرنے کی کیا بات ہے؟ کوئی بوڑھا، پرانا مسافر ہوگا جو یہاں رات کے لیے جگہ مانگنے آیا ہے۔ صبح کو چلا جائے گا، مگر، مگر اس کے کپڑے تو بہت ہی پرانے زمانے کے ہیں۔ ہم لوگ ایسے موقعے پر ''دقیانوسی'' لفظ استعمال کرتے تھے، اب بہت دن سے یہ لفظ سننے میں نہیں آیا۔

اجنبی آ کر میرے پلنگ کی پائینتی کھڑا ہو گیا ہے۔ نہیں، میں اسے اپنے پلنگ پر رونے نہ دوں گا۔ رونے؟ نہیں سونے۔ ہرگز سونے نہ دوں گا۔ میں چاہتا ہوں اٹھ کر اس سے پوچھوں، کون ہو تم؟ اور ساتھ ہی سامنے کوئی پچاس قدم دور پردادا کی مسجد میں سوئے ہوئے موذن کو آواز دوں، لیکن میرا بدن کچھ اکڑ سا گیا

ہے۔ آواز کے عضلات (عضلات بھی کیا فضول لفظ ہے جیسے بہت سارے موٹے پتلے تار جھنجھنا گئے ہوں) میں وہ لچک نہیں رہ گئی جس کے ذریعہ آواز بنتی ہے۔

گرمی تو کچھ خاص نہیں ہے، لیکن میرے سارے بدن میں، خاص کر ماتھے پر، گریبان اور بغل میں عجیب طرح کی تری ہے۔ مجھے چاہیے کہ اٹھ کر پسینہ خشک کروں، ہو سکے تو کہیں سے پنکھا جھلنے کے لیے کسی چیز کا اہتمام کروں۔

روشنی اب اس اجنبی کے پیچھے ہی نہیں، اس کے اطراف میں بھی ہے۔ اب میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ یہ کمبخت کچھ بولتا کیوں نہیں؟ متوسط قد، گٹھا ہوا بدن، سر پر بھاری لیکن مضبوط بندھی ہوئی پگڑی، سیاہ کپڑے کی، جس میں سفید دھاریاں ہیں۔ بدن پر سوتی شلوکا، کچھ اونچا لیکن آستین دار۔ کپڑے کا رنگ اس وقت متعین کرنا مشکل ہے۔ شلوکے پر آدھی آستیوں کا انگرکھا کسی پھولدار موٹے کپڑے کا، زین کے کپڑے کا اونچا پاجامہ، پنڈلیوں پر چست لیکن کمر کے نیچے ڈھیلا۔ پاجامے کی لمبائی پنڈلیوں کے نیچے تک نہیں ہے۔ کمر میں ایک ڈوپٹہ بہت تنگ کسا ہوا، اس میں ایک خنجر یا چھرا آویزاں۔ (یہ کوئی خونی قاتل وغیرہ تو نہیں؟) لیکن خنجر میان میں ہے۔ میان بہت سادہ کسی لکڑی یا سینگ کی بنی ہوئی ہے۔ خنجر کا قبضہ بھی نقش و نگار سے عاری ہے۔ پاؤں میں جوتیاں ہیں کہ نہیں، پتا نہیں لگتا۔ گلے میں مختصر سا ہار کسی پتھر کا، لیکن قیمتی یا چمک دار نہیں۔ مونچھیں کچھ کچھ طویل لیکن بہت گھنی نہیں، ہاں دہانے کے دونوں طرف انھیں بل دے رکھا تھا۔ داڑھی ایک مٹھی سے کم، لیکن خاصی نمایاں اور تل چاولی۔ ڈاکو تو نہیں لگتا اور ڈاکو اس طرح چپکے چپکے تن تنہا تھوڑا ہی آجاتے ہیں۔

میں نے دوبارہ اٹھنا چاہا، لیکن فضول۔ آواز بھی اسی طرح بند تھی، گلا اسی طرح خشک تھا۔

”بندگی عرض کرتا ہوں حضور خانِ دوراں، عالی جاہ۔ مزاج سرکار کا کیسا ہے؟“

عجیب سی آواز تھی۔ کچھ کھوکھلی سی۔ لہجہ بھی ہماری طرف کا نہ تھا لیکن مغربی اضلاع والوں جیسا بھی نہ تھا۔ لگتا تھا یہ شخص مدتوں فارسی بولنے والوں کے ساتھ یا آس پاس رہا ہو۔ پچھم والے ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولتے ہیں۔ ایرانی، یعنی آج کے ایرانی، الفاظ کو تیزی سے ادا کرتے ہیں۔ اس شخص کی بھی ادائیگی ذرا تیز تھی۔ حرکات و سکنات بدن میں فدویانہ پن کے باوجود لہجے میں کچھ قوت اور سختی تھی۔

نیند کا ایک جھونکا آیا۔ میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں، ہوا بھی ٹھنڈی اور شیریں ہو گئی تھی۔

باب دوم

خداوند عالم سکندر سلطان لودی بن سکندر سلطان لودی فرماں روا عرصہ بیس سال سے ملک ہندوستان، پنجاب، دوآبۂ ہندوشرق اور بنگالے سے بندیل کھنڈ تک کے علاقے پر نہایت شان اور دلجمعی اور انصاف وعظم وشان کے ساتھ تھے۔ یہ آخری برس (1517) ان کی حکومتِ بابرکت کا تھا۔ لیکن خبر کسی کو کیا تھی کہ اقبالِ سکندری کا یہ آفتاب اب لبِ بام ہے۔ بلادِ روم کے آگے مشرق میں دار الخلافۂ اسلام، شہر فرحت وقوت التیام، یعنی حضرت دہلی کو چھوڑ کر خداوندِ عالم نے ایک نیا شہر گوالیار سے کچھ اوپر دہلی کے جنوب میں آگرہ نام کا سنہ 1504 میں تعمیر کر کے اسے اپنا دار السلطنت ٹھہرایا تھا۔ خداوندِ عالم کا بیشتر وقت نئے شہر کی تزئین اور توسیع میں صرف ہوتا تھا۔ حکومت میں ساری دبدبۂ خداوندِ عالم کے بل پر امن وامان ہر طرف تھا۔ کہیں بھی، کچھ بھی، طول وعرضِ سلطنتِ باحشمت میں واقع ہوتا، خداوندِ عالم کو پلک مارتے میں خبر اس کی لگ جاتی تھی۔ لوگوں میں عقیدہ عام تھا کہ خداوندِ عالم حضور سلطان سکندر کے قبضے میں کئی مؤکل ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے قبضے میں سکندر ذوالقرنین کے بھی تھے اور یہ مؤکلان سلطان سکندر کے، انھیں آگاہ وباخبر کلیتاً رکھتے تھے۔ کسی کو مجالِ ظلم رانی نہ تھی۔

میں گل محمد، عمر کوئی پچاس سال (صحیح عمر والدہ کو میری معلوم تھی لیکن اب وہ مدت ہوئی اس دنیا میں نہیں ہیں۔) اپنے آبائی گاؤں سے باپ اپنے کے ساتھ دہلی آ گیا تھا۔ اس وقت میرا لڑکپن تھا، فارغ البالی

کے دن تھے۔ باپ خان جہاں لودی جو مشہور عالم مسند علی خان کے نام سے تھے، ان کی ڈیوڑھی پر تا عمر دربان رہے۔ میں اکیلی اولاد، کھیلنے کھانے سے فرصت نہ ملتی تھی۔ تاہم باپ میرے نے مجھے خان جہاں کے دوسرے نوکروں کے بچوں کے ساتھ حویلی کے مولوی کے سپرد کر دیا۔ بعد ازاں عمر ابھی گیارہ ہی برس کی تھی کہ مجھے مشہورِ زمانہ، شیخ عصر شاہ اللہ دیا صاحب جونپوری کے فرزندِ جگر بند شیخ بھکاری صاحب دہلوی کے مدرسے میں ڈال دیا گیا۔ تین چار برس تک مدرسے میں خوب کٹائی منجھائی ہوئی۔ شیخ بھکاری صاحب کو تقریر سے زیادہ تحریر سے شغف تھا، اس لیے اصل کام تعلیم کا ان کے شاگردوں کے سپرد تھا۔ میں نے جہاں تک ہو سکا پڑھائی محنت سے کی۔ تھوڑا بہت لگاؤ شعر گوئی سے تھا، اس لیے مطول اور المعجم اور بعد میں اسرار البلاغۃ اور اعجاز القران اور البیان والتبیین میں تھوڑا بہت درک حاصل کیا۔ باقی معقولات ہوں یا منقولات، ایک ذرا سے علم انجم شناسی اور علم ہیئت کے سوا کچھ میرے پلے نہ پڑا۔

میں نے حضرت شیخ جمالی کنبوہ کی خدمت میں حاضری دینی شروع کی اور فن شعر کے کچھ نکات ان سے حاصل کیے۔ لیکن مجھ میں ملکہ شعر گوئی کا حقیقتاً نہ تھا۔ ایک دن میری غزل پر خط تنسیخ پھیر کر انھوں نے فرمایا:

''میاں صاحب، شما شاعر نہ خواہید شد۔ می بینیم کہ شما مذاق شناوری و کشتی گیری دارید۔ پیشۂ سپہ گری ہم برائے شما خوب می باشد۔''

مجھے بُرا تو بہت لگا۔ افسوس بھی بے حد ہوا، لیکن اس کو کیا کیجیے کہ حضرت شیخ نے مجھے متعدد بار کنار جمنا پر پتنگ اڑاتے، یا بابا سلطان جی صاحب کی باؤلی میں شناوری کرتے، یا استاد بھوپت رائے ماہر کشتی گیری کی خدمت میں حاضر ہوتے بھی دیکھا تھا۔ بسنت پھولتی یا میلاد شریف کے دن آتے یا ہولی کا تیوہار ہوتا، میں ہر اس جگہ موجود رہتا جہاں مواقع سیر اور گل چھروں کے مہیا ہوتے۔ حضرت شیخ کا آنا جانا کہاں نہ تھا، تغلق آباد سے لے کر کوٹلہ فیروز شاہ تک ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے۔ از صبح تا شام وہ اپنی پالکی میں شہر کی سیر کرتے یا شاگردوں اور عقیدت مندوں کے دیوان خانوں میں شعر و سخن کی محفلوں کے صدر مجلس ہوتے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ بندہ بھی نہ ٹلد گل محمد جیسا تھا، اپنے شوق اور اپنے لہو ولعب کو ترک کرنے والا میں نہ تھا۔

اس طرح نہ تو میں شاعر بن سکا، نہ ہی عالم۔ بس یہ ضرور تھا کہ عربی فارسی کی شُد بد، تھوڑا بہت علم

الحساب، جو میں کسب کر سکا تھا، میرے بہت کام آیا۔ اپنے کھلنڈرے دوستوں میں تو ئیں مولانا گل محمد دہلوی کے نام سے معروف ہو گیا تھا۔ باپ کا گھر سونے اور کھانے کے لیے، اور دہلی کا شہر سیر سپاٹوں اور کھیل کود کے لیے، پھر اور کیا چاہیے تھا۔ یہ ضرور ہے کہ باپ نے شادی میری برس اٹھارہ کے سن میں کر دی۔ بی بی اور گرہستی سے لگاؤ مجھے اتنا ہی تھا جتنا کسی ایسے جوان کو ہوتا جسے شہر کی ہوا لگ گئی ہو۔

باپ کے ہوتے فکر بال بچوں کی کسے ہوتی۔ کبھی کبھی تیج تیوہار کے زمانے میں گھر ہو لیے، گھر والی کے لیے شیرازی جوتیاں، بھاگل پوری نینو اور بنارسی کمخواب دست بقچے میں باندھے، بچوں کے لیے متھرا اور بداؤں کے پیڑے، جو دہلی میں مفرط ملتے تھے، ہانڈیوں میں رکھوائے اور چاند دِسنے کے کچھ پہلے گھر پہنچ لیے۔ میری شادی کے تیسرے سال باپ نے اچانک مرضِ فرنگ میں جان دی۔ فرنگی تو ہمارے یہاں دُور دُور تک نہ تھا، لیکن کہتے ہیں کہ اب سے دُور ایک بار سارے ملکِ فرنگ میں مرض طاعون کا پھیلا اور ایسا پھیلا کہ مسافروں، یا شاید جناتوں اور شیطانوں کے توسط سے بلادِ شرق میں بھی جگہ جگہ متمکن ہو گیا۔ تب سے ہر دو چار سال بعد کسی نہ کسی علاقے میں ہندوستان کے یہ موذی مرض پھوٹ پڑتا اور صدہا جانیں لے کر ہی جاتا۔ اس وقت سے لوگ طاعون کو مرضِ فرنگ کہنے لگے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ دراصل مرضِ آتشک مرضِ فرنگ ہے، کیونکہ یہ بلا بھی انھیں دیار وامصار سے ہم تک پہنچی تھی لیکن یہ قول قوی نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ شیخ الرئیس اور امام رازی کی کتابوں میں بھی ذکر آتشک کا ہے۔ پس دریں صورت آتشک کو مرضِ فرنگ کیونکر کوئی کہوے۔

باپ کے مرنے کا غم میں نے بہت کیا اور دوسرا اتنا ہی بڑا غم کسبِ معاش اور پرداختِ خاندان کا تھا۔ بارے میرے مرحوم باپ کی نوکری اور توسلی رشتے یہاں بھی کام آئے۔ خان جہاں لودی نے جب میری بدحالی سنی اور دیکھی تو مجھے خانِ دوراں اسد خان بن مبارک خان کے رسالے میں احدی بحال کرا دیا۔

سن رہے ہو صاحب، آپ سن رہے ہو نہ؟

''ہاں سن رہا ہوں،'' میں نے بیزاری سے کہا اور دوسری کروٹ سو گیا یا شاید سونے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کچھ ٹھنڈی سی ہو رہی تھی۔ میں نے بستر کی چادر میں خود کو لپیٹ لینے کی کوشش کی۔

احدی سے آپ کو یہ گمان نہ ہو کہ میں مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے کے احدیوں میں شامل ہو گیا۔ اکبر بادشاہ اس وقت کہاں تھا اور اکبر کے احدی تو یوں سمجھیے آپ کہ وظیفہ یاب قسم کے نفر تھے، مفت کی روٹی توڑتے تھے۔ خداوندِ عالم سلطان سکندر بن سلطان سکندر کے احدی فوجی ہوتے تھے، سلطان کے ہمہ وقت جاں نثار اور دن رات سینہ سپر کرنے کو تیار۔ ہمیں اپنا گھوڑا، اپنی ڈھال تلوار، خنجر، فوجی کپڑے اور اسلحہ کی دیکھ بھال کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ عوض اس کے ہمیں خداوندِ عالم کی بارگاہ سے درماہہ ملتا تھا اور سر چھپانے کو خیمہ یا بڑے بڑے گھر ملتے تھے جن میں دس دس یا اور بھی زیادہ احدیوں کے سونے کا اہتمام رہتا تھا۔

کہنے کو میں نوکر تھا خان دوراں اسد خان بن مبارک خان کا، لیکن درحقیقت آقا میرا خداوند سلطان سکندر تھا۔ خانِ دوراں کی ذمہ داری صرف اس قدر تھی کہ بخشی فوج تک مجھے پہنچانا اور اس بات کی ضمانت روبروئے کوتوال لینا کہ میں زمرۂ بدمعاشان میں نہ تھا اور نہ کبھی میں نے ساتھ کسی بھی باغیانِ حکومت کا دیا تھا۔ اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوتا، یا میں ادائے فرض میں کوتاہ پایا جاتا تو پہلی جواب دہی انھیں کی تھی۔ مجھے جو سرچنگ ملنی تھی وہ تو ملتی ہی۔

جب میرا باپ اس دُنیا سے سدھارا تو سلطان خداوند عالم بن سلطان سکندر لودی کو تختِ سلطانی پر متمکن ہوئے دس سال ہو چکے تھے۔ چار دانگِ عالم میں سلطان کے غلغلے تھے۔ دابِ سلطنت کے شہرے اور سکہ و خطبہ کا نفوذ از ہند تا سند، از پنجاب تا بنگال اور از دہلی تا دھور سمدرا تھا۔ سلطان کی حق بینی اور انصاف پرستی کا ایک واقعہ ان دنوں زبان زدِ خاص و عام تھا کہ علاقۂ سنبھل کے ایک غریب مزارع کو اپنے کھیت میں ایک دن ایک کانسے کا گھڑا ملا جس میں سلطان علاء الدین کے زمانے کی پانچ سو سلطانیاں، یعنی سونے کے سکے تھے۔ حاکم صوبۂ سنبھل کو پرچہ لگا تو اس نے بفور وہ سلطانیاں ضبط کر لیں۔ بے کس مزارع سلطان کی بارگاہ میں عرض پرداز کسی نہ کسی طور ہوا تو باز پرس حاکم سنبھل سے ہوئی۔ اس بدبخت نے بابِ حکومت میں یہ پاسخ بھیجا کہ خداوندِ عالم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا جائے کہ وہ مزارع ایک مردِ نامشخص ہے اور ہرگز لائق و مستحق اس خزانے کا نہیں۔

خداوندِ عالم نے فرمان صادر فرمایا کہ اے احمق، جس نے یہ خزانہ اس مفلس کشاورز کو ارزانی کیا ہے وہ مجھ سے اور تجھ سے زیادہ جاننے والا ہے کہ کون مستحق کس مہربانی کا ہے۔ اشرفیاں اس غریب کی فوراً

پھیر دی جائیں ورنہ آتشِ غضبِ سلطانی تجھے دم کے دم میں بسترِ نرم سے خاکسترِ گرم پر سلا دے گی۔ حاکم سنبھل اتنا سراسیمہ ہوا کہ اشرفیوں کی گاگر خود لیے ہوئے اس دہقان بچے کی جھونپڑی پر پہنچ گیا اور سو تنکے اپنی طرف سے دے کر اس نے مزارع سے راضی نامہ لکھوایا۔

ایک بار تھانیسر کے علاقے سے اطلاع آئی کہ ہندوان نے ایک تالابِ قدیم کو از سرِ نو تعمیر کر کے وہاں میلہ ایک ماہ بماہ منعقد کرنا شروع کیا ہے اور پوجا پاٹھ بھی کرتے ہیں اور گھنٹ ناقوس بھی بجتے ہیں۔ پس اس باب میں حکمِ عالی کیا صادر ہوتا ہے؟ سلطان والا شان نے مفتیِ اعظم سے مشاورت کر کے فرمان لکھوایا کہ وہ اپنے مذہب پر ہیں، پس جب تک ان کے مناسک و رسوم کے باعث کوئی خطرِ امن و امان کے لیے نہ ہو، ان سے ہرگز کچھ تعرض نہ کیا جائے۔

انتظامِ سلطنت میں ہشیاری اور خبرداری غرض سے حضرت دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اسّی ہزار مسلح فوج ہر وقت تیار رہتی تھی۔ کہیں سے ذرا بھی بدامنی کی خبر آئی اور جیوشِ سلطانی حرکت میں آ گئے۔ تغلق آباد، غیاث پور، بیگم پورہ، سیری اور کیلوکھیڑی جو پایۂ تخت کے پرانے شہر تھے، ان سب میں میدان وسیع و مرتفع و مسطح دیکھ کر فوجوں کے خیام کے لیے مقرر کر دیے گئے تھے۔ میں جس فوج میں تھا وہ غیاث پور سے ذرا اورے کنار جمنا پر قیام کرتی تھی۔ اس ندی کو جن نے دیکھا ہے وہی اس کے وسیع پاٹ کا قیاس کر سکتے ہیں۔ برساتوں میں ندی پر دریائے اعظم کا گمان ہونے لگتا۔ غازی آباد میں ہنڈن کے ورلے کنارے سے کچھ آگے جنوب کی طرف سے لے کر او کھلے تک سارا علاقہ پانی سے بھر جاتا۔ اسی بنا پر اس علاقے کو خلق اللہ طنزاً پٹ پڑ گنج کہنے لگی تھی، حالانکہ وہاں مچھروں، پسوؤں، جونکوں اور دیگر گستاخ کیڑوں کے سوا گنج کے نام پر کچھ نہ تھا۔

واللہ وہ بھی کیا زمانے تھے۔ بارہ برس میں میرا درماہہ بارہ تنکے سے بڑھتے بڑھتے بیس ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پانچ تنکے ماہانہ خرچ کرنے والے اجلے خرچ سے رہتے تھے۔ سلطان بہلول لودی کو اللہ بخشے، ان کا جاری کیا ہوا تانبے کا سکہ بہلولی کہلاتا تھا۔ وہ اب بھی رائج تھا اور اس میں طاقت اس قدر تھی کہ آدمی یہاں سے کول تک کا سفر اپنے گھوڑے کے ساتھ کرتا تو ایک بہلول اس کے لیے کافی ہوتا۔ مجھے اپنے گھوڑے کے ساز و یراق، سائیس اور اسلحہ کی دیکھ بھال پر بہت صرف کرنا پڑتا تھا، پھر بھی میں ہر مہینے تین سے چار تنکے گھر بھجوا دیا کرتا تھا۔ شراب کی لت مجھے نہ تھی، لیکن بازاروں اور کنچنیوں پر کچھ خرچ تو لازم ہی آتا تھا اور ایسی

محفلوں میں کچھ شراب کچھ نقل تو بہر حال ضروریات میں تھی۔ مولانا گل محمد اب ذرا پیچھے چھوٹ گئے تھے اور گل محمد اوپچی کچھ آگے آگئے تھے۔

اب سلطان سکندر کا یہ اکیسواں سنہ جلوس تھا۔ میری بیٹی بارہ برس کی ہو کر تیرہویں میں لگی تھی۔ گھر سے خبر آئی کہ اس کی سگائی اور پھر بیاہ آئندہ برساتوں سے پہلے ہو جائے تو خوب ہو۔ مجھے بلایا گیا تھا کہ جا کر سب معاملات طے کر دوں۔ ہر چند کہ خداوندِ عالم سلطان سکندر بن سلطان سکندر نے شرع شریف کی پابندی پر بہت کچھ زور دیا تھا، لیکن ہم ان اطراف کے گنوار مسلمانوں میں ہندوؤں کی بُو باس ابھی بہت کچھ باقی تھی۔ جمعے کے سوا ہر دن ہم لوگ ہندوانی دھوتی پہنتے تھے۔ جمعے کو البتہ دو برکا ڈھیلا سفید پاجامہ گاڑھے کا اور محمودی کا کُرتا پہنا جاتا تھا۔ ہماری عورتیں گھر سے باہر نکلتی تھیں لیکن لمبا گھونگھٹ کاڑھ کر۔ ہر گھر میں ایک صندوق تھا جس میں دیوالی اور دسہرے اور عید بقرعید شبرات کے لیے روپیہ پس انداز کیا جاتا تھا۔ شادی کی رسمیں بہت کچھ ہندوانہ تھیں۔ کنیادان یا جہیز کی صورت نہ تھی لیکن لڑکے والے شادی سے پہلے منگنی لے کر ضرور آتے اور اس موقعے پر شادی سے کچھ ہی کم خرچ ہوتا۔ نکاح کے بعد رخصتی (جسے ہم لوگ گون یا گونا کہتے تھے) اکثر بہت دیر سے ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی طرح ہمارے یہاں بچکانہ شادی کا رواج تو نہ تھا لیکن منگنی پھر نکاح پھر گون کی رسمیں کچھ نہ کچھ وقفے سے ادا ہوتی تھیں۔

جیٹھ نکل کر اساڑھ کی آمد آمد تھی جب میں نے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ تین ساڑھے تین سونکوں کا انتظام میں نے کر لیا تھا کہ مصارفِ شادی اس سے کم بھلا کیا ہوں گے۔ ارادہ تھا کہ شام ہونے کے پہلے لیکن عصر کے بعد چل نکلوں کہ موسم ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔ ایک منزل کرتے کرتے غروبِ آفتاب ہونے لگے گا، کہیں کوئی اچھی سرائے دیکھ کر رات گذار لوں گا اور صبح ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گاؤں ننگل خورد پہنچ لوں گا۔ زادِ سفر بہت تھوڑا رکھا، تحفہ تحائف کی ضرورت نہ تھی کہ سارا سامان شادی اور دیگر رسومِ شادی کے لحاظ سے گھر کی عورات ہی کو خرید کرنا تھا۔ سواری کے لیے گھوڑا تھا ہی، اور کچھ درکار سپاہی کو نہ تھا۔ میرا راستہ نہر فیروز شاہی کے بائیں کنارے سے لگا ہوا کئی کوس چل کر پھر نہر سے کٹ جاتا تھا۔

وزیر پور پر نہر فیروز شاہی خود ہی خم کھا کر کرنال اور حصار کی جانب رواں ہو جاتی تھی۔ دورویہ گھنے پیڑ اور آتی برسات کے بادلوں کی دھندلی روشنی نے نہر کے دونوں طرف نیم تاریکی سی پیدا کر دی تھی۔ ایک جگہ خم اس قدر سخت تھا کہ خم کے پہلے اور بعد دونوں سرے نظر نہ آتے تھے۔ خم میں داخل ہو جائیں تو گویا

دونوں طرف کی راہ بند ہو جاتی تھی لیکن خطر کوئی نہ تھا۔ حکومت میں سلطان والا شان کی راہیں سب محفوظ تھیں اور یہ جگہ تو حضرت دہلی سے کوئی پانچ ہی چھ کروہ تھی۔ درحقیقت میرے لیے جگہ رات کے پڑاؤ کی یہاں سے بہت دُور نہ تھی۔ میں گھوڑے پر سوار گنگناتا دلکی چلتا چلا جا رہا تھا۔ سامنے ایک پلیا تھی جس کے نیچے نالا ابھی خشک تھا۔ پلیا کے ورلی طرف ایک بڑھیا، نہایت تباہ حال نظر آئی، مجھے دیکھتے ہی اس نے کچھ دعائیہ لہجے میں مگر ذرا بلند آواز میں پکارا:

اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی!

پھر اس نے بہت مسکین لیکن پھر بھی بلند آواز میں مجھ سے کہا:

''اللہ کی راہ میں کچھ دے دو بیٹا۔ بیوہ دکھیا پر ترس کھاؤ۔''

میں نے سوچا، سفر میں ہوں، نیک کام کے لیے جا رہا ہوں، اس وقت اسے کچھ دے دوں تو نیک شگون ہوگا۔ پھر میں نے گھوڑا آہستہ کیا، راس کو بڑھیا کی طرف موڑ کر جھکا، شلوکے کی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ کچھ نکال کر بڑھیا کو دے دوں۔ یک مرتبہ کسی نے مجھے پیچھے سے دھکا دیا۔ میں غصے میں اس کی طرف مڑ کر گالی دینے والا تھا کہ کسی اور نے ایک دھکا اور دیا۔ میں بے قابو ہو کر بائیں طرف کو لڑکھڑایا۔ گھوڑا الف ہونے لگا۔ راس میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ گھوڑا الف ہو کر کدھر گیا، یہ میں نہ دیکھ سکا کہ کسی نے اتنی دیر میں میرے سر پر کالا کپڑا ڈال کر مجھے اندھا کر دیا تھا۔ کپڑا اتنا موٹا اور پسینے کی بدبو سے بھرا ہوا تھا کہ مجھے ابکائی آگئی اور میری سانس رکنے لگی۔ کپڑا فوری طور پر میری گردن پر کس دیا گیا تو میں سمجھا کہ یہ بٹ مار ہیں۔ جان نہ بچے گی، میری بیٹی کا کیا ہوگا، میں نے کمر سے خنجر نکالنا چاہا کہ ایک دو کو ختم ہی کر دوں۔ یہ قرم ساق نہیں جانتے کہ کس کے گھر بیعانہ دیا ہے۔ ایک دو کو تو مار ہی کر مروں گا۔

میری سانس اب بالکل ہی رکی جا رہی تھی۔ ابکائیوں اور خنجر نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوششوں میں سانس ٹوٹی جاتی تھی۔ میں نے پوری قوت سے چلّا کر ان حرام زادوں کو ماں کی گالی دینی چاہی لیکن اب تک میری مشکیں بھی کس لی گئی تھیں۔ پھر ٹانگیں باندھ کر مجھے ایسا بنا دیا گیا جوں کر کہ بکرے کو ذبح کے اس کی ٹانگیں باندھ کر کہیں اور لے جاتے ہیں۔ میری کمر میں ہمیانی بندھی ہوئی تھی۔ اسے نہایت صفائی سے کاٹ کر نکال لیا گیا۔ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی، پھر کسی نے اس کو چمکارا اور چپ کیا۔ گھوڑوں کی چوری میں بھی ظالم اس غضب کے مشاق تھے کہ بظاہر گھوڑا بھی پلک جھپکتے میں رام ہوگیا۔ سارا

کام مکمل خاموشی میں ہوا تھا۔ پھر میرے سر پر کپڑا کھینچ لیا گیا لیکن اس کے پہلے کہ میں کچھ کر سکتا، میرے منھ میں ایک اور کپڑا، پہلے سے بھی بدبودار اور متعفن، ٹھونس کر ساتھ ہی ساتھ آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ پھر کچھ دوڑتے ہوئے قدموں اور گھوڑے کی ہلکی ٹاپ کی آواز۔ دونوں آوازیں بہت جلد مدھم ہو کر غائب ہو گئیں۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہ سنائی دی تھی، بات کرنے یا کھانسنے کھنکھارنے یا ہنسنے کی تو بات ہی کیا تھی۔ میں یہ تو سمجھ ہی گیا کہ یہ پرلے درجے کے مشاق بٹ مار ہیں اور وہ بڑھیا ان سے ملی ہوئی تھی لیکن یہ بھی تھا کہ وہ مجھے جان سے مارنا نہ چاہتے تھے۔ ان کا منشا محض یہ تھا کہ مجھے بے دست و پا کر چھوڑ دیں اور اتنی دُور نکل جائیں کہ میں ان کا تعاقب نہ کر سکوں اور نہ کسی کو آگاہ ان کے بارے میں کر سکوں۔

مجھے رنج سے بڑھ کر غصہ تھا کہ میں، سارے عالم میں مانے ہوئے سلطان کی سارے عالم میں مانی ہوئی فوج کا سپاہی اور یوں کسی کچھوے کی طرح پکڑ لیا جاؤں کہ مدافعت اپنی میں ایک وار بھی نہ کر سکوں۔ لعنت ہے ایسی سپہ گری پر اور تُف ہے ایسی سلطانی پر کہ رعایا یوں بے کھٹکے دن دہاڑے لٹ جائے۔ میں یہاں یوں ہی مجبور پڑا رہا تو کیا پتا رات میں کسی موذی جانور کا شکار ہو جاؤں۔ کیا خبر مجھے کوئی اور بٹ مار قتل کر کے جو کچھ میرے بدن پر کپڑے اور تھیلی میں ستو اور جلیبیاں ہیں اور شلوکے کی جیب میں چند سکے بہلولی ہیں انھیں بھی لے کر چمپت ہو جائے۔ میں نے چیخنا چاہا، لیکن وہ متعفن کپڑا میرے حلق تک یوں ٹھنسا ہوا تھا کہ میں اگر بولنے کی کوشش میں منھ یا حلق پر کچھ زیادہ زور ڈالتا تو کپڑا شاید میرے حلق کے اندر ہی اتر جاتا۔ وقت کتنا گذر گیا تھا، مجھے اس کا کچھ علم نہ تھا۔ مغرب تو ہو ہی چکی تھی لیکن کہیں دُور سے بھی اذان کی آواز یا مندروں میں گھنٹے کی پکار، یا چراگاہ سے واپس ہوتے ہوئے کسان یا چرواہے کے ساتھ مویشیوں کے ریوڑوں کی گھنٹیوں کی آواز کچھ بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ دانہ دنکا چن کر اپنے گھونسلوں کو لوٹنے والی چڑیوں کے جھنڈ اگر تھے تو یا تو ابھی واپس نہ ہو رہے تھے یا وہ بھی شام کی تنہا شفق میں چپ چپاتے نکل گئے تھے یا اگر آواز کوئی سنائی دینے والی تھی بھی تو زور سے چلّانے کی کوشش سے میرے کانوں میں سائیں سائیں اس قدر ہونے لگی تھی کہ کچھ سُن لینا مشکل تھا۔

کیا بہت دیر ہو گئی تھی؟ کیا اب کوئی آنے والا نہیں ہے؟ ابھی ابھی میں نے شیر کی دہاڑ سنی تھی کیا؟ شیر تو اس علاقے میں تھے نہیں، ہاں گلدار بہت تھے۔ گلدار تو جمنا کے کنارے کی کچھاروں میں دہلی سے کرنال تک چھوٹے ہوئے سانڈوں کی طرح بے روک ٹوک گھومتے تھے اور بھیڑیے بھی۔ گلداروں کی تو

ہمتیں اس قدر کھلی ہوئی تھیں کہ دہلی کے مضافات میں جو آبادیاں بوجہ نقل مکانی کے ذرا چھدری ہو جاتیں، ان کے خالی گھروں میں گلدار آباد ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تو میں جمنا کے کنارے سے دور تھا۔ سلطان فیروز شاہ خلد مکانی نے یہ نہر بنوائی ہی اسی لیے تھی کہ جمنا کا پانی جن علاقوں میں پہنچتا نہیں ہے وہاں بذریعہ اس نہر کے پہنچ جائے۔ لیکن یہاں بھی اب درختوں کے گھنے سائے اور نہر کی رطوبت نے کچھار جیسا سماں پیدا کر دیا تھا۔ سلطان فیروز کو اللہ نے جنت میں اونچا مقام ضرور دیا ہوگا۔ انھوں نے اس راہ میں، اور کول کی راہ میں جگہ جگہ شاہی سرائیں بنوائیں تھیں جہاں کوئی بھی مسافر کچھ رقم دیے بغیر ٹھہر سکتا تھا اور اچھا ہی تھا کہ انھوں نے یہ حکم دے دیا تھا کہ سراؤں کا خرچ تمام خزانۂ سلطانی سے ادا ہو، ورنہ مجھ جیسے لٹے پٹے مسافر کو تو راہ میں ایک وقت کی روٹی اور سر چھپانے کے لیے چھت کے لالے پڑ جاتے۔

میں نے بہت چاہا کہ راہ کے کسی پتھر سے رگڑ کر اپنے ہاتھوں کو بندش سے آزاد کرا لوں لیکن ایک تو اس اندھیرے میں پتھر کہاں ملتا پھر میری آنکھوں پر اندھیری جو چڑھی ہوئی تھی اور ہاتھ پیٹھ پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کے بند کو رگڑ کر کاٹنے کی کوشش میں جگہ جگہ خراشوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگا تھا۔ کیا سب لوگوں کو خبر ہو گئی تھی کہ یہ راہ بٹ ماروں نے ہتھیا لی ہے اور شام ڈھلے آنا ادھر انھوں نے چھوڑ دیا تھا؟ کتے بھی نہ بھونکتے تھے، یا شاید گیدڑوں کا ایک غول کہیں کھیت میں غل مچا رہا تھا۔ کبھی کبھی ملکِ چین کے سفیر ملک میں ہمارے آتے تھے تو ان کے سپاہیوں سے میں سنتا تھا کہ ان کے یہاں اصولِ حرب کے ماہرین نے کچھ فن ایسا ایجاد کیا کہ جب ہاتھوں اور پاؤں کو ان کے باندھتے ہیں تو وہ بدن کو اپنے کچھ اس طرح پھلا لیتے ہیں کہ کیسا ہی بند ہو، بندھنے کے بعد ڈھیلا ہو جاتا ہے کیونکہ بدن پھر اپنی حالتِ اصلی پر آ جاتا ہے۔ اس طرح اگر کبھی انھیں کوئی باندھ کر بالکل بے چارہ بھی کر دے تو وہ بباعث بندھنوں کے ڈھیلا ہونے کے، خود کو ذرا سی کوشش کے بعد رہا کرا لیتے ہیں۔ افسوس کہ مجھے وہ فن آتا نہ تھا اور اگر آتا بھی تو کیا ہوتا۔ میں تو بے خبری میں مار لیا گیا تھا۔

رات تو بیشک ہو چکی ہوگی۔ کہیں درختوں کے پیچھے کچھ کھسر پسر تو نہیں ہو رہی ہے؟ کہیں وہ حرامی واپس تو نہیں آ رہے ہیں؟ یہ کچھ آواز سی کیسی ہے؟ میں نے بہت غور سے سننا چاہا، لیکن کانوں میں کچھ سائیں سائیں اب بھی ہو رہی تھی۔ ہاں یہ کچھ نئی سی آواز تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر آ رہی تھی۔ کہیں کسی مندر میں گھنٹ ناقوس تو نہیں بج رہا؟ نہیں، یہ تو گہری اور دور تک پھیلنے والی آواز تھی۔ ٹن.... ٹن.... ٹن.... ذرا رک رک کر.... کوئی فیل نشین ادھر آ رہا تھا.... میرا دل بلیوں اچھلنے لاگا۔ شاید میری جان بچ ہی جائے گی۔ ہاتھی کی گھنٹیوں کی آواز

نزدیک آئی، آہستہ ہوئی، ٹھہر گئی۔

''معتبر سنگھ، ذرا دیکھنا۔ یہ راہ میں کیا پڑا ہوا ہے؟'' مضبوط، ٹھہری ہوئی آواز، لیکن کسی فوجی عہدہ دار یا شاہی اہل کار کی نہیں، بلکہ کسی ایسے شخص کی تھی جو عیش و عشرت میں پلا بڑھا رئیس زادہ ہو۔ ''نہیں، ابھی اترو نہیں، پاس سے دیکھو۔''

میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی سعی اور تیز کر دی کہ مہاوت سمجھ لے کہ میں زندہ ہوں۔

''عالی جاہ، لگتا ہے ڈاکوؤں نے کسی شخص کو گھائل کر کے ڈال دیا ہے۔'' نہایت مؤدب لیکن کچھ ڈری ڈری سی آواز آئی۔

''اچھا؟ کوئی زخمی ہے؟ ہاں شاید اس کا کوئی دشمن اسے یہاں نہر میں پھینکنے لا رہا تھا، ہم کو دیکھ کر بھاگ نکلا۔ ہاتھی ذرا اور پاس لے چلو۔''

''حضور کہیں کوئی چال اس میں نہ ہو،'' آواز اب اور بھی ڈری ہوئی سی تھی۔ ''ایسا تو نہیں کہ ہمیں ہی دھوکے سے کچھ.... کچھ کر ڈالنے کا چکر ہو....''

میں نے اپنی کشمکش اور تیز کر دی۔ اس بار میں کچھ غیں غیں سی آواز نکالنے میں بھی کامیاب ہو گیا۔

''چال؟ چال بھلا اس میں کیا ہوگی؟ تم بھی عجب تھڑدلے آدمی ہو معتبر سنگھ۔ ہم ہاتھی سے اتریں گے نہیں تو ہمیں کوئی کچھ کیا کر دے گا؟ اور اگر تیر کا نشانہ بنانا ہوتا تو اب لگ کئی تیر چل چکے ہوتے۔ چلو، نیچے اترو۔ اس غریب کی کیفیت دریافت کرو۔''

''سرکار....'' معتبر سنگھ کے لہجے میں کچھ شک اور بہت سارا ڈر تھا۔

میں اپنی غیں غیں اور تیز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اے میاں تم تو بالکل ہی بودے نکلے۔ اچھا یوں کرو۔ ہاتھی کو ذرا اور آگے لے جا کر کہو کہ سونڈ سے اس آدمی کو اٹھا کر اوپر میرے پاس لے آئے۔ چلو، شاباش۔''

معتبر سنگھ نے ہاتھی کو کچھ آگے بڑھایا، لیکن کتنا، اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا۔ لیکن معتبر سنگھ نے ہاتھی سے سرگوشی میں کچھ کہا، اور کئی بار کہا۔ پھر مجھے لگا کہ کوئی بہت ہی طاقتور اور کئی گز لمبا موٹا اجگر مجھے باندھ کر لپیٹ کر بلوں میں اپنے اٹھائے لیے جا رہا ہے۔ میں نے سہم کر خود کو چھوٹا کرنے کی کوشش کی، لیکن کہاں میں اور کہاں وہ زبردست بادلوں جیسا زور۔ آن کی آن میں ہاتھی نے مجھے رئیس کے ہودے کے آگے

مہاوت اور مالک کے بیچ کی جگہ میں دھانس دیا۔ بلا سے جگہ تنگ تھی لیکن اب میں ضیقِ جان سے تو بچ نکلا تھا۔

معتبر سنگھ نے، یا شاید مالک نے بھی اس کا ہاتھ بٹایا، مجھے بآسانی اس عفونت سے بھرے اور شاید تیل اور تھوک سے بھی چکنے ہوئے میرے حلق میں ٹھنسے ہوئے کپڑے اور آنکھ کی پٹی سے آزاد کر لیا گیا۔ تاہم مجھے اپنی آواز دوبارہ حاصل کرنے میں کچھ وقت لگا۔ تھوک کو بمشکل گھونٹتے ہوئے میں نے فیل نشین کے سوال کے جواب میں مختصر لفظوں میں اپنی بپتا کہہ سنائی۔

''تو سپاہی جی، تم دُہرے خوش نصیب تھے۔ ان قرم ساقوں نے تمھیں زندہ چھوڑ دیا اور پھر ہم ادھر آنکلے۔''

''بندے کا بال بال آپ کے احسان سے گندھا رہے گا۔ میں تو سمجھا تھا کہ شیر بھیڑیا کوئی نہ کوئی مجھے کھا ہی لے گا۔''

خیر، رسیدہ بود بلائے.... ہوا سو ہوا۔ میں بہادر گڈھ جا رہا ہوں۔ وہاں تک بآسانی تمھیں پہنچا دوں گا۔ آگے جو تمھارا جی چاہے۔ بہادر گڈھ میں بھی قیامِ شب کا انتظام ہو سکتا ہے۔''

''بندہ پروری ہے آپ کی۔ بہادر گڈھ تک بہت ٹھیک رہے گا اگر حفاظت میں جناب کی چلا چلوں۔ کل صبح دہلی واپس چلا جاؤں گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور دل میں اہلتے ہوئے رنج کو دباتے ہوئے کہا۔

''بہت مناسب۔ معتبر سنگھ آگے بڑھو۔ اور ہاں، سپاہی گل محمد، ایک بار خوب غور سے دیکھ لو، کچھ تمھارا یہاں چھوٹ تو نہیں رہا؟''

''چھوٹنے کو اب کیا رہا ہے جناب۔ بندگانِ حضور نے جان بچا لی، میں اسی پر خوش ہوں۔ فیل کو آگے بڑھنے کا حکم فرمائیں۔''

اثنائے راہ میں معلوم ہوا کہ فیل نشین کا اسم سامی رگھوراج بہادر سنگھ تھا۔ وہ اپنے کسی عزیز کی شادی میں شرکت کی غرض سے بہادر گڈھ کے کہیں آگے تشریف لے جا رہے تھے۔ بہادر گڈھ میں انھوں نے مجھے ایک سرائے کے سامنے اتار دیا۔ دوبارہ بندگی اور اظہارِ تشکر کر کے میں نے ان سے رخصت لی۔

اگلے دن میں دہلی آ گیا۔ میرے شلوکے میں چار چھ بہلولی جو بچ رہ گئے تھے وہ مصارف کے لیے

کافی سے زیادہ تھے۔ ایک بہلولی میں سولہ تنکے اور ایک تنکے میں چونسٹھ چھدام ہوتے تھے۔ میں نے ایک بہلولی کا خوردہ کرایا اور سرائے کے مصارف اور مصارف بہلی میں سفر کے بخوبی ادا کیے۔ بہلی میں میرے ساتھ چار مسافر تھے۔ خدا کا شکر بھیجتا ہوں کہ ان میں سے کسی کو عارضہ تجسس اور کرید کا بہت نہ تھا۔ نہ انھوں نے پوچھا کہ میں بہادر گڈھ کس تقریب سے آیا تھا اور نہ میں نے ظاہر کیا۔

باب سوم

دہلی میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ میری ہی مت بدل گئی تھی۔ میں تین ساڑھے تین سو تنکے کا انتظام اتنی جلد کہاں سے کرتا؟ میرے ساتھی سپاہی مجھ سے زیادہ خرچیلے اور تہی دست تھے۔ خان دوراں تو ان دنوں خداوندِ عالم کی معیت میں آگرے میں تشریف رکھتے تھے۔ خان جہاں شاید کسی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ انھیں دونوں سے مجھے کچھ توقع ہو سکتی تھی۔ بھکاری شاہ صاحب سے کچھ مدد مل سکتی تھی، لیکن کہتے شرم آتی تھی کہ خدمت استاد کی کرنے کی جگہ انھیں سے خدمت لوں اور سپہ گری اختیار کرنے کے بعد آنا جانا بھی میرا طرف مدرسے کے بہت کم ہو گیا تھا اور یہ بھی تھا کہ میں موٹا مشٹنڈا مسلح سپاہی، چار کو مار کے پھر کہیں چوٹ کھانے کا دعویٰ رکھنے والا، اور اتنی آسانی سے چند بے حقیقت ڈکیتوں کا شکار ہو جاؤں، یہ تو منھ چھپانے کی بات تھی نہ کہ ہر کسی سے بتانے کی۔

دن بہت چڑھ آیا تھا جب میں اپنی خیمہ گاہ میں پہنچا۔ حسنِ اتفاق سے کم ہی لوگ اس وقت باہر دکھائی دیتے تھے۔ ممکن ہے نواب کے یہاں حاضری کے لیے بلا لیے گئے ہوں۔ میں نے اپنے خیمے میں قدم رکھا تھا کہ میرے قریبی دوست محمد عالم بہاری نے پکارا کہ ''اوئے تو یہاں کیسے؟ تجھے تو ننگل خورد میں ہونا تھا۔''

چار و ناچار میں نے اس کی طرف نگاہ کی۔ وہ اپنی چوکی پر کچھ لیٹا کچھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی سی تسبیح تھی۔

''محمد عالم، تم؟ ابھی تک باہر نہیں گئے؟ جی تمھارا ماندہ ہے کیا؟''

''نہیں، سب ٹھیک ہے۔ میں نے ایک منّت مانی تھی اسے ہی پوری کرنے میں لگا ہوں، مگر تم واپس کیسے آگئے؟ سب خیر تو ہے؟''

''مشفق من، خیر ہوتی تو یہاں کیوں دِستا۔ میں تو لٹ لٹا کر گھر کو آ گیا۔''

''اجی بجھولیں کیوں بجھاتے ہو، بتاؤ کیا گذری تم پر؟''

جبراً میں نے سارا قصہ عالم کو سنا دیا۔ مگر میری کہانی ختم ہونے کے پہلے ہی وہ بول اٹھا:

''ارے رے رے، ارے رے رے، تو تم اس شیطان بڑھیا اور اس کے تینوں ابلیس بچوں کے ہاتھ پڑ گئے۔ اجی میں سمجھے ہوئے تھا تم ان کے بارے میں جانتے ہو۔ یہاں کا تو بچہ بچہ جانے ہے....''

''اجی کیا جانے ہے؟ تم یوں ہی امیر خسرو کی طرح پہیلیاں کہو گے کہ کچھ بتاؤ گے بھی؟''

''یارا میرے، میں واللہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ تم جانتے ہو۔ نہیں تو میں خود تمھیں آگاہ ہی دے دیتا کہ وزیر پور کے آگے نہر کے موڑ پر معاملات سانجھ کے پھولتے ہی مخدوش ہو جاتے ہیں۔ وہ کمبخت ڈائن، پلیا کے ایک طرف بیٹھی ہوئی بظاہر بھیک مانگا کرتی ہے۔ پرلی طرف پلیا کے نیچے اس کے تینوں حرام کے جنے پوشیدہ رہتے ہیں۔ جب تین یا زیادہ مسافر گذرتے ہیں تو وہ پکارتی ہے، ''جماعت میں سلامت ہے!'' اور جب دو یا ایک مسافر ہوتا ہے تو پکارتی ہے ''اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی!'' اور یہ اشارہ سن کر وہ تینوں برم راکھس کی طرح بچارے راہگیر کو آ لیتے ہیں۔ کسی کا جان وہ کبھی نہیں مارتے، لیکن لوٹ کر اسے باندھ کر وہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر چمپت ہو جاتے ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ،'' میں بڑبڑایا۔ ''مجھے ہی ان کا ہدف بننا تھا۔ پر اب کیا کروں؟ اتنی رقم تنکے کہاں سے لاؤں۔ کون دے گا مجھے اور دے بھی دے تو ادا کہاں سے کروں گا؟'' میں نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔

''اجی میاں جی، دینے والے تو بہتیرے ہیں۔ کسی بھی ساہوکار کنے چلے جاؤ۔ مال ہی مال ہے۔ لیکن مال کے پہلے وہ کھال کھنچوا لے گا۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے جھونجھل میں آ کر تیز لہجے میں کہا۔ ''مار مروں تو میری بیٹی کون بیاہے گا؟''

محمد عالم کچھ چپ سا ہو گیا۔ میں بھی دل ہی دل میں خفیف ہو رہا تھا کہ بے وجہ اسے جھڑک دیا۔ وہ بچارا تو میری مدد ہی کرنا چاہے تھا۔ پر جب اللہ ہی کو منظور نہ ہو تو بندے کا کیا چارہ۔ افسوس اور رنج میں میں یوں ہی بارہ باٹ ہو رہا تھا، مجھے ایسے سنکٹ کے سمیں میں دوستوں اور نیک صلاح مشورے کی ضرورت تھی۔

تھوڑی دیر بعد عالم نے سر اٹھایا اور کچھ شرمندہ سی مسکراہٹ مسکرا کر بولا۔ ''کیوں نہ ہم لوگ دوستوں سے اپنا حال کہیں۔ تھوڑا تھوڑا کر کے بہت نہ سہی، کچھ تو ہو جائے گا۔''

''نہ، نہ بابا۔ بالکل نہ۔ بیٹی کو کیا منھ دکھاؤں گا؟ بیٹی سن لے گی کہ جمعہ واری چندہ لے کر اس کا بیاہ ہو رہا ہے تو وہ کچھ کھا کر سو رہے گی۔''

''اے لو میں چندے کو کب کہہ رہا ہوں۔ میں تو کہہ رہا تھا کہ سب سے تھوڑا تھوڑا ادھار بٹور کے....''

''کون مان کے دے گا کہ ادھار بھی چندے کی طرح بٹورے جاتے ہیں؟ میں بھی نہ مانوں گا اور بالفرض میں مان بھی گیا تو دُنیا کو کیا سمجھاتا پھروں گا.... سنو رے بھائیو، یہ خیر خیرات نہیں، چندہ ہے۔ توبہ توبہ، مجھے باتوں میں نہ اڑاؤ محمد عالم صاحب۔'' مجھے رونا سا آ گیا۔

محمد عالم نے مجھے غور سے دیکھا۔ شاید اسے بھی لگا کہ میرا پیالہ بھرنے کو ہے۔ اس نے سر جھکا لیا۔ شاید وہ مجھ سے آنکھیں چار کرنے سے کترا رہا تھا۔ میں نے غصے میں اپنی پگڑی اتار کر پٹک دی اور کہا، ''گھر جاتا ہوں۔ وہاں اپنی عورت کے مائکے والوں کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں گا۔ پھر تا عمر اس کے سامنے نکو بنا رہوں گا.... ابے حرام زادے عالم تو نے مجھے آگاہ کیوں نہ کر دیا تھا کہ وہ جگہ....''

''رسان سے کام لے بھائی،'' عالم نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ''اپنی بوٹیاں نوچنے سے کیا پائے گا؟''

''تو کیا کروں تیرا خون پی جاؤں؟''

وہ ہلکی سی ہنسی ہنسا۔ ''اس سے کچھ بنتا ہو تو ابھی لے میں نبض پر خنجر سے نشتر کیے دیتا ہوں۔ پی لے۔''

میں نے سر پر دو ہتڑ مارے اور کہا، ''اچھا ٹھیک ہے۔ میں بفورِ خنگل خورد چلا جاتا ہوں۔ ہو سو ہو۔''

عالم ایک لمحہ چپ رہا، پھر ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولا، ''استاد ایک بات ہے.... پر تو خفا تو نہ ہو گا؟''

میں نے منھ بنا کر کہا، ''اس سے کچھ کام بنے تو وہ بھی کر دیکھیں گے۔''

''نہیں ذرا دھیان سے سن۔ تو نے.... تو نے امیر جان کا نام سنا ہے؟''

''کون، وہی امیر جان جے پور والی جو رئیسوں جیسے ٹھاٹھ سے رہتی ہے؟''

''ہاں ہاں، بالکل وہی۔ گل خان تم نے سنا ہے کہ وہ تم سے مصیبت زدوں کی مدد بے کھٹکے کرتی ہے؟''

''مدد؟ وہ کیا مدد کیا کرے گی، ہے تو وہی کسبن مالزادی۔ وہ ہتھیاتی ہے نہ کہ مٹھی کھولتی ہے۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''اس کی کوئی عزت اور آدر بھی ہے؟''

''اماں سنو تو سہی، ذرا چھری تلے دم لو۔'' عالم نے شاید دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی بات سننے کو تیار ہوں، اس لیے اب وہ بے کھٹکے بول رہا تھا۔

''سن تو رہا ہوں، کیا تمھاری بغل میں گھس جاؤں؟''

''کہا یہ جاتا ہے کہ وہ پیدائشی کسبن نہیں ہے۔ کسی غریب، پُرغیرت دار ماں باپ کی بیٹی ہے۔ صورت شکل، ہنر، سگھڑاپا، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کوئی اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہ تھا۔''

''تو پھر؟ یہ سب مجھ سے زیادہ کون جانے ہے؟ میری یتما مجھ سے بڑھ کر کون جانے گا۔''

''پھر یہ کہ ایک ڈھونگی شریف زادے نے اس کی نسبت بالآخر مانگی اور بہت زور دے کر مانگی۔ اندھے کو کیا چہیے دو آنکھیں۔ باپ ماں نے کچھ پوچھے سمجھے بغیر اس کے ہاتھ پیلے کر دیے۔''

وہ چپ ہو گیا، شاید اسے میرا خیال آ گیا تھا کہ کہیں ہم بھی ایسا ہی نہ کرنے والے ہوں۔ میں بھی چپ رہا۔ قصے کا انجام کچھ کچھ سمجھ میں میری آ رہا تھا۔

عالم نے سر جھکائے جھکائے کہا:

''ان ذات شریف نے اس بچی کو جی بھر کے خراب کیا، پھر یہاں لا کر ایک بالا خانے پر بیچ دیا۔ گھر والوں کو خبر ہوئی تو باپ نے تو نہیں، پر ماں نے بہت بلوایا، دودھ کا واسطہ دیا، مگر اس کو نہ جانا تھا نہ گئی اور جلد ہی اس نے ساری دہلی جیت لی۔ اب کسی کے ہاں جاتی نہیں ہے....''

میں نے اچانک بات کو سمجھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا:

''تو اسی وجہ سے امیر جان....''

''بالکل۔ یہی بات ہے۔ اسے معلوم ہو جائے کہ تم پر کیا بپتا پڑی ہے تو وہ بے کھٹکے تمھیں قرض دے دے گی۔''

''پر.... وہاں جاؤں کیسے؟ اور وہ میری بات کیا یوں ہی مان لے گی؟''

''میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ فیروز شاہ جنّت آرام گاہ کے کوٹلے سے ذرا ادھر اس کی شاندار حویلی ہے۔ دروازے پر ہاتھی جھومتے ہیں۔''

''کوئی وسیلہ، کوئی ذریعہ بھی تو ہو۔'' میں نے مایوس لہجے میں کہا۔ ''اس پاس مجھ جیسے بیسیوں پہنچتے ہوں گے۔ اسے کیا پتہ کہ میں چور ہوں کہ ٹھگ ہوں۔''

''تمھارا باپ خان جہاں کے یہاں نوکر تھا۔ خان جہاں وہاں جاتے آتے ہیں۔ شاید اپنے باپ کا ذکر اور اُن کا نام اور خان دوراں سے ہمارا توسل .... کیا پتہ کام بن جائے۔ سب لوگ ایک ساں تھوڑی ہیں۔ پولی پولی آنچ جدی ہوتی ہے۔''

میں سوچ میں ڈوب گیا۔ میرے آگے راہ کوئی نہ تھی۔ امیر جان کے یہاں خان جہاں جیسے لوگ پہنچتے ہیں تو میرے لیے کیا ذلت ہے۔ میں بھی ان کوچوں سے نا آشنا نہ تھا۔ البتہ میری اڑان امیر جان جیسیوں کے بام تک نہ تھی۔ کام اگر بن گیا تو بہت خوب اور اگر نہ، تو میرا کچھ نہ بگڑے گا۔ جتنا بگڑنا تھا سو تو بگڑ ہی چکا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''کب چلو گے؟''

''بس ابھی۔ نیک کام میں استخارہ اور حیص بیص کیسا؟ اپنا وظیفہ میں واپس آ کر پورا کرلوں گا اور تمھارا کام بن گیا تو حضور غوث الوریٰ کو ایصالِ ثواب کے لیے ایک وظیفہ اور پڑھوں گا۔''

''جزاک اللہ۔ یہ احسان تمھارا مجھ پر رہا۔''

''احسان کاہے کا، کبھی تم بھی کام آؤ گے۔ چلو اٹھو اب تاخیر نہ کریں۔''

امیر جان کی حویلی، یا قلعہ دیکھ کر اوسان میرے اڑ گئے۔ اللہ اللہ اتنا بلند مکان بھی کسی کو بہم پہنچ سکے ہے۔ بہت بڑا اونچا پھاٹک، دونوں جانب محافظ خانہ، محافظ خانے کے اوپر دو منزلہ حجرے جو شاید حوالی موالیوں کے لیے ہوں گے۔ محافظوں میں کوئی مرد نہ تھا، کوئی ہندی بھی نہ تھا۔ لمبی تڑنگی بہت مضبوط ہاتھ پیر والی، قزاقستان یا ترکستانی نسل کی، مسلّح اور مکمل بارہ عورتوں کا دستہ۔ گورے لیکن گرم کیے ہوئے تانبے جیسے

تمتمائے ہوئے رخسار، بادام کی طرح آنکھیں، کسی ہوئی چھاتیاں، تنگ شلوکوں سے ابھرے ہوئے ڈنڈ اہٹتے ہوئے بلکہ اگلے پڑتے ہوئے، بر میں چست پاجامے، اس قدر چست کہ رانوں پر گویا مڑھے ہوئے ہوں، لیکن ایسے نہیں کہ جسم کی نمائش کی جھلک بھی ہو۔ شلوکے کی آستینیں کلائیوں تک، دامن پیٹ کے ذرا نیچے تک، اس طرح کہ کنارے دامن کے دوپٹے سے کچھ ڈھک گئے تھے۔ سروں پر زری کی ٹوپی اور کمر میں زرنگار دوپٹے کے سوا کوئی آرائش ان کے بدن پر نہ تھی۔ شلوکا، پاجامہ، ڈوپٹہ، سب سیاہی مائل نیلے رنگ کے تھے، تاکہ تاثر مردانہ وجاہت کا مزید تقویت پائے۔ ٹوپیاں آسمانی مخمل کی تھیں، مگر سونے سے اس قدر لپی ہوئیں کہ نیلا رنگ بہت کم دکھائی دیتا تھا۔ سب بالکل تنی ہوئی کھڑی تھیں اور آتی جاتی دُنیا کو نخوت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

دروازے پر واقعی دو ہاتھی مہیب وبالا جھوم رہے تھے۔ جھولیں ان کی زربفت اور کمخواب کی، ان پر آسمانی مخمل سے مڑھا ہوا اور چاندی کے ڈنڈوں والا ہودہ، ہاتھیوں کے لمبے لمبے دانتوں پر آٹھ آٹھ چوڑے سونے کے، بھسونڈوں پر زعفرانی نقش ونگار، مستکیں گیرو سے رنگی ہوئی، تانبے کی جگمگاتی گھنٹیاں، ہاتھی دونوں پھاٹک کے دونوں طرف جمنا کے رُخ پر کھڑے ہوئے تھے۔ کوئی آدھے کوس، یا کچھ کم کے فاصلے پر دریا اور اس کے گھاٹ، اور سطح پر ندی کے تیرتی ہوئی کشتیاں اور جہاز صاف نظر آتے تھے۔

اپنی عہدہ دار کا اشارہ پا کر، یا شاید آپ ہی آپ، ایک اردا بیگنی آگے آئی اور مجھ سے بے جھجک آنکھیں ملا کر بولی:

''کہیے؟''

میں نے اٹک اٹک کر اظہارِ مدّعا کیا کہ میں غریب سپاہی پیشہ اور مصیبت زدہ ہوں، ملنا چاہتا ہوں۔

''اور یہ آپ کے ساتھ ہیں، کیوں؟''

میں نے محمد عالم کا تعارف کرایا تو اس نے ذرا ہمت کر کے مسکرا کر ہم لوگوں کا توسل خان جہاں اور خان دوراں سے ظاہر کیا۔

کہیں سے کوئی اشارہ پا کر ایک اردا بیگنی اندر گئی۔ ہم لوگ یوں ہی دھوپ میں کھڑے رہے۔ کسی نے ہمیں قریب آنے یا بیٹھ جانے کی دعوت نہیں دی۔ امیر جان کی حویلی جس گلی میں تھی اس میں ایک ہی دو گھر

اور تھے، اس لیے لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی۔ بس ایک شربت عطر کی دُکان کی اور ایک پھولوں کے گجرے والا سامنے اپنا ٹھیہا جمائے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا، ایک موتیا اور گلاب کا ہار میں بھی خرید لوں، نذر کر دوں گا۔ لیکن ہیاؤ نہ کھلا۔ خدا معلوم اس کا کیا مطلب نکالا جائے۔ میری ہستی ہی کیا تھی، ایک مجہول سا احدی جس کا سارا تعارف اس کے مالکان تھے۔

ہم کھڑے سوکھتے رہے۔ بڑی دیر بعد میں مایوس ہو کر واپس ہونے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اندر سے بلاوا آ گیا۔ جلد جلد ہاتھوں سے پسینا پونچھ کر اور ہاتھوں کو چپکے چپکے ڈوپٹے پر خشک کر کے ہم اندر گئے۔

میں نے سمجھا تھا کہ محافظ خانے کے اندرونی دروازے بعد سہ رویہ بارہ دریاں ہوں گی، بیچ میں چمن ہوگا، ذرا سایہ اور خنکی کا ماحول ہوگا لیکن وہاں تو دائیں ہاتھ کو ایک تنگ لیکن اونچا سا زینہ تھا اور ہمارے سامنے ایک لمبا گلیارا تھا جس میں جگہ جگہ روزن تھے اور طاقوں میں چراغ روشن تھے۔

ہم چلتے چلے گئے۔ خدا خدا کر کے گلیارا ختم ہوا۔ پھر ایک دالان اور کچھ کمرے، ایک کمرے میں ہمیں ٹھہرا دیا گیا۔ کچھ انتظار کھینچنے کے بعد پھر بلاوا آیا۔ اب ہم ایک بڑے ایوان میں تھے۔ اللہ اللہ نقش و زیبائش اس ایوان کے بھلا کون بیان کر سکے ہے اور سچ پوچھیے تو مجھے آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ بس یہی کہہ سکوں ہوں کہ ہر طرف روشنی بے شمار ہو رہی تھی۔ جا بجا ہنڈے اور کنول روشن تھے۔

''تسلیمات،'' ایک بہت ہی میٹھی لیکن صاف اور جھانجھن سی بجتی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔ ''آپ خان جہاں لودی مسند علی خان کی سرکار میں نوکر ہیں؟''

''جی.... جی نہیں۔ میرا باپ ان سے متوسل تھا۔ ہم دونوں دراصل خان دوراں اسد خان بن مبارک خان بہادر کے فوجی دستے میں سپاہی ہیں۔''

رک رک کر، سر جھکائے جھکائے، میں نے اپنی رام کہانی سنائی۔ اس دوران تھوڑا بہت مشاہدہ کرنے کی ہمت پڑی لیکن میں امیر جان کا حلیہ نقشہ بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ان کی پشت پر دو خواصیں پنکھا جھل رہی تھیں، دائیں بائیں باہر والیوں جیسی دو اردابیگنیاں مؤدب تھیں۔ کوئی سامان وہاں نشاط و غنا کا نظر نہ آتا تھا۔ پیتل کے بڑے بڑے پنجڑوں میں کئی خوش نوا پرند ضرور تھے، لیکن میں ان میں سے کسی کو پہچان نہ سکا۔ مجھے خیال آیا کہ حضرت عرش آرام گاہ فیروز شاہ تغلق کے بارے میں مشہور تھا کہ انھوں نے اپنے کوٹلے کے سامنے ایک الگ عمارت میں دُنیا جہان کے عجائب جانور اور انسان اور لاکھوں کروڑوں برس پہلے

کے وحوش وطیور کی ہڈیاں جمع کر رکھی تھیں۔

ہمارا پورا حال سن کر امیر جان نے پشت پر کھڑی ہوئی ایک خادمہ کو اشارہ کیا۔ وہ کسی بغلی دروازے سے باہر گئی اور تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ چار بدرے لے کر حاضر ہوئی۔ دوسرے اشارے پر وہ بدرے اس نے میرے ہاتھ کی طرف بڑھائے۔ میں نے ایک کیفیتِ اضطراری سے مغلوب ہو کر ہاتھ بڑھایا اور بدروں کو لے لیا۔

''یہ چار سو تنکے ہیں۔ ساڑھے تین سو جو آپ نے گنوائے اور پچاس میری طرف سے آپ کی بیٹی کو جہیز قبول کیجیے۔''

''میں.....م.....مگر یہ قرض فوراً ادا نہ کر سکوں گا۔''

''پچاس تو قرض ہی نہیں، بقیہ کے لیے آپ کو اختیار ہے۔ آپ کی نیت صاف ہو، یہ شرط ہے۔''

میں کچھ اور عرض معروض کرنے والا تھا کہ امیر جان نے منھ پھیر لیا اور ان کی خادماؤں نے جھک کر ہمیں سلام کیا، یہ گویا ہماری رخصت تھی۔

میری لاڈلی بیاہی گئی اور بڑی دھوم دھام سے بیاہی گئی۔ شری رگھوراج بہادر سنگھ کو بھی میں نے اپنی ماں کی دعاؤں کے ساتھ رُقعہ بھیجا۔ انھوں نے ایک ڈوپٹہ بنارسی، پانچ تنکے اور مٹھائی بھیجی۔ سلطان عالی مقام کے بموجب فرمان کے میں نے پورا لحاظ اس بات کا رکھا کہ کوئی رسم غیر شرعی نہ ہو، یعنی ایسی نہ ہو جو محض ہندوؤں میں رائج ہو۔ ایک بات پھر بھی ایسی تھی جو مسلمانوں میں رائج تھی، پر کم، اور وہ یہ کہ نکاح کے کئی مہینے بعد رخصتی ہوئی۔ نکاح کے دس ہی بیس روز بعد خبر اڑی کہ سلطان والا شان خداوندِ عالم سکندر لودی آگرے سے دہلی کی راہ میں واصل بحق ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس شان و جاہ و دبدبے کا سلطان چشمِ فلک اب کیا دیکھے گی۔ دہلی سے آگرے انتقال میں شاید فال نیک اس کے لیے نہ تھی۔ آگرہ اتنا کچھ نہ بن سکا جتنا میرے مرحوم سلطان کی تمنا تھی اور دہلی انھیں بار بار نزول اجلال کرے ہی بنے۔ ہر چند کہ سلطان کی صحت اب گرتی جا رہی تھی، لیکن کسی کے شانِ گمان میں بھی نہ تھا کہ انجام زندگی اس قدر نزدیک ہے۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ دہلی نہ چھوٹتی تو شاید جان بھی نہ چھوڑنی پڑتی۔ یہ حادثہ دہلی کی راہ ہی میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

سلطان کے جنت نشین ہونے پر اربابِ حکومت میں تغیر و تبدل ہونا ہی تھا۔ نہ معلوم خانِ جہان اب

کون بنتا اور خانِ دوراں کا عہدہ کسے ملتا اور اسد خان بہادر کی کیا حیثیت بندگان عالی کی بارگاہِ مبارک میں ہوتی۔ میں بہانہ رخصتی کا کر کے ساری مدت گھر پر ہی رکا رہا۔ رخصتی کے بعد میں جوروا پنی کو سمجھاتا رہا کہ سکہ خطبہ بدلا ہے، دیکھیں ابھی کیا ظہور میں آتا ہے۔ خان اسد خان کا رسالہ شاید رہے نہ رہے۔ جب وہ بلوا بھیجیں گے تو چلا جاؤں گا۔ ابھی مجھے کھیتی باڑی دیکھنے دو، کچھ آرام کرنے دو۔ پھر دیکھیں گے۔

باب چہارم

ایک سال گذر گیا۔ پھر دو سال۔ کہتے ہیں داماد کی تقدیر درحقیقت بیٹی کی تقدیر ہوتی ہے۔ میری بیٹی اس قدر بھاگوان نکلی کہ اس کے میاں کا کام نجاری کا بہت جلد اور بہت خوب چل نکلا۔ ان کا گاؤں تنگل خورد کے پاس ہی تھا، اس لیے انھیں ہمارے یہاں آتے رہنے میں کوئی پریشانی نہ تھی۔ پھر داماد سے معرفی حاصل کر کے لوگ میرے پاس سپہ گری کے فنون، کشتی کے داؤ پیچ، تلوار اور نیزے کی دیکھ بھال اور بناوٹ کے طریقے سیکھنے آنے لگے۔ مجھے گھر بیٹھ رہنے کا اچھا بہانہ ہاتھ آیا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ امیر جان کا قرض ادا کر سکنے کی سبیل نکل آئی۔ میں اپنے اوپر رہتا تو یہ قرض تین کہ چار سال میں بھی ادا نہ ہو سکتا تھا۔ سپہ گری کا حال میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ آرام تھا لیکن دولت نہ تھی۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید تھی واپس دہلی جاؤں گا تو اپنے سب شوق بند کر کے جیسے بھی ہو ماہ بہ ماہ چار تنکے بچاؤں گا۔ گھر بھیجنا بھی ایک تنکہ کم کر دوں گا۔ اس طرح اگر نئی مصیبت کوئی نہ آ گھیرتی تو چھ سات برس میں ادائیگی کی صورت بن سکتی تھی۔ اب یہاں مجھے جو کام ملنے لگا اور گھر کی کھیتی میں اتنا پیدا ہونے لگا کہ مجھے الگ سے کچھ لگانا نہ پڑتا تھا۔ اس نے آسانیاں بڑی پیدا کر دیں۔ بیٹی کا خرچ کچھ تھا نہیں، سوائے اس کے کہ تیج تہوار، پیدائش، شادی بیاہ پر کچھ دینا دلانا پڑتا۔ بیٹا میرا بھی اب بڑا ہو کر بہنوئی کے پاس کام سیکھنے لگا تھا۔

تیسرا سال ختم ہونے کو تھا جب میں نے دیکھا کہ اب میں بہت جلد امیر جان کا قرض چکا سکوں گا۔ خداوندِ عالم ابراہیم لودی نے دارالخلافہ دہلی پھیر لیا تھا لیکن خان جہاں اور خان دوراں کے عہدے اب

لگ خالی تھے۔ میں نے سنا کہ سلطان کا خیال تھا کہ ان بڑے بڑے عہدہ داروں کے بغیر ہی کارِ سلطانی چل سکتا ہے۔ میرے خان نے شاید اپنا رسالہ دوبارہ ترتیب نہ دیا تھا، یا شاید ترتیب دیا تھا تو مجھے بلوایا نہ تھا۔ عالم بہاری کی جانب سے بھی کچھ نامہ و پیام نہ تھا۔ شاید وہ رسالہ برہم ہی ہو گیا ہو، میں نے سوچا۔

میری بیٹی کو اللہ نے ایک چاند سا بیٹا دیا تو نیا موقع خوشیوں کا ہم سب کے ہاتھ لگا۔ میں نے دل میں کہا کہ یہ دہلی واپس جانے اور امیر جان کا قرض ادا کرنے کے لیے اچھا شگون ہے۔ اب کی بار مہاوٹیں تھیں، موسم بہت خوشگوار اور تر و تازہ کن تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا، امام ضامن بازو پر بندھوایا، میری ماں نے کسی ہندوانی دیوی کا صدقہ بھی اتارا اور میں صبح کے وقت عازمِ دہلی ہوا۔ سنہ 1520 بکرمی گذار کر ذی الحجہ کا مہینہ ختم پر تھا۔ کوار کا مہینہ لگ چکا تھا۔ دن بھی خوب چمک رہا تھا، پر آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی جھلک موسم کی سردی کا دھیان دلاتی تھی۔ چیل کوے گوریاں درختوں اور آسمانوں میں شور مچاتے پھرتے کہ سردیاں اب واپس آنے والی ہیں۔ باغوں میں موروں کی کثرت تھی۔ کالے تیتر اپنے اپنے بھٹ سے نکل کر اتروا تے پھر رہے تھے۔ تنومند، بلند و بالا نیل گائیں، بارہ سنگھے، چھریرے چیتل، کانکر، لمبی پیچ دار سینگوں والے کالے، ٹھگنے چوسنگھے، سبھی طرح کے ہرن ہر موڑ پر اور ہر کھلی جگہ پر دکھائی دیتے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے۔ گھوڑا میرے پاس تھا نہیں، اور یوں بھی لمبی رقم ساتھ لے کر تنہا چلنے کا خمیازہ میں کھینچ چکا تھا۔ اب واقعی جماعت میں سلامت تھی۔

دوسرے دن میں دہلی پہنچا۔ دُنیا پہلے جیسی لگ رہی تھی۔ سلطان نیا تھا تو کیا ہوا، شہر تو وہی تھا۔ فیروز شاہ جنت آشیانی کے کوٹلے کے پہلے کچھ آبادی نہ تھی۔ مٹکا شاہ صاحب کی درگاہ، پھیر قلعۂ کہنہ، اور ان کے درمیان کہیں بی بی فاطمہ سام کی درگاہ، سب کچھ یوں ہی تھا۔ مٹکا شاہ صاحب کی درگاہ پر اب بھی ہیجڑے اور زنانے حسبِ معمول جھاڑو لگاتے، زائرین کو پانی پلاتے، بابا نظام الدین صاحب سلطان جی کے گن گاتے۔ سب ویسا ہی تھا۔ میرے سلطان سکندر لودی صاحب کا مزار تکمیل کے قریب تھا۔ سلطان بہلول لودی عرش آشیانی تو بہت دُور خواجہ قطب صاحب کے کچھ پہلے ذرا ہٹ کر ابدی نیند سو رہے تھے لیکن اُن کا سکہ ہنوز رواں تھا۔

مجھے امید تو نہ تھی، لیکن ایک خیال سا تھا کہ خان دوراں سابق کا رسالہ ابھی موجود ہو گا تو شاید میرا دوست بھی وہیں مل جائے اور رات ٹھہرنے کا سہارا ہو جائے۔ موٹی رقم میری ہمیانی میں تھی، اسے ساتھ لیے

لیے پھرنا، یا کسی اَن جانی سرائے میں لے جانا اور رات گذارنا، کچھ بہت دلچسپ بات نہ تھی۔ غیاث پور بھی حسبِ معمول وہیں تھا، لیکن رسالے کا خان دوراں کے کہیں پتہ نہ تھا۔ اِدھر اُدھر پوچھا تو پتہ لگا کہ خان دوراں کو بھڑائچ کسی مہم پر بھیج دیا گیا ہے لیکن ان کی فوج اور رسالے کہاں ہوں گے، اس باب میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ مجبور ہو کر میں نے فیروز شاہی سرائے میں رات رہنے کی ٹھانی۔ سب سے قریبی سرائے تغلق آباد کی سرحد پر بدر پور میں تھی۔ وہاں سے دہلی بہت دور تھی اور کوٹلہ فیروز شاہ، جس کے پچھواڑے والے گاؤں فیروز آباد میں جا کر مجھے امیر جان کا قرض اتارنا تھا، اور بھی دور تھا۔ پر مرتا کیا نہ کرتا، اب پرانے دوستوں کو کہاں ڈھونڈوں، سرائے کی بھٹیارن ہی کی مہمانداری پر قناعت کرلوں گا۔

صبح ہوئی تو میں نے توجہ معمول سے زیادہ اپنی تراش خراش اور درست کرنے اپنی وضع قطع میں لگائی۔ سب سے پہلے تو ہمیانی ہی کو ٹٹول کر دیکھا تھا کہ سلامت ہے کہ نہیں۔ بارے سب محفوظ تھا۔ امیر جان کا قرض چکانے یا شاید ان کو دیکھنے کا ذوق اس قدر تھا کہ میں بغیر ناشتا ہی نکل کھڑا ہوا۔ کئی فرسنگ کا فاصلہ تھا، ایک گھوڑا کرائے پر لیا اور عازمِ فیروز آباد ہوا۔

سفر میں ایک گھنٹے سے کچھ اوپر لگا۔ جمنا پر چہل پہل ویسی ہی تھی۔ پر یہ کیا؟ وہ حویلی تو کچھ خالی خالی سی لگ رہی تھی۔ نہ وہ فیل ہائے کوہ پیکر، نہ وہ اردابیگنیاں، نہ وہ سامنے عطر فروش اور گل فروش تھے۔ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے۔ کچھ دیر یوں ہی کھڑا فکر میں ڈوبا رہا۔ کیا انھوں نے حویلی چھوڑ دی، کہ دہلی ہی چھوڑ دی؟ کسی سے شادی کر کے شوہر کے پاس تو نہیں اٹھ گئیں؟ والدین نے راضی کر کے انھیں جے پور واپس بلا لیا کیا؟

ناگاہ ایک بھلے مانس سے آدمی ادھر سے گذرے اور مجھے چپ چاپ کسی فکر میں غرق دیکھ کر ٹھٹکے اور بولے:

''کیا جناب کو کہیں جانا ہے؟ راستہ بھول گئے ہیں؟''

''جی نہیں.... ایسا تو کچھ نہیں۔ وہ.... بات یہ ہے کہ سامنے والی حویلی میں....''

''امیر جان کو پوچھتے ہیں آپ۔ حضت وہ تو اللہ کو پیاری ہوئیں۔''

''اللہ کو پیاری.... کیا بات کہتے ہیں جناب۔ میں جب ملا تھا تو وہ اچھی خاصی جوان جہان تندرست تھیں۔ یہاں حویلی پر شان اور ہی تھی۔''

''تھی صاحب من۔ مگر عرصہ کوئی ایک سال ایک کا ہوا کہ ان کا بلاوا آ گیا۔''

''کیوں.... کیسے.... معافی چاہتا ہوں، آپ سے جرح نہیں کر رہا ہوں۔ اطمینان اپنا چاہتا ہوں کہ کہیں کچھ....''

''جی نہیں میاں صاحب، کہیں کچھ اور نہیں۔ سب کچھ وہیں ہوا۔'' انھوں نے دریا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی میں سمجھا نہیں۔''

''بات یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے لیے ایک مور پنکھی نئی بنوائی تھی۔ اسے اتارنے کی دریا میں عجلت انھیں بہت تھی۔ لوگوں نے کہا کہ چندے توقف کریں، دریا ان دنوں چڑھائی پر ہے۔ پر عورت ذات ضدی تو ہوتی ہی ہے، پھیر آپ جانو ان کے ناز اٹھانے والے بے شمار۔ مور پنکھی کو ساز و سامان سے آراستہ کر کے اس میں کچھ اور لوگوں کے ساتھ بیٹھیں اور رسہ کھولنے کا حکم دیا۔ ندی کیا تھی کہ بپھرا ہوا دیو تھی، پانی کے ریلے پر ریلے آ رہے تھے۔ ابھی ٹھیک سے آگے بھی نہ آئے تھے کہ ایک زور کی لہر آئی اور مور پنکھی کو منجدھار میں کھینچ لے گئی۔ پھر تو یہ جا، وہ جا۔ مور پنکھی کی بساط ہی کیا؟ آناً فاناً میں ہچکولے کھانے لگی اور اس کے پہلے کہ مرجیے اور ملاح پانی میں اتریں اتریں، کشتی میں سوار سب لوگوں کی کشتیٔ حیات طوفانی ہو گئی۔ سب ختم ہو گیا۔''

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" میں نے حزن بھرے لہجے میں کہا۔ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین مجھے حضرت یونسؑ کی قرآنی دعا یاد آئی۔ مگر امیر جان کو کسی مچھلی نے نہیں نگلا تھا۔ انھیں تو مچھلی کے مستقر کو اپنا مستقر بنانا بدا تھا۔

''لاش نہیں ملی؟'' میں ہمت کر کے پوچھا۔

''ملی۔ تیسرے دن آپ ہی آپ کنارے آ لگی۔''

''کہاں مدفون ہوئیں؟ کیا جیپور لے جائی گئیں؟''

''نہیں، ان کی وصیت تھی کہ جب بھی میں مروں مجھے سیدی مولی صاحب کے مزار کے سامنے والے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ وہی ہوا۔'' ایک لمحہ چپ رہ کر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اللہ بخشے بڑی نیک بی بی تھیں۔''

''سنا ہے ڈوب کر مرنے والے شہید ہوتے ہیں۔''

''ان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' انھوں نے سنسان حویلی کی طرف سر کا ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہم سب کو وہیں جواب دہی کرنی ہے۔ میں متشکر ہوں کہ آپ نے زحمت کی، سب حال بیان فرمایا۔ ورنہ میں تو بھٹکتا ہی رہتا۔''

ہم دونوں نے مصافحہ کیا، پھر وہ اپنی راہ چل دیے۔ میں کھڑا سوچتا رہا۔ اب امیر جان کا قرض تو ادا ہوگا نہیں۔ ان تنکوں کا کیا کروں اور خود کہاں جاؤں؟ شاید سب سے پہلا فرض میرا تو یہ ہے کہ قبر پر ان کی جاؤں اور فاتحہ پڑھوں۔ سیدی مولیٰ صاحب کا مزار اور اس کے سامنے کا قبرستان مجھے خوب جانا بوجھا تھا۔ نظام الدین صاحب سلطان جی کی درگاہ کے کچھ ہی ورے تو تھا، بیچ میں کھلی زمین صحرا کی طرح تھی۔ اس کے ذرا آگے غیاث پور کا گاؤں تھا۔ پھولوں اور پیڑوں کے باعث قبرستان خاصا پُرفضا تھا۔ قمریاں اور کبوتر اور فاختائیں غول کے غول ہر طرف یاہو اور غٹرغوں کرتے دانہ چنتے نظر آتے تھے۔ مور بھی کثرت سے تھے۔ کبھی کبھی تیتر، لومڑیاں اور خرگوش بھی دکھائی دے جاتے۔ بابا سلطان جی صاحب کے نام نامی پر لگائی ہوئی سبیل پر پانی ہر وقت موجود رہتا۔ فاتحہ پڑھنے والے ہر وقت ہی آتے جاتے رہتے تھے۔ میں ابھی چلا چلوں تو اس کام سے فراغت ہو جائے۔ پھیر حضرت سلطان جی صاحب اور امیر خسرو کے آستانے پر بھی جبہ سائی کر لوں گا۔

گھوڑا میرے پاس تھا ہی، میں فوراً چل پڑا۔ سیدی مولیٰ صاحب کے مزار پر رونق ان دنوں کچھ کم رہتی تھی۔ مجھے ان کے عروج کے زمانے یاد آئے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ انھیں دستِ غیب تھا۔ روز ایک اشرفی سے کم نہ خرچ کرتے تھے۔ خاص موقعوں پر اور بھی داد و دہش تھی لیکن ذریعۂ آمدنی بظاہر کوئی نہ تھا۔ دوسرے پیر فقیروں کی طرح وہ فتوح، نذرانہ، ہدیہ کچھ قبول نہ کرتے تھے۔ وہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے، یہ بھی کھلتا نہ تھا۔ سیدیوں کی نسل سے ہونے کے بسبب بہت لمبے، قوی ہیکل، سیاہ فام تھے اور سیدیوں کے برخلاف داڑھی نہایت لمبی، گھن کی اور گھونگر والی تھی۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی تھیں۔ کہتے ہیں دن ہو یا رات، ہر وقت کوئی نہ کوئی ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا اور سب دیکھتے تھے کہ وہ کسی وقت سوتے نہیں ہیں۔ بہت سے بہت خانقاہ میں کسی ستون سے ٹیک لگا کر کچھ دیر کو آنکھیں بند کر لیتے تھے لیکن کسی بھی نئے شخص کی آہٹ پر

آنکھیں کھول کر اس کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ وہ خود بھی اسلحہ باندھتے تھے اور دوسروں کو بھی تلقین کرتے کہ سنت ہے۔ آدمی کے لیے بہتر ہے کہ کوئی بھی سنت نہ چھوٹے۔

وہ کسی رئیس، کسی فوجی عہدے دار، کسی سلطانی صاحبِ اختیار، حتیٰ کہ سلطان وقت کے وہاں بھی نہ جاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کے یہاں اتنا مرجوعہ ہونے لگا اور سب کے سب اسلحہ بند، کہ کوتوالِ شہر کو ان پر شک ہونے لگا کہ یہ کچھ کرنے والے تو نہیں ہیں۔ سلطان جلال الدین خلجی کا زمانہ تھا، سلطان کو کوتوالی پرچہ لگا کہ سیدی مولیٰ کے لچھن بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ سلطان جلال الدین ہر چند کہ نہایت نرم دل اور صلح جو حاکم تھا، لیکن بار بار کے پرچہ اخبار اور پھر اس کے اپنے اپنے مخبروں کی اطلاعات یہی کہتی تھی کہ سیدی مولیٰ کے مریدان سب مسلح رہتے ہیں۔ کچھ نذر فاتحہ نہیں لاتے لیکن کھانا سب کو پیٹ بھر ملتا ہے۔ ان کی خانقاہ میں آنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔

سلطان روز روز کی خبروں سے متوحش ہوا اور اس نے متعدد بار سیدی مولیٰ کو دربار میں طلب کیا لیکن وہ کہاں سننے والے تھے۔ اب سلطان کا شک یقین میں بدل گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے اپنے درباری مفتی سے فتویٰ طلب کیا کہ ایسے شخص کی کیا سزا ہو جو بارہا طلبی پر بھی دادگاہِ سلطانی میں حاضر نہیں ہوتا۔ مفتی صاحب کو سلطان کے عندیے کی خوب فہم تھی۔ انھوں نے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کی دلیل پر فتویٰ دیا کہ ایسا شخص واجب القتل ہے۔ سلطان کو تو بس حیلۂ شرعی کی تلاش تھی۔ اس نے فوراً سیدی مولیٰ کو بجرم حکم عدولی سلطانِ عادل قتل کرا دیا اور ان کی خانقاہ لٹوا کر کھدوا ڈالی اور منادی کرا دی کہ سیدی مولیٰ کے مریدین فوراً توبہ کریں ورنہ عتابِ سلطانی کے مستوجب ہوں گے۔

اللہ کی شان، جہاں میلہ لگا رہتا تھا اور حلوے کی دیگیں گرم ہوتی تھیں اور نان کے تندور دہکتے تھے وہاں اب پرندہ بھی پر نہ مارتا تھا۔ اصحابِ دل کی آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ نے تو کھلے بندوں کہا کہ سلطان نے اچھا نہیں کیا۔ بے گناہ خون رنگ لائے بغیر نہ رہے گا، اور یہی ہوا۔ کچھ ہی مدت گذری تھی کہ سلطان کے سگے بھتیجے علاء الدین نے کڑا کے مقام پر قتل اسے کرا کے لاش دریائے گنگ میں پھکوا دی۔ تاج تو اس کا ایک مچھیرن کے ہاتھ لگا لیکن سر کہیں نہ ملا۔ سیدی مولیٰ کا مزار از سرِ نو بنا اور زیارت گاہِ خاص و عام ہوا اور اب لگ یوں ہی ہے۔ لیکن آج ڈھائی سو برس بعد بھی مزار پر شہید کے جلال اس قدر برستا ہے کہ کوئی دیر تک وہاں ٹھہرتا نہیں۔ میں نے مزار کے سامنے سے گذرتے گذرتے سلام کیا اور نیت کی کہ امیر جان کے یہاں فاتحہ

خوانی کے بعد آپ کے مزار پر فاتحہ پڑھوں گا، پھر سلطان جی کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔

قبر ڈھونڈنا امیر جان کی چنداں مشکل نہ تھا کہ قبر کے کچھ ہی فاصلے پر پانی کی سبیل تھی۔ اگرچہ وہاں اس وقت سناٹا تھا، لیکن لوحِ مزار دیکھ کر میں فوراً پہچان گیا۔ طاق میں کالک کا داغ بہت ہلکا تھا، گویا چراغ یہاں کبھی ہی کبھی جلتا ہو۔ مجھ پر اچانک رقت طاری ہوگئی۔ آہ زندگی میں کیا رونقیں تھیں اور اب کیا بے سرو سامانی ہے۔ اول و آخر فنا ہی فنا ہے۔ مولائے کریم سب کا انجام بخیر کرے، لیکن یہ کیا، پرلی طرف قبر میں ایک شگاف سا نظر آ رہا تھا۔ ہائے افسوس، بجو اور کفن دزد یہاں بھی باز نہیں آتے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کچھ جھاڑی جھنڈی خس و خاشاک ہو تو مٹی پتھر ملا کر شگاف کو بند کر دوں۔ چشم زدن میں سب مہیا ہو گیا اور میں شگاف کے اوپر آیا کہ احتیاط سے اسے پاٹنے کی سبیل کروں۔ لیکن میں ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ قبر کے اندر روشنی سی تھی۔ اندر کوئی چور تھا کیا؟ لیکن ایسا دلاور چور کہاں جو قبر کے اندر چراغ لے کر جائے۔ میں نے دور ہی دور سے آنکھیں گڑا کر دیکھا۔ کچھ سبز سے رنگ کی روشنی تھی، آنکھیں ٹھنڈی ہوئی جا رہی تھیں۔ ہمت کر کے میں دوبارہ نزدیک گیا، لیکن اس کے پہلے میں چاروں جانب نگاہ دوڑائی کہ کوئی اور نظر آ جا تو اس سے امداد کی التجا کروں۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ ساری قمریاں، کبوتر، مور، سب بالکل چپ ہو گئے تھے، جوں کہ سورج گرہن کے اندھیرے میں وحوش و طیور سب چپ ہو جاتے ہیں۔ مجھے اور بھی ڈر لگ رہا تھا لیکن وہ روشنی مجھے اپنی طرف کھینچتی سی لگ رہی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو روشنی کچھ بڑھ سی گئی تھی اور لگتا تھا کہ شگاف میں کسی نے میرے لیے مشعل رکھ دی ہو لیکن دن چڑھ کر اب نصف النہار کے قریب تھا۔ ایسے میں مشعل کی کیا لم ہو سکے ہے؟ مجھے بلانا مقصود تھا تو.... لاحول ولا قوۃ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔ قبر میں سے کوئی کسی کو بلاتا ہے اور میں ہوں بھی کون کہ مجھے بلایا جائے۔ میں امیر جان کے ساتھ سرسری جان پہچان کا بھی دعوے دار نہ ہو سکتا تھا۔ تو کیا یہ آسیبی کارخانہ ہے؟ میری زبان پر بے اختیار آیت الکرسی جاری ہو گئی۔ پھر میں نے معوذتین کا ورد کیا۔ پھر آیت الکرسی کی تلاوت کی۔ معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قرآنی آیتیں اتنی پڑھ ہی میں چکا ہوں، انھیں کو فاتحہ قرار دے کر ایصالِ ثواب کروں اور الٹے پاؤں.... مگر اس روشنی میں عجب سی کشش ہے یا پھر یہ سب میرا وہم ہے۔ کیا معلوم سیدی مولیٰ صاحب جیسا کوئی صاحب تصرف یہاں بھی دفن ہو اور کسی بنا پر اثر ان کا مجھ پر ہو رہا ہو۔ یہاں سے چل لینا ہی.... میں نے جلد جلد دل ہی دل میں امیر جان کو ایصال ثواب کیا۔ یا اللہ اگر یہ کوئی کارخانہ آسیب کا یا نعوذ باللہ عذابِ قبر کا ہے تو اپنے حبیب کے صدقے تو اس اپنی ناچیز بندی کو

اس مصیبت سے، اس قہر سے نجات دے دے۔ میں نے منت مانی کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ امیر جان پر کوئی عذاب نہیں ہے اور یہ روشنی آسیبی نہیں ہے تو یہاں سے اٹھتے ہی سلطان جی صاحب کے مزار پر پورے ساڑھے تین سوتنکوں کی دیغ پکوا کر محتاجوں کو کھلاؤں گا۔ مگر دل میرا یہاں سے نہ جانے کو بھی چاہ رہا ہے۔ ذرا اور جھک کر دیکھوں کہ اندر کیا ہے۔ اب جو غور کرتا ہوں تو پہلوئے قبر میں کوئی شگاف نہیں بلکہ چور دروازہ سا ہے بالکل ٹھیک ٹھاک بنا ہوا اور روشنی بھی کچھ ایسی ہے گویا کئی شمعیں فانوسوں میں روشن ہوں اور یہ تو کچھ زینہ سا ہے اندر اترنے کا، جیسا کہ تہ خانوں میں ہوتا ہے۔ میرے قدم خود بخود اٹھتے جا رہے ہیں، بڑھتے جا رہے ہیں۔ میں چور دروازے میں داخل ہو گیا ہوں۔ اب میں نیچے اتر رہا ہوں۔ کہیں وہ چور دروازہ بند تو نہ ہو جائے گا؟ مجھے علاء الدین کا جادوئی چراغ یاد آیا۔ جب علاء الدین نے چراغ دینے سے انکار کیا تو اس کے ماموں.... نہیں.... اس کے چاچا نے غار کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا اگر یہ چور دروازہ بھی بند ہو گیا تو.... لیکن مجھے کون سی چیز وہاں سے لا کے کس چاچا ماما کو دینی ہے مجھے کاہے کا ڈر لیکن اگر دروازہ بند نہ ہوا غائب ہو گیا؟ پھیر میں واپس کیونکے آسکوں گا؟ واپس لوٹ چلتے ہیں۔ ابھی تو چور دروازے سے آتی ہوئی باہر کی روشنی دکھائی دے رہی ہے ابھی وقت ہے۔

باب پنجم

بہت بڑا، دور تک پھیلا ہوا، باغ۔ اس میں نہریں اور حوض اور مرمریں فوارے چھلچھلاتے ہوئے ہلکے کیوڑے کی آمیزش لیے ہوئے، معطر، پانی کی بوندوں سے روشن۔ شاخساروں میں بلبلیں اور کئی ایسے پرند جنھیں میں پہچانتا نہیں، چہچہاہٹ پوری فضا میں ٹھنڈی پھواریں چھوڑ رہی ہے۔ سرخی مائل بالوں والی گلہریاں درختوں میں آنکھ مچولی کھیل رہی ہیں۔ سامنے مرغزار کا سا سماں، سفید ہرن، چیتل، خرگوش، مور، سرخاب، آ آ کر حوض سے پانی پی رہے ہیں۔ ایک ہرن پانی پیتے پیتے ٹھٹک کر رک گیا ہے اور لمبی موہنی گردن کو موڑ کر بڑی بڑی حیرت زدہ آنکھوں سے کچھ دیکھ رہا ہے۔ دور آسمان میں بڑے بڑے پرند، عقاب اور سیمرغ جیسے، لیکن ان سے کسی کو گزند کا خوف نہیں۔ ایک دو عقاب کبھی غوطہ مار کر نیچے آ جاتے ہیں تو ان کا سایہ پانی میں پڑتا ہے، ہرن شاید اسی سے بھونچکا ہو گیا ہے۔

> عجب پُر بہار باغ ہے کہ بہار کو بھی اس بہار پر داغ ہے۔ نخل سرسبز و شاداب، جوبن پر گلاب، نسرین و نسترن بشکل معشوقانِ پُرفن، سرو و شمشاد جس سے قدِ محبوب کی یاد، رنگ گلہائے چمن شکل عارض محبوب گلبدن۔ ہوائے سرد چل رہی ہے، نشۂ بادۂ محبت سے لڑکھڑاتی ہے، ہر ایک شاخ شجر سے سر ٹکراتی ہے، لیکن دبے پاؤں چل رہی

ہے۔خیال ہے کہ ایسا نہ ہو پاؤں کی دھمک سے گرد اڑے اور عارض گل پر پڑے۔ نہریں بصد آب وتاب جوش زن، بہار پر ہر چمن، جام وصراحی موجود، اپنے رنگ پر ثمر ہائے امرود۔شراب شبنم سے جامِ لالہ مملو ہے، اور مشک وعنبر کی اس میں خوشبو ہے۔قمریاں نخل سرو پر بصد رعنائی و زیبائی بیٹھی ہیں۔صدائے حق سرہٗ بلند، قلندر مشرب صدائے کوکو سے دردمند۔صاف ثابت ہوتا ہے کہ کوئی درویش گوشہ نشیں یا ہو!یاہو! کر رہا ہے۔لباس خاکستری زیبِ جسم، ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف ہے۔ اس کی صدائے حق سرہٗ پر ناپائداریٔ دُنیا موقوف ہے۔

(نوشیرواں نامہ،جلد اول،از شیخ تصدق حسین،ص 19)

میں بڑھتا چلا گیا۔حیرت کی بات یہ بھی دیکھی کہ سارے باغ میں باغبانیاں ہی باغبانیاں تھیں، ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار، اور مرد باغبان کوئی نہ تھا۔نظر کی حد سے ذرا ادھر ایک بہت بڑی عمارت تھی۔ میں نے دو ہی چار قدم بڑھائے تھے کہ عمارت بالکل نزدیک آ گئی۔امیر جان کی حویلی، ہو بہو جیسی میں دہلی میں ابھی دیکھ کر چلا آ رہا تھا۔فرق صرف یہ تھا کہ حقیقی حویلی بھورے اور سیاہی مائل سرخ پتھر کی تھی اور یہ حویلی سفید سنگ مرمر کی تھی۔ جیسے ٹھنڈے دودھ سے بھری چینی کی صراحی، اس قدر تری اور خنکی تھی کہ جی چاہتا تھا اٹھا کر منھ میں رکھ لیجیے۔سامنے ہاتھی ویسے ہی جھوم رہے ہیں۔تھوڑی دور پر جمنا اسی طرح بہ رہی ہے۔گھاٹ پر نہانے والے کوئی نہیں ہیں لیکن بجرے، بادبانی کشتیاں، بار بردار جہاز، سب حسبِ معمول رواں۔ہم لوگ پہلی بار حویلی اصلی پر گئے تھے تو دن کا وقت تھا لیکن اس وقت شام لگتی تھی۔اردا بیگینوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔میں درانہ اندر گھستا چلا گیا۔ویسا ہی گلیارا، دائیں طرف ویسا ہی تنگ اور اونچا زینہ، لیکن اس بار ہر طرف وہی ہلکی سبز، کچھ نیلی گلابی روشنی، روشنی۔گرمی یا حرارت کا بالکل شائبہ نہ تھا۔اس بار جی نے کہا کہ گلیارے میں دھنسنے سے پہلے زینوں پر چڑھ کر دیکھوں وہاں سے کیا نظر آتا ہے۔

خلافِ توقع اس بار زینہ بالکل روشن تھا۔جوں کر روشنی میرے پیچھے پیچھے ہو، ساتھ ساتھ ہو کہ جہاں جاؤں وہاں روشنی پہلے ہی پہنچ جائے۔مجھے بڑا ڈر لگا۔یہ کیا اسرار ہے۔جناتی کارخانہ ہے یا کچھ سحر و ساحری کا چکر ہے۔مجھے آگے بڑھتے ہی جانا تھا، نہ جانے کیوں واپسی کا خیال اب میرے دل سے محو ہو چکا

تھا۔ پیچ دار زینہ لیکن تنگ نہیں، جیسے کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے اندر جانے کے لیے زینے تنگ تھے تو کیا یہ لاٹھ تھی اور بہت موٹی، چوڑی؟ میں نے سیڑھیاں گننی شروع کیں مگر جلد ہی گنتی فراموش ہونے لگی۔ ہر دس بیس زینہ چڑھنے پر لگتا میں گنتی بھول گیا ہوں۔ یاد کرنے کی کوشش کرتا تو اور بھی خلجان ہوتا کہ سیڑھیاں گننا بلکہ سیڑھیاں چڑھنا درست ہے بھی نہیں۔ میں کتنی ہی سیڑھیاں طے کرلوں، انجام کچھ نہ ہوگا۔ میرا جی متلانے لگا اس خیال سے اب میں تا قیامت سیڑھیاں ہی چڑھتا جاؤں گا لیکن اب تو مراجعت کی بھی ہمت نہ تھی۔ میں نے ایک شخص کے بارے میں سنا تھا کہ اس نے شرط بدی کہ سامنے والے بہت ہی اونچے پیڑ کی پھنگ تک چڑھ جاؤں گا۔ درخت اتنا تنومند تھا کہ پھنگی بھی اس کی بہت موٹی معلوم ہوتی تھی لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ پھنگی تک پہنچنے کے لیے جس ڈال پر چڑھنا ضروری تھا وہ ٹوٹی ہوئی ہے۔ آگے جانا غیر ممکن ہو گیا تھا۔ اس کا دل مایوسی سے بھر گیا لیکن اس نے گھوم کر نیچے دیکھا تو زمین بہت دور لگی، اتنی دُور کہ اس کے پاؤں لرزنے لگے۔ اتنی دُور نیچے کس طرح اتروں گا میں۔ اس کا دل مایوسی اور خوف سے بھر گیا اور وہ چلانے اور رونے لگا کہ بچاؤ بچاؤ میں گرا جاتا ہوں۔ بالآخر اس کے دوستوں اور گاؤں والوں نے سیڑھیاں لگا کر اور رسیاں اوپر پھینک کر اسے بہزار خرابی نیچے اتارا۔

لیکن یہاں تو کوئی دوست کوئی گاؤں والا نہیں ہے۔ میرا کیا ہوگا؟ اچانک زینے ختم ہو گئے، سامنے کھلی ہوئی چھت تھی جس پر وہی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں چار قدم آگے بڑھا۔ دور قطب صاحب کی لاٹھ صاف نظر آتی تھی، تو میں ابھی اسی قبرستان میں ہوں؟ سامنے میرے ایک بارہ دری مرمریں، دالان میں ایک دروازہ کھلا اور میں اندر چلا گیا۔

وہی منظر، قسم ہے اللہ کی بالکل وہی منظر تھا۔ امیر جان کسی سلطان کی طرح صندلی پر متمکن، پیچھے دو خواصیں مورچھل لیے ہوئے، دائیں بائیں اردابیگنیاں۔ کہیں پردے کے پیچھے ارغنوں بج رہا تھا۔ کوئی دھیمے سروں میں گا رہا تھا۔ ہلکے سروں کی بوندیاں پڑ رہی تھیں۔ ہر طرف عطر کی دھیمی دھیمی پھوار برس رہی تھی۔ دُور کہیں چڑیاں زفیل رہی تھیں، لیکن اس بار میں نے پہچانا کہ وہ لال تھے جو برسات میں خوب بولتے ہیں۔ لگتا تھا زفیلیں ان کی چھت کے اوپر سے آ رہی ہیں۔

''ل.... لی.... لیجیے، میں آپ ک.... کا ق.... قرضہ و.... واپس کرنے....'' بدقت میرے منھ سے نکلا۔

لیکن میری بات ختم ہونے کے پہلے ہی امیر جان گویا خواب سے چونکیں۔ ان کے چہرے پر برہمی اور بیزاری کے آثار نمایاں ہوئے۔ وہ ساری نرمی چہرے کی اور نزاکت بشرے کی مبدل بہ سختی ہوگئی۔

''تم یہاں کیسے آئے؟ تم یہاں کیوں آئے؟ چلو، فوراً باہر نکلو۔'' انھوں نے کچھ اس طرح کہا گویا مجھے پہچانتی ہی نہ ہوں۔

''جی.... میں.... میں گل محمد ہوں، خان دوراں کے دستے میں ملازم ہوں.... ملازم تھا۔ آپ نے....''

اب ان کی بیزاری اور بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ انھوں نے صرف رخ پھیر کر بلکہ پہلو میری طرف سے موڑ کر اردابیگنیوں کی طرف دیکھا اور چیں بجبیں ہو کر حکم دیا:

''کھڑی دیکھتی کیا ہو؟ جانتی ہو نا محرم کو یہاں آنے کی اجازت نہیں۔ اسے دھکے دے کر نکالو، دفع کرو اسے۔''

دونوں میں سے ایک اردابیگنی خنجر ہاتھ میں لے کر میری طرف بڑھی۔ دوسری نے ہلکے سے تالی بجائی تو کئی اور بھی پردے کے پیچھو سے نکل آئیں۔ پہلی اردابیگنی چار قدم میں میرے سامنے آگئی تھی اور میں مارے استعجاب اور خوف کے وہیں جم کر رہ گیا تھا۔ پھر اس خنجر زن کا حُسن بھی ایسا تھا کہ رئیس بھی اچھے اچھے مبہوت ہو جاویں۔

''چلو، ایوان خالی کرو ورنہ پیٹ میں خنجر اتار دوں گی۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا اور اشارہ دروازے کی طرف کیا۔

مجھ پر جیسے عالم خواب طاری تھا۔ ارادہ اور ادراک سلب ہو گئے تھے۔ قاتل اس خنجر گذار پر سے نگاہ نہ ہٹتی تھی۔ اتنے میں کئی اور اردابیگنیاں جو پردے سے باہر آئی تھیں میرے چاروں طرف حلقہ زن ہو گئی تھیں۔ ان میں سے ایک زنگن تھی، مجھ سے بہت زیادہ قد آور تھی۔ اس نے میرا شانہ ہلایا جیسے سوتے کو جگاتے ہیں اور ہلکے سے مجھے دھکا دیا۔

میں گویا آپ سے آپ چل پڑا اور آپ سے آپ ہی زینے اتر گیا۔ اس بار زینے پیچدار نہ لگتے تھے۔ وہی زنگن میرے پیچھو پیچھو آئی۔ روشنیاں پہلے ہی کی طرح میرا تعاقب کر رہی تھی۔ نیچے اندرونی دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ زنگن نے دروازے کو اپنی طرف کھینچ کر کھولا اور کچھ کھلنڈرے سے انداز میں

میری پیٹھ تھپتھپا کر ہلکے سے باہر دھکیلا گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو کہ اگر وقت اور جگہ مساعد ہوتی تو....

صدر دروازے کے سامنے وہ باغ اب نہ تھا یا شاید میں کسی اور دروازے سے باہر کیا گیا تھا۔ نغموں اور چہل پہل سے فضا گونج رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے مڑ کر طرف زنگن کے دیکھا، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ دروازہ اس طرح تیغا ہو گیا تھا گویا کبھی کھلا ہی نہ تھا۔

بازار، بہت روشن اور پُر رونق بازار۔ حُسن اس بازار کا کیا بیان کروں۔ جوانان رعنا، خوبصورت، حسین و جمیل، ہر طرف اینڈتے پھرتے ہیں۔ چادروں میں سے جن کی حُسن کی روشنی پھوٹتی ہے ایسی زنان جمیلہ، پالکیوں اور محافوں کے غرفوں سے لگی ہوئی بڑی بڑی سیاہ، شربتی، جامنی آنکھیں، کبھی کبھی جھلک مار دیتی ہیں تو دل دماغ میں فرحت دوڑ جاتی ہے۔ دکانیں جنس اور مال اور سامانِ تجارت سے پٹی پڑی ہیں۔ ہجوم خریداروں، مول بھاؤ کرنے والوں کا، اور آزاد ٹہلتے ہوئے بےفکروں کا۔ بیچ میں بازار کے ایک نہر، تازہ خوش گوار پانی کی رواں، اس کے دو رویہ درخت پھولوں اور پھلوں سے لدے ہوئے مگر کسی کو یارائے گل چینی نہیں۔ ثمر ہائے شیرین و پختہ کو ملازمان شاہی چن چن کر توڑتے اور مونج کی سبد میں اکٹھا کرتے ہوئے۔ نہر کا پانی خس و خاشاک سے پاک آئینے کی مانند۔ باغبانیاں، گری ہوئی پتیوں اور پنکھڑیوں کو جال سے سمیٹتی ہوئی۔ کیا مجال جو کوئی بےخیالی میں بھی کوئی تنکا، کوئی خاش، کوئی دھجی، نہر میں ڈال دے۔ محتسبان بازار کا یہ بھی ایک کام ہے۔ سونٹے لیے ہوئے پھرتے ہیں۔ جہاں کسی نے ایک دھجی بھی گرائی، سونٹا لہرا کے اس سے کہا کہ اُٹھا، ورنہ پیٹھ لہولہان کر دوں گا۔

دُور بازار کے ایک سرے پر ایک قصر فلک جناب، سرخ پتھر کا بنا ہوا گویا کوئی جوان رعنا اور قوی ہیکل ہو جس کے گالوں سے خونِ شباب ٹپک رہا ہو۔ اس کے سامنے کھلا میدان جس میں بھانت بھانت کے لوگوں کا جم غفیر۔ ہر چند کہ بازار میں دُنیا جہان کی تحفہ تحفہ چیزیں فروخت ہو رہی تھیں، میرے پاؤں خود بخود اس قصر کی طرف کھنچ گئے جس کے سامنے میلہ سا لگا ہوا تھا۔ تین طرف نہر، سامنے سے کھلا ہوا وہ چوک نہ تھا، نمونہ اور خزینۂ عجائبات تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ امیر جان کی سفید حویلی اور وہ باغ و سبزہ نظر آتے ہیں کہ نہیں مگر وہاں تو دُور تلک بازار ہی بازار تھا۔ سامنے نفیری اور شہنائی بج رہی تھی، ایک طرف مرغے لڑائے جا رہے تھے۔ ایک جانب ٹھیلے پر ٹھاٹر سا باندھ کر چڑیوں کے رہنے بسنے کے لیے کھوکھے اور چھتیاں لگی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے پالتو پرند، لال، پدڑی، کوئل، بلبل، ہزار گلا، پیلک، سفید قمری، لال قمری، فاختہ، سرخ

اور کالے رنگ کی مہوکی، اور نہ جانے کتنے انھیں کی طرح کے جانور، ان چلتے پھرتے بسیروں میں اور ان کے آس پاس اڑتے پھرتے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا کہ انھیں جنگل سے پکڑ کر سدھایا گیا ہوگا۔

تانپورے پر سر سدھ رہے ہیں۔ گھونگھرو کی چھن چھن، چھنا چھن بھی دھیرے دھیرے سنائی دے جاتی ہے۔ فارسی عربی پڑھا ہوا ہونے کے باعث مجھے شعر و شاعری سے تو تھوڑی بہت رغبت ایک زمانے میں ضرور تھی، پر گانے بجانے، رقص و غنا سے محض تماش بینوں اور شوقینوں والا رشتہ تھا۔ سریلی آواز سن کر کان متوجہ بے شک ہو جاتے تھے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک بڑے سے لکڑی کے چبوترے پر فرش بچھا ہوا، اور اس کے اوپر پال کی چھت، چاروں طرف گجروں اور پھول ہار کا جوش۔ سارا ماحول روشنیوں سے جھل جھلاولا ہو رہا تھا۔ لکڑی کے چبوترے پر ایک بارہ چودہ برس کے سن کی لعبت کافر و مومن فریب جلوہ ریزی حُسن و غنا کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

وہ کافر حُسن پر تھی اپنے مغرور — سراپا مثلِ برقِ شعلۂ طور
بھرا سینے میں جوشِ نوجوانی — زباں مصروف لفظ لن ترانی
قد موزوں سراپا نور میں غرق — برنگ مصرع برجستہ برق
عیاں ہر عضو سے شانِ قیامت — سراپا جان و ایمان قیامت
دمِ رفتار گرتا ہے قدم پر — بجائے سایہ رنگ روئے محشر
وہ کافر زلف یا دود جگر ہے — دل زاہد سے بھی تاریک تر ہے
غضب ہے جا کے پھر آنا ادھر کا — اثر ہے زلف میں تار نظر کا
وہ پیشانی کہ جس کا بدر مشتاق — درخشاں کوکب اقبال عشاق
ہمیشہ دیکھ کر شام و سحر کو — کہے لی ساجدین شمس و قمر کو
ہر اک ابرو ہے تیغ خوش نظارہ — سراپا جوہر موج اشارہ
دم جنبش ادا اس فتنہ گر کی — مبارک باد ہے زخم جگر کی
خمار آلودگی آنکھوں سے پیدا — نظر سے کیف مستانہ ہویدا
نگاہِ مست پھرتی ہے جدھر کو — غشی آتی ہے مایوس نظر کو

وہ مژگاں وقت آرائش کریں گھر — دل آئینہ میں مانند جوہر
کنار بام وہ رخسارۂ پُرنور — نظر آتے تھے جیسے شعلۂ طور
یہی کہتا ہے ہر مشتاق مضطر — سوا نیزے پہ ہے خورشید محشر
دہن گرداب صہبائے معانی — زباں موج شراب لن ترانی
تبسم بن کے ہر لب سے ہویدا — تقاضا شوخیٔ طبع جواں کا
زنخداں جلوہ گر مانند گرداب — برنگ آب گوہر خشک و سیراب
صفت گردن کی افزوں حوصلے سے — وہی جانے جو لگ جائے گلے سے
ہر اک شانہ برنگ دستہ، گل — زیارت گاہ صبح عید بلبل
عیاں سینے سے آغاز جوانی — نمو پستاں کی غماز جوانی
نزاکت سے عجب عالم کمر کا — گماں سب کو رگ تار نظر کا
کسی صورت نظر آتی نہیں صاف — مگر ہے خلق کو میم کمر ناف
ہر اک زانو طرب انگیز عشاق — بظاہر جفت خوبی میں مگر طاق
نمایاں پائچے سے ساق پُرنور — تہ فانوس جیسے شمع کافور
بہار حُسن ہے جوش صفا سے — عیاں رنگِ حنا ہے پشتِ پا سے

(نوشیرواں نامہ، جلد اول، از شیخ تصدق حسین، ص258 تا259)

اس کے بعد مجھے خبر نہ لگی کہ اس قاتل عالم کی جلوہ گری کب تک رہی، اس نے کیا گایا اور کیا ناچا۔ اگر ننگل خورد نہ ہوتا اور میرے بیوی بچے نہ ہوتے....

مجھے جھرجھری سی آئی۔ آنکھ سی کھل گئی۔ کیا وہ صحبت خواب تھی؟ نہیں، ابھی لوگ پہلے ہی کی طرح آ جا رہے تھے، تماش بین بھی کئی موجود تھے۔ ایک طرف تیغ زن اپنے فن کی نمائش کر رہے تھے، ایک طرف ریچھ والا اپنے ریچھ اور اس کے بچے کے ساتھ مجمع لگا رہا تھا۔ حسینوں اور معشوقوں کا جوش حسبِ دستور تھا۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔ کل صبح تک متعین کرنا ہے کہ دہلی میں رہوں یا گاؤں واپس جا کر زر اندوختہ کو کسی کاروبار میں لگاؤں۔

مگر واپسی کس طرح اور کدھر سے ہو؟ یہاں تو سارے کارخانے جناتی سے لگتے تھے۔ کیا مجھے قدرتِ خدا سے کسی نئے شہر میں پہنچا دیا گیا ہے اور مجھے اب یہیں رہنا ہے؟ پھر میرے گھر بار بیوی بچوں، بوڑھی ماں، ان سب کا کیا ہوگا؟ پر یہ شہر نیا شہر ہے کہ کچھ اور؟ اگر نیا شہر ہے تو میں امیر جان کی قبر میں داخل ہو کر یہاں کیونکر پہنچا؟ اور امیر جان کی حویلی کے بالا خانے سے جو شہر مجھے دِستا تھا وہ تو دہلی ہی تھا.... قطب صاحب کی لاٹھ اور کہیں تو ہے نہیں۔ مانا جو ندی میں نے دیکھی وہ جمنا نہ تھی، مگر وہ لاٹھ تو قطب صاحب ہی کی تھی۔ کیا پتہ قدرت کے کارخانے میں کہیں کوئی اور قطب صاحب بھی ہوں، ان کی لاٹھ بھی ہو، بس وہ سلاطین و حاکمان نہ ہوں جو دہلی میں ہوگذرے تھے۔ اور کیا پتہ وہ حاکمان بھی ہوں، ہوگذرے ہوں۔ تو امیر جان مجھے کیونکے ملیں؟ اور یہاں کیونکے ملیں؟ کیا امیر جان بھی ایک سے زیادہ تھیں اور جو یہاں مریں وہ کوئی اور تھیں؟

بات سمجھ میں کچھ نہ آتی تھی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے گھبرا اِدھر اُدھر نگاہ کی۔ کوئی برف والا، قفلی والا یا کوئی عطار ملے تو مداوا اپنی گردشِ سر کا کروں، مگر دائیں بائیں جلد جلد سر گھمانے سے گھوم اور بھی فزوں ہوئی۔ میں چرخ کھا کر گرا اور بیہوش ہوگیا۔

پتہ نہیں میں کب تک بیہوش رہا۔ مجھے تو لگا کہ فوراً ہی طبیعت بحال آگئی ہے، مگر جب آنکھ کھلی تو وہ میلہ نہ تھا۔ امیر جان کی قبر کے چور دروازے کو جاتی ہوئی روش البتہ صاف دِستی تھی۔ میں سرپٹ روش پر دوڑا کہ کہیں حال پھر دگرگوں نہ ہو جائے۔ بہت جلد زینے طے کر کے میں چور دروازے سے باہر آگیا۔ میں نے دیکھا تو نہیں، مگر مجھے لگا کہ میرے پیچھے دروازہ بند ہوگیا اور وہ روشنیاں بھی غائب ہوگئیں۔ کچھ دور پر سید بھورے شاہ صاحب یا شاید بابا نظام الدین سلطان جی صاحب کی چوکھٹ پر بہت اونچائی پر ایک دیا البتہ روشن تھا۔ شام ہو رہی تھی۔

باب ششم

شام، نہیں.... بالکل نہیں.... شام کا کوئی محل نہ تھا۔ میں اس قبر (جو بھی اسے کہیں) کے اندر بہت سے بہت دو یا ڈھائی ساعت رہا تھا اور جب داخل ہوا تھا تو زیادہ سے چار گھڑی دن چڑھا تھا۔ ظہر کا وقت بھی دُور تھا، مغرب کا کیا سوال تھا۔ میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سارے قبرستان میں جھاڑیوں، جھنڈیوں، خاردار جھڑ بیریوں، برووں اور مہندی کے گھنے جھنڈ سے ڈھکے ہوئے قطعاتِ زمین کے سوا کچھ نہ نظر آتا تھا۔ قبریں سب نابود ہو چکی تھیں یا اگر تھیں تو جھاڑ اور جھاڑیوں تلے دب کر غائب ہو چکی تھیں۔ میں نے سراسیمہ ہو کر امیر جان کی قبر کی طرف دیکھا مگر وہاں تو کوئی قبر نہ تھی۔ مانا کہ ان کے مزار کی لوح بہت اونچی نہ تھی لیکن دکھائی تو دیتی تھی۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہ تھا اور وہ سلطان جی کے نام پر لگائی ہوئی وہ سبیل اور اس سے ملحق کنواں کدھر تھا؟ یہیں بس یہیں تو تھا۔ اسی سبیل سے میں نے امیر جان کی قبر کی شناخت کی تھی۔

میں نے گھبرا کر اندھادھند بھاگنا شروع کیا لیکن صاف راستہ کیا، تنگ جادہ بھی نہ دکھائی دیتا تھا اور اگر کہیں افراتفری میں پاؤں میرا کنویں میں جا رہا تو.... میں رک گیا، جیسے کسی نے بھاگتے گھوڑے کی راس کھینچ لی ہو مگر یہاں سے باہر تو نکلنا ہی تھا۔ کیا رات یہیں گذاروں گا اور خدا جانے کن کن طرح کی بلاؤں اور عفریتوں اور جناتوں کا شکار بن جاؤں گا۔ میں نے جی کڑا کر کے پھیرا اپنے گرد و پیش دیکھا۔ وہ کنواں تو اب ہرگز وہاں نہ تھا۔ شاید اس کا پانی ٹوٹ گیا ہو تو کسی نے بند کرا دیا ہو۔ م.... مگر.... مگر اتنی جلدی کک.... کیسے سوکھ گیا ہو گا آج صبح ہی کی تو بات ہے کہ میں کنویں میں.... نہیں نہیں.... قبر میں اترا تھا.... نہ جانے کون

سی منحوس گھڑی تھی وہ جب میں نے.... میں نے.... کیا؟ میں نے تو کچھ بھی نہ کیا تھا۔ قرض ہی تو لیا تھا۔ میں نہ دُنیا میں پہلا احدی تھا اور نہ پہلا شخص بیٹی بیاہنے کا جو باپ ہو۔ کیا بیٹی کو بیاہنے کے لیے قرضہ لینا کچھ گناہ ہے؟

میں نے پھونک پھونک کر دیکھ بھال کر قدم رکھنا شروع کیا۔ جس اونچی روشنی کا ذکر میں نے کیا ہے کہ قبر.... قبر سے باہر آ کر جسے میں نے دیکھا تھا، اسے خوب دھیان میں رکھ کر اس کی طرف چلنے لگا۔ چلنے کیا لگا، کہیں خود کو کھینچ کر آگے بڑھاتا، کہیں دونوں ہاتھوں پر پگڑی لپیٹ کر اپنے ہاتھوں سے خارزاروں میں راستہ بناتا، کہیں بلامبالغہ چاروں ہاتھ پاؤں کے بھل، سر اور منھ کو چھپا کر بس اندازہ لگا کر آگے بڑھتا۔ ان خار زاروں بلکہ جہنم زاروں میں بچھو تو کیا ہوں گے لیکن زہریلے گرگٹوں اور سانپوں کا ڈر بے شک تھا۔ پر میں تو تقدیر اپنی پہلے ہی ٹھونک چکا تھا۔ سانپ سے ڈسوانا آپ کو منظور تھا مگر اس قبرستان میں بلکہ اس کے محاذ میں بھی ٹھہرنا منظور نہ تھا۔

بارے میں باہر آیا۔ اندھیرا خوب پھیل چکا تھا۔ اب جب میں مسطح زمین پر تھا تو وہ روشنی کچھ اور واضح دکھائی پڑتی تھی۔ سیدی مولیٰ صاحب کا مزار کہیں درختوں کے پیچھو چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسی روشنی کو مشعلِ راہ بنا کر بڑھنا شروع کیا۔ حضرت سلطان الاولیا کی درگاہ اور سیدی مولیٰ صاحب کے مزار کے بیچ میں صرف بھورے شاہ صاحب تھے اور باقی سب جنگل تھا۔ بھورے شاہ صاحب کی بھی ایک جھلک اب دکھائی دی۔ اِکا دُکا چراغ روشن تھے مگر وہ اونچی روشنی ابھی دُور تھی۔ جنگل میں پہلے ایک پگڈنڈی ان دونوں کو ملاتی تھی پر اب کچھ سڑک سی بن گئی تھی۔ اِکا دُکا مزار اور دروازے بھی نظر آتے تھے۔ پہلے، پہلے کیا معنی؟ کیا میں یہاں بہت دیر کے بعد آیا ہوں؟

سلطان جی صاحب کا دروازہ سامنے تھا۔ بلند روشنی کی کرنوں نے درگاہ کی چوکھٹ کو منور کر دیا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ بہت سے لوگ مغرب کی نماز پڑھ کر حضرت امیر خسرو کی درگاہ پر قوالیاں سن رہے تھے۔ کچھ تو فارسی میں قوالیاں تھیں اور کچھ کسی ایسی زبان میں تھیں جسے میں ہندی کے طور پر سمجھ لیتا تھا لیکن مجھے لگا کہ میں اسے بول نہیں سکتا مگر یہ ملک تو ہند ہی ہے، یہ شہر تو دہلی ہی ہے.... اچھا ان لوگوں کے لباس بھی کچھ مختلف تھے۔ بڑی مہری کے دوبر کا پائجامہ، سر پر پگڑی، لیکن بدن پر کُرتے کے اوپر کوئی لباس تھا جس کی آستینیں آدھی تھیں اور کچھ کی آستینیں پوری تو تھیں لیکن اوپر سے لمبائی میں آدھی کٹی ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں کے برخلاف ان کے کُرتے رنگین پھولدار اور پائجامے رنگین دھاریوں والے کپڑوں کے تھے۔ میں نے غور کیا تو

کپڑے نہ سوتی تھے نہ ریشمی، کچھ ملواں بناوٹ کے تھے۔ مجھے وہ کپڑے خوبصورت مگر عجیب لگے کیونکہ ہم لوگوں میں مرد ہمیشہ رنگین لیکن بھاری رنگوں والے ماشی، سیاہی مائل سبز، مونگیا، تیلیا رنگ کے کُرتے پائجامے پہنتے تھے۔ ہاں پگڑیاں ہماری طرح ان لوگوں میں سے کسی کی سیاہ، کسی کی سفید، اور زیادہ تر لوگوں کی رنگین دھاری دار تھیں۔

میں ہونقوں کی طرح درگاہ فلک اشتباہ کے سامنے کھڑا ایک ایک کا منھ تک رہا تھا۔ کچھ لوگوں نے شاید میرے لباس یا میری صورت کو اجنبی جان کر کبھی کبھی کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ شاید ایک دو ایسے بھی تھے جو ٹھٹکے، لیکن ٹھہرا کوئی نہیں۔ آخر میں نے ہمت کر کے ایک شخص کو بھلا آدمی جان کر سلام کے اشارے سے روکا:

''اے صاحب، ذرا ایک بات بتائیے گا۔''

اجنبی شخص مجھے غور سے دیکھتا ہوا ٹھہر گیا۔ میں کوئی سائل تو ہو نہ سکتا تھا، مسافر ممکن تھا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا:

''جی، فرمائیے۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اس کے لہجے میں ایک لوچ اور شیرینی تھی۔ آواز کے اتار چڑھاؤ میں جلدی یا رعونت کا شائبہ تھا۔ ان کے مقابلے میں مجھے میرا ہریانی لہجہ اکھڑ اور کرخت سا لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ان لوگوں کی طرح کی ہندی نہ بول سکوں گا۔ گڑبڑا کر میں نے فارسی میں کہا:

''آقائے من۔ ایں شہر دہلی می باشد، یا نہ؟'' مجھے اپنی فارسی اپنی ہندی سے بہتر لگی۔

اجنبی نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''چہ خوش گفتید آقائے من سلامت۔ ایں شہر البتہ دہلی می باشد۔ گمان تاں چیست؟''

''مگر.... مگر ایں ہمہ چنداں متلون است از آں دہلی کہ ما می شناختیم۔''

''قربان شما، آغا پس از چند مدت تشریف ایں جا آوردہ باشید؟''

میں اس کے جواب میں کیا کہتا۔ مجھے گھبراہٹ اور خلفشار ذہن کے باعث بڑے زور کا چکر آیا اور پھر میں دوبارہ ہوش کھو بیٹھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے اجنبی محسن کے گھر کے باہری دالان میں لیٹا ہوا تھا۔ حکیم صاحب آ

کے مجھے لخلخہ سنگھا کے اور کوئی مفرح دوا میرے منھ میں ڈال کے جا چکے تھے۔ دوا کا ذائقہ اب بھی میرے منھ میں تھا۔ تشخیص یہ تھی کہ ضعفِ معدہ اور ایک مدت سے بلاخورد ونوش رہنے کی وجہ سے نفخ بخارات معدے سے قلب کی جانب ہوا جس کی بنا پر فشارِ قلب نے دماغ کو متاثر کر دیا، ورنہ مجھے صرع یا اس جیسا کوئی موذی مرض نہ تھا۔ میں خوش ہوا کہ مجھے اپنی اصلیت بتانے کی ضرورت بھی نہ پڑی تھی۔ میرے اجنبی محسن نے، جن کا نام مجھے معلوم ہوا کہ حمید الدین تھا۔ گمان کیا کہ میں مسافر تھا۔ دہلی سے دُور ترین جگہ جو مجھے معلوم تھی وہ ملک سندھ میں ایک قصبہ عیسیٰ خیل تھا۔ پس میں نے یہی بتایا کہ میں عیسیٰ خیل میں ایک رئیس کے دروازے پر سپاہی تھا۔ اپنے حالات کی بہتری کی تلاش میں دہلی کل ہی آیا تھا اور فیروز شاہی سرائے میں ٹھہرا تھا۔ راستہ بھول جانے کی وجہ سے اور خلفشارِ ذہنی کی وجہ سے میں اپنی سرائے واپس نہ جا سکتا تھا اور رہبری کی تلاش میں تھا کہ اپنے مستقر پر پہنچ جاؤں۔

حمید الدین نے گمان کیا کہ مزار سلطان جی پر میری اوٹ پٹانگ باتیں دراصل میری پریشانی اور گم کردہ راہی کے بہ سبب تھیں۔ لہجے کا اختلاف اور فارسی گفتگو میں میری روانی کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں سندھ کا تھا اور پُورب پہلی بار آیا تھا لیکن دیر سے معدہ میرا خالی تھا، اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا، اس نے تعجب کیا ہو۔ اس سے زیادہ تعجب تو مجھے تھا۔ آخر صرف آج صبح ہی میں نے کچھ نہ کھایا تھا اور امیر جان سے ملنے چل کھڑا ہوا تھا۔ ان کے مزار میں (شاید وہ مزار تھا یا کچھ اور) مجھے بمشکل دو ڈھائی ساعتیں لگی تھیں۔ ایسے شخص کو کئی دن کا تو بھوکا نہ کہہ سکتے ہیں۔

میری پہلی مشکل یہ تھی کہ اس معاملے کا تصفیہ کیونکے ہو کہ میں دہلی میں تو تھا لیکن وہ دہلی اجنبی میرے لیے بڑی حد تک تھی۔ ایسا کیوں؟ یہ آسان لگا کہ حمید الدین سے سلسلۂ گفتگو یوں چھیڑوں کہ میرا راز نہ کھلے کہ میں درحقیقت کہاں کا تھا اور یہ مجھ پر کھل جائے کہ کیفیت اس وقت دہلی شہر کی کیا ہے۔ شکر اللہ کا کہ میرا یہ کہنا کہ میں عیسیٰ خیل میں دروازے کا سپاہی تھا، میرے لیے آسانی بھی پیدا کر گیا۔ حمید الدین نے جواب میں کہا:

''بہت خوب تو جناب ایک طرح سے ہم پیشہ میرے ہیں۔''

''جی وہ کیونکر؟''

''میں بھی گھڑسوار سپاہی ہوں، خان دوراں عبد الصمد خان صاحب کی ڈیوڑھی پر متعین ہوں۔''

''ڈیوڑھی'' یہ لفظ میرے لیے نیا تھا لیکن ''خان دوراں'' سے تو میں خوب واقف تھا۔

''تو کیا اسد خان بن مبارک خان اب خان دورانی سے ہٹ گئے؟''

''اسد خان بن مبارک خان؟ یہ خان دوراں کب تھے، مجھے نہیں معلوم۔ عبدالصمد خان تو عہدِ فردوس آرام گاہ محمد شاہ بادشاہ غازی کے وقتوں سے خان دوراں ہیں۔''

میرا سر پھر چکرانے لگا۔ میں نے خود کو بہت قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا:

''تو کیا خداوندِ عالم ابراہیم لودی اب سلطان دہلی نہیں ہیں؟''

ایک شکن گہری حمید الدین کے ماتھے پر آئی۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولے:

''آپ شاید کچھ بھولتے ہیں صاحب۔ ابراہیم لودی نام کا بادشاہ تو یہاں کبھی نہیں ہوا.... ہاں بابر بادشاہ نے ایک سلطان ابراہیم لودی کو شکست دے کر ملک ہند اس سے بزورِ شمشیر لے لیا تھا۔ ابراہیم لودی پانی پت میں مدفون ہے۔''

یک مرتبہ میری آنکھوں کے سامنے پھیر گہرا اندھیرا چھا گیا۔ ابراہیم لودی میرے خداوندِ عالم، میرے سلطان عالی مقام مدفون ہیں پانی پت میں؟ اور یہ شاہ و بادشاہ کا کیا مذکور ہے؟ ہمارے حاکمان خود کو سلطان ہمیشہ کہتے اور لکھتے تھے۔

میرے رنگ کو متغیر دیکھ کر حمید الدین نے کہا:

''جناب کا مزاج ابھی بھی برہم نظر آتا ہے۔ میری سمجھ میں تو آپ کچھ تناول فرمالیں اور یہیں لیٹ رہیں۔ کیا فرمایا تھا جناب نے، فیروز شاہی سرائے؟ اس نام کی سرائے سے بندہ واقف نہیں ہے لیکن ایک عرب سرائے کچھ فاصلے پر خواجہ صاحب سے متصل ہے۔ وہ مگر اب محلہ اقامت ہے، سرائے نہیں۔ ممکن ہے وہاں کچھ معلوم ہو جائے۔ کل وہاں جا کر دیکھیں گے۔''

''جہاں ہم ہیں اس جگہ کا نام کیا فرمایا تھا آپ نے مشفق من؟''

''جی یہ بدر پور کے مضافات میں کھڑکی گاؤں ہے۔ یہاں کی مسجد کا ذکر آپ نے سنا ہو شاید۔''

''کھڑکی!'' میرا دل بلیوں اچھلا۔ یہ جگہ تو میرے زمانے میں شہر سے بالکل باہر تھی اور لاٹ فیروز شاہ کی اور کوٹلہ فیروز شاہ کا یہاں سے بہت دور تھے۔ اب میرا یہ بہانہ کہ میں راہ بھول گیا تھا، اور قوی معلوم ہوگا مگر شکر خدا کہ اس وقت کی چیزیں بہت سی باقی ہیں۔ شاید فیروز شاہی سرائے بھی تغلق آباد اور بدر پور کی

سرحد پر ابھی باقی ہو مگر میرے سلطان ابراہیم سے لے کر اب تک زمانہ کتنا گذر چکا ہے، یہ کیسے معلوم ہو؟ جب میں گھر سے چلا تھا تو سنہ 1520 تھا، اب کس اٹکل سے معلوم کروں کہ یہ کون سا سنہ ہے؟ ابھی چپ ہی رہنا بہتر ہے۔ میں زبان اور ذہن پر پوری طرح قابو رکھے رہوں، اسی میں بہتری ہے۔ کل تک کچھ نہ کچھ کھل جائے گا۔ کیا معلوم وہ سرائے بھی اب بھی وہیں ہو؟

اللہ حمید الدین کا بھلا کرے، ان کے اصرار پر میں چند لقمے کھائے اور وہیں باہری دالان میں لیٹ رہا۔ میں نے انھیں راضی کر لیا کہ کل دن چڑھتے ہی میں ایک گھوڑا کرائے پر لے کر دہلی چلا جاؤں گا (نہ جانے اس بچارے گھوڑے پر کیا بیتی جسے میں قبرستان کے باہر چھوڑا تھا۔ کوئی لے ہی گیا ہوگا۔ اس سرائے والے کو شکایت رہ گئی ہوگی جس سے میں نے گھوڑا کرائے پر لیا تھا۔) حمید الدین کو میں نے پوری طرح یقین دلایا کہ اب ملاقات ہوگئی ہے تو ان شاء اللہ قائم رہے گی۔ میں کل تنہا ہی دہلی چلا جاؤں گا۔

گھوڑا میں نے کرائے پر لے تو لیا پر یہ خدشہ مجھے کھائے جا رہا تھا کہ بچارے اس بے زبان کا بھی وہی حشر نہ ہو جو کل والے گھوڑے کا ہوا تھا۔ میں جان بوجھ کر سیدی مولیٰ صاحب کے مزار اور اس قبرستان سے ہو کر گذرا جہاں کل والا واقعہ پیش آیا تھا۔ مزار کے چاروں طرف کچھ آبادانی تھی، بظاہر کچھ خانہ بدوشوں نے کبھی وہاں مسکن بنایا تھا اور وہیں رہ پڑے تھے۔ ساری آبادی پر خانہ بدوشوں کے طرزِ حیات کے علامات تھے۔ عورتیں بے پردہ، کم و بیش آدھا جسم عریاں، اونچا لہنگا اور اس پر ایک ہلکی سی چادر جس کے پیچھے بدن صاف نظر آتا تھا۔ ننگے سر، ننگے پاؤں، کانوں اور ناک میں بڑے بڑے بالے اور نتھ۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہوئی، مرد چارپائی پر اینڈتے ہوئے اور کسی قسم کی نالی کو ایک بند پیالے میں ڈالے ہوئے نالی کو منھ میں لے کر گڑگڑاتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے، توبہ کیا قبیح حرکت تھی، مگر سامنے کے قبرستان میں کوئی قبر، کوئی مزار، کوئی مجاور نہ تھا۔ میرا دل کانپ اٹھا۔ کل میں یہیں تھا۔ یہ کون سی جگہ ہے میرے اللہ۔ کیا امیر جان نامی کوئی تھی بھی کہ نہیں؟ کیا خود میں ہوں کہ نہیں؟ کیا میں کوئی بھوت یا آوارہ بے خانماں روح ہوں؟ مگر ہم مسلمانوں کو بھوت پر اعتقاد ہے نہ بے خانماں روحوں پر۔ ہمارا اعتقاد قبر پر، برزخ پر، جنت اور جہنم پر ہے اور حشر پر ہے۔ ہم میں سے کوئی کبھی بھوت پریت شیطان بدروح نہیں بنتا۔ لاحول ولا قوۃ۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اس وقت جو ہو رہا ہے شاید کسی بزرگ کا تصرف ہے۔ مجھے صبر کرنا اور حالات کے کھلنے کا

امیدوار رہنا چاہیے۔

غیاث پور، سیری، کیلوکھیڑی، یہ سب بڑی حد تک سنسان دکھائی دیے۔ سلطان جی کی درگاہ کے ذرا آگے بھورے شاہ صاحب کے مزار کے قریب لیکن ایک طرف کو ہٹی ہوئی۔ میں نے ایک بے حد بلند اور دلکش عمارت دیکھی، سنگِ مرمر اور سرخ پتھر سے بنی ہوئی، اس کا گنبد کچھ بالکل نئی وضع کا تھا، ذرا سا پیاز کی شکل کا، لیکن اس قدر متناسب اور موزوں کہ بس۔ چونکہ وہ عمارت ذرا مرتفع جگہ پر تھی اس لیے دُور سے بھی مجھے دکھائی دے گئی۔ کئی منزلیں اور چورویہ دالان تھے، بہت بلند کرسی اور ہر طرف وسیع اور پُر فضا باغ۔ سارے میں عجب فرحت اور ٹھنڈک برس رہی تھی۔ یہ کوئی قلعہ یا قصر تو ہو نہیں سکتا تھا، کسی کا مزار ہی ہوگا مگر مزاروں کے گرد ایسے باغ کہاں ہوتے ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے ایسی اولاد پیدا کی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مقبرہ اوّل مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کے بیٹے ہمایوں کا تھا اور اس کے کئی اخلاف بھی وہیں مدفون ہیں۔

بی بی فاطمہ سام کے مزار سے میں نے گھوڑا دائیں جانب بڑھایا۔ زیادہ تر وہی رنگ بے رونقی تھا جو پہلے دیکھ آیا تھا۔ ہر چند کہ میرے زمانے میں وہ شان پرانے شہروں کی نہ تھی جو اس وقت رہی ہوگی جبکہ سلاطین ان کے نے ان کی بنا ڈالی تھی۔ تاہم آج جیسا صحرائی ماحول نہ تھا۔ اب تو ایسا لگتا تھا کہ جنگل دھیرے دھیرے کر اپنی گذشتہ املاک واپس لے آیا ہو۔ منکا شاہ صاحب کے مزار پر سبیل ضرور یوں ہی تھی جیسی ان وقتوں میں تھی مگر اس کے گرد جو آبادیاں اس وقت تھیں اب بہت چھدرا گئی تھیں۔ شاید خواجہ صاحب کو جانے والوں نے یہ راہ چھوڑ کر کوئی نئی راہ بنالی تھی مگر قلعۂ کہنہ سے گذرتے وقت میں بے اختیار رو دیا۔ قلعۂ مبارک کا بڑا حصہ کھنڈر ہو گیا تھا۔ وہ بابِ عالی جہاں حاضری کے وقت شاہوں اور بڑے بڑے فوجی عہدہ داروں اور راجاؤں کے قدم لرزتے تھے، جہاں انھیں پانچ سو قدم پہلے ہی سواری چھوڑ کر پا پیادہ ہونا پڑتا تھا، جہاں سے وہ فرمان جاری ہوتے تھے جن کے دبدبے سے اربابِ اقتدار کی حویلیوں میں رعشہ پڑ جاتا تھا اب چند جھونپڑیوں سے دبا ہوا پڑا تھا۔ جہاں محلات تھے وہاں کھلا میدان تھا اور اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ گھانس ہر طرف اگ رہی تھی۔ اونچی گھانس میں کبھی کبھی کوئی خرگوش، کوئی لومڑی، کوئی چیتل جھلک پڑتا اور غائب ہو جاتا اور دیکھنے والے کو شک رہتا کہ وہ حیوان اس نے واقعی دیکھے بھی تھے کہ اس کی چشمِ خیال نے اسے بھرمایا تھا۔

میں دیر تک کھڑا آنسو بہاتا رہا، عربی شاعروں کی طرح جو اپنے قصائد میں ذکر کرتے ہیں دوبارہ گذرنے کا ان صحرائی فرودگاہوں پر سے جہاں ان کے معشوق نے کبھی رات قیام کیا تھا اور اب وہاں ایک دو

ادھ جلی لکڑیوں، ٹوٹی ہوئی طنابوں، ہوا میں پھٹ پھٹاتے ہوئے بوسیدہ اور موسم خوردہ خیموں کے پھٹے ہوئے سراپردوں کے سوا اب کچھ نہ تھا۔ ہائے ہائے انسان کس قدر ضعیف البنیاد ہے۔

اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ میرے سلاطین، میرے مربّی، میرے آقا، اب مملکتِ ہند کے مالک نہ تھے۔ اب وہ کہاں تھے، شاید قبروں میں آرام کرنا بھی انھیں نصیب ہوا کہ نہیں۔ میرے سامنے خداوندِ عالم سلطان بن سلطان ابراہیم لودی اپنے عظیم الشان باپ کا مقبرہ مکمل کرنے کا حکم صادر فرما چکے تھے۔ کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ یہیں کہیں سلطان جی کی درگاہ جنت نگاہ سے مغرب کو گوڑ گاؤں کی طرف جو راہ جاتی تھی، اس پر کوئی نیم فرسخ کی دوری پر وہ مقابر بن رہے تھے لیکن اب تو خود سلطان ابراہیم کا مزار دور پانی پت میں کہیں تھا۔ نہ معلوم لودیوں کے مزارات پورے ہو بھی سکے تھے یا نہیں۔

قلعۂ کہنہ کے آگے آبادی بڑھنی شروع ہوئی۔ فیروز شاہ کے کوٹلے تک آئے تو شہر کا سا سماں بننے لگتا تھا لیکن خود کوٹلہ پر کچھ نہ تھا۔ بس وہی لاٹ جو سلطانِ خلد آشیان نے کس جتن سے اور کس جرِ ثقیلی حکمت سے کام لیتے ہوئے دُور پنجاب سے اٹھوا کر یہاں نصب کی تھی، یوں ہی اپنے اونچے چبوترے پر فخر اور وقار کے ساتھ سرافراز کھڑی تھی۔ اب اطرافِ کوٹلہ میں آبادی اور بھی زیادہ ہو گئی تھی لیکن خود کوٹلہ سنسان پڑا تھا۔ میں نے کوٹلے سے کچھ آگے نکل کر گھوڑے کو دائیں جانب دریا کی طرف موڑا کہ فیروز آباد اسی طرف تھا۔

آبادی کے نام پر تو وہاں کچھ نہ تھا، چند جھونپڑے مچھیروں اور ملاحوں کے تھے۔ دریا بھی اب ذرا دور چلا گیا تھا اور اب گاؤں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ امیر جان کی حویلی بے وجود تھی، ہاں ایک دھنڈار سا ضرور آبادی کے سرے پر تھا، اسے ہی حویلی یا حویلی کا ماتم دار کہہ لیں تو کہہ لیں۔ اب میرا شک اور بھی پختہ ہو گیا کہ وہ زمانے اب کہیں بہت پیچھے چھوٹ گئے۔ میں نے اپنی ہمیانی کو ٹٹولا تو وہ بجنسہٖ موجود تھی، حاملہ عورت کی طرح سکوں سے بوجھل اور میری کمر سے لپٹی ہوئی، گویا اسے بھی خوف ہو کہ میں کہیں چلا جاؤں گا اور وہ دُنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ پچھلے وہ زمانے تھے ضرور، نہیں تو یہ سکے میرے پاس کہاں سے آتے؟

میں نے گھوڑے کا رُخ دریا سے متصل بائیں طرف سمت شمال میں موڑا کہ ادھر آبادی بہت نظر آتی تھی۔ ہر طرف سواریوں کی ریل پیل، بیل گاڑیاں، رتھ، دو پہیے اور ایک گھوڑے والی کھلی ہوئی گاڑیاں جن میں ایک یا دو یا تین مسافر پاؤں پھیلا کر آرام سے سفر کر رہے تھے۔ یہ سواریاں میرے وقت میں نہ تھیں اس لیے مجھے بہت دلچسپ اور انوکھی لگیں۔ کسی نے اسی وقت پکارا ''او میاں تانگے والے، او بھائی تانگے

والے ہوت!'' تو اس گاڑی کو ہانکنے والے نے مڑکر دیکھا اور رک گیا۔ اس سے میں نے جانا کہ اسے ''تانگہ'' کہتے ہیں۔ عجب بد وضع لیکن ظاہراً آرام دہ سواری تھی۔ پالکیاں، سجے ہوئے زرق برق محافے، ہاتھی، اونٹ، کیا نہیں تھا جو اس بازار میں رواں تھا جس کی سمت مَیں بھی رواں تھا۔ تانگے کی طرح سواریوں کی شق میں ایک نئی چیز اور دکھائی پڑی کہ جس کا نام مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ نالکی تھا۔ نالکی کیا تھی، لکڑی کا ایک منقش، رنگین اور مزین بلند گنبد تھی جس کے دروازے کے اوپر ایک اور بھی اونچا چھجا تھا کہ اندر بیٹھنے والے کو دھوپ سے بچاؤ رہے اور اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو ہوا بھی ملتی رہے اور اگر بارش ہو تو چھینٹیں اندر نہ آئیں۔

جس بازار کی طرف ان سواروں اور سواریوں اور پا پیادہ چلنے والوں کو میں رواں دیکھ رہا تھا، اس کے بارے میں مجھے خیال سا تھا کہ جو پُر رونق بازار میں نے امیر جان.... امیر جان.... یا جو بھی وہ ہستی تھی، اس کے مقبرے میں دیکھا تھا، وہ اس موجودہ بازار سے کچھ مشابہ تھا مگر میں نے ادھر کا رخ نہ کیا اور ندی کا کنارہ کم وبیش تھام کر شمال کی سمت چلتا گیا کہ ادھر ہجوم کم تھا۔ بازاریوں میں، خواہ وہ لوطی بےفکرے رہے ہوں یا اہل حرفت، یا شرفا، میں نے سب کو ہتھیار بند دیکھا۔ شاید ان دنوں خلقت میں جنگجوئی کا ذوق افزوں تھا، یا شاید لوگ اس زمانے میں خود کو کم محفوظ سمجھتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ہجوم میں اگر کسی سے ٹکرا گیا یا گھوڑے کی ٹاپ کسی کو لگ گئی تو خواہی نخواہی جھگڑا ہو سکتا تھا۔ میں اجنبی اور سراسیمہ بے گھر مسافر ایسے کسی جنجال کے لیے تیار نہ تھا۔

شمال میں ذرا آگے ہی میں گیا تھا کہ ایک نہایت دلکش مسجد نظر آئی۔ اس شہر میں مسجدوں اور مزارات کی کثرت تھی۔ ہم لوگوں کے زمانے میں ایسا نہ تھا۔ مسجد کے دو مینارے قلم کے نیزوں کے مانند چھریرے اور بہت ہی بلند تھے۔ مسجد سے بالکل متصل ایک سرائے بھی تھی۔ سرائے کے دروازے پر اونٹ، گھوڑے، پالکیاں، خوانچے والے، اس طرح کے بہت سے لوگ دکھائی دے رہے تھے یعنی یہ سرا اب تک آباد تھی اور میں یہاں ٹھہر سکتا تھا۔

میں مسجد کی عمارت کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ صدر دروازے پر جو کتبہ تھا اس کے مطابق اس مسجد کا نام زینت المساجد تھا اور اسے محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کی بیٹی زینت النسا بیگم نے 1707....؟ 1707 میں؟.... بنوایا تھا۔ میں نے آنکھوں کو خوب رگڑ کر صاف کیا، پھر ہر طرح غور کر کے دیکھا، وہی تاریخ نظر آئی۔ واللہ ایسا اسرار مجھ پر نازل ہو، یہ نہیں ہو سکتا۔ ارے صاحب جب میں ننگل خورد

سے چلا تھا تو سنہ 1520 تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے اور سلطان ابراہیم لودی کو فرماں روائی کرتے چار سال ہو رہے تھے۔ تو کیا یہ مسجد اس کے کوئی دو سو برس بعد بنی تھی؟ تو کیا واقعی ابراہیم لودی ہی نہیں اور بھی بہت کچھ میرے ننگل خورد چھوڑنے سے لے کر اب تک ہو چکا تھا؟

میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اندر گیا۔ صحن مسجد میں ایک طرف کسی کا مزار تھا۔ میں نے قریب جا کر لوح دیکھی تو معلوم ہوا کہ یہ اسی شہزادی زینت النسا بیگم کا مزار ہے اور وہ 1710 میں واصل بحق ہوئی تھی۔ مسجد پرانی معلوم ہوتی تھی۔ بیشک شہزادی زینت النسا کے وصال کو کچھ برس ہو چکے تھے۔ اس وقت بھلا کچھ نہیں تو سنہ 1730 ہو گا۔ شاید اور بھی زیادہ ہو۔ شاید یہ احمد شاہ بادشاہ جن کا نام حمید الدین نے لیا تھا، بارہویں صدی میں نہیں، تیرہویں صدی ہجری میں ہوں۔

میں نے جوتے اتارے، حوض پر جا کر وضو کیا اور سجدے میں جا کر اللہ کے حضور میں خود کو متوجہ کر کے گڑگڑا کر کہنے لگا کہ الہ العالمین تو دانا اور بینا ہے تو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اپنے حبیب کے صدقے ان کی پیاری بیٹی بی بی فاطمہ کے صدقے مجھے اس عذاب سے نجات دلا دے۔ میرے اللہ میری بیاہی بی بی کا میرے بیٹے کا کیا حال ہوا ہو گا، میری ماں پر کیا گذری ہو گی۔ اگر تیری مرضی نہیں ہے تو مجھے ان سے نہ ملا، لیکن مجھے یہاں سے اٹھا لے۔

میں روتے روتے نڈھال ہو گیا۔ اس اثنا کئی لوگ میرے پاس سے گذرے لیکن شاید کسی کو مجھ سے دریافتِ حال کا ہواؤ نہ ہوا۔ ایک اچھی خاصی عمر کے روتے بلکتے مرد سے کون کچھ پوچھنے کی ہمت کرتا۔ بھلے لوگ ڈر گئے ہوں گے کہ خدا جانے یہ بادشاہ کا معتوب ہے یا غضبِ الٰہی کا شکار ہوا ہے۔

جب میرے آنسو تھمے تو دل میرا مجھے کچھ ہلکا لگا، خدا جانے کتنی دہائیوں بلکہ صدیوں کے بعد آج میں رویا تھا۔ میں نے حوض پر جا کر تجدید وضو کی اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے پھر دعا مانگی کہ مجھے صحیح راستہ ملے، میرا خوف کم ہو، مجھے میرے گھر بار کی خبر ملے.... مگر دو سوا دو سو برس کے بعد میرا گھر بار کہاں رہ گیا ہو گا؟ نہ صحیح۔ مجھے پتہ تو لگے کہ اب وہاں کیا ہے، کون ہے، کچھ ہے بھی کہ نہیں؟ اللہ میرا جانتا ہے میں نے کچھ ایسا گناہ نہ کیا تھا کہ جس کی سزا مجھے یوں ملتی اور مسلسل ملتی.... اب کے بعد میں کیا کروں.... مجھے ایک طرح سے نئی زندگی ملی تھی۔ میں اس نئی زندگی کو گذارنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں.... فقیری لے لوں کہ پھر سے گھر گرہستی جماؤں۔ ہر چند کہ میری عمر ڈھائی سو برس سے متجاوز تھی لیکن اضحلال قویٰ میں میرے مطلق نہ

تھا یا اگر تھا تو اتنا ہی جتنا کسی بوڑھا ہوتے ہوئے مرد کے ہاتھ پاؤں میں ہوتا ہے۔

آگے تو مجھے عبادات اور وظائف سے اتنا ہی شغف تھا جتنا کسی سپاہی پیشہ کو ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اولیاء اللہ کے دربار میں ضرور حاضر ہو جایا کرتا تھا ورنہ نماز جمعہ کا بھی اہتمام کچھ نہ کرتا تھا لیکن اس وقت نماز اور دعا سے میرا دل کچھ ہلکا تو ہوا ہی تھا، مگر شاید ان عفت مآب شہزادی کی نیتوں اور اعمالِ نیک کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں کئی ارادے ڈال دیے جن کو قوۃ سے فعل میں لا کر میری اگلی زیست کا کچھ نقشہ مترتب ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے تو میں نے زینت النسا بیگم کی سرائے پر جا کر بھٹیارن اور اس کے مرد کے سامنے خود کو ملک سندھ سے آیا ہوا مسافر ظاہر کیا اور بتایا کہ میں تلاشِ معاش میں دہلی آیا ہوں، جب تک کوئی صورت نوکری کی نہ نکلے، میں سرائے ہی میں مقیم رہوں گا۔ انھوں نے میرا نام تو پوچھا لیکن جہاں سے آیا تھا وہاں کی تفصیل اور میرے اثاثے کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میں نے خود ہی بتا دیا کہ دہلی سے باہر وزیرآباد پر نہر کے پاس میں لٹ گیا تھا اور گذشتہ رات میں نے ایک دوست کے یہاں کھڑکی گاؤں میں گذاری تھی۔ اس کے آگے میں نے کچھ نہ کہا اور نہ ہی بھٹیاری نے میرا اعلام لکھوانے کے باب میں کوئی تعجیل ظاہر کی۔

میں نے کرایہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ڈیڑھ پیسہ روز کے حساب سے میں کئی دن قیام کر سکتا ہوں۔ کھانا جو مطلوب ہو گا پکا دیا جائے گا۔ اس کی قیمت الگ سے دینی ہوگی۔ سرائے سے کچھ دور پر دریا گنج میں کئی حمام تھے وہاں غسل و طہارت کا انتظام تھا۔

میرے پاس زر مقامی تو تھا نہیں۔ جب میں نے اپنے چھدام بھٹیاری کو دکھائے تو وہ خوف زدہ ہو کر بولی کہ میاں صاحب یہ جناتی سکے کہاں سے لائے، میں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں اب چھونے سے ڈرتی ہوں۔ مجھے تو اس شہر اور اس زمانے کے پیسے درکار ہیں۔ میں نے بہتیری کوشش اسے سمجھانے کی کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں یہی سکے رائج ہیں۔ لیکن جب میں نے زیادہ زور دے کر اسی بات کو کہنا چاہا تو اس کے چہرے پر شک کے آثار پیدا ہوئے۔ شاید اسے خیال آیا ہو کہ میں کوئی ڈکیت تھا اور مجھے کسی پرانی حویلی میں گڑا خزانہ ہاتھ لگ گیا تھا۔

''میاں صاحب، میری مانو تو ان پیسوں کو کوتوالی میں لے جا کر دکھاؤ۔ وہ پہچانیں گے کہ یہ کیا مال ہے اور اس کی قیمت کیا ہے۔ مجھے تو بالکل درکار نہیں۔''

اس کی آواز کچھ بلند ہوتے دیکھ کر بھٹیارا بھی ہماری طرف متوجہ ہوا تھا کہ ایک دو مسافروں کو بھی تجسس ہوا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ دہلی والے میرے زمانے میں بھی جھگڑے تماشے پر مجمع لگانے کے بہت شوقین تھے۔ اب شاید وہ ذوق اور بھی افزوں ہو گیا تھا۔ اس کے پہلے کہ میں کسی مجمعے کی توجہ میں آجاتا، میں نے اپنے گلے کا کنٹھا اتار کر بھٹیارن کو دے دیا۔ اس میں کچھ دانے چاندی کے اور ایک دانہ سونے کا تھا۔ ایک آدھ دانہ شاید مرجان کا بھی رہا ہو، باقی رنگین شیشوں کے تھے۔ میں نے کہا:

''نیک بخت، اتنے کہ میں بازار جا کر اپنا کام ڈھونڈوں، تو یہ رکھ لے اور ایک کوٹھڑی پر تالا میرے نام کا ڈال دے۔ باقی حساب ہوتا رہے گا۔''

بھٹیارن کا مزاج کچھ ٹھنڈا پڑا اور میں اپنی دادی کو دعائیں دیتا ہوا کہ ہار یہ انھیں مرحومہ کا تھا اور میرے باپ نے مجھے میری شادی پر مجھے پنھایا تھا، سرائے کے باہر آ گیا اور اسی راہ پر چل پڑا جس پر میں نے سواروں اور پیدلوں کو چلتے دیکھا تھا۔ پھر ایک بہت بلند اور بہت گراں جثہ دروازہ، جیسا کسی قلعے کے لیے مناسب ہوتا۔ دونوں طرف اونچی فصیل، لیکن زینت المساجد کی طرف سے آنے جانے والوں پر کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ دروازہ دہلی دروازہ کے نام سے موسوم تھا مگر اب بہت سے لوگ دہلی کے بجائے دلّی کہنے لگے تھے۔ وجہ اس کی معلوم نہ ہوئی پر بعد میں مَیں نے سنا کہ یہاں کے ایک شاعر بقا صاحب نے ایک اور شاعر صاحب جن کا نام میر تھا، ہجو میں ان کی کہا تھا ؎

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر
اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

مجھے تو دہلی کی جگہ دلّی نام بالکل پسند نہ آیا۔ ہمارے زمانے میں لوگ عموماً کہتے تھے دہلی جنت کی دہلیز ہے۔ کئی گنوار لوگ اور بھی اچھا کہتے کہ دہلی جنت کی دہری۔ لفظ دہری بمعنی دہلیز شاید علاقۂ بہار سے یہاں آیا تھا کہ دکن سے، مگر لوگ بولتے ضرور تھے۔ بازار کا نام معلوم ہوا کہ دریا گنج ہے۔ مساجد کے علاوہ بھی یہاں لوگوں کی آؤ جاؤ کے سامان بہت تھے۔ ایک بات میں نے یہ دیکھی کہ اس شہر میں اب تجارت اور سامان کی وہ کثرت تھی جس کا ہمارے وقتوں میں تصور محال تھا۔ ہر جگہ ہر طرح کا سامان خریدار کی آنکھ کو متوجہ کرتا تھا۔ کہتے تھے دُنیا کا ہر سامان دریا گنج میں لے لو اور وہاں اگر نہ ملے تو چار قدم آگے چل کر جاؤ چاندنی

چوک میں ملے گا ہی ملے گا۔ کیا شے تھی جس کے مشتری یہاں نہ تھے اور جس کے مشتری بھی یہاں نہ تھے۔ ان میں سے کئی تو گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے آواز لگا لگا کر پکارتے تھے اور کئی نے اپنے نوکر باہر کھڑے کر رکھے تھے جو ہر آنے جانے والے، حتیٰ کہ پالکی سواروں کو بھی روکنے کی کوشش کر کے بتاتے کہ ان کے یہاں کون سا مال ملتا ہے۔ ہر طرح کے دکاندار نے اپنے مال کے موافق دلچسپ آوازیں وضع کر رکھی تھیں۔ مثال کے طور پر سوئی دھاگے بیچک والے یوں پکارتے تھے:

اے میاں یہ اصفہان کی سوئیاں ہیں آنکھوں میں کھبتیاں ہیں!

اے صاحب یہ لوڈھاکے والی ململ کا دھاگا، جس کو چاہو کچے دھاگے میں باندھ لو۔ چاہو کُرتا شلوار سلوا لو!

بھائی میاں ذرا دیکھتے جائیو یہ ملکِ یمن کے ریشمی دھاگے ہیں، ان سے بنتے حضرت سلیمانؑ کے راگے ہیں!

اے جی صاحب ان سوئیوں میں تلواروں کا لویا ہے، ان سے ہم نے موتیوں کو پرویا ہے!

عجب لطف کا سماں تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے تاجر بھی اور رنگ رنگ کے لباس وضع قطع والے خریدار بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ صراف یہاں بے شمار تھے۔ قدم قدم پر ان کی دکانیں، اور کئی تو یوں ہی سرِ راہ دری بچھا کر اپنی تمام ملکیت کی نمائش کرتے تھے۔ میں نے جگہ جگہ رک کر بغور لیکن خود کو نمودار کیے بغیر دیکھا کہ مال کیا ہے اور گاہک کیسے ہیں، تو معلوم ہوا کہ صرافوں کا عجب عالم ہے۔ ان کے پاس ہر طرح کا اور ہر ملک کا سکہ رائج الوقت موجود تھا۔ عراق کے دینار سے لے کر ایران کا تمن اور روم کا ریال اور ملکِ فرنگ کا فرانک اور پیسو اور پونڈ، سب مہیا تھے۔ گاہک بھی چین و ترکستان سے لے کر دکن و روم و فرنگ کے تھے۔ جس کے پاس جو تھا اسے خرید رہا تھا یا بیچ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ گاہک ہو یا بیچنے والا ہو، کسی سے کوئی کچھ پوچھتا نہ تھا لیکن میرے سکوں جیسے پرانے سکوں کا لینے والا یا بیچنے والا دکھائی نہ دیتا تھا۔

میں نے ہمت کڑی کر کے ایک ایسے صراف کی طرف رجوع کیا جس کے ہاں بہت ازدحام نہ تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے السلام علیکم کہا۔ اس نے مسکرا کر اور گرم جوشی سے کہا:

''وعلیکم السلام میاں جی صاحب، کہیے کیا خدمت کروں؟''

شاید میرے لہجے اور میرے لباس سے وہ مجھے غیر ملکی سمجھا تھا، کیونکہ ہندی میں جواب اس نے ٹھہر

ٹھہر دیا تھا۔ میں نے بھی قیافہ پہچان لیا کہ وہ مجھے یہاں کا نہیں سمجھتا۔ ایک تنکہ جو کہ میں نے پہلے ہی ہمیانی سے نکال کر شلوکے کی جیب میں ڈال رکھا تھا، میں نے اسے نکالا اور اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھایا اور کہا:

''اینہا را چہ بہا می دہید آغا؟''

صراف نے جھک کر تنکے کو بڑے غور سے دیکھا۔ پھر بولا:

''می توانم کہ من برایں مسکوک انگشت نہم آغا، و در دست من گیرم؟''

میں نے کچھ سوچ کر کہا، ''درست۔''

صراف نے وہ تنکہ میرے ہاتھ سے لے کر انگلیوں سے رگڑا، الٹا پلٹا، ایک اور چاندی کے سکے سے ٹکرا کر کھنکایا، پھر بولا:

''آغا ایں سکہ را از کجا آوردہ باشید؟''

مجبوراً میں نے وہی کہانی سنائی کہ ملک سند سے آیا ہوں۔ وہاں یہ سکہ چاندی کے معیاری ایک تولہ والے مصری درہم کے برابر گنا جاتا ہے۔

میری فارسی اس کے لیے بالکل قابلِ فہم تھی، لیکن میرا لہجہ شاید اسے کچھ بھاری پڑ رہا تھا۔ میری ہندی بہت مختلف تھی، لیکن مجھے ہندی بولنے کی مشق ضرور تھی۔ باقی گفتگو میں وہ زیادہ تر فارسی اور میں زیادہ تر ہندی بولا۔ حاصل یہ ہوا کہ پاس پڑوس کے بڑے صرافوں سے پوچھ کر اور مشورہ کر کے تصفیہ ہوا کہ ایک تنکے کے بدلے ڈھائی روپے دہلوی ملیں گے۔ اگر تنکے زیادہ ہوں اور یک مشت فروخت کرنے ہوں تو کچھ زیادہ مل سکیں گے۔

میں نے کہا کہ میں پانچ تنکے بدلواؤں گا، فی الحال یہ ایک بدل لیا جائے۔ پھر میں نے وہ چند چھدام نکالنے چاہے جو میں نے بہادر گڈھ میں بھنائے تھے اور وہ بہلولی جو ابھی میرے پاس تھے۔ لیکن میرا دل دفعتاً درد سے بھر گیا۔ آہ کیا وہ دن واقعی تھے، یا اب یہ دن واقعی ہیں، کیا بہادر گڈھ کی وہ سرائے اب بھی ہو گی، کیا بہادر گڈھ ہی ابھی ہوگا؟ میں نے خیال کیا کہ یہ سکے یادگاری رکھ لوں، مگر کس کی یادگار، اور وہ کس کے مطلب کے ہوں گے، ان سوالوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ جوں کر کوئی بوڑھا اپنے زمانۂ صبا کا کوئی کھلونا یا اپنی ٹوپی یا مشق کی تختی کہیں سے پا جائے اور اس کا دل اس زمانے کی کھٹی میٹھی یادوں سے بھر جائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو جائیں۔ اس کا دل بے طرح چاہے کہ میں اس یادگار کو رکھ لوں، مگر کیوں اور کس

کے لیے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آوتا ہو۔

بازار میں گھومتے پھرتے، لوگوں کی باتیں سنتے اور کبھی کبھی خود بھی ایک دو سوال تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ پوچھ دینے سے کئی امور مجھ پر روشن ہوئے۔

اس وقت کے بادشاہ کا نام واقعی احمد شاہ تھا۔ یہ اس کے سنہ جلوس کا دوسرا سال تھا۔ یہ لوگ سنہ ہجری اور سنہ ہندی کے ساتھ سنہ جلوس بھی گنتے تھے، یعنی بادشاہ حال کو فرمانروائی کرتے کتنے برس گذرے۔ شاہی کواغذ اور فرامین میں اور رسمی مواقع پر سنہ جلوس مندرج کرنے یا اس کا اعلان کرنے کا التزام تھا۔

یہ بادشاہ خاندانِ مغلیہ کے تھے اور ان کا سلف ظہیر الدین محمد بابر ہے جو کابل میں مدفون ہے اور جس نے ابراہیم لودی سے سلطنت چھینی تھی۔

سنہ ہجری کے حساب سے یہ سال 1164 ہے۔ اس طرح میں نے امیر جان کے مزار کے اندر ڈھائی گھنٹے نہیں، کوئی ڈھائی سو برس گذارے تھے۔

ان بادشاہوں پر کئی سال سے گاڑھا سماں تھا، پھر بھی ہاتھی لاکھ لٹے گا تو سوا لاکھ کا ہوگا، کے مصداق ابھی دہلی کی بادشاہت کا سکہ ہر جگہ رواں تھا۔

اب میں آہستہ آہستہ اس صدمے اور شاق اور ضعفِ جاں کے عہدے سے باہر آ رہا تھا جس کا شکار میں اس وقت سے تھا جب میں امیر جان کے مزار سے باہر آیا تھا۔ اب مجھے اس بات کی زیادہ فکر نہ تھی کہ امیر جان کا مزار واقعی کوئی جگہ تھا جس میں مجھے وہ سب کچھ عجائب وغرائب دیکھنے کو ملے تھے۔ اتنا تو مجھے یقین کامل تھا کہ میں تھا۔ میں گل محمد سلطان سکندر بن سلطان سکندر لودی کے عساکر میں خان دوراں کے دامن سے متوسل احدی تھا۔ امیر جان سے قرض ساڑھے تین سو تنکے میں نے لیے تھے، بالضرور لیے تھے۔ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اسی زرِ مقروضہ سے کی تھی۔ اس میں بھی کوئی شک نہ تھا۔ جب وہ واصل بحق ہوئے تھے تو سال 1517 تھا۔ جب میں نے آخری بار اپنا وطن چھوڑا، وہ سال 1520 تھا۔

اس درمیان، میں یا تو مر چکا تھا، یا کہیں پڑا ہوا کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اگر مر گیا تھا تو پھر میں یہاں زندوں کی طرح، اور گذشتہ یادوں کے ساتھ کیونکے موجود تھا؟ کیا اسی کا نام برزخ ہے، یعنی جس شہر سے میں پوری طرح مانوس تھا، اسی شہر میں لیکن کسی نامانوس زمانے میں ڈال دیا جاؤں؟ مگر اس سے اللہ کی کون سی مصلحت، کون سی مرضی پوری ہوتی تھی؟ کیا اللہ تعالی کو مجھ سے کام کوئی لینا ہے؟ کیا میری تقدیر ایک محض احدی

کی تقدیر نہیں ہے؟ یا ایسا ہے تو ابھی پردہ اسرار سے اٹھے گا۔ شاید مجھے کچھ بشارت ہو گی۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ ان معاملات میں مجھے کیا، کسی کو دخل دینے یا دم مارنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ مجھے صبر سے انتظار کرنا چاہیے۔

یا میں مر ضرور گیا ہوں لیکن ملک الموت کی کسی غلطی سے میری روح راستے ہی میں کہیں ملک الموت کے چنگل سے چھوٹ گئی اور پھر فرشتوں نے مجھے یوں ہی بھٹکتا ہوا دیکھ کر واپس میرے شہر میں ڈال دیا۔ کیا ایسا ہوتا ہے؟ یہاں ان دنوں ایک سے بڑھ کر عارف کامل اور واصل بالحق موجود ہے۔ ابھی بازار ہی میں ایک صاحب کسی شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے مدرسے کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ بے یقینی اور تلاطم ذہنی کی آندھیاں رکیں، میرے پاؤں کہیں ٹھہریں، تو میں سوچ سمجھ کر ان سے یا کسی اور بزرگ سے دریافت کروں۔

اچھا، اگر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں تو کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ خواب دو ڈھائی سو برس بعد شروع ہو؟ اپنے حسابوں تو میں حد سے حد پانچ دن پہلے اپنے آبائی گاؤں میں تھا۔ اب ڈھائی صدیاں سوتے سوتے پھلانگ گیا ہوں۔ واہ، کیا خوب کہی۔ آخر کتنا طویل المدت خواب ہے یہ، اور کیا خوابوں میں دن رات کی گنتی بھی ہوتی ہے؟ میں تو بخوبی گن سکتا ہوں کہ میں کھڑکی گاؤں میں کب تھا اور یہاں اس سرائے زینت النسا بیگم میں کب آیا اور میں سویا کب تھا؟ میں تو سارے وقت جاگتا رہا تھا۔

پھر.... ایسا تو نہیں کہ میں مر تو چکا ہوں مگر کوئی مجھے خواب میں دیکھ رہا ہے اور میں بھی وہی خواب دیکھ رہا ہوں.... یعنی کوئی دیکھ رہا ہے کہ میں مر گیا، لیکن اس کے خواب میں کہیں میں موجود ہوں یا اس نے مجھے اپنے خواب میں زندہ کر کے مجھے بھی اس خواب کا ایک فرد بنا دیا ہے۔ اب لگتا ہے کہ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، کام کر رہا ہوں، گھوڑ سواری کر رہا ہوں، امیر جان.... مگر امیر جان تو کوئی تھی نہیں.... غلط، سراسر غلط۔ امیر جان تھی۔ میری بیٹی ایک تھی اور اب بھی ہے۔ میں اسے بیاہی اور گود میں ایک پیارا سا بچہ کھلاتے چھوڑ آیا ہوں، تو پھر امیر جان اگر تھی تو اس کی موت بھی تھی اور اس کی موت تھی تو اس کا مزار بھی تھا اور اگر مزار تھا تو وہ سب واقعات.... نہیں یہ کیا لغو اور واہی تباہی بیان ہے۔ اصلیت یہی ہے کہ مجھے دو ڈھائی صدیوں کے پار یہاں لا بٹھایا گیا ہے، مگر کیوں؟ کہا نہ کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ کسی کو ان باتوں میں دم مارنے کا یارا نہیں۔ تو کیا یہ اور لوگوں کے ساتھ بھی ہوا ہے یا ہوتا ہے؟ ہوتا ہو گا۔ تمھیں کیا خبر یہ لوگ جن کے کھوے سے

میرا لکھوا چھپل رہا ہے ان میں سے کتنے اس زمانے کے ہیں اور کتنے تمھارے زمانے کے یا تمھارے بھی زمانے کے پہلے کے ہیں؟

الف لیلہ میں نے نہیں لکھی، پڑھی بھی بہت نہیں۔ اس طرح کی خرافات میں میرا دل لگتا نہیں ہے لیکن وہاں بھی تو سنا ہے شیشے کے اندر سے جنات ہزاروں ہزار سال بعد نکل آتے ہیں۔ کیا معلوم میں بھی کوئی جنات ہوں۔ جب میں اس قبر میں داخل ہوا تو گل محمد احدی تھا، جب باہر آیا..... جب باہر آیا.....تو جنات تھا۔ نہیں۔ ذرا ٹھہرو۔ تمھیں کیسے معلوم کہ تم باہر واپس آ گئے ہو؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس دُنیا میں تم نے وہ رقاصہ دیکھی، جس بالا خانے سے تم نے قطب صاحب کی لاٹھ دیکھی، اسی دُنیا میں تم ابھی یہ سب بھی دیکھ رہے ہو؟

ایک مرتبہ مجھے بخار جیسی کپکپی چڑھ آئی۔ بڑے زور کا پیشاب لگا۔ قریب تھا کہ میرا پیشاب نکل جائے کہ مجھے ایک مسجد نظر آ گئی۔ اللہ بخشے مسجدوں کے بنانے والوں کو۔ میں جھپاک سے اندر گیا۔ مسجد کے استنجا خانے میں گھس کر دروازہ بند کر کے بیٹھ گیا۔ بڑی دیر بعد باہر نکلنے کے لیے ہمت کو مجتمع کر سکا مگر اب یہاں دیر کیا اور زود کیا معنی رکھتا تھا؟ مجھے ہر دن، ہر ساعت، ہر گھڑی یوں جینی تھی گویا وہ بالکل حقیقی ہو اور آخری بھی ہو۔

تعفن، تاریکی اور تنگیٔ جا کے باوجود میرا جی نہ چاہتا تھا کہ پیشاب خانے سے باہر نکلوں۔ باہر کی دُنیا نامفہوم، اجنبی، پُراسرار اور بڑی حد تک تہدید سے بھری ہوئی لگتی تھی۔ ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ دُنیا میں کوئی بالکل اکیلا بھی ہو سکتا ہے۔ بے باپ ماں کا ہوگا کوئی تو بھی اس کا گھر تو ہوگا۔ گھر اتو کوئی ہوتا نہیں اور اگر گھر بھی نہیں تو گاؤں گراؤں دھام کچھ تو ہوگا۔ پر مجھے تو یہ معلوم بھی نہیں کہ گھر میرا اس صفحۂ ہستی پر ہے بھی کہ نہیں۔ مجھ سا بے کس اور بے کو بھلا کوئی ہوگا۔ بالکل ہی بے یاور اور بے یارا، اب میرا ہوگا تو کیا ہوگا..... مجھے لگا کہ شاید کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ کسی کو بہت عجلت ہے یا مجھے ہی شاید دیر بہت ہو گئی ہے۔ نمازیوں کے دل میں سو طرح کے چتے آ رہے ہوں گے کہ یہ شخص مر تو نہیں گیا، بیہوش تو نہیں ہو گیا۔

میں کچھ ہڑ بڑایا سا باہر نکلا۔ دروازے پر تو کوئی نہ تھا مگر اندھیاری سے نکلنے کے بباعث کچھ میں چوندھیا سا گیا تھا، یا شاید حواس ہی میرے پراں تھے۔ قدم مسجد سے باہر نکالا ہی نکالا تھا کہ ایک صاحب سے ٹکرا گیا۔ میں نے شرمندگی کی وجہ سے سر بھی نہ اٹھایا۔ شکل اور وضع قطع میری یوں ہی اجنبیوں جیسی تھی، یہ صاحب مجھے کیا گردانتے ہوں گے، کوئی ملکی گنوار سمجھ کر شاید معاف کر دیں شاید میرے ساتھ کھلی بازیاں کریں

کہ نیا پکھیرو کہیں سے بھٹکا ہوا آ گرا ہے۔ مگر سر نہ اٹھا سکنے کے بوجہ میں ٹھیک سے آپ کو سنبھال نہ سکا اور دوبارہ انھیں صاحب سے ٹکرا گیا۔

''اجی حضرت کیا ڈوڈا پی رکھا ہے جناب نے؟'' انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''قدموں پر قابو نہ رہا تھا تو گھر ہی میں بیٹھ کر غین رہتے۔''

میں مارے خفت کے گھبرا کر وہیں دروازۂ مسجد پر بھد سے بیٹھ گیا تھا۔ ان صاحب نے بڑی شفقت سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا، ''بارے اب اٹھیے، کہیں چوٹ دوٹ تو نہیں آئی؟''

''جی.... جی.... شک.... شکر ہے.... شکریہ جناب کا۔ میں.... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے بدقت سر اٹھایا اور اٹک اٹک کر کہا۔ ''جناب درگذر فرمائیں۔ اچانک مجھے کچھ چکر سا آ گیا تھا۔''

''اے ہے، بچارے غریب شہر لگتے ہو۔ ڈھارس رکھیں جناب، گھبرائیں نہیں۔ کیا میں جناب کو فرودگاہ تک آپ کی پہنچا دوں؟''

میں نے اب ان صاحب کو دیکھا اور بھچک رہ گیا۔ واللہ کیا نازک نقوش تھے لیکن مردانہ وجاہت میں پھر بھی کمی نہ تھی۔ کشیدہ قامت، چھریرا بدن، گورا رنگ، مسکراتی ہوئی آنکھیں، گہری سیاہ۔ بہت بڑی بڑی آنکھوں سے زیادہ حیرت زا ان کی پلکیں تھیں، کیا کسی شہزادی یا پری کی ایسی پلکیں ہوں گی۔ میں نے سنا تو تھا کہ کچھ لوگوں کی پلکیں ان کی آنکھوں پر پردہ سا ڈالے رہتی ہیں، لیکن دیکھا کبھی نہ تھا۔ جب وہ مژگاں اپنی کھول کر دیکھتے تھے تو لگتا تھا منھ پر چراغ دو روشن ہو گئے ہیں۔ بہت نفیس کتری ہوئی ڈاڑھی، لمبی بالکل نہیں لیکن کم بھی نہیں۔ مونچھیں ذرا نمایاں، بل دی ہوئیں نوکدار لیکن لمبی نہیں۔ پتلے پتلے ہونٹھ، ان پر ہلکی سی سرخی، شاید تنبول کی دولت سے، یا شاید ان کا رنگ ہی سرخ گلابی تھا۔ سر پر پٹے جو شانے کے ذرا اوپر تک آئے ہوئے تھے، اوپر سنہری دھاریوں کا آسمانی رنگ کا ریشمی چیرہ، خوب بل دیا ہوا، اس طرح کہ سر سے گویا ہم آغوش لگتا تھا۔ بہت باریک ململ کا کُرتا، اسی آسمانی رنگ کا، لیکن رنگ اتنا ہلکا کہ نیچے کا بدن جھلکتا تھا۔ کُرتے پر وہی لباس جس کی آستینیں اوپر سے کٹی ہوتی ہیں۔ کاشانی مخمل، جس پر ہلکی ہلکی جواہرات کی بیل ٹکی ہوئی، لیکن بہت متناسب۔ ریشمی دھاری دار کپڑے کا پاجامہ، کاکریزی یا شربتی رنگ کا، جو ان کے گورے بدن پر عجب بہار دے رہا تھا۔ کُرتے کے ہلکے لطیف کپڑے کے مقابلے میں پاجامے کا کپڑا بھاری تھا، اتنا کہ پاؤں کی ٹھوکر سے کچھ بڑھا ہوا تھا۔ سیاہ چمکیلے چمڑے کی جوتیاں جن پر زری کا بھاری کام، کمر میں ڈوپٹے کے

بجائے نیلے کیمخت کا پٹکا، جس پر زری کا کام اور کہیں کہیں سرخ قیمتی پتھر ٹکے ہوئے، کمر میں جڑاؤ خنجر جس کی میان بھی جڑاؤ تھی۔ گلے میں موتیوں کا سہ لڑا مالا، لگتا ہے اسی گردن کی زیب و زینت کے لیے وہ موتی بنائے گئے ہوں گے۔ ایک بھی دانہ غیر متناسب نہیں، آب و تاب میں ذرا دودھیا دھندلے، جیسے کہ سچے موتی ملک سیلان کے ہوتے ہیں۔

ان کی عمر بھی کوئی میری سی ہوگی، یعنی پچاس کے لگ بھگ مگر چہرے پر ایسی نرمی اور اس قدر تازگی تھی گویا ابھی مدرسے سے اٹھ کر چلے آ رہے ہوں۔ ان کے پورے شخص سے روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ کتنی بڑی بدمذاقی کر رہا ہوں کہ انھیں دیکھے جا رہا ہوں۔ ان کی بات کا جواب بھی نہیں دیا ہے۔ لیکن شاید وہ صاحب اس طرح سے دیکھے جانے کے عادی تھے۔ انگشت نمائے عالم ہونا نئی کوئی بات ان کے لیے نہ تھی۔ وہ پورے اطمینان اور دلجمعی سے سمت میری میں دیکھتے رہے۔ شاید وہ بھی محسوس کر چکے ہوں کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو گیا ہوں، اور کوئی باعث خاموشی کا میری نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے آنکھیں نہ چرا رہے تھے۔ بے شرمی سے چار چشم بھی نہ تھے لیکن میرے استغراق کو انھوں نے عجب خندہ پیشانی سے لیا اور شرمائے بھی بالکل نہیں، بس انتظار میں رہے کہ میں آپ میں واپس آؤں تو سلسلہ تکلم کا آگے بڑھے۔ ان کے کسی میں انداز میں اتراؤنے بناؤنے کا شائبہ تک نہ تھا۔

اچانک مجھے لگا کہ صرف میں ہی ان اجنبی شاہ خوباں کو نہیں دیکھ رہا ہوں، کچھ لوگ مجھے بھی دیکھ رہے ہیں اور شاید زیر لب مسکرا بھی رہے ہیں اور کچھ لوگ ان اجنبی گل خوبی کو بھی کچھ اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے انھیں بھی یہ اچھا لگتا ہو کہ لوگ انھیں روکریں۔ میں نے چونک کر گویا نیند سے آنکھیں کھولیں اور ایک قدم آگے بڑھ کر چاہا کہ ان کا دامن تھام لوں لیکن یہ کس قدر بدتہذیبی کی بات ہوتی۔ میں جھجک کر رک گیا اور بولا:

''جناب، معافی کا خواستگار ہوں۔ میں واقعی غریب الدیار ہوں....''

ابھی میں بات پوری نہ کر پایا تھا کہ ایک صاحب مسجد کے اندر سے لپکتے ہوئے آئے اور بے تکلفی سے ان اجنبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے چوم کر بولے:

''اے واللہ میر صاحب، کیا بھاگ ہیں میرے جو آپ یہاں توقف کر گئے۔'' انھوں نے میری طرف مختصر سا اشارہ کیا اور مجھے دست بوسی کا موقع مل گیا۔ ''کئی دن سے نیت کر رہا تھا کہ ڈیرے پر جناب

کے حاضر ہوں گا۔''

''السلام علیکم میاں شرف الدین پیام صاحب۔ خوب ملے آپ۔ میں ابھی ان نئے دوست اپنے سے معرفی حاصل کر ہی رہا تھا.... بھئی آپ کا وہ شعر تو کیا غضب کا تھا میاں شرف الدین صاحب، ٹوپی والوں نے قتل عام کیا.... لیکن ذرا غم کھائیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''میاں صاحب آیا کہیں دور سے تشریف لائے ہیں؟ جناب میں عرض کر رہا تھا، مستقر جناب کا کہاں ہے؟''

واللہ کیا سریلی، کھنکتی ہوئی سی لیکن مردانہ آہنگ والی آواز تھی، اتنی صاف اور کھلی ہوئی گویا محفل میں شعر سنا رہے ہوں۔

''جی میں یہیں قریب ہی مسجد زینت النسا کے پاس والی سرا میں اترا ہوا ہوں۔ ملک سند سے آیا ہوں۔ گل محمد مجھے کہتے ہیں۔''

کچھ لوگوں کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ مجھے زینت المساجد کہنا چاہیے تھا۔ ہوگا، میں نے دل میں اپنے بیزاری سے کہا۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ میں نو آمدہ ہوں۔ آہ، میں نو آمدہ تھا لیکن اجنبی نہ تھا۔ ہائے رے تقدیر کے تماشے۔

''تو میاں صاحب ابھی آپ نے دلی کچھ دیکھی بھی نہ ہوگی۔ چلیے آپ کو چاندنی چوک کی سیر کرائیں اور کہیں بیٹھ کر قہوہ پی لیں۔'' انھوں نے شرف الدین پیام صاحب کی طرف دیکھا، جیسے مستفسر ہوں کہ آپ کا کیا ارادہ ہے۔ پیام صاحب تو غالباً اسی امید میں کھڑے تھے کہ میر صاحب مجھے ساتھ چلنے کو کہیں۔

''بہت درست۔ بندہ بھی ادھر ہی مدرسۂ رحیمیہ کو جا رہا تھا۔ میر صاحب کو امر ناگوار نہ ہو تو میں بھی مشایعت کر لوں۔'' پیام صاحب کے لہجے میں مسرت اور اشتیاق ان کے دبائے بھی دب نہ رہا تھا۔ میر صاحب نے مسکرا کر فرمایا:

''اجی صاحب، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ آپ کی معیت میں لطف سیر کا دوبالا ہو جائے گا۔''

''میں بسر و چشم حاضر ہوں، بسم اللہ،'' میں نے کہا۔

ہم لوگ مسجد کی سیڑھیاں اتر کر بازار میں آئے۔ ہر دوسرا تیسرا شخص میر صاحب کو سلام کرتا اور

اکثروں کی کوشش ہوتی کہ انھیں روک کر ان سے دو باتیں کرلیں۔ میر صاحب انتہائی خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے عناں گیروں کو ٹالتے، ایک دو فقرے کہہ کر آگے بڑھتے جاتے۔ میں نہایت دلچسپی سے انھیں دیکھتا اور ان کی باتیں سنتا چل رہا تھا۔ کبھی کبھی میں جان بوجھ کر ان کے ایک دو قدم پیچھے ہو جاتا کہ ان کی چال کو بھی دیکھتا چلوں کہ ان کی صورت اور ان کی گفتار ہی کی مانند دلربا تھی۔ رفتار ان کی میانہ سے کچھ تیز تھی، اور وہ دم رفتار اپنے دونوں ہاتھ یوں آگے پیچھے کرتے تھے گویا چپو چلا رہے ہوں، اور چال ان کی اتنی سبک تھی کہ بس لہریں سی اٹھتی ہوئی لگتی تھیں۔

باتیں ان کی نہایت دلکش، بذلہ سنجی اور ظرافت سے معمور، کبھی کبھی راہ چلتوں پر ایک آدھ فقرہ بھی چست کر دیتے۔ کوئی سنتا بھی تو بُرا نہ مانتا، خوش طبعی سے مسکرا دیتا۔

''ان میاں صاحب زادے کو ذری دیکھیو، کل سے مدرسے کیا بیٹھنے لگے ہیں کہ سر ہی گھٹا لیا، جیسے چھلا ہوا کسیرو۔''

''کیوں شرف الدین پیام میاں صاحب، وہ سامھنے والوں کی نگاہیں کسی سے نامہ و پیام کرتی ہیں گی یا میں ہی یک چشم ہو رہا ہوں؟''

پیام صاحب مسکرا کر بولے: ''کوئی آپ سے چشمک کرے تو سامھنے ہی کی پھوٹیں۔''

اب میر صاحب نے رعایتوں اور تلازموں کا بازار گرم کر دیا:

''جی جناب، کوئی ستارۂ آسمان سے دیدہ درائی کرے اور کسی کو چشمۂ آفتاب بھی نظر میں نہ آوے۔ ہم سے چشمکیں کر کے کوئی کیا پالے گا۔ ہم نے تماشا گاہ دُنیا کی طرف سے آنکھیں موند لی ہیں صاحب۔ سامنے چشمہ ہے جا کے منھ دھو آئے پھر ہمیں آنکھیں دکھائے۔ ہم نے تو پری رخوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ منھ ڈھل جائے تو شاید دیدے تارا سے روشن ہو جائیں، ورنہ ایسا کسی کا منھ کہاں کہ ہمارے منھ آئے۔''

''مگر صاحب طفل اشک تو مچل کر منھ آ ہی جاتا ہے۔ سنیے حضرت میر سوز صاحب فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں۔

اے طفل اشک تجھ کو آنکھوں میں میں نے پالا
تس پر بھی گرم ہو کے تو منھ پہ میرے آیا''

''جی، خوب کہا، مگر یہ میں میں کی تکرار ایسی لگی جیسے کوئی ممیا رہا ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا سا مسکرائے، جیسے اپنی مسکراہٹ کی شیرینی سے اس تعریض کی تلخی کو ضائع کرنا چاہتے ہوں۔

انھیں خوش گفتاریوں میں راستہ کٹ گیا۔ اچانک میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ لگا، کسی نے میرے دل کو شکنجے میں کس دیا ہو اور سارے بدن کا خون کہیں اور جا کر جم گیا ہو۔ میں نے چکرا کر کسی دکان کے تختے کا سہارا لینا چاہا لیکن میرا بدن ہی لڑکھڑا گیا تھا۔ میر صاحب نے میری حالت نہ جانے کیونکر بھانپ لی تھی۔ انھوں نے میرا شانہ مضبوطی سے جکڑ لیا اور میں ثابت قدم ٹھہرا رہا۔ اتنے چھریرے اور بید مجنوں جیسے جسم میں اتنی قوت؟ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میر صاحب تمام فنونِ حرب سے بخوبی آشنا تھے، اکھاڑے میں پابندی سے زور آزمائی کرتے تھے اور لکڑی کھیلنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ مگر اس وقت تو میں بارِ دیگر امیر جان کی قبر میں پہنچ گیا تھا.... سامنے وہی سر بفلک، دیو آسا، سنگِ سرخ کا قلعہ تھا اور اس کے آگے وہی بازار جس میں اس ناظورۂ قتالہ کا رقص میں نے دیکھا تھا۔ قلعے کے ذرا ورلی طرف سے وہی نہر لہراتی بل کھاتی چلی آتی تھی اور اسی طرح طراوت افزا کیفیت میں بازار کے وسط میں بہتی تھی۔

یہ سب میں خواب میں.... نہیں، امیر جان کی گور کے اندر لیکن بہوش وحواس اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اگر چند مجھے پہلے ہی یقین ہو چکا تھا کہ میں اس وقت اپنے اصل زمانے سے کم از کم دوسوا دو سو برس اوپر آ گیا تھا لیکن اب تک جو میں نے دیکھا تھا ان میں سے کوئی چیز میں نے اس گور کے اندر نہ دیکھی تھی۔ اب جو نظروں کے سامنے تھا وہ پہلے بھی آ چکا تھا۔ اب مجھے یوں لگ رہا تھا گویا میں کسی نئے شہر میں ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔ اب مجھے اپنے نگھرے ہونے کا پوری طرح یقین ہو گیا تھا اور ستم یہ کہ یہ ایسے وقت ہوا جب میں کچھ دوست، کچھ ملاقاتی اپنے لیے حاصل کرنے کا کچھ امکان رکھتا تھا۔

''کیا ہوا میاں صاحب؟ کیا کچھ جی ماندہ ہے آپ کا؟'' انھوں نے اس طرح پوچھا گویا وہ حقیقتاً فکر مند ہوں کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ بس یوں ہی چکر سا آ گیا تھا۔ آج سارا دن شہر میں آپ کے گھومتا رہا ہوں۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''آیئے وہ سامنے ہی قہوہ خانہ ہے۔ وہاں بیٹھ کر تھکے ہوئے پاؤں کو آرام دیتے ہیں۔''

قہوہ خانے کی فضا میں کئی طرح کی جدید خوشبوئیں تھیں، لیکن نہایت گوارا۔ تنبول سے میں واقف تھا، اگرچہ ہمارے زمانے میں چلن اس کا بہت نہ تھا لیکن یہ تنبا کو عجب شے تھی۔ لوگ اسے کٹوروں میں ڈال کر سلگاتے اور پھر ایک لمبی نَے سے اس کا دم لگاتے۔ بڑا فرحت افزا اور معطر دھواں نکلتا اور ماحول کو عجب انوکھی سی خشک اور بہت لطیف، گرم، خوشبو سے بھر دیتا۔ دھواں جہاں تک پھیلتا وہاں تک خوشبو جاتی، چاہے دھواں زائل ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ بظاہر قہوہ خانے میں کئی طرح کے تنبا کو بکار لائے جاتے تھے کیونکہ میں الگ الگ دھوئیں اور الگ الگ خوشبوئیں محسوس کر سکتا تھا۔

معلوم ہوا جس آلے کو یوں تنبا کو پینے کے کام میں لاتے ہیں، اسے ایرانی قلیان اور ہندی بھنڈا کہتے تھے۔ اس کے ہر حصے کے الگ الگ نام تھے: چلم، نیچہ، پیچوان، نَے، مہنال، یہ نام تو اسی دن قہوہ خانے میں شنید ہو گئے تھے اور تنبا کوے نوشیدنی الگ شے تھی اور تنبا کوے خوردنی الگ شے تھے۔ مؤخر الذکر میں بھی عطریات وافر ہوتی تھیں لیکن بڑا عیب اس میں کھا کر تھوکنے کا تھا۔ پان کے ساتھ کھائیں تو تھوکنا لازم آتا تھا۔ قہوہ خانے میں جگہ جگہ اگال دان، پیک دان موجود تھے۔ لوگ پیک تھوکنے یا اگال الگ کرنے میں خاصے محتاط تھے لیکن اپنے کُرتے پر کی چھینٹوں کا کیا کرتے۔ کئی لوگوں کے دامن میں نے کم یا زیادہ بہاری دیکھے۔ میر صاحب سے رسمی سلام وکلام کرنے والوں کے علاوہ کئی ان کے دوست یا ملاقاتی تھے۔ سب ایک گوشے میں یکجا بیٹھے، نئے دوست بھی جو آتے تو اسی کنج بے تکلف میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے۔ لمبی، کچھ تنگ اور نیچی سی چوکیاں، ان پر صاف کھاروے کا دسترخوان یا مخمل پوشش، چاروں طرف مخملی گدے۔ بھنڈا عند الطلب حاضر کیا جاتا تھا۔ کچھ کھانے کی خواہش ہوئی تو قہوہ خانے کا ملازم لونڈا پاس کے نانبائی یا حلوائی سے مطلوبہ سامان جھپاک سے لے آتا۔

قہوہ خانے کی گفتگوؤں اور چہلوں میں خاصا وقت نکل گیا۔ میری گھبراہٹ بھی اب کم ہو چلی تھی۔ اب مجھے اپنے اجنبی کرم فرما کے بارے میں کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ نام ان کا سیّد محمد علی اور تخلص حشمت تھا۔ یہ لوگ کشمیری الاصل تھے لیکن کئی پشتوں سے دہلی میں مقیم اور بادشاہِ وقت یا کسی نمودار امیر کی نوکری بصیغۂ سپہ گری کرتے تھے۔ دوان کے برادران عابد یار خان اور مراد علی خان مشہور جوہری تھے اور معاملات تیغ وتبر میں بھی ماہر ہونے کے بسبب محمد شاہ بادشاہ فردوس آرام گاہ کے جواہر خانے میں نوکر تھے۔ اس خانوادے میں زر و جواہر کی وہ ریل پیل تھی گویا لکشمی جی نے ان کے آنگن میں نہر اپنی بہا دی ہو۔

بوجہ فراوانی زر اور بوجہ ذوقِ فطری، میر محمد علی نے کسی کی نوکری نہ کی تھی، شعر گوئی اور دوستداری میں شب و روز ان کے گذرتے تھے۔ میر محمد علی حشمت فارسی میں زیادہ کہتے تھے، ریختہ میں کم۔ فارسی میں اپنے وقت کے مشہور فارسی گو میرزا عبدالغنی بیگ قبول کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ ریختہ میں کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہ کیا لیکن خود انھوں نے ریختہ میں کئی شاگرد بہم پہنچائے تھے جن میں میر عبدالحیٔ تاباں کا نام ہر طرف مشہور تھا۔ استاد سے تاباں کو ایسی محبت تھی کہ اسے ضرب المثل کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ استاد کے بارے میں ان کا شعر بہت مشہور ہوا تھا۔

نہ مانے جو کوئی حشمت کو تاباں
وہ دشمن ہے محمد اور علی کا

استاد کا نام چونکہ محمد علی تھا، اور خود میر عبدالحیٔ موصوف موسوی سید تھے، اس وجہ کر شعر اور بھی با مزہ ہو گیا تھا۔

دھیرے دھیرے میں دہلی والوں میں گھلنے ملنے لگا، لیکن بعد از خرابی بسیار اس عمل میں جو تاخیر ہوئی اور جو روحانی کرب مجھے اٹھانے پڑے ان کا تذکرہ کر کے آپ کو بے مزہ نہ کروں گا۔ دہلی والوں میں میرا اخلا ملا سب سے زیادہ تو اس بات کے چلتے ہوا کہ میر محمد علی حشمت نے اپنی ذمہ داری پر مجھے سوا روپے مہینے پر ایک مناسب مکان کوچہ چیلاں میں دلوا دیا تھا۔ پکانے رِیندھنے کے لیے ایک شریف بڑھیا ماما بھی آٹھ آنے درماہہ اور دو وقت کے کھانے پر مجھے دلوا دی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری پر مجھے اپنے مربی نواب قطب الدین خان بہادر فوجدار مراد آباد کے رسالے میں بصیغۂ سپہ گری رکھوا دیا تھا۔ آپ کو ان امور پر شگفت و حیرت نہ ہونا چاہیے۔ ایک عالم میر حشمت کی خوبیوں کا قائل اور مداح تھا۔ یہ بات دہلی میں عام تھی کہ مردانِ مشاہیرِ دہلی میں حیا و حمیت و اہلیت و آدمیت کی دولت سے بہرۂ وافر رکھنے والا، زائد الوصف اور مستغنی عن الثنا، اگر کوئی تھا تو وہ میر محمد علی حشمت تھے۔

حسنِ اتفاق یہ کہ چند روز پہلے میر محمد علی بھی اسی رسالے میں دنگل عہدہ داری پر متعین ہو گئے تھے۔ حسنِ اتفاق کہیں یا یوں کہیں کہ ان کی مدت حیات سپری ہو چکی تھی۔ قضا کو بہانے کی تلاش تھی اور وہ اس نوکری نے بآسانی مہیا کر دیا۔

باب ہفتم

میر محمد علی حشمت کی صحبت میں رہ کر مجھے جلد ہی شعر و سخن میں دلچسپی دوبارہ پیدا ہو گئی۔ میرے زمانے کے شہر دہلی میں تو مولانا جمالی کے سوا کوئی مشہور و معروف استاد فنِ شعر میں نہ تھا اور یہ بھی ہے کہ ان وقتوں کی دہلی میں شعر و سخن کا چرچا اس قدر اور اتنا عام نہ تھا جتنا آج کی دہلی میں تھا۔ کیا فارسی کیا ریختہ، کیا ہندو کیا مسلمان، ہر شخص ناظورۂ شعر کا متوالا اور شمعِ سخن پر مثالِ پروانہ جان دینے والا تھا۔ دہلی کی گلیاں شاعروں، زباندانوں اور استادانِ فنِ سخن سے پٹی پڑی تھیں۔ اپنے مختصر دورِ حیات میں مجھے ان سب سے ملنے تو کیا، ان کے ناموں سے بھی آشنا ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

زبان و کاروبار علم ولسان و بیان کے باب میں سب سے عجب بات یہ تھی کہ یہ لوگ خود کو ایرانیوں سے بہ وجوہ بہتر سمجھتے تھے۔ ٹیک چند بہار اور آنند رام مخلص جیسے لغت داں اور محاورۂ اہل زبان پارسی کے محققین، سراج الدین علی خان آرزو جیسے فنونِ شعر و نحو و لغات میں منتہی المدققین، میاں نور العین واقف اور خواجہ میر درد اور میرزا مظہر صاحب جان جاناں نقشبندی جیسے جید فارسی گو، جدھر جاؤ نیا عالم نظر آتا تھا۔ صوفی سنتوں اور اہل اللہ اور علما کی تو گنتی ہی نہ تھی۔ خود میرزا مظہر صاحب مغتنمات روزگارِ صوفیہ میں سے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث کے شُہرے مکے مدینے تک تھے۔ پھر ان کے صاحب زادگان، اور علاوہ برآں بزرگواراں حضرت سید حسن رسول نما، حضرت شاہ محمد فرہاد، قطب شہر حضرت شاہ کلیم اللہ صاحب جہان آبادی، جدھر دیکھو علم و عرفان اور معرفت کے چراغ جگمگا رہے تھے۔ سوائی راجہ جے سنگھ ہیئت اور ریاضی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ استاد خیر اللہ مہندس کے شاگرد از ہند تا ایران پھیلے ہوئے تھے۔

مجھ سے کچھ زمانہ قبل میر حشمت کے استاد قبول کشمیری صاحب کے ساتھ بڑا پُر لطف معاملہ گذرا تھا۔ شیخ علی حزیں ایک بد دماغ ایرانی شاعر اور حق یہ ہے کہ بہت مستند شاعر وارد شاہجہاں آباد تھے۔ وہ مقامی لوگوں سے عموماً نفور رہتے۔ ایک بار عبدالغنی بیگ صاحب ان کی ملازمت حاصل کرنے ڈیرے پر ان کے پہنچے تو شیخ علی حزیں نے کہلا دیا کہ شیخ گھر پر نہیں ہیں، ہر چند کہ اندرون خانہ تھے۔ مرزا قبول بیگ صاحب اگلے دن کئی اپنے شاگردوں کے ساتھ، کہ ان میں میر محمد علی بھی تھے، شیخ موصوف کی حویلی پر پہنچے اور کہلا دیا کہ جب تک شیخ ہم سے ملاقی نہ ہوں گے، ہم ان کی راہ دیکھیں گے۔ چار و ناچار شیخ علی حزیں کو دیوان اپنا کھلوا کر ان سے ملنا پڑا۔ میرزا قبول بیگ صاحب اور ان کے شاگردوں نے دیر تک اپنا کلام سنایا کہ آپ کا کلام تو ہم سنتے ہی رہتے ہیں، آج ہمارا کلام آپ سماعت کریں۔ شیخ بچارے جز بز ہوئے اور منھ بنائے سنتے رہے۔ پھر شیخ نے از راہِ تواضع کچھ اپنے کلام سنانا چاہا، مگر وہاں کون سنتا تھا۔ شیخ بہت خفیف ہوئے اور شُہرہ اس بات کا شہر سارے میں پھیلا۔

لیکن بات میر عبدالحیٔ تاباں کی ہو رہی تھی کہ استاد سے ان کی محبت کا ذکر بچے بچے کی زبان پر ان دنوں تھا اور اس سے بھی بڑھ کر شُہرے میر صاحب کے حُسن کے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ میر عبدالحیٔ کے سامنے بڑی بیگمات بھی اگر ہوتیں تو ماند پڑ جاتیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا کہ بادشاہِ وقت اعلیٰ حضرت احمد شاہ پادشاہ غازی بھی کبھی کبھی جب میر صاحب کے دروازے پر سے گذرتے اور میر صاحب گھر اپنے کے باہر نشست گاہ میں تشریف فرما ہوتے تو بادشاہ کسی بہانے اپنا فیل رکوا کر انھیں ایک نظر دیکھ لیا کرتے تھے۔ مجھے میر عبد الحیٔ صاحب کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا، لیکن سوئے اتفاق کہ میں اور وہ کبھی یکجا نہ ہو سکے تھے۔ ملنے کے لیے مواقع تو بہت تھے، لیکن میں ان کے حُسن کے اذکار سے اس قدر مرعوب تھا کہ چاہتا تھا ایسی ملاقات ہو جس میں میر محمد علی صاحب بھی شریک ہوں تا کہ میں پہلے ہی ملنے میں ان سے بے تکلف ہو سکوں۔

اور پھر میر عبدالحیٔ صاحب کی بلانوشیوں کے چرچے، وہ تو چار دانگِ عالم میں گونجتے سے لگتے تھے۔ جہاں بھی ان کا مذکور آتا، لوگ سب سے پہلے یہی پوچھتے، آنجناب عالم سکر میں ہیں کہ عالم صحو میں ہیں؟ ہر چند کہ یہ اصطلاحیں بخود تصوف کے عالم سے تھیں لیکن یہاں اس نہج سے بہت مناسب لگتی تھیں کہ تاباں صاحب جب نشے میں نہ ہوتے تو بڑی عقل کی باتیں کرتے تھے اور نشے کی جھونک میں وہ کسی کو کچھ بھی کہہ گذر سکتے تھے، الا اپنے استاد کے کہ وہ ان کے مرشد اور محبوب اور دوست، سب کچھ تھے۔ کسی کو آج تک یہ

نہ معلوم ہو سکا تھا کہ تعلقات کی تاباں صاحب اور حشمت صاحب کے درمیان نوعیت کیا تھی۔ ان دنوں ایک اور شاعرِ ریختہ شیخ مبارک آبرو کی مثنوی آدابِ معشوق کے مضمون میں بہت ذکر میں آتی تھی۔ انھوں نے جو نصائح معشوق کو کیے تھے ان میں شہوت اور اختلاطِ باطنی تو کیا، اختلاطِ ظاہری بھی کے لیے کچھ جا نہ تھی۔ فرماتے ہیں ؎

پر خبر رکھنا کوئی خندہ نہ ہو — بوالہوس ناپاک دل گندہ نہ ہو
کوئی پاجی یا کوئی لچا نہ ہو — بات کہنا اس ستی بیجا نہ ہو
اب زمانے کے رجالے ہیں کچھ اور — سیکھ کر ہندوستاں زادوں کا طور
گھورتے ہیں خوبصورت کے تئیں — دل میں رکھتے ہیں کدورت کے تئیں
جس کو جانے یوں کہ دل میں پیار نھیں — اس کی جانب دیکھنا درکار نھیں

لیکن اندر کا حال کسے معلوم ہے۔ درست کہ محتسب را درونِ خانہ چہ کار، مگر کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکے ہے۔ ابھی کچھ مدت پہلے ایک شاعرِ ریختہ میر جعفر زٹلی نے امرد پرستی کی ہجو میں بہت شعر لکھے تھے۔ ان سے بڑھ کر یہ کہ اس زمانے کے ایک بہت ہی محترم شاعر فارسی کے تھے میرزا عبدالقادر بیدل، انھوں نے امرد پرستی کے خلاف ایک ہجو لکھی ہے جو خود ہی نہایت فحش ہے۔ مجھے ان باتوں میں کچھ طوع نہ تھا۔ مجھے تو یہ جاننے کی فکر تھی کہ کیا کوئی بندۂ خدا میر محمد علی حشمت سے بھی بڑھ کر حسین ہو سکے ہے۔ میر محمد علی با وصف کہ میری ہی عمر کے تھے اور یہ عمر بڑھاپے کی نہیں تو جوانی کے زوال کی بیٹھک تھی، لیکن وہ مجھے بہت کمسن اور کبھی کبھی اپنی اداؤں کے بباعث الھڑ معلوم ہوتے تھے۔ پھر بھی ان کی آواز اس لوچ اور باریکی اور اونچے سروں سے خالی تھی جن سے امردوں کو متصف کیا جاتا ہے۔ ان کے جسمانی قویٰ کی قوت کا حال میں لکھ چکا ہوں۔ ان کی جرأت کا عالم یہ تھا کہ ایک بار انھوں نے بھرے میلے میں ایک بپھرے ہوئے سانڈ کی سینگیں پکڑ کر اسے بالکل جامد کر دیا تھا۔ جب تک لوگ رسے اور کمندیں لے کر آئیں، کیا مجال کہ سانڈ کہیں ٹس سے مس ہو جاتا۔

عمدۃ الملک امیر خان انجام کے قتل کو ابھی چند ہی برس ہوئے تھے۔ لوگ اکثر انھیں یاد کرتے اور کہتے تھے کہ جس نے عمدۃ الملک امیر خان انجام کو نہ دیکھا ہو وہ میر محمد علی کو دیکھ لے، بس فرق تھا تو اتنا تھا کہ

عمدۃ الملک چھوٹے قد کے تھے اور میر صاحب کا قد کشیدہ تھا۔ عمدۃ الملک کبھی کبھی زنانہ لباس بھی پہن لیتے اور وہ بھی ان پر بہت پھبتا تھا۔ میر محمد علی کو تحویل لباس کا کوئی شوق نہ تھا۔ عمدۃ الملک سے متوسل وہ بھی رہے تھے اور ان کے قتل کے بعد نواب قطب الدین خان کے یہاں ان کا آنا جانا ہو گیا تھا۔ یہیں ان کی ملاقات میر عبد الحئی تاباں سے ہوئی۔ تاباں ان دنوں شاہ حاتم کے شاگرد تھے لیکن میر حشمت سے ملتے ہی ان کے گرویدہ اس قدر ہوئے کہ ان کے شاگرد ہو گئے اور انھیں کے ہو رہے۔

میر عبد الحئی تاباں مدت سے قزلباش خان امید کی سرکار سے متوسل تھے۔ مشہور تھا کہ میر صاحب کے گھر پر ہر شام نوخیز خوش جمالوں کی محفل جمتی۔ تاباں ان میں سے چند کو قزلباش خان امید کی حویلی پر رقص و موسیقی کی مجلسوں اور شاید کچھ کو شب باشی کے لیے بھی لے جاتے۔ واللہ اعلم۔ میں نے اپنی تھوڑی سی مدتِ ملاقات میں ایسی کوئی بات نہ دیکھی، الّا یہ کہ تاباں صاحب کا منظورِ نظر ایک نوخیز، سبزہ آغاز، معشوق صفت لڑکا سلیمان نامی تھا اور وہ اس کے بغیر کہیں نہ جاتے تھے۔ لیکن میر محمد علی صاحب کے یہاں جلسوں میں میاں سلیمان ہمیشہ حاضر نہ رہتے، یہ بھی میں نے سنا۔ میر عبد الحئی کا دوسرا آماجگاہ میرزا مظہر صاحب جانجاناں کا جماعت خانہ تھا۔ وہ وہاں تیسرے چوتھے البتہ حاضر ہوتے، شعر و سخن کی بات ہوتی، کچھ لطیفے اور مطایبے سنے سنائے جاتے، پان اور قہوے کا دور چلتا۔ گھڑی دو گھڑی بعد یہ انجمن اٹھ جاتی اور میرزا صاحب کے درس اور بیاناتِ معرفت و تعلیمِ عرفان اور تلقینِ خیرات کا دور چلتا جو بعد عشا بھی جاری رہتا۔ ان مجلسوں میں صرف خاص خاص مریدین شامل ہو سکتے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صحبتیں اٹھانے والا اور ایسے شب و روز گذارنے والا سید زادہ، اور قزلباش خان امید، یا کسی اور کے یہاں امارد و لوطیان کو بار دلوانے کا وسیلہ بنتا ہو۔ میں نے تو انھیں بہت ہی کم دیکھا لیکن ہمیشہ سنجیدہ اور بردبار دیکھا۔ ہاں ہنسی ٹھٹول اور لطیفہ بازی کی بات اور ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری پہلی ہی ملاقات میں پہلی بات جو میں نے ان سے سنی وہ ایک لطیفہ تھا۔

جو کہ میں محمد علی صاحب کی حویلی کے بہت قریب تھا لہٰذا نمازِ عشا کے فوراً بعد وہاں پہنچ گیا۔ محمد علی صاحب نے مجھے کہا تھا کہ آج عشا کے بعد میرزا صاحب کی محفل سے اٹھ کر عبد الحئی ادھر آویں گے۔ تم بھی آنا، کچھ خاص دوست اور ہوں گے، سب مل کر دھمال مچائیں گے۔ کچھ شعر خوانی بھی ہوگی۔ میاں تاباں نے ایک غزل مجھ پر لکھی ہے، اسے سنانے کے بے حد وہ مشتاق ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میر عبد الحئی اگر میرزا

صاحب جیسے متدین بزرگ کے وہاں جائیں گے تو غالباً شراب پی کر نہ جائیں گے۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ حشمت صاحب کے دیوان خانے میں قدم دھرتے ہی تاباں نے استاد کے ہاتھ چومے، قدم چھوئے، ان کے رخساروں کو بوسہ دیا، پھر ہاتھ باندھ کر مسکراتے ہوئے بولے:

''استاد کو معلوم ہے بندے نے شام کہاں گذاری۔ قسم ہے خواجۂ شیراز کی، حلق سوکھتا ہے، جان لبوں تک آئی ہے۔ للہ ساقیٔ کوثر کا صدقہ اس سرخ و سفید ارمنی کو گلے لگالوں تو خدمت میں حضور کی ایک گرم لطیفہ گذرانوں۔''

میر محمد علی مسکرائے، ایک نوکر دائیں جانب مؤدب کھڑا تھا۔ آنکھ کا اشارہ پاتے ہی سدھا ہوا خدمت گار بغل کا پردہ ہٹا کر اندر گیا اور پل مارتے میں ایک تھالی میں دو لمبی پتلی گردنوں والے شیشے اور ایک تھالی جوڑ جام نقشین اور چند پیالوں میں کاجو، اخروٹ، بادام لے آیا اور پورا سامان اس نے نہایت ادب اور اہتمام سے تاباں صاحب کے سامنے ایک تپائی پر دھر دیا۔ ایک شیشے میں سرخ رنگ کا مشروب تھا، ایک میں بالکل بے رنگ۔ میں ان شرابوں سے بالکل ناواقف تھا۔ لفظ ارمنی سے میں نے گمان کیا کہ یہ ارمنی یا پرتگالی شرابیں ہوں گی۔ تاباں اس درمیان قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے حشمت صاحب کے زانو بزانو بیٹھ چکے تھے۔ حشمت صاحب نے فرمایا:

''اماں شیخ سلارو، گل محمد صاحب بھی تو شوق فرمائیں گے۔ ان کے لیے تو جام تم لائے نہیں۔''

''میاں، بھول ہوگئی۔ ابھی حاضر کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیخ سلارو نے معاً ایک جام اسی کے جوڑ کا لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ تاباں صاحب نے بھنڈے سے شوق کرنا شروع کر دیا تھا اور آئندہ لمحات میں دختِ رز سے ہم آغوشی کے رنگین تصور نے ابھی سے ان کی آنکھوں میں گلابی ڈورے لانے شروع کر دیے تھے۔ مجھے بھی موقع ملا کہ میں تاباں صاحب کو ٹھیک سے دیکھ سکوں۔

اگر محمد علی حشمت کا حُسن مردانہ رنگ میں وجاہت اور نسائی رنگ میں نزاکت کا انتہائی نمونہ تھا تو عبد الحیٔ تاباں کا حُسن نسائی رنگ میں صباحت اور مردانہ رنگ میں نزاکت کا نمونہ تھا۔ عمر اُن کی کوئی چونتیس یا پینتیس رہی ہوگی لیکن ان کے اوپر حُسن اس طرح پھوٹا پڑتا تھا کہ کمسن لگتے تھے اور جتنے وہ کمسن لگتے تھے اتنے ہی باوقار، تمکنت سے بھرپور اور رعب دار تھے کہ مجھے یقین تھا یہ شخص اگر لچوں، شہدوں، بازاری اچکوں میں تنہا بھی گھر جائے تو کوئی اس کے قریب آنے کی جرأت نہ کر سکے گا، چھو لینا تو بہت بڑی بات ہے۔ یہ سب

تھا، پر اپنے حُسن اور جوانی پر اترا ونے کا کہیں سے اشارہ تک نہ تھا۔

درست کہ کثرتِ شراب نے ان کے بشرے پر کچھ ایسی چونے جیسی خشکی سی پھیر دی تھی کہ دوسری نظر میں ان کے چہرے پر تھوڑی سی فرسودگی کا سا اثر جھلکتا ہوا لگا تھا مگر کیا مجال کہ کوئی انھیں بیس چوبیس برس سے زیادہ کا سمجھ لے۔ سر پر ریشمی چیرہ، جس میں سنہری اور سبز نیلی دھاریاں پر طاؤس کا گمان پیدا کرتی تھیں۔ بہت گورا رنگ، ستواں ناک لیکن بیچ میں ذرا سی اُٹھی ہوئی، بڑی بڑی روشن اور باخبر آنکھیں سبزی مائل نیلگوں، چہرے پر خط لیکن ہلکا اور سلیقے سے ترشا ہوا۔ مونچھیں باریک، بالکل خط کے برابر، لیکن ان پر ذرا سے بل کا گمان ہوتا تھا۔ کتابی چہرے پر کلے کی ہڈیاں ذرا نمایاں، لیکن مغل بادشاہوں جیسی نہیں۔ ڈھاکے کی ہلکی زرد ململ کا کُرتا، اس پر انگرکھے (اب میں اس لباس کا نام جان گیا تھا) کی جگہ ٹخنوں تک پہنچی ہوئی قبا جس کے بند سب کھلے ہوئے تھے۔ قبا کا رنگ سنہرا سبز، تافتہ لیکن کچھ بنارسی پوت کی جھلک لیے ہوئے۔ فاختئی رنگ کا ریشمی مگر سادہ پائجامہ، کمر میں قرمزی ڈوپٹہ، لیکن قبا کے کھلے ہونے کی وجہ سے بہت ڈھیلا بندھا ہوا۔ گلے میں تسبیح کے دانوں کے برابر یاقوت اور زمرد کے بیضوی دانوں کا ہار، اور اس پر سے کلابتو کے پرتلے سے شانہ و گردن میں تعبیہ کیا ہوا خنجر، کہ جسے دیکھیے تو تعجب بھی ہو اور لطف بھی آئے کہ کیا بہار آسا انداز ہے۔ دونوں ہاتھوں کی ایک ایک انگلی میں انگوٹھی اور داہنی کلائی میں آبنوسی ایک چوڑا، بالکل سادہ، جو گوری کلائی پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سارے بدن میں ان کے کچھ آبداری سی تھی، جیسے پردے کے پیچھے شمعیں جلتی ہوں۔

اگر چند کہ لوگ کہتے تھے، اور خود شعرا بھی کہتے تھے کہ حسینوں کے منھ پر خط آ جائے پر حُسن زائل ہو جاتا ہے، چنانچہ خود حشمت صاحب کا یہ شعر بہت مشہور تھا۔

خط نے ترا حُسن سب اڑایا
یہ سبز قدم کہاں سے آیا

جو کہ خط کو سبزے سے تشبیہ دیتے ہیں اور منحوس شخص کو بد قدم بھی کہتے ہیں اور سبز قدم یا سبز پیرا بھی کہتے ہیں، پس دوسرے مصرعے کا لطف بیان سے باہر ہے اور پھر قدم کی مناسبت سے آیا بھی بہت خوب ہے۔ میر عبدالحیٔ تاباں نے بھی کہا تھا اور سبزی کی مناسبت دے کر بہت نئی بات کہی تھی۔

وہ رنگ کہ تھا جس کی ملاحت کا نپٹ شور
اس رنگ پہ کس طرح سے سرسبز ہوا خط

یہاں بھی یہ لطف ہے کہ سانولے شخص کو سبزہ رنگ کہتے ہیں اور خط کو سبزہ کہتے ہی ہیں۔ لہٰذا خط کا سرسبز ہونا ایک نیا مضمون بن گیا ہے جو حسینوں کے خلاف بھی جاتا ہے اور موافقت میں بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب صحیح، پر حشمت اور تاباں صاحبان کے منہ پر خط اتنا بھلا لگتا تھا کہ واقعی جیسے سبزہ زار آنکھوں میں کھبا جا رہا ہو۔

میر محمد علی کی طرح میر عبدالحیٔ نے بھی محسوس کیا کہ میں انھیں دیکھ رہا ہوں، اور جس طرح میر حشمت اپنے دیکھنے والوں سے باخبر لیکن بے پروا نظر آتے تھے، بالکل وہی انداز تاباں کا تھا۔ جب انھوں نے قرینے سے سمجھ لیا کہ میں انھیں ٹھیک سے دیکھ چکا ہوں، تو میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولے:

''واللہ حضت، آپ ہی ہیں مولوی گل محمد،'' انھوں نے نیم قد اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ ''ہمارے حضرت بکثرت ذکر آپ کا کرتے رہتے تھے، اس قدر کہ مجھے بھی اشتیاق بیحد تھا کہ بالمواجہ آپ کو دیکھوں۔ بارے آج وہ ارمان پورا ہوا۔''

باوجود اس کے کہ میاں تاباں عمر میں مجھ سے بہت چھوٹے تھے میں نے سروقد اٹھ کر انھیں تعظیم دی اور مسکرا کر کہا: ''امیدوار ہوں بارگاہِ الٰہی میں کہ مجھ سے مایوس نہ ہوئے ہوں۔''

''مایوس، بھلا مایوس کیوں، میں نے تو آپ کو اس سے بھی بہتر پایا جیسا کہ اعلیٰ حضرت نے فرمایا تھا۔ لیجیے، شوق فرمایئے۔'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے بھنڈے کی نے، اور ایک جام بھر کر میرے سامنے رکھا اور ایک خود اپنے لیے بھر کر غٹاغٹ چڑھا گئے۔ واللہ کمال ہے، میں نے دل میں کہا، بلانوشی ہو تو ایسی ہو۔ انھوں نے شاید میری نگاہوں سے کچھ بھانپ لیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے:

''جی جناب من، ہمارے اعلیٰ حضرت کے دوست اور کرم فرما حضرت خواجہ ناصر عندلیب کے صاحب زادے میر درد اطال اللہ عمرہم کا ایک مطلع ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں ؎

نشہ کیا جانے وہ کہنے کو مے آشام ہے شیشہ
جہاں میں دختر رز سے عبث بد نام ہے شیشہ

کیوں مولوی صاحب، سچ کہنا۔ میر درد صاحب ابھی نامِ خدا جوان بلکہ کمسن ہیں کہ ناچیز سے چھوٹے عمر میں ہیں، بھلا ایسا شعر اعجاز نہیں تو اور کیا کہا جائے گا؟''

میں نے دل ہی دل میں شعر پر وجد کیا اور اس سے زیادہ اس بات پر کہ تاباں نے کس خوبصورتی سے بلانوشی کے اعتراض سے بری اپنے کو کرلیا تھا اور اس کی دلیل بھی یوں پیش کی تھی کہ خود کو انسان نہیں بلکہ شیشۂ شراب قرار دیا تھا۔ اللہ اللہ میرے زمانے میں ایسے شعر گو فارسی میں بھی نہ تھے، ہندی تو بچاری ابھی گھٹنیوں چلنا سیکھ رہی تھی۔ لیکن یہ بات میں کسی سے کہہ نہ سکتا تھا۔ میرے دل میں گھٹن ہونے لگی۔ پر یہ تو دھندا روز ہی کا تھا، کن کن امور پر اپنا کلیجا میں پانی کرتا۔

''سبحان اللہ،'' میں کہا۔ ''میر صاحب کی روشن ضمیری کی داد دوں کہ دوسرے میر صاحب یعنی خواجہ میر صاحب کے کلام بلاغت التیام پر سر دھنوں۔ واللہ مجھے تو یوں ہی سرور ہو گیا۔''

عبدالحئ تاباں مسکرائے۔ اس بیچ وہ پہلا جام خالی کر کے دوسرے کو نصف حلق میں اپنے اتار چکے تھے اور میں نے دو ہی جرعے ابھی نذرِ دل و جگر کیے تھے۔ میر محمد علی حشمت نے میری جانب ہمت افزایانہ دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں، مولوی صاحب اپنی چال آپ چلیں، میر عبدالحئ کو اپنے حال پر چھوڑیں۔ ان کے لچھن ہی اور ہیں ان کے طور ہی دیگر ہیں۔

میں یہ پوچھنے کی ہمت کرنے والا تھا کہ خود محمد علی صاحب کے ہاتھ میں جام کیوں نہیں ہے کہ ان کے ملازم نے افیون کی پیالی اور ایک فنجان میں قہوہ، اور ایک بڑی پیالی میں چائے کشتی میں لگا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ حشمت صاحب نے گھولوے سے ایک چسکی لی، گرم میٹھی چائے کا ایک گھونٹ پیا اور کچھ لطف کے سے عالم میں آنکھیں بند کر کے ایک بار جھوم گئے۔ پھر جو آنکھیں انھوں نے کھولیں تو وہ کچھ اور بھی دلآویز لگ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ افیونیوں کی آنکھیں چندھیائی ہوئی سی ہوتی ہیں اور افیون کے سرور کے ساتھ ساتھ ان کی چوندھ افزوں ہوتی جاتی تھی۔ مگر وہ محمد علی حشمت ہی کیا جو ہر بات میں دُنیا سے نرالا نہ ہو۔

عبدالحئ صاحب دوسرا جام خالی کر کے تیسرے کی تیاری کر رہے تھے کہ ملازم نے اندر آ کر سکھ راج سبقت کے ورود کی خبر دی۔

''اھلاً و سھلاً۔ فوراً تشریف لے آئیں۔'' میر حشمت نے کہا۔ ''میاں سلارو، لالہ صاحب کے لیے بھی جام کا بندوبست کرو۔''

''بہت بہتر جناب،'' کہہ کر سلارو میاں باہر گئے اور فوراً ہی سبقت صاحب کو لے کر اندر آئے۔ میر حشمت نے نیم قد کھڑے ہو کر اور ہم دونوں نے سرو قد ہو کر تعظیم دی۔ سبقت صاحب جھک کر حشمت صاحب سے بغل گیر ہوئے اور ہم لوگوں سے مصافحہ کر کے اپنا داہنا ہاتھ بائیں طرف سینے پر رکھا، گویا کہہ رہے ہوں آپ کی جگہ ہمارے دل میں ہے۔

میرزا عبدالقادر بیدل کے شاگرد سکھراج سبقت کو دہلی کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ وہ لاجواب فارسی گو اور علم مجلسی کے ماہر تھے۔ اعتماد الدولہ معین الدین خان عرف میر منو سے متوسل تھے اور ان کی شہادت کے بعد اب وہ اپنا خاندانی کام دیکھنے لگے تھے۔ ان کا یہ شعر ساری دہلی میں ضرب المثل تھا۔

او بفکر منت و من فارغ
بندگی ہا خدایئے وارد

عبدالحیٔ تاباں صاحب سے ان کی پرانی دوستی تھی، ہر چند کہ وہ عمر میں ان سے بڑے تھے۔ یہی بات کشن چند اخلاص صاحب کے ساتھ بھی عبدالحیٔ تاباں کی تھی کہ عمر میں بڑے ہونے کے باوجود وہ اخلاص صاحب کے زمرۂ دوستاں میں شامل تھے، چنانچہ ان کا شعر ہے۔

سخن میں ان کے محبت کی بو ہے اے تاباں
رکھیں ہیں تب تو کشن چند جی سے ہم اخلاص

اخلاص صاحب کو گذرے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ سبھی لوگوں کے دلوں میں ان کی جگہ باقی تھی اور پھر ان کا تذکرۂ شعرا موسوم بہ ''ہمیشہ بہار'' اکثر گفتگو کا موضوع بنتا تھا۔ سکھ راج سبقت نے بعد مصافحے اور معانقے کے کہا:

''اجی میاں عبدالحیٔ، کئی دن سے دل تمھارے لیے ہوک رہا تھا۔ آج ادھر سے گذرا تو ہر چند کہ ساعت بے ساعت ہوتی تھی، جی نہ مانا کہ یہاں میر صاحب کی ملازمت کو حاضر نہ ہوں۔ اور دل سے میں نے کہا کہ تمھاری بھی خیر خبر مل جائے تو سونے پر سہاگا سمجھیو۔ پس یوں ہی ہوا۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔''

''اعلیٰ حضرت کی بارگاہ کو اپنا ہی دربار سمجھیے جناب۔ میں ہمیشہ یہی عرض کرتا تھا۔'' تاباں نے کہا۔ ''بارے آج آپ کو اللہ نے توفیق دی۔ لیجیے شوق فرمایئے،'' انھوں نے شراب کی صراحی کی طرف اشارہ کر

کے کہا۔

اس بار جو شراب تھی وہ شیشے میں نہ ہو کر صراحی میں تھی۔ اغلباً وہ فرنگی نہ رہی ہو۔ میرے زمانے میں فرنگی شراب اور شراب ہی کیوں، تمامی اہل فرنگ کو کوئی جانتا پوچھتا نہ تھا لیکن اب ان کی شرابیں اور کہیں کہیں ان کی فوجیں بھی متداول ہو رہی تھیں۔ میں پرانے وقت کا سپہ گری پیشہ، مجھے ان سب اعلیٰ شرابوں کے لیے کہاں ظرف تھا۔ فرنگی سرخ شراب کا ایک جام جو میں چڑھا چکا تھا وہی مجھے بڑی تلخ اور سخت نشہ آور لگ رہی تھی۔ خدا جانے جو لوگ انھیں پیتے تھے ان کے کام و دہن عادی ہو جاتے ہوں گے۔

سکھ راج سبقت کی تشریف آوری سے مجھے ایک موقع گفتگو میں براہِ راست حصہ لینے کا ملا۔ میں نے تاباں کو یاد دلایا کہ وہ لطیفہ ابھی باقی ہے۔ میر حشمت نے بھی کہا کہ ہاں ان کا تو دماغ سرورِ شراب سے گرم ہو چکا ہوگا، میر عبدالحیٔ وہ لطیفہ تو سناؤ جو موعود تھا۔

تاباں کے چہرے پر شراب نے کچھ نئی ہی شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ گورے چہرے پر سرخی کی بہار عجب پھبن دے رہی تھی۔ منہ تمتما گیا تھا اور آنکھوں میں سرور کے ڈورے اس طرح لہرا رہے تھے جیسے غروب آفتاب کے فوراً بعد شفق کے لہریے سیاہ آسمان پر دوڑتے چلے جا رہے ہوں۔ پتلے پتلے ہونٹوں سے خون سا ٹپک رہا تھا۔ لیکن نہ ان کی آواز میں لرزش تھی اور نہ زبان میں کسی بھی قسم کی رکاوٹ۔ بالکل پہلے ہی کی طرح تن کر بیٹھے تھے گویا ابھی ابھی آئے ہوں۔ میری زبان پر بے ساختہ میرزا جلال اسیر کا مصرع آ گیا.... ؎

شراب روغن گل شد چراغ رنگ ترا

میر محمد علی کہاں تو افیون کے ہلکے سرور میں تھے اور کہاں دفعتاً اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''ہائے ظالم کیا مصرع پڑھا۔ محفل کا سرور دوبالا بلکہ سہ بالا کر دیا۔ خدا خوش رکھے۔ کس کا ہے؟'' یہ کہہ کر انھوں نے عجب شیریں لحن سے مصرع پھر دُہرایا۔ میں نے پہلی بار انھیں شعر پڑھتے سنا تھا کہ کلام اپنا وہ سناتے نہ تھے۔ ان کی آواز میں ایسی جادوگرانہ لرزش تھی کہ اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ادھر سکھ راج سبقت اور عبدالحیٔ تاباں بھی اسی مصرعے کی کیفیت سے مغلوب تھے۔ تاباں کے چہرے پر اب بھی کسی حیا کا تاثر نہ تھا، گویا وہ ایسی توصیف کو اپنا حق فطری سمجھتے ہوں۔ خوش وہ بہت تھے، لیکن انکسار اپنے حُسن کے باب میں انھیں بالکل نہ آتا تھا۔

’’میرزا جلال اسیر کا مطلع ہے جناب۔‘‘ اب میں نے پورا شعر پڑھ دیا۔

پیالہ رنگ دگر زد رخ فرنگ ترا
شراب روغن گل شد چراغ رنگ ترا

’’ہائے ہائے،‘‘ میر محمد علی نے زانو پر ہاتھ پٹک کر کہا۔ ’’سبقت صاحب ذری دیکھیو، بے چارہ ملک ہند کبھی نہ آیا لیکن ہمارے رنگ کا شعر کہتا تھا۔‘‘

’’درست فرمایا۔ یہ ہماری طرز ہے، ہماری ادا ہے۔ اہل ایران بچارے اسے کیا جانیں اور کیا سمجھیں۔‘‘ سبقت صاحب نے کہا۔

تاباں نے بڑی بڑی روشن آنکھیں کھولیں۔ ’’ہمارے خان آرزو صاحب غلط تھوڑا ہی کہتے ہیں۔ ان روزوں اہل ہند ہی اہل زبان ہیں۔‘‘

میں ذرا مشوش ہوا کہ اب زبان اور شاعری کی باریک بحثیں چھڑ جائیں گی تو میرا کیا ہوگا۔ گذشتہ دو صدیوں میں جو ہوا تھا میں اس سے بیگانۂ محض تھا۔ جلال اسیر صاحب کا یہ شعر تو مجھے اس لیے یاد تھا کہ کل ہی پرسوں کہیں قوالی ہو رہی تھی۔ میں ذرا کی ذرا ٹھہر گیا تھا کہ سنوں کیا پڑھا جا رہا ہے۔ بس یہ شعر میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ میں نے فوراً عرض کیا:

’’بجا اور درست۔ مگر صاحب وہ لطیفہ.....؟‘‘

’’ہاں صاحب، وہ لطیفہ تو سنوایے میر عبدالحئ۔‘‘ میر حشمت نے فرمایا۔

’’جی، عرض کرتا ہوں۔ وہ جو ایک صاحب ہیں، نئے نئے منصب دار بنے ہیں۔ پہلے ان کے یہاں پھلوں کی آڑھت ہوتی تھی.....‘‘

’’بس ٹھیک ہے میر عبدالحئ،‘‘ حشمت نے کہا۔ ’’ان کا نام زبان پر نہ آئے تو انسب ہے۔‘‘

’’بہت درست پیر و مرشد۔ تو ان صاحب نے سن رکھا تھا کہ عمدۃ الملک شہید جب نور بائی صاحب کے وہاں تشریف لے جاتے تو دونوں میں چوٹیں چلتی تھیں۔ اب ان بچاروں میں نہ وہ سلیقہ، نہ وہ بذلہ سنجی، انھیں مگر شوق پیدا ہوا کہ نور بائی نہ سہی شمشاد بائی تو ہے، اور عمدۃ الملک امیر خان نہ سہی، ہم تو ہیں۔‘‘

’’چہ خوش، کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی،‘‘ حشمت نے کہا۔ ’’خیر، تو پھر؟‘‘

''جی، وہ تشریف لے گئے۔ شمشاد بائی نے ان کی تواضع نچلی منزل میں نہ کی، بالا خانے میں انھیں بار دی، گویا بڑا خیال کیا۔ اب اس گاؤدی احمق زماں کو دیکھیے کہ وقت رخصت کہتا ہے، بائی صاحب، بالا خانہ اپنا تو آپ نے بہت خوب دکھایا لیکن وہ آپ کی نچلی منزل کہاں ہے، اس کا راستہ کہاں سے ہے؟''

''لاحول ولا قوۃ کیا بد مذاقی ہے۔'' سبقت صاحب نے کہا۔

''جی ہاں۔ تو بائی صاحب بولیں، سرکار اسی منزل سے تو ہو کر تشریف لائے ہیں۔''

بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ اس اثنا میں کئی لوگ اور بھی آتے گئے تھے۔ شرف الدین پیام صاحب کو تو میں پہچانتا تھا۔ اوروں میں سے کچھ کے نام سے آشنا تھا اور کچھ کو بالکل نہ جانتا تھا۔ دیر تک محفل رہی۔ میں نے دیکھا کہ بظاہر تو ان لوگوں کو شعر و شاعری اور عاشقی و معشوقی کے سوا کچھ کام نہ تھا، مگر درحقیقت یہ لوگ زمانے کے سرد و گرم سے آشنا اور وقت کے بدلتے ہوئے طوروں سے خوب واقف تھے۔ اس رات بھی جو باتیں اکثر ذکر میں آئیں ان میں نادر گردی تھی جسے کوئی دس بارہ برس ہو چکے تھے لیکن ان زمانوں میں دہلی پر جو بیتی تھی اسے کوئی بھلا نہ سکا تھا۔ اس وقت کی آفت اور قتل اور غارت اور تاراجی کے اذکار سے زیادہ جو بات سب لوگوں کی زبان پر تھی وہ محمد شاہ بادشاہ غازی فردوس آرام گاہ کے امرا اور عمائد اور سردارانِ مملکت کی آپسی رقابتیں، عداوتیں اور خود غرضیاں تھیں۔ سب کو اس بات کا رنج تھا کہ دتی کی شان اور رونق بھلے ہی واپس آ گئی ہو لیکن حکومت اب اس طرح کی اور اس نہج پر نہ ہو گی جب تک بادشاہ اور اس کے امرا مل کر سر جوڑ کر نہ بیٹھیں اور اتحاد کو قائم رکھیں۔ دہلی اب مرکزِ عالم نہ رہے گا اگر یہی لیل و نہار رہے۔

محفل ختم ہونے کو تھی، کچھ لوگ اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ تاباں نے کہا:

''پیر و مرشد، ایک بات تو رہی جاتی ہے۔ وہ جو غزل میں نے آپ کی مدح میں لکھی تھی....''

محمد علی حشمت مسکرائے۔ ''میں امید کر رہا تھا کہ تم وہ بات بھول گئے ہو گے۔ چلو خیر سناؤ۔ حضرات سماعت فرمائیں، میاں تاباں نے مجھ ہیچ مداں کے ذکر میں کچھ شعر کہے ہیں۔''

سب لوگ پھر سے متوجہ ہو گئے۔ تاباں دوزانو بیٹھ گئے اور انھوں نے غزل شروع کی۔

ہوا ہوں اس جہاں میں دل سے تیرا آشنا حشمت
کروں میں دولتِ دُنیا کے تیں اب لے کے کیا حشمت

جو تیرا آشنا ہو اس کو سیم و زر سے کیا حاجت
میں تیرے ربط کے تیں جانتا ہوں کیمیا حشمت

نہ ہوں محتاج دُنیا میں کسی شاہ و گدا کا میں
رہے لطف و کرم ایسا ہی گر مجھ پر ترا حشمت

تری باتوں میں اپنا درد و غم سب بھول جاتا ہوں
کروں کس طرح تجھ کو آپ سے اک دم جدا حشمت

ہے سب کو آرزو ظل ہما کی مجھ کو کیا پروا
قیامت تک رہے سر پر مرے سایہ ترا حشمت

سخن کے بحر میں آ کے مری کشتی تباہی تھی
کنارے آ لگی جب سے ہوا تو ناخدا حشمت

پرستش کیوں نہ دُنیا میں کریں ہم اس کی اے تاباں
ہمارا قبلہ حشمت دین حشمت رہنما حشمت

سایہ ترا حشمت والا شعر بہت پسند کیا گیا اور بار بار پڑھوایا گیا۔ اس میں یہ بھی کنایہ تھا کہ اگر حشمت کا سایہ مجھ پر تا قیامت رہے گا تو میں بھی تا قیامت رہوں گا۔ کسی کو کیا خبر تھی کہ قیامت بہت دور اور موت بہت نزدیک تھی اور یہ سارا اچکھنا دم کے دم میں اٹھ جاوے گا۔ مجھے یہ بات اس غزل میں بہت لحاظ کے لائق لگی کہ کسی بھی شعر، بلکہ کسی بھی لفظ سے عشق اور ہوس اور معشوقی کی خفیف ترین بو بھی نہ تھی۔

محفل اٹھی تو میں بھی کوچہ چیلاں اپنے گھر کو چلا، سکھ راج سبقت صاحب بھی میرے ساتھ چلے کہ ان کا ڈیرہ حوض قاضی میں معین الملک کی حویلی کے پاس ہی تھا۔ راستے میں وہ بار بار جلال اسیر کا مطلع پڑھتے اور داد دیتے رہے۔

باب ہشتم

چند مہینے یوں ہی گذرے۔ تاباں، حشمت، اور دوسرے کئی شعرا سے بھی ملنا ملانا ہوتا رہا۔ ایک آدھ بار میں نے میرزا رفیع، شاہ حاتم اور صرف ایک بار میاں میر تقی میر کو دیکھا اور سنا۔ شعر گوئی مجھ سے پھر بھی ہمیشہ کی طرح روٹھی ہی رہی، ہاں دہلی کی شعر سے معطر اور تر فضا میں مجھے شعر شناسی البتہ آ گئی۔ مزید علیہ، خود کو دہلی کے گلی کوچوں سے آشنا کرنے اور یہاں اپنا دل پوری طرح لگانے کے سب جتن میں نے کیے اور اس میں مجھے یک گونہ کامیابی ہونے لگی تھی کہ ایک بات ایسی ہوئی جس نے مجھے یقین دلا دیا کہ اس دُنیا میں انصاف نہیں ہے اور میرے مقدر میں یوں ہی محروم رہنا اور تنہا بھٹکنا لکھا ہے۔ کبھی کبھی جی میں آتی، شادی کر لوں۔ گھر بسا لوں گا تو زندگی میں اور ذہنی حالت میں اعتدال آئے گا لیکن دوسری شادی کے خیال سے وحشت اور آشفتگی پیدا ہوتی تھی۔ جیسے میں اپنی بیاہی بی بی کو چھوڑ کر اس پر سوت لا رہا ہوں۔ ہر چند کہ دو سے زیادہ صدیوں کے بعد میری بی بی کیا میرا خاندان بھی شاید کہیں نہ ہوگا، مگر پھر بھی یہ مجھے بڑی بے وفائی لگتی تھی۔

پایان کار میں نے خود کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ننگل خورد کسی کو بھیج کر معلوم کراؤں کہ وہاں میرے لوگ کوئی ہیں کہ نہیں اور ہیں تو کس حال میں ہیں۔ کئی دن انتظار کیا۔ راتوں کو بُرے خواب دیکھتا اور دن کو سب کی سلامتی دعا کرتا۔ میں اس قدر وارفتہ ہو رہا تھا کہ یہ بھی نہ سمجھا کہ اب ڈھائی صدی بعد میں کس کی سلامتی کے لیے دست بدعا ہو سکوں گا۔ بالآخر میرا ہرکارہ واپس آیا۔

میر گھر تو کیا، وہاں میرا گاؤں بھی اب نہ تھا۔ بہت پوچھ گچھ کے بعد پتہ لگا کہ بہت دن پہلے، کوئی ہزاروں برس پہلے، ننگل ندی، جس کے کنارے میرا گاؤں آباد تھا، بُری طرح چڑھ آئی تھی۔ اسی زمانے میں جمنا میں بھی زبردست باڑھ آئی اور جمنا کا بہت سارا پانی نہر کے بند توڑ کر نہر کو ہڑپ کر کے چاروں جانب پھیل گیا۔ اس دوطرفہ یلغار نے میرے گاؤں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر نیست و نابود کر دیا۔ اب وہاں کچھ ویران زمینیں ہیں اور زیادہ تر جنگل ہیں۔

ہزاروں برس؟ ہزاروں نہیں، صدیوں برس تو ہو ہی گئے تھے۔ کیا عجب میرے دوسری بار دہلی جانے کے فوراً بعد یہ قیامت ٹوٹی ہو۔ لیکن مجھ پر تو آج ٹوٹ رہی تھی۔

میں کئی دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ اکثر راتوں کو چراغ بھی نہ جلنے دیتا، ماما کے گھر چلے جانے کے بعد چراغ بجھا کر کھانا کھائے بغیر منہ لپیٹ کر پڑ جاتا۔ صبح کو ماما کے آنے سے پہلے زیادہ تر کھانا محلے کے کتوں، آوارہ گایوں، سانڈوں، بلیوں کو جلد جلد کھلا کر پھر آ کر پڑ رہتا۔ ماما آتی تو یوں آنکھیں ملتا ہوا اٹھتا گویا ابھی آنکھ کھلی ہو۔

مانا کہ یہ سب بے فائدہ، بے مزہ، بے صرفہ تھا۔ یہ بات تو مجھے شروع ہی سے معلوم تھی کہ میرا کوئی نہیں ہے، گھر بھی نہیں ہے، اقارب بھی نہیں ہیں، سنگی ساتھی بھی نہیں ہیں۔ میں درحقیقت ایک جنات ہوں جو انسان کی جون میں زبردستی ڈال دیا گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں امید کا ایک تار سا معلق تھا کہ شاید....

اس شاید کی جھونک ایسی تھی جو مجھے امید کے پالنے میں جھلائے جاتی تھی۔ چلو میری بی بی بیٹی بیٹا وہاں نہ ہوں گے، ان کے اعقاب تو ہوں گے۔ سگے نہ ہوں گے رشتے کے تو ہوں گے۔ کچھ نہ ہوگا تو میرا گاؤں تو ہوگا۔ کوئی تو میری زمینوں کی کاشت کر رہا ہوگا۔ میرا پرانا باغ سوکھ گیا ہوگا، دیمک کھا گئے ہوں گے لیکن اس کی جگہ نیا باغ تو کسی نے لگا لیا ہوگا۔ اس میں پپیہے اور کوئلیں تو کوکتی ہوں گی۔ اس پر بارش کی پہلی پھوار سے گرد آلود آم کے پھلوں کا منہ تو اب بھی دھل جاتا ہوگا؟

لیکن عینی شاہد اور عقلی شاہد سب میرے خلاف تھے۔ تو اب میں جی کر کیا کروں گا؟ خودکشی بھی تو کوئی بات ہے۔ میر محمد علی اور میر عبدالحئ میرے لیے گور و کفن تو مہیا کر ہی دیں گے مگر خودکشی تو حرام ہے۔ میری دادی کہتی تھیں خودکشی کرنے والا بدروح بن جاتا ہے.... تو میں کیا کسی بدروح سے کم ہوں....؟

کئی دن اور گذرے۔ اب میری ماما کو بھی شک ہونے لگا تھا کہ شاید میاں کے حواس بجا نہیں ہیں۔ مجھ سے تو اس نے کچھ نہ کہا مگر محلے والوں تک دبی زبان سے بات پہنچا دی۔ دلّی والوں کو تو ایک تماشا درکار ہے، چاہے وہ گھر ہی پھونک کیوں نہ ہو۔ جہاندیدہ لوگوں نے قیاس کیا کہ میرا دل کہیں آیا ہوا ہے۔ ایک آدھ بار انھوں نے کٹنیاں بھیجیں کہ جاؤ کیفیت معلوم کرو اور پرانے سلسلے کو دوبارہ باندھو اور وہ ممکن نہ ہو تو نیا سلسلہ جنباں کرو۔ لیکن میں نے انھیں کچھ انعام دے کر رخصت کیا۔ قصہ یہ بتایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ گھر پر میرے لوگ بے حد مقروض ہو گئے ہیں۔ میں اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہوں کہ تدارک کیا اس کا کروں۔ کئی جگہ سے مجھے کچھ قرض ملنے کی امید ہے لیکن سود بہت زیادہ ہے اور واپسی جلد ہونی ہے۔ بس انھیں فکروں میں دن رات کا جینا حرام ہو گیا ہے۔

وہ کٹنیاں ہزار بلائے بے درماں سہی لیکن جہاں دیدہ، ہزاروں دروازے دیکھے ہوئے اور بیسیوں کنوؤں کا پانی پیے ہوئے تھیں، سمجھ گئیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں اور یہ معاملہ نہ زن کا ہے نہ زر کا، یہ تو کچھ جناتی کارخانے ہیں۔ پھر سب نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

لیکن کٹنیوں کے دفان ہونے کے دو ہی چار دن بعد محمد علی حشمت کا ہرکارہ آیا کہ فوری معاملہ ہے، بستر باندھو اور میرے ہاں پہنچو۔ مجھے تھوڑا سا تعجب تو ہوا لیکن ایک امید سی بھی ہوئی کہ شاید یہاں کچھ بہتری کا آثار ہو۔ یوں کچھ نہ ہو لیکن تبدیلِ حال میں ایک امید تو ہوتی ہے۔ میں نے بستر باندھا، گھر کی کلید پاس کی مسجد کے امام صاحب کے حوالے کی، ماما کو کہا کہ نیک بخت تو میری راہ دیکھ لیجو میں چند دن میں واپس آ جاؤں گا۔ دو چار گھڑی کے بعد میں میر حشمت صاحب کی حویلی پر حاضر تھا۔

میں پُر امید تھا تو دل میں ڈرا بھی ہوا تھا۔ میرے زمانے سے اب تک طریق جنگ اور اسلحہ سب بہت بدل چکا تھا۔ یہاں گولہ، بارود، بندوق، توپ سے جنگ ہوتی تھی اور ہمارے لوگوں کو بندوق کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ہم نے بارود کی بو بھی نہ سونگھی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ میرے خداوندِ عالم سلطان ابراہیم لودی شہید کی افواج کو مکمل ہزیمت چند ہی ساعتوں میں اس سبب سے ہو گئی تھی کہ ان کے ہاتھی گولہ بارود کا سامنا نہ کر سکے تھے اور فوج میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے جب یہ سامان یہاں دیکھے تو بہت متوحش ہوا تھا کہ ان چیزوں کو میں کیا سنبھال پاؤں گا۔ بہت کچھ مشق کر کے اب میں تھوڑا بہت عادی سلاح آتش کا تو ہو گیا تھا لیکن معرکے کی گرمی میں کہاں تک میں بندوق یا توپ کا ساتھ دے سکوں گا، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔

''خوب آئے میاں صاحب،'' انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ مراد آباد کے لیے رخت سفر باندھ لو، ابھی اور اسی وقت چل دیجیے۔ میں اور بقیہ رسالہ بھی ساتھ ہوگا۔''

میرا دل دھڑکا۔ یہ تو کچھ فوجی کارروائی جیسا رنگ لگتا تھا۔ ''بہت مناسب۔ میں حاضر ہوں، پر معاملہ کیا ہے؟''

میر حشمت کے مفصل اظہار کا ماحصل یہ تھا کہ روہیلہ نواب علی محمد خان کی اچانک موت کے بعد علاقۂ رُوہیل کھنڈ میں بدامنی کا خدشہ پھیل گیا تھا۔ علی محمد خان کے دونوں بڑے بیٹے عبداللہ خان اور فیض اللہ خان قندھار میں جلاوطن تھے۔ تیسرا بیٹا سعد اللہ خان کم عمر تھا۔ کسی بنا پر نواب قطب الدین علی خان، فوجدار مراد آباد کو گمان تھا کہ جب تک بڑے بھائیوں کی جلاوطنی کی منسوخی کا فرمان قلعۂ معلّٰی سے نہ صادر ہو، خطۂ روہیل کھنڈ میں عملداری براہِ راست شاہ جمجاہ کی رہے گی اور سعد اللہ خان کو دہلی بلا کر زیر نگین دارالخلافت رکھا جائے گا۔ جہاں تک میر محمد علی کو معلوم تھا، ان مضامین کو محتوی کوئی فرمان قضا شیم بارگاہ بادشاہ جمجاہ سے جاری نہ ہوا تھا لیکن خیال تھا کہ نواب قطب الدین خان نے مہابلی کو حالات سے آگاہ رکھا ہوگا۔ بہر طور، روہیلوں کو یہ گوارا نہ تھا کہ نوعمر نواب زادہ اپنے وطن اور اپنے لوگوں سے جدا کر دیا جائے اور پورے خطے پر شاہی اہلکار قابض ہو جائیں۔ فلہٰذا وہ بڑی جمعیت اکٹھا کر کے سعد اللہ خان کا تحفظ اور اس کو ہر قیمت پر اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر فوجدار مراد آباد نے حکم دیا کہ رسالۂ فوجداری کے سب سپاہی بفور مراد آباد پہنچ مقابلہ روہیلوں کا کریں اور ان کو عتابِ شاہی اور خفگیٔ جناب عالم پناہی کا مزہ چشید کرائیں۔ فوجدار بنفس نفیس مراد آباد پہنچ چکے تھے۔ پس ہم لوگوں کو بھی وہیں پہنچ جانا چاہیے۔

شام ہوتے ہوتے رسالے کی جمعیت پانچ سو کے قریب ہوگئی تھی۔ دوسری صبح ہم عازمِ مراد آباد ہوئے اور دھاوے کے طور پر سفر کرتے ہوئے چوتھے دن وہاں وارد ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہاں سے کئی کوس پر دھام پور کوئی مقام ہے، نواب قطب الدین خان وہاں فروکش ہیں۔ روہیلوں کا بھی مجمع وہیں قریب میں ہے۔ نواب منتظر ہمارے ہیں کہ ہم پہنچیں تو معرکہ گرم ہو۔

کمریں کھولے بغیر ہم نے دھاوے کے طور پر دھام پور کا رخ کیا۔ فوجدار صاحب دھام پور سے دو کوس ادھر ایک اُجاڑ سی گڑھی میں خیمہ زن تھے۔ ان کے جاسوسوں نے خبر دی تھی کہ روہیلے کنار دریائے رام

گنگا مجتمع اور جیش شاہی سے محاربے کے منتظر ہیں۔ نواب نے پوری فوج کے ساتھ قلعے سے باہر نکل کر ایک مناسب عرصۂ مصاف دیکھ کر قیام کیا اور ایک ٹکڑی مقدمۃ الجیش کے طور پر آگے روانہ کی۔ نواب نے اپنی فوج کی پشت پر گھنے خار دار جنگل کا وسیع قطعہ رکھا تھا، اس خیال سے کہ اگر بالفرض محال پیچھے ہٹنا پڑا تو ہم جنگل میں چھپ جائیں گے۔ وہاں غنیم کا داخلہ محال ہوگا کیونکہ جب وہ جنگل میں داخل ہوگا تو ہمیں اس کی نقل وحرکت کی خبر از خود مل جائے گی اور ہم اسے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیں گے۔

فوجداری جمعیت میں بڑی یا چھوٹی توپیں نہ تھیں، حتیٰ کہ دمامہ، شتری اور فیلی تو کیا شتر نال بھی نہ تھے۔ نواب قطب الدین خاں صاحب کا خیال تھا کہ مٹھی بھر تو روہیلے ہوں گے، ہزار دو ہزار بھی ہوئے تو ہم انھیں جنگ دو بدو میں مار لیں گے۔ توپ کے لیے میدان درکار ہے، ہمیں ان کی ضرورت کچھ نہ ہوگی۔

نواب کی تجویز بظاہر صائب تھی۔ لیکن ان کے مخبروں نے ان کے ساتھ دغا کی تھی۔ روہیلوں کا ایک بڑا جتھا اس جنگل میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ ایک طرف دریائے رام گنگا، دوسری طرف دھام پور کا قصبہ، پیچھے خارستان۔ فوجدار کے مقدمۃ الجیش سے کچھ تو بے خبری میں وہیں مار دیے گئے۔ کچھ بچے کھچے جو تھے وہ حواس باختہ یہ خبر لے کر آئے کہ ہم ہر طرف سے گھر گئے ہیں۔ روہیلے کم سے کم دس ہزار ہیں اور ہر طرف، حتیٰ کہ دریا کے ورلی طرف بھی ہیں۔

ابھی ان کا اظہار تمام نہ ہوا تھا کہ روہیلوں کے رسالوں نے ہم پر گولہ باری شروع کر دیں، ہر چند کہ وہ ابھی کچھ دور تھے۔ پاس آتے ہی آتے انھوں نے گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ کوئی دس ہزار رہے ہوں گے۔ نواب نے جم غفیر دیکھ کر جنگل کو مراجعت کا حکم دیا۔ لیکن وہاں تو کوئی بیشہ، کوئی جھاڑی، کوئی جھنڈی ایسی نہ تھی جس کے پیچھے روہیلے مسلح اور مکمل جمے ہوئے نہ ہوں۔

قطب الدین علی خان بڑی بے جگری سے لڑے۔ ان سے بڑھ کر محمد علی حشمت کی جگرداری تھی۔ لگتا تھا انھوں نے ملک الموت سے کہہ رکھا تھا کہ میرے کنے نہ آنا۔ میں ان کے ساتھ ساتھ تھا لیکن نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ سردیوں کے دن تھے، کنار دریا اور جنگل کے متصل ہونے کی وجہ سے سردی اور بھی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ ہم لوگوں کا خون بہنے بھی نہ پاتا تھا کہ وہیں جم رہتا۔ زوال کے پہلے پہلے ہم سب مار لیے گئے۔ کوئی متنفس زندہ نہ بچا۔

جیسے زلزلے کے جھٹکے نے میرا پلنگ زور سے ہلا دیا ہو، میں ہڑبڑا کر اٹھا اور پلنگ سے گرتے گرتے بچا۔

''کیا کہا؟ سب مار لیے گئے؟ کوئی بھی نہ بچا؟''

''نہیں جناب۔ کوئی بھی نہیں۔'' اس نے پست اور افسردہ آواز میں کہا۔

''تو کیا... تو کیا تم مردہ ہو؟''

''یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا جناب۔ شاید آپ یہ معاملہ بہتر طے کر سکتے ہیں۔''

افسردہ آواز اور بھی دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ پھر جیسے بولنے والا دور ہوتا جا رہا ہو۔ پھر شہنائی پر بھیروی کی نفیر دھیرے دھیرے اٹھی۔ وہ بھی دُور ہوتی چلی گئی۔

باب نہم

عبدالحیٔ تاباں نے جب محمد علی حشمت کی سناونی سنی تو دستار اتار کر پھینک دی اور گریباں چاک ہو کر محمد علی حشمت کا شعر پڑھا۔

جب آ خزاں چمن میں ہوئی آشنائے گل
تب عندلیب رو کے پکاری کہ ہائے گل

اس دن سے عبدالحیٔ تاباں جامۂ آبی پہن کر گوشہ نشین ہو گئے۔ ساری محفل آرائیاں چھوڑ دیں، حتیٰ کہ میرزا مظہر جان جاناں صاحب کے یہاں بھی جانا چھوڑ دیا۔ انھوں نے بلوا بھی بھیجا لیکن انھوں نے کہلا دیا کہ میرزا صاحب کی خدمت میں ہاتھ جوڑ کر کہہ دیکھو کہ تاباں اب وہاں نہیں ہے۔

پھر انھوں نے شراب چھوڑ دی۔ ہر چند کہ اطبا نے سختی سے منع کیا، کہا کہ شراب تمھارے رگ و ریشے میں بجائے لہو جاری ہے۔ شراب تمھارے لیے اخلاط میں سے ایک خلط بن گئی ہے تمھارے مزاج میں جاگزیں ہو گئی ہے۔ شراب چھٹے گی تو مر جاؤ گے۔ لیکن تاباں نے ایک نہ سنی۔ انھوں نے بس یہی کہا کہ میں نے توبہ کر لی ہے۔ اب دوبارہ پینے لگوں تو خدا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ میر حشمت کو کیا منھ دکھاؤں گا۔

شراب چھوڑتے ہی تاباں نے تمام دوستوں کو رقعے لکھے کہ اب میرا وقت آخر ہے۔ آ کر منھ دکھا جاؤ۔ میرا منھ بھی دیکھ لو۔ کوئی تقصیر مجھ سے ہوئی ہو تو معاف کر دو کہ میں جس طرح ہلکا آیا تھا اسی طرح ہلکا

جاؤں۔ لوگ ہر روز آتے رہے، کچھ تو ان کا منھ دیکھ کر رو پڑتے اور فوراً واپس چلے جاتے۔ کچھ وہیں ان کی طرح پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ جاتے، لطیفوں اور مطائبوں سے ان کا دل بہلاتے۔

دوستوں کو مراسلے بھیجنے کے آٹھویں دن میر عبدالحئی تاباں نے دُنیا سے منھ موڑ لیا۔

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

تمام شد

عرض مصنّف

قطب الدین خان اور ان کے ساتھ محمد علی حشمت اور ان کے سارے فوجیوں کی موت کا واقعہ دھام پور (اب ضلع بجنور) کے پاس جنوری 1749 میں پیش آیا۔ روہیلوں میں سے کتنے مرے، یہ نہیں معلوم، لیکن قطب الدین خان کی فوج کا کوئی شخص نہ بچا۔

عبدالحیٔ تاباں کی صحیح تاریخ وفات نہیں معلوم، لیکن وہ محمد علی حشمت کے بعد بہت دن نہ جیے۔ اغلب ہے کہ ان کا انتقال 1749 ہی میں ہوا۔ اس وقت ان کی عمر پینتیس (35) سال کی تھی۔

مولانا حامد حسن قادریؒ اپنے رسالے ''کنز الکرامات'' (ص 8 تا 10) میں لکھتے ہیں:

''قبض زماں کا ایک واقعہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی نے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کے لیے طویل زمانے کو مختصر کر دیتا ہے جبکہ وہ دوسروں کے لیے طویل ہی رہتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دہلی میں ایک سپاہی تھا، اس کے اہل وعیال جے پور کی طرف کسی گاؤں میں تھے۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی کے لیے رخصت اور روپے کا بندوبست کر کے اپنے وطن کو روانہ ہوا۔ راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ خالی ہاتھ جے پور شہر میں پہنچا، لوگوں سے حال بیان کیا تو کسی نے کہا کہ یہاں فلاں طوائف بہت سخی اور فیاض ہے۔ محتاجوں، مسافروں کی مدد

کرتی ہے۔ سپاہی اس کے پاس گیا اور اس سے تین سو روپے قرض لیے کہ وطن سے واپسی میں قرض ادا کردوں گا۔ روپیا لے کر وطن گیا، لڑکی کا نکاح کیا۔ کئی مہینے رہ کر واپس چلا تو پہلے جے پور آیا۔ معلوم ہوا، اس طوائف کا انتقال ہو گیا اور کوئی والی وارث نہیں۔ بہت افسوس کیا کہ اس کا قرض گردن پر رہ گیا۔ پھر سوچا کہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھتا چلوں۔ دریافت کر کے قبر پر گیا۔ دیکھا کہ قبر شق ہے۔ اندر جھانکا تو کچھ روشنی اور دروازہ سا معلوم ہوا۔ یہ دروازے میں داخل ہوا تو بڑا میدان اور باغ نظر آیا۔ اس میں ایک محل بنا ہوا تھا۔ یہ محل کے اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ ایک تخت پر وہی طوائف عمدہ لباس میں بیٹھی ہے۔ سپاہی دوڑ کر اس کے پاس گیا اور روپے کی تھیلی اس کے سامنے رکھ دی کہ لو اپنے روپے۔ شکر ہے تمھارے قرضے سے سبک دوشی ہوئی۔ طوائف اس کو دیکھتے ہی گھبرا کر بولی کہ تو یہاں کیونکر چلا آیا؟ فوراً نکل جا، یہ تیرے آنے کی جگہ نہیں ہے اور سپاہی کو دھکے دیتے ہوئے زبردستی محل سے باہر کر دیا۔ سپاہی بڑا حیران ہوا، لیکن سوچا اب تو آ ہی گیا ہوں، لاؤ باغ کی سیر تو کرتا چلوں۔ کچھ دیر سیر کر کے دروازے سے ہو کر قبر سے باہر نکل آیا۔ اس کا بیان ہے کہ بہت سے بہت تین گھنٹے اس میں صرف ہوئے ہوں گے۔ اب باہر نکلا تو دیکھا کہ سارا عالم بدلا ہوا ہے۔ شہر، بازار، سڑکیں، آدمی، سب نئے نئے سے ہیں۔ لوگوں سے پوچھا کہ دہلی میں کون بادشاہ ہے؟ معلوم ہوا مغلیہ سلطنت کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم بادشاہ ہے اور سپاہی لودھی سلطنت کے زمانے میں دہلی میں نوکر تھا، اور وہاں سے اس نے یہ سفر کیا تھا۔ تین سو سال کا عرصہ گذر گیا۔ سپاہی کے تین گھنٹے دوسروں کی تین صدیوں کے برابر ہو گئے۔"

کسی اوٹ میں

غیر مدوّن افسانے

مرتب کے قلم سے

ایک زمانہ تھا کہ اپنے عہد کے سب سے بڑے اُردو کے نقاد شمس الرحمن فاروقی ''افسانے کی حمایت میں'' کے سلسلۂ مضامین میں کچھ ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے: ''ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے جس طرح غزل کی مخالفت اور افسانے کی حمایت کی وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حالی کے دسترخوان کے بچے ہوئے نوالوں سے اپنا تنقیدی خوان سجا رہے تھے۔ اگر حالی کے زمانے میں افسانے کا وجود ہوتا تو وہ شاعری کو یک قلم Condemn کر کے افسانہ نگاری کی تلقین کرتے۔ افسانہ نہیں تھا اس لیے انھوں نے شاعری کو زبردست قسم کا جلاب دے کر عشق، عاشقی وغیرہ کے تمام مسائل کا اسہال کر دیا۔ افسانہ بے چارہ تو تبت کے یاک کی طرح سست قدم لیکن کارآمد ہے۔ شاعری کی طرح جذباتی آگ سے نہیں کھیلتا۔'' وہ یہاں تک کہہ گزرے تھے: ''اصل الاصول تو یہ ہے کہ افسانہ اتنی گہرائی اور باریکی کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا جو شاعری کا وصف ہے۔'' تب شاعری اُن کی پہلی محبت تھی اور اپنی اس محبوبہ کے مقابل انھیں کوئی نہ جچتا تھا۔ تاہم ان کے اندر جو افسانہ نگار چھپا ہوا تھا ان خیالات کے باوجود ان کے وجود کی اوٹ سے نکلتا اور کہانیاں لکھنے لگتا تھا۔ اوّل اوّل اپنی کہانیوں کو اُنھوں نے اپنا نام نہیں دیا تھا مگر ایک وقت آیا کہ انھیں شہرزاد، جاوید جمیل، بینی مادھو رسوا اور عمر شیخ مرزا کے ناموں کی حقیقت کھول دینا پڑی۔ مجموعے کے اس حصے میں وہ افسانے شامل کیے جا رہے ہیں جو فاروقی صاحب نے شہرزاد اور جاوید جمیل کے نام سے ''شب خون'' کے مختلف شماروں میں شائع کروائے۔ فاروقی صاحب نے بتا رکھا تھا کہ شہرزاد اور جاوید جمیل کے نام سے اُنھوں نے کچھ طبع زاد افسانے بھی لکھے تھے۔ جن افسانوں کے ساتھ 'ماخوذ' یا

'ترجمہ' کا اعلان نہیں ہے انھیں طبع زاد افسانے سمجھا جائے۔ ان افسانوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ''ہر اک راہ رَو کے ساتھ'' (شہزاد، ماخوذ) شمارہ:۱۔ ''شیطانی پوجا کی ایک رات'' (شہزاد) شمارہ:۵۔ ''ہمارے ننھے منے دوست'' (شہزاد، ماخوذ) شمارہ:۱۱۔ ''آواز پا'' (شہزاد، ماخوذ) شمارہ:۱۳۔ ''معصوم جانیں'' (شہزاد، ماخوذ) شمارہ۲۶۔ ''بھیانک افسانہ'' (شہزاد، ماخوذ) شمارہ:۴۰۔ ''دریائے خواب'' (جاوید جمیل) شمارہ:۲۵۰۔

یہ آخری افسانہ ''دریائے خواب'' کوئی نیا افسانہ نہیں ہے۔ یہ پہلے ''شب خون'' کے پانچویں شمارے میں شائع ہونے والا ''منزل ہے کہاں؟'' ہی ہے جس میں کچھ تبدیلیاں کر کے عنوان بدل لیا گیا ہے۔ یہاں ہم افسانے کا بعد والا متن شامل کر رہے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ سب افسانے محض ''شب خون'' کے قارئین کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے لکھے گئے تھے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ فاروقی صاحب کے دلچسپی کے علاقے کیا کیا رہے ہوں گے اور وہ فکشن کی طرف کن کن راستوں سے ہو کر آ رہے تھے۔ پہلے شمارے کے افسانے ''ہر ایک راہ رَو کے ساتھ'' مصنف کا ایک تفصیلی نوٹ بھی ہے۔ ایسا ہی ایک نوٹ آگے چل کر بھی دیا گیا ہے۔ ان تعارفی تحریروں میں افسانہ نگاری کی بابت دلچسپ باتیں کی گئی ہیں۔ فاروقی صاحب بھیانک افسانوں کا ایک سلسلہ لکھنے جا رہے تھے اس لیے اِس ضمن کی باتیں ان تحریروں میں در آئی ہیں۔ ان تحریروں کو ''پہلی بات'' کے عنوان سے اس حصے کا دیباچہ بنایا جا رہا ہے۔

محمد حمید شاہد

پہلی بات

ا

قصہ گوئی کا شوق جتنا پرانا ہے اتنا ہی دوسروں کو حیرت زدہ کرنے اور ڈرانے کا بھی۔ ایک طرح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں خصلتیں ایک ہی جبلت کے دو مظاہر ہیں۔ کچھ زیب داستان کے لیے اور کچھ اپنے جانے اَن جانے خوف کے اظہار کے لیے بھی، افسانہ میں محیر العقول اور مافوق الفطرت حادثات اور واقعات کا اضافہ ہم عرصۂ دراز سے کرتے آئے ہیں۔ الف لیلہ کی کہانیاں اس کی اچھی مثال ہیں۔ اس کے علاوہ موت وحیات کے ہزار ہا اسرار اور قدرت کے اَن گنت مظاہر جو ہم کو اب تک حیرت زدہ کرتے رہتے ہیں اور جن کی کرید اور چھان بین ہماری فطرت کا خاصہ ہے، اکثر ہمارے تخیل میں ان سوالات کا جواب افسانوں کی صورت میں ڈھونڈھتی رہتی ہے۔

پرانے یونان کے ادب سے لے کر آج تک خوفزدہ کرنے والے واقعات پر مبنی کہانیاں لکھی جاتی رہی ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا، ان کہانیوں کی تخلیق میں تحیر اور تجسس کے علاوہ ڈرانے کا جو جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اسے ہم انسان کی بنیادی اذیت پرستی پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ جس طرح بچہ تتلی کے پر نوچ کر اس کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر ایک عجیب وغریب لذت اور قوت کا احساس حاصل کرتا ہے ویسے ہی افسانہ نگار اپنے

---

(۱) نوٹ مصنف۔ افسانہ ''ہر اک راہ رو کے ساتھ''

تخیل کی بنائی ہوئی تصویریں ہمیں دکھا کر ہمارے رونگٹے کھڑے کردینے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا ہے اور وہی لذت بالواسطہ ہم بھی محسوس کرتے ہیں۔ واقعہ چاہے جسمانی اذیت پر مبنی ہو یا کسی مافوق الفطرت ہستی یا روح یا قوت کے ہم سے یا افسانے کے کردار سے متصادم ہوتے یا کسی تحیر خیز اور ہر ہر قدم پر ہم کو اختتام کے لیے بے چین لیکن اختتام سے خوفزدہ رکھنے والے واقعات کے تسلسل پر، لیکن ہر صورت میں ہمیں ایک طرف تو اس عجیب وغریب جذبہ کا احساس ہوتا رہتا ہے جو کسی ایسے واقعہ سے دوچار ہونے پر ہوتا ہے جس کا اثر ہم پر ہوتے ہوئے بھی نہیں ہوتا (مثلاً جب ہم خواب میں خود کو مرتے ہوئے یا مردہ دیکھتے ہیں تو ایک طرف تو ہمیں موت اور اس کے پیدا کردہ کرب اور خوف کا احساس ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمارے لاشعور میں یہ بات جاگزیں رہتی ہے کہ اگرچہ ہم ہی مر رہے ہیں لیکن مرنے والے ہم نہیں ہیں۔) ساتھ ہی ساتھ بھیانک افسانہ پڑھتے وقت (ایک لمحہ کے لیے سہی لیکن بار بار) یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم زمان ومکان کی قید سے آزاد ہو کر فطرت اور کائنات کی ان دیکھی اور پُراسرار قوتوں کا ان کی پوری عریانیت اور بہیمانہ جاہ و جلال کے ساتھ مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ دوسری زبانوں میں بھیانک افسانوں کی بہ اعتبار موضوع کئی تقسیمیں کی گئی ہیں اور ان کو الگ الگ مستقل اصناف کی شکل میں بھی مان لیا گیا ہے لیکن اگر اصلیت پر غور کیا جائے تو فن کی ٹکنیک، مقصد اور استعمال کیے جانے والے ہتھکنڈوں کی بنا پر ان سب کو ایک ہی صنف، یعنی بھیانک افسانہ، کہا جا سکتا ہے (لفظ ہتھکنڈوں کا یہاں جان بوجھ کر استعمال کیا گیا ہے اور اس کی تشریح نیچے کی جائے گی) چونکہ اُردو میں ابھی تک اس میدان میں طبع آزمائی کم لوگوں نے کی ہے اس لیے ہم اگرچہ نیچے بھیانک افسانوں کی مختلف اقسام کا ذکر وضاحت کی غرض سے کر رہے ہیں لیکن ان سب کو اپنے مقصد کے لیے بھیانک افسانے کے تحت میں رکھیں گے۔

① خوفناک افسانہ (Horror story)

② دہشت انگریز افسانہ (Terror story)

③ بھوت افسانہ (Ghost story)

④ شیطانی افسانہ (Black Magic story)

۱۔ خوفناک افسانے کے تحت خاص طور پر وہ افسانے آتے ہیں جن میں جسمانی اذیت یا بہیمیت کے ایسے پہلوؤں اور واقعات کا ذکر ہوتا ہے جن کو پڑھ کر خوف اور ترحم کے ساتھ ساتھ ایک ذہنی گھن یا جذباتی استفراغ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے مثلاً مارکوئس دا ساد (Marquis de Sade) کے افسانوں میں جنی ایذا رسانی (Sexual Cruelty) کے واقعات پڑھ کر ہمارے ذہن میں کوئی استفراغ نہیں پیدا ہوتا، سوائے اس کے کہ انسانوں کی انسان کے ساتھ بہیمیت سے ایک طرح کی نفرت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ خوفناک افسانہ کو نفرت یا محبت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا لیکن اس کے بیانات ایک طرف تو ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں اور دوسری طرف ہماری طبیعت کو عجیب و غریب طرح سے مکدر کر دیتے ہیں اور کراہیت کا احساس پیدا کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے افسانے کی اچھی مثال انگریزی کی ایک کہانی ہے جس میں ایک شخص دوسرے سے بدلہ لینے کے لیے اس کے کان میں ایک کنکھجورا ڈال دیتا ہے۔ کنکھجورا کان کے پردے کو پھاڑ کر اور دماغ کے رگ و ریشہ سے گزرتے ہوئے مہینوں کی مسافت طے کر کے دوسرے کان سے نکل آتا ہے۔

۲۔ دہشت انگیز افسانہ کا بنیادی موضوع بھی اذیت ہی ہوتا ہے لیکن یہ اذیت جسمانی سے زیادہ روحانی یا ذہنی ہوتی ہے۔ ایک طرف تو افسانہ کے مرکزی کردار کو ایسے ذہنی حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو دیوانگی کے پیدا کردہ یا دیوانگی کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں اور دوسری طرف پڑھنے والے کے ذہن پر وہ کیفیات طاری ہوتی ہیں جو کچے دھاگے سے بندھی چھت سے لٹکی ہوئی تلوار کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہیں۔ دہشت انگیز افسانہ ذہنی اذیت کے علاوہ واقعات کے حیرت انگیز موڑ اور بظاہر اَن ہونے لیکن دل کو تھرا دینے کی حد تک یقینی ہونے والے اتفاقات کا بھی سہارا لیتا ہے مثلاً ایک افسانے کی مرکزی کردار عورت دیوار پر لگے ہوئے کاغذ پر بنی ہوئی تصویروں کو زندہ اور متحرک سمجھتی ہے اور خود بھی ان ہی کی طرح ہو جانے کی ذہنی کشمکش میں گرفتار رہتی ہے اور کبھی خود کو ان ہی کاغذوں میں گرفتار سمجھتی ہے۔ آخر میں جنون کے ایک دورے کا شکار ہو کر وہ اپنے شوہر کا خون کر ڈالتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں اسے کاغذ پر بنی ہوئی تصویروں میں ضم ہو جانے سے شوہر ہی باز رکھتا ہے۔ افسانہ کی قوت کاغذ پر بنی ہوئی تصویروں کی واقعیت اور اس طویل کشمکش میں ہے جو اس عورت اور اس کے شوہر کے درمیان واقع ہوتی ہے۔ عورت کا ذہن جواب دے رہا ہوتا ہے اور بالآخر دیوانگی اور ہوش مندی کے بیچ

میں اس کا شوہر حدِ فاصل کی تمثیل بن جاتا ہے۔ جدید دہشت انگیز افسانے کا خاص موضوع فاتر العقلی اور ہوش مندی کے درمیان کی ہی کشمکش ہے جس کے ذریعہ افسانہ نگار نفسیاتی یا مابعد النفسیاتی (Para Psychological) گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

۳۔ بھوت افسانہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے روحوں اور بھوتوں سے متعلق حالات اور واقعات پر مبنی ہوتا ہے۔ ان حالات اور واقعات کو تھوڑی سی وسعت دے کر اس زمرہ میں نا قابلِ فہم مظاہر یا پُراسرار قوتوں کے پردۂ شعور پر کارفرما ہونے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ بھوت افسانے کی اصل قوت اسی نکتہ میں مضمر ہے کہ کرداروں پر جو کچھ گزرتی ہے اس کی کوئی عقلی یا منطقی توجیہہ نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر واقعات دراصل صرف ایک ذہنی یا نظری دھوکہ بنا کر پیش کیے جائیں تو ان کی سریت مجروح اور مبہم وسعت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ پھر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم پُراسرار اور غالباً خطرناک اور منتقم قوتوں کی کارفرمائی سے دوچار ہیں بھوت افسانے میں کابوس کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی جس طرح ہم خواب میں جب یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی اندھیرے میں ہمارا گلا گھونٹ رہا ہے اور ہم باوجود کوشش کے چلا نہیں سکتے تو اس وقت ہم خود کو ذہنی اور جسمانی حیثیت سے مفلوج سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح بھوت افسانے میں روحوں سے دوچار ہونے والے کردار اور ان کے ساتھ ہی ساتھ ہم بھی، اپنی صورتِ حال سے باخبر لیکن مجبور ہوتے ہیں۔

۴۔ آخری صنف یعنی شیطانی افسانہ جادو اور اس سے متعلق واقعات پر تعمیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ جادو کے عمل کی اولیں شرط شیطان کی پرستش ہے اس لیے ان افسانوں میں شیطان کا، شر کی قوتوں کا، اور ان قوتوں کے استعمال کرنے والے انسانوں کا ذکر ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کو خیر اور شر کی غیر مرئی (Abstract) حیثیت سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔

اوپر کی تفصیل سے واضح ہوگیا ہوگا کہ تقریباً ہر بھیانک افسانے میں کسی نہ کسی پہلو سے ان چاروں اصناف کا پرتو مل جاتا ہے فرق صرف رویہ اور شدتِ تاثر کا ہوتا ہے۔ کنکھجورے والے افسانے میں ذہنی اذیت کے ساتھ ساتھ دیوانگی کا پہلو صاف جھلکتا ہے اور کابوس کی سی بھی کیفیت واضح ہے۔ اگرچہ شیطانی افسانے کا انداز زیادہ روشن نہیں ہے لیکن شیطانی شر کا مظاہرہ موجود ہے۔ اس اجتماعِ تاثر کی سب سے اچھی مثال اس کہانی میں ہے جو اگرچہ میں نے کہیں لکھی نہیں دیکھی مگر لوگوں کی زبان زد ہے۔ یہ اس طرح کہی جاتی ہے۔

ایک نوجوان لڑکا آدھی رات کو گھر لوٹتے ہوئے ایک خوانچہ والے سے مونگ پھلی خریدتا ہے، جب وہ مونگ پھلیاں لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ خوانچہ والے کے دونوں ہاتھ گھوڑے کے سُم کی طرح ہیں۔ وہ خوفناک چیخ مار کر بھاگتا ہوا ایک تانگہ والے کو روک کر سوار ہو جاتا ہے۔ راستہ میں وہ تانگے والے سے اس دل دہلا دینے والے واقعہ کا ذکر کرتا ہے، تانگہ والا دلچسپی اور ہمدردی سے پوری بات سنتا ہے اور منزلِ مقصود پر پہنچ کر اپنے دونوں ہاتھ آگے کرتے ہوئے لڑکے سے پوچھتا ہے۔ "بابو جی خوانچہ والے کے ہاتھ کیا میری طرح تو نہیں تھے؟'' لڑکا اپنے ذہن کو جواب دیتے ہوئے پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تانگہ والے کے ہاتھ بھی گھوڑے کے کھروں کی طرح ہیں۔

اس کہانی میں نہ صرف بھیانک پن کے چاروں پہلو اُبھر آئے ہیں بلکہ بھیانک افسانے کی تکنیک کا بھی اچھا نمونہ ملتا ہے۔ جیسا پہلے میں نے کہا، بھیانک افسانوں کی تعمیر ہتھکنڈوں پر منحصر ہوتی ہے۔ افسانہ نگار غیر متوقع یا ڈرامائی اختتام، یا بظاہر ادھورے اختتام، واقعات کے اچانک غیر متوقع موڑ (Twist) اَن ہونے لیکن شدید تاثر چھوڑنے والے اتفاقات اور اشاریت سے بھرپور ماحول کا سہارا لیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو بھیانک افسانہ جوڑ ھانچہ کے اعتبار سے سادہ اور کردار کے ڈرامائی ٹکراؤ اور نفسیاتی در و بست کے مطالعہ سے بالکل خالی ہوتا ہے، اپنا اثر باقی نہیں رکھ سکتا۔ کولرج کا یہ قول کہ شاعری کے زیرِ اثر ہم اپنی بے اعتباری کو خوشی خوشی معطل اور معلق کر دیتے ہیں، بھیانک افسانے پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے اور افسانہ نگار کی کامیابی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ وہ کس طرح اور کتنی دیر تک ہماری قوت متخیلہ کو جھنجھوڑ کر ہماری بے اعتباری کو معطل رکھ سکتا ہے۔

۲

شیطان کی پوجا تقریباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی خدا کی۔ عہدِ قدیم میں اکثر دونوں کی عبادت ساتھ ساتھ کی جاتی تھی اور اکثر ایک ہی ہستی دونوں مظاہر کی تمثیل ہوا کرتی تھی۔ اہرمن و یزدان (قدیم ایران) سیٹ اور

(۲) نوٹ مصنف۔ افسانہ "شیطانی پوجا کی ایک رات"

اوسی ریس (قدیم مصر) شیطانی اور الوہی خداؤں کی بہ یک وقت پرستش کی روشن مثالیں ہیں۔ عیسائیت اور پھر اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر شیطان کا وجود خدا سے الگ اور بدی کی تمثیل مانا جانے لگا۔ اس طرح مروجہ مذہب سے مختلف اور الگ ہٹ کر شیطانی پرستش کی ایک آزاد رسم کی نشوونما ہوئی جو آہستہ آہستہ ایک مستقل مذہب بن گئی۔ شیطان کی پرستش کرنے والے بائیں ہاتھ والے کہلائے اور خدا کی عبادت (بحیثیت نیکی کے ایک مجرد اصول کے) کرنے والے دائیں ہاتھ والے۔ ایسا اس وجہ سے ہوا کہ شیطان روایت کے بہ موجب چپ دست تھا۔ غالباً اسی وجہ سے قرآن میں بھی اصحاب المیمنہ اور اصحاب المیسرہ کا ذکر آیا ہے۔ جدید تہذیب کی روشنی اور مروجہ مذہب کی سختیوں اور اصلاحوں کے زیرِ اثر بائیں ہاتھ والوں کا زور کم ہوتا گیا ہے لیکن یہ فرض کرنا کہ عہدِ حاضر میں شیطان کی پرستش کرنے والے گروہ معدوم ہیں، بہت بڑی غلطی ہوگی۔ تقریباً پورا علم الاسرار ذرا سی تبدیل سمت سے پرستشِ شیطان میں تبدیل ہوسکتا ہے، اور یہ اکثر ہوتا رہا ہے کہ لوگوں نے علم الاسرار سیکھنے کی لالچ میں کبھی کبھی جان بوجھ کر اور کبھی کبھی کم علمی اور حماقت کی وجہ سے شیطان پرستی کو قبول کرلیا ہے۔ علم الاسرار اور علم الشیطان کا مطالعہ ایک وسیع و عریض میدان ہے جس میں انسان آسانی سے اپنی پوری زندگی صرف کرسکتا ہے، اس کی ضمن میں معمولی جادوگرانہ شعبدوں سے لے کر انسان کی پوشیدہ قوتوں کے حیرت ناک مظاہر آجاتے ہیں۔ سانپ اور بچھو کے زہر کا اتار، یرقان کی جھاڑ، کھوئی ہوئی چیزوں کا فال کے ذریعہ پتا لگانا، پوشیدہ چیزوں کا راز معلوم کرنا۔ یہاں سے لے کر زندگی اور موت کے وسیع الشان دھندلے رازوں پر قابو پالینے تک، ہر چیز علم الاسرار میں ممکن ہے۔ جب جادوگر اپنی قوتیں حصولِ زر، ذاتی منفعت یا دوسروں کو نقصان پہنچانے کی غرض سے استعمال کرتا ہے تو وہ بائیں ہاتھ والا ہوجاتا ہے، لیکن جب یہ حیرت ناک قوتیں اور صلاحیتیں انسانوں کے بھلے یا بدی کے خلاف تحفظ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں تو اسے سحرِ بیضا (White Magic) یا سحرِ حلال کہہ کر سحرِ اسود (Black Magic) یا سحرِ حرام سے ممتاز کرتے ہیں۔ جدید انگلستان میں سحرِ اسود کے ماہروں نے اندھے پن اور اس طرح کی تقریباً ناقابلِ علاج بیماریوں اور مجبوریوں کا شافی علاج کر کے بہت سے لوگوں کو حلقہ بگوش کرلیا ہے۔

شیطان کی عبادت کی رسمیں اور اصول آج کے عہد میں اچانک پھر بہت زیادہ زور پکڑ گئے ہیں اور یہ جدید تہذیب کے لیے ایک اور مقامِ ماتم ہے۔

یہ خیال ممکن ہے کہ مندرجہ ذیل واقعات جو ایک انگریزی ناول سے اخذ کیے گئے ہیں محض افسانہ

طرازی پر مبنی ہیں۔ لہٰذا رابرٹ گولڈسٹن کی کتاب "اولیاء الشیطان" سحرِ اسود کی مختصر تاریخ" (نیو یارک 1962) کا یہ مختصر اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"سن 1388ء لا میراندول گاؤں کے قریب ایک وسیع اور تاریک جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا میدان۔ چھ ہزار مرد و عورت عبادت کی رات منانے کے لیے اکٹھے ہیں۔ قرب و جوار کے دیہاتوں سے آنے والوں کی ایک بھیڑ ہے۔ غلام کاشت کار، چیتھڑوں میں ملبوس، عالی خاندان نواب و زمین دار اپنے قیمتی کپڑے دیہاتی لبادوں میں چھپائے ہوئے، سیاہ جبوں میں ملبوس پادری، مقامی بشپ اپنی اونچی ٹوپی اور عصا کے ساتھ، شرکت کے لیے صرف دو شرطیں ہیں، کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہ ہو اور ہر آدمی کے ساتھ ایک عورت ہو۔

میدان کے ایک سرے پر درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ یہ تاریک کنج شیطان کی جائے پناہ و قیام کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس کا گرجا گھر ہے اور میدان وسط کلیسا، اس کنارے پر شیطان کا ایک عظیم الشان بت کھڑا کیا گیا ہے۔

ایک بھیانک اور کراہیت سے بھرپور سیاہ رنگی ہوئی مورت ہے، جسم انسان کا، عضوِ تناسل بہت بڑا اور استادہ، سر، ہاتھ اور پاؤں بکرے کی طرح کے.... جادوگرنیاں ایک سترہ سالہ کنواری کو لیے ہوئے داخل ہوتی ہیں۔ شیطان کے سامنے سرخم کرتی ہیں اور پھر لڑکی کے کپڑے اتار دیتی ہیں۔ ننگی لڑکی شیطان کے کولھے کو بوسہ دیتی ہوئی کہتی ہے۔ میں تیری قربان گاہ پر آؤں گی۔ اے مالک اے شیطان! مجھے دھوکے بازوں اور سختی کرنے والوں سے بچائیو، کنواری، جو اَب شیطان کی پجارن کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ سحر زدہ مشروب کا ایک پیالہ غٹاغٹ پی جاتی ہے، مسیح کے خون کی نمائندہ شراب کے بجائے اس پیالہ میں تازہ خون، سڑتا ہوا پانی اور پیشاب ہے۔ وہ مقدس روٹی کے مضحکے کی طور پر ایک سیاہ پیاز کی گٹھی چباتی ہے۔ پھر پجارن خود کو شیطان کے قدموں میں گرا دیتی ہے اور شیطان جس نے ان عبادات کو قبول کر لیا

ہے۔ خود ظاہر ہوتا ہے، اس کا چہرہ نقاب میں پوشیدہ ہے۔ لیکن بدن ننگا ہے.... انسانی گوشت کے ٹکڑے.... لڑکی کے جسم کی زندہ قربان گاہ پر رکھ دیے جاتے ہیں جنھیں شیطان کی ہم عناں دوسری شیطانی مورتیں ہڑپ کر جاتی ہیں.... شیطان خود کو ننگی دوشیزہ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ ہر ایک کے لیے عام جنسی دیوانگی میں مبتلا ہو جانے کا اشارہ ہے۔"

ہر اک راہ رَو کے ساتھ

اس کی جیب میں چالیس ہزار روپے تھے اور وہ ہر طرح سے آزاد تھا۔

سناٹی رات میں پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتے ہوئے اس کے ذہن میں پچھلے پانچ برس کی تلخیوں کا نچوڑ قطرہ قطرہ گر کر پھیلتے ہوئے تیل کی طرح مختلف تصویروں کی شکلیں اختیار کر رہا تھا۔ روز آٹھ بجے صبح گھر سے کمپنی کے دفتر میں۔ جہاں اسے غیر ملکی منیجر کے ماتحت شام تک طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی ذلتیں سہہ کر کاروبار کا حساب دیکھنا پڑتا تھا۔ تنخواہ اچھی تھی لیکن آج کے زمانے میں سات سو روپیوں کی کیا حیثیت، جبکہ تین بچے جنم کے بیمار اور بیوی کی فرمائشیں، جن کے روز بروز بڑھنے کے ساتھ اس کے مزاج کی درشتی اور کڑواہٹ بھی بڑھتی جاتی تھی۔ روز وہی دفتر وہی گھر، نت نئے جھگڑے، بچوں کی جھائیں جھائیں، بیوی کا بات بات پر بگڑتا ہوا منہ۔ اچانک نہ جانے کب اس کے ذہن میں یہ احساس شدت کے ساتھ ابھرا تھا کہ بیوی کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا، لیکن طلاق کا تصور بھی ناممکن تھا، کیونکہ اس کی بیوی مزاج کے ساتھ ساتھ ارادے کی بھی سخت تھی اس کو کب یہ گوارا ہوتا کہ وہ اپنے شکار کو آزاد کر دے۔

مہینوں کے ادھیڑ بن کے بعد اس نے اپنی آزادی کو اپنی ہی قیمت پر خریدنے کا فیصلہ کر لیا۔ دس ہزار روپیہ کی رقم اور گھر کا ساز و سامان بیوی بچوں کے لیے بہت تھا۔ دہلی سے دور کسی چھوٹے موٹے دور افتادہ شہر میں.... کیوں نہ گوا چلا جائے.... چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا بزنس شروع کرنے کے لیے اور فارغ البالی سے زندگی کا

آغاز کر لینے کے لیے چالیس ہزار روپیہ کی رقم کافی تو نہیں، بس مناسب تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو اس بات پر آمادہ کیا کہ غیر ملکی کمپنی کے لاکھوں کے منافع میں سے پچاس ہزار کی رقم وہ کسی بھی صورت سے اپنے لیے حاصل کر لے (ملک کا روپیہ ہے، اپنا ہی ہے غیروں کی جیب میں کیوں جائے) برسوں کے ارادہ اور منصوبہ بندی کے بعد مناسب دن کسی نہ کسی طرح ہاتھ لگ پایا تھا۔ جمعہ کے دن دو بجے اس نے بینک جا کر پچاس ہزار روپے کمپنی کے حساب سے نکالے۔ غیر ملکی منیجر دوشنبہ کی چھٹی پر تھا اور سنیچر اور اتوار کو دفتر بند ہونے کی وجہ سے، منگل سے پہلے اس کی گمشدگی پر کسی قسم کی شوروغل کا امکان نہیں تھا۔ واپسی میں اپنے گھر پر بیوی کے ہاتھ میں دس ہزار کا بنڈل امانتاً رکھنے کے لیے کہتے ہوئے اس نے اپنے جہنم کدہ پر آخری نظر ڈالی اور اب دہلی سے میلوں دور جے پور کی سڑک پر وہ پوری طرح آزاد تھا۔

دفعتاً اس کی چھوٹی سی کار پیچھے سے آنے والی چکاچوندھ کرتی ہوئی روشنی میں نہا گئی اور ایک لمبی سیاہ، بیوک، اس کی پست رفتاری کا مذاق اڑاتی ہوئی ایک لمحہ میں اس کے برابر آئی اور آگے نکل گئی۔ اندھیری سڑک پر لمبی کار کی عقبی سرخ روشنیاں دیر تک جگمگاتی رہیں اور اچانک لہرا کر پھر بیچ سڑک پر آ گئیں۔ اس کی گاڑی کی روشنیوں کے سامنے ایک لومڑی کے بچہ کی لاش گاڑھے خون کے چھوٹے سے دائرے میں کسی کچلی ہوئی مکھی کی طرح پڑی تھی۔ تقریباً دوسو گز آگے ایک جنگلی خرگوش اپنی ٹوٹی ہوئی کمر کے ساتھ دم توڑ رہا تھا۔ آگے والی بیوک کی روشنیاں پھر لہرائیں اور متوازن ہو گئیں۔ اس بار اس کی کار کی روشنیاں ایک اور خرگوش کی لاش پر لرز رہی تھیں۔

اس کو اچانک یہ احساس ہوا کہ بیوک والا جان بوجھ کر روشنی کی زد میں آئے ہوئے ان بے زبان جانوروں کا قتلِ عام کر رہا ہے۔ اس بے معنی اور مجنونانہ بہیمیت کے احساس سے وہ کانپ اٹھا۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ بیوک کو روک کر اس کی اس اذیت پسندی پر ملامت کرے، اس سے جھگڑا کرے اور ہو سکے تو اس کی اچھی طرح خبر لے۔ اس نے کار کی رفتار بڑھانی شروع کی لیکن بیوک ابھی بہت آگے تھی، جیسے آگے والے نے اس کی رفتار بڑھتے دیکھ کر اپنی بھی رفتار بڑھا لی ہو۔ اس نے دانت پیس کر ایکسیلریٹر کو فرش تک دھنسا دیا، اور اسٹیرنگ وہیل پر اس طرح جھک گیا جیسے اپنی قوت بھی گاڑی کے انجن میں شامل کر دینا چاہتا ہو! لیکن چار سال پرانی ننھی سی جان ستر میل میں زیادہ نہ بڑھ سکی۔ بیوک اب بھی اسی شانِ بے اعتنائی سے پچھتر اور اسّی میل کی رفتار سے چل رہی تھی۔ جے پور شہر کے پاس کی پہاڑیوں تک پہنچتے پہنچتے دونوں کی رفتار کم ہوئی، شہر کے پہلے پٹرول پمپ تک پہنچنے پر تین کتوں نے بھونکنا شروع کیا اور ان میں سے ایک دیو ہیکل گاڑی کے جابر

پہیوں کے نیچے اپنی جان گنوا بیٹھا، بیس گز پیچھے سے اس نے کتے کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز صاف سنی، غصہ اور بے بسی کے شدید احساس نے اسے تقریباً رلا ڈالا تھا کہ بیوک اسٹیشن کے پھاٹک کی طرف مڑ گئی۔ اس قوی ارادے کے باوجود، کہ صبح ہوتے ہوتے احمد آباد پہنچ کر دم لے گا، جہاں اس نے اپنی پرانی گاڑی کا ایک گاہک تیار کر رکھا تھا۔ وہ بھی بیوک کے پیچھے اسٹیشن میں داخل ہوا۔

اس نے دور سے ایک قوی ہیکل مرد اور ایک نازک اندام عورت کو بیوک سے اترتے دیکھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے وہ سب ریستوراں میں داخل ہوئے، چمکیلی روشنی میں مرد کی چڑھی ہوئی مونچھیں، اس کی سرخ آنکھیں اور بھاری جبڑے کو دیکھ کر اسے یہ احساس ہوا کہ ایسے جابر شخص کا حلیہ ایسا ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے برخلاف ننھے قد کی دبلی پتلی گوری سی عورت کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک ناقابلِ بیان بے چارگی اور اس کے زرد رنگ سے ایک انوکھے سہم اور ہراس کا تاثر نمایاں تھا۔ شاید اس نے اس جانور نما انسان کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے تھے۔ مرد کاؤنٹر پر منیجر سے بات کر رہا تھا تو لڑکی کی نگاہیں اس سے چار ہوئیں۔ شاید اس کے جذبہ ہمدردی کی شدت نے لڑکی کے دل سے اس کا پیغام کہہ دیا تھا! کیونکہ اس مایوس سی مسکراہٹ کی جھلک اس کے ہونٹوں پر آئی اور غائب ہوگئی۔

وہ اپنے کھانے کے ساتھ یونہی شغل کرتا رہا لیکن مرد کی نگاہیں بچا کر وہ لڑکی کو بار بار دیکھ لیا کرتا تھا۔ مرد کے کھانے کا انداز بھی اس کے کار چلانے کی طرح وحشیانہ تھا۔ کھانا ختم کر کے مرد جیسے ہی ''باتھ روم'' کی طرف مڑا لڑکی نے اس کی طرف کچھ اس التجا سے دیکھا کہ انجام کی پروا کیے بغیر وہ اس کی میز پر آ پہنچا۔

وہ جھک کر سرگوشی کے لہجہ میں بولا: ''اگر میں آپ کے لیے کچھ کر سکوں....؟''

''ابھی نہیں۔'' وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ ایک تقریباً غیر مرئی آواز میں بولی۔

''ریٹائرنگ روم نمبر 3، دو گھنٹہ بعد۔''

کسی نہ کسی طرح اس نے یہ دو گھنٹے گزارے اور پھر چپکے چپکے تاریک راہ داری طے کرتا ہوا جب وہ ریٹائرنگ روم کے پاس پہنچا تو وہ لڑکی کسی سفید پری کی طرح دیوار کے سایہ سے ہم آغوش کھڑی تھی۔ پاس آتے ہی اس نے لڑکی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا بولا ''آئیے آپ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔''

چالیس ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں اس کے جسم کے مختلف حصوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ سسکی بھری آواز میں

لڑکی نے کہا ''نہیں، نہیں! وہ مجھے مار ڈالے گا، وہ انسان نہیں جانور ہے۔ میں نے اسے ''مارفیا'' دے کر سلا دیا ہے، ورنہ وہ مجھے اپنے پاس سے ہرگز نہ اٹھنے دیتا۔''

بجلی کی مار کی طرح سے اچانک اس کے ذہن میں یہ خیال گونج گیا، مارفیا! کتنی گہری نیند ہوگی اس کی، کیوں نہ اسے ہمیشہ کے لیے.... لیکن لڑکی نے شاید جیسے پہلے ہی کسی الہامی قوت سے اس کے ارادے بھانپ لیے اور اس کے بازوؤں کو جھنجھوڑ کر بولی۔ ''نہیں نہیں! وہ اتنی آسانی سے نہیں مر سکتا۔'' لیکن اس کے پہلے کہ وہ جملہ پورا کر سکتی، دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جس کی آواز اندرونی جیب میں رکھے ہوئے نوٹوں کے ساتھ ٹکرا رہی تھی، وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ قوی ہیکل مرد اپنے پلنگ پر چت لیٹا ہوا تھا اس کے ہونٹ کھلے تھے اور خراٹوں کی ہلکی ہلکی آواز کمرے کی فضا میں مرتعش تھی، اس نے ڈنلپ کا بھاری تکیہ اٹھا کر اس کا منہ پوری قوت سے دبا دیا۔ مرد کے ہاتھ پاؤں، پھیپھڑے ہوا نہ پا کر تشنج سے اینٹھنے لگے اور افیون زدہ نیند کے باوجود قوی ہیکل مرد نے بار بار اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن رفتہ رفتہ تکیہ کے پورے دباؤ کے نیچے اس کے خراٹے کراہوں میں بدل کر بالکل تھم گئے۔ جب وہ چڑھتی ہوئی سانس اور لرزتے ہوئے پاؤں لے کر کمرے کے باہر نکلا تو لڑکی کٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے آغوش میں آ رہی اور سسکتی ہوئی بولی، ''تم نے اچھا کیا....'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیشن کی عمارت کے باہر آیا، لڑکی کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بیوک اسٹارٹ کی اور پھر دہلی کی سڑک پر مڑ گیا۔ شہر سے آگے نکل کر اس نے گاڑی بدقتِ تمام پیچھے بیک کی اور اس کا رخ جے پور کی طرف موڑا۔ پہاڑی سڑک پر ایک گہرے کھڈ کے پاس گاڑی پہلے گیئر میں ڈال کر وہ دروازہ کھول کر باہر کود آیا اور سیاہ بیوک کسی عفریت کی طرح چنگھاڑتی ہوئی ڈھلان پر سے لڑھکتی سیکڑوں گز دور جا کر ساکت ہو گئی۔

وہ نشہ کے سے عالم میں اپنی گاڑی کی طرف آیا، لڑکی نے اس سے کہا ''تم بہت تھک گئے ہو، سو جاؤ میں چلاتی ہوں۔'' اور وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر ایک عجیب بے چینی اور خوابوں سے بوجھل نیند کے عالم میں کھو گیا۔

اچانک گاڑی کے لہرانے سے اس کی آنکھ کھل گئی اسے یاد نہ آیا کہ وہ کہاں تھا۔ سنسان رات میں گاڑی ستر کی رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ لڑکی اسٹیرنگ وہیل پر جھکی ہوئی سڑک پر نظر جمائے عالم و مافیہا سے بے خبر کار کو بھگائے لیے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب خونخوار سی وحشیانہ چمک تھی۔ اس کے ہونٹ تر تھے اور

احساسِ لذت سے کھلے ہوئے تھے۔ سنسان روشنی سے نہائی سڑک پر گاڑی بار بار لہرا رہی تھی اور موت کا بلایا ہوا کوئی نہ کوئی لومڑی یا خرگوش گاڑی کے حیوانی پہیوں کے نیچے لقمۂ اجل بنتا جا رہا تھا۔

(یہ افسانہ پلاٹ اور واقعات کے اعتبار سے عہد جدید کے بھیانک افسانہ کے بادشاہ امریکی افسانہ نگار رابرٹ بلاخ کی ایک کہانی سے ماخوذ ہے۔)

شیطانی پوجا کی ایک رات

''یہ رسمیں کب تک چلیں گی؟ ریکس نے کچھ سہمے ہوئے انداز میں سرگوشی کی۔

''مرغ کی بانگ تک۔ مرغ کی بانگ سے جادو کا اثر ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ ایک بہت پرانا اعتقاد ہے۔''

''رات بھر یہ لوگ کیا کرتے رہیں گے؟''

''پہلے تو شیطان کی عبادت، اس کے بعد ٹھونس ٹھانس کر کھانا اور شراب نوشی، اصول یہ ہے کہ ہر چیز مسیحی رسوم کے بالکل متضاد اور منافی ہو۔ مذہبی لوگ اگر عبادت کے پہلے روزے رکھتے ہیں تو یہ لوگ جانوروں کی طرح کھاتے ہیں۔ دیکھو اب ان کے کاہن قربان گاہ پر آ گئے ہیں۔''

ریکس نے دیکھا کہ چھ نقاب پوش بارہ شمعیں تخت شیطان کے دامن میں رکھ رہے تھے، گیارہ ایک دائرہ میں اور بارہویں وسط میں۔ ''یہ خاص قسم کی شمعیں ہیں، گندھک اور کول تار کی بنی ہوئی۔ تم بھی ان کی بو سونگھ سکو گے۔''

شیطان پرستوں کی بھیڑ سے الگ معبد کے رہنماؤں نے اب عجیب وغریب سی نقابیں اوڑھ لیں تھیں۔ ایک نے بلی کا سر اوڑھا ہوا تھا اور سمور کا ایک لبادہ جس سے بلی کی دم لٹک رہی تھی، دوسرا گھناؤنے مینڈک کی سی نقاب میں اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا، تیسرے کا چہرہ بھیڑیئے کی دانت نکالے ہنستی ہوئی نقاب کے پیچھے

سے نیلگوں سا جھانک رہا تھا۔ سربراہ کاہن نے ایسی نقاب اور لباس کا انتخاب کیا تھا، جس کے ذریعے اس کی شباہت اور بناوٹ کسی بہت بڑی چمگادڑ کی سی لگ رہی تھی۔

''یہ کم بخت سرد لہر پھر وادی سے پہاڑ کی طرف اٹھ رہی ہے۔'' ریکس نے اچانک کہا۔ ''دیکھو! دیکھو! وہ تخت نشین صورت اپنی ہیئت بدل رہی ہے۔'' انھوں نے دیکھا کہ سیاہ صورت والی مورت دھندلا کر اب سیاہی مائل بھوری سی ہو رہی تھی۔

''خدا کی پناہ! یہ مینڈیز کا بکرا ہے۔'' ڈیوک نے زیر لب کہا۔

اس کے کہتے ہی کہتے سحری مظہر واضح ہونے لگا تھا۔ بت کے ہاتھ جو آگے کو پھیلے ہوئے لیکن بجائے دست دعا کی طرح اٹھے ہونے کے نیچے کی طرف مڑے ہوئے تھے، بکرے کے کھروں کی شکل کے ہو گئے۔ اوپر ایک دیو قامت بکرے کا داڑھی لگا سر نمودار ہوا جو بڑے سے بڑے بکرے کا بھی تین گنا رہا ہوگا۔ ترچھی بادام نما آنکھیں اندر اور نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور ان سے سرخ خشم گیں روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں جھبرے سر کے اوپر دو لمبے لمبے نوک دار کان سیدھے کھڑے تھے اور سر کی گنجی چاند کے اوپر چار بڑے بڑے خم کھائے ہوئے سینگ اگ رہے تھے داہنے سے بائیں اور اوپر کی طرف.... اس طیف خیالی کے سامنے شیطانی کاہنوں نے عود دان روشن کرنے شروع کر دیے جن سے بدبودار ملگجے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔

انھیں اپنے دوست سائمن کی شکل کہیں نظر نہ آ رہی تھی۔ سائمن جس سے زیادہ شریف النفس، معتدل المزاج اور مہذب شخص ملنا دشوار تھا، اور جو اب شیطان پرستوں کے فریب میں گرفتار ہو کر آج کی رات اپنا خونی بپتسمہ کرانے آیا تھا۔ خونی بپتسمہ۔ جس کے بعد اس کے جسم و جان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شیطان کی ملکیت ہو جاتے۔

''وہ دیکھو۔ وہ رہا۔'' ریکس نے کہا ''مینڈک والی نقاب کے بائیں جانب۔'' بکرا آہستہ آہستہ کھڑا ہو رہا تھا۔ اب اس نے اپنی پشت عبادت گزاروں کی طرف کر لی اور ایک ایک کر کے کاہن اور عامی آگے بڑھ کر اس کے کولھے کو بوسہ دینے لگے۔ جب سائمن اس کے پاس پہنچا تو ریکس نے جوش سے ڈیوک کا بازو جھنجھوڑ کر کہا۔ ''اب اگر ہم اس کو بچا لیں تو بچا لیں ورنہ پھر وہ شیطان کا ہو کر رہ جائے گا۔''

''چپ!'' ڈیوک نے کہا۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی وقت ہے ہماری باری ضرور آئے گی۔''

''اگر ہم نے ان مجنونوں کے بیچ سے سائمن کو نکال لے جانے کی کوشش کی تو لحہ بھر بھی نہ ٹھہر سکیں گے۔ کچھ کرو! کچھ سوچو!''

''ہاں'' ڈیوک نے روحانی کرب کے عالم میں کہا۔''میں نے یہ نہ سوچا تھا کہ سب اس کھلی جگہ میں اس طرح اکٹھا ہوں گے۔ اس وقت دخل اندازی کرنے کے معنی موت کے علاوہ کچھ نہیں، ہم بہت کچھ دیکھ چکے ہیں۔

''تو کیا وہ قتل سے بھی باز نہ آئیں گے؟''

''خونی قربانی دنیا کی قدیم ترین ساحرانہ رسم ہے۔'' ڈیوک نے کہا ''خون زندگی ہے، جب خون بہایا جاتا ہے تو قوت فضائے بسیط میں آزاد ہو جاتی ہے اور اگر خون خاص طور پر کھینچے ہوئے حصار میں بہایا جائے تو انسان قوت کو مجتمع کر کے اسے کسی بھی کام میں لگا سکتا ہے، جس طرح بجلی کی قوت کام میں لائی جا سکتی ہے۔''

''مگر کیا یہ لوگ انسان تک کو قربان کرنے سے دریغ نہ کریں گے؟''

''ہرگز نہیں، بہرحال قربانی کی نوعیت مقصد کی نوعیت پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر جنگ کے دیوتا مریخ کو راضی کرنا ہو تو ایک جوان مینڈھا، اگر جنسی ہوسناکی کو مطمئن کرنا ہو تو بکرا وغیرہ لیکن کسی بھی مقصد کے حصول میں انسانی قربانی سے بڑھ کر کوئی قربانی نہیں۔''

جب سب لوگ اسے بوسہ دے چکے تو بکرے نے گھوم کر اپنا منہ پھر کاہنوں کی طرف کر لیا۔ اب اس کے کھروں میں ایک لکڑی کی صلیب تھی۔ اچانک اس نے صلیب کو پتھر پر شدت سے پٹک کر دو ٹکڑے کر دیا۔ بلی کی نقاب والے کاہن نے صلیب کا ایک ٹکڑا عبادت گزاروں کی طرف پھینک دیا۔ سب کے سب اس ٹکڑے پر پل پڑے اور خاموش بربریت کے ساتھ اسے لمحے بھر میں ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ کاہن نے دوسرا ٹکڑا زمین پر الٹا نصب کر دیا۔

اس کے بعد کھانا کھانے یا کھانے کو وحشیانہ طور پر بھنبھوڑنے اور نگلنے کا دور شروع ہوا۔ چھری کانٹے چمچے گلاس کا کوئی سوال نہ تھا۔ سب دونوں ہاتھوں سے لوٹ لوٹ کر یوں کھا پی رہے تھے گویا خود کو حیوانیت کی منزلوں سے آگے لے جانا چاہتے ہوں۔

''آؤ ہم لوگ ذرا اور نزدیک کھسک لیں۔'' ڈیوک نے کہا، ''اس وقت یہ سب جانوروں کی طرح کھانے میں مشغول ہیں، شاید اب ہمیں کوئی موقعہ مل سکے۔''

آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے دونوں دوست اب بکرے کی ہولناک صورت سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر آ گئے۔ سائمن بھی اوروں کی طرح گوشت کا ایک ٹکڑا دونوں ہاتھوں میں لیے اسے دانتوں سے بھنبھوڑ رہا تھا۔ اس کے لباس پر جگہ جگہ سالن اور شراب کے دھبے تھے۔ اس بھیانک اور حیرت افزا سکوت میں شیطان پرستوں کا گروہ تقریباً آدھے گھنٹے تک کھانے کے ساتھ حیوانی شغل کرتا رہا۔ آخر کار سائمن بھی شراب میں تقریباً دھت اپنے سنے ہوئے ہاتھوں کو اپنے لباس سے رگڑتا ہوا بھیڑ سے نکل کر کچھ دور جا کر گھاس پر ڈھیر ہو گیا۔

''آؤ!'' ڈیوک نے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔ ''اب ہمیں اسے نکال لے جانا چاہیے۔''

لیکن موقع ہاتھ آتے آتے نکل گیا۔ ان کے حرکت کرتے ہی کرتے ایک طویل القامت مرد اور پھر دو تین عورتوں نے سائمن کے نزدیک پہنچ کر اسے گھیرے میں لے لیا۔ ''کچھ نہیں ہو سکتا۔'' ڈیوک نے اپنی بے چینی کو دباتے ہوئے شدید غصے کے لہجے میں کہا۔

دعوت کھانے والے اب نشے میں بالکل غرق ہو چکے تھے اور سب کے سب ایک انسانی لہر کی طرح بکرے کے تخت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ڈیوک اور ریکس سائمن کو دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے تھے کہ انھوں نے ادھر سے اپنی توجہ ہٹالی تھی۔ اب انھوں نے دیکھا کہ کاہنوں نے بکرے کے سامنے ایک بڑی میز بچھادی تھی اور بکرا اپنا سر جھکا کر ایک بڑی سینی میں سے کچھ کھا رہا تھا۔

''تو شیطان کھاتا بھی ہے!'' ریکس نے حقارت سے کہا۔

''ہاں، یا کم سے کم اس کے کاہن اور حواری۔'' ڈیوک نے کہا۔ ''اور یہ کھانا بھی اسی کی طرح نفرت انگیز اور ڈراؤنا ہوگا یا تو کوئی سقوط الحمل بچہ یا کسی بدنصیب ماں باپ کی ننھی اولاد، جسے یہ گھر سے اٹھا لائے ہوں گے۔''

ایک بڑا سا دیگ نما برتن آگے لایا گیا۔ شیطان کے ساتھ کھانے والوں نے اپنے اپنے حصہ میں سے کچھ لے کر برتن میں ڈال دیا۔ ایک کاہن نے جو کچھ پھینکا اس سے ایک ٹھن ٹھناہٹ کی آواز ہوئی اور ریکس یہ دیکھ کر کانپ گیا کہ وہ گول سی چیز دراصل ایک ننھے بچے کا کاسۂ سر تھی۔

ان سب چیزوں کو کچھ دوسری جڑی بوٹیوں کے ساتھ ملا کر برتن میں کھولایا جائے گا پھر اس کا آب جوش تھوڑا تھوڑا ہر ایک کو تقسیم ہوگا اگلے سال یہی دن آنے تک ہر جادوگر اسے اپنے عملیات و سحر میں استعمال کرے گا۔''

''کیا فضول بات کرتے ہو تم کہیں بھلا اس لغو گندے شوربے سے کوئی عمل بھی کیا جا سکتا ہے؟''

خیر یہ الگ بات ہے۔ کیا تم کو کلمۂ حق کی قوتوں پر ایمان نہیں؟ مگر خدا کی پناہ اب تو وہ ایک اور بھی منحوس اور بے حرمتی کا عمل کرنے جا رہے ہیں۔ مت دیکھو، ریکس! ادھر مت دیکھو! یہ کہتے کہتے ڈیوک نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھانپ لیا۔ لیکن ریکس کی قوتِ ارادی جیسے سلب ہو گئی تھی، وہ ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ پہلے ایک بڑا چاندی کا پیالہ ہر کاہن کو دیا گیا، یہاں تک کہ پیالہ بھر گیا۔ پھر کاہن اعلیٰ نے بھرے ہوئے پیالے میں کلیسا کی کچھ مقدس ٹکیاں ریزہ ریزہ کر کے ڈالیں۔ اس محلول کو ٹوٹی ہوئی صلیب سے اچھی طرح ہلا کر بکرے کے اگلے کھروں میں پکڑا دیا گیا، اور پھر بکرے نے پیالہ اور اس کا مظروف زمین پر گرا دیا۔ دفعتہً سب پجاری ہول ناک جوش کی آواز کے ساتھ آگے بڑھے اور زمین پر گرے ہوئے مقدس ٹکیوں کے ریزوں کو اپنے قدموں سے کچلنے میں مصروف ہو گئے۔

''توبہ! اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ یہ سب کم بخت پاگل ہو گئے ہیں کیا؟'' ریکس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب سائمن کا کیا بنے گا؟''

''خدا ہی جانے۔ اگر کچھ بھی امید ہوتی میں ان کے درمیان کود پڑتا۔ لیکن جیسے ہی ہم پر ان کی نظر پڑی یہ ہماری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔''

مقدس ٹکیوں کے کچلنے کے دوران جادوگروں نے اپنے لباس اتارنے شروع کر دیے تھے اور اب انھوں نے ابلتی ہوئی دیگ کے دونوں اطراف گھیرا ڈال کر ایک مجنونانہ رقص شروع کر دیا۔ رقص کی نوعیت بکرے اور دیگ کے چاروں طرف تیزی سے چکر لگانے کے علاوہ کچھ نہ تھی، رقص کی رفتار لحہ بہ لحہ تیز تر ہوتی گئی، یہاں تک کہ عورتوں کے بال وحشیانہ انداز میں بکھرنے لگے، پسینے کے قطرے ان کے جسم سے بارش کی بوندوں کی طرح ٹپکنے لگے، ان کی سانسیں پھول گئیں۔ ایک دوسرے سے بے خبر اور بے نیاز، آنکھیں جنگلی جانوروں کی طرح سرخ وہ کسی ماورائی قوت کے زیرِ اثر ایک دوسرے پر گرتے پڑتے اٹھتے ٹکراتے رقص کیے جا رہے تھے۔

''میرا خیال ہے اب تو ان کم بختوں کو کسی بات کا ہوش نہیں رہ گیا۔ اب اگر ہم ان کے درمیان سے سائمن کو نکال لائیں....؟'' ریکس نے کہا۔

''خدا رحم کرے'' ڈیوک نے کہا۔ ''اب اس رقص کے بعد ہی بپتسمہ اور پھر اس ذلیل جنسی بہیمیت کا دور

چلے گا جس میں ہر وہ مکروہ فعل جائز ہوگا جو ان کے شراب اور افیون زدہ دماغ اختراع کر سکیں گے، میں ان سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ مجھے.... مجھے اس بھیانک شبیہ سے ڈر لگ رہا ہے جو تخت پر بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے جو جو اقدام تحفظ کے لیے کیے ہیں وہ اس کی ہولناک بدی کی طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں۔ خدا پر ہمارا ایمان بھی کافی نہیں، کیونکہ ہم سب گناہ گار بھی ہیں۔ کاش اس وقت یہاں روشنی ہوتی!'' ریکس کا دل ڈوب گیا؛ ''روشنی اور اس وقت یہاں؟'' ڈیوک پھر بولا۔ اس کی آواز خوف اور غم میں رچی ہوئی تھی ''خدا مجھے معاف کرے ریکس۔ میں بہت خوف زدہ ہوں، بہت مجبور ہوں۔'' اس نے اپنا چہرہ زمین میں چھپا لیا۔

ریکس غم و غصہ سے تقریباً پاگل ہو رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ انجام کی پروا کیے بغیر بھیڑ میں گھس پڑے کہ ڈیوک نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ ''رک جاؤ'' ''رک جاؤ! ابھی موقع ہے؟''

''کیا مطلب؟ چھوڑ میرا ہاتھ۔ تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' ریکس اٹھتا ہوا بولا۔

''نہیں نہیں! ابھی کار باقی ہے!'' ڈیوک نے کہا۔

''کار؟'' ریکس کے جواب دیتے ہوئے ذہن کو یہ لفظ بے معنی سا لگا۔ ''ہاں ہاں۔'' ڈیوک اٹھ کر پہاڑی کی اوٹ کی طرف دوڑتا ہوا بولا، جہاں اس نے اپنی رولس رائس جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپا رکھی تھی۔ کچھ نہ سمجھتا ہوا بھی ریکس اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ ڈیوک ہانپتا ہوا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ زیر لب پرانی مسیحی اور غیر مسیحی دعائیں پڑھتے ہوئے ڈیوک نے بہ دقت کار اسٹارٹ کر کے اس کی انتہائی طاقت ور روشنیاں اور سرچ لائٹ روشن کر دی۔

پتھروں، چھوٹی موٹی جھاڑیوں اور زمین کی ناہمواری کی پروا نہ کرتے ہوئے اس نے گاڑی کا رخ وادی کی طرف موڑ دیا اور گاڑی کو پوری قوت سے آگے کی طرف بڑھایا۔ تاریک وادی تیز سفید روشنی میں نہا اٹھی۔ ریکس ڈیوک کے بغل میں سیٹ سے چپکا ہوا نیل گوں نعل [1] کے مقدس پیکر پر اپنی چشم تصور کو پوری قوتِ ارادی سے مرکوز کیے ہوئے تھا، لیکن اسے ایسا معلوم ہوا جیسے بکرے کی سرخ آنکھوں کی روشنی اس کی روح سلب کیے دے رہی ہے۔ رولس رائس کی روشنیاں دھندلائیں، بجھ گئیں اور پھر روشن ہو گئیں۔ ڈیوک بلند آواز میں دعائیں پڑھ رہا تھا۔

---

(۱) گھوڑے کی نعل یا اس کی شکل کا تعویذ عہد قدیم سے بدی کی قوتوں کے خلاف مدافعت کے لیے کام میں لایا جاتا رہا ہے۔

نیچے وادی میں افراتفری اور انتشار کا ہنگامہ برپا تھا۔ کہیں کہیں جلتے ہوئے گوشت کی بدبو آرہی تھی، جیسے کار کی سفید روشنیوں نے جادوگروں کے جسموں کو سرخ لوہے سے داغ دیا ہو۔ خوف اور دہشت نے ڈیوک اور ریکس کو تقریباً نیم مردہ کر رکھا تھا۔ لیکن انھوں نے بکرے کی بلند درد بھری ممیانے کی کریہہ آواز سنی اور ٹوٹی ہوئی صلیب کو دفعتہً روشن ہو کر بکرے کے سر میں داخل ہوتے دیکھا۔

منٹوں میں وادی جادوگروں سے خالی ہونے لگی۔ وہ سائمن کو کھینچ کر زمین پر تقریباً گھسیٹتے ہوئے کار تک لائے۔ ڈیوک بلند آواز میں پڑھ رہا تھا۔

''وہ تجھے اپنے بازوؤں کے نیچے لے کر تیری حفاظت کرے گا۔ اس کی وفاداری اور حقانیت تیری ڈھال ہوگی۔ تورات کے کسی ہول سے خوف زدہ نہ ہوگا۔ نہ دن کو اڑنے والے کسی تیر سے، نہ اس عذاب سے جو تاریکی میں گھومتا پھرتا ہے، نہ اس روگ سے جو دوپہر کی روشن دھوپ میں موت لاتی ہے۔''

تقریباً بے ہوش سائمن کو موٹر میں ڈال کر وہ تیزی سے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہمارے ننھے منے دوست

آگے، پیچھے، حد نظر تک، بھوری پہاڑیاں۔ دور افق کے لبوں کو چھوتی ہوئی سفید برف پوش چوٹیوں کے مسکراتے جھل ملاتے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے سر۔ پس منظر میں ہوا کی پُر وقار لیکن ڈراؤنی سائیں سائیں، لیکن دونوں طرف اونچی پہاڑیوں کی حفاظت میں لپٹی ہوئی پتلی سفید پگ ڈنڈی بالکل چپ چاپ، بالکل سنسان، ابھی شام بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیچ وخم کھاتی ہوئی ننھی پگ ڈنڈی کے غیر موجود موڑ بیلوں کی میٹھی سہانی گھنٹیوں کی آواز سے آہستہ آہستہ گونج رہے تھے۔ سیکڑوں صدیوں سے سر اٹھائے، سینہ تانے، گردن اکڑائے پہاڑوں کے دامن میں رنگ برنگے پھول۔ پھول جو آپ سے آپ کھلتے ہیں اور آپ ہی آپ مرجھاتے ہیں۔ گھنے جنگل کی تنہا نہتی تاریکی کے سینے میں چبھتی ہوئی جگنو کی روشنی کی طرح انھیں کوئی نہیں دیکھتا۔

پگ ڈنڈی گرد آلود تھی۔ کبھی کبھی جب ہوا پہاڑوں کی کسی تنگ سرنگ نما دراز سے بہ مشکل گزر کر وادی میں سر پٹکنے اور رقص کرنے آجاتی تو گرد کے چھوٹے چھوٹے مرغولے اٹھ کر بگولوں کا سماں پیش کرنے لگتے۔ اگست کے مہینے کی سخت جامد دھوپ گرد و پیش کو اپنی گرم آغوش میں لیے ہوئے تھی، جوتے گرد آلود، بغلیں پسینے میں تر، ہونٹوں پر سرد دھوپ کی خشکی، ایک لڑکا اور ایک لڑکی جن کی عمروں کی مجموعی میزان پینتالیس سے کم ہی

رہی ہوگی، آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہوئی پگ ڈنڈی کی سطح پر تھکے تھکے قدم مار رہے تھے۔ لباس کی تراش اور ظاہری وضع قطع سے وہ شہری معلوم ہوتے تھے۔ شاید نئی شادی کے بعد ہنی مون منانے نکلے ہوں گے، لڑکی نے اپنے سر پر ایک سرخ سفید اسکارف باندھ رکھا تھا لیکن اس کے گھنے چمکیلے بال نائلون کے اسکارف کی قید سے اکتا کر جگہ جگہ اس کی گوری پیشانی اور گلابی کانوں پر بکھر آئے تھے۔ اسی طرح اس کا جوان جسم تنگ جمپر اور شلوار کی قدغن کو توڑ کر جگہ جگہ عریاں ہونے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ لڑکے کے چہرے پر غیر معمولی ذہانت یا اشرافیت کے آثار نہ تھے۔ وہ بھی ان ہزاروں لاکھوں نوجوان لڑکے لڑکیوں کی وسیع بھیڑ کا ایک گم نام فرد تھا جو بڑے بھرے پرے شہروں کے بارونق بازاروں، سینما گھروں، ریستورانوں اور دفتروں میں لحظہ بہ لحظہ ڈولتی نظر آتی ہے۔ دونوں کے چہروں پر زندگی تھی، نئی محبت کی نرم حرارت سے ان کی سانسیں تیز تھی اور آنکھیں روشن لیکن اس وقت دونوں بری طرح تھکے اور پست ہمت اور عظیم الشان سر بہ فلک پہاڑیوں کے پس منظر میں بہت ہی کم حقیقت اور ناچیز معلوم ہو رہے تھے۔

''ابھی کتنی دور ہے؟ اب مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔'' لڑکی نے کہا۔

''بس چار ہی پانچ میل رہ گیا ہوگا۔ ان کم بخت پگ ڈنڈوں پر تو مائل اسٹون بھی نہیں ہوتے۔''

''تم تو گھنٹوں سے چار پانچ ہی میل کہتے آرہے ہو۔ دو بجنے کو آئے ابھی تک آپ کے چار میل ختم ہی ہونے میں نہیں آتے۔''

''اجی ذرا صبر کرو'' لڑکا کچھ ہانپتا ہوا لیکن چڑانے کے انداز میں بولا۔ ''یہاں تو آدمی ہے نہ آدم زاد۔ بس ہم ہی تم ہیں۔'' وہ اس کی طرف معنی خیز نگاہوں اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر خفیف سی ہنسی ہنسا۔

''میں کس سے پوچھوں؟'' لڑکی کے کانوں کی لوری سے لے کر گالوں تک ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ چپ رہو۔ تم بڑے وہ ہو۔ اب تو مجھے بھوک ہی لگ رہی ہے۔''

'''بس آج کل کی لڑکیوں کو کھانا کھانے ہی کی سوجھتی ہے۔ نہ سینا نہ پرونا، نہ خانہ داری، کھانا پکاؤ گی نہیں تو کھاؤ گی کہاں سے؟''

خدا معلوم کس نے ان سے کہا تھا کہ رانی کھیت سے نینی تال پیدل چلیں۔ کیا کوئی ضروری ہے کہ ہر آدمی تین سنگھ ہی بن جائے۔''

لڑکی سنی ان سنی کر کے بولی۔

باتیں کرتے کرتے وہ پگ ڈنڈی کے ایک ایسے موڑ پر آپہنچے تھے جس کے سامنے ایک نیچی پہاڑی صدہا ننھے منے اور اونچے درختوں کا بوجھ اٹھا کے آگے کو اس طرح جھک آئی تھی کہ خم کے ادھر کچھ نظر نہ آتا تھا۔ راستہ آہستہ اور بھی اونچا ہو گیا۔ ان کے بائیں طرف پہاڑی تھی اور داہنی طرف تقریباً خطِ مستقیم کھینچتا ہوا پہاڑی کا اترتا ہوا دامن، جو سیکڑوں فیٹ دور جا کر گھنی کہر آلود وادی میں گم ہو گیا تھا۔ دھوپ کی تمازت چکنی پتیوں سے ہلکی ہلکی بخار نما حرارت اٹھا رہی تھی۔ جس سے ماحول اور بھی حابس ہو گیا تھا۔ جب موڑ سے ہو کر وہ دوسری طرف پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے دائیں جانب وادی میں اترنے کے لیے ایک بہت ہی باریک سی پگ ڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ وہاں سے اتار بھی نسبتاً آسان تھا اور غالباً بن مانسوں نے یہی دیکھ کر نیچے کی دشوار گزار وادی تک پہنچنے کے لیے یہیں سے راستہ نکالا تھا۔ لڑکی وہیں رک کر نیچے کی طرف جھانکنے لگی، لیکن لڑکا بے خبری میں کچھ دور نکل گیا تھا۔

''اے سنو، سنو! کہاں چلے جا رہے ہو؟ آؤ ذرا نیچے گھاٹی میں چلیں۔ وہاں ایک آدھ جھونپڑیاں ہیں۔''

''ہوں گی۔ لڑکے نے مڑ کر کہا۔ ''تمھیں رات انھیں جنگلوں میں گزارنی ہے کیا؟ یہاں شیر بھی ہوتے ہیں؟'' اس نے اسے ڈرانے والے انداز میں کہا، لیکن لہجہ مزاحیہ تھا۔

''میں آگے نہ جاؤں گی۔ مجھے بھوک لگی ہے گرمی بھی تو بہت ہے۔'' لڑکی کا انداز چمکارنے کا سا تھا۔

''مان جاؤ نہ۔ نیچے گھنا جنگل ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی وہاں کیا حال ہے۔''

اتنا کہتے کہتے لڑکی جواب کا انتظار کیے بغیر تنگ پگ ڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی نیچے اترنے لگی تھی۔ لڑکا بھی مجبوراً لیکن ذرا منہ بنائے ہوئے اس کے پیچھے ہو لیا۔

ابھی وہ آدھے ہی راستے میں تھے کہ ان کی ہمتیں جواب دینے لگیں۔ فضا میں عجیب بھاری سکوت اور خشم گیں ٹھہراؤ سا تھا۔ بار بار گھسٹ گھسٹ کر اترنے اور چاروں ہاتھ پاؤں کا استعمال کرنے کی وجہ سے ان کی ہتھیلیاں زخمی تھیں۔ لڑکی کی چست شلوار اور لڑکے کی تنگ پتلون جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور گھٹنوں کی خراشیں جھانک رہی تھیں۔

''اوہ.... کتنی سردی ہے۔'' لڑکی نے سسکی سی لی۔ وہ کچھ کچھ کانپ رہی تھی۔ ''تم ہی نے تو کہا تھا کہ اوپر دھوپ بہت ہے۔ اب تم جانو۔'' لڑکا ایک موٹی سی ٹیڑھی میڑھی جڑ کو پکڑ کر بہ مشکل اپنا توازن برقرار رکھتا

ہوا بولا۔ اس کی آواز میں بھی خفیف سا ارتعاش تھا۔

سردی واقعی اچانک بہت بڑھ گئی تھی۔ انھوں نے پیدل چلنے میں گرمی کے احساس سے ہلکے ہی کپڑے پہن رکھے تھے اور اب سردی کی یخ بستہ لہر غیر مرئی طور پر ان کی ہڈیوں میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ لڑکی کا اسکارف ڈھیلا ہو کر سر سے اتر آیا تھا اور اس کے بال خشک پسینے کے ساتھ کانوں اور گردن پر چپکے ہوئے تھے۔ ہوا اب بھی بالکل نہیں تھی، لیکن پھر بھی فضا غیر معمولی طور پر سرد تھی۔

اچانک نیچے کا جنگل چڑیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ عجیب و غریب نغمہ تھا۔ بے انتہا سریلا اور بے انتہا پُرشور۔ جیسے اچانک زمین کے دروازے کھل گئے ہوں اور لاکھوں پریاں اپنے پاؤں میں گھونگرو لگائے حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہی ہوں اور ناچ رہی ہوں۔ ایک لمحہ کے لیے ان پر ہیبت سی طاری ہو گئی۔ نغمہ اس طرح دفعۃً ابھرا تھا جیسے کسی خاموش ریڈیو کا مائیکروفون اچانک اپنی پوری طاقت سے بول اٹھا ہو۔ لڑکی سکتے میں آ گئی تھی اور اس طرح اپنی گردن ایک طرف کو جھکائے مبہوت سن رہی تھی جیسے چڑیاں اپنی گردن موڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔

"آؤ، آؤ، نیچے چلو۔" وہ بولی۔ "کتنا پیارا گیت ہے۔"

لڑکے کا چہرہ کھنچا ہوا سا اور اس کی آنکھیں کچھ متوحش تھیں، جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ اس بھیانک اور خوبصورت آرکسٹرا کو سنتے رہنا ٹھیک ہے بھی یا نہیں۔ لیکن لڑکی ٹٹول ٹٹول کر پاؤں رکھتی، ایک دو گز اور نیچے پہنچ چکی تھی۔ بادلِ ناخواستہ وہ بھی نیچے ہو لیا۔ جنگل میں چڑیوں کا غیر فطری شور پورے جوش و خروش سے جاری تھا، ان کی گیت میں ایک ایسا وحشیانہ حُسن اور تنویمی دل کشی تھی کہ دونوں کو اپنی قوتِ ارادی بے کار ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک کر وہ اپنی پوری توجہ اس شدت سے مرتکز کر کے چڑیوں کے گیت کو سنتے کہ گردن اور جبڑے کے پٹھے تن جاتے اور پیشانی پر تفکر کی سی لکیریں ابھر آتیں۔

سردی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی اور دونوں کی آنکھوں میں خواب ناک غنودگی کا سا عالم تھا۔

اب وہ نیچے پہنچ کر وادی کے دامن پر سایہ کیے ہوئے درختوں سے گزر رہے تھے۔ لڑکے کا چہرہ اب بھی فکر سے آلودہ تھا۔ اس کی بھنویں سوچ اور الجھن میں سکڑی ہوئی تھیں۔ وہ چڑیوں کے غیر فانی گیت کو غور سے سن بھی رہا تھا لیکن اسے رہ رہ کر کسی کمی، کسی انوکھے پن، یا کسی غیر فطری قوت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

دونوں تھکے تھکے قدموں سے جنگل میں اور اندر آئے اور ایک موٹے دیودار کی جڑ پر بیٹھ گئے۔ لڑکی کے

بدن میں سردی کا رعشہ اب پوری طرح گھر کر چکا تھا لیکن اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ وہ کھسک کر لڑکے کے اور بھی پاس آ گئی اور سمٹ کر اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئی۔

کیا وہ خوف زدہ ہے؟ لڑکے نے سوچا۔ نہیں نہیں خوف زدہ میں ہوں مگر کیوں؟ کچھ نہیں، ہم دونوں کو سردی لگ رہی ہے۔ کم بخت چڑیاں یہ شور کب بند کریں گی؟ لڑکی نے اب اپنا سر اس کے کاندھوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔ لڑکے نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ کسی بھی ذی روح کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ جانے وہ بن مانس کہاں رہتے تھے۔ جنھوں نے اپنے استعمال کے لیے یہ تنگ پگ ڈنڈی تراشی تھی۔ مگر وہ پگ ڈنڈی بھی ان کے ذرا ہی آگے جا کر ختم ہو گئی تھی۔ جھونپڑیاں کہاں ہیں، سب لوگ کہاں گئے؟

چڑیوں کا سریلا بھیانک شور اپنے شباب پر تھا۔

ہر لے مختلف، ہر راگ صاف اور کھلا ہوا۔ ہر اتار چڑھاؤ سمجھ میں آنے والا، جیسے کوئی غیر مرئی کنڈکٹر اپنے ساحرانہ عصا کو اوپر نیچے لا کر یہ حیرت انگیز موسیقی مسحور موسیقاروں کے حلق سے پیدا کر رہا ہو۔

اچانک آوازیں اس طرح ایک دم رک گئیں جس طرح شروع ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے سوئچ گھما کر بند کر دیا ہو۔ ''کیا ہوا؟'' لڑکی نے آنکھ کھول کر پوچھا لیکن جنگل میں ہوا کی سائیں سائیں بھی نہ تھی۔ سخت پتھریلی دھوپ جو سیکڑوں فیٹ اوپر بھوری پہاڑیوں سے نبرد آزما تھی یہاں کہیں پہنچ نہ پائی تھی۔ مگر اندھیرا بھی نہ تھا۔ اتنا تو ہرگز نہ تھا کہ وہ اس فاختئی رنگ کی ننھی سی چڑیا کو نہ دیکھ سکتے جو ان سے بیس پچیس قدم دور کھڑی انھیں اپنی گلابی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔

بغیر پلک جھپکائے۔

''دیکھو! دیکھو!'' لڑکی چلائی۔ وہ رہی، دیکھو نا ہم سے کچھ کہنے آئی ہے۔'' وہ ہنس رہی تھی۔ لیکن....

چڑیا آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ لڑکی نے اسے چمکارنا اور پاس بلانا شروع کر دیا۔ لیکن لڑکے کی نگاہیں چڑیا کے پیچھے آنے والی قطار پر جمی ہوئی تھی جو لحہ بہ لحہ سائے سے نکل کر ان کے پاس آتی جا رہی تھی۔ مکمل اور مضبوط نیم دائرہ تھا جو انھیں اپنے گھیرے میں لینے جا رہا تھا۔ گھیرے میں! گھیرے میں کیوں؟ لڑکے نے خوف زدہ نظروں سے پیچھے دیکھا۔ نیم دائرہ نہیں، مکمل دائرہ تھا۔ ایک ٹھوس، موٹی سی لکیر تھی جو پھانسی کے پھندے کی طرح انھیں باندھے لے رہی تھی۔

مگر لڑکی اب بھی اس اگلی چڑیا کو دیکھ رہی تھی جو پھدک کر اب اس کے ٹخنوں پر آ گئی تھی۔ آجا! آجا! وہ

اسے چمکارتی ہوئی اور ہنستی ہوئی بولی۔ دفعتہً ساکت فضا میں کسی چڑیا کو دیکھ رہی تھی جو پھدک کر اب اس کے ٹخنوں پر آ گئی تھی۔ ''آجا! آجا!'' وہ اسے چمکارتی ہوئی اور ہنستی ہوئی بولی۔

دفعتہً ساکت فضا میں کسی چڑیا کی ایک بے حد شیریں، غیر معمولی سریلی آواز آسمان سے ٹپکی۔

چڑیا اچھل کر لڑکی کی کہنی پر آ گئی تھی۔ لڑکا مسحور لڑکی کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں اب نیم وا تھیں اور رنگ سفید۔

''ہی ہی ہی'' لڑکی کی مرتعش ہنسی فضا میں بغیر کوئی تلاطم پیدا کیے مر گئی۔ ''آجا۔ آجا۔'' اب اس کی آواز بھاری اور رندھی ہوئی تھی جیسے وہ نیند میں ہو۔

دفعتہً بھاری فضا میں کسی چڑیا کی ایک بے حد شیریں، غیر معمولی سریلی، پہلے سے بھی زیادہ میٹھی آواز آسمان سے ٹپکی۔

چڑیا اب اپنی گلابی آنکھوں سے لڑکی کو اس طرح گھور رہی تھی جیسے کچھ کہنے والی ہو۔ بڑھتی ہوئی فاختئی چڑیوں کا گھیرا اب لڑکے کے قدموں تک آ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر ٹھوکر ماری۔ ایک چڑیا مردہ ہو کر گر پڑی لیکن گھیرا بڑھتا رہا۔

دفعتہً جامد فضا میں کسی چڑیا کی ایک بے حد شیریں مدہوش کن آواز۔ پہلے سے بہت زیادہ سریلی۔ آسمان سے ٹپکی، کہنی پر بیٹھی ہوئی۔ فاختئی چڑیا نے کالے ناگ کی طرح بجلی کی سی تیزی سے اپنی نوکیلی چونچ لڑکی کے سرخ وسفید رخسار میں پیوست کر دی۔ خون کی ایک سرخ چمکیلی لکیر بہہ نکلی۔

لڑکا غصہ اور خوف سے چیخ مار کر لپکا۔ لیکن چڑیاں اب بالکل سر پر آ گئی تھیں۔

سنسان جنگل میں چڑیوں کی شکل کے پروں سے ڈھکے ہوئے دو تودے تھے جو تڑپ تڑپ کر چیخ رہے تھے، بال و پر پٹک رہے تھے، پھڑ پھڑا رہے تھے اور

پھر وہ آہستہ آہستہ ساکت ہو گئے۔

(مرکزی خیال فلپ میک ڈونلڈ کی انگریزی کہانی سے ماخوذ)

آواز پا

عجیب بور شخص تھا وہ مجاور بھی۔ زبان تھی کہ سلائی کی مشین جو رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ میں نے چپکے سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بارہ بج رہے تھے۔

''یہ حضرت بی بی کا مقبرہ ہے۔ مادر زاد ولی تھیں، یہ بی بی۔ تین سال کی عمر سے مرتے دم تک ایک وقت کی نماز قضا نہیں کی۔ ہمارے حضرت ان پر خاص نظر کرم رکھتے تھے۔ مشہور ہے کہ بی بی جس پر بھی ایک بار توجہ سے نگاہ کرتی تھیں وہ کپڑے پھاڑ مجذوب ہو جاتا تھا اور انھیں کی چوکھٹ کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ ان کی کرامات کا ذکر لوگ آج تک کرتے ہیں، کہتے ہیں ایک دن....''

''کتابوں میں بھی کہیں کچھ لکھا ہے یا صرف زبانی جمع خرچ ہے؟'' میں نے کچھ چڑ کر کہا۔

''جی....؟'' شاید اس کو میرے لہجہ کی جھنجھلاہٹ کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ بزرگوں کی باتیں ہیں، کتابوں اور کتابوں میں تو کچھ نہیں ملتا لیکن سیکڑوں برس سے لوگ جانتے مانتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کا اعتقاد ہے۔ یہ دیکھیے یہ بی بی بلائی کی قبر ہے۔ مشہور ہے کہ ایک بار ہمارے حضرت نے خانقاہ کی بلی پر توجہ کی نظر ڈال دی تھی۔ بلی نے بھی درجہ ولایت کو پہنچ کر بی بی بلائی کا نام پایا۔ کہتے ہیں کہ خانقاہ میں جتنے مہمان دن بھر میں آنا ہوتے تھے، بی بی بلائی صبح کو اتنی ہی بار میاؤں کرتی تھیں۔ بی بی بلائی نے ولی ہونے کے بعد چوہے مارنا بند کر دیا تھا....''

''جنت میں جگہ ملے گی بی بی بلائی کو؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''جنت میں۔؟ کیوں نہیں، کیوں نہیں، آخر کو ولی تھیں۔'' وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔

''لیکن اسلامی عقیدے کے اعتبار سے تو صرف اصحابِ کہف کا کتا، حضرت عیسیٰؑ کا گدھا اور حضرت ابوہریرہؓ کی بلی ہی کو جنت نصیب ہوگی؟''

شرع اور فقہ کے یہ مسائل میرے مجاور کی فہم سے بالاتر تھے وہ ایک لمحہ چپ رہ کر بولا۔''جناب یہ ہنسی اڑانے کی چیز نہیں ہے۔اپنا اپنا ایمان ہے ہمارے حضرت کی بارگاہ....''

''ہوگا، ہوگا۔ آپ نے تو کہا تھا کہ خانقاہ کی عمارت بہت قدیم اور تاریخی اہمیت کی مالک ہیں۔ وہ علاء الدین خلجی کا بنوایا ہوا حجرہ کدھر ہے؟ اسے دیکھ لیں تو چلیں۔اب بہت دیر ہو رہی ہے۔''

میرے بائیں پاؤں میں پھر کچھ تکلیف ہو رہی تھی۔ دس سال پہلے اتفاقیہ گولی لگ جانے کی وجہ سے گھٹنے کی ہڈی چکنا چور ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے جوڑ توڑ لگا کر ٹھیک تو کر دیا تھا لیکن زیادہ دیر تک چلنے میں مجھے اب بھی مشکل ہوتی تھی اور پاؤں میں ذرا سا لنگ باقی تھا۔لیکن میں اجنبیوں کے سامنے اپنی اس کمزوری کا اقبال شاذ ہی کرتا تھا۔ بڑھاپا نزدیک آ رہا تھا،لیکن میری خودداری گوارا نہ کرتی تھی کہ میں کسی بھی طرح خود کو دوسروں کے سامنے محتاج یا مجبور ظاہر کروں۔ خانقاہ کی سیر کرتے کرتے دو گھنٹے ہو چکے تھے، اب چلنا یا کھڑا رہنا میرے لیے ایک مصیبت تھا،لیکن کیا کرتا۔مجاور انشورنس ایجنٹ یا ہوشیار سیلز مین کی طرح میری توجہ کے دامن کو اس طرح پکڑے ہوئے تھا کہ مفر ہی نہ تھا۔''مجھے بھی کیا پڑی تھی کہ بارہویں صدی کی اس گمنام خانقاہ اور بارگاہ کو دیکھنے کے لیے اپنی راہ کھوٹی کرتا؟'' میں نے تلخی سے سوچا۔ پرانی عمارت کو دیکھنے کا شوق مجھے اکثر اس طرح مشکلوں میں ڈال دیا کرتا تھا۔ میں بعد میں خود کو برا بھلا بھی کہتا لیکن شوق اگر عادت کی حد تک پہنچا ہوا ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

اب ہم خانقاہ کے بوسیدہ مینار پر چڑھ رہے تھے۔مشکل سے پچاس سیڑھیاں ہوں گی لیکن چوٹی تک پہنچتے پہنچتے میری حالت دگرگوں ہو گئی، مجاور اپنی سپاٹ یک رنگ آواز میں کہے جا رہا تھا۔ یہ مینار 1392ء میں فیروز تغلق نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ پہلے اس مینار کی بلندی 70 گز تھی لیکن اب اس کے صرف تین درجے باقی رہ گئے ہیں۔مشہور ہے کہ ایک بار حضرت نے اس پر جذب کے عالم میں نگاہ کی تو مینار کے اوپری درجے تابِ جلال نہ لا کر سجدہ ریز ہو گئے۔''

خدا جانے کتنے مسافروں کو یہ احمقانہ افسانہ سنایا گیا ہوگا۔ میں نے سوچا لیکن کوئی ضروری نہیں کہ ایسا ممکن نہ ہو، یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو دوسری چیزیں ممکن نہ ہوں۔ بہر حال میرا کام سیر و تفریح ہے، حقیقت اور افسانے کی چھان بین نہیں۔ مجھے اپنی معتدل مزاجی اور وسیع النظری پر بڑا بھروسہ اور فخر ہے، میں کسی چیز پر ایمان نہیں رکھتا لیکن کسی چیز کو غلط بھی نہیں سمجھتا تاوقتے کہ وہ غلط ثابت نہ ہو جائے۔ دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ مجاور نے اپنی ساری تقریریں زبانی یاد کر رکھی تھیں یا شاید بار بار دہرانے سے اسے خود بہ خود یاد ہو گئی ہوں۔

''.... مینار کی تعمیر پر ڈھائی لاکھ روپے لاگت آئی تھی، اس وقت جب ایک روپے کا پانچ من گیہوں تھا اور ایک سپاہی کی تنخواہ دو پیسہ یومیہ تھی۔ ہمارے حضرت کے لنگر کا خرچ ہزاروں روپیہ یومیہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ کھانے میں جس قدر پیاز استعمال ہوتی تھی، صرف اس کے چھلکے گاڑیاں بھر بھر کر پھینکے جاتے تھے۔''

نیچے مسجد کے وسیع صحن میں اکا دکا نمازی نظر آنے لگے تھے، شاید اولیا سلف کے زمانے میں یہاں جم غفیر اکٹھا رہتا ہو۔

''.... وہ جو دور چھوٹی سی پہاڑی آپ دیکھ رہے ہیں اس میں ایک تنگ سا غار ہے، کافی گہرا، نیچے پہنچنے کے لیے پتھر کی سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ وہ غار دراصل بے تاب بابا کا حجرہ تھا۔''

''کس کا؟'' بے تاب بابا کا نام میرے خیالات کا سلسلہ توڑ کر اچانک میرے ذہن کو چونکا گیا۔ لیکن میری اس مداخلت نے شاید مجاور کے منہ زبانی جملوں کا تسلسل بھی منتشر کر دیا، کیونکہ وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہو گیا۔

''بے تاب بابا ہمارے حضرت کے آخری وقتوں کے مرید تھے۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، لیکن وہ ہر وقت ''آہ آہ'' کے نعرے بلند کرتے رہتے اور راتوں رات آہ و بکا کیا کرتے تھے، اس لیے ان کا نام بے تاب بابا پڑ گیا تھا۔ حضرت کے وصال کے بعد وہ مستقل اپنے حجرہ میں بند رہنے لگے تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ....''

یہاں پہنچ کر مجاور خود خاموش ہو گیا۔ مجھے نہ جانے کیوں بے تاب بابا میں دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔

''کیا ان سے بھی کوئی کرامت سرزد ہوئی تھی۔''

مجاور نے میری طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا ''جناب آپ کو یقین نہیں آئے گا۔'' شاید میری

پچھلی تشکیک اس کے الفاظ کے سیلاب سے ہوکر اس کے ذہن میں کوئی نقش چھوڑ گئی تھی۔'' لیکن واقعہ یہ ہے کہ شیطان ان کی آہ وزاری اور خلوصِ قلب کو دیکھ کر انھیں بہکانے کے لیے ایک حسین وجمیل لڑکی کا بھیس بنا کر ان کے حجرہ میں آرہا تھا اور برسوں تک وہ نیم عریاں بے حیا لڑکی ان کے حجرہ میں رہی۔''

میں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا اور کہا۔ ''پھر.....؟''

''بے تاب بابا نے اس کی ذرہ برابر پروانہ کی، لیکن جب برسوں مہینوں وہ ہمہ وقت ان کے ساتھ رہنے لگی تو ان کا دل بھی اس کی طرف مائل ہونے لگا۔ تنگ آکر انھوں نے خدا سے اس بے انصافی کی شکایت کی اور غصہ میں آکر دُعا کی اگر اس شیطانی آزمائش ہی میں ڈالنا تھا تو خود شیطان ہی کو کیوں نہ بہ نفس نفیس ان پر مسلط کر دیا۔''

مجاور پھر خاموش ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے بے تاب بابا کی طویل آزمائش آہستہ آہستہ ان کی شکست اور احساسِ گناہ کی طویل داستان کسی تیز گزرتے ہوئے منظر کی طرح میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔

ان کی دعا قبول ہوگئی۔ لڑکی نے بے تاب بابا کا حجرہ چھوڑ دیا، لیکن اب وہ جدھر جاتے (انھیں خواب میں حضرت نے حکم دیا تھا کہ دن کا کچھ حصہ آبادی میں گزاریں اور لوگوں کو برکت دیں) انھیں اپنے پیچھے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی۔ جیسے کوئی بڑے اطمینان سے ساتھ ساتھ چل رہا ہو، ایسا شخص جسے نہ ٹھوکر لگتی ہو، نہ کسی بات کی جلدی ہو، نہ اس کے قدم غلط پڑتے ہوں، جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ جب چاہے گا اپنے سے اگلے آدمی کو جالے گا۔ صبح شام، دن رات، بابا کو قدموں کی آہٹ سنائی دیتی، دوسرے بھی کبھی کبھی سنتے، لیکن پیچھا کرنے والے کو کبھی کسی نے دیکھا۔

''ایک رات جب بابا بستی سے لوٹ رہے تھے، پیچھا کرنے والا لمبے لمبے قدم بڑھا کر بابا کے برابر آگیا۔ بابا نے مڑکر دیکھا تو وہ اپنی اصلی شکل صورت میں ان کے سامنے موجود تھا۔ اس کی شبیہہ اتنی خوفناک تھی کہ بابا کی ہمت چھوٹ گئی، ان کے قدم اکھڑ گئے، انھوں نے الٹے پاؤں بھاگنا شروع کیا۔ وہ اندھا دھند بھاگتے رہے لیکن پیچھا کرنے والا ان کے ساتھ ساتھ رہا، جیسے وہ تھکتا ہو نہ لڑکھڑاتا ہو۔ بھاگتے بھاگتے بابا نے ندی کے کنارے پر پہنچ کر چھلانگ لگا دی۔ وہ دن اور آج کا دن نہ بابا کی لاش ملی نہ کوئی اور پتہ چلا۔''

مجاور ایک میلے سے رومال سے اپنا پسینہ خشک کر رہا تھا۔ میں نے دل میں پیدا ہوتی ہوئی دہشت کو دبا کر کہا۔

''تنگ حجروں میں بند رہتے رہتے دماغ اکثر خراب ہو جاتا ہے، اچھا آیئے اس حجرہ کو بھی دیکھ لیں۔''

غار کے دہانے سے کچھ نظر نہ آتا تھا کہ اندر کیا ہے۔ مجاور کافی سہما ہوا سا تھا، میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کو کہہ کر سیڑھیاں اترنی شروع کیں۔ خاصا گہرا غار تھا۔ سیڑھیاں نم آلود اور فضا متعفن تھی۔ دس بارہ سیڑھیاں اتر کر مجھے ایسا لگا جیسے مجاور اپنی بزدلی پر آخر کار قابو پا کر میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہو، لیکن میں نے مڑ کر دیکھا تو کوئی بھی نہ تھا۔ مجاور غار کے منہ پر روشن دائرے میں جھکا ہوا مجھے دیکھ رہا تھا.... مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرا منہ چڑھا رہا ہو.....

لیکن وہ وہیں تھا، میرے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میں ساری سیڑھیاں طے کر کے حجرہ میں پہنچا تو وہاں چمگادڑوں کی بیٹ اور چھت سے ٹپکتی ہوئی سیلن جیسے جیسے میرے واہمہ کا مذاق اڑا رہی تھی۔ میں جب واپس ہونے لگا تو میں نے پھر قدموں کی آہٹ سنی۔ جیسے کوئی بہت اطمینان سے میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے قدموں کی صدائے بازگشت نہیں تھی۔ کیونکہ لنگڑے پاؤں کی چاپ صحیح و سالم ٹانگوں والوں کی آہٹ سے مختلف ہوتی ہے۔ میرا پیچھا کرنے والے کی آہٹ میری آہٹ سے بالکل مختلف تھی۔

باہر نکل کر میں نے مجاور سے پوچھا۔ ''بے تاب بابا کی موت کس دن ہوئی تھی؟''

''پندرہ شعبان کی رات کو۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور آج کیا تاریخ ہے؟''

''یکم رجب۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں؟'' میں نے کہا ''کچھ نہیں مجھے یوں ہی خیال آیا تھا کہ چاندنی رات میں نظری واہمہ زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔''

لیکن میں جہاں جہاں گیا قدموں کی آواز میرا پیچھا کرتی رہی، جیسے کوئی شخص بڑے اطمینان سے ساتھ ساتھ چل رہا ہو، جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو، جیسے اسے معلوم ہو کہ وہ جب چاہے گا اپنے سے اگلے آدمی کو جا لے گا۔ میں اگر کبھی ٹھوکر کھا کر لڑکھڑاتا تو بھی اس کے قدموں میں تبدیلی نہ ہوتی اگر میں اونچی نیچی پتھریلی زمین پر الٹے سیدھے قدم رکھتا تو بھی میرے تعاقب میں آنے والے کی رفتار میں کوئی فرق نہ آتا۔ جیسے ساری زمین اس کے لیے مسطح اور برابر ہو، جیسے اسے کبھی ٹھوکر نہ لگتی ہو، جیسے اس کے قدم کبھی غلط نہ پڑتے ہوں۔ گھر

کے زینوں پر، دروازہ بند کرتے وقت، اژدہام سے لدی ہوئی سڑکوں پر، روشن اور مشغول دفتروں میں، وہ آزاد کبھی میرا ساتھ نہ چھوڑتی۔

مگر بے تاب بابا کا پیچھا کرنے والا تو دوسروں کو بھی اپنے قدموں کی آہٹ سننے دیتا تھا۔ میرے تعاقب میں کون ہے، کیا دوسرے بھی اس کی چاپ سنتے ہیں؟ ایک دن میں نے اپنے نوکر سے پوچھا۔

''تم نے کبھی سنا، گھر میں کسی کے چلنے کی آواز آتی رہتی ہے؟''

''جی ہاں۔ مگر اتنا بڑا اور پرانا مکان ہے، سنا ہے پرانے مکانوں میں ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں، میں نے تو کبھی زیادہ خیال نہیں کیا۔''

اس جواب کے بعد میرے پاس خاموشی کے سوا کیا چارہ تھا؟

آج پندرہ شعبان ہے۔ رات کے دس بجے ہیں۔ میں اپنی خواب گاہ کا دروازہ مقفل کر کے یہ جملے لکھ رہا ہوں۔ خدا معلوم لوگ میرے بعد ان کا کیا مطلب نکالیں گے۔ بند دروازے پر دوبارہ دستک ہو چکی ہے، لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ تیسری دستک پر مجھے دروازہ کھولنا ہی ہوگا۔ وہ زیادہ دیر انتظار نہیں کرے گا، لیکن اسے بھی معلوم ہے کہ تیسری دستک آخری ہوگی۔

لیکن میں بے تاب بابا کی طرح بھاگوں گا نہیں، یہاں کوئی ندی بھی نہیں ہے جہاں میں پناہ لے سکوں۔ سامنے میز پر بھرا ہو پستول رکھا ہے، دروازہ کھولنے کے بعد مجھے بے تاب بابا کی طرح میلوں میل دوڑ کر ندی میں کودنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

کوئی اطمینان سے زینے چڑھ کر اوپر آ رہا ہے۔ اب دستک ہونے ہی والی ہے۔

(مرکزی خیال سیسل بنی کی انگریزی کہانی سے ماخوذ)

معصوم جانیں

جب دولت ہو اور فرصت بھی تو ملکوں ملکوں کی سیر سے بڑھ کر تفریح کیا ہو سکتی ہے؟ لاڈلے مرزا کا جسم بوڑھا تھا، مگر دل میں جوانی کے دم خم باقی تھے۔ بال بچوں سے فارغ البالی، باپ دادا کی چھوڑی ہوئی فراواں دولت، اور تجسس و تفریح کا بے ضرر جذبہ انھیں سال کے چھ سات مہینے مصروفِ سفر رکھتا تھا۔ کبھی افغانستان، کبھی برما، کبھی جنوبی مشرقی جزائر، کبھی مغرب اقصیٰ، کبھی یورپ، ان کا گھر کیا تھا، اچھا خاصا عجائب خانہ تھا، جس میں دور دراز کی اکٹھا کی ہوئی عجوبۂ روزگار چیزیں کمال لاپروائی سے فرش پر، الماریوں میں، میز کرسیوں پر، کارنس اور طاق پر سجی یا بکھری رہتی تھیں۔

لاڈلے مرزا ہمیشہ ہوائی جہاز اور کار سے سفر کرتے تھے۔ جہاں پہنچے، ٹیکسی کرائے پر لی، اور خود ہی نقشہ دیکھ بھال کر اپنا پروگرام بنا لیا۔ نہ ٹریول ایجنسی کا چکر، نہ گائڈ کی ضرورت۔ انھیں مطلب تو دنیا دیکھنے سے تھا، گہرے مطالعہ یا معلومات میں اضافہ سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان کے پروگرام میں گڑبڑ ہو جاتی، لیکن کورده ملکوں کی اوبڑ کھابڑ سڑکوں پر چوں چرا کرتی ہوئی قدیم موٹروں میں سفر کرتے وقت کہیں نہ کہیں چھوٹا موٹا حادثہ ہو بھی جائے تو حیرت یا تشویش کی بات کیا تھی؟ لاڈلے مرزا قریب ترین گاؤں میں رات گزار لیتے اور موٹر کی مرمت کسی نہ کسی طرح

ہو ہی جاتی ورنہ پھر بدرجہ مجبوری جو بھی وسائل نقل و حرکت دست یاب ہوتے، کام میں لائے جاتے۔

لہٰذا بورنیو کے ایک سنسان پہاڑی گھنے جنگلی علاقہ سے گزرتے ہوئے ان کی 1932ء ماڈل کی فورڈ کا بگڑ جانا کوئی ایسا حادثہ نہ تھا جس پر انھیں گھبراہٹ ہوتی۔ ڈرائیور ان کی زباں سے واقف نہ تھا، اور وہ اس کی زبان کے صرف چند لفظ جانتے تھے۔ ''روکو چلو، پانی، کھانا، ہوٹل۔'' وغیرہ۔ مگر انھیں اتنا سمجھنے میں دشواری نہ ہوئی کہ قریب ترین آبادی خاصی دور تھی اور موٹر کی مرمت میں چار پانچ گھنٹے صرف ہو سکتے تھے۔ دن ڈھل رہا تھا، اور زرد سورج کی کرنیں منطقۂ حارہ کے سیاہ جنگل پر اپنی پلکیں جھپکا کر شام کو اشارہ کر رہی تھیں۔ سڑک سے کوئی سو گز دور ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی اور اس کے پیچھے لامتناہی جنگل کا ٹھنڈا سانولا سایہ۔ لاڈلے مرزا کو تصویر کشی کا بھی شوق تھا، انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا سامان کندھے پر ڈالا اور ڈرائیور کو اشاروں ہی اشاروں میں سمجھاتے ہوئے کہ وہ اس منظر کو کاغذ پر اتارنے کے لیے پہاڑی کے پیچھے ڈھلوان پر جا رہے ہیں، لمبے لمبے قدم بڑھاتے چل دیے۔

انھیں ذرا تعجب ہوا کہ ڈرائیور نے انھیں رک جانے کے اشارے کیے۔ اپنے چکٹ بھرے ہاتھ میں اس نے لاڈلے مرزا کی آستین پکڑ کر زور سے کھینچی گویا وہ انھیں بہ زور روکنا چاہتا ہو۔ اس کی آنکھوں سے تردد اور توحش ٹپک رہا تھا، لیکن لاڈلے مرزا کو اس کی یہ حرکت خاصی بدتہذیبی سی معلوم ہوئی۔ وہ سمجھے کہ ڈرائیور شاید سنسان سڑک کے گہرے سناٹے میں اکیلے رکنے سے ڈرتا ہے۔ انھوں نے بگڑ کر کہا ''ڈر کس بات کا ہے؟ میں ابھی آتا ہوں۔'' انھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ ڈرائیور ان کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ تیزی سے ہاتھ چھڑا کر پہاڑی کی طرف ہو لیے، ڈرائیور انھیں پکارتا رہا، لیکن تھوڑی ہی دیر میں ڈرائیور سڑک اور کار ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

جنگل بھی طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ کوئی پُراسرار ہوتا ہے، کوئی تہدید آمیز ڈراؤنا، کوئی گرم جوش اور دوستانہ، تو کوئی بالکل لاتعلق اور بے پروا۔ لاڈلے مرزا کو احساس ہوا کہ یہ جنگل مہربان اور دوستانہ سا ہے۔ اگرچہ چڑیوں کے چہچہانے کی کوئی آواز نہ تھی۔ لیکن یہ سکوت پُرامن سکوت تھا، نہ کہ اَن جانے خوف اور دھوکے سے بھرا ہوا، جیسا کہ جنگل کا سکوت ہوتا ہے۔ درختوں کے نیچے وہ گھنی جھاڑیاں اور ننھے ننھے سخت جان خودرو پودے بھی نہ تھے جو چلنے والوں کی ٹانگوں پر خراش کی لکیریں کھرچ دیتے ہیں۔ ہر طرف چکنے چکنے طویل القامت درخت اور ان کے تنوں سے لپٹی ہوئی سیاہی مائل گہری ہری کائی۔ لاڈلے مرزا کوئی سائنس داں

تو نہ تھے، لیکن انھیں یہ احساس ہوا کہ اس جنگل کی فضا انتہائی فرحت بخش اور صحت مند ہے۔

ڈھال سے اتر کر سامنے ہی ایک صاف ستھرا قطعہ تھا، ایک گرے ہوئے درخت کا موٹا تنا بیٹھنے کے لیے موجود تھا اور سامنے اسکیچ بک رکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا پتھر، بس اور کیا چاہیے تھا، لاڈلے مرزا نے محویت اور شوق کے ساتھ پنسل سنبھال لی ورا اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی پُرسکون خاموشی میں ڈوبے ہوئے درختوں کے حُسن کو کاغذ پر منتقل کرنے لگے۔

انھوں نے کوئی پندرہ منٹ تک پنسل سے جنگل کا خاکہ تیار کیا، ہر طرف خاموشی تھی۔

اچانک انھیں خیال آیا کہ اس خوبصورت منظر میں ایک ننھے سے معصوم لڑکے کی ضرورت ہے، سرخ قمیص پہنے ہوئے، سادہ سا دیہاتی لڑکا جس کے چہرے پر بھی وہی طمانیت جھلکتی ہو جو اس جنگلی کے گہوارے میں ہے۔ ایک لڑکا سامنے والے درخت کے نیچے بیٹھا ہوا....

کام کرتے کرتے انھوں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور نظر اٹھائی.... حیرت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پنسل ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور ڈھلکتی ہوئی درخت کی جڑ کے پاس جا کر رک گئی۔

لڑکا موجود تھا۔ البتہ وہ سرخ قمیص میں تو نہ تھا، لیکن انتہائی معصوم، بڑی بڑی آنکھوں والا، وہ بن باسیوں کی سی موٹے ٹاٹ کی ایک لمبی قمیص پہنے ہوئے تھا جو اس کے گھٹنوں تک آتی تھی اور وہ ٹکٹکی لگائے انھیں دیکھ رہا تھا۔ ان کو اپنی طرف متوجہ پا کر لڑکا مسکرایا۔ اس کے سفید دانت جھلک اٹھے۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے اعتماد و اطمینان سے لاڈلے مرزا کی طرف بڑھا، اور ان کے بالکل پاس کوئی دوفٹ ادھر، آ کر رک گیا۔

لاڈلے مرزا کو بڑی کراہیت اور گھن محسوس ہوئی جب انھوں نے دیکھا کہ لڑکے کے ہاتھ میں کوئی چھوٹا سا گلہری کی طرح جانور ہے جس کا سر اور دھڑ خون میں لت پت تھے، جیسے وہ کسی جھٹکے دار کھٹکے میں پکڑا گیا ہو اور جگہ جگہ سے کچل دیا گیا ہو۔ ان کی نگاہ کو دیکھ کر لڑکے نے مسکرا کر جانور کی لاش ایک طرف پھینک دی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹ سکوڑے اور ایک لمبی تیز سیٹی دی۔

فوراً ہی تین اور بچے جنگل کی گہرائیوں سے برآمد ہوئے۔ ان کے قدموں کی چاپ تک لاڈلے مرزا کو نہ سنائی دی تھی۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی سب تقریباً ہم عمر، سب اسی موٹے ٹاٹ کی لمبی قمیص میں ملبوس، بڑی بڑی بھوری آنکھوں اور سیاہ بالوں والے۔

وہ تینوں انھیں دیکھتے رہے، حس و حرکت اور تاثر سے عاری، لیکن بالکل مطمئن اور اعتماد سے بھرپور، جیسے بھرے جنگل میں اجنبیوں سے ملاقات ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ پھر لڑکی آگے بڑھی، اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور آہستہ سے لاڈلے مرزا کی ٹانگ میں چٹکی لی۔ گھٹنے کے کچھ اوپر، مگر بہت نرمی سے، پھر جیسے وہ مطمئن سی ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی اور اپنی زبان میں تینوں سے کچھ کہا۔ فوراً ہی وہ سب ٹھٹھا مار کر ہنستے، ہنستے دہرے ہو گئے۔ ان کے سرخ سرخ مسوڑھے اور تالو اور سفید دانت لاڈلے مرزا کو صاف نظر آ رہے تھے۔

پھر ہنسی رک گئی۔ اچانک جس طرح شروع ہوئی تھی۔ پھر چاروں لاڈلے مرزا کے گرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئے، سنجیدہ، گمبھیر، مگر ہوشیار اور گھورتے ہوئے۔

لاڈلے مرزا کچھ الجھن میں اور کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ عجیب بچے تھے یہ، اور عجیب تھی ان کی یہ پہرہ داری، اور پھر ان سے بات بھی تو ممکن نہ تھی۔ وہ مسکرائے، لیکن بچوں کے چہرے پر کوئی تغیر نہ ہوا۔ انھوں نے اپنی اسکیچ بک اٹھا کر دکھائی۔ لیکن ایسا لگا جیسے وہ سمجھتے ہی نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ اچانک انھیں ایک چیز سوجھ گئی۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا نکالا۔ انھوں نے تھوڑا سا خود کتر لیا اور بقیہ لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔

اس کے بعد جو ہوا وہ لاڈلے مرزا کی فہم سے بالکل بالاتر تھا۔

لڑکی نے چاکلیٹ لیا، سونگھا، پھر اسے منہ میں رکھ کر چبانے لگی۔ فوراً اس کے پاس والے لڑکے نے جھپٹ کر چاکلیٹ اس کے منہ سے چھین کر ایک طرف پھینک دی اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں ایک دوسرے کو اس بری طرح جھنجھوڑ رہے تھے گویا زندہ نہ چھوڑیں گے۔

''رکو۔ رکو۔ بس کرو کم بختو۔'' لاڈلے مرزا چلّائے اور ان کی طرف بڑھے، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ لڑکے کی انگلیاں لڑکی کے گلے پر تھیں اور لڑکی اپنے ناخن سے لڑکے کا منھ بری طرح نوچ رہی تھی۔ لاڈلے مرزا نے بہ ہزار دقت ان کو الگ کیا۔ ان کو خود حیرت ہو رہی تھی کہ ان ننھے منے بچوں میں اس قدر قوت کہاں سے آ گئی!

اور پھر، ایک لمحے میں سب ختم ہو گیا۔ لڑکا بھی ڈھیلا ہو کر ایک طرف پڑ گیا اور لڑکی گھاس پر سے لڑکھڑاتی مگر ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ پھر اچانک لاڈلے مرزا نے خود کو ایک طویل چکردار رقص کے مرکز میں پایا۔ چاروں بچے ان کے گرد اس تیزی سے گھوم رہے تھے یا ناچ رہے تھے یا دوڑ لگا رہے تھے کہ لاڈلے مرزا کا سر بری طرح چکرانے لگا پھر بچوں نے ان کے بھی ہاتھ دونوں طرف سے پکڑ لیے، اور انھیں بھی ان کے ساتھ

ساتھ گھمر گھمر چکر کاٹنے پڑنے لگے۔ ان کا سانس پھول آیا۔ آنکھوں کے سامنے سرخ سیاہ نقطے ناچنے لگے، آخر ساٹھ برس کی عمر بھی کچھ ہوتی ہے، اور کہاں جنگل کا یہ وحشیانہ رقص کہاں شہر کی آرام دہ زندگی!

بہ مشکل تمام انھوں نے اپنے کو الگ کیا، اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر تھکے ہوئے کتے کی طرح ہانپنے لگے۔ بچوں نے پھر ان کے چاروں طرف حلقہ بنالیا۔ ایک بار پھر انھوں نے اپنی ٹانگ پر نرم چٹکی محسوس کی.... مگر اس بار چٹکی لینے والا ایک لڑکا تھا....

لعنت ہے ان بچوں پر، اب واپس چلنا چاہیے۔ انھوں نے خود کو کسی نہ کسی طرح گھٹنوں پر زور دے کر اٹھایا، لیکن ان کے پاؤں ثابت نہیں تھے، انھیں خود پر غصہ آنے لگ کہ یہ کیا کمزوری ہے۔ وہ چلنے کو اٹھ کھڑے ہوئے، تب لڑکی آگے بڑھی، اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور منہ اوپر اٹھایا، جیسے چاہتی ہو وہ اسے گود میں اٹھالیں....

لاڈلے مرزا کا دل پگھل گیا۔ انھوں نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ لڑکی کا منہ ان کے نزدیک آیا اور اس کے منہ کی بھاری خون آلود وحشیانہ بدبوان کے نتھنے سے ٹکرائی.... دو سبزی مائل بھوری آنکھیں انھیں بے رحمی سے گھور رہی تھیں۔ ان کا دل اچھل کر حلق میں آرہا۔ وہ چیخے، یا انھوں نے چیخنے کی کوشش کی، کیوں لڑکی کے دانت ان کے نرخرے میں پیوست تھے اور ان کی چیخ گلے کی خرخراہٹ میں بدل گئی تھی۔

بازوؤں کے تین جوڑوں نے ان کی ٹانگیں مضبوطی سے پکڑ لیں اور گھسیٹ کر انھیں گرادیا۔ کچھ دیر تک وہ تڑپتے پھڑکتے رہے اور ان کے گلے سے سسکیاں ابھرتی رہیں۔ اس کے بعد ہڈیوں پر تیز کم سن دانتوں کی رگڑ کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔

(مرکزی خیال ولیم بیکر ایونز کی کہانی سے ماخوذ)

بھیانک افسانہ

جیسے جیسے امتحان نزدیک آتا گیا میلکم سن کا یہ احساس شدید ہوتا گیا کہ یونیورسٹی کا ہاسٹل عام امتحانوں کی پڑھائی کے لیے تو موزوں ہے، لیکن خالص ریاضی کا سب سے بڑا امتحان پاس کرنے کے لیے جس سکون، یک سوئی اور خاموشی کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہاسٹل میں مفقود ہے۔ مجبوراً اس نے ہاسٹل چھوڑ کر ایک مضافاتی قصبے کی راہ لی جہاں ریل، ڈاک تار کی آسانیاں تو تھیں، لیکن وہ ہر طرح سے جدید تہذیب کی بھیڑ بھاڑ سے محفوظ تھا۔ اسے ذرا سی تلاش کے بعد ایک بڑے سے مکان میں دو کمرے بھی رہنے کے لیے مل گئے جو اس کی ضرورت کے لیے کافی تھے۔

مکان بہت عالی شان، پختہ اور خوب صورت بنا ہوا تھا، بس اس میں صرف یہ عیب تھا کہ آبادی سے ذرا دور تھا، میلکم سن کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ اگر چہ اس کا کرایہ واجبی تھا لیکن اس کے باوجود وہ عرصہ دراز سے خالی پڑا تھا بلکہ پاس کی دُکان کے مالک نے جو چھوٹے سے چائے خانے کے علاوہ مختصر ضروریاتِ زندگی کے سامانوں کی ایک دُکان بھی رکھتا تھا، اسے وہ مکان لینے سے روکنے کی کوشش بھی کی۔ اس مکان کے متعلق طرح طرح کے افسانے مشہور تھے، اور کبھی کوئی کرایہ دار اس میں دو چار دن سے زیادہ نہ ٹھہر سکا تھا۔ مکان پچھلی صدی کے کسی جج نے بنوایا تھا جو اپنی سخت بلکہ بہیمانہ سزاؤں کے لیے مشہور تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی

عدالت میں قتل کے ہر ملزم کو پھانسی کے علاوہ کوئی سزا کبھی نہ ملتی تھی، مقدمہ کم زور ہو یا مضبوط، شہادتیں جھوٹی ہوں یا سچی، عینی ہوں یا سنی سنائی، جج جانسن کا فیصلہ ملزم کے خلاف ہی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا جب کٹر سے کٹر مجرم پولیس والوں کی ہر طرح سے خوشامدیں تو کرتے ہی تھے کہ ان کا مقدمہ جانسن کی عدالت میں نہ جائے، لیکن پولیس والے بھی اس کے سامنے مقدمات پیش کرتے ڈرنے لگے تھے۔

میلکم سن کو جو دو کمرے سے ملے تھے، ان میں ایک خاصا بڑا ہال نما کمرہ تھا، جس کی دیواروں پر چھت تک خوبصورت شاہ بلوط کے تختے جڑے ہوئے تھے۔ بیچ میں ایک وسیع میز تھی جس پر پرانی وضع کا ایک بھاری لیمپ تھا اور دیواروں پر پرانی دھندلی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ لیکن سب سے دلچسپ چیز تھی ایک موٹی بھاری رسی جو چھونے میں اب بھی نرم تھی، یہ رسی مکان کے سب سے اوپری منزل پر برساتی میں ٹنگی ہوئی ایک پرانی وضع کی بھاری گھنٹی سے منسلک تھی۔ اس گھنٹی کا مصرف میلکم سن کی سمجھ میں بالکل نہ آیا، بہر حال اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔

میلکم سن نے گاؤں کے ایک چھوکرے کو ملازم رکھ لیا تھا جس کے ذمہ گھر کی صفائی ستھرائی، دن کا کھانا پکانا، اس طرح کے معمولی کام تھے کیونکہ میلکم سن کی ضروریات زیادہ نہ تھیں، شام کو جب میلکم سن گھوم پھر کر واپس ہوا تو چھوکرا جا چکا تھا، لیکن بستر لگا ہوا تھا، میز پر کتابیں قرینے سے چنی ہوئی تھیں، ہر چیز صاف ستھری تھی، لیمپ روشن تھا اور چائے کا سامان کونے میں رکھا ہوا تھا۔ طبیعت بھاری ہونے کے خیال سے میلکم سن شام کو کھانا نہ کھاتا تھا، لہٰذا اس کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ میلکم سن نے جم کر پڑھنے کی نیت سے کتاب کھولی اور بیٹھ گیا۔

اس نے صبح ہی کو محسوس کیا تھا کہ کمرے میں چوہے بہت ہیں، اگرچہ وہ سامنے نہ آئے تھے، لیکن اس نے ان کے دوڑنے پھدکنے کی آوازیں سنی تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ دیوار اور چھت پر جڑے ہوئے تختوں کو انھوں نے اندر سے کھا ڈالا ہے اور جگہ جگہ اپنے مسکن بنا رکھے ہیں۔ چوہوں کی دوڑ بھاگ جو اس کے داخل ہونے پر ایک لمحے کے لیے بند ہو گئی تھی، اب پھر جاری ہو گئی اور ایک پس منظری شور کی طرح مستقل اس کے کانوں سے ٹکراتی رہی، آہستہ آہستہ وہ اس کا عادی ہو گیا اور شعوری طور پر اسے نظر انداز کر کے ریاضی کے فارمولے حل کرنے میں مستغرق ہو گیا۔

کئی گھنٹے گزر گئے، اچانک اس کی توجہ اچٹ گئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف

بالکل سناٹا تھا۔ گہری رات باہر پھیلی ہوئی تھی۔ لیمپ کی ہلکی سبز روشنی میں کمرے کی دیواروں پر لگی دھندلی تصویریں تقریباً معدوم سی تھیں۔ اس نے ایک لمحہ غور کیا تو اسے خیال آیا کو چوہوں کا شور بالکل بند ہو چکا تھا اور در حقیقت یہی اچانک خاموشی اس کو دماغی کاوش کی دنیا سے باہر کھینچ لائی تھی۔

اس نے سوچا معلوم ہوتا ہے سب کو ایک بارگی سانپ سونگھ گیا۔ سانپ سونگھ گیا کے محاورے پر وہ زیرِ لب مسکرا دیا، کیونکہ چوہوں کی رعایت سے محاورہ بہت مناسب تھا۔

دفعتہً اس کی نگاہ اپنے سامنے والی کرسی پر پڑی۔

ایک بہت ہی بڑا چوہا، سیاہی مائل بھورے رنگ کا جو قد و قامت میں کم سے کم ایک چھوٹے خرگوش کے برابر تھا، کرسی پر بیٹھا ہوا اس کو سرخی مائل سیاہ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ اس کی دم آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی یہی حرکت اور اس کی آنکھوں کی سنگ دل چمک، جو چوہے سے زیادہ کسی بلی کی آنکھوں سے مشابہ تھی، اس کی زندگی کا ثبوت تھی۔

ورنہ وہ ہر طرح ساکت و صامت تھا، کرسی پر یوں بیٹھا ہوا گویا وہ اس کا مالک ہو۔

میلکم سن ایک لمحہ کے لیے چکرا گیا۔ پھر اپنے حواس کو مجتمع کر کے اس نے نیوٹن کی بھاری کتاب چوہے پر کھینچ ماری۔

چوہا اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ اس نے غصے میں آئے ہوئے بندر کی طرح جبڑا کھول کر گلے سے عجیب سی آواز نکالی۔ میلکم سن کو اس کے بے انتہا بڑے بڑے پیلے دانت صاف نظر آ رہے تھے۔

پھر تو میلکم سن نے کتابوں کی بارش شروع کر دی۔ ہر بار چوہا اچھل کر ایک طرف ہو جاتا، دانت دکھاتا اور غصے بھری آواز نکالتا۔ لیکن اس نے کرسی نہ چھوڑی، آخر کار میلکم سن کی آخری کتاب اس پر پڑ ہی گئی۔ دفعتہً چوہے کی شکل بدل گئی۔ اس کے بدن کا تناؤ اور جوش سب غائب ہو گیا۔ بڑے بڑے دانت دکھانے کے بجائے ایک ڈری ہوئی چیں کے ساتھ وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور ایک بڑی تصویر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

''اچھا، تو یہ ہے اعلیٰ حضرت کا گھر۔'' میلکم سن نے، اس غیر معمولی صورتِ حال کے زیر اثر کچھ کچھ کانپ رہا تھا، لیکن خوش ہی تھا کہ اس نے آخر موٹے بدمعاش کو پچھاڑ ہی دیا تھا، کتاب اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔

جب اس نے آخری کتاب اٹھائی تو دیکھا کہ وہ ریاضی کی کوئی موٹی کتاب نہ تھی، بلکہ انجیل کا وہ چھوٹا سا نسخہ تھا جو اس کی دادی نے اسے دیا تھا۔

دوسری صبح کو چائے خانے کے مالک نے اس کی ملاقات ایک ڈاکٹر سے کرائی اور اس طرح گویا میلکم سن کوئی عجوبہ روزگار تھا کہ جو جج کے مکان میں رہتا تھا۔ میلکم سن نے ڈاکٹر سے اس رسی کے بارے میں پوچھا جو اتنی بڑی گھنٹی سے بے کار ہی منسلک تھی۔ ڈاکٹر نے خفیف سی ہنسی ہنس کر کہا:

''لوگ کہتے ہیں یہ وہ رسی ہے جسے جج جانسن کا جلاد اس کے مجرموں کو پھانسی دینے کے لیے استعمال کرتا تھا... خدا جانے جھوٹ ہے یا سچ۔ لیکن آپ خود ہی کہتے ہیں کہ رسی اب بھی بہت نرم اور مضبوط ہے.... وہ رک سا گیا، اور پھر جھجکتا ہوا بولا۔ ''بہر حال اب تو وہ محض ایک گھنٹی ہے جب بھی آپ کو ضرورت محسوس ہو، رسی کو زور زور سے کھینچیں۔ گھنٹی کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ہے۔''

''مگر کیوں؟'' میلکم سن نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے خیال میں مجھے گھنٹی کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟''

مگر ڈاکٹر نے سنی ان سنی کر دی۔

گھر پہنچ کر میلکم سن نے پہلا کام یہ کیا کہ اس تصویر کو صاف کیا جس کے پیچھے دیو قامت چوہا غائب ہوا تھا۔

ایک جج کی تصویر تھی۔ سرخ مخملی عبا و چغہ پہنے ہوئے اس کے بشرے سے سخت کینہ توزی، استقلال مزاج، تندیٔ طبع اور بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ دہانہ تنگ اور عیش پرستانہ، ناک سرخی مائل، طوطے کی چونچ کی طرح لمبی اور مڑی ہوئی، آنکھوں میں ایک عجیب جارحانہ اور زندہ چمک.... مصور نے اپنے موضوع کی خوفناک روح کا ہر ہر گوشہ بے نقاب کر دیا تھا۔

میلکم سن کو اچانک یہ محسوس ہوا کہ جج کی آنکھوں میں اس طرح کی وحشیانہ چمک تھی جیسی اس چوہے کی آنکھوں میں تھی۔

وہ ایک لمحے کے لیے کانپ اٹھا، لیکن اس وقت اسے اپنے آباؤ اجداد یاد آ گئے جو سنسان اجاڑ پہاڑی قلعوں میں تن تنہا دشمنوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ کیا وہ ایک معمولی چوہے اور ایک بچکانہ توہم سے ڈر جاتے؟ اس نے اپنی کتاب کھول کر سامنے رکھ لی، دونوں لیمپ روشن کر دیے، تا کہ کمرے کا ہر گوشہ منور رہے، ان کے شیڈ بھی اتار دیے اور تیز روشنی سے بھری ہوئی کتاب میں محو ہو گیا۔ باہر مارچ کی تند ہوا آہستہ آہستہ اٹھ رہی

تھی۔ باغ کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ چوہوں کا شور بدستور تھا۔

بالکل پچھلی رات کی طرح میلکم سن کی توجہ اچٹ گئی۔ چوہوں کا شور بند ہو گیا تھا، لیکن اور ہر چیز بالکل پہلے کی طرح تھی، سوائے اس کے کہ گھنٹی کی موٹی رسی آہستہ آہستہ لرز رہی تھی، شاید ہوا کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔ وہ اسے بند کرنے کے لیے اٹھا تو اس کی نظر اوپر چھت پر گئی۔

رسی اس وجہ سے لرز رہی تھی کہ بڑا چوہا اس پر چڑھا ہوا اسے اپنے تیز دانتوں سے کتر رہا تھا۔ رسی آدھی سے زیادہ کٹ چکی تھی۔ مگر کیوں؟ مجھے رسی سے کیا لینا دینا ہے؟ میلکم سن نے استعجاب سے سوچا۔ لیکن اسے حیرت سے زیادہ چوہے کی ڈھٹائی پر غصہ بھی آیا۔ اس نے لپک کر وہی انجیل اٹھائی اور تاک کر نشانہ لگانا چاہا۔ رسی ایک بار زور سے ہلی، چوہے کے زرد دانت دھندلی روشنی میں بھی صاف نظر آ رہے تھے، اور رسی کٹ کر آواز کے ساتھ نیچے آ رہی۔ چوہا بھی ساتھ ہی نیچے کودا اور اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا، کتاب میلکم سن کے ہاتھ سے آزاد ہو رہی تھی کہ چوہا اوپری تاریکی میں تصویر کے پیچھے غائب ہو گیا۔

کٹی ہوئی رسی مرے ہوئے سانپ کے ڈھیر کی طرح فرش پر ساکت پڑی تھی۔ اب میلکم سن کو خیال آیا کہ وہ گھنٹی نہیں بجا سکتا۔ قصبے والے اس کی آواز نہیں سن سکتے۔ وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس نے انجیل میز پر رکھ دی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لیمپ لے کر جج کی تصویر کی طرف بڑھا، جس کے پیچھے چوہا غائب ہوا تھا۔

لیمپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ تصویر کا گدلا کینوس اور رنگ اڑا ہوا سنہری فریم تو موجود تھا، لیکن کینوس پر تصویر نہ تھی۔ کچھ بھی نہ تھا۔ کینوس بالکل خالی تھا۔

اور جب وہ واپس مڑنے لگا تو اس نے دیکھا کہ سامنے والی کرسی پر، جس پر پچھلی رات، یا شاید برسوں پہلے، وہ چوہا بیٹھا ہوا اسے غرا کر گھور رہا تھا، جج بیٹھا ہوا تھا۔ وہی کینہ توز آنکھیں، وہی تند بے رحم مضبوط جبڑا، وہی سرخ مخملی لباس۔ جج اسے دیکھ کر ایک بے آواز بھیانک ہنسی ہنسا۔ اس کے ہونٹ حقارت سے سکڑ گئے، میلکم سن نے دروازے کی طرف بھاگنا چاہا، لیکن جج وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے لپک کر انجیل ہاتھ میں لینی چاہی، لیکن جج اس کے اور میز کے درمیان آ گیا۔ اس کے زائل ہوتے ہوئے حافظے نے بچپن میں یاد کی ہوئی دعائیں زبان پر لانے کی کوشش کی۔

اے ہمارے باپ، تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے۔۔۔ لیکن زبان کو یارا نہ تھا۔ جج اب کرسی پر تھا، لیکن جب میلکم سن دروازے کی طرف بڑھتا تو جج دروازے پر بھی موجود ہوتا۔ اب اس کی آنکھیں

میلکم سن کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھیں جیسے وہ سحر زدہ ہو۔ پھر جج نے بہت اطمینان سے اپنی سیاہ ٹوپی پہنی اور ہاتھ بڑھا کر پھانسی کی رسی اٹھائی۔

اٹھا کر ایک سرے کا پھندا بنایا اور اسے میلکم سن کی طرف پھینکا۔ میلکم سن جھکائی دے کر ایک طرف نکل گیا۔ جج نے پھر کوشش کی۔ پھر یہی نتیجہ رہا۔ لیکن بار بار کی اس ناکامی سے جج کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوئی۔ اس کے لبوں پر پہلے کی ہی سی سفاک مسکراہٹ تھی۔ چوہا بلی، چوہا بلی، چوہا بلی میلکم سن نے سوچا۔ اے ہمارے باپ.... لیکن اس کا گلا خشک تھا۔ آخر کار جج رسی ہاتھ میں لے کر میلکم سن کی طرف بڑھنے لگا۔ پھینکنے اور جھکائی دے کر نکل جانے کا کھیل بہت ہو چکا تھا....

میلکم سن کے پاؤں اپنی جگہ پر جم گئے۔ جج نپے تلے قدم رکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے پھندے کو میلکم سن کے گلے میں ڈال کر ایک پیشہ ورانہ جھٹکا دیا۔ اس کی گردن تنگ حلقے میں تن گئی۔ جج نے میلکم سن کو اٹھا کر رسی کا ایک سرا دوبارہ اوپری سرے سے باندھ دیا، ایک جھٹکے کے ساتھ میلکم سن نیچے آ رہا، لیکن اب وہ کمرے کی گھٹی ہوئی فضا میں معلق تھا اور ادھر اُدھر لہرا رہا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو لٹک گئی تھی۔

گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ جب لاٹھیوں، بندوقوں اور گیس کے ہنڈوں سے مسلح لوگ جج کے مکان پر پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف میلکم سن کی لاش ہوا میں جھوم رہی تھی۔

(برم اسٹوکر کے انگریزی افسانے سے ماخوذ)

دریائے خواب

جب میں سری گنگا پور کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اترا تو شام ہو چلی تھی۔ پلیٹ فارم پر کئی آدمی موجود تھے مگر میں نے یہ غور نہیں کیا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ ٹرین سے اترے تھے یا کہیں جانے والے تھے۔ شام کی سرمئی روشنی گدلے پانی کے تالاب کی طرح مٹ میلی اور ٹھہری ہوئی سی تھی۔ مگر مجھے یہ ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس دھندلی نیم تاریک فضا کو بوجھل بنانے میں خود میرے الجھے ہوئے خیالات اور پرانی وضع کے ڈھیلے ڈھالے انجن کے اڑائے ہوئے دھوئیں کا کتنا دخل تھا۔ ضرور رہا ہوگا کیوں کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ دراصل ہمارے ہی خیالات کی بنائی ہوئی ہوتی ہے۔ میں نے ادھر اُدھر نہ دیکھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ قریب ہی ایک بکری ممیاتی ہوئی ایک بڑھیا کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجھ پر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ سب اپنی اپنی دنیا میں مصروف تھے۔ اچانک میرے پاس سے ایک لمبا آدمی گزرا۔ بہت زیادہ لمبا، میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی، لیکن اس کی پیٹھ اور کندھوں کی بناوٹ کچھ عجیب طرح کی تھی، ہاتھ لمبے اور کندھے بالکل سیدھے اور سپاٹ، جیسے ہنسلی کی ہڈی گول ہونے کی بجائے سیدھی اور چپٹی ہو۔ بہ ظاہر اس نے مجھے بالکل نہیں دیکھا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہیں پہلے مجھے بہت غور سے دیکھ چکا ہے اور مجھے پہچاننے کی اسے ضرورت نہیں۔ پلیٹ فارم پر آتے جاتے لوگ، گٹھریاں اٹھائے ہوئے، بے رونق چہرے، شاید میرا ہی چہرہ بے رونق تھا۔ اس وجہ سے مجھے کسی کے چہرے پر رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ لمبے آدمی نے میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا؟ کیا بالکل اجنبی اور گنوار لگتا ہوں؟ لمبے آدمی بے وقوف ہوتے ہیں۔ اونٹ کی طرح لمبے، اونٹ

جب پہاڑ کے نیچے آجاتا ہے تو اپنے کو بے وقوف سمجھنے لگتا ہے۔ پلیٹ فارم کی زرد رو عمارت شفق کے سرخ سیاہ رنگوں کی جھم جھماہٹ سے سنولانے لگی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا روشنیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ممیاتی ہوئی بکری کے پیچھے پیچھے پھاٹک سے باہر نکل آیا۔ پھاٹک پر کچھ اونگھتے ہوئے گائے بیل تن بہ تقدیر سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شاید انھیں کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ انھیں کھانے کو کون دیتا ہوگا؟ الیکشن قریب ہے۔ دو بیلوں کی جوڑی۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والی سڑک تھوڑی دور آگے جا کر تین راستوں میں منقسم ہو جاتی تھی۔ دُنیا میں ہر طرف تین ہی کی کارفرمائی کیوں ہے؟ فرسٹ سیکنڈ تھرڈ۔ ایک دو تین، باپ بیٹا روح القدس۔ ستیم شیوم سندرم۔ نہ دیکھو برا، نہ کہو برا، نہ سنو برا۔ محبت کا امٹ مثلث۔ تین راستے، تین شاہ راہیں۔ میں جس کو بہت دور چھوڑ آیا تھا وہ بھی انھیں تین راستوں کے معمے کا شکار تھی۔ وہ میرا ساتھ دیتی کہ اپنے شوہر کا یا اپنے ضمیر کا؟ مجھے جن لوگوں نے یہاں بلایا تھا انھوں نے پتہ تو لکھا تھا لیکن ایسا گھسیٹ اور بدخط کہ بات پوری طرح سمجھ میں نہ آئی تھی۔ سری گنگا پور۔ سری گنگانگر۔ راجستھان میں ایک شہر کا نام ہے۔ سرنگاپٹم۔ ٹیپو سلطان یہاں شہید ہوا تھا۔ اس کے مزار پر پھول کون چڑھاتا ہوگا؟ مجھے ایک دن جا کر فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ آخر اقبال بھی تو خاص کر کے سلطان شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے گئے تھے۔ انھوں نے جامہ دار کی شیروانی پہن کر وہاں دو رکعت نفل بھی پڑھی تھی شاید۔ پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا۔ تو فاتحہ مذکر ہے؟ میں نے سوچا کہ کسی سے راستہ پوچھوں مگر مجھے جانے کیوں بڑی جھجک سی محسوس ہوئی۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی بے وقوفوں کی طرح ہونق منھ بنا کر راستہ پوچھے؟ لوگ کیا سمجھیں گے؟ کہیں ہنس کر ٹال نہ دیں۔ لیکن کیا ضرور کہ ہر راستہ پوچھنے والا ہونق معلوم ہو؟ میری ماں تو مجھے چاند کا ٹکڑا کہتی تھی اور وہ، وہ تو دن میں کتنی ہی بار کہتی کتنے اچھے لگتے ہو تم۔ لیکن میں راستہ نہ پوچھوں گا۔ آخر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔ میں بیچ والے راستے پر ہولیا۔ دونوں طرف دکانیں۔ نہ جانے کن کن چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میرے سامنے راستے میں ایک ٹھیلے والا دہی بڑے بیچ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سمجھا کہ میں اس سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔ اس نے اپنا ٹھیلا ہٹانے کے بجائے اور بھی میرے راستے میں کر دیا۔ مجھے اچانک بڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ مجھے کچھ خریدنا چاہیے تھا۔ اس نے کیا سوچا ہوگا۔ یہ شخص کس قدر کنجوس ہے۔ لیکن کیوں، میں کچھ کیوں خریدوں؟ اور سڑک پر راہ چلتے کھانا تو یوں بھی میرے لیے ناممکن سا ہے۔ میں اس کا راستہ کاٹ کر بیچ سڑک میں بیٹھے ہوئے اک سانڈ کو پھلانگتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ لیکن سانڈ کو پھلانگنے کے دوران میں اپنا توازن

قائم نہ رکھ سکا اور شیشہ کے سامانوں کی اک دُکان کی چوبی سیڑھیوں سے ٹکرا گیا جو تقریباً سڑک ہی پر لگی ہوئی تھی۔ سڑک کے کنارے پر ایک گہری نالی بہتی تھی اور دُکان کی سطح ذرا اونچی تھی۔ گاہکوں کی آسانی کے لیے لکڑی کی یہ سیڑھی دُکان کے تختے سے ٹکا دی گئی تھی۔ میں سنبھلتا سنبھلتا سیڑھی کے ایک تختے پر چڑھ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ لاؤ دیکھیں یہاں کی دُکانیں کیسی ہیں۔ دُکان میں داخل ہوتے ہی مجھے دو آدمیوں نے گھیر لیا۔ ایک تو میرے سامنے اپنے چہرہ پر ایک سوالیہ نشان بنا کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے نے کچھ اونچی آواز میں پوچھا۔

''کہیے؟ آپ کو کیا چاہیے؟''

شیشے کی چھت میں ہم تینوں کا الٹا ٹنگا ہوا عکس اور پہلے شخص کے چہرہ پر مہذب سا سوالیہ نشان۔ مجھے نہ جانے کیوں ہنسی سی آ گئی۔ میں نے جلدی جلدی ایک گلاس خریدا اور دُکان کے باہر آ کر سوچنے لگا کہ اس فضول سی چیز کو کیا کروں۔ گلاس بڑا تھا اس لیے میری جیب میں نہ آ سکتا تھا۔ میرا کل سامان صرف ایک بیگ تھا اور بیگ میں پرانے کپڑے اور دوسرے چھوٹے موٹے ضروری اشیا، اس طرح بھرے ہوئے تھے کہ اب کچھ رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اچانک ایک عجیب وغریب جذبے کے تحت گلاس سڑک پر بیٹھے ہوئے سانڈ کے ایک سینگ پر پہنا دیا اور اس سے پہلے کہ سانڈ یا کوئی اور میری اس حرکت سے خبردار ہو میں تیز قدم چلتا ہوا بائیں طرف کی ایک تاریک گلی میں مڑ گیا۔ گلی کا فرش اینٹوں کا تھا مگر کہیں کہیں اینٹیں اکھڑ جانے کی وجہ سے چھوٹے موٹے گڈھے بن گئے تھے جن میں برسات کا پانی اکٹھا تھا۔ برسات پیار کا موسم ہوتا ہے چنچل من میں طوفان اٹھتے ہیں۔ گڈھوں میں مینڈک کے بچے اچھلتے کودتے نظر آ رہے تھے۔ کیا ان کے بھی من چنچل ہیں اور کیا ان کے بھی من میں طوفان اٹھتے ہوں گے؟ مگر میرے من میں تو آج تک کوئی طوفان نہ اٹھا تھا یا شاید اٹھا تھا۔ شاید اٹھا تھا، نہیں ضرور اٹھا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ نہ سکتی تھی اور اپنے شوہر سے چھٹکارا پانا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔ میرے من میں اس کے لیے طوفان ضرور اٹھا تھا شاید۔ لیکن وہ نہ اسے اڑا لے گیا اور نہ مجھے۔ کیا میں اس کے شوہر کو قتل.... کیا میں اسے لے کر کہیں بھاگ نہ سکتا تھا.... مگر جائیں تو جائیں کہاں۔ کس قدر منحوس فلمی گانا ہے۔ افسوس کہ ہم لوگ اب اپنے عمیق ترین اظہار کے لیے بھی فلمی گانوں کے محتاج ہو گئے ہیں۔ ای ایم فارسٹر، یا شاید کسی اور مصنف کے افسانے میں ایک نوعمر لڑکا ہے۔ جب وہ کوئی ایسی نظم پڑھتا ہے جو اسے بہت اچھی لگتی ہے تو اس کے کلیجے میں نہیں بلکہ پیٹ میں عجب سی ہوک، عجب سی تلاطم آمیز لہر سی اٹھتی محسوس ہوتی ہے۔ فارسٹر، یا جو بھی وہ مصنف تھا، اس نے اس کیفیت کو Queasiness کا نام دیا تھا اور میں

فلمی گانا۔ مجھے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ کچھ دن پہلے یہاں ایک طوفان آیا تھا کیونکہ میرے سامنے ایک بوسیدہ مکان کی دیوار گر کر گلی کو تقریباً بند کیے ہوئے تھی۔ پیچھے سے آتی ہوئی سرد بیمار روشنی میں صد ہا برس کی گاڑھی چپ چپی ہری اور کتھئی کائی نم دیواروں کے قدموں میں لتھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں ادھر کہاں جا رہا ہوں؟ مجھے تو کہیں اور جانا تھا؟ کہیں وہ لوگ میرا انتظار نہ کرتے ہوں۔ سوچیں گے کیسا غیر ذمہ دار آدمی ہے۔ بلایا گیا اتنے اصرار سے اور وقت کا پابند نہیں۔ لیکن اب میں تاریک گلی سے روشن سڑک میں واپس نہ جانا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس دم مجھے یہ خیال آیا کہ یہی گلی مجھے ان لوگوں تک پہنچا دے گی۔ اس وقت تک میں ٹوٹی ہوئی دیوار اور اس کے گرے ہوئے ملبے کے اس پار پہنچ چکا تھا اور ملبے کی اوٹ کے سبب پیچھے کی سڑک مجھے بالکل نظر نہ آتی تھی۔ روشنی بھی اب بالکل ہی مدہم ہو گئی تھی۔ صرف ایک دھواں دیتی ہوئی سڑک کی لالٹین کوئی سو گز آگے تھوڑی بہت روشنی پھیلا رہی تھی مگر اس روشنی کے منحنی ٹیڑھے میڑھے محاذ کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ میں جب روشنی کے اس منحنی سے دائرے کو پار کر چکا تو میں نے دیکھا کہ گلی ایک دروازے پر ختم ہوتی تھی۔ دروازے کا رنگ د روغن موسم کی دست برد کے ہاتھوں اڑ چکا تھا اور اس کی لکڑی پچھلی بارش کی وجہ سے اب بھی کچھ نم تھی، دروازے پر کوئی سائن بورڈ یا کسی کا نام نہ تھا۔ لیکن دروازہ چوں کہ میرے دستک دیے بغیر آپ سے آپ ذرا سا کھل گیا اس لیے میں اسے اندر آنے کی دعوت سمجھتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ میں ایک تاریک ڈیوڑھی میں تھا جس کی دیواریں کچی تھیں مگر ان پر چونا پھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ سے دیوار کی مٹی اکھڑ گئی تھی اور نیم روشنی میں یہ اکھڑی ہوئی جگہیں کہیں بھالو کہیں بندر اور کہیں ہنستے ہوئے بے دانت کے بڈھے کی عجیب وغریب شکلیں معلوم ہو رہی تھیں۔ میں نیچی دہلیز کو پار کر کے ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گیا۔ لالٹین کی یرقان زدہ روشنی میں ایک عورت دیوار سے لٹکے ہوئے ایک میلے آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری آہٹ پا کر وہ مڑی اور مجھے دیکھ کر ایک عجیب ادائے معشوقانہ سے مسکرائی۔ اس کے دانت کچھ بڑے بڑے تھے اور مسی اور پان کی کثرت سے سیاہ ہو رہے تھے تنگ پیشانی پر دونوں طرف بالوں کی لٹیں موڑ کر چپکائی ہوئی تھیں جن کے نیچے سے اس کی چھوٹی ہنستی ہوئی آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں گویا میری قدر و قیمت تول رہی تھیں۔ سنسان کمرے میں وہ مجھے عجیب پیاری سی اور خوف ناک سی لگی۔ میں ایک لمحے کے لیے یہ بھول گیا کہ میں یہاں کیسے آ گیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے بہت دیر ہو چکی تھی اور میں ''پھر کبھی آؤں گا'' کہتا ہوا اس مکان سے باہر آیا۔ باہر آ کر مجھے احساس ہوا کہ گلی دروازہ

پر ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ مکان کے بغل میں ایک تنگ سی گلی اور بھی تھی میں منھ اٹھائے اسی میں داخل ہوگیا۔ دو ہی چار قدم چلنے پر پانی کی بھاری اور سڑتی ہوئی سی مہک میری ناک سے ٹکرائی۔ شاید میں اس دریا کے کنارے پہنچ رہا تھا۔ شاید اس دریا کا نام بھی گنگا تھا اور اسی لیے اس جگہ کا نام سری گنگا پور تھا۔ یا شاید اس دریا کا نام رام گنگا تھا۔ رام گنگا تو مراد آباد کے کنارے ہے؟ نہیں میں نے غلط کہا۔ مراد آباد رام گنگا کے کنارے آباد ہے۔ مراد آباد میں مردہ زندہ ہوگیا۔ میں نے خود سے کہا۔ ''چہ خوش'' میں نے خود پر طنز کیا یا شاید وہ نہیں کیا، میں اس عورت کے تئیں اپنی شرمندگی مٹانا چاہتا تھا۔ میں اس عورت کے لیے تو مر ہی چکا تھا، وہ میں جسے بہت دور چھوڑ آیا تھا یا وہ جسے میں بالوں میں کنگھی پھیرتا چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا؟ خدا ہی جانے، میں نے اکتا کر سوچا، اس ندی کا نام کیا ہے۔ مجھے کیا لینا دینا۔ میں اس میں کوئی ڈوبنے تو جا نہیں رہا ہوں۔

گلی اب تقریباً ختم ہونے کو تھی اور سامنے کھلا ہوا سا دھندلا کنارہ چمک رہا تھا کہ میں نے اچانک گلی کے منہ اور کنارے کے درمیان اسی لمبے آدمی کو کھڑا ہوا دیکھا وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے پوری گلی کو روکے کھڑا تھا اور کنارے کی دھندلی روشنی کے پس منظر میں وہ کسی سیاہ پہرے دار کی طرح معلوم ہو رہا تھا، جب میں اور نزدیک پہنچا تو میں نے اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹی چمکتی ہوئی سی چیز دیکھی۔ وہ اچانک قدم بڑھا کر میرے سر پر آگیا اور مجھے اچانک ایسا محسوس ہوا کہ میرے بائیں پہلو میں پسلیوں کے نیچے کوئی سوراخ ہوگیا ہے اور کھولتا ہوا پانی سوراخ میں سے ہو کر میرے سینے میں اور پیٹ میں پھیل رہا ہے۔ میرے گھٹنے اپنے آپ مڑ گئے اور بیگ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔

جب وہ اپنا شکستہ حال بیگ لے کر اسٹیشن پر اترا تو میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر ایسی بے رونق اُداسی اور ایسا شدید خالی پن تھا جیسے وہ مر کر پھر پیدا ہوا ہو اور دوبارہ مرنے کے لیے تیار ہو۔ اس نے ایک لمحے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا پھر پلیٹ فارم پر اترتی ہوئی بھیڑ کی طرف۔ شاید اسے یاد نہ تھا کہ وہ یہاں کسی کے بلاوے پر آیا ہے۔ اس وقت تو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے اپنا نام بھی یاد نہ رہا ہو۔ اس کی اس ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ اندیشہ کیا ہو سکتا تھا کہ وہ پلیٹ فارم پر میری موجودگی کا احساس کرے گا یا اسے کوئی غیر معمولی اہمیت دے گا۔ لیکن پھر بھی پوری احتیاط لازم تھی اور مجھے یہ اطمینان بھی کرنا تھا کہ وہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں میرے مالکوں نے مجھے بتایا تھا۔ یہ سپاری کا معاملہ نہ تھا۔ اسے راستے سے ہٹانا میرے فرائض میں شامل تھا۔ اس کے لیے مجھے کوئی معاوضہ نہ ملنا تھا۔ لیکن پھر بھی، بلکہ اس وجہ سے تو اور بھی،

احتیاط لازم تھی۔ میں اس کے پاس سے اس بے تعلقی کے انداز سے گزرا کہ اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں اور نہ وہ میرا ہی چہرہ دیکھ سکا وہ اپنے خیالوں میں گم اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلا اور چوراہے پر آ کر سوچ میں غرق ہو گیا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب کدھر جائے۔ اس جیسے شخص سے تذبذب اور بے یقینی کی توقع کرنی ہی چاہیے تھی، یا شاید وہ یہاں آنے سے مطمئن نہیں تھا اور اسی جگہ واپس لوٹ جانا چاہتا تھا جہاں سے وہ آیا تھا۔ سڑک پر ایک دو جانور اس کی ہی طرح اونگھتے ہوئے سے بیٹھے تھے گویا وہ بھی اس کی طرح اپنے انجام سے بے خبر لیکن اپنے انجام کے منتظر تھے۔ جب وہ بیچ والی سڑک پر ہولیا تو میں کبھی اس کے آگے اور کبھی اس کے پیچھے رہ کر اس کی حرکات پر نظر رکھتا رہا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ ایک دُکان میں گھس گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ ہوا کہ دُکان والا اس کا کوئی ملاقاتی ہے اور وہ رات اسی کے یہاں گذارے گا۔ یہ سوچ کر میں گھبرا سا گیا کیونکہ اگر وہ بچ نکلتا تو مجھے بڑی سخت سزا ملتی، لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے دُکان سے باہر نکلتے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ایک گلاس پکڑے ہوئے تھا اور پھر اس نے فوراً ہی وہ گلاس پاس بیٹھے ہوئے سانڈ کے سینگ پر پہنا دیا۔ مجھے یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے میرے تعاقب کا احساس ہو گیا ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے وہ اس طرح پاگل پن کا ڈھونگ رچا رہا ہے۔ میرا یہ ڈر اس وقت اور بھی مضبوط ہو گیا جب میں نے اسے پاس کی ایک گلی میں گھستے ہوئے دیکھا۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ گلی میں گھس کر اس نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا ہے میں نے سوچا کہ اب اس کا بچ نکلنا ممکن نہیں۔ گلی کی دھندلی روشنی میں اس کا لمبا سایہ عجیب ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ لیکن میں ابھی گلی کے سرے ہی پر تھا کہ میں نے اسے کچھ آگے ملبے کے ڈھیر کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا۔ احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر میں جب تقریباً دوڑتا ہوا ملبے کے پاس پہنچا تو وہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ لیکن تھوڑا ہی آگے میں نے نسیم بانو کے گھر کے کواڑ کھلے ہوئے دیکھے اور میں سمجھ گیا۔ یہ سب اپنے آخری وقت میں انھیں چیزوں کی تلاش خود بہ خود کیوں کرنے لگتے ہیں یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ میں اس گلی کے آخری سرے پر دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے نہ جانے کتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔ ایسے موقع پر میں ہمیشہ وقت کا احساس کھو بیٹھتا ہوں لیکن آخر دھندلی تاریکی میں اس کی مڑی تڑی شکل تیز قدموں سے بڑھتے ہوئے دکھائی دی۔ اس کے کندھے آگے کو جھکے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ کبڑا ہو۔ جب وہ میرے قریب پہنچ گیا تو میں نے آسانی اور آہستگی سے خنجر اس کی بائیں پسلی میں اتار دیا۔ اچھا خاصا صحت مند شخص تھا لیکن میرا ہاتھ بھی کچھ کم سدھا ہوا نہ تھا۔ وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح لہرا کر نیچے آ رہا۔

جب میرے گھٹنے گرمی میں پگھلتی ہوئی موم کی طرح نرم ہو کر جھک گئے اور بیگ میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا تو میرے منہ سے ایک طویل آہ نکلی۔ سنو تم کوئی بھی ہو لیکن اس سے کہہ دینا کہ میں تمھیں بھگا نہ لے جا سکا تو تم ہی مجھے یہاں سے اٹھا لے جاتیں۔

اس کے گھٹنے کچی دیوار کی طرح لڑکھڑائے اور اس کا بیگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا یا کہنا چاہتا تھا لیکن مجھے صرف ایک دبی ہوئی کھڑکھڑاہٹ سی سنائی دی جیسے کسی نے بھاری تکیہ اس کے منھ اور ناک پر رکھ دیا ہو۔

میرے گلے سے کچھ عجیب سی خرخراہٹ کی آواز ہوئی جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں پھنس گیا ہو۔

پھر اس کے گلے سے موت کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز اس زور سے پیدا ہوئی جیسے اس کا گلا بند ہو گیا ہو اور وہ اسے کھانس کر صاف کرنا چاہتا ہو۔

میں گلی کے کھردرے غلاظت آلود فرش پر گر پڑا اور موت کا تشنج میرے ہاتھ پاؤں پر طاری ہو گیا۔

وہ گلی کے فرش پر گر پڑا اور اس کا منھ گلی میں پھیلے ہوئے گدلے پانی اور کیچڑ سے بھر گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں بالکل ساکت و صامت ہو گیا تو اس نے مجھے کھینچ کر دریا میں ڈال دیا۔ اگر میں زندہ ہوتا تو اس وقت اس دریا کا نام ضرور پوچھ لیتا۔ مگر کیا پتہ اس دریا کا کوئی نام ہی نہ ہو۔ کیا پتہ وہ صرف میری لاش کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے کہیں سے بہا کر لایا گیا ہو اور میری لاش کے ڈوبتے ہی وہ دریا بھی زمین میں ڈوب جاتا۔

جب لاش ٹھنڈی ہونے لگی تو میں اسے گھسیٹتا ہوا دریا کے کنارے تک لایا اور اونچے کنارے پر کھڑے ہو کر میں نے اسے ایک زور کا دھکا دیا۔ ابھی لاش کچھ بہت بھاری نہ ہوئی تھی۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ زندگی میں تو وہ کچھ تن و توش رکھتا تھا لیکن جان نکلنے کے ساتھ اس کا بدن کچھ سکڑا ہوا سا، کچھ چھوٹا سا اور کچھ بے حقیقت سا لگنے لگا تھا۔ میں نے دل میں سوچا اگر اسے ایک ٹھوکر ہی ماردوں تو یہ اڑتا ہوا ندی کے وسط میں جا گرے گا۔

جب میں سری گنگا پور کے اسٹیشن پر اترا تو شام ہو رہی تھی۔

عالمی فکشن

کے تراجم

مرتب کے قلم سے

فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ بی اے کے زمانے (1951ء۔1953ء) تک ان کی ذہنی زندگی کا ملجا اور ماویٰ ہارڈی کے ناول تھے اور یہ بھی کہ وہ 1975ء تک انگریزی اور انگریزی کے توسط سے دوسری یورپی زبانوں کے فکشن اور ڈرامہ کے پرشوق طالب علم رہے۔ یہی رغبت انھیں فکشن کے تراجم کی طرف لے گئی اور اس باب میں بھی انھوں نے قابل قدر کام کیا۔ ''شب خون'' کا پہلا شمارہ نکالنے کا موقع آیا تو انھوں نے جان کولیئر کے افسانے ''کتے کی موت'' کو ترجمہ کیا اور ''بھیانک افسانہ'' کی ذیل میں شائع کیا۔ اس افسانہ نگار کے اسلوب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ اس کی کہانیاں چھوٹے چھوٹے بے ضرر واقعات سے شروع ہوتی ہیں اور اختتام پُرقوت ہو جاتا ہے۔ اڈگر ایلن پو کا افسانہ ''موسیو والدمار کی موت کا راز'' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے اور اس میں ایسے خیال کو افسانہ بنایا گیا ہے جس کی بعد میں سائنس نے تصدیق کر دی کہ موت کے بعد بھی انسان کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔ ''بھیانک افسانہ'' کی ذیل کا افسانہ ''اُس کی تصویر'' ای ایف بنسن کا ہے جسے فاروقی صاحب نے المیہ ناگزیریت کا افسانہ کہا ہے۔ شموئیل یوزف انیان کے ''چار قدم'' پر ایک اور عنوان ''یہودی افسانہ'' بھی ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ یہودیوں کے ادب کی جڑیں اپنے تمدن اور معاشرت میں دور تک پیوست ہیں اور یہودی روایات سے ان کا گہرا رابطہ ہے۔ ''پرچھائیں کا شیطان'' ایلن وائکس کے افسانے کا ترجمہ ہے جس کی بابت مترجم کا کہنا ہے کہ اس میں جنونِ تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ فرانسیسی فکشن نگار اور فلم کار آلن روب گرییے کے افسانے ''خفیہ کمرہ'' کے

جس انگریزی ترجمے کو اُردو میں ڈھالا گیا ہے وہ باربرا رائٹ کا ہے۔ معروف برطانوی فکشن نگار ولیم سین سم کا ''بھیانک افسانہ'' روم کی سیاحت کو جانے والے ایک دیہاتی کی کہانی ہے اور اس لڑکی کی بھی جس نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو اس کا بازو لمبا ہوتا گیا تھا۔ شمالی کوریا کے افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر ہوانگ سوتوان کا یہ مختصر افسانہ ''نقابیں'' ایک سپاہی کے بارے میں ہے جس کی ٹانگ میں گولی اور سینے میں سنگین پیوست ہوگئی تھی اور جس کی جان کا رس یولالیا نرگل نے پی لیا تھا۔ چین کی خاتون فکشن نگار ژانگ شن شن کا جو افسانہ ''دوسری کوشش'' کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا ہے اس میں بہ طور شریک مصنف ایک اور نام سانگ یے کا بھی ہے۔ سانگ یے کا تعلق صحافت سے تھا اور انھوں نے کئی سمعی کہانیاں مرتب کی تھیں۔ زندگی کی ہوس کو موضوع بناتی رُوسی ناول نگار، فلسفی، تاریخ نویس اور افسانہ نگار الکساندر سالژ نیتسن کی کہانی ''کرژم کا درخت'' اس مجموعے کی سب سے مختصر تحریر ہے۔ ایلن کیپرو کا ''دو و تو ے'' اگرچہ مہر افشاں فاروقی کا ترجمہ ہے لیکن اسے اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے کہ ترجمے کی نظرِ ثانی فاروقی صاحب نے کی ہے۔ ان تخلیقات کے تراجم جن فرضی شخصیات کے نام سے شائع ہوئے ان کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ''کتے کی موت'' (شہزاد) شمارہ: ۲۔ ''موسیو والدمار کی موت کا راز'' (شہزاد) شمارہ: ۳۔ ''اُس کی تصویر'' (شہزاد) شمارہ: ۴۔ ''چار قدم'' (جاوید جمیل) شمارہ: ۹۔ ''پرچھائیں کا شیطان'' (شہزاد) شمارہ: ۱۰۔ ''خفیہ کمرہ'' (جاوید جمیل) شمارہ: ۳۰۔ ''بھیانک افسانہ'' (شہزاد) شمارہ ۳۸۔ ''نقابیں'' (جاوید جمیل) شمارہ: ۲۷۵۔ ''دوسری کوشش'' (جاوید جمیل) شمارہ: ۲۸۰۔ ''کرژم کا درخت'' (جاوید جمیل)، شمارہ ۲۸۰۔

اسی حصے میں تین ڈراموں کے تراجم بھی شامل ہیں: سپین کے ڈرامہ نگار، فلم ڈائریکٹر اور ناول نگار فرنانڈو آرابال کا ڈرامہ ''دو جلاد''، سپین ہی کے گارسیا لورکا کا ڈرامہ ''عقد خونیں'' اور آئرش ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار سیموئل بیکٹ کا ڈرامہ ''چپ سوانگ''۔ ان تینوں ڈراموں کے لیے مترجم کے طور پر جاوید جمیل کا نام برتا گیا ہے۔ یہ ڈرامے بالترتیب ''شب خون'' کے شمارہ نمبر ۲۳، ۲۶ اور ۱۹ میں شائع ہوئے تھے۔ اب یہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فاروقی صاحب کے مطابق بعض مصلحتوں کے تحت ان کا یہ کام دوسرے ناموں سے شائع ہوتا رہا۔

محمد حمید شاہد

کتے کی موت

جان کولیئر

جان کولیئر جدید انگریزی بھیانک افسانہ نگاروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا انداز تحریر بظاہر بے کیف ہونے تک سادہ اور موضوع کی طرف رویہ ایک حد تک استہزائیہ ہے لیکن درحقیقت یہ ایک نقاب ہے جس کے پیچھے ہیبت ناک حقیقتیں دانت نکالے مسکراتی رہتی ہیں۔ اس کے افسانوں کی ابتدا چھوٹے چھوٹے اور بظاہر بے ضرر واقعات سے ہوتی ہے اور اختتام میں گھڑیال کی دم کی سی اچانک عمل پیرا ہونے والی قوت۔ ذیل کا افسانہ اس تکنیک کی اچھی مثال ہے۔ (مترجم)

رنگ وڈ ان انگریز زمین داروں کی آخری نشانی تھا جن کے اجداد تین سو برس سے آئرلینڈ کے باشندوں کو اپنے استبداد کا نشانہ بناتے رہے تھے۔ پایان کار اب ان کی حویلیاں ایک ایک کر کے فروخت ہوتی جارہی تھیں یا صدہا برس سے مظالم کے شکار آئرستانی انھیں آگ لگا لگا کر اپنے دل ٹھنڈے کر رہے تھے۔ ہزارہا ایکڑ اراضی کا اب ایک گز بھی نہ بچا تھا۔ لیکن رنگ وڈ کے پاس کچھ اپنی ذاتی آمدنی تھی اور اگرچہ باپ دادا کی جائداد وقت کی نذر ہوگئی تھی لیکن اس کی وہ آبائی جبلت زندہ اور متحرک تھی جس کی رو سے آئرلینڈ کی پوری سرزمین اس کی اپنی ملکیت تھی اور وہاں وافر مقدار میں پائی جانے والی نوجوان دیہاتی حسیناؤں کے حُسن و شباب سے لے کر تندرست اور صبا رفتار گھوڑوں، دریاؤں میں پلتی ہوئی مچھلیوں، جنگلوں میں آوارہ لومڑیوں اور جانوروں تک پر اس کا اپنا حق تھا۔

بارہویں مہینے زندگی کی ان لذتوں کی تلاش میں رنگ وڈ ملک کے کونے کونے کی سیر میں مصروف رہتا اور شاید ہی کوئی ایسی شکاری پارٹی ہوگی جس کی امامت اس نے اپنے عاریتاً مانگے ہوئے گھوڑے پر نہ کی ہو۔ شاید ہی کوئی ایسا پل ہوگا جس پر سے مئی کی چمکیلی صبحوں میں اس نے مچھلیوں کا شکار نہ کھیلا ہو اور شاید ہی کوئی ایسی دیہاتی سرائے ہوگی جس میں اس نے تیز جلتی ہوئی آگ کے سامنے سردیوں کی نم شامیں خراٹے لیتے ہوئے نہ گزاری ہوں۔

بیٹس نام کا اس کا ایک گہرا دوست تھا، کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کے مصداق، دونوں ایک ہی خاندانی پسِ منظر اور مزاج کے تھے۔ بیٹس بھی رنگ وڈ کی طرح قلاش، دبلا پتلا اور لمبا تھا۔ اس کے استخوانی چہرے پر ہی ویسی ہی سرد ہواؤں کی پیدا کردہ جھوٹی سرخی تھی، اس کے بھی عادات واطوار میں وہی پوچ رعونت تھی اور جھونپڑیوں اور گوشالوں کی ننھی منی تیتریوں کی طرف اس کا بھی رویہ وہی تھا جو رنگ وڈ کا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کو شاید ہی کبھی خط لکھتے ہوں، لیکن عام طور پر ایک کو دوسرے کا پتہ رہتا تھا۔ ٹرین کا ٹکٹ چیکر فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے مسٹر رنگ وڈ کے تھرڈ کلاس کے ٹکٹ سے مؤدبانہ پہلو تہی برتتے ہوئے یہ اطلاع بہم پہنچاتا کہ مسٹر بیٹس ابھی پچھلے ہفتے ہی ادھر سے گزرے تھے اور اب فلاں مقام پر ہوں گے۔ سرائے کی مرطوب خواب گاہوں میں شرمیلی خادمائیں مسٹر بیٹس کو بتا دیتیں کہ رنگ وڈ وہاں سے ہوتا ہوا فلاں جگہ کی طرف گیا تھا۔ پولیس والے، گرجا کے پادری، سیلز مین، بڑے آدمیوں کے میر شکار، اور یہاں تک کہ سڑکوں پر گھومنے والے چھوٹے موٹے کاری گر بھی خبر رسانی کی اس مہم میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے۔ اس طرح اگر ایک کو خبر لگ جاتی کہ دوسرے نے کوئی اچھا ہاتھ مارا ہے تو وہ بھی اپنی بندوقیں اور مچھلی پکڑنے کی ڈور اور کانٹے سنبھالتا اپنے ٹوٹے پھوٹے بیگ کو لیے ہوئے وہاں تک پہنچ جاتا۔

اس طرح سردیوں کی ایک سہ پہر کو جب رنگ وڈ بیلی نیری کی دلدلوں میں قاز کے شکار سے بے نیلِ مرام لوٹ رہا تھا تو اسے ایک واحد العین گھوڑوں کے بیوپاری نے خبر دی کہ مسٹر بیٹس ناک ڈری نام کے ایک گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اس سے ملے تھے اور انھوں نے خاص طور پر کہا تھا کہ مسٹر رنگ وڈ کو بھی یہ خبر دے دی جائے۔ رنگ وڈ نے اس پیغام میں یہ خاص بات نوٹ کی کہ اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ اس کا دوست ان اطراف میں شکار کی غرض سے گیا ہوا ہے یا ماہی گیری کے لیے یا اسے کوئی گانٹھ کا پورا رئیس ایسا مل گیا ہے جو شکاری کتوں کا ایک پورا جھنڈ انھیں حوالے کرنے کو تیار ہے۔ ایسا ہوتا تو یقیناً بیٹس نے صفائی سے اس کا ذکر کیا

ہوتا۔ اس نے سوچا۔ ''یقیناً دو چھوکریوں کا معاملہ ہے۔'' یہ سوچ کر وہ ناک سکوڑ کر لومڑیوں کی طرح مسکرایا اور جلد از جلد ناک ڈری کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کے پہلے آج تک وہ کبھی نہ جا پایا تھا۔

اس کو معلوم ہوا کہ ناک ڈری کا گاؤں سڑک سے بہت فاصلے پر اور ایک بہت ہی خاموش سا مقام تھا۔ آئر لینڈ کے عام دیہاتوں کی طرح یہاں بھی چاروں طرف نیچی اور نرم سی پہاڑیاں تھیں۔ ایک چھوٹی سی ندی وادی کو دو حصوں میں منقطع کرتی تھی اور ایک مرتفع مقام پر ویران اور نیم منہدم سی ایک قلعہ نما عمارت تھی جس کے چاروں طرف گھنے درختوں کے جھنڈ تھے اور جس تک پہنچنے کے راستہ کے بھی نشان اب مدہم پڑ رہے تھے۔ خود گاؤں بھی آئر لینڈ کے اور سینکڑوں دیہاتوں کی طرح تھا۔ ایک دو درجن ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں، ایک سڑی گلی سی پن چکی، دو چار شراب کی دوکانیں، اور ایک سرائے جس میں دیہاتی دسترخوانوں کے عادی مہمان کسی نہ کسی طرح گزر کر سکتے تھے۔ رنگ وڈ اپنی کرائے پر لی ہوئی موٹر سے وہیں اترا اور فوراً ہی اس نے اپنے دوست بیٹس کے بارے میں پوچھا۔

''جی ہاں.... جی ہاں حضور....'' جواب ملا۔ ''نواب صاحب یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں، یا ٹھہرے ہوئے تھے، اس وقت تو وہ یہاں نہیں ہیں۔''

''یعنی؟'' رنگ وڈ نے پوچھا۔

''حضور ان کا سامان تو موجود ہے، اور ہمارے سب سے بہترین کمرے میں (ہمارے پاس ایک اور بھی کمرہ ہے، وہ اس سے کچھ کم نہیں ہے) تقریباً ایک ہفتے تک وہ رہے لیکن پرسوں وہ کہیں تشریف لے گئے اور سچ جانیے.... ہم نے ان کو پھر نہیں دیکھا۔''

''ٹھیک ہے۔ واپس تو وہ آئیں گے ہی۔ میرا سامان بھی رکھوا دو، میں ان کا انتظار کروں گا۔'' رنگ وڈ نے کہا۔

مگر بیٹس شام تک بھی واپس نہ لوٹا۔ لیکن آئر لینڈ میں یہ سب باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ رنگ وڈ صرف ان دو چھوکریوں کے خیال سے بے صبر ہوا جا رہا تھا جو اس کے خیال میں بیٹس کو یہاں کھینچ لائی تھیں۔ اگلے ایک دو دن کا وقت اس نے گاؤں اور اس کے مضافات کی سیر میں گزارا۔ اس امید میں کہ شاید ان حسیناؤں یا کسی اور سے ملاقات ہو ہی جائے، اسے اس بات کا کوئی خاص لحاظ نہیں تھا کہ لڑکی کس طبقہ کی ہو لیکن اس وقت اسے کوئی دیہاتی چنچل زیادہ قابلِ قبول ہوتی کیوں کہ کسی اچھے گھر کی لڑکی کو ہموار کرنے میں وقت درکار ہوتا، اور وہ یہاں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن سہ پہر کے بعد جھٹ پٹے کے وقت گاؤں سے کوئی میل بھر دور اسے گایوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا جنھیں ایک لڑکی ہنکائے لیے جا رہی تھی، اور اس کو دیکھتے ہی رنگ وڈ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس کی ناک اور بھی زیادہ لومڑیوں کی طرح مسکراہٹ میں سکڑنے لگی۔ کیوں کہ وہ لڑکی صحیح معنوں میں حسین کہلانے کی مستحق تھی، اگرچہ اس کی عمر ابھی بیس سے کم ہی رہی ہوگی اور اس کی ٹانگوں پر کیچڑ کے داغ اور کانٹوں کی خراشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن اس کو نظر بھر دیکھتے ہی بیسیوں نسلوں کے خون کی گرمی اس کی رگوں میں ابل پڑی اور اس کو شدت سے یہ خواہش ہوئی کہ وہ لڑکی سے دودھ مانگ کر پیے۔ وہ ہلکے قدموں سے اس کے پیچھے ہو لیا، اس خیال سے کہ جیسے ہی لڑکی اپنے گوشالے کے نزدیک پہنچے گی، وہ آگے بڑھ کر دودھ کی درخواست کے بہانے اس سے دو دو باتیں بھی کر لے گا۔

کہتے ہیں کہ اچھی چیز اکیلی نہیں آتی۔ رنگ وڈ لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے قسم کھانے کو تیار تھا کہ اس جیسی حسین چیز اس ضلع بھر میں نہ ہوگی کہ اس نے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنی اور نظر اٹھائی تو ایک اور لڑکی کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ شاید کسی پگڈنڈی کے موڑ کی وجہ سے اب تک اس کی نظروں سے اوجھل تھی، کیوں کہ لمحہ بھر پہلے تک کوئی بھی چیز راستے میں نہ تھی۔

سرمئی رنگ کے گھوڑے کی کوئی خاص اہمیت نہیں، خاص کر جب کسی کو ایک گلاس دودھ کی سخت ضرورت ہو، لیکن رنگ ونسل کے اعتبار سے یہ گھوڑا بھی اور تمام گھوڑوں سے مختلف تھا۔ کچھ عجیب سا جانور تھا، نہ سواری، نہ شکاری، اس کے پاؤں بھی زمین پر کچھ الٹے سیدھے سے پڑ رہے تھے، لیکن اس کی گردن کا تناؤ، چھوٹا سر، کھڑی کنوتیاں اور پھیلے نتھنے امتیاز سے عاری نہ تھے لیکن سب سے اہم بات تھی کہ اس گھوڑے پر جو لڑکی سوار تھی اس سے زیادہ حسین اور طرح دار چھوکری رنگ وڈ نے زندگی بھر نہ دیکھی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہ گیا، اور جب لڑکی اس کے نزدیک آئی تو اس نے بھی نگاہ بھر کر رنگ وڈ کو دیکھا۔ وہ گایوں کو، گوالن کو اور سچ تو یہ ہے کہ دُنیا کی ہر چیز کو بھول کر اسے مبہوت سا دیکھتا رہا۔ گھوڑا آگے بڑھتا رہا اور لڑکی اسے دیکھتی رہی.... اور نگاہوں کا یہ ٹکراؤ کوئی معمولی ٹکراؤ نہ تھا، اسے اتصال و امتزاج کہیے جس میں عشق و محبت، وصل کے وعدہ و پیمان سبھی کچھ شامل تھے۔

ایک لمحے میں گھوڑا لڑکی کو لیے اس کے پاس سے گزر گیا۔ وہ اس قابل ہی نہ رہ گیا تھا کہ اس کو پکارتا یا اس کے پیچھے دوڑتا۔ سرد دھندلکے میں اس نے گھوڑے اور سوار کو ایک ٹوٹے ہوئے پھاٹک میں مڑتے

ہوئے دیکھا، نظروں سے اوجھل ہوتے ہوتے لڑکی نے اس کی طرف رخ پھیر کر پکارنے کے انداز میں سیٹی بجائی تو رنگ وڈ نے دیکھا کہ لڑکی کا کتا اس کے پاس رک کر اس کے جوتوں کو سونگھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے رنگ وڈ سمجھا کہ وہ شاید کوئی چھوٹے قد کا شکاری کتا ہے لیکن پھر اس نے دیکھا کہ وہ ایک لاغر اور مریل سا دونلا ہے۔ اس نے کتے کو دم دبائے لنگڑاتے ہوئے لڑکی کے پیچھے دوڑتے ہوئے دیکھ کر سوچا کہ شاید ابھی ابھی اس کی مالکہ نے اس کی بری طرح مرمت کی ہے.... کتے کی کمزور پسلیوں پر کے گھنے بال چابک کی مار سے جگہ جگہ سے اُڑ گئے تھے۔

لیکن کتے پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس نے بھی پیچھے پیچھے تیزی سے قدم بڑھائے۔ جب وہ پھاٹک تک پہنچا تو لڑکی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی، لیکن رنگ وڈ کو وہ راستہ پہچاننے میں دقت نہ ہوئی جو مرتفع مقام پر بنے ہوئے قلعہ نما مکان کی طرف جاتا تھا۔ اتنی معلومات اور ملاقات کو اس دن کے لیے کافی سمجھ کر رنگ وڈ واپس لوٹ آیا۔ بینس کا اب بھی کوئی پتہ نہ تھا، خیر یہ بھی ٹھیک تھا، کل کے مقابلہ کا نقشہ تیار کرنے کے لیے یک سوئی کی ضرورت تھی۔ گھوڑا کس قدر واہیات سا تھا، مشکل سے چند روپیوں کی قیمت کا ہوگا، اس نے دل میں سوچا، بہت دولت مند نہیں ہے، اچھا ہی ہے۔ کپڑے بھی معمولی پہنے ہوئے تھی، نہ جانے کس طرح کا کوئی لبادہ سا تھا، بہرحال بانڈ اسٹریٹ کی فیشن ایبل اونچی دکانوں کا نہیں تھا اور رہتی بھی اس سنسان سے بنگلے میں ہے، میں سمجھا تھا بالکل ویران ہوگا۔ خیر ایک آدھ کمرہ تو بچ ہی رہا ہوگا۔ مفلس محل کہیے۔ پرانے وقتوں کی چیز معلوم ہوتی ہے، عالی خاندان اور پیسہ ایک نہیں اس کوردہ میں پڑی سوکھتی رہتی ہے، شاید برسوں کسی مرد کی صورت نہ دیکھتی ہو، تعجب نہیں جو اس نے مجھے اس قدر غور سے دیکھا۔ افوہ! اگر کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ اس اجاڑ گھر میں اکیلی ہے تو میں یوں ہی دلیرانہ گھس پڑتا کسی تعارف وغیرہ کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بہرحال، شاید اس کے کوئی بھائی بند بھی ہوں۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔''

جب سرائے والی لیمپ روشن کر کے لائی تو اس نے پوچھا: وہ کون سی ایک نوجوان لڑکی ہے جو ایک ٹیڑھے میڑھے پاؤں والے سرمئی گھوڑے پر سوار گھومتی ہے؟''

''نوجوان لڑکی؟'' اس نے پوچھا جیسے اسے معلوم نہ ہو، ''سرمئی گھوڑے پر؟''

''ہاں، ہاں، ابھی ابھی میں اس کے پاس سے ہو کر گزرا ہوں، وہ اونچے بنگلے کی طرف جارہی تھی۔''

''اوہ، خدا آپ کو اپنی امن وامان میں رکھے، آپ شاید مردک کی ان حسین بی بی کو پوچھ رہے ہیں۔''

''مردک؟ تو یہ نام ہے اس کا؟ ہوں! کیا اچھا اور پرانا خاندانی نام ہے!''

''جی ہاں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سیکسن [1] لوگوں کے پہلے وہی یہاں کے بادشاہ تھے اور ان بی بی کی صورت بھی تو بالکل رانیوں کی سی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اچھا مجھے وہسکی کی بوتل اور پانی لا دو۔''

اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ حسین مس مردک کے بھائیوں یا دوسرے اہل خاندن کے بارے میں بھی پوچھے، لیکن سکوت کو احتیاط کی شرط جان کر وہ چپ رہا۔ وہ آگ کے پاس آرام سے نیم دراز اس لڑکی کی نگاہوں کے وعدہ و پیام کی یاد سے لطف لیتا رہا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ذرا ہی سا بہانہ پا کر وہ اس سے رسم و راہ پیدا کرے گا۔

رنگ وڈ کو بہانوں کی کمی نہ تھی۔ اس لیے دوسرے ہی دن شام سے پہلے وہ بن سنور کر پرانے مینار کی طرف چلا۔ پھاٹک سے ہو کر وہ سرنگوں اور نمی سے ٹپکتے ہوئے ویران درختوں کے جھنڈ سے (جن پر طرح طرح کی بیلیں اس بری طرح چھائی ہوئی تھیں کہ راستہ دیکھنا دشوار تھا) گزرتا ہوا آگے نکلا تو راستہ ایک طرف کو مڑ گیا تھا اور قلعہ کی بوسیدہ عمارت نظر نہ آتی تھی۔ آخری جھنڈ کو پار کر کے جب اس کی نظر دروازے پر پڑی تو اس نے کسی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ لڑکی خود ہی شاید اس کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ اس کے نزدیک پہنچا اس نے خوش مذاقی کے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''آداب عرض کرتا ہوں، امید ہے میں مخل نہیں ہو رہا ہوں، لیکن میرا خیال ہے آپ کے ایک عزیز سے میری ملاقات پچھلے دنوں....'' اتنا کہتے کہتے وہ بالکل لڑکی کے پاس پہنچ گیا اور جوں ہی ان کی آنکھیں ملیں وہ سب کچھ بھول گیا کیوں کہ نہ جانے کیوں یہ لمحہ اسے ان تمام احمقانہ باتوں سے بعید اور بلند تر لگا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔'' لڑکی نے کہا۔

''خدا کی قسم میں رک نہیں سکتا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کیا آپ اتنے بڑے مکان میں یکہ و تنہا رہتی ہیں؟''

''ہاں۔ بالکل تنہا۔'' اس نے اپنا ہاتھ پھیلا کر، جیسے اسے اندر لے جانے کو ہو، کہا۔ رنگ وڈ اپنی قسمت پر وجد کرتا ہوا اس کا ہاتھ پکڑنے ہی والا تھا کہ لڑکی کا مریل کتا اچھل کر دونوں کے بیچ میں آ گیا اور رنگ وڈ

---

(۱) انگریز

دھکے سے گرتے گرتے بچا۔

"چل یہاں سے باہر نکل!" لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مارنے کے لہجے میں کہا اور کتا خوف سے جھجک کر پیچھے آرہا۔ ڈر کی وجہ سے وہ اس قدر جھک گیا تھا کہ اس کا پیٹ زمین سے لگا جا رہا تھا اور وہ منہ سے رونی آوازیں نکال رہا تھا جیسے بہت زیادہ مار کھا گیا ہو۔ "یہ کتا قابلِ اعتبار نہیں ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ دیکھنے میں تو ہوشیار لگتا ہے، اس نسل کے کتے بڑے ہوشیار ہوتے ہیں۔" چمکار کر "کیوں بے! کیا تو مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

خواتین کے کتوں کی تعریف کرنا، رنگ وڈ کا پرانا حربہ تھا لیکن یہ کتا تو واقعی عجیب وغریب طرح کی رونی آوازیں نکال رہا تھا۔ "چپ ہوجا!" لڑکی نے پھر ہاتھ اٹھا کر ڈانٹا، کتا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور بالکل خاموش ہوگیا۔

"دوغلا ہے کم بخت۔ کیا تم یہاں اس دوغلے کی تعریفیں کرنے آئے تھے؟" یہ کہتے ہوئے لڑکی نے پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور وہ اس بدنصیب کتے کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔ اس بار وہ آزادی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر صدر دروازے کی طرف لے چلی۔ رنگ وڈ دل ہی دل میں خود کو مبارک باد دے رہا تھا، کیا تقدیر ہے! اور اس وقت میں شاید کسی مرطوب اور بدبودار گوشالے میں اس دیہاتی لونڈیا پر ہاتھ پھیر رہا ہوتا.... اور وہ شاید بعد میں شوں شوں کرتی روتی اپنی ماں کے پاس شکایت کرنے جاتی۔ یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔"

اس لمحہ لڑکی نے بھاری دروازے ڈھکیل کر کھولے اور کتے کو وہیں بیٹھنے کا حکم دے کر وہ رنگ وڈ کو لے کر ایک بڑے سے بالکل ننگے پتھر کے فرش والے ہال سے ہوتی ہوئی محرابوں والے ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچی جس کو گوشالے سے کوئی مناسبت نہ تھی، سوائے اس کے کہ یہاں کی ہوا بھی ذرا نم تھی، جیسا کہ عام طور پر پرانی پتھر کی عمارتوں میں ہوتا ہے پھر بھی، آتش دان میں تیز آگ بھڑک رہی تھی اور آگ کے ٹھیک سامنے ایک نیچا سا چوڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کمرے کی آرائش بالکل سادہ اور قدیمی انداز کی تھی۔ "خوب، عہد قدیم کے دھندلکے میں لیٹی ہوئی وہ دل لگانے کے خواب دیکھتی رہتی ہے۔" اس نے سوچا "بہرحال، کسی قسم کے تکلف یا ڈھانکنے چھپانے کی قائل نہیں معلوم ہوتی!"

لڑکی اس کو اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہتی ہوئی خود بھی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ایک طویل لمحے تک کوئی نہ

بولا۔ ہوا کی سائیں سائیں کتے کی سسکیوں اور پنجوں سے چوکھٹ کھرچنے کی آواز کے علاوہ ہر طرف ایک محشر سکوت طاری تھا۔

آخر کار لڑکی نے مہرِ سکوت توڑی ''تم سیکسن نسل کے ہو۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں، لیکن آپ مجھے اس وجہ سے موردِ الزام نہ ٹھہرائیں۔ میرے آبا و اجداد 1656ء میں یہاں آئے تھے یہ تو صحیح ہے کہ آئرلینڈ کی قدامت کے سامنے یہ کل کی سی بات ہے، لیکن پھر بھی ہمارا اس ملک پر کچھ تو حق ہے ہی۔''

''ہاں، تم لوگوں نے ایک خنجر اس کے سینے میں پیوست کر رکھا ہے۔''

''تو کیا ہم لوگ سیاسیات پر باتیں کریں گے؟ اس نے آئرش لہجہ میں کہا۔'' آپ اور میں، آگ کی اس مدھم روشنی میں؟''

''نہیں تم تو محبت کی باتیں کرنا چاہو گے، لیکن تم ایسوں کو تو ہم بے چاری آئرش لڑکیوں کی ناموس کی ہنسی اڑانے میں مزا آتا ہے۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''آپ مجھے بالکل غلط سمجھی ہیں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو غم و یاس کی زندگی گزارتے ہیں۔ اپنی سچی محبت کی تلاش میں، چاہے وہ امید سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہو۔''

''اور پھر بھی تم کل اس دیہاتی گوالن کو گھور رہے تھے۔''

''یہ میں مانتا ہوں۔ لیکن اس وقت تک میں نے آپ کو نہ دیکھا تھا۔ آپ کو دیکھ کر میں اسے بالکل بھول گیا۔''

''یہی تو میں چاہتی تھی۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ ''تم یہاں میرے پاس رہو گے؟''

''ہاں، رہوں گا۔'' وہ کھل اٹھا۔

''ہمیشہ؟''

ہمیشہ! اس نے بڑے جوش سے کہا۔ ''ہمیشہ ہمیشہ رہوں گا۔'' کیوں کہ اس کے خیال میں تھوڑے مبالغہ سے کام لینا کسی خاتون کی دل شکنی کرنے سے کہیں بہتر تھا۔ لیکن وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے درحقیقت اس کو اعتبار آ ہی گیا ہو۔

''آپ نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔'' اس نے اسے آغوش میں چھپا کر اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست کر دیے اور فوراً ہی اس کا ہیجان طوفان بن کر قابو سے باہر ہو گیا۔ اس کو اپنی تجربہ کاری اور پُرسکون طریقۂ محبت پر بڑا گھمنڈ تھا لیکن یہاں نشہ کا عالم کچھ اور ہی تھا اس کو اپنا ذہن شیرینی اور آگ میں گھلتا ہوا سا محسوس ہوا۔ اور آخر کار آگ کے بجھتے بجھتے اس کے ہوش و حواس بھی بجھ گئے.... ہوش کے آخری لحظہ میں اس نے لڑکی کی آواز سنی، ''تم ہمیشہ میرے پاس رہو گے، ہمیشہ ہمیشہ....'' اور پھر ہر چیز تاریکی کی گاڑھی دھند میں غرق ہو گئی۔

وہ کچھ دیر تک سوتا رہا ہوگا، کیونکہ جب دروازے کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی بھاری آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو اس کا دماغ بالکل پراگندہ تھا او وہ ایک لمحہ کے لیے سمجھ نہ پایا کہ وہ کہاں تھا۔

آگ تقریباً سرد ہو چکی تھی اور کمرہ اب بالکل تاریک تھا۔ اس نے اپنی پلکیں جھپکائیں، کان ہلائے اور اپنے ہوش درست کرنے کی کوشش کی۔ اچانک اندھیرے میں اس نے بینس کو بولتے ہوئے سنا، مگر آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی، جیسے وہ نیم خوابی میں ہو یا شاید گہرے نشے میں۔

''تم آخر آ ہی گئے۔ اگرچہ میں نے تمھیں روکنے کی ہزار کوشش کی۔''

''ارے بینس!'' وہ سمجھا کہ شاید وہ گاؤں کی سرائے میں آگ کے سامنے بیٹھا بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ''میں شاید بڑی گہری نیند سو گیا تھا۔ سر کچھ عجیب بھاری سا لگ رہا ہے۔ لعنت ہے، وہ سب خواب ہی میں دیکھ رہا تھا۔ ذرا روشنی تو کر۔ بڑی دیر ہو گئی ہے، میں کھانے کے لیے آواز دوں۔''

''خدا کے لیے! آواز نہ دینا۔'' بینس اپنی بدلی ہوئی آواز میں بولا۔ ''چپ رہو، چپ رہو، نہیں تو وہ کوڑوں سے خبر لے گی۔''

''کوڑوں سے خبر لے گی؟ کیا مطلب؟'' اور اس لمحہ چیخ کر ایک جلتی ہوئی لکڑی آتش دان میں نیچے آ رہی۔ ایک مدھم سا شعلہ بھڑک اٹھا۔

اس کی نظر اپنے جھبرے بالوں والے اگلے پنجوں پر پڑی اور وہ سمجھ گیا کہ اس کا کیا حشر ہونے والا تھا۔

موسیو والدمار کی موت کا راز

اڈگر ایلن پو

اڈگر ایلن پو کا نام دُنیا کے کسی ادبی حلقے میں اب محتاج تعارف نہیں رہا۔ انیسویں صدی کی فرانسیسی شاعری، تمثیلیت کی تحریک، اور اس طرح دُنیا کی جدید شاعری پر اس کی شاعری اور تنقید نے جو گہرا اثر ڈالا اس سے ہم سب واقف ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے بھیانک افسانے کی صنف کو پہلی بار باقاعدہ صنف کی حیثیت بخشی۔ اسرار و سراغ رسانی کے افسانے بھی پہلی بار اسی نے لکھے۔ اس کی نثر جو غیر مانوس الفاظ سے بوجھل ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک انوکھی پُراسرار اعصابی قوت رکھتی ہے آج کے نقادوں کے نزدیک اس کی نظم سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔

اس افسانے میں جس تجربہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا سائنسی ثبوت بھی جدید تحقیقات کی رو سے ایک حد تک مل گیا ہے۔ 1952ء میں امریکا کے دو ڈاکٹروں نے ایک حیرت انگیز تجربہ کیا جس کی مثال علم الطب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر پھانسی پر لٹکائے ہوئے ایک شخص کے ذہن میں عمل تنویم کے ذریعہ داخل ہو گیا اور نہ صرف مردہ شخص کے ذہن سے گزرتی ہوئی کیفیات کا مطالعہ کرتا رہا بلکہ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ موت کے بعد بھی کچھ عرصہ تک انسان کا دماغ کام کرتا رہتا ہے۔ (مترجم)

سچ پوچھیے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ موسیو والدمار کے کیس نے اپنے غیر معمولی واقعات کی وجہ سے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کیا اور سب نے اپنے اپنے مقدور کی حد تک اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ حیرت کی بات تو تب ہوتی اگر ایسا نہ ہوتا۔ کچھ تو ان واقعات سے متعلق اشخاص کی اس خواہش کی وجہ

سے کہ یہ غیر معمولی اسرار منصۂ شہود پر نہ آئیں جب تک ان کی چھان بین پوری طرح نہ ہو جائے اور کچھ ہماری ان تحقیقات اور تفہیمات کی وجہ سے جو اس واقعہ کے بعد لازمی تھیں، حقیقت کا کچھ بگڑا ہوا سا اور مبالغہ آمیز روپ لوگوں کے سامنے آ ہی گیا اور اس کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں اور بہت سے ناخوش گوار نتائج بھی اخذ کر لیے گئے۔ اس کے علاوہ، فطری طور پر، لوگوں میں بے اعتباری بھی بڑھی۔

اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں واقعات کی صحیح روداد، جہاں تک میں انھیں سمجھ پایا ہوں، آپ کے گوش گزار کر دوں۔

پچھلے تین برسوں سے میری توجہ مسلسل تنویم Mesmerism کے موضوع پر مرتکز رہی ہے۔ تقریباً نو مہینے ہوئے مجھے اچانک یہ خیال آیا کہ جتنے تجربات اس سلسلے میں کیے گئے ان میں ایک نہایت اہم فروگذاشت رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ کسی شخص کو سکرات کی حالت میں تنویم کے زیر اثر لا کر یہ نہ دیکھا گیا تھا کہ نزع کے عمل پر تنویم کا کیا اثر پڑتا ہے۔ پہلی بات تو یہ قابل غور تھی کہ کیا ایسے عالم میں بھی مریض تنویم کی مقناطیسی اثریت قبول کر سکتا ہے؟ اگر ہاں، تو کس حد تک؟ جان کنی کے عالم میں تنویم کا اثر شدید تر ہو جاتا ہے، یا کم؟ اور سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ موت کی آمد آمد کس حد تک اور کس عرصہ تک تنویم کی مدد سے روکی جا سکتی ہے؟ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں تحقیق طلب تھیں لیکن آخری مسئلہ میری توجہ اور تجسس کا خاص مرکز تھا۔ کیونکہ اس کے نتائج انسانی زندگی کے لیے انتہائی اہم ہو سکتے تھے۔

میں کسی ایسے مریض کی تلاش ہی میں تھا جس پر یہ تجربات آزمائے جا سکتے تھے کہ مجھے اپنے دوست موسیو ارنسٹ والدمار کا خیال آیا۔ یہ وہی موسیو والدمار ہیں جنھوں نے قانونی علم الطب پر ایک مشہور کتاب لکھی ہے اور آخر کار مارکس کے فرضی نام سے کچھ فرانسیسی کتابوں کا پولش میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ موسیو والدمار 1839ء سے نیویارک میں رہتے تھے اور اپنے انتہائی دبلے پن، مونچھوں کی سفیدی اور بالوں کی سیاہی (جنھیں بہت سے لوگ اسی وجہ سے نقلی سمجھتے تھے) کی وجہ سے سوسائٹی میں خاصے معروف بھی تھے۔ ان کے مزاج میں انتہائی اعصابیت تھی اور اسی وجہ سے تنویمی تجربات کا موضوع بننے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ دو تین موقعوں پر میں نے انھیں عالمِ خواب میں لانے کی کوشش کی تھی اور اس میں بہ آسانی کام یاب بھی ہوا تھا۔ لیکن جس طرح کے شان دار نتائج کی مجھے ان کی اعصابی اور مزاجی بناوٹ کی بنا پر امید تھی ویسے برآمد نہ ہو سکے، جس کا مجھے افسوس بھی رہا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی ان کی قوتِ ارادی پوری

طرح میرے قبضے میں نہ آسکی اور غیب بینی کے باب میں بھی ان کے ذریعہ حاصل کی ہوئی اطلاعات ناقابلِ اعتبار نکلیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان کی پراگندہ صحت کی بنا پر اطمینان بخش نتائج ان سے نہیں مل سکتے۔ مجھ سے ملاقات ہونے کے چند مہینوں پہلے ڈاکٹروں نے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ تپ دق کے تیسرے اور آخری درجے سے گزر رہے ہیں۔ موسیو والدمار اپنی قضائے مبرم کا ذکر انتہائی سکون کے لہجے میں کیا کرتے تھے کیونکہ موت سے ان کے خیال میں نہ فرار ممکن تھا اور نہ اس پر رنج کرنے سے کچھ حاصل۔

جب مجھے عالم سکرات میں تنویم کے عمل کا خیال آیا تو میں نے فطری طور پر موسیو والدمار کے بارے میں بھی سوچا۔ ان کے مزاج کی سنجیدہ فلسفیت کی بنا پر مجھے معلوم تھا کہ وہ میری تجویز پر کوئی اعتراض نہ کریں گے، اور امریکا میں ان کے کوئی عزیز اقارب بھی نہ تھے جو ان کی مخالفت کرتے۔ میں نے اس مسئلہ پر بہت صفائی کی ان سے گفتگو کی اور مجھے یہ دیکھ کر ذرا تعجب ہوا کہ انھوں نے میری تجویز سے خاصی دلچسپی ظاہر کی۔ مجھے حیرت اس لیے ہوئی کہ اگرچہ اس سے پہلے وہ بہ خوشی میرے تجربات کے معمول بن چکے تھے لیکن انھوں نے ان تجربات سے کبھی کسی جذباتی ہم دردی کا اظہار نہ کیا تھا۔ ان کے مرض کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ سکرات موت اور خود موت کا لمحہ کے بارے میں ایک حد تک صحیح پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ اس لیے میرے ان کے درمیان یہ طے ہوا کہ اپنی آخری گھڑی کے تقریباً چوبیس گھنٹے پہلے وہ مجھے خبر کر دیں گے۔

تقریباً سات مہینے ہوتے ہیں کہ مجھے ان کا مندرجہ ذیل خط ملا۔

> ’’عزیزی، میرا خیال ہے اب تم آہی جاؤ۔ دونوں ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ میں کل نیم شب سے زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اندازہ درست ہی ہے۔ تمھارا والدمار۔‘‘

ان کے خط لکھنے کے ایک گھنٹے کے اندر اندر میں ان کے کمرے میں تھا۔ میں دس دنوں سے ان کی عیادت کو نہیں گیا تھا اور اس عرصہ میں ان کی حالت میں اس قدر بھیانک تبدیلی ہو چکی تھی کہ میں حیرت زدہ اور خوف زدہ رہ گیا۔ ان کا چہرہ سیاہ پڑ رہا تھا، آنکھوں میں زندگی کی چمک قطعی نہ تھی اور دبلے پن کا یہ عالم تھا کہ رخسار کی ہڈیاں کہیں کہیں جلد کو پھاڑ کر باہر نکل آئی تھیں۔ بلغم کی خاصی مقدار کھانسی کے ساتھ خارج ہو رہی تھی اور نبض کی حرکت تقریباً معدوم تھی۔ لیکن ان کے اندازِ گفتگو میں وہی پہلے کی سی چستی اور صفائی تھی۔ ان کی

دماغی اور ایک حد تک جسمانی قوت بھی پہلے کی طرح برقرار تھی۔ ان کی آواز واضح تھی اور وہ اپنی دوا اپنے ہاتھ سے پی سکتے تھے۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ تکیوں کے سہارے بیٹھے اپنی نوٹ بک میں عالم نزع کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کر رہے تھے۔ دونوں ڈاکٹر بھی موجود تھے۔

والدمار کا ہاتھ محبت سے دبانے کے بعد میں نے ڈاکٹروں کو الگ لے جا کر ان کی مرضیاتی کیفیت کے بارے میں تفصیلی پوچھ گچھ کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ بائیں پھیپھڑے کا عمل جھلیوں کے سخت ہو جانے کی وجہ سے پچھلے اٹھارہ مہینوں سے بالکل بند تھا۔ داہنے پھیپھڑے کا اوپری حصہ بھی اگر پوری طرح نہیں تو تقریباً بالکل سخت ہو چکا تھا اور نچلا حصہ ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تپ دق خوردہ خلیات کے ایک سڑے ہوئے ڈھیر سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اس میں جگہ جگہ کافی بڑے سوراخ ہو چکے تھے اور ایک مقام پر تو پھیپھڑا پسلی میں پوری طرح پیوست ہو گیا تھا۔ داہنے پھیپھڑے میں یہ مرضیاتی کیفیات ایک حد تک حالیہ تھیں اور خلیات کا انحطاط نہایت تیزی سے عمل پذیر ہوا تھا، کیونکہ ایک مہینہ پہلے اس کا کوئی نشان نہ تھا اور پسلی سے پیوستگی کی کیفیت ابھی تین ہی دن پہلے مشاہدے میں آئی تھی۔ تپ دق کے علاوہ دل کے بائیں جانب سے نکلنے والی شہ رگ میں خون کی کثرت کی وجہ سے آماس کی بھی کیفیت کا شبہ تھا لیکن پھیپھڑوں کی سختی کی وجہ سے اس بات کی پوری تحقیق ممکن نہ تھی۔ دونوں طبیبوں کی رائے تھی کہ موسیو والدمار کی موت اتوار کو آدھی رات کے قریب واقع ہو جائے گی۔ اس وقت شام کے سات بجے تھے اور دن سنیچر تھا۔

مریض کے پاس سے ہٹتے وقت دونوں ڈاکٹروں نے آخری الوداع کہہ لی تھی۔ اس کا واپسی کا ارادہ نہ تھا۔ لیکن میرے کہنے کی وجہ سے انھوں نے دوسرے دن رات کو دس بجے پھر آنے کا وعدہ کر لیا۔

ڈاکٹروں کے جانے کے بعد میں نے موسیو والدمار سے ان کی مرگ قریب اور اپنے تجربے کے بارے میں وضاحت سے گفتگو کی۔ سب باتوں کے باوجود وہ تجربے کے لیے تیار بلکہ اس کے مشتاق نظر آتے تھے، اور انھوں نے بہ اصرار مجھ سے کہا کہ میں اپنا کام فوراً شروع کر دوں۔ ایک عورت اور ایک مرد نرس ان کی دیکھ بھال کے لیے موجود تھے، لیکن میں اتنا نازک کام صرف ان دو (ایک حد تک ناقابلِ اعتبار) گواہوں کی موجودگی میں شروع کرنے سے کچھ ہچکتا تھا، کیونکہ کسی حادثے کی صورت میں معتبر گواہوں کی موجودگی ضروری تھی۔ اس لیے مجھے اپنا تجربہ دوسری رات کے آٹھ بجے تک ملتوی رکھنا پڑا۔ اس وقت میرے ایک دور کے ملاقاتی، جو علم الطب کے طالب علم بھی تھے، کے آ جانے سے میری زحمت رفع ہو گئی۔ تب بھی میرا ارادہ تھا کہ ڈاکٹروں

کے آجانے پر اپنا کام شروع کروں، لیکن کچھ تو اس وجہ سے کہ موسیو والدمار کی حالت لحظہ بہ لحظہ دگرگوں ہوتی جاتی تھی اور اب ایک لمحہ کی تاخیر بھی مناسب نہ تھی اور کچھ خود موسیو والدمار کے بڑھتے ہوئے اصرار کی وجہ سے میں نے اپنا تجربہ شروع کر دیا۔

میرے ملاقاتی طالب علم از راہِ کرم اس بات پر تیار ہو گئے تھے کہ تمام واقعات کی پوست کندہ یادداشت لکھتے چلیں اور آئندہ آنے والے بیان میں جو کچھ میں نے کہا ہے وہ یا تو اس یادداشت کی تلخیص ہے یا اس سے بجنسہٖ نقل کر لیا گیا ہے۔

آٹھ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ میں نے ل.... کے سامنے موسیو والدمار سے پوچھا کہ آیا وہ اب بھی اس بات پر تیار ہیں کہ میں انھیں قوتِ تنویم کے زیر اثر لاؤں۔

انھوں نے بہت کم زور لیکن واضح آواز میں کہا۔ ''ہاں میں تیار ہوں.... مجھے خوف ہے کہ تم نے دیر کر دی ہے۔''

ان کے اتنا کہتے ہی میں نے اپنے ہاتھوں سے وہ خاص اشارے شروع کر دیے جن کو میں نے ان کے لیے ہمیشہ بہت سریع الاثر پایا تھا۔ بظاہر ان کی پیشانی پر پہلی ہی بار اس سرے سے اُس سرے تک ہاتھ پھیرتے ہی ان پر نیند کا غلبہ شروع ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد اگرچہ میں نے اپنی تمام قوتیں صرف کر ڈالیں مگر پھر بھی کوئی واضح اثر مرتب نہ ہو سکا اور یہاں تک کہ دس بجنے کے کچھ منٹ بعد دونوں ڈاکٹر د.... اور ف.... بھی آ گئے۔ میں نے انھیں مختصراً اپنے تجربے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔ انھوں نے یہ کہا کہ اب مریض اپنی آخری سانسیں لے ہی رہا ہے، اس لیے اس کو تنویم کے زیر اثر لانے سے کوئی حرج نہیں۔ میں نے پھر اپنا عمل شروع کیا، لیکن اب اشارے پیشانی کی لمبائی کے بجائے اوپر نیچے شروع کر دے اور اپنی نگاہ مریض کی داہنی آنکھ پر مضبوطی سے مرکوز کر دی۔

اس وقت تک مریض کی نبض معدوم ہو چکی تھی اور اس کی سانس گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ تقریباً آدھے منٹ کے وقفے سے رک کر آنے لگی تھی۔

یہ حالت تقریباً پندرہ منٹ تک رہی۔ اس کے بعد اچانک نزع میں گرفتار مریض کے ہونٹوں سے ایک گہری لیکن فطری آ آ آہ نکلی۔ سانس کی گھڑگھڑاہٹ بند ہو گئی۔ لیکن سانس لینے کا وقفہ ویسا ہی پہلے کی طرح تھا۔ مریض کے ہاتھ پاؤں برف کی طرح سرد تھے۔

گیارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اب پہلی بار مریض پر نیند کا واضح اثر دکھائی دینے لگا تھا۔ آنکھوں کی شیشے کی طرح بے رنگ کیفیت اب اس بے چین سی اندرونیت کی طرف مائل ہونے لگی جو صرف خواب بیداری کے مریض میں نمایاں ہوتی ہے اور جس کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا، چند ایک اشاروں کے بعد مریض کی پلکیں آہستگی سے پھڑ پھڑائیں، جیسا کہ نیند آتے وقت ہوتا ہے، اور پھر میں نے ان کو بالکل ساکت کر دیا۔ لیکن میں ابھی مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری قوتِ ارادی صرف کر کے اپنے اشاروں کی قوتِ ترغیب بڑھانی شروع کی، یہاں کہ مریض کو نیند کے آسن میں لٹا کر میں نے اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سخت کر دیے۔ ٹانگیں پوری طرح پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ بازو بھی تقریباً پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور کمر سے ذرا دور آہستگی سے پھیلائے ہوئے تھے۔ سر بہت ذرا سا اٹھا ہوا تھا۔

مریض کو اس حالت میں لاتے لاتے آدھی رات ہوگئی تھی، میں نے تینوں صاحبان سے مریض کا معائنہ کرنے کے لیے کہا اور انھوں نے تفصیلی معائنے کے بعد تصدیق کی کہ اب موسیو والد مار پوری طرح تنویم کے زیر اثر تھے۔ اب دونوں ڈاکٹروں کی دلچسپی اور تجسس پوری طرح بیدار ہو چکے تھے اور ڈاکٹر د.... نے رات بھر مریض کے پاس رہنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ف.... صبح سویرے آنے کا وعدہ کر کے رُخصت ہوئے، ل.... اور نرسیں ٹھہری رہیں۔

ہم نے رات کے تین بجے تک موسیو والد مار کو بالکل اسی حالت پر رہنے دیا۔ تین بجے رات کے معائنہ پر ان کی حالت ویسی ہی پائی گئی جیسی کہ ڈاکٹر ف.... کی روانگی کے وقت تھی۔ وہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے۔ نبض کی حرکت معدوم تھی، سانس اس قدر آہستہ تھی کہ ناک پر آئینہ رکھنے پر ہی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ پاؤں سنگِ مرمر کی طرح سخت اور سرد تھے۔ لیکن ظاہری حالت کسی بھی طرح موت کی سی نہیں تھی۔

موسیو والد مار کے پاس پہنچ کر میں نے ان کے داہنے ہاتھ کو اپنے اثر میں لا کر متحرک کرنے کی کوشش کی۔ پہلے کے تجربات میں، مَیں کبھی ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تھا اور اس وقت بھی مجھے کوئی خاص امید نہ تھی۔ لیکن اب مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب ان کا ہاتھ میرے ہاتھ کے اشاروں کی پوری طرح اگرچہ بہت آہستہ آہستہ اور کمزوری سے تعمیل کرنے لگا تھا۔ میں نے جی کڑا کے ان سے کچھ باتیں کرنا شروع کیں۔

''موسیو والد مار؟'' میں نے کہا، ''کیا آپ سو گئے؟'' کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن ہونٹوں میں خفیف سا

ارتعاش پیدا ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے دوبارہ اور سہ بارہ یہی سوال کرنے کی ہمت ہوئی۔ تیسری بار ان کے سارے بدن پر ایک بہت ہی ہلکا اور مختصر لیکن واضح لرزہ پیدا ہوا اور آنکھیں اس حد تک کھلیں کہ ان کی سفیدی نظر آنے لگی، ہونٹ بہت آہستہ آہستہ کھلے اور تقریباً نہ سنائی دینے والے لہجے میں انھوں نے یہ الفاظ ادا کیے۔

''ہاں، میں سو گیا ہوں۔ مجھے جگاؤ مت، یوں ہی مر جانے دو۔''

اس وقت میں نے ان کے اعضا کو ٹٹولا تو وہ پہلے ہی کی طرح جامد تھے اور ان کا ہاتھ اب بھی میرے اشاروں پر چل رہا تھا۔ میں نے پھر سوال کیا۔

''موسیو والدمار! کیا آپ کے سینے میں اب بھی درد ہے؟''

جواب فوراً ملا، لیکن آواز پہلے سے بھی زیادہ ہلکی تھی۔ ''نہیں درد نہیں ہے۔ اب میں مر رہا ہوں۔''

ان کی کیفیت میں اس سے زیادہ خلل انداز ہونے کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے میں نے اب خاموشی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ ڈاکٹر ف.... جو طلوع آفتاب کے کچھ ہی پہلے آئے، کے آنے تک مریض سے بالکل کوئی بات نہ ہوئی۔ ڈاکٹر ف.... کو یہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوئی کہ موت اب تک واقع نہیں ہوئی تھی۔ نبض ٹٹولتے اور ہونٹوں کے سامنے آئینہ رکھ کر سانس کی حرکت کی تصدیق کرنے کے بعد انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مریض سے پھر گفتگو کروں۔ پہلے کی طرح اس بار بھی جواب ملنے میں دیر ہوئی جیسے موسیو والدمار اپنی گرتی ہوئی قوتوں کو مجتمع کر رہے ہوں اور چوتھے استفسار کے بعد انھوں نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''ہاں، میں اب بھی سو رہا ہوں.... میں مر رہا ہوں۔''

اب ڈاکٹروں کی رائے یہ ہوئی کہ موسیو والدمار کو اس بظاہر پرسکون حالت میں چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ ان کی موت واقع ہو جائے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ اب جان نکلنے میں چند ہی لمحوں کی دیر ہے۔ میں نے بہر حال یہ سوچا کہ سوال و جواب ایک بار پھر کر لیا جائے۔

اس بار میرے سوال کے دوران میں ہی منوم مریض کے چہرے اور بدن کی حالت میں ایک انوکھا تغیر ہوا۔ آنکھیں آہستہ آہستہ کھل گئیں لیکن ان کی پتلیاں اوپر کی طرف گھوم کر غائب ہو گئیں۔ چہرے کی رنگت جو اَب تک پارچے کی طرح زرد تھی، لاش کی طرح سپید ہو گئی اور سرخی کے دو دھبے جو دونوں رخساروں پر نمایاں تھے، دفعتاً غائب ہو گئے۔ میں نے ''دفعتاً غائب ہو گئے'' جان بوجھ کر کہا ہے، کیوں ان کا مٹ جانا شمع کی لو کے پھونک سے بجھ جانے کی طرح اچانک اور قطعی تھا۔ اس وقت اوپر والا ہونٹ جو اب تک دانتوں کو

ڈھانکے ہوئے تھا، اینٹھ کر اوپر اٹھ گیا اور نچلا جبڑا ہلکی سی آواز اور جھٹکے کے ساتھ نیچے آرہا۔ اب ان کا منہ پوری طرح کھلا ہوا تھا اور ان کی سیاہ پھولی ہوئی زبان صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے ہر ایک عالمِ سکرات کی بھیانک تشنجی کیفیات سے واقف تھا۔ لیکن اس وقت موسیو والد مار کی صورت اس حد تک بھیانک اور کریہہ المنظر تھی کہ ہم سب چونک کر ان کے بستر کے پاس سے ہٹ آئے....

مجھے احساس ہے کہ واقعات کی روداد اب اس منزل پر آچکی ہے جہاں ہر قاری بے اعتباری سے میرا ساتھ چھوڑ دے گا لیکن مجھے تو بہر حال حقائق کی صحیح صورت سامنے رکھنی ہے۔

اب موسیو والد مار میں قوتِ حیات کا ذرا شائبہ نہ تھا اور ہم سب ان کو مردہ سمجھ کر نرسوں کے حوالے کرنے ہی والے تھے کہ ان کی زبان میں ایک شدید تشنج اور حرکت پیدا ہوئی۔ یہ حالت تقریباً ایک منٹ تک رہی اس کے بعد ان کے پھیلے ہوئے اور ساکت جبڑوں میں سے ایک ایسی آواز خارج ہوئی جس کو بیان کرنے کی کوشش کرنا دیوانگی کے مترادف ہوگا۔ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آواز کریہہ، کرخت، شکستہ اور کھوکھلی سی تھی، لیکن اس کی پوری خوف ناک وحشت انگیزی ناقابلِ بیان ہے، کیونکہ آج تک کبھی ایسی آواز کسی انسان کے کانوں سے نہ ٹکرائی ہوگی۔ لیکن دو خصوصیات جو اس وقت ہی میرے مشاہدے میں آئی تھیں، اور آج بھی میں یہی سمجھتا ہوں، حلق سے نکلتی ہوئی اس گونگی پکار میں پائی جاتی تھیں، اور جو اس کے غیر ارضی انوکھے پن کو ایک حد تک بیان کر سکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ کم سے کم میرے کانوں میں یہ آواز کسی عظیم الشان فاصلے یا کسی بہت ہی عمیق زیرِ زمین غار سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، دوسرے یہ کہ (خدا جانے میں اپنا ماضی الضمیر ادا بھی کر سکتا ہوں یا نہیں) اس صدائے بے زبان میں وہی کیفیت تھی جو کسی گاڑھے چپچپے مواد کو چھو کر حاصل ہوتی ہے۔

میں نے صدا اور آواز کا ذکر کیا ہے کیوں کہ یہ صدا جو موسیو والد مار کے منہ سے نکلی، درحقیقت آواز تھی، اور بہت ہی واضح اور تھرا دینے کی حد تک صاف بھی۔ میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا۔

''ہاں، نہیں، میں اب تک سو رہا تھا۔ اور اب.... اور اب.... میں مر چکا ہوں۔''

ہم میں سے کسی کو نہ اس ناقابلِ بیان اور بے اندازہ لرزتے ہوئے بھیانک احساس کا انکار کرنے یا اس کو دبا دینے کی جرأت تھی اور نہ کسی نے اس کی کوشش ہی کی۔ ل.... بے ہوش ہو گیا۔ مرد و عورت دونوں نرس کمرے سے بھاگ نکلے اور کسی صورت سے واپسی پر رضا مند نہ ہوئے۔ خود اپنی حالت کا قابلِ فہم بیان کرنے کی میں کوشش ہی نہیں کروں گا۔ ایک لفظ بھی بولے بغیر ہم تقریباً ایک گھنٹے تک ل.... کو ہوش میں

لانے کی کوشش کرتے رہے جب اس کی حالت سنبھلی تو ہم پھر مریض کی طرف متوجہ ہوئے۔

موسیو والد مار کی پچھلی حالت میں کوئی تغیر نہ ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ ہونٹوں کے سامنے آئینہ رکھنے پر بھی اب سانس کا نشان نہ ملتا تھا۔ بازو میں سوئی چبھونے پر خون بھی نہ نکلا۔ ان کا ہاتھ اب میری قوتِ ارادی کا تابع بھی نہ رہ گیا تھا۔ ان کے منوم ہونے کا اب صرف یہی ایک ثبوت باقی رہ گیا تھا کہ میرے سوالات پر ان کی زبان میں وہی تشنج پیدا ہونے لگتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جواب دینے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن ارادہ کی قوت مضمحل اور پژمردہ ہے۔ اگرچہ میں نے اپنے ساتھیوں اور ان کے درمیان تنویمی ارتباط قائم کرنا چاہا لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور میرے علاوہ کسی کے سوالات سے ان کی زبان پر یہ ردِعمل رونما نہ ہوتا تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ موسیو والد مار کی ذہنی اور جسمانی خواب بیداری کی پوری تفصیل میں نے بیان کر دی ہے۔ دوسری نرسوں کا انتظام کر کے ہم سب دس بجے دن کو موسیو والد مار کے گھر سے چلے آئے۔

سہ پہر کو جب ہم پھر ان کو دیکھنے گئے تو ان کی حالت بالکل پہلے ہی کی طرح تھی۔ اب ہم نے اس بات پر غور کیا کہ آیا ایسی حالت میں ان کو عالمِ خواب سے باہر لانا مناسب اور ممکن ہے یا نہیں۔ لیکن اس نتیجہ پر پہنچنے میں ہمیں کوئی مشکل نہ ہوئی کہ انھیں تنویم سے باہر نکالنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ بات روشن ہو چکی تھی کہ عملِ تنویم نے موت کو انھیں اپنی گرفت میں لینے سے روک دیا تھا اور ان کو جگانے کا مطلب ان کے جسم کو اگر فوراً ہی نہیں تو تیزی سے نیست و نابود کر دینا ہوگا۔

اُس وقت سے لے کر پچھلے ہفتہ تک.... تقریباً سات مہینے متواتر۔ میں روزانہ ڈاکٹروں اور دوسرے دوستوں کی معیت میں موسیو والد مار کا معائنہ کرنے آتا رہا، اور ان کی حالت میں سرِ مو فرق بھی نہ آیا، نرسیں بدستور مستقل موجود رہیں۔

آخر کار پچھلے جمعہ کو ہم نے انھیں جگانے یا جگانے کی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فیصلہ کے جو نتائج برآمد ہوئے انھیں نے غالباً سوسائٹی میں اس قدر بحث و مباحثہ اور غیر ضروری نکتہ چینی کو راہ دی ہے۔

موسیو والد مار کو جگانے کے لیے میں نے عملِ تنویم کے معمولہ اشاروں سے کام لیا، شروع شروع میں کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ آنکھ کی پتلیاں جو اب تک غائب تھیں نیچے آنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ

آنکھوں کے پپوٹوں کے نیچے سے ایک زردی مائل غلیظ اور انتہائی بدبودار مادہ بہہ نکلا۔ ڈاکٹروں نے یہ تجویز پیش کی کہ میں مریض کے داہنے ہاتھ کو متحرک کرنے کی کوشش کروں۔ میں اس کوشش میں ناکام رہا۔ اب ڈاکٹر ف..... کے کہنے پر میں نے مریض سے یہ سوال کیا۔

''موسیو والدمار! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت آپ کے احساسات وخواہشات کی کیا نوعیت ہے؟''

میرے اتنا کہتے ہی ان کے گالوں پر سرخ دھبے واپس آگئے اور اگرچہ جبڑے اور ہونٹوں کی سختی پہلے کی طرح باقی تھی، لیکن سیاہ زبان زور سے متحرک ہو کر منھ کے باہر ڈھلک آئی، اور پھر اسی پہلے کی سی کریہہ آواز میں ان کے منھ سے نکلا۔

''خدا کے لیے جلدی کرو جلدی کرو! مجھے سلا دو..... یا نہیں نہیں..... مجھے جگا دو.....تم دیکھتے نہیں، میں مر چکا ہوں!'' میں بالکل گھبرا گیا تھا اور ایک لمحہ کے لیے فیصلہ نہ کر سکا کہ کیا کروں۔ پہلے میں نے مریض کو پھر سلانا چاہا، لیکن اس میں ناکام رہ کر میں نے اسے جگانے کی پوری کوشش کی۔ اس کوشش کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ہم سب کو یہ امید ہونے لگی کہ موسیو والدمار اب جاگ اٹھیں گے۔

لیکن جو ہوا اس کے لیے ہم میں سے کوئی تیار نہ تھا۔ شاید کوئی بھی متنفس ایسے نتیجہ کی توقع نہ کر سکتا ہوگا۔

میرے تنویمی اشاروں کے ساتھ ساتھ ''مر گیا ہوں، میں مر گیا ہوں۔'' کی صدائیں مریض کے ہونٹوں سے نہیں بلکہ اس کی زبان سے پھٹ پڑ رہی تھیں، اور ایک لمحہ میں میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم سکڑ کر پارہ پارہ ہو کر میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ہم سب نے دیکھا کہ بستر پر ایک انسان کی لاش کے بجائے ایک انتہائی متعفن گاڑھا اور چپچپا رقیق پھیلا ہوا تھا۔

اس کی تصویر

ای ایف بنسن

ای ایف بنسن کا یہ افسانہ اپنی شدت تاثر واقعیت کے انوکھے پن اور خاص کر اپنی المیہ ناگزیریت (Tragic inevitability) کی بنا پر دنیا کے بہترین بھیانک افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ افسانے کی ہیروئن جس طرح آزادی حاصل کرتے کرتے کھو دیتی ہے وہ بجائے خود ایک المیہ ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو افسانے کا اختتام اس کے علاوہ کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔ (مترجم)

جون کی گرم سہ پہر کو کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھی ہسٹر وارڈ اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صبح سے اس کا دل کسی بے نام خوف سے بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے زندگی کی ان تمام خوشیوں کا خیال کیا جو اس کے حصے میں آئی تھیں۔ جوانی، حُسن، دولت، تندرستی، پیارا شوہر اور عزیز بچے جو خود بھی اس پر دل و جان سے نثار تھے۔ اگر کوئی بزرگ یا درویش اس سے کہتا کہ ''مانگ! کیا مانگتی ہے؟'' تو شاید وہ کچھ بھی جواب نہ دے پاتی کیوں کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی اہم کمی نہ تھی جسے وہ اس موقع پر پوری کر لینے کی تمنا کرتی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے ان خوشیوں کا احساس اور اعتراف نہیں تھا۔ اسے اپنی خوش نصیبی کا پورا علم تھا اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کو بھی، جن کی بدولت اسے یہ سکھ نصیب تھے، اپنی مسرتوں میں برابر کا شریک مانتی اور جانتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود گھٹن اور بے کیفی کے یہ بادل کیسے تھے؟

وہ دیر سے اپنے ذہنی صورتِ حال پر غور کر رہی تھی کیونکہ وہ اس تکدر اور آنے والے خطرے کے

بے نام سے احساس کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ لندن کا موسم ادھر معمول سے زیادہ خراب تھا لیکن اگر موسم ہی اس ذہنی انقباض کا ذمہ دار تھا تو ایسا پہلے کبھی کیوں نہیں ہوا؟ شاید یہ ان حبس سے گھٹتے ہوئے دنوں کا مجموعی کرشمہ تھا؟ بات تو دل کو لگتی تھی، لیکن بہت نہیں۔ کیونکہ گرمی کا موسم اسے بہت ہی پسند تھا۔ اس کا شوہر ڈک جسے گرمی سے سخت چڑ تھی اسے آگ کا کیڑا کہا کرتا تھا۔

اس نے کرسی پر اپنی جگہ ذرا بدلی۔ کیونکہ جس تصور کا اب وہ سامنا کرنے والی تھی اس کے مقابلے کے لیے تھوڑی ہمت درکار تھی۔ صبح سے ہی اسے معلوم تھا کہ وہ کس کا خوف تھا جو اس کے دل پر سے ہٹائے نہ ہٹتا تھا اور اب جب وہ ہر طرح اپنے دل کو بہلانے اور اصل وجہ سے منہ چھپانے اور آنکھ چرانے میں ناکام ہو چکی تھی تو اسے ماننا پڑا کہ وہ جس کا بوجھل گراں بار سایہ اس کو اپنی مٹھی میں بے رحمی سے مسل رہا تھا ایک بالکل ہی معمولی سی بات تھی۔ اتنی چھوٹی کہ اسے حماقت یا واہمہ کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس سے زیادہ بے وقوفی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس نے سوچا سچی بات یہ ہے کہ میرا خوف بالکل بچگانہ اور بے معنی ہے اگر میں اس بات کو پوری طرح دیکھ سمجھ لوں تو یہ ڈر خود بہ خود دور ہو جائے گا۔

بے خوفی کے اس ارادہ کے باوجود اس نے اپنی مٹھیاں یوں بھینچ لیں جیسے خود کو کسی انتہائی مشکل کام کے لیے آمادہ کر رہی ہو۔

اس نے پچھلی رات ایک خواب دیکھا تھا۔ وہی خواب جو وہ بچپن میں بار بار دیکھا کرتی تھی، بہ ذاتِ خود خواب کچھ بھی نہ تھا، لیکن اگلی رات کو وہ پھر ایک خواب دیکھتی تھی جو پچھلی شب کے خواب کا انتہائی بھیانک اختتام یا اس کا دوسرا حصہ ہوتا تھا۔ وہ اس ہولناک خواب سے چونک کر چیختی ہوئی اور بے اندازہ خوف کے شکنجوں میں جکڑی ہوئی پسینے سے تر جاگ اٹھا کرتی تھی۔ پچھلے دس سال سے اس نے یہ خواب نہیں دیکھے تھے اور وہ کہا کرتی تھی کہ اب اس خوفناک کابوس کے نقش بھی مدھم پڑ گئے ہیں۔ لیکن گزشتہ رات اس نے پھر وہ پہلا خواب دیکھا تھا جسے وہ دوسری رات کو اس کے سینے پر مسلط ہونے والے کابوس کی تمہید سمجھتی تھی اور اب لرزتی ہوئی خوفزدہ یادوں کے خزانے کھل گئے تھے جن میں بچپن کی سہانی یادوں سے بھی زیادہ شدید اور واضح ان خوابوں کی تاریک اور شیطانی یادیں تھیں۔

ابتدائی خواب بہ ذاتِ خود سادہ اور بے ضرر ہی تھا۔ وہ خود کو نرم گھاس سے ڈھکی ہوئی ایک اونچی پہاڑی پر دیکھتی تھی۔ کوئی بیس گز دور بائیں طرف پہاڑی کا کنارہ تھا جو تیزی سے ڈھلتا ہوا سمندر پر ختم ہوتا تھا۔ جس

راہ سے گزر کر وہ پہاڑی پر پہنچتی تھی وہ دونوں طرف سبزہ زار کھیتیوں سے ڈھکا ہوا اور بتدریج بلند تر ہوتا چلا جاتا تھا۔ گھلتی ہوئی شفق کے سیاہ سرخ رنگوں کی ہلکی روشنی میں وہ راہوں پر بھیڑیں چرتی ہوئی دیکھتی لیکن اسے کبھی کوئی آدمی نظر نہ آتا۔ وہ تیزی سے اپنے قدم بڑھاتی چلتی جیسے کوئی اس کا انتظار کر رہا ہو اور اسے دیر ہو گئی ہو، اور انتظار کرنے والے کو اس کی راہوں میں کھڑے سالہا سال گزر چکے ہوں۔ جب وہ آخری چڑھائی چڑھ رہی ہوتی تو اس کو خشک درختوں کا ایک جھنڈ نظر آتا۔ سمندر سے آنے والی تیز ہواؤں کے جھکولوں کی چوٹ سہتے سہتے درختوں کی شاخیں اور تنے عجیب و غریب شکلوں میں ٹیڑھے میڑھے بنے ہوتے۔ ان درختوں کو دیکھتے ہی اسے احساس ہوتا کہ وہ بے نام انتظار کرنے والا کہیں قریب ہی ہے، اور وہ اپنی منزل پر پہنچ گئی ہے.... وہ جو نہ جانے کب سے اس کا منتظر تھا۔

درختوں کے بیچ میں سرنگ کی طرح بنی ہوئی ایک پگڈنڈی سے ہوتی ہوئی وہ ایک سنسان گرجا گھر کے پاس پہنچتی جس کا سیاہی مائل بلند مینار سیدھی انگلی کی طرح کھڑا آسمان کی طرف دیکھتا معلوم ہوتا۔ گرجا گھر کے چاروں طرف ایک قبرستان تھا جو بہ ظاہر برسوں سے ویران پڑا تھا اور کلیسا کی عمارت وقت کے ہاتھوں منہدم ہو رہی تھی۔ اس کی کھڑکیاں بے خواب آنکھوں کی طرح کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ دیواروں کو چھپائے ہوئے تھے۔

یہاں پہنچ کر آغاز یہ ہمیشہ ختم ہو جاتا۔ خواب سے جاگ کر وہ پریشان اور بے چین سی ہو جاتی کیونکہ شام کے دھندلے اور برسوں سے منتظر اس بے نام ہستی کا احساس کچھ ڈراؤنا سا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ خواب میں کچھ نہ تھا۔ بچپن میں اس نے بار بار یہ خواب دیکھا تھا اور ہر بار آنے والے ہولناک خواب کا غیر شعوری احساس شاید اسے پہلے ہی سے بوجھل رکھتا تھا اور اب یہ تمہیدی خواب اسے پھر دکھائی دیا تھا۔ ہر طرح سے پرانے خوابوں کی طرح، لیکن ایک اہم تبدیلی کے ساتھ۔ دس برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد اسے کچھ ایسا لگا تھا جیسے پہاڑی کا کنارہ اب سرمئی مینار کے اور بھی نزدیک آ گیا ہو، اور بیس گز کے بجائے دو ہی تین گز رہ گیا ہو اور گرجا کی عمارت صرف ایک ٹوٹی پھوٹی محراب کو چھوڑ کر پوری طرح منہدم ہو چکی تھی....

ہسٹر کو معلوم تھا کہ اس کے مبہم خوف کا سرچشمہ یہی خواب اور صرف یہی خواب تھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دوسرا حصہ اس ہسٹریائی اور چیختے ہوئے خوف کا حامل ہوتا تھا۔ سمجھ دار انسانوں کی طرح وہ اب خواب کے دوسرے حصہ کو اپنے ذہن سے بالکل نوچ کر نکال دینے یا اسے پوری طرح دبا دینے کی کوشش

کررہی تھی۔ کیونکہ ذہن کا بار بار ادھر منتقل ہونا ہی شاید دوسرے خواب کو بلانے کے لیے کافی ہوتا۔ وہ جانتی تھی کہ دوسرا خواب بدہضمی کے کابوس کی طرح کوئی الجھی ہوئی بے معنی سی وحشت نہیں تھی، بلکہ اس کا تعلق اس بے نام شخص سے تھا جو برسوں سے سنسان پہاڑی پر اس کا منتظر تھا۔

اس نے اپنے دل میں پکا ارادہ کیا کہ وہ دوسرے خواب کا خیال بھی ذہن میں نہ لائے گی۔ دروازے میں ڈک کی آہٹ نے اس ارادہ کو اور بھی مصمم کردیا۔ وہ دروازہ کھولنے کے لیے اٹھی۔ کتنا مضبوط، لمبا چوڑا اور ہول ناک خوابوں سے کس قدر مختلف اور کتنا دور تھا وہ!

''اُف یہ گرمی! یہ تباہی ہے۔ ویرانوں کی لعنت ہے یہ کم بخت!'' وہ تولیا سے اپنا چہرہ رگڑتا ہوا بولا۔ ''ہم لوگوں نے کیا گناہ کیا ہے جو اس کڑاہی میں پھینک دیے گئے ہیں؟ ہسٹر! آؤ ہم لوگ قدرت کی کوششوں کا منہ چڑانے کے لیے ہیمپٹن کورٹ میں ڈنر کھائیں گے۔'' اس نے نیم ڈرامائی مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''آہستہ! آہستہ! کہیں اوپر والا سن نہ لے!''

وہ ہنسی۔ تجویز ہر طرح سے مناسب تھی۔ کچھ منظر بھی بدل جائے گا اور واپسی بھی دیر سے ہوگی۔ باہر کا کھانا عمدہ ہی ہوگا اور شاید اسے نیند بھی گہری آجائے۔

''بالکل ٹھیک! اوپر والے نے ہماری بات نہ سنی ہوگی۔ چلو ابھی نکل چلیں۔'' وہ بولی۔

''قطعی۔ کوئی خط تو نہیں ہے میرا؟'' وہ اس میز کی طرف چلتا ہوا بولا جہاں تازہ ڈاک سے آئے ہوئے بہت سے لفافے پڑے تھے ''ہوں! رسیدیں، بل ادا کرنے کی حماقت کی یاددہانی۔ کسی ادارے کا گشتی خط ''محترمہ، محترمی.... کیا بدتمیزی ہے، یہ بھی معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ مکتوب الیہ عورت ہے یا مرد اور چلے ہیں چندہ مانگنے۔ والٹن گیلری میں تصویروں کی پرائیویٹ نمائش کا دعوت نامہ.... میں تو نہ جاسکوں گا، ہسٹر تم چاہو تو ایک نظر ڈال لینا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وان ڈائک کے کچھ شاہ کار بھی ہیں۔ بس.... چلو بھاگ چلیں۔''

ہسٹر نے شام ہنسی خوشی گزاری۔ اسے بار بار خیال آیا کہ ڈک کو اپنا خواب بتا دے تا کہ اس کی بے وقوفی سن کر وہ زور سے قہقہہ لگا کر ہنسے، کیونکہ اس کی صحت مند ہنسی سے بڑھ کر ان خوف کے سایوں کا کوئی علاج نہ تھا۔ لیکن اپنی ذہنی بے چینی کی توجیہہ کرنے کے لیے اسے یہ بھی بتانا پڑتا کہ وہ یہ خواب کئی بار دیکھ چکی تھی.... اور پھر اس کے بعد والا خواب بھی.... لیکن وہ اس خواب کے بارے میں کچھ سوچنے یا اس کا تذکرہ

کرنے پر تیار تھی۔ ڈک کی غیر معمولی ذہنی صحت مندی میں خود کو غرق کر لینا اور اس کی محبت کی چادر میں خود کو لپیٹ لینا اس سے بدرجہا بہتر تھا۔

انھوں نے کھلی ہوا کے دریا کے کنارے ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ ٹھنڈی، تازہ ہوا اور ڈک کی قوت بخشنے والی باتوں کی دوستانہ فضا میں سانس لے کر جب آدھی رات کے قریب وہ گھر لوٹی تو اسے خود اپنی اس ذہنی کیفیت پر حیرت ہو رہی تھی جس نے صبح سے اس کو بے کیف کر رکھا تھا۔ اس کو ایسا لگا جیسے اس نے جہاز میں غرقابی کا خواب دیکھا ہو اور جاگ کر خود کو کسی محفوظ باغ کی کھلی ہوا میں پایا ہو جہاں طوفانوں کی شورش تھی اور نہ قاتل لہروں کا شور وغل.... لیکن پھر بھی یہ دور، بہت دور گرجتی ہوئی لہروں اور کف لانے والے بھنوروں کا یہ شور کیسا تھا؟

ڈک پاس والے کمرے میں سوتا تھا جس کا دروازہ ہسٹر کے کمرے میں کھلتا تھا۔ روشنی گل کرتے ہی اسے نیند آگئی، اگرچہ ڈک ابھی جاگ ہی رہا تھا اور فوراً ہی اس کا خواب شروع ہو گیا۔

وہ سمندر کے کنارے کھڑی تھی۔ لہروں میں جزر آچکا تھا کیونکہ رات میں حل ہوئے دھندلکے کی نیم روشنی میں دور تک ریت چمک رہی تھی۔ پہلے کبھی نہ دیکھنے کے باوجود یہ جگہ اس کو بھیانک حد تک مانوس لگ رہی تھی۔ ٹھیک کنارے کے سرے پر بالو کی ایک اونچی سی پہاڑی تھی جس پر ایک سرمئی مینار ٹکا ہوا تھا۔ سمندر کی لہروں نے گرجا کی عمارت کو گھن کی طرح کھا لیا ہوگا کیونکہ پہاڑی کے دامن میں اس کے چاروں طرف مسالے سے جڑے ہوئے بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ بہت سے کتبۂ مزار بھی آسمان کو پس منظر میں لیے سفید جھلک رہے تھے۔ کلیسا کے مینار کے داہنی طرف خشک درختوں کا ایک جھنڈ تھا جن کی شاخوں میں سمندری ہوا ہر وقت کنگھی کرتی رہتی تھی۔ اس کو معلوم تھا کہ پہاڑی کی چوٹی کی طرف ایک قدم آگے سے ایک راستہ درختوں اور سبزہ زاروں سے ہو کر ادھر نکلتا تھا۔ یہ سارا منظر ایک ہی نظر میں اس نے دیکھ لیا اور پھر اس دل توڑ دینے والے خوف کی منتظر رہی، جواب خود کو ظاہر کرنے والا تھا۔ اس کو خود بخود معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کیا شے ہے، اور جیسے کہ بارہا پہلے ہو چکا تھا، اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن کابوس کا فالج اس پر پڑ چکا تھا، اور مجنون کی طرح کوشش کرنے کے باوجود اس کے قدم ریت پر ایک انچ بھی نہ ہل سکے۔ گھبرا گھبرا کر اس نے اپنی نظر پہاڑی کی چوٹی پر سے ہٹانے کی کوشش کی جہاں وہ بھیانک ہستی خود کو ظاہر کرنے والی تھی۔

وہ ظاہر ہونے لگی۔ ایک نیم تاریک زردی روشنی، کسی انسان کے چہرے کی طرح بیضاوی اور ٹھیک ہسٹر

کے سامنے، اس کی آنکھوں کی سطح کے بالکل برابر اور متوازی، خط و خال آہستہ آہستہ ابھرنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے سرخ بال نیچے ماتھے تک اُگتے ہوئے، دو بھوری آنکھیں بہت ہی پاس پاس جو بلا جھپکے اس کو دیکھ رہی تھیں، سر کے دونوں طرف کان کافی بڑے بڑے اور چوڑے، جیسے سر سے آگے نکلے ہوئے ہوں، اور جبڑے کے خطوط چھوٹی سی نوکیلی ٹھوڑی میں آکر مل گئے تھے اور سب سے آخر میں رخسار اور دہانہ کی شکل اور بناوٹ نمودار ہوئی اور دہانہ ہی اس بھیانک ہول کا اعلیٰ ترین درجہ تھا۔ ایک طرف نرم اور حسین، جس پر مسکراہٹ لرز رہی تھی اور دوسری طرف بھونڈا۔ لوتھڑے کی طرح سمٹا ہوا اور ٹیڑھا، جس پر استہزا اور نفسانیت سے بھرا ہوا خبیث تبسم تھا۔

پورا چہرہ، پہلے دھندلاہٹ لیے ہوئے اور بالآخر واضح خطوط میں نمودار ہوا۔ کوئی جوان آدمی تھا، زردی مائل اور کچھ دبلا۔ اور پھر نچلا ہونٹ کچھ گر کر کھل سا گیا، دانت جھلکے اور اس نے اسے بولتے ہوئے سنا: ''میں اب بہت جلد تجھے لینے آؤں گا....'' ان الفاظ کے ساتھ چہرہ اس کے کچھ اور قریب آگیا اور اس کی مسکراہٹ کچھ اور پھیل گئی۔ اس کے ساتھ ہی کابوس کے طوفان کا پورا جھونکا اس کی شخصیت پر چھا گیا۔ اس نے پھر بھاگنے اور چیخنے کی ناکام کوشش کی۔ اب وہ اس خوفناک چہرے کی سانس اپنے منہ پر محسوس کر رہی تھی....اور پھر روح اور جسم کے پارہ پارہ ہو کر الگ ہو جانے کی طرح کے روحانی دھماکے کے ساتھ اس نے خود اپنے چیخنے کی آواز سنی۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں اپنی روشنی تھی اور ڈک دروازے سے جھپٹتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ ابھی اس نے اپنے کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔

''کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔ ''ہسٹر! کیا بات ہے، بولو۔''

''وہ پھر آیا تھا....'' وہ روتی ہوئی چیخی، وہ کہہ رہا تھا میں بہت جلد تجھے لینے آؤں گا۔ ڈک اسے میرے پاس مت آنے دو۔''

ایک لمحے کے لیے اس کے خوف کا چھوت اسے بھی لگ گیا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے اس نے خالی کمرے کو دیکھا اور کہا: ''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

اس نے اس کے سینے پر سے اپنا سر اٹھایا ''نہیں میں نے خواب دیکھا تھا۔ پرانا والا خواب۔ مگر تم نے کپڑے نہیں بدلے، کیا وقت ہوا ہے؟''

''ابھی تو مشکل سے دس منٹ ہوئے تم سوئی ہو۔ جیسے ہی تم لیٹیں میں نے تم کو چیختے ہوئے سنا۔''

کتنا ڈراؤنا خواب تھا!'' وہ کانپنے لگی۔ ''وہ پھر آئے گا....''

وہ اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ''بتاؤ۔ مجھے بتاؤ۔ تم نے کیا خواب دیکھا؟''

''نہیں، نہیں'' وہ سر ہلا کر بولی۔ ''اس کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں، نہیں تو خواب اور بھی ڈراؤنا ہو جائے گا۔ بچے تو ٹھیک ہیں؟''

''ہاں ہاں۔ میں نے ابھی کمرے میں جھانک کر دیکھا ہے۔''

''خدا کا شکر ہے۔ میں بھی اب ٹھیک ہوں۔ ڈک بتاؤ خواب کی کوئی حقیقت تو نہیں ہوتی؟ کیا خواب سچے بھی ہوتے ہیں؟''

ڈک کو خوابوں کی حقیقت کا کوئی وہم نہیں تھا۔ اس کی تشفی بخش باتوں نے ہسٹر کو بہت سکون دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ آرام سے سو گئی۔

ڈک کے دفتر چلے جانے کے بعد ہسٹر نے خود کو خوب برا بھلا کہا۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا کہ وہ اپنے ہی پیدا کردہ خوف کے جال میں اسیر تھی۔ کتنی ہی بار وہ منحوس چہرہ اسے خواب میں دکھائی دیا تھا اور اب تک بھلا اس کا کیا نتیجہ نکلا تھا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہ بلا وجہ ڈری جا رہی تھی۔ وہ ہر طرح محفوظ اور مامون تھی اور اگر بچپن کا ایک خواب اس نے پھر دیکھ بھی لیا تھا تو کیا ہوا، نہ اُس وقت اس کے کچھ معنی تھے اور نہ آج۔ بچپن کے اور سب ڈراؤنے خواب اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر مٹ گئے تھے....اور تب بلا ارادہ وہ پھر اس خواب کو دل ہی دل میں دیکھنے لگی۔ اس کو یاد آیا کہ پہلے وہ چہرہ اس سے کہا کرتا تھا: ''میں تجھے لینے آؤں گا.... جب تو بڑی ہو جائے گی۔'' اور پچھلی رات اس نے کہا تھا: ''میں اب بہت جلد تجھے لینے آؤں گا....'' اس کو یہ بھی یاد آیا کہ اب کے آغاز ہی میں سمندر کی لہروں کی تباہی گرجا کے دامن سے بڑھ کر گرجا کو ہی تباہ کر چکی تھی۔ دونوں تبدیلیاں اس کی موجودہ حالت سے پوری اور ہولناک حد تک ہم آہنگ تھیں۔ ایک طرف تو ماہ و سال نے گرجا کو اکھاڑ پھینکا تھا اور دوسری طرف وہ بھی لڑکی سے جوان ہو چکی تھی۔

خود کو برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ کیونکہ خواب کا تصور ہی اس کے بے حساب ہراس اور مجنونانہ خوف کو تازہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بجائے کہ خواب کو یاد کر کے وہ خوف کے بے رحم پنجہ کو اپنے دل

پر محسوس کرتی رہے اور اپنے دل کے ٹکڑے کھلا کھلا کر کابوس کو موٹا کرے، اس کے بارے میں کچھ نہ سوچ کر وہ اسے بھوکا مارنا بہتر سمجھتی تھی۔ اس نے گھر کے سارے کام کیے۔ بچوں کو پارک میں گھمانے لے گئی اور وقت کاٹنے کے لیے اس نے تصویروں کی نمائش دیکھنے کا فیصلہ کیا، نمائش کے بعد اس کا دن خاصی مصروفیت کا تھا، اور شام ہی کو اسے ڈک کے ساتھ سنیچر اور اتوار گزارنے کے لیے باہر دیہات جانا تھا۔ ڈک کے دیہاتی بنگلے کی کھلی ہوا میں صبح سے شام تک تفریح کرتے وہ اتنی تھک جاتی کہ رات کو خواب دیکھنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ خوابوں کا خناس اس طرح کے خوش گوار ماحول میں پنپ نہ پائے گا۔

نمائش لوگوں سے بھری ہوئی تھی، ان میں بہت سی جان پہچان کی عورتیں بھی تھیں اور تصویروں کے معائنہ کے ساتھ ساتھ ہنسی خوشی کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ دو تین عمدہ تصویریں، رے برن کی تھیں، ایک دو بوشوا رینالڈس کے بھی نمونے تھے، لیکن نمائش کے بہترین نمونے، ڈان ڈائک کی تین تصویریں، ایک الگ کمرے میں رکھی ہوئی تھیں اس نے فہرست میں دیکھا کہ پہلی تصویر سر راجر وائی برن کی پورٹریٹ تھی۔ باتوں کے دوران میں اس کی نگاہیں اٹھیں اور تصویر سے چار ہوئیں۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ رہا اور پھر بالکل رک سا گیا، ایک عجیب روح کی ذہنی بیماری کی سی اینٹھن اس کے جسم میں دوڑ گئی کیوں کہ یہ وہی تو تھا، وہ جو بہت جلد اسے لینے کے لیے آنے والا تھا.... وہی سرخ بال، کھڑے کھڑے کان، حریص آنکھیں پاس پاس جڑی ہوئی، منہ ایک طرف ہنستا ہوا سرخ و سفید اور دوسری طرف اینٹھا ہوا سا۔ جس پر وہی نفسانیت اور استہزا سے بھرپور خبیث تبسم تھا جیسے کہ یہ اس کا زندہ کابوس تھا نہ کہ اس شخص کی تصویر جس کی روح اور چہرہ کو عظیم مصور نے اس کامیابی سے اتار لیا تھا۔

''اوہ! کیسی بولتی ہوئی تصویر ہے! اور کتنا شیطان رہا ہوگا یہ شخص!'' اس کی ساتھی نے کہا۔ ''ہسٹر دیکھو، کتنی اعلیٰ درجہ کی پورٹریٹ ہے!'' اس نے بروقت خود کو سنبھالا۔ اس ذہن و دل پر چھا جانے اور یقیناً یہ راہ دیوانگی کی راہ تھی۔ اس نے زبردستی آنکھیں اٹھا کر پھر اسے دیکھا۔ وہی لالچ بھری نگاہیں اسے گھور رہی تھیں اور اس کو ایسا لگا جیسے تصویر کے ہونٹ ہلے ہوں۔ اس کے چاروں طرف دیکھنے والوں کی بھیڑ اور ہما ہمی تھی، لیکن اپنے تخیل میں وہ راجر وائی برن کے ساتھ تنہا تھی۔

لیکن.... اس نے خود کو سمجھانا چاہا۔ لیکن اگر راجر وائی برن کی تصویر وان ڈائک نے بنائی تھی تو یقیناً

اسے مرے ہوئے آج دو سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ ایک ایسا شخص جس کی ہڈیاں تک گل سڑ گئی ہوں گی، اب اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا؟ شاید اس نے یہ تصویر کبھی بچپن میں دیکھی تھی، لیکن اس کا خوفناک تاثر اس پر اسرار تحت الشعور میں باقی تھا جو انسان کی بیرونی زندگی کی سطح کے نیچے کسی زیر زمین دریا کی طرح مسلسل جاری و ساری رہتا ہے۔ نفسیات میں اس نے پڑھا تھا کہ اوائل عمر کے تاثرات دماغ میں چھپے ہوئے ناسور کی طرح زہر پھیلایا کرتے ہیں۔ شاید یہی چھپا ہوا ناسور جس پر بعد میں دوسری یادوں کے گہرے خطوط منقش ہو گئے تھے اس کے اس خوفناک خواب کا ذمہ دار ہو....؟

دیہات کے سنسان بنگلے میں اس رات اس نے ایک کے بعد ایک دونوں خواب دیکھے اور اپنے شوہر کے سینے سے لگی سسک سسک کر اس نے اسے پانی زندگی کا وہ ناسور کھول کر دکھایا جسے چھپائے رہنے کا مصمم ارادہ وہ صبح کر چکی تھی۔ خواب بیان کر دینے سے ہسٹر کو کچھ تشفی ہوئی، بات ہی کچھ اتنی اَن ہونی اور حد سے زیادہ ناقابلِ یقین تھی کہ ڈک کی مضبوط عقلیت نے اس کو بڑا سہارا دیا۔ لیکن جب لندن واپس ہونے پر پھر اسے وہی خواب آئے تو اس کی ہچکچاہٹ کی پروا کیے بغیر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

''تم سب کچھ اسے بتا دو۔ وعدہ کرو کہ سب کچھ بتا دوگی، ورنہ میں بتا دوں گا۔ میں تمھیں اس طرح گھلتے نہیں دیکھ سکتا، یہ ہے تو سب لغویات، لیکن ڈاکٹر ان لغویات کا علاج زیادہ بہتر کر سکتے ہیں۔''

اس نے اسے مڑ کر دیکھا۔ ''ڈک تم ڈر گئے ہو۔'' اس نے خاموشی سے کہا۔

وہ ہنسا.... ''ڈر نہیں گیا ہوں۔ لیکن مجھے تمھارا چیختے ہوئے جاگ پڑنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ رات کی میٹھی نیند کا مطلب میری نظروں میں یہ نہیں ہے۔ یہ لو ڈاکٹر کا مطب سامنے ہے۔''

ڈاکٹر کی رپورٹ مختصر اور صاف تھی۔ ہسٹر کے دل و دماغ بالکل درست تھے لیکن اس کی عام صحت کمزور تھی۔ رات کے ڈراؤنے خواب دراصل اسی عام کمزوری کی علامت تھے، نہ کہ اس کی وجہ، ڈاکٹر نے اسے کسی پُر فضا مقام پر آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ بہتر یہ ہوتا کہ وہ کسی ایسی جگہ چلی جائے جہاں وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی، مکمل تبدیلی، یہی اس کا علاج تھا اور ڈک اس کے ساتھ نہ جائے تو اور بھی اچھا ہو۔ مشرقی سمندر کا کنارہ سب سے اچھا ہوگا۔ دیر تک پیدل چلنا یا سمندر میں نہانا بند، لیکن ایک دو غوطے اور پھر ریتیلے کنارے پر آرام کرسی میں گہری نیند، کاہلی اور نیند لانے والے معمولات کیوں نہ آپ رشٹن چلی جائیں؟ میرا خیال ہے کہ رشٹن

آپ کے لیے پوری طرح مناسب ہوگا۔ ایک آدھ ہفتہ بعد ڈک اگر چاہے تو آپ کی خیریت معلوم کرنے چلا آئے گا۔ خوب سویے اور خوب تازہ ہوا میں سیر کیجیے۔ برے خوابوں کا ذکر ہی نہ کیجیے۔

ڈک کو ذرا تعجب ہوا، جب ہسٹر نے ڈاکٹر کا مشورہ فوراً مان لیا اور دوسری شام تک ہی وہ اسے رشٹن کے قدیمی ہوٹل میں چھوڑ آیا جہاں ابھی سیاحوں کی بھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ دن بھر وہ دھوپ میں سمندر کے کنارے بیٹھی رہتی اور اسے ایسا لگتا جیسے کسی بہت بڑی جدوجہد کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب اسے اپنے ڈر سے مائل پیکار رہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اسے ایک دھندلا سا احساس تھا کہ اب اس کی خشونت ختم ہو چکی ہے۔ کیا کسی طرح وہ اس خوف کی شکار ہو گئی تھی اور اس چہرے کا فرمان اس نے کسی طرح پورا کر دیا تھا؟ بہر صورت اس رات کا مہمان پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا اور وہ راتوں کو گہری نیند سوتی تھی۔ ہر صبح اسے ڈک کا خیریت کا خط مل جایا کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے ڈک اور بچے کسی بہت پرانی یاد کی طرح دور اور دھندلے معلوم ہوتے تھے اپنے اور ان کے بیچ میں شیشے کی ایک دیوار سی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن راجروائی برن کا چہرہ بھی جیسا ماہر مصور کے نقش میں یا خواب میں اسے نظر آیا تھا اب اس سے اتنا ہی دور تھا۔ جذبات کی اس ذہنی صلح نے نہ صرف اس کے ذہن کو تسلی اور امن و امان کے احساس سے سلا دیا تھا بلکہ اس کا جسم بھی اس دن رات کی بے حرکتی سے کچھ اکتا سا گیا تھا۔

رشٹن کا گاؤں سمندر سے حاصل کی گئی زمین کے ایک کنارے پر آباد تھا۔ شمال کی طرف ترائی کی کیچڑ جس میں اس وقت سمندری پھولوں کی زردی ایک چمک سی پیدا کر رہی تھی، حدنگاہ تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن جنوب کی طرف سے ایک پہاڑی کا اتار جو درختوں سے ڈھکا ہوا تھا گاؤں تک پھیلتا چلا آیا تھا۔ آہستہ آہستہ جب اس کی جسمانی طاقت واپس آنے لگی، اسے یہ خیال آنے لگا کہ اس پہاڑی کے پیچھے دیکھا جائے کہ ادھر کا منظر کیسا ہے اور ایک شام کو وہ ٹہلتی ہوئی سبزہ زار ڈھلوان تک گئی۔ سمندر کی ہوا جس نے گرمی کی تیزی کو گوارا بنا دیا تھا، اب ٹھہر گئی تھی جس سے موسم گرم اور حابس ہو گیا تھا۔ اسے خیال تھا کہ پہاڑی کی چوٹی پر ہوا کا غلبہ ہوگا۔ جنوبی اُفق پر سیاہ بادلوں کے پرے لگے تھے۔ لیکن ابھی بارش یا طوفان کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ چڑھائی آسانی سے چڑھ گئی اور چوٹی پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ ایک مسطح جنگلوں سے ڈھکے ہوئے اونچے خطے پر کھڑی تھی۔ پہاڑی کے کنارے سے ایک پگڈنڈی آگے کی طرف جا رہی تھی اور اس پر سے ہو کر اس نے خود کو زیادہ کھلی زمین میں پایا۔ پہاڑی کی چڑھائی کے ساتھ خالی کھیت بھی اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔

ادھر ادھر ایک آدھ بھیڑیں چر رہی تھیں لیکن آدمیوں کا نشان نہ تھا اور اپنے سامنے بمشکل میل بھر آگے اس نے ٹیڑھے میڑھے درختوں کا ایک جھنڈ دیکھا جن کی شاخیں ہوا کے زور سے تڑی مڑی جا رہی تھیں.... سب سے آگے چڑھائی کی چوٹی پر درختوں کے پیچھے سے کسی سرمئی مینار کی چوٹی جھانک رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے پرانے ہراس کی لہر ہسٹر کے جسم میں دوڑ گئی۔ منظر ہولناک حد تک مانوس تھا۔ لیکن فوراً ہی ہمت اور ارادے کی پختگی نے اسے سہارا دیا۔ آخرکار خواب کے آغازیہ کا منظر جیتا جاگتا اس کے سامنے تھا۔ اپنے خوف کی تہ تک پہنچنے اور اسے اکھاڑ پھینکنے کا اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس نے فوراً آگے بڑھنے کی ٹھان لی اور بادل سے گہنائے ہوئے آسمان کی انوکھی مدھم روشنی میں وہ تیزی سے انھیں کھیتوں اور درختوں کے جھنڈ سے گزرتی ہوئی آگے چلی جن سے خواب میں وہ صدہا بار گزر چکی تھی اور جن کے آگے وہ چہرہ اس کا انتظار کر رہا تھا.... خوف کی تیز گھنٹیوں کی آوازوں کو سنی اَن سنی کرتی ہوئی.... ان گھنٹیوں کو اب وہ ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے والی تھی.... وہ بلا جھجکے آگے بڑھتی رہی۔ درختوں کا جھنڈ اب کم گنجان تھا اور اس کے سامنے کلیسا کا مینار سر اٹھائے کھڑا تھا۔ سمندر کی گیر و دار سے کٹ کٹ کر پہاڑی گرجا کی بنیادیں تک تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ مینار اور پہاڑی کے کنارے کے درمیان اب صرف ایک شکستہ محراب تھی جو گھنی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اس سے آگے گزر کر اس نے نیچے جھانکا تو نیچے بالو پر لوحِ مزار کے پتھر اور مسالے سے جڑی اینٹیں بکھری ہوئی پائیں۔ مگر پہاڑی کی کگر پر رُکی ہوئی قبروں میں جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے۔ لیکن وہاں اور کوئی نہ تھا اور وہ قبرستان جو اس نے اتنی بار خواب میں دیکھا تھا اس کے پیچھے کھیتوں کی طرح ویران اور خاموش تھا۔

اس کا بجھا ہوا دل ایک عظیم الشان جذبۂ مسرت سے کھل اٹھا تھا۔ اسے اس کی ہمت اور استقامت کا پھل مل گیا تھا۔ ماضی کے خواب اور خوف بے معنی ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن اب رکنے کا موقع نہیں تھا، کیونکہ طوفان آیا ہی چاہتا تھا اور افق پر بجلی کی چمک کے بعد بادل زور سے گڑگڑائے تھے۔ جیسے ہی وہ واپس ہونے کے لیے مڑی، اس کی نظر ایک لوحِ مزار پر پڑی جو پہاڑی کے بالکل کنارے پر کسی طرح ٹکا ہوا تھا اور اس نے لوح پر لکھا ہوا دیکھا کہ سر راجر وائی برن کی لاش یہیں دفن تھی۔

خوف اور کابوس کے فالج نے اس کے قدم وہیں پر تھام لیے۔ کائی جمے ہوئے حروف کو وہ دیر تک خوف

اور تحیر سے دیکھتی رہی اسے ہر لحظہ یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ ظالم چہرہ اپنی آخری آرام گاہ سے اب نمودار ہونے والا ہے۔ پھر جس خوف نے اس کے پاؤں جکڑ رکھے تھے اس کے تیز کچوکے کے زیر اثر وہ اڑتے ہوئے قدموں سے درختوں کے جھنڈ اور کھیتوں سے گزرتی ہوئی پہاڑی کے دوسرے سرے تک آ رہی۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا کہ اس کے پیچھے کیا ہے۔ کھیتوں میں اب بھی انسان کا نام ونشان نہ تھا، لیکن آنے والے طوفان سے سہمی ہوئی بھیڑیں جھاڑیوں کی پناہ میں گھس رہی تھیں۔

پہلے پہل اس کو گاؤں سے بھاگ نکلنے کا خیال آیا۔ لیکن لندن کو جانے والی آخری گاڑی نکل چکی تھی۔ پھر فرار سے بھی کیا فائدہ اگر وہ دو سو برس پہلے مرے ہوئے ایک آدمی کی رُوح اُس کے تعاقب میں تھی جو اس قبر سے دور بھاگنے میں امن نہیں تھا، امن اسے خود اپنے اندر ڈھونڈھنا تھا۔ لیکن اس کا دل ڈک کے محفظ اور خود اعتماد موجودگی کے لیے تڑپ رہا تھا۔ کل تو اسے آنا ہی تھا، لیکن ابھی کل اور آج کے بیچ میں رات کے طویل تاریک لمحات تھے۔ خدا جانے آنے والی رات کیا کیا گل کھلائے؟ اگر ڈک آج شام کو چل کھڑا ہوتو کار کے ذریعہ وہ دس بجے رات تک یہاں پہنچ سکتا ہے، اس نے یہ سوچ کر ڈک کو ایک ایکسپریس تار بھیج دیا: ''فوراً چلے آؤ۔''

جنوب میں جھکنے والا طوفان اب پوری قوت سے دیہات کی ہوا پر کوڑے برسا رہا تھا۔ ڈاک خانے سے ہوٹل واپس آتے آتے کچھ موٹی موٹی بوندیں گریں۔ تھوڑی ہی دیر میں آنے والی بارش کی گرج سنائی دی اور پھر آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔

بارش کے ساتھ ساتھ بجلی کی آگ بھی بھڑکتی رہی۔ آسمان میں طوفانِ رعد برپا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کی گلیاں جل تھل ہو گئیں۔ تاریک ہوتے ہوئے کمرے میں بیٹھی اس کے چشم تصور کے سامنے راجروائی برن کے لڑکھڑاتے ہوئے لوحِ مزار کے علاوہ اور کوئی تصویر نہ تھی اس کے کانوں میں پھسلتی ہوئی ریت کی سرگوشیوں کی آواز آتی رہی۔ طوفان کی ماری ہوئی ریت جو اس مردہ مزار اور اس کے اندر مقید ہستی کو ہمیشہ کے لیے سمندر میں غرق کر دیتی۔

آٹھ بجتے بجتے طوفان تھمنے لگا۔ کھانے کے وقت اسے ڈک کا تار ملا کہ وہ چل پڑا ہے اور راستے ہی سے یہ تار بھیج رہا ہے۔ اگر سب خیریت رہی تو ساڑھے دس تک وہ اس کے پاس ہوگا۔ کسی نہ کسی طرح وہ اس کے اور اس بھیانک چہرے کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہ اسے یقین تھا۔ کتنی انوکھی بات تھی کہ

ایک ہی دو دن پہلے ڈک کی یاد اور اس خوف کے نقوش اس کے ذہن میں دھندلے اور دور معلوم ہونے لگے تھے، اور اس لمحہ دونوں انتہائی شدت سے اجاگر تھے۔ وہ ڈک کے انتظار کی گھڑیاں گنتی رہی اور جب بارش بالکل رک گئی تو اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے چمپئی رنگ کے چاند کو آسمان پر ابھرتے دیکھا۔ چاند کے وسط آسمان پر پہنچنے اور گھڑی کے مطابق دو گھنٹے گزرنے سے پہلے ہی ڈک اس کے پاس ہوگا، اس نے سوچا۔

ٹھیک دس بجے تھے جب ہوٹل کے لڑکے نے دروازہ کھٹ کھٹا کر اس سے کہا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ اس کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا کیونکہ اس کے حساب کے مطابق ابھی ڈک کے آنے میں آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی نیچے تک آئی۔ باہر سیڑھیوں پر کوئی شخص کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف مڑا ہوا تھا۔ شاید وہ اپنے ڈرائیور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ سفید چاندنی کے پس منظر کی وجہ سے اس کے بال گیس کی روشنی میں سرخی مائل جھلک رہے تھے۔

''تم آگئے ڈک! کتنی جلد پہنچ گئے! آگئے تم نے کتنا اچھا کیا؟'' جیسے ہی اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا وہ اس کی طرف مڑا اور اس کے سامنے ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جس کی آنکھیں پاس پاس جڑی ہوئی تھیں، جس کا منہ ایک طرف نرم و نازک تھا اور دوسری طرف اینٹھا ہوا اور ٹیڑھا، جس پر نفسانیت اور استہزا سے بھرا ہوا خبیث تبسم تھا....

کابوس اس پر سوار تھا۔ وہ نہ بھاگ سکی اور نہ کسی کو پکار سکی۔ اس کے گھسٹتے ہوئے قدموں کو سہارا دیتا ہوا وہ اس کے ساتھ بھیگی ہوئی تاریک رات میں گم ہو گیا۔

جب آدھ گھنٹہ بعد ڈک پہنچا تو اس کو یہ معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ اس کی بیوی کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو اسے لینے آیا تھا، اگرچہ وہ گاؤں میں اجنبی لگتا تھا کیونکہ ہوٹل کے لڑکے نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حیرت گھبراہٹ میں بدل گئی۔ ہوٹل کے باہر تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک دو آدمیوں نے ہسٹر کو کسی آدمی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھر کے کپڑے پہنے ہوئے پہاڑی پر چڑھتے دیکھا تھا۔ آدمی اجنبی تھا لیکن گواہوں میں سے ایک اس کا حلیہ بیان کر سکا تھا۔

لالٹین اور کئی آدمی ساتھ لے کر ڈک ہسٹر کی تلاش میں پہاڑی کی طرف نکلا۔ دودھیا چاندنی میں انھیں

آدمی کے چہرے کے نقوش ہر قسم کے تاثر سے عاری ہیں، لیکن ان میں تناؤ کی سی کیفیت ہے، جیسے وہ کسی اچانک وقوعہ کا منتظر یا کسی اچانک وقوعہ کے پیش آنے کے تصور سے خوف زدہ ہو یا جیسے وہ ایک آخری نظر ڈال کر منظر کے مکمل بے حس و حرکت ہو جانے کا تماشہ دیکھ رہا ہو۔ اگر چہ وہ اس طرح سے مڑ کر دیکھ رہا ہے، لیکن اس کا جسم اب بھی آگے کی طرف جھکا ہوا ہے، گویا وہ اوپر ہی چڑھ رہا ہو۔ اس کا داہنا ہاتھ، جو عبا کو نہیں تھامے ہوئے ہے، بائیں طرف کو آدھا بڑھا ہوا ہے، اس نقطہ کی طرف جہاں زینے کا ڈنڈا ہوتا۔ ایک مداخلت زدہ، ادھورا اشارہ، تقریباً ناقابلِ فہم، یا کم سے کم اس وقت تک ناقابلِ فہم کہ جب تک اس کو کسی ایسے سہارے کو پکڑنے کی کوشش سے نہ تعبیر کیا جائے جو موجود نہیں ہے۔

اور اس کی گھورتی ہوئی آنکھ کا نشانہ؟ کوئی شبہ نہیں کہ اس کا نشانہ قربان شدہ شکار کا جسم ہے جو گدوں پر کھلا پڑا ہے جس کے اعضا صلیب کی شکل میں پھیلے ہوئے ہیں، سینہ تھوڑا سا اٹھا ہوا ہے۔ نیم کرہ کے پاس اسی زاویے سے ایک اور بالکل اسی کی طرح کی گول شکل، مگر بے داغ، دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ سنگی نقطہ، جو ذرا گہرے رنگ کا ہے، اور جو اس کے کمرے کے سر پر رکھا ہوا ہے، پوری طرح پہچانا جا سکتا ہے۔ جب کہ پہلے والی شکل کا سر تقریباً پوری طرح تباہ ہو چکا ہے، یا کم سے کم، زخم کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے۔

پس منظر میں، زینہ کی چوٹی کی طرف، ایک سیاہ سایہ دور کی سمت میں بڑھ رہا ہے۔ ایک آدمی جو لمبی لہراتی ہوئی عبا پہنے ہوئے ہے، آخری سیڑھیاں چڑھ رہا ہے وہ مڑ کر نہیں دیکھتا۔ اسے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا کام پورا ہو چکا ہے۔ عود دان قسم کی کوئی چیز ایک اونچی گھڑے ہوئے لوہے کی بنی ہوئی تپائی پر رکھی ہے۔ عود دان سے دھوئیں کی ایک پتلی لکیر اٹھ رہی ہے۔ سفید دودھیا جسم بالکل پاس ہی ہے۔ اس کی بائیں چھاتی سے خون کی چوڑی لکیریں نکل کر اس کی بغل اور کولہوں کی طرف بہہ رہی ہیں۔

یہ ایک عورت کا جسم ہے، سڈول، بھرا ہوا، لیکن بھاری نہیں۔ وہ بالکل ننگی ہے، پیٹھ کے بل پڑی ہوئی، اس کا سینہ ذرا اٹھا ہوا ہے۔ کیونکہ زمین پر موٹے موٹے گدے پڑے ہوئے ہیں۔ زمین مشرقی ڈیزائن کے قالینوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کی کمر بہت تنگ ہے۔ گردن لمبی اور نازک، ایک طرف مڑی ہوئی، اس کا سر ایک نسبتاً زیادہ تاریک جگہ میں ہے، لیکن نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں۔ نیم وا ہونٹ، بڑی بڑی، کھلی ہوئی آنکھیں، ساکت اور چمکیلی اور لمبے لمبے سیاہ بالوں کا ڈھیر جو منظم انتشار کے ساتھ کسی بھاری سلوٹوں والے کپڑے۔ شاید مخمل پر لہریئے بناتا ہوا پھیلا ہوا ہے۔ کاندھے اور بازو بھی اسی مخمل پر ہیں۔

یہ گہرے بنفشی رنگ کا مخمل ہے یا کم سے کم اس روشنی میں ایسا ہی لگتا ہے لیکن بنفشی، کتھئی اور نیلے رنگ بھی گدوں کے رنگوں میں حاوی نظر آتے ہیں۔ گدوں کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ مخمل سے ڈھکا ہوا ہے اور جو جسم کے نچلے حصے.... سینہ اور کمر.... کے نیچے اور مشرقی قالین کے اوپر صاف دکھائی دیتے ہیں اور آگے، فرش کے اصل پتھروں میں بھی یہی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہی رنگ محرابوں کی کمانیوں، زینے اور کمرے کے دور دراز دھندلے کونوں میں بھی نظر آتے ہیں۔

کمرے کی لمبائی چوڑائی ٹھیک بتانا مشکل ہے۔ پہلی نظر میں تو قربان کی ہوئی نوجوان عورت اس کمرے میں خاصی مرکزی اور اہم جگہ کی مالک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان وسیع و عریض سڑھیوں کو، جو اترتی ہوئی، اس تک پہنچتی ہیں، دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی رائے کے برخلاف یہی سارا کمرہ نہیں ہے بلکہ کمرے کی خاصی بڑی وسعتیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہوں گی۔ داہنے، بائیں اور کھمبوں کی قطار کے آگے بھی ہر طرف ان دور دراز کتھئی اور نیلے رنگوں کی طرف۔ شاید اس طرف اور بھی صوفے، موٹے قالین، گدوں اور مخمل کے ڈھیر، اذیت پہنچائے ہوئے بدن، اور عود دان موجود ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ روشنی کہاں سے آرہی ہے۔ کھمبوں اور زمین پر کوئی ایسا نشان نہیں ہے جس سے اور سر پیچھے کو ڈھلکا ہوا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ سیڑھی کے دامن میں کھڑے ہوئے ستونوں میں سے کسی ستون کی آڑ کی وجہ سے اس کا چہرہ دیکھنے والے کی نگاہ سے اوجھل ہو۔ عورت کا داہنا ہاتھ اس ستون کی جڑ کے ٹھیک پاس ہی زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس کی نازک کلائی میں لوہے کا ایک بھاری حلقہ ہے۔ اس کا بازو سایوں میں تقریباً چھپا ہوا ہے۔ صرف اس کی سرنگی ستون کے گول اٹھے ہوئے پائے کے پس منظر میں وضاحت سے نظر آتا ہے، کسی سیاہ دھات کی ایک زنجیر پائے میں بندھی ہوئی ہے اور وہی زنجیر عورت کی کلائی کے حلقے سے جڑی ہوئی ہے۔ اس طرح کلائی مضبوطی کے ساتھ ستون سے بندھی ہے۔

بازو کے اس سرے پر، ایک گول شانہ بھی، جو گدوں کے سہارے اٹھا ہوا ہے، خاصی روشنی میں ہے۔ اس طرح گردن، حلق، دوسرا شانہ، بغل جس پر ہلکے ہلکے نرم بال ہیں، بایاں بازو، جو کہ پہلے بازو کی طرح پھیلا ہوا ہے اور کلائی جو کہ پہلی کلائی کی طرح دوسرے ستون سے بندھی ہوئی ہے، خاصی روشنی میں ہیں۔ یہ سب پیش منظر کے بالکل نزدیک ہیں۔ یہاں پر لوہے کی زنجیر اور حلقہ بہت ہی صاف اور ممتاز ہیں، ہر ہر تفصیل پوری پوری طرح نمایاں ہے۔

یہی حال اسی طرح کی ایک اور زنجیر کا ہے۔ وہ بھی پیشِ منظر میں، لیکن دوسری طرف ہے۔ یہ پچھلی زنجیروں سے کچھ کم موٹی ہے، اور بائیں ٹخنے کے چاروں طرف دوبارہ لپیٹی ہوئی ہے۔ زنجیر ٹخنے کو ایک مضبوط حلقے سے ملاتی ہے جو فرش میں گڑا ہوا ہے۔ اس سے ایک گز، یا اس سے کچھ زیادہ پیچھے، داہنا پاؤں بھی بالکل اسی طرح جکڑا ہوا ہے۔ لیکن بایاں ٹخنہ اور اس کی زنجیر زیادہ وضاحت سے دکھائے گئے ہیں۔

پاؤں چھوٹا، سبک اور نزاکت سے بنایا ہوا ہے۔ زنجیر نے گوشت کو جگہ جگہ کچل ڈالا ہے، اور اس میں خاصے گڑھے بنا دیے ہیں۔ اگرچہ یہ گڑھے زیادہ بڑے نہیں ہیں۔ زنجیر کی کڑیاں بیضاوی موٹی اور آنکھوں کے برابر ہیں۔ حلقہ اس طرح کا ہے جیسا گھوڑوں کو باندھنے کے کام آتا ہے اور پتھر کے فرش سے، جس میں وہ ایک بھاری آنکڑے کے ساتھ لگا ہوا ہے، تقریباً بالکل چپک کر مسطح ہو گیا ہے، ایک قیمتی قالین کا کنارہ ایک یا دو انچ کے فاصلے پر دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ تھوڑا سا مڑا ہوا ہے، بلاشبہ اس محدود لیکن اضطراری کش مکش کی وجہ سے، جو شکار کشتہ نے اپنے دفاع کے لیے کی ہوگی۔

آدمی اب بھی اس پر تقریباً نیم خم ہے۔ کوئی تین فیٹ کے فاصلے پر، وہ اس کے پیچھے ڈھلکے ہوئے سر، میک اپ کی وجہ سے بڑی لگنے والی سیاہ آنکھوں اور پورے کھلے ہوئے منہ کو دیکھ رہا ہے۔ اس کا منہ کسی چیخ کے دوران کھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آدمی کی پوزیشن ایسی ہے کہ ایک دھندلے بغلی ہیولیٰ کے علاوہ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ایک بہیمانہ وجد و مسرت کا شکار ہے، اگرچہ اس کے کھڑے ہونے کا انداز اکڑا ہوا ہے، اور وہ خاموش اور بے حس و حرکت ہے۔ اس کی پیٹھ تھوڑی سی خم ہے۔ اس کا صرف داہنا ہاتھ نظر آتا ہے۔ اسے وہ اپنے جسم سے کچھ دور پر لیے ہوئے ہے۔ اس کے ہاتھ میں کسی گہرے رنگ کے لباس کا ٹکڑا ہے جس کا سرا قیمتی قالین تک پہنچا ہوا ہے اور جو یقیناً زری کے کام کے استر والی عبا ہوگی۔

اس آدمی کا بھاری سایہ ننگے گوشت پر اس سرخ دھبے کو، جو اَب سینے کے خم تک پھیل گیا ہے اور لمبی لمبی لکیروں میں بہہ رہا ہے، چھپائے ہوئے ہے۔ یہ لکیریں جیسے جیسے آگے بڑھ کر تقسیم ہوتی جاتی ہیں، تنگ ہوتی جاتی ہیں۔ لکیریں زرد دھڑ اور پوری بغل تک دوڑی ہوئی ہیں۔ ایک پتلی دھار بغل کے اندر تک پہنچ کر بازو کے اوپر ایک باریک اور تقریباً سیدھی لکیر بنا رہی ہے۔ دوسری لکیریں کمر تک پہنچ گئی ہیں اور پیٹ، کولہے اور ان کے اگلے حصے کی ایک طرف لکیروں کا ایک زیادہ الجھا ہوا اور باریک جال بنا رہی ہیں جو اَب سوکھنے بھی لگا ہے۔ تین یا چار باریک لکیریں ناف کے گڈھے میں لہراتی ہوئی پہنچ کر اس V شکل کے جوڑ پر مل گئی ہیں جو کھلی

ہوئی ٹانگوں سے بنا ہے اور پھر سیاہ بالوں میں غائب ہو گئی ہیں۔

لیکن ابھی.... گوشت پوست کا جسم ویسے کا ویسا ہے۔ سیاہ بال، سفید پیٹ، کولہوں کا نازک خم، تنگ کمر اور اس کے اوپر سیپ کی سطح رکھنے والے پستان جو اونچی تیز سانس کے آہنگ کے ساتھ اٹھ اور گر رہے ہیں۔ سانس اب لحہ بہ لحہ زیادہ تیز اور بے چین ہوتی جا رہی ہے، آدمی، جو اس کے بالکل پاس ہے اور ایک گھٹنے کے بل جھکا ہوا ہے، اور زیادہ جھک جاتا ہے۔ صرف لمبے گھونگرالے بالوں والا سر ہی اب حرکت کی کچھ آزادی پر قادر ہے، وہ لہرا رہا ہے اور مروڑ رہا ہے۔ آخر کار لڑکی کا منہ تشنج کی کیفیت میں کھل جاتا ہے اور گوشت پوست کا جسم ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ نرم، کھنچے ہوئے گوشت پر خون ابل پڑتا ہے۔ احتیاط و توجہ سے کاجل لگائی ہوئی آنکھیں تمام تناسب سے بھی زیادہ پھیل جاتی ہیں، منہ اور بھی کھل جاتا ہے، سر شدت سے داہنے بائیں ہلتا ہے، اور آخر کار فرش پر ٹپک کر جامد ہو جاتا ہے، سیاہ بالوں کا ڈھیر مخمل پر پھیلا ہوا۔

پتھر کے زینے کی آخری سیڑھی پر چھوٹا دروازہ کھلا ہوا ہے، جس میں سے ایک زرد لیکن مستقل روشنی خارج ہو رہی ہے۔ اس روشنی کے پس منظر کے ساتھ بھی عبا میں لپٹے ہوئے شخص کا سایہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اب اسے چوکھٹ تک پہنچنے کے لیے چند ہی سیڑھیاں چڑھنی ہیں۔

تب سارا اسٹیج منظر خالی ہو جاتا ہے۔ بنفشی سایوں والا وسیع و عریض کمرہ جس میں ہر طرف ستون ہیں، بھاری بھرکم زینہ جس میں ڈنڈا نہیں ہے، اور جو اوپر چڑھنے کے ساتھ ساتھ اور زیادہ تنگ اور غیر متعین ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ تاریکیوں تک اٹھ جاتا ہے، ان اونچی محرابوں تک، جہاں وہ غائب ہو جاتا ہے۔

جسم کے قریب، جہاں زخم سے بہا ہوا خون جم گیا ہے، اور جس کی چمک بھی کم ہونا شروع ہو گئی ہے، عود دان سے اٹھتی ہوئی دھویں کی باریک لکیر ساکت ہوا میں ٹیڑھی پیچیدہ شکلیں بنا رہی ہے۔ پہلے دھواں بائیں طرف افقی سطح میں پھیلے ہوئے ایک گچھے کی طرح ہے، پھر سیدھا ہو کر تھوڑا اونچا اٹھتا ہے۔ اس کے بعد پھر اپنے نقطۂ آغاز کے مرکز کی طرف واپس لوٹتا ہے اور اس سے بھی آگے جا کر دائیں کو بڑھ جاتا ہے، پھر مخالف سمت میں اٹھنا شروع کرتا ہے، پھر واپس آتا ہے، اور اس طرح ایک منحنی اور بہ تدریج گھٹتی ہوئی بل دار رسی کی شکل بناتا ہے جو کہ دیوار پر لگی تصویر کی چوٹی پر عمودی شکل میں کھڑی ہے۔

بھیانک افسانہ

ولیم سین سم

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان روم کی سیاحت کو گیا۔

روم کو یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ وہ رہنے والا تو دیہات کا تھا، لیکن نہ تو وہ اس قدر کم عمر تھا نہ بے وقوف کہ اسے یہ گمان ہوتا کہ اتنے عظیم الشان اور خوبصورت دارالحکومت میں دل لگانے کے مواقع دوسرے شہروں کے مقابلے میں زیادہ ہوں گے۔ اسے معلوم تھا کہ زندگی زیادہ تر مایا جال ہے، اور اگر چہ حیرت انگیز پُرلطف واقعات کبھی کبھی پیش آجاتے ہیں، لیکن اتنی ہی مایوسیاں بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں، اس طرح حساب برابر ہوجاتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ زندگی میں ایک اس سے بھی بدتر چیز ہوسکتی ہے، یعنی اس بات کا امکان کہ کچھ بھی نہ ہوگا، ہر طرف سناٹا رہے گا اور ایسا ہونے کا امکان بڑے شہروں میں، جو اپنے کام میں جتے رہتے ہیں، نسبتاً زیادہ ہی ہوتا ہے۔

کچھ اس طرح کے خیالوں میں گم وہ اسپینی سیڑھیوں پر کھڑا اس عظیم الشان مسلسل منظر کو دیکھ رہا تھا جو اس کے سامنے پھیلا ہوا تھا، وہ شام کی ٹریفک کی بڑھتی ہوئی گونج کو سن رہا تھا اور روم کی سنہری شفق کے پس منظر میں چراغوں کو روشن ہوتے دیکھ رہا تھا۔ چمکیلی موٹریں فواروں کے پاس سے سرسراتی گزر رہی تھیں اور تیزی سے کانداتی کی روشن سڑک میں داخل ہو رہی تھیں۔ سرخ سفید نیون روشنیاں، تاریک سایوں کے جسموں میں

دعوت کے خنجر لگا رہی تھیں۔ بسوں کی زرد کھڑکیوں، کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کام سے جانے والوں کے چہروں سے ٹھنسی پڑی تھیں۔ شہر کا شخص شام کے کسی نہ کسی کام میں گتھا ہوا تھا۔ صرف وہی بالکل بے کار اور فارغ تھا۔

وہ سارے شہر میں صرف اپنے کو تنہا محسوس کر رہا تھا لیکن حیرت انگیز، دلچسپ واقعات و حالات تلاش سے کبھی ہاتھ نہیں آتے، بلکہ تلاش انھیں اور دور کر رہی دیتی ہے۔ ایسی ذہنی کیفیت سے کسی حاصل کی توقع نہیں کی جا سکتی اس لیے وہ الٹے پاؤں سیڑھیوں پر سے واپس گزر کر، راستے میں کھڑے خوب صورت گرجا گھر سے گزرتا ہوا پہاڑی پر بنے ہوئے کھڑنجے کے راستے سے اپنے ہوٹل کی طرف واپس چلا۔ ان تنگ راستوں کے دونوں طرف بنے ہوئے شراب خانے اور کھانے کی دوکانیں لوگوں کے بڑھتے ہوئے اژدہام میں دھکے کھا رہی تھیں۔ لیکن وتوریو ونیتو کے چوڑے فٹ پاتھ پر، بودگیر باغات کی سمت اوپر چڑھنے والے درختوں کے نیچے روم کی اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ یورپ کے بہترین فیشن ایبل ریستورانوں میں بیٹھے دھند لکے کے سائے میں قبل از ڈنر کے اشتہا انگیز جاموں کا لطف لے رہے تھے۔ وہاں تو یہاں سے بھی زیادہ تنہائی ہوگی۔ نوجوان یہ سوچتا ہوا اپنے گھر کی طرف اپنا تنہا سفر خاموشی اور قدیم راہوں میں طے کرتا رہا۔

ایسی ہی ایک سڑک پر جو سڑک کیا، پرانے زرد مکانوں کے مکانوں میں ایک تنگ گلی تھی جس پر فٹ پاتھ بھی نہ تھا۔ ایسی سڑک جو روم میں اچانک کسی چھپے ہوئے فوارہ لگے چوراہے اور لوئی چہاردہم کے طرز میں بنے ہوئے گرجا گھر، کسی گمبھیر گوشہ نشین مگر لعل و جواہر کی طرح خوبصورت اور قیمتی جگہ میں کھل سکتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ بالکل تنہا ہے، مگر صرف ایک عورت ڈھلوان سڑک پر اتار سے ہوتی ہوئی اس کی طرف چلی آ رہی ہے۔

جب عورت قریب آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا لباس بہت باذوق اور مہذب تھا، اور اس کی چال میں مخصوص لاطینی مدھم آنچ تھی اور اس میں وہ وقار تھا جو دوسروں کو راستہ دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ نقاب اوڑھے ہوئے تھی، لیکن یہ تصور کرنا ممکن نہ تھا کہ وہ بدصورت ہوگی۔ اس طرح تنہا اس کے وجود کا قرب، وہ جو اس لطف اور لذت انگیز حیرت کی علامت تھی جس سے اس کی شام قطعاً خالی تھی، اس نوجوان کے دل کو شدید حزن و یاس سے بھر گیا۔ وہ خود کو گندی نالی کی ذلیل شے محسوس کر رہا تھا۔ حقیر قابلِ رحم، زمین میں گڑا ہوا۔ اس لیے عورت کے برابر آتے آتے اس نے اپنے کندھے سکوڑ لیے اور نگاہیں نیچی کر لیں، لیکن اس کے پہلے عورت کی آنکھوں کی طرف کن انکھیوں سے دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ عورت کی آنکھوں میں اس نے جو دیکھا وہ اس

قدر شدید حیرت کا موجب تھا کہ وہ ٹھٹک گیا، اور بالکل سن ہو کر اس کے چہرے کو گھورنے لگا۔ لیکن غلط فہمی کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اسے دیکھ کر ٹھٹک بھی گئی تھی۔ ''رنڈی ہے؟'' اس نے فوراً سوچا۔ لیکن نہیں، اس کی مسکراہٹ اس طرح کی نہیں تھی، اور ایک طرح کی اُنسیت سے خالی نہ تھی اور پھر، یا حیرت! وہ بولی:

''میں.... میں جانتی ہوں مجھے آپ سے بولنا نہ چاہیے۔ لیکن یہ شام اس قدر خوبصورت ہے، اور آپ شاید اکیلے ہیں، جس طرح میں اکیلی ہوں....''

وہ بہت خوبصورت تھی۔ نوجوان کو یارائے نطق نہ تھا، لیکن ایک بڑھتے ہوئے اہتزاز کے احساس نے اسے مسکرانے کی قوت بخش دی تھی۔ لہٰذا، تھوڑی بہت ہچکچاتی ہوئی لیکن طوائفوں کے انداز سے بالکل مختلف لہجہ میں، وہ کہتی رہی۔

''میں نے سوچا.... شاید.... ہم آپ کچھ دیر سیر کر سکیں.... کہیں بیٹھ کر ایک دو آپری تیف پییں....''

آخر کار نوجوان خود پر قابو پا سکا۔ ''میرے لیے اس سے بڑھ کر مسرت کی بات کیا ہو سکتی ہے.... اور ونیتو بس یہاں سے چند قدموں پر ہے۔''

وہ پھر مسکرائی: ''مگر میرا گھر بھی بس یہیں ہے۔''

مخالف سمت میں چند گز کا فاصلہ خاموشی سے طے کر کے وہ ایک موڑ پر پہنچے جسے وہ نوجوان پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ عورت نے موڑ کی طرف اشارہ کیا، مڑ کر وہ ایک جگہ پہنچے جہاں شروع میں چھوٹے موٹے معمولی مکانات ایک تنگ سے راستے پر ختم ہوتے تھے۔ اس تنگ راستے میں ایک باغ کی دیوار تھی اور دیوار کے پیچھے ایک بڑا سا، خوبصورت مکان تھا۔ اس عورت نے جس کے چہرے پر ایک عجیب زردی مائل جگ مگاہٹ تھی۔ کچھ عجیب سا تاثر جس میں گوری جلد کی خفیف شفاف زردی، گہری بھنوؤں، چمکیلے سیاہ بالوں، بھوری مگر روشن آنکھوں کے رنگ شامل تھے، باغ کے پھاٹک میں چابی لگا کر گھمائی۔

مخملی وردی پہنے ہوئے ایک نوکر نے ان کا خیر مقدم کیا۔ وہ ایک وسیع خوبصورت کمرے میں لے جائے گئے جو قیمتی بلور کے جھاڑوں سے روشن تھا اور جس کے آگے ایک سبز مرطوب فواروں اور چشموں سے بھرا آنگن تھا۔ جھاگ لاتی ہوئی بلبلوں سے بھری شراب ان کی خدمت میں پیش کی گئی، وہ باتیں کرتے رہے۔ گرم رومانی رات کے پیشِ نظر ان کی شراب برف میں لگائی ہوئی تھی، جسے پی کر ان کے رگ و پے میں بند

پرواز، گرم فرحت دوڑ گئی۔ لیکن نوجوان گاہے گاہے عورت کو متعجب نگاہوں سے دیکھتا بھی رہتا تھا۔ اپنی نظروں، اپنی آنکھوں اور دانتوں کے مختلف دقیق و باریک اتار چڑھاؤ کے ذریعہ وہ ایک ایسے تعلق و آشنائی کو راہ دے رہی تھی جو اپنے اندر بہت سے امکان رکھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے احتیاط لازم ہے آخر کار اس نے طے کیا کہ بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرے، تا کہ آگے چل کر جو بھی کرم نمائی وہ کرے اس کا بدل پہلے سے موجود ہو۔ لیکن جب اس نے کہنا شروع کیا تو عورت نے اسے روک دیا، پہلے تو مسکرا کر، اور پھر ایک نگاہ سے، جو کچھ کچھ رنجیدہ بھی تھی۔

عورت نے نوجوان سے التجا کی کہ وہ خود کو کسی الجھن میں نہ ڈالے۔ ان دونوں کا اس طرح یک جا ہو جانا عجیب تو تھا، اور اس کے پیچھے کسی اور مقصد کا شبہ ہونا فطری بھی تھا۔ لیکن حقیقت صرف اسی قدر تھی کہ وہ تنہائی کا شکار تھی، اور (یہ جملہ اس نے ذرا احترام و اکرام کے لہجے میں کہا) شاید نوجوان کی چال ڈھال میں کوئی چیز یا دھند لکے کا وقت اس کو نا قابل گریز حد تک دل کش معلوم ہوا تھا۔ واقعی وہ مجبور ہو گئی تھی۔

اس امکان نے کہ شاید یہ اتفاقیہ ملاقات واقعی ہر طرح سے تکمیل و خوبی کے پہلو اپنے اندر رکھتی ہو اور اس میں کسی حرص یا غرض یا دھوکے کا شائبہ نہ ہو۔ یہ ایک خواب جو عمر بھر کی فریب شکستگی بھی پوری طرح قتل نہ کر پاتی تھی۔ نوجوان کو عورت کے حق میں فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے اہتزاز و انبساط کا ٹھکانہ نہ تھا۔ اس کو عورت پر اعتبار آ گیا اور اس کے بعد ہر چیز ہر طرح مکمل نظر آنے لگی۔ عورت کی دعوت پر اس نے کھانا وہیں کھایا۔ خدام نے اعلیٰ درجے کے کھانے سے اس کی ضیافت کی، اس کے بعد وہ آنگن کے پاس ایک خنک کونے میں صوفے پر دیر تک بیٹھے رہے۔ شیریں شرابیں لائی گئیں، نوکر برخاست ہو گئے، سارے گھر پر سکون کا سناٹا چھا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے اندر لے گئی۔ ان دونوں کے درمیان کتنی گہری خاموشی چھا گئی تھی! نوجوان کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ دل دھڑکنے کی اونچی آواز سنگ مرمر کے ہال میں گونج رہی ہوگی جس سے وہ گزر رہے تھے، یا شاید اس کے ہاتھوں کے ذریعہ عورت کے ہاتھ تک پہنچ رہی ہوگی اور وہ بھی اسے محسوس کرتی ہوگی۔ لیکن جذبات کا یہ ہیجان اب یقین کا مرہون منت تھا۔ یقیناً اس لمحے میں، اس مسحور شام میں، کسی ضرر کا امکان نہ تھا۔ گفتگو کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ دونوں نے ایک ساتھ بھاری زینے کو طے کیا۔

خواب گاہ میں پہنچ کر ہلکے ریشمی لباس میں ملبوس اس کی عریانیوں کے سامنے جو پلنگ کے پردوں کے فریم میں نظر آ رہی تھیں، نوجوان نے اپنا دل اس کے سامنے رکھ دیا۔ ایسی محبت جو امر رہے گی، ہمیشہ بے عیب رہے گی، اتنی ہی افسانوی جتنی آج کی ملاقات تھی۔

دھیمی شیریں آواز میں عورت نے اس کی محبت کا جواب دیا۔ کسی ضرر، کسی زیاں، کا کبھی کوئی امکان نہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی چیز حائل نہ ہوگی اور بہت آہستگی سے اس نے اپنی چادر کھینچ کر پلنگ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

لیکن اچانک جب وہ آخرکار اس کی آغوش میں لیے ہوئے تھا اور جب ان کے لب ایک دوسرے تک پہنچنے ہی والے تھے، وہ جھجک گیا۔

کوئی چیز درست نہ تھی کہیں کچھ کمی تھی۔ ایک لمحہ تامل کے بعد اس کو محسوس ہوا کہ غلطی اسی کی تھی۔ پلنگ کے پاس شیڈ سے چھپی ہوئی نرم روشنیاں تھیں، لیکن چھت کے وسط میں لٹکے ہوئے جھاڑ کو اس نے لاپروائی سے روشن چھوڑ دیا تھا، اس کی تیز روشنی مخل تھی۔ اسے یاد تھا کہ جھاڑ کا سوئچ کچھ دور دروازے کے پاس تھا، وہ اٹھ کر اسے بجھانے والا ہی تھا کہ اس کی محبوبہ نے اس کے تامل کو دیکھا، جھاڑ کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور سمجھ گئی۔

اس کی آنکھیں جگ مگا اٹھیں۔ اس نے نرم پیار بھرے لہجے میں کہا ''میرے محبوب، تم پریشان نہ ہو، زحمت نہ کرو....''

اور اس نے اپنا ہاتھ نکالا، پھیلایا، اس کا ہاتھ بڑا ہو گیا اس کا بازو لمبا ہوتا گیا.... لمبا ہوتا گیا.... بڑھتے بڑھتے اس کا ہاتھ پلنگ کے پردوں کے باہر، لمبے قالین کے پار، عظیم الجثہ، اس کا سایہ کمرے کی ساری لمبائی پر محیط ہو گیا....

یہاں تک کہ اس کی دیو نما انگلیاں دروازے تک پہنچ گئیں....

ایک کلک کی آواز آئی، اور کمرہ تاریک ہو گیا۔

نقابیں

ہوانگ سونوان

سپاہی کی ٹانگ میں گولی لگی۔ وہ زخم کھا کر گر پڑا۔ جب اس نے خود کو زمین سے اٹھانا چاہا تو ایک سنگین اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ بیہوشی غالب آنے کے لمحے میں اس کے حملہ آور کی شکل اس کی آنکھوں میں منقش ہوگئی، جیسے تپتے ہوئے سرخ لوہے سے وہاں داغ دی گئی ہو۔ سنسان ویران میدانِ جنگ کی پیلی زمین پر سپاہی کا خون بہ نکلا۔ یہ ایک پہاڑی کا دامن تھا، اس کے وطن سے بہت دور، لیکن یہاں کی زمین اس کے گاؤں کے اطراف کی زمین سے ملتی جلتی تھی۔

اس کا خون مٹی میں جذب ہوا اور مٹی بن گیا۔ بے جان سپاہی اپنی زندگی میں ایک کسان تھا اور مٹی اس کے لیے جان ہی کی طرح تھی۔ پہلے تو وہ قطعۂ زمین بقیہ زمین سے زیادہ گہرے رنگ کا تھا، لیکن آہستہ آہستہ وہ سارا ہی ایک رنگ ہوگیا۔

سرخی مائل یولا لیا نرکل کی جڑوں نے چپکے چپکے سپاہی کی جان کا رس پی لیا اور وہ خود بھی نرکل بن گیا۔

فوجی بوٹوں کے ملے جلے جمگھٹ نے نرکل کو کچلا اور کچلتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ سردیوں کے زمانے میں پچھلے بوٹوں سے بھی زیادہ بھاری بوٹوں نے برف سے ڈھکے ہوئے نرکل کو کچلا۔ بار بار ایسا ہوا کہ بوٹ آئے اور اسے کچلتے ہوئے نکل گئے، لیکن نرکل کا پودا مرا نہیں۔ بوٹ جب اسے کچلا ہوا چھوڑ کر آگے چلے گئے تو بہار کے دنوں کی ہواؤں میں نرکل کا پودا لہراتا، دھوپ کی کرنوں میں نہاتا، شبنم اور بارش کے قطرے اس کا منھ دھلاتے، پھر وہ برف سے ڈھک جاتا اور اس کے بعد ایک بار پھر بہار کی ہواؤں میں لہرانے لگتا۔ بہار

کے دن گزرنے کو تھے جب ایک کسان کی ہنسیا اسے کاٹ لے گئی اور وہ ایک اصطبل میں پہنچ دیا گیا۔

یہاں وہ نرکل نرگاؤ بن گیا، جس طرح کہ مردہ سپاہی نے اپنی کسانی کے زمانے میں اس کی دیکھ بھال کی تھی، اسی طرح نرگاؤ کا مالک اب اس کی دیکھ بھال یوں کرتا گویا وہ اس کے گھرانے کی سب سے قیمتی شے ہو۔ اب کسان کے شانہ بہ شانہ سپاہی خوب محنت سے کام کرتا۔ وہ اتنا جی لگا کر کام کرتا کہ اس کی جلد کھرچ جاتی، بدن میں سوجن آجاتی، لیکن کھیت کو سال بسال مرنے سے بچائے رکھنا آسان نہ تھا۔ پھر ایک بار باڑھ آئی اور سارے کھیت کو بہالے گئی۔ ایک رات ایسا ہوا کہ کسان اپنے گلے میں اپنی چیخ اور سسکیاں دبا کر نرگاؤ کی پتلی سوکھی گردن کو سہلاتا رہا۔ سپاہی بازار سے گزرا پھر ریل میں بٹھا کر اسے کمیلے لے جایا گیا۔ شہر کے ایک قصاب کی دکان پر اس کی لوتھ موٹی میخ سے آویزاں کی گئی اور اس کے بدن سے گوشت کاٹ کاٹ کر فروخت ہوا۔ قصاب کی دکان کے سامنے اسے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ وہی سپاہی تھا جس کی سنگین پہاڑی کے دامن میں اس کا سینہ توڑ کر نکل گئی تھی۔ وہ ایک نوالے کی بھیک مانگ رہا تھا۔ گوشت والے نے اسے گوشت کا ایک پارچہ دے دیا۔ بھکاری نے اسے کھالیا اور اس طرح سپاہی اب اس شخص کے اندر آ گیا۔

بھکاری نے اپنا خالی شکستہ کچکول ایک طرف کو اچھال دیا، پھر وہ زمین پر سے اٹھا۔ اس کی ایک آستین خالی لٹک رہی تھی، اس کا بازو نہ تھا، وہ لوہا ڈھالنے والی کارگاہ میں گیا جہاں وہ اس زمانے میں کام کرتا تھا جب جنگ نے اس کا بازو نہیں اتارا تھا۔

''سلام سیٹھ۔''

کارگاہ کے مالک کے چہرے پر ناگواری کے نشان ابھر آئے۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا، اس اپنے جوتے کی نوک سے سگریٹ کے ٹکڑے کو کچل دیا۔

آپ فکر نہ کریں سر جی۔ میں بھیک مانگ کر آپ کو تنگ کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں تو یہاں کام کرنا چاہتا ہوں جیسے پہلے کام کرتا تھا۔''

مالک نے اس کی بازو سے خالی آستین کو ذرا تشویش سے دیکھا۔

''آپ کیا دیکھ رہے ہیں سیٹھ جی؟'' اس شخص نے مالک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میری ٹانگ میں گولی لگی تھی، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں کھراد پر کام نہیں کر سکتا۔

یہ کہتے ہوئے اس شخص نے اپنے بدن کو حرکت دی۔ اس کی خالی آستین اس کے پہلو میں جھول رہی تھی۔

دوسری کوشش

ژانگ شِن شِن، سانگ یے

گزشتہ کئی برسوں میں چین کی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلے کے لیے امتحان دینے والے اور امتحان میں کامیاب ہونے والے طالب علموں کا تناسب بیس میں ایک سے لے کر آٹھ میں ایک تک رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں جگہوں کی قلت کی وجہ سے نوجوان نسل کو بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ اٹھارہ سالہ فویاوین (Fu Yawen) ایک سیدھی سادی لڑکی ہے، وہ پچھلے امتحان میں ناکام رہی تھی۔ اس نے ہم لوگوں کو بتایا کہ اس سال دوبارہ امتحان میں بیٹھنے کے لیے اس کے والدین اس پر زور ڈال رہے ہیں۔

میں نے اماں سے کہہ دیا کہ جنت ٹھساٹھس بھری ہوئی ہے۔ میں یہ داخلے کا امتحان کبھی پاس نہ کر سکوں گی۔ میں کوئی نوکری کیے لیتی ہوں، بس یہی ٹھیک ہوگا۔ لیکن وہ بھلا کب سننے والی ہیں۔ میرے باپ ماں نے میرے اوپر درجنوں قاعدے جاری کر رکھے ہیں۔ سبق دہرانے کی کلاس میں بروقت پہنچنا میرے لیے ضروری ہے۔ ناول پڑھنا بند، ٹی وی دیکھنا بند، فلم دیکھنا بند، سب بند۔ میں نے ان سے کہا کہ اس طرح تو میری زندگی اجیرن ہو جائے گی، تو انھوں نے کہا کہ بس یہ ذرا کٹھنائی کے دن کسی طرح گزار لو، ایک بار کالج پہنچ جاؤ گی تو چین ہی چین ہوگا۔

مجھے لگتا ہے کہ انھوں نے مجھے وقت سے پہلے ہی بوڑھی ٹھڈو بنا دیا ہے۔ جب نہ تب وہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ جو لوگ پڑھتے نہیں وہ کوڑے کباڑ سے بدتر ہیں۔ جانوروں سے بدتر ہیں۔ میرے بڑے میاں تو یہی کہتے ہیں۔

کالج میں داخلے کے لیے کم سے کم نمبر جتنے درکار تھے ان سے میرے نمبر باون (52) کم تھے۔ ایسے میں بھلا اگلے سال کے لیے مجھے کیا امید ہو سکتی ہے؟ لیکن میرے والدین کہتے ہیں کہ تم اگلی بار فیل ہوئیں تو بھی کیا، تمھیں اس سے اگلی بار پھر امتحان میں بیٹھنا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں: ''فکر نہ کرو، ہم تمھارا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔'' اور وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ امتحان مجھے اپنے لیے دینا ہے، کسی اور کے لیے نہیں۔ ہمارا کیا ہے، ہمیں تو پنشن ملے گی، ہمارا تو کام چل ہی جائے گا۔ ہمیں تمھارے پیسے کی ضرورت نہیں۔ سچ مانیے یہ سب سنتے سنتے میرا تو دل کھٹا اور پست ہو گیا ہے۔

میرے نمبر اتنے خراب ہیں کہ میں کسی کوچنگ کلاس میں بھی نہیں بار پا سکتی۔ آپ جانتے ہیں ان کوچنگ کلاسوں میں وہ بچے جاتے ہیں جو بالکل ہی گھامڑ اور پھسڈی ہوتے ہیں۔ ہمیں ان باتوں نے خاصا رنجیدہ بنا رکھا ہے۔ ایک لڑکے نے کلاس میں کھلے عام شکایت کی۔ ''ہمارا قصور کیا ہے؟ ہمیں بڑوں سے بھی زیادہ محنت کرنے کو کیوں کہا جاتا ہے؟'' ماسٹر صاحب نے جواب دیا، ''تمھارا قصور یہ ہے کہ تم کالج کے داخلہ امتحان میں ناکام رہے اور یہ کوئی معمولی جرم نہیں۔ تمھیں اس کوچنگ میں بھیجنے کے لیے وسائل فراہم کرنا تمھارے والدین کے لیے کچھ آسان تھوڑی ہے۔ تمھیں تو چاہیے کہ تمھیں ان پر افسوس آئے، بچارے والدین۔'' ماسٹر صاحب نے ہم لوگوں کو تو افسوس میں مبتلا کر کے اشک بار کر دیا، لیکن ہمارے اوپر افسوس کون کرتا ہے؟

مجھے لگتا ہے کہ میری تو صورتِ حال بالکل ناممکن اور ناقابلِ برداشت ہے۔ ''کالج اساتذہ متوسط اسکول'' نامی ادارہ ہماری کوچنگ کلاس چلاتا ہے۔ کتابیں ہمیں صرف اسکول کی لائبریری سے مل سکتی ہیں۔ لیکن میں تو ادب کے پیچھے دیوانی ہوں اور ادیب بننا میری سب سے بڑی تمنا ہے۔ لیکن اماں کہتی ہیں کہ اگر تو نے کوئی کتاب لکھ ڈالی تو میں تجھے داخلے کے امتحان میں بیٹھنے کی مصیبت سے بچا لوں گی۔ یہ باتیں مجھے اور بھی پست کیے دیتی ہیں۔ ادب پڑھنے کی اجازت نہ ہونا تو بس ایسا ہے جیسے قتل ہو جانا اور لکھنا، وہ تو محض خوابوں ہی میں ممکن ہے۔

میرے بابا اس قدر رتبہ پرست (Snob) ہیں کہ بس۔ جب بھی کوئی آنے جانے والا میرے بارے میں پوچھتا ہے تو بابا کہہ دیتے ہیں، ابھی یہ سینئر مڈل اسکول میں ہے۔ ان کی باتیں اس قدر تکلیف دہ ہیں کہ کیا کہوں۔ ایک دن وہ ایک کتاب لائے جس میں مجرموں کے خلاف ایک نہایت جابرانہ مہم کا حال تھا۔ اس میں سے ایک سبق انھوں نے مجھے پڑھ کر سنایا جس میں یہ تھا کہ ان لوگوں کا کیا حشر ہوتا ہے جو پڑھتے نہیں۔ ان مجرموں میں کوئی یونیورسٹی کا طالب علم تو شاید نہ تھا، لیکن بعض اسکولی لڑکے بھی کیا کم ہوتے ہیں؟ ایک ہماری ہی بلڈنگ میں دو لڑکیاں پیٹ سے رہ گئیں اور انھیں گھر واپس آ کر چوری چھپے حمل ساقط کرانا پڑا۔ کتنی ذلت اور بدنامی کی بات ہے، اور ان کی شادی تو اب ہو ہی نہ سکے گی۔ خیر، میں اب اس معاملے میں بابا سے کیا کہتی، میں نے بس یہی کہا کہ وہ لڑکیاں جیسی انھیں ہونا چاہیے اس سے کچھ بہتر نہیں ہیں اور ابھی تو وہ یونیورسٹی ہی میں ہیں۔ بابا مجھ پر برس پڑے۔ انھوں نے یہاں تک کہہ دیا.... یہاں تک کہہ دیا کہ تم ان جیسی بن جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، بس تم یونیورسٹی میں داخلے کا امتحان کسی طور پاس کرلو، سمجھیں۔ مجھے لگتا ہی نہیں کہ میں بھی کوئی انسان ہوں۔

اور اس سال فیل ہو جانے میں میرا کوئی قصور نہ تھا۔ میں امتحان ہال میں پرچہ لکھ رہی تھی اور اماں بابا دونوں ہال کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں گھبرا ہی تو گئی کہ یہ لوگ کہاں سے آٹپکے۔ اب مجھے اتوار کے دن سے چڑ ہونے لگی ہے۔ ہر اتوار کو یہ لوگ گھر پر ہوتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں کہ میں پڑھ رہی ہوں کہ نہیں۔ سچ میرا تو دل کانپنے لگتا ہے۔ وہ مجھے اعلیٰ قسم کی جیلی بھی کھلاتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر تو فیل ہوئی تو ہم تیرے حلق سے سب نکال لیں گے۔ ان باتوں کی بنا پر مجھ پر دباؤ اور بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ میں تو پاگل ہوئی جا رہی ہوں۔

اور اسی لیے میرا جی چاہتا کہ کاش میں مر جاتی۔ کاش میں خودکشی کر سکتی۔ لیکن میں اپنے باپ ماں کی تنہا اولاد ہوں۔ میری خودکشی سے انھیں بہت دکھ ہوگا اور میں انھیں اتنا دکھ نہیں پہنچانا چاہتی۔ کتنا اچھا ہوتا اگر کوئی خونی مجھے قتل کر ڈالتا۔ اس وقت تو میری ذہنی حالت ایسی ہے کہ سڑک پر ٹریفک کے حادثے میں مر جانا بھی مجھے اچھا لگے گا۔

نوعمر لوگ بہت تیزی سے بوڑھے ہوتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب میں اپنے آدرشوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ لیکن اب نہیں۔ آپ اگر اپنا سر کسی دیوار سے ٹکرائیں، ٹکراتے جائیں، یہاں تک کہ سر بالکل

زخمی ہو جائے اور خونم خون ہو جائے تو آپ مزید ٹکرانے کے لائق نہ رہیں گے۔

ایک بار میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بیجنگ میں گوشت کہاں سے اور کس طرح آتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بیجنگ میں گوشت ٹرکوں پر لد کر نہیں آتا۔ چرواہے لوگ اپنے اپنے جانور، مثلاً بھیڑیں، اپنے ساتھ پاپیادہ لاتے ہیں۔ یعنی بھیڑیں، جنھیں گوشت بننا ہے، اپنا گوشت خود ہی لاد کر لاتی ہیں۔ میں بیجنگ تو کبھی گئی نہیں ہوں، لیکن اماں کہتی ہیں کہ اگر میں نے اگلے سال داخلے کا امتحان پاس کر لیا تو میں وہاں گھومنے جا سکتی ہوں۔ لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں بھی ایک بھیڑ ہوں جو اپنا گوشت اپنے اوپر لادے سڑک پر چلی جا رہی ہے، اور میں تھک کر بے جان ہو چکی ہوں۔

کرشم کا درخت

الکساندر سالژنیتسن

کٹے ہوئے درختوں پر آرہ چلا کر ہم لوگ سوختہ کے لیے لکڑیاں تیار کر رہے تھے۔ ہم نے کرشم [1] کا ایک لٹھا اٹھایا اور حیرت کے مارے ہماری چیخ نکل گئی۔ نہ جانے کتنا عرصہ گذر چکا تھا، کرشم کا درخت کاٹا گیا، چھیلا گیا، ٹریکٹر نے ہلا ہلا کر اسے جڑ سے اُکھاڑا، پھر مشینی آرے سے اس کے کئی ٹکڑے کیے گئے اور ان ٹکڑوں کو بار بردار کشتیوں اور ٹرکوں پر لادا گیا، اٹھایا پٹکا گیا، ڈھیریوں کی صورت میں جمع کیا گیا.... یہ سب ہوا، لیکن یہاں کرشم کے اس لٹھے نے اب تک ہار نہ مانی تھی۔ اس نے ایک ننھی سی کونپل نما شاخ پھوٹ نکالی تھی جو کبھی نہ کبھی خود بھی پورا پیڑ یا پھر ہری بھری لہلہاتی ڈال بن جاتی۔

---

(۱) کرشم یا کجم کو انگریزی میں (Elm) کہتے ہیں۔ عربی میں اسے دردار اور بق کہا جاتا ہے۔ اس خاندان کے اور بھی درخت ہیں جو کرشم یا کجم کہلاتے ہیں۔ ٹھنڈے ملکوں میں بکثرت ہونے والے ان پیڑوں کی لکڑی طرح طرح سے کام آتی ہے۔

ایسے نقشِ قدم نظر آئے جو شاید ہسٹر کے رہے ہوں، لیکن اس کے ساتھی کے نشانِ قدم کا پتہ نہ تھا۔ یہ نشانات بھی پرانے قبرستان کے نیچے ریتلے کنارے پر آکر ختم ہو گئے۔ جہاں طوفان نے ایک لوحِ مزار اور اس کے ساتھ قبر میں قید لاش کو بھی نیچے اکھاڑ پھینکا تھا۔

لوحِ مزار سر راجر وائی برن کا تھا، اس کی لاش پاس ہی پڑی تھی۔ دو سو سال کی طویل نیند نے بھی اس پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا.... تلاش کے ایک ہفتہ بعد تک گگر کٹ کٹ کر گرتی رہی اور لہروں نے آہستہ آہستہ سارے نشانات دھو ڈالے لیکن ہسٹر کی لاش کہیں نہ ملی۔

چار قدم*

شموئیل یوزف انیان

وسط یورپی ملکوں میں یہودی (Yiddisi) زبان و ادب کی تاریخ بہت پرانی اور خاصی وقیع ہے۔ یہودی اہل یہود کی قومی زبان ہے۔ اصلاً یہ زبان قدیم جرمن کی ایک شکل ہے جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ بھی آزادی سے داخل ہو گئے ہیں۔ اسرائیل کے قیام کے پہلے یہودی ادیب عام طور پر ملکی زبان (پولستانی، جرمن وغیرہ) ہی ذریعۂ اظہار بناتے تھے، لیکن یہودی زبان وثقافت سے کبھی مکمل طور پر علیحدہ بھی نہیں ہوئے تھے۔ کچھ ادیبوں مثلاً جے بی سنگر نے صرف یہودی زبان میں ہی لکھا۔ قیام اسرائیل کے بعد ایسے ادیبوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اور آہستہ آہستہ ان کو بین الاقوامی شہرت بھی حاصل ہو رہی ہے۔ پچھلے چند برسوں میں جو یہودی ادیب عالمی منظر پر آئے ہیں ان میں آئی بی سنگر (جے بی سنگر کا چھوٹا بھائی) اور شموئیل یوزف انیان کے نام قابل ذکر ہیں۔ دونوں کے ادب کی جڑیں اپنے تمدن اور معاشرت میں دور تک پیوست ہیں اور یہودی روایات واساطیر سے ان کا گہرا رابطہ ہے۔ دونوں کا انداز نیم داستانی ہے اور تمثیلیت میں رچا ہوا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حد تک روحانی اور مذہبی بھی ہے۔ انیان کو ایک دوسرے ادیب کے ساتھ 1966ء کا ادبی نوبل انعام بھی ملا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا یہ افسانہ پڑھنے والوں کے لیے خاص دلچسپی کا باعث ہوگا۔ (مترجم)

تال پیوست کی تعمیر کے پہلے ہواؤں کا شہنشاہ اس ساری سرزمین پر راج کرتا تھا۔ اس کے امرا، وزرا اور خدام.... اڑیل اور طاقت ور ہوائیں.... اس کے ساتھ ہی رہتی تھیں اور کوہ و بیاباں، وادی و میداں چھوٹی

• انگریزی ترجمہ جوئل بلوخر کا ہے۔

بڑی پہاڑیوں اور پیڑوں پر سائیں سائیں کرتی اڑا کرتیں اور اپنی من مانی اس طرح کرتی رہتیں گویا اس ساری زمین پران ہی کا سکہ چلتا تھا۔

ایک بار جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ وہ جگہ کس قدر خوب صورت تھی۔ ہوا چاق و چوبند، آسمان گہرا، نیلا اور زمین کتنی کھلی ہوئی اور کتنی آزاد، میں ادھر اُدھر ذرا دیر تک ٹہلتا رہا تھا کہ ایک ہوا نے میرے سامنے آکر مجھ سے پوچھا ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' میں نے کہا ''گھوم رہا ہوں۔'' اس نے میرے سر پر زور کا ایک تھپڑ مارا کہ میری ہیٹ سر سے اڑ گئی۔ ''اچھا! تو آپ گھوم رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔ میں اپنی ہیٹ اٹھانے کے لیے جھکا تو اس نے میرا کوٹ الٹ پلٹ کر کے اسے میرے سر پر اڑھا دیا اور میری ہنسی اڑانے لگی۔ میں نے اپنا کوٹ سر پر سے کھینچ اتارا تو وہ پھر مجھ پر پل پڑی۔ اس نے مجھے اٹھا کر پٹک دیا اور بے قابو ہو کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ میں کسی صورت سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے مجھے زور کا دھکا دیا اور کہنے لگی۔ ''بھاگو.... جاؤ.... بھاگو....''

میں نے سمجھ لیا کہ اپنے سے زیادہ شہ زور مخالف سے بار پانا مشکل ہے، اس لیے میں نے اپنی راہ لی۔

میں شہر واپس چلا آیا اور گھر کے اندر پڑا رہا لیکن مجھے چین نہ تھا اور میں پھر باہر نکل آیا۔ میرا ارادہ چاہے ادھر جانے کا رہا ہو یا نہ رہا ہو، لیکن میرے قدم خود بہ خود تال پیوست کی طرف اٹھنے لگے۔ مجھے یاد تھا کہ پہلی بار ہوا نے میری کیا گت بنائی تھی۔ اس لیے اس بار میں کرمچ اور کھونٹیاں اپنے ساتھ لے گیا تاکہ ہوا اور طوفان سے بچنے کے لیے خیمہ گاڑ سکوں۔

میں ایک رات وہاں ٹھہرا۔ اچانک خیمے کی روشنی بجھ گئی۔ میں خیمہ سے باہر نکلا کہ دیکھوں کس نے میرا چراغ گل کر دیا ہے۔ میں نے ہوا کو باہر کھڑی دیکھا۔ ''کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ اس نے میرے کان اینٹھے اور مجھے تھپڑ مارے۔ میں اپنے خیمہ میں گھس گیا۔ اس نے خیمے کی کھونٹیاں اکھاڑ دیں، رسیاں توڑ ڈالیں اور کرمچ کو الٹ پلٹ کر کے پھاڑ کر ریشہ ریشہ کر دیا۔ پھر وہ مجھ پر بھی آ رہی اور مجھے تقریباً زمین پر پٹک دیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مقابلہ کرنا میرے لیے کسی بھی طرح ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور شہر واپس لوٹ گیا۔

میں شہر لوٹ آیا اور اس کی دیواروں کے حدود میں رہا۔ لیکن مجھے سکون نصیب نہ تھا اور میرا دل بار بار کسی تازہ کھلی ہوا والی جگہ کے لیے بری طرح بے چین ہو اٹھتا۔ چونکہ تال پیوت کی طرح صاف اور تازہ ہوا

کہیں کی بھی نہیں، اس لیے میں پھر وہیں چلا گیا اور اس خیال سے کہ ہوا پھر میری مرمت نہ کرے، میں اپنے ساتھ لکڑی کے کچھ تختے لے گیا اور ایک جھونپڑا کھڑا کر لیا۔ میں نے سوچا تھا کہ آخر میں نے اپنے لیے ایک سکون کی جگہ بنا ہی لی، لیکن ہوا کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ ابھی ایک دن بھی نہ گزرا تھا کہ وہ میری چھت کو زور زور سے دھپ دھپانے اور دیواروں کو ہلانے لگی۔

ہوا میرے جھونپڑے کو اڑا لے گئی اور مجھے بے اماں چھوڑ گئی، میں نے کسی صورت سے خود کو اٹھایا اور شہر کی راہ لی۔

جو مجھ پر پہلی بار گزری اور پھر دوسری بار، وہی تیسری بار بھی گزری۔ میں شہر لوٹ تو آیا لیکن مجھے سکون نہ تھا۔ کس شوق وذوق سے میرا دل مجھے اسی طرف لیے جاتا تھا جہاں سے میں کس بے آبروئی سے نکالا گیا تھا! میں نے اپنے دل سے کہا ''تم دیکھتے نہیں کہ اب اس جگہ کس طرح واپس جا سکیں گے جہاں سے ہم بھگا دیے گئے ہیں؟ جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے۔'' لیکن میرے دل کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ اگر میں ایک ہزار بار ''ناممکن'' کہتا تو وہ ایک ہزار ایک بار ''ممکن'' کہتا۔

میں اس بار لکڑی کے شہ تیر اور پتھر لے کر گیا اور اپنے لیے ایک گھر بنا ڈالا۔ میں اپنے مکان کی تعریف نہ کروں گا، کیوں مکان تھا چھوٹا سا اور اگرچہ بہت سے مکان اس سے بڑے بڑے اور اچھے اچھے بھی ہیں، لیکن مجھے اس پر بھی کوئی شرم نہیں۔ مکان چھوٹا تھا، لیکن میرے جیسے ایک آدمی کے لیے جو شان وشوکت پسند نہیں کرتا، مکان میں جگہ بہت تھی۔

ہوا نے دیکھا کہ میں نے اس بار ایک مکان بنا لیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ گھر ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسی اور کہنے لگی۔ ''لعنت ہو جو میں نے کبھی کہیں ایسی احمقانہ چیز دیکھی ہو، جسے تم گھر کہتے ہو۔''

میں بھی ہنسا اور بولا۔ ''جو چیز تم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی وہ اب دیکھ لو۔'' وہ ہنسی ''یہ مکان کیا چیز ہوتی ہے؟''

میں نے ہنس کر کہا۔ ''مکان؟ مکان ہوتا ہے اور کیا؟''

وہ ہنسی اور بولی۔ ''میں بھی تو دیکھوں یہ کیا ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور دروازے کو چھوا۔ دروازہ ٹوٹ کر گر پڑا اس نے اپنا ہاتھ لمبا کیا اور کھڑکیوں

کا معائنہ کیا۔ کھڑکیاں گریں اور ٹوٹ گئیں، پایان کار وہ اٹھ کر چھت پر چڑھ گئی۔ وہ اوپر گئی اور چھت نیچے آ رہی۔ وہ مجھ پر ہنسی اور بولی:

''کہاں گیا وہ مکان جو تم نے بنایا تھا؟'' میں نے بھی یہی سوال پوچھا، لیکن ہنسا نہیں۔

اول اول جب ہوا مجھے نکال باہر کرتی تو میں شہر لوٹ جایا کرتا لیکن پھر ایسی باتیں ہوئیں جنھوں نے مجھے واپسی سے باز رکھا۔ میں جدھر جدھر مڑتا، کوئی نہ کوئی چیز سدِ راہ ہو جاتی۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں۔ شہر کو مراجعت ان باتوں کی وجہ سے ممکن نہ تھی جو وہاں مجھ پر گزرتی تھیں اور تال پیوت کو واپس جانا یوں ممکن نہ تھا کہ ہوا نے مجھے ملک بدر کر دیا تھا۔ میں نے وہاں رہنے کے لیے ایک خیمہ کھڑا کیا تھا، پھر ایک جھونپڑا، لیکن نہ وہ رک سکا نہ یہ۔ پھر میں نے مکان بنایا لیکن وہ بھی ہوا کے سامنے رک نہ سکا۔ میں نے سوچا کہ شاید میرا مکان بہت کمزور اور چھوٹا سا تھا، اور اگر میں نے ایک بڑا اور مضبوط سا مکان بنایا ہوتا تو شاید ٹھہر سکتا۔ پھر میں نے خوب مضبوط بڑے بڑے شہتیر، پتھر کے بڑے بڑے کندے، پلاٹر اور سیمنٹ مہیا کیے، اچھے اچھے کاری گر اور مزدور بلائے اور دن رات کھڑے ہو کر مکان بنوایا۔ اب کی بار میں نے عقل مندی یہ کی کہ مکان کی بنیادیں بہت گہری رکھیں۔

مکان بنا اور اپنی جڑوں کو مضبوط زمین میں گاڑے ہوئے سیدھا اور تنومند کھڑا ہو گیا۔

جب مکان بن گیا تو ہوا آئی اور اس نے کھڑکیوں کو زور زور سے دھپ دھپایا۔ ''کون ہے؟ کون میری کھڑکیوں پر دستک دے رہا ہے؟'' میں نے پکارا۔ وہ کھل کھلائی اور بولی۔ ''ایک پڑوسی۔''

''ایسی طوفانی اور اندھیاری رات میں ایک پڑوسی دوسرے سے کیا مانگ رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسی اور بولی ''اپنے پڑوسی کو نئے گھر کی مبارک باد دینے آیا ہے۔''

''کیا پڑوسی چوروں کی طرح کھڑکیوں سے اندر گھستے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ دوسری طرف سے گھوم کر آئی اور دروازے کھڑکھڑانے لگی۔ ''کون میرے دروازے کھٹ کھٹا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک پڑوسی۔''

''تم پڑوسی ہو، اندر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''مگر دروازہ تو بند ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا اگر بند ہے تو اس وجہ سے کہ میں نے بند کیا ہوگا۔'' میں نے لا پروائی سے کہا۔

''کھولو!'' ہوا تحکمانہ لہجہ میں کہا۔

''مجھے سردی بہت لگتی ہے۔ صبح دن نکلنے پر آنا، تب میں دروازہ کھولوں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

جب دن نکلا تو میں نے دروازہ کھولا کہ ہوا کو اندر بلاؤں لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں اپنے دروازے پر کھڑا رہا۔ میں نے دیکھا کہ ہر طرف زمین سنسان اور بنجر تھی، کہیں درختوں یا ہریالی کا پتہ نہ تھا، صرف گرد و غبار اور کنکر پتھر۔ ''میں یہاں ایک باغ لگاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

میں نے ایک پھاوڑا لے کر زمین کھودنی شروع کی۔ جب زمین تیار ہوگئی تو میں کچھ ننھے ننھے پودے لایا۔ پانی برسا اور پودوں کو سینچ گیا۔ اوس پڑی اور پودوں سے ننھی ننھی پتیاں پھوٹیں۔ سورج نے انھیں کھانا دیا اور وہ کھل اٹھے۔ ابھی بہت دن نہ گزرے تھے کہ میرے بوئے بوئے ننھے منے پودے ہرے بھرے شاخوں سے لدے پیڑ بن گئے۔ میں نے اپنے لیے ایک بنچ بنائی اور درختوں کے سائے میں پڑا رہا۔

ایک رات ہوا واپس آئی اور درختوں کو اکھاڑنے پچھاڑنے لگی پھر درختوں نے کیا کیا؟ انھوں نے اس پر جوابی حملہ کیا۔ ہوا زوروں سے اٹھی اور درختوں کو ہلا ڈالا۔ درختوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ہوا کا سانس اکھڑ گیا۔ وہ واپس چلی گئی۔

وہ دن اور آج کا دن ہوا ہمیشہ منکسر المزاج اور خاک سار رہی ہے۔ جب بھی آتی ہے تو شریفوں کا سا برتاؤ کرتی ہے اور چوں کہ اس کا وطیرہ میری طرف اچھا ہے، اس لیے میرا بھی وطیرہ اس کی طرف ٹھیک ہے۔ جب وہ آتی ہے تو میں باہر نکل کر اس کا استقبال کرتا ہوں اور اسے اپنے پاس باغ میں بٹھاتا ہوں۔ اب جب وہ آتی ہے تو پہاڑوں اور وادیوں کی مہک سے معطر آتی ہے اور نسیم میرے منہ پر پنکھے جھلتی ہے۔ چونکہ اب وہ پچھلے طور طریقے سے بالکل تائب ہو چکی ہے، اس لیے میں اس کو پرانی باتیں نہیں یاد دلاتا، جب وہ جانے لگتی ہے تو میں اسے پھر آنے کے لیے کہتا ہوں، جیسا کہ پڑوسیوں سے کہا جاتا ہے۔ سچ مچ ہمارے تعلقات دوستانہ ہیں۔ مجھے اس سے خاصا انس ہو گیا ہے اور شاید اسے بھی مجھ سے کچھ موانست ہو گئی ہو۔

پرچھائیں کا شیطان

ایلن وانکس

بھیانک افسانہ اب سنسان مکانوں میں چرچراتے ہوئے دروازوں، سرسراتے ہوئے پردوں کے پیچھے سے شیطانی ہنسی کی آوازوں، چلتی پھرتی لاشوں اور خون پینے والے جادوگروں کا دور بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ اس افسانے میں جنونِ تعذیب (Persecution mania) کا انتہائی سچا اور گہرا مطالعہ کیا گیا ہے۔ بھیانک افسانے کے فن کے روز افزوں ترقی کے باوجود یہ افسانہ اپنے موضوع اور طرزِ بیان کے اعتبار سے منفرد ہے اور اس منزل کو چھو لیتا ہے جہاں ''سنجیدہ'' اور ''تفریحی'' ادب کی حدیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ (مترجم)

ڈاکٹر فریزر سے جان پہچان کے پہلے میری زندگی عذاب کے ایک بھیانک خواب کی طرح تھی۔ میں فطرتاً کچھ بزدل سا واقع ہوا ہوں اور بچپن ہی سے لوگ مجھے ہنسی میں ڈرا ڈرا کر خوش ہوا کرتے تھے۔ میری طرح کی بزدلی یا تھڑدلا پن کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں، لیکن لوگوں کی تحقیر آمیز شقی القلبی بھی کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں ہے۔ بہت سے عام طور پر خوش طبع اور ہنس مکھ لوگ بھی دوسروں کو اس طرح ستاتے رہتے ہیں لیکن اگر آپ ان کو بتائیں کہ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں تو انھیں نہ صرف یہ کہ افسوس اور تعجب ہوگا بلکہ وہ انکار بھی کریں گے لیکن میں جانتا ہوں۔ میں اس طرح کی سنگ دلی کا شکار رہا ہوں۔ بداندیشی اور ایذادہی کی ہوا صاف پہچانی جا سکتی ہے، جیسے جیسے آپ بڑے ہوتے جائیں، آپ اسے نہ صرف محسوس کر سکتے ہیں بلکہ

دیکھ سن بھی سکتے ہیں، یہاں تک کہ آپ اسے دوسرے کے گرد گھرے ہوئے روحانی عکس کی طرح پہچان سکتے ہیں۔

آہستہ آہستہ ستائے جانے کا احساس مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے اور عزیز اقارب اس سلسلے میں آگے آگے ہوتے ہیں۔ ایک وقت وہ آتا ہے کہ ان کی صورتیں عجیب دھندلی سی دکھائی دینے لگتی ہیں اور ان کی آوازیں صرف ایک بدی سے بھرپور بھائیں بھائیں سی سنائی دیتی ہیں۔ ان کا چہرہ بشرہ، آواز، لب و لہجہ، ہر چیز کسی بھیانک خواب کے سے پس منظر میں کھو جاتی ہے۔ اگر کوئی چیز پہچان پڑتی ہے تو صرف ان کی بدخواہی اور دشمنی کے سائے جوان پر احاطہ کیے رہتے ہیں، آوازیں، پرچھائیاں، ہی ہی کرتی ہوئی تحقیر آمیز ہنسی، شکار کا تعاقب، یہ ہیں ستانے اور ایذا پہنچانے کے عمل کے عناصر، اور آپ کے پاس رہ جاتی ہے صرف ایک شدید تلخ تمنا کہ آپ ان سے بدلہ لے سکیں، انھیں نیچا دکھا سکیں، لیکن اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے آپ اپنی اس تمنا کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔

تو اس طرح میں آہستہ آہستہ جنون کی سرحد تک گھسٹتا جا رہا تھا۔ مجھ میں باہر نکلنے کی تو ہمت تھی ہی نہیں، لیکن اب گھر میں بند پڑے رہنا بھی کافی نہ تھا، کیونکہ میری جان کے دشمن بند کمرے میں بھی آسانی سے گھس سکتے تھے۔ ہر طرح کی قید و بند بے معنی اور بے کار تھی، اور آخر کار وہ مجھے کمرے کے ایک کونے میں سر چھپائے کانپتا ہوا پکڑ کر لے ہی گئے، اس طرح ڈاکٹر فریزر سے میری ملاقات ہوئی۔

''یہاں تم ہر طرح محفوظ ہو۔ کوئی خطرہ نہیں۔'' یہ جملے میں پہلے بھی کئی بار سن چکا تھا، لیکن اس بار نہ جانے کیوں ڈاکٹر فریزر کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے یقین سا آ گیا۔ اس نے تمام دروازے اور کھڑکیاں کھلی چھوڑ دی تھیں اور میں سہا ہوا گھٹنوں کے بل ہر کونے اور ہر دیوار کو ٹٹولتا پھرا۔ لیکن وہ بھیانک پرچھائیاں جو مجھے ہر جگہ ملتی تھیں یہاں کہیں نظر نہ آئیں۔

''کیوں؟ سب ٹھیک ہے نا؟'' ڈاکٹر فریزر نے مسکراتے ہوئے کہا، ہم دونوں تقریباً ایک ہی قد و قامت کے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میرے مستقل خوف و ہراس نے مجھے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کی ایسی عادت ڈال دی تھی کہ میری گردن اور کاندھے کچھ خم شدہ اور ٹیڑھے سے تھے اور ڈاکٹر فریزر چھریرے بدن کا، سیدھے قد کا اور وجیہہ تھا۔ لیکن جب اس نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور میرے کٹے پھٹے ناخنوں پر نگاہ کی (جنھیں میں برسوں سے خوف و ہراس کی انتہائی شدت کے عالم میں دانتوں سے چباتا اور

کا نتا رہتا تھا) تو مجھے کسی قسم کی کمتری کا احساس نہیں ہوا۔

''کتنے خوبصورت ہاتھ ہیں!'' اس نے نرمی سے کہا۔''انھیں اور بھی اچھا لگنا چاہیے۔''

دیکھا آپ نے۔ وہ میرے ساتھ تھا، میرا دوست اور ہمدرد۔ شروع سے ہی وہ میری مشکلیں سمجھتا تھا اور اگرچہ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے میرے خوف سے چھٹکارا دلانے اور میرا علاج کرنے کی کوشش بھی نہ کی، لیکن مجھے اعتماد اور اعتقاد ہو گیا کہ وہ مجھے اچھا کر دے گا۔

میں اس کے نرسنگ ہوم میں داخل ہو گیا۔ میرے قبضہ میں اچھے خاصے دو بڑے کمرے تھے اور گھومنے پھرنے کی مکمل آزادی تھی، لیکن شروع شروع میں تو میں نرسنگ ہوم کی دیواروں سے باہر نکلنے کی ہمت نہ کرتا۔ کچھ دن تک تو میں صرف اپنی آزادی اور امن کے احساس کے مزے لیتا رہا۔ نرسنگ ہوم ایک طرح سے میری جائے قرار تھا، میں جائے قرار سے فرار ہو کر کہاں جاتا۔

جہاں تک علاج کا سوال ہے، میں اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا، روز صبح کو میں اور ڈاکٹر فریزر دیر تک باتیں کرتے۔ سب سے بڑا علاج یہی تھا۔ ڈاکٹر جو کچھ مجھ سے پوچھتا میں اسے بتاتا جاتا، کبھی کبھی میں جواب نہ بھی دیتا۔ پھر وہ کہتا۔''اچھا بھئی ذرا ایک جھپکی لے لی جائے، اس کے بعد مجھے ایسا لگتا کہ میں نے اس سے وہ سب باتیں بھی کہہ ڈالی ہیں جو میں چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔'' دیکھا آپ نے؟ بس اتنا سا علاج تھا۔ صوفے پر آرام سے لیٹ جائیے اور ڈاکٹر فریزر کے سوالوں کا جواب دیتے رہیے اور سوال بھی کیسے، سوال جواب نہیں بلکہ دوستانہ بات چیت کہیے، کیونکہ ڈاکٹر فریزر کبھی دوسروں کی پرائیویٹ باتوں کی کرید میں تو رہتا نہیں تھا، بس جیسے وہ آپ کی زندگی اور حالات میں دلچسپی لے رہا ہو۔

بہت آہستہ آہستہ لیکن یقینی طور پر میں اچھا ہوتا گیا۔ ڈاکٹر فریزر نے کہا: ''آئینہ میں اپنی شکل تو دیکھنا۔'' اور میں نے دیکھا کہ اب میرے کاندھے پہلے کی طرح جھکے ہوئے اور ٹیڑھے نہ تھے کیونکہ اب میں مستقلاً پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا نہ رہتا تھا۔ میری نگاہ اب پہلے کی طرح بھیانک ادھر اُدھر گھومتی ہوئی اور کسی ایک جگہ نہ ٹھہرنے والی نہ رہ گئی تھی، بلکہ میں اپنے مدمقابل کی آنکھوں سے آنکھیں ملا سکتا تھا۔ میری انگلیاں بھی ٹھیک ہونے لگی تھیں، پہلے تو میں انھیں ٹانگوں کے نیچے چھپائے رہتا تھا، لیکن اب انھیں دیکھ کر مجھے کسی کراہت اور گھن کا احساس نہ ہوتا تھا۔

''اب تم ٹھیک ہو گئے ہو، لیکن ایک دو ہفتہ ابھی یہیں رہو، بہت سے علاج اس لیے ناکام ہو جاتے ہیں

کہ مریض اچانک محفوظ فضا سے کھلی دنیا میں آجاتا ہے۔"

"کیا میں واقعی اچھا ہوگیا؟" مجھے خود یقین تھا لیکن ڈاکٹر کی زبان سے دوبارہ یہ جملہ سن کر اپنے احساس اطمینان وامن میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔

"بالکل اب کوئی کسر نہیں رہ گئی۔" اس نے کہا۔

اپنی نئی زندگی کا آغاز میں نے کس مسرت سے کیا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اب وہ پُراسرار دشمنوں کی سرگوشیاں اور جسمانی اور ذہنی ایذا کے غیر مربوط احساسات کہاں تھے، میں لوگوں میں بچوں کی طرح بے فکر اور بے خوف گھومتا پھرتا تھ، تمام رنگ و بو، ہر آواز، ہر مہک، بالکل صاف اور اس طرح شدید اور گہری تھی، جیسی بہت دن بعد بسترِ علالت سے اٹھنے پر محسوس ہوتی ہے۔ کوئی آزردگی نہیں، کوئی ہول نہیں، کوئی دہشت نہیں، ہر چیز سادہ اور آزاد۔ جب میں اپنی چشمِ تصور سے گزشتہ زندگی کو دیکھتا کہ میں کس طرح ایک بے سہارا خوفناک چیزوں کے تعاقب سے تھرتھراتے ہوئے ہانپتے کانپتے شکار کی طرح جیا کرتا تھا تو حقارت سے مسکرا دیتا۔ مجھے یہ سوچ کر ہنسی سی آتی کہ میں اتنے لمبے عرصے تک ایک خوف انگیز خبیث کے پیدا کردہ سرطان کے سہارے زندہ رہا تھا۔

لوگ سمجھیں گے کہ اب میں نے لازوال مسرتوں کا خزانہ پالیا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کچھ دنوں بعد مجھے لگنے لگا کہ کرب وخوف کے مستقل احساس کی غیر موجودگی میں کسی چیز کی کمی بار بار کھٹک رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا کہ مجھے کوئی ناقابلِ تسکین بھوک ہے۔ مجھے ذہنی ایذا کی ضرورت تھی کیونکہ یہی میری روح کی غذا تھی اور اب.... اب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

اس لیے میں کرب اور ایذا کی تلاش کرنے لگا، جس طرح پہلے اس سے بھاگا پھرتا تھا۔ میں اینڈے بینڈے کپڑے پہن کر سڑکوں پر نکل جاتا تا کہ لوگ مجھ پر ہنسیں اور آوازے کسیں۔ لیکن مجھے جلدی ہی احساس ہوا کہ لوگ جو باتیں چپکے چپکے میرے بارے میں کہتے وہ دراصل خوش طبعی اور ہنسی میں ہوتی تھیں، نہ کہ حقارت اور استہزا میں، یہ ترکیب بھی ناکام رہی۔ میری آزردگی اور شکایت بڑھنے لگی، اور خاص کر اس ڈاکٹر کی طرف سے میرے دل میں بہت زیدہ تلخی اور شکایت پیدا ہونے لگی جس نے مجھے اس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

اور پھر ایک رات نیند میں کابوس مجھ پر سوار ہو گیا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے چاروں طرف تیز گرم روشنی ہے۔ اس طرح کی دھوپ جس میں نابینا ہو جانے کے خوف سے لوگ آنکھیں میچ لیتے ہیں۔ لیکن اس روشنی کے وسط میں پرچھائیوں اور تاریک کھمبوں کا ایک سیاہ نخلستان سا لہرا رہا تھا۔

اور ان سایوں کے بیچوں بیچ ایک سیاہ ساکت وصامت صورت کھڑی مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے کہا، گھور رہی تھی، لیکن یہ بالکل درست نہیں ہے، کیونکہ وہ لبادہ پوش سیاہ صورت اپنی جگہ سے ہلی تو میں نے دیکھا کہ اس کے کوئی چہرہ نہ تھا۔

یہ بے صورتی ایک عجیب اور پُراسرار گہرائی تھی، ایک خلا، جو سائے کا سرپوش اوڑھے ہوئے تھا، لیکن پھر بھی اس میں مڑنے اور گھورنے کی قوت تھی، اور اگرچہ اس تیز نگاہی کا سراغ نہ آنکھوں میں تھا اور نہ چہرے میں، لیکن مجھے اس کی کینہ توزی اور خباثت صاف نظر آ رہی تھی۔ کسی زہریلے سانپ کی خباثت تھی جو سرپوش سے جھانک رہی تھی۔

میں نے چیخ مار کر جاگ اٹھنا چاہا۔ لیکن قلبی دباؤ کے اس گاڑھے خواب ناک ماحول میں میری چیخ کا گلا گھٹ گیا، اور فرار کی راہیں مسدود ہو گئیں۔

آخر کار جب میں پسینے میں تر جاگا تو مجھے احساس ہوا کہ اب یہ کابوس بار بار مجھ پر مسلط ہوگا، مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے خوفی کے عذاب سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ میں جاگ کر چیختا اور چیختا رہا۔

میرے خوف سچ ثابت ہوئے، ہر رات میں خود کو چمکیلی دھوپ سے بھری ہوئی مگر سیاہ پرچھائیوں کا قلب رکھنے والی جگہ میں پاتا اور ہر رات وہ بے شکل صورت اپنی سیاہ جلتی ہوئی بد باطن خبیث نگاہوں کی شدت سے مجھے گھورتی رہتی۔ لیکن ہر بار اس دم گھونٹنے والی اور اندھا کر دینے والی روشنی کی چکا چوندھ میں کچھ تخفیف ہو جاتی۔ روشنی کی حرارت اور چمک جو مجھے مجبور، بے حس اور گرفتار رکھتی تھی، کم ہونے لگی، اس کا احساس مجھے کئی بار خواب دیکھنے کے بعد ہوا، آہستہ آہستہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لبادہ پوش صورت اب پہلے سے زیادہ واضح دکھائی دینے لگی ہے، اگرچہ اب بھی نہ گھورتی ہوئی آنکھیں نظر آتیں اور نہ بھیانک خبیث مسکراہٹ لیے ہوئے پتلے پتلے سفاک ہونٹ دکھائی دیتے۔ میرے کابوس کی کینہ توزی اب بھی پہلے کی طرح ناقابل بیان اور لاینحل تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میں اسے کچھ کچھ پہچاننے لگا ہوں۔

میری ظاہری شکل وصورت پر اس خواب کا اثر انتہائی وحشت آگیں ہوا، میں تیزی سے پھر اپنی پچھلی حالت کی طرف گرنے لگا۔ ظاہر ہے کہ بے چارہ ڈاکٹر فریزر مجھے اس حال میں دیکھ کر مضطرب اور متعجب ہوا کہ یہ کیا ہونے لگا ہے۔ ''یہ تو بڑی بری بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ کہ ہوا کیا؟ میں اتنی مکمل صحت کو اس طرح پھر بیماری میں بدلتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔''

میں کیا کہتا؟ کرسی پر کانپتا ہوا سر جھکائے بیٹھا اپنے ناخون چباتا رہا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے پاس آیا۔

''کچھ تو بتاؤ، میں تمھارا دوست ہوں۔'' چھریرے بدن کا لمبا، مجھے ایسا لگا جیسے وہ پرچھائیوں اور تاریک ستونوں کے بیچ میں کھڑا مجھے گھور رہا ہو۔ میں چیخ اٹھا۔ ''نہیں! نہیں! نہیں!''

''اچھا!'' وہ مسکرایا۔ ''تو تمھیں بھیانک توہمات تنگ کرتے ہیں؟ ڈراؤنے خواب آتے ہیں؟ بتاؤ تم نے کیا خواب دیکھا ہے؟''

میں دل سے چاہتا تھا کہ اس کو اپنا خواب بتادوں، لیکن نہیں، اگر میں اسے خواب بتادوں گا تو میری زندگی میں کیا رہ جائے گا؟ میں اس قدر بے وقوف نہیں تھا۔ میں ہی ہی کر کے ہنسنے لگا۔

''منحوسمت!'' اس نے ترشی سے کہا۔

مجھے احساس نہیں تھا کہ میں ہنس رہا ہوں۔ ذلت کا احساس بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح میرے دل و دماغ میں دوڑ گیا۔

''دیکھو، بس تم مجھے بتادو تم نے کیا خواب دیکھا ہے۔ میں سب ٹھیک کردوں گا۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں خواب دیکھتا ہی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تب تم دنیا میں اکیلے شخص ہو جو خواب نہیں دیکھتا۔'' اس نے خشکی سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے یاد ہی نہیں میں نے کیا خواب دیکھا تھا۔''

''خیر، کبھی اور سہی، میں سچ کہتا ہوں، میں تمھیں ٹھیک کردوں گا۔ تمھیں نیند کی ضرورت ہے، میں کوئی دوا لکھ دوں؟''

''نہیں!'' میں چلا اٹھا۔ اس عذاب دینے والی صورت کا تصور بھی میری برداشت سے باہر تھا۔

لیکن میں راتوں رات شیفتگی اور خوف و ہراس کے ملے جلے جنون کے جال میں گرفتار اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اگر کسی رات وہ کابوس مجھ پر نہ مسلط ہوتا تو مجھے ایک ناقابلِ برداشت فرحت کا احساس ہوتا۔ وہ تعذیب جو مجھے نیست و نابود کیے جا رہی تھی میرے لیے اشد ضروری ہو گئی تھی، اور ڈاکٹر فریزر سے میری شکایت آمیز نفرت بھی بڑھتی گئی، لیکن میں نے اسے کچھ بھی نہ بتایا۔

ایک صبح کو اس نے تھک ہار کر مجھ سے کہا۔ ''اچھا، اگر تم مجھے نہ بتاؤ گے تو میں زبردستی تم سے تمھارا عذاب چھین لوں گا۔ کل میں تمھیں سلا دوں گا۔''

مجھے یاد آیا کہ پہلے بھی وہ مجھے سلا کر مجھ سے طرح طرح کے سوال پوچھا کرتا تھا۔ میں غصے کے جنون میں اس سے جھگڑنا چاہتا تھا، لیکن کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لینے کے علاوہ میں کچھ نہ کر سکا۔

''بس، چپ رہو، چپ رہو۔'' اس نے کہا۔

کمرے سے جاتے ہوئے میں اس کی جلتی ہوئی آنکھیں اپنی پیٹھ میں چبھتی ہوئی محسوس کرتا رہا۔

یہ کل دن کی بات تھی۔

کل رات میں نے پھر خواب دیکھا، لیکن ایک نازک فرق کے ساتھ۔ چکا چوندھ کرنے والی روشنی اور جھلسا دینے والی حدت کی جگہ ہلکی فشار آمیز سردی نے لے لی تھی، میرا گم نام لبادہ پوش، سرپوش میں چھپا ہوا خناس، مجھے اسی طرح گھور رہا تھا، لیکن اس کے بشرے سے ایک طرح کی کینہ توز حیرت کا بھی اظہار ہوتا تھا کہ میں نے آنکھیں بند کر کے سمجھا تھا اس سے چھپ سکوں گا۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے ایک انوکھی دوئی کا بھی احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا کہ میں نے بھی کسی ہولناک طرح سے اپنے عذاب پرور کابوس کا روپ دھار لیا ہے، اور اب میں بھی تاریک سرپوش کی آڑ لے کر بے صورت چہرے سے اپنے ہی کابوس کو گھور رہا ہوں۔ میں نے ناقابلِ بیان شیطانی مسرت کے ساتھ اس چھریرے بدن کی لمبی صورت کو اس مکروہ خباثت سے بھاگنے اور بچنے کی کوشش کرتے دیکھا جس سے میں اسے بھرنا چاہ رہا تھا۔ سیاہ صورت اپنی آنکھیں بند کرنے اور چیخنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اسے جائے فرار نہ ملتی تھی۔ میں بہ یک وقت عذاب کابوس کا صید زبوں بھی تھا اور فتح مندانہ، انتقامانہ اسی کابوس پر خود بھی خبیث کی طرح سوار

تھا۔ میرے لیے مسرت کا یہ لمحہ ناقابلِ برداشت ہوتا اگر اس موقع پر مجھے تسکین اور آسودگی کا ایک انوکھا احساس نہ ہوتا۔

میں جاگا تو میں حسبِ معمول خوف سے کانپ رہا تھا اور میری نگاہیں پہلے کی طرح ادھر اُدھر جھانکتی پھر رہی تھیں، لیکن مجھے ایک ایسی فرحت کا احساس تھا جو ڈاکٹر فریزر کے علاج سے نہ حاصل ہوئی تھی۔ کسی کارِ نمایاں کو سرانجام دینے کا سکون و فرحت۔

جب میں نے صبح کو ڈاکٹر فریزر کے دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب نہ ملا۔ انتظار کیے بغیر میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور وہیں کھڑا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔

ڈاکٹر فریزر اپنی کرسی پر سر جھکائے بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تھے۔ ابھی خوف کا گھن اس کی شخصیت کو پوری طرح نہیں کھا سکا تھا، لیکن بیم و ہراس کی لہر اس کی اندرونی شخصیت کو آہستہ آہستہ کاٹے ڈال رہی تھی اور اس کے نشانات اس کے سفید چہرے پر نمایاں تھے۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے، اور اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں مَیں اپنی لبادہ پوش بے چہرہ صورت اسے گھورتی ہوئی دیکھ رہا تھا، جس طرح طویل راتوں میں اس کی لبادہ پوش بے چہرہ صورت مجھے گھورتی رہی تھی۔

''خدا کے لیے کچھ بتاؤ۔ اب کیا ہوگا؟'' اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ میں کچھ نہ بولا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے تشفی بخش جواب سننے کے لیے دم بستہ تھا۔ ''کیوں ڈاکٹر؟ تم میرے خواب کا علاج کرو گے نہ؟'' لیکن مجھے اب اپنا خواب اسے بتانے کی ضرورت نہ تھی، اور نہ یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ پچھلی رات اس نے عذاب و ہول کا ایک طویل بھیانک خواب دیکھا تھا جس میں کوئی بے شکل چھریرے بدن والی نقاب پوش شیطانی صورت اسے گھورتی رہی تھی، جس طرح اس وقت میں اسے گھور رہا تھا۔

خفیہ کمرہ*

آلن روب گریئے

گستاو مورو کے نام

پہلے پہلے تو یہ ایک سرخ پارہ ہے۔ صاف، چمکتا ہوا مگر گہرا سرخ۔ اس کے گرداگرد پر چھائیاں ہیں جو تقریباً سیاہ ہیں۔ یہ ایک ٹیڑھے میڑھے ربن کی شکل میں ہے۔ جس کے کنارے اور موڑ بالکل واضح ہیں اور جو کئی سمتوں میں چوڑی ندیوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں جو لمبائی میں برابر نہیں ہیں، آگے چل کر یہ ندیاں تقسیم ہوجاتی ہیں، تنگ ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ وہ لہراتی ہوئی رقیق لکیروں کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ یہ سارے کا سارا ایک چکنی، گول کی ہوئی سطح کی زرد بے رنگی کے پس منظر میں صاف نظر آتا ہے۔ چکنی سطح، جو بہ یک وقت کسی نہ کسی طرح سے کھردرے پن کا بھی احساس دلاتی ہے جیسے کہ وہ سیپ کی بنی ہو۔ ایک نیم کرہ، جسے خفیف گولائیوں نے فرش کی ہی سی زرد بے رنگ وسعتوں سے ملا رکھا ہے۔ یہ زرد بے رنگی ایک سفیدی ہے جو منظر کی سیاہی کی وجہ سے ہلکی اور کمزور معلوم ہوتی ہے۔ کال کوٹھری، یا زیر زمیں کمرہ یا عبادت گاہ، نیم روشنی کی پھیلی ہوئی دھند میں جھمکتا ہوا۔

آگے کی جگہ کھمبوں کی اونچی گولائیوں سے گھری ہوئی ہے، کھمبے جوں جوں پس نظر سے نزدیک ہوتے

---

* انگریزی ترجمہ: باربرا رائٹ

جاتے ہیں، تعداد میں گھٹے اور زیادہ غیر واضح ہوتے جاتے ہیں۔ پس منظر کے پاس ایک بہت اونچے اور بڑے پتھریلے زینے کی نچلی سیڑھیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ زینہ جوں جوں اوپر اٹھتا ہے، گھومتا جاتا ہے، اور جوں جوں اونچی محرابوں تک اٹھتا جاتا ہے، تنگ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ بالکل غائب ہو جاتا ہے۔

یہ سارے کا سارا اسٹیج منظر.... کھمبوں کا جنگل اور زینہ.... بالکل خالی ہے۔ پیش منظر میں اور تھوڑا تھوڑا دمکتا ہوا، اکیلا، ایک مردہ جسم ڈھیلا پڑا ہوا ہے، اور اس کا سرخ دھبہ۔ ایک سفید جسم، دیکھنے والا جس کو بھرا بھرا، لچک دار، نازک (اور بلاشبہ، قابلِ تسخیر) سمجھ سکتا ہے۔ خون سے داغ دار اس کی کرنوں کی سمت کا پتہ چل سکے اور پھر کوئی کھڑکی بھی نظر نہیں آتی۔ کوئی مشعل بھی نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ دودھیا بدن ہی منظر کو روشن کر رہا ہے۔ سینہ جس کی چھاتیاں بھری ہوئی ابھرتی ہوئی ہیں۔ کولہوں کا خم، پیٹ، گول سڈول رانیں، چوڑی کھلی ہوئی، پھیلی ہوئی ٹانگیں اور دکھائی دیتی ہوئی ناف پر سیاہ بال۔ کھلی ہوئی، برانگیختہ کرتی ہوئی آزاد پیش کش، اب بالکل بے مصرف۔

عبا پوش آدمی کئی قدم بڑھ چکا ہوتا ہے۔ وہ زینے کی پہلی سیڑھیوں پر ہے اور اوپر چڑھنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ نچلی سیڑھیاں لمبی اور چوڑی ہیں، جیسی کسی عمارت مثلاً تھیٹر یا مندر کی طرف لے جانے والی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ وہ جیسے جیسے اوپر اٹھتی ہیں چھوٹی ہوتی چلی جاتی ہیں، اور ساتھ ساتھ ایک چوڑا، گھومتا ہوا چکر شروع کرتی ہیں۔ یہ چکر اس قدر ہلکا ہے کہ ابھی آدھا موڑ بھی نہیں پورا ہو پاتا کہ زینہ ایک تنگ سیدھے، بلا ڈنڈے کے راستے کی شکل اختیار کرتا ہوا، جو گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں اور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے، محرابوں کے اوپر کہیں گم ہو جاتا ہے۔

لیکن وہ آدمی اس طرف نہیں دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ سیڑھیاں اسے اسی تاریکی ہی کی طرف لیے جا رہی ہیں۔ اس کا بایاں پاؤں دوسری سیڑھی پر ہے اور اس کا داہنا پاؤں تیسری کو چھو رہا ہے، اس کا گھٹنا جھکا ہوا ہے، لیکن وہ اس منظر کو آخری بار دیکھنے کے لیے مڑ گیا ہے۔ لمبی لہراتی ہوئی عبا، جسے اس نے عجلت سے اپنے کاندھوں پر ڈال لیا ہے اور جسے وہ اپنی کمر کے پاس ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے ہے۔ اس کے سر اور سینے کی گھومتی ہوئی تیز حرکت کے ساتھ، جس کی وجہ سے اس کا سر اور سینہ سمتِ مخالف میں آگئے ہیں، اس کی عبا بھی ہوا میں لہرا گئی ہے، جیسے اسے ایک جھونکا سا لگا ہو، عبا کا کونا مڑ کر 'ی' کی سی شکل بنا رہا ہے مڑے ہوئے حصے پر ریشمی استر اور زری کا کام دکھائی دے رہا ہے۔

موریس: کیا تم ان کی کراہ نہیں سن سکتی ہو؟ دیکھتی نہیں ہو کہ تم انھیں کس قدر دکھ دے رہی ہو اپنی باتوں سے؟ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔

بینوا: میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ امی سے اس طرح بات نہ کرو۔

فرانسواز: بیٹے وہ جیسے چاہے اسے بولنے دو۔ میں اس کی عادی ہو گئی ہوں۔ میرے لیے یہی لکھا ہے کہ ان دونوں کے واسطے پریشان رہوں۔ حالانکہ وہ نہ اس کے مستحق ہیں اور نہ میرے احسان مند ہوتے ہیں۔ (ژین کراہتا ہے)

موریس: ابا جان! ابا جان (تقریباً اشک بار) ابا جان!

فرانسواز: وہ اب بھی کراہ رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوڑوں کی مار اور ہاتھ پاؤں پر بندھی ہوئی رسیاں انھیں تکلیف پہنچا رہی ہیں (میز کی دراز کھول کر ٹٹولتی ہے۔ سرکے کی ایک بوتل اور ایک نمک دان نکال کر میز پر رکھتی ہے) بس انھیں کی ضرورت تھی مجھے۔ میں اس کے زخموں کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے ان پر سرکہ اور نمک لگاؤں گی۔ سرکہ اور نمک ان کے زخموں پر جادو کا سا کام کریں گے۔ (ہسٹریائی جوش سے) ذرا سا سرکہ اور نمک۔ بس ذرا ذرا سا، ہر زخم پر۔ بس اسی کی ان کو ضرورت ہے۔

موریس: (غصے سے) ایسا نہ کرو!

فرانسواز: بس تم اسی طرح چاہتے ہو اپنے باپ کو؟ تم ان کے دلارے بیٹے۔ تم ان کے ساتھ یہی برتاؤ کرو گے؟ اور لوگ تو اور ہیں مگر تم نالائق بیٹے! تم، جو خوب جانتے ہو کہ جلاد انھیں کوڑوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالیں گے، چاہتے ہو کہ انھیں چھوڑ کر بھاگ جاؤ اور ان کے زخموں کی مرہم پٹی بھی نہ ہو؟ (سرکہ اور نمک لے کر ایذا گھر کی طرف جاتی ہے)

موریس: ان کے زخموں پر نمک نہ لگاؤ! جب وہ انھیں مار ہی ڈالیں گے تو انھیں سکون سے مرنے دو۔ ان کا درد اور نہ بڑھاؤ۔

فرانسواز: تم ابھی بچے ہو بیٹے۔ تم دُنیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمھیں کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میرے بغیر تمھارا کیا حشر ہوتا؟ زندگی تمھارے لیے بہت ہی آسان رہی ہے۔ تم اس بات کے عادی ہو کہ

تمھاری امی تمھیں ضرورت کی ہر چیز مہیا کردیں۔ میری باتیں یاد رکھو میں تمھاری ماں ہوں، اور ماں صرف اپنے بچوں کے لیے جیتی ہے۔ اپنی ماں کا احترام کرو۔ کچھ نہیں تو اس کے سفید بالوں کی وجہ سے۔ یاد رکھو کہ تمھاری ماں جو بھی تمھارے لیے کرتی ہے، تمھاری محبت میں کرتی ہے۔ بیٹے، تم نے کبھی اپنی امی کو اپنے لیے بھی کچھ کرتے دیکھا؟ میں صرف تم لوگوں کی فکر کرتی ہوں۔ پہلے میرے بچے، پھر میرا شوہر۔ کسی کی بھی نظروں میں خود میری کوئی قیمت نہیں، اور سب سے کم تو میری اپنی نظروں میں میری قیمت ہے۔ اس لیے بیٹے، جب میں تمھارے باپ کے زخموں کی دیکھ بھال کے لیے جارہی ہوں تو تم میرے راستے میں نہ آؤ۔ دوسرے تو میرے نقشِ قدم کو بوسہ دیتے۔ میں تو تم سے کچھ نہیں مانگتی، سوائے اس کے کہ تمھیں میری کوششوں پر ممنون ہونے کی توفیق ہو۔ (وقفہ، فرانسواز ایذا گھر کی طرف جاتی ہیں) میں جا کر بے چارے ابا جان کے زخموں پر نمک اور سرکہ لگاؤں گی۔

(مورس سختی اور بے دردی سے اپنی ماں کا بازو پکڑ لیتا ہے اور اسے اندر جانے سے روکتا ہے۔)

بینوا: امی کا ہاتھ مت پکڑو۔

فرانسواز: مار لینے دو اسے۔ یہی تو وہ ہمیشہ سے چاہتا رہا ہے۔ دیکھو، میرے کم زور بازوؤں پر اس کی انگلیوں کے نشان دیکھو۔ یہی تو اس کی دیرینہ تمنا رہی ہے کہ وہ مجھے مارے۔

بینوا: (بہت غصہ میں) تمھاری یہ جرأت کہ تم امی پر ہاتھ اٹھاؤ؟ (اپنے بھائی کو مارنا چاہتا ہے۔ فرانسواز جھپٹ کر بیٹوں کے درمیان آجاتی ہے۔)

فرانسواز: نہیں بیٹے۔ میری آنکھوں کے سامنے نہیں۔ ہمارا کنبہ متبرک ہے، میں اپنے بیٹوں کے درمیان جھگڑا نہیں چاہتی۔ (بینوا بہ مشکل خود پر قابو پاتا ہے۔) وہ چاہے تو میری کھال اتار لے لیکن میرے بچے، خدا کے لیے اسے میرے سامنے مت مارو۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے بھائیوں میں جھگڑا نہیں چاہتی۔ اس نے مجھے مارا ہے، میں اسے معاف کرتی ہوں۔ (شوہر زور سے چیختا ہے) دیکھا، وہ کتنی تکلیف میں ہیں! جلاد انھیں دُکھ پہنچا رہے ہیں.... انھیں بہت تکلیف ہے، میں ضرور جلد از جلد انھیں سرکہ اور نمک لگاؤں گی۔ فوراً (کمرے میں چلی جاتی ہے)۔

فرانسواز کی آواز: بس ذرا سا سرکہ اور نمک، تمھیں کتنا فائدہ ہوگا! بس، بس۔ ہلومت۔ ذرا ہی سا تو ہے۔ اسے یہ لو۔ لگا دیا۔ (ژین کراہتا ہے) یہ لگا دیا، بس اب ذرا سا نمک۔ (ژین غصہ سے چیختا ہے۔)

موریس: (چلاتا ہے) ابا جان! (اور روتا ہے۔)

فرانسواز کی آواز: بس۔ ایک ذرا سا اور۔ اسے یہاں۔ ذرا سا اور ہلومت (ہانپ ہانپ کر بولتی ہے) ہلومت۔ اسے یہاں۔ بس ذرا سا اور (ژین کراہتا ہے) بس، بس۔ ذرا سا اور۔ اسے یہاں۔ اس سے تمھیں بڑا فائدہ ہوگا۔ (ژین چیختا ہے) بس، ختم، ذرا سا یہاں اور (ژین چیختا ہے) بس، ختم۔ ذرا سا یہاں اور (ژین چیختا ہے) بس اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ (طویل خاموشی۔ ژین کی چیخ۔ خاموشی) کہو۔ اب تمھاری چوٹیں کیسی ہیں؟ میں ذرا چھو کے تو دیکھوں، اب کیسی ہیں۔ (ژین زور سے چیختا ہے۔ موریس اپنے بھائی کی نظر بچا کر ایذا گھر میں داخل ہوتا ہے۔)

موریس کی آواز: تم کیا کر رہی ہو؟ تم ان کے زخموں کو کھرچ رہی ہو!

(موریس اپنی ماں کو ڈھکیل کر باہر کر دیتا ہے۔ بینوا بھائی پر جھپٹا مارتا ہے اور قریب ہے کہ اسے مارے، ماں پھر ان دونوں کے بیچ میں آجاتی ہے۔)

فرانسواز: نہیں، نہیں بیٹے، نہیں۔ (بینوا سے) چوٹ مجھے لگ رہی ہے، اسے نہیں، نہیں، اپنے بھائی کو مت مارو، میں نہیں چاہتی کہ تم اپنے بھائی کو مارو۔ (بینوا ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔)

بینوا: میں اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ آپ کو گزند پہنچائے۔

فرانسواز: پہنچانے دو۔ اگر اسے اسی میں مزا آتا ہے تو پہنچانے دو۔ یہی تو وہ چاہتا ہے اسے اپنی سی کرنے دو۔ وہ چاہتا ہے کہ جب وہ مجھے مارے تو میں روؤں۔ بیٹے۔ تمھارے بھائی کی فطرت ہی ایسی ہے، ہائے یہ میرے لیے کیسا جہاد ہے۔ کیسے بوجھ کی صلیب ہے میرے کاندھوں پر! خدایا، میں نے کیا کیا تھا جو تو نے مجھے ایسا بے مروت بیٹا دیا، جو صرف اس انتظار میں رہتا ہے کہ میں ذرا سا کم زور پڑوں اور وہ مجھے مار بیٹھے اور اذیت دے۔

بینوا: (بپھر کر) موریس!

فرانسواز: آہستہ، میرے بیٹے۔ آہستہ (دل شکستہ) کیسی صلیب ہے۔ یہ! کیسا بار ہے یہ! خدایا، یہ کون سے

گناہوں کی سزا ہے۔ میں نے کیا کیا ہے جو تو مجھے ایسی سخت سزا دے رہا ہے! میرے بچو، اپنی دکھیاری ماں، اس کے سفید بالوں کی خاطر، جھگڑو مت! (بینوا سے) اور اگر اس کو میرے دکھ درد پر رحم نہیں آتا تو تمھیں تو آنا چاہیے۔ تم تو مجھے دکھ نہ دو یا تم کو بھی مجھ سے محبت نہیں ہے؟ (بینوا کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن وہ اسے بولنے نہیں دیتی) ہاں! یہی بات ہے۔ تم بھی مجھے نہیں چاہتے۔

بینوا: (تقریباً اشک بار) نہیں امی، میں آپ کو چاہتا ہوں، بہت چاہتا ہوں۔

فرانسواز: تو پھر تم میرے کانٹوں کے تاج میں اور کانٹے کیوں لگاتے ہو؟

بینوا: امی!

فرانسواز: کیا تم میرا درد نہیں دیکھتے؟ کیا تم ایک ماں کا اتھاہ درد نہیں دیکھتے؟

بینوا: (تقریباً اشک بار) دیکھتا ہوں۔

فرانسواز: خدا تمھارا بھلا کرے بیٹے، تم میرے بڑھاپے کا سہارا اور اس زندگی میں خدا کی طرف سے بخشا ہوا انعام اور تسلی ہو۔

(جلادوں کے کوڑوں کی مار پھر سنائی دینے لگتی ہے۔ ژین سسک رہا ہے۔ تینوں خاموشی سے ہمہ تن گوش ہیں۔)

فرانسواز: وہ انھیں پھر مار رہے ہیں اور انھیں بہت چوٹ پہنچ رہی ہوگی۔ (ہانپ ہانپ کر بولتی ہے) وہ رو رہے ہیں، وہ رو رہے ہیں۔ وہ کراہ رہے ہیں۔ ہے کہ نہیں (کوئی جواب نہیں دیتا) ہاں، وہ کراہ رہے ہیں، وہ کراہ رہے ہیں۔ میں اچھی طرح سن سکتی ہوں۔ (کوڑوں اور کراہوں کی آوازیں۔ اچانک ژین بری طرح زور سے چیختا ہے۔ کوڑے پڑتے رہتے ہیں۔ کراہوں کی آواز اب نہیں آتی، فرانسواز دروازے کے پاس جا کر جھانکتی ہے) انھوں نے انھیں مار ڈالا۔ انھوں نے انھیں مار ڈالا۔ (مکمل خاموشی، موریس بیٹھ جاتا ہے اور اپنا سر میز پر ٹکا دیتا ہے، شاید وہ رو رہا ہے۔ طویل وقفہ خاموشی۔ دونوں جلاد ژین کو لیے ہوئے داخل ہوتے ہیں وہ پہلے ہی کی طرح بندھا ہوا ہے۔ ژین مر چکا ہے۔ اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا ہے۔ فرانسواز جلادوں سے کہتی ہے۔) لائیے میں انھیں دیکھوں، لائیے میں انھیں ٹھیک سے دیکھوں۔ (جلاد اس کی باتوں پر کوئی توجہ کیے بغیر اسے لے کر نکل جاتے ہیں۔ فرانسواز اور بینوا موریس کے دائیں بائیں بیٹھ جاتے ہیں، اس کی طرف دیکھتے ہیں۔ خاموشی)

موریس: (ماں سے) ابا کی جان صرف تمھاری وجہ سے گئی۔

فرانسواز: تمھاری یہ ہمت کہ تم اپنی ماں سے اس طرح بات کرو؟ وہ ماں جس نے ہمیشہ تمھارے لیے اتنی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔

موریس: (قطع کلام کرکے) مجھ سے یہ سب بے کار جھوٹی بکواس مت کرو۔ میں تم پر یہ الزام لگا رہا ہوں کہ تم نے ابا کی مخبری کی ہے۔

(بینوا اس قدر پست دست ہے کہ اسے یارائے گویائی نہیں۔)

فرانسواز: ہاں میرے بیٹے۔ تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔ اگر تمھیں یہ سن کر کچھ خوشی ہو تو میں کہہ سکتی ہوں کہ ہاں یہ میرا ہی قصور تھا۔ تم یہی چاہتے ہو نہ؟ کیوں؟

موریس: اونہہ، بار بار اس فضول بات کو مت دہراؤ، (وقفہ وطویل خاموشی) تم نے ابا کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ ابا نے تو تمھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا؟

فرانسواز: بس، بس ٹھیک ہے۔ میں اسی کا تو زندگی بھر انتظار کرتی رہی تھی۔ جب تمھارے باپ نے اپنے بیوی بچوں کا مستقبل خطرہ میں ڈالا، صرف اپنی....

موریس: (قطع کلام کرکے) کیا؟ یہ خطرے میں ڈالنے والی بات کیا تھی؟ یہ تمھارا سب سے تازہ جھوٹ کیا ہے؟

فرانسواز: آہ۔ بیٹے، یہ کیسی مصیبت ہے! یہ کیسی صلیب میرے کاندھوں پر ہے۔ (وقفہ) یقیناً انھوں نے اپنی غلطیوں کی وجہ سے اپنے بچوں کا مستقبل خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ اگر وہ اپنے گناہ گار طور طریق پر چلتے رہے تو جلد یا بہ دیر ان کا انجام وہی ہوگا جو آج ہوا۔ انھیں یہ بات خوب اچھی طرح معلوم تھی مگر وہ بدلے نہیں۔ ہر حال میں ہر صورت میں، وہ اپنے مجرم طریق زندگی پر قائم رہے۔ میں نے ان سے کتنی کتنی بار کہا ہوگا کہ اگر تم اسی طرح رہو گے تو ایک دن بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ چھوڑ جاؤ گے۔ مگر انھوں نے کیا کیا؟ انھوں نے میری کوئی بات نہ مانی اور اپنے برے چلن چلتے رہے۔

موریس: ایک تم ہی ہو جو ان کو مجرم کہتی ہو۔

فرانسواز: ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔ رات بھر میری توہین کرتے رہنے سے تمھارا دل نہیں بھرا تو اب تم مجھے جھوٹی بھی بناؤ گے اور قسمیں کھاؤ گے کہ میری وجہ سے لوگ جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں۔ اپنی ماں کے ساتھ تم یہی سلوک کرو گے؟ وہ ماں جس نے تمھاری پیدائش سے لے کر اب تک ہر طرح تمھاری دیکھ ریکھ کی۔ جب تمھارے باپ اپنے برے اعمال کے ذریعہ تم لوگوں کا مستقبل خطرہ میں ڈال رہے تھے، مجھے صرف ایک فکر اور میرا صرف ایک مقصد تھا کہ تم لوگوں کو خوش رکھوں، تم لوگوں کو وہ ساری خوشیاں دے دوں جو میرے بس میں تھیں، وہ ساری خوشیاں جو میرے حصے میں آئی تھیں۔ کیونکہ میرے لیے صرف ایک بات اہم تھی اور ہے، تم بھائیوں کی بہبودی اور کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں، میں تو ایک غریب، جاہل، بے پڑھی عورت ہوں جس کا زندگی کا صرف ایک مقصد ہے۔ ہر قیمت پر اپنے بچوں کی فلاح و بہتری، بس۔

بینوا: (مصالحت کے انداز میں) موریس، اب جھنجھٹ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، ابا تو مر ہی چکے ہیں، اب وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے۔

فرانسواز: بینوا ٹھیک کہتا ہے۔ (طویل خاموشی)

موریس: ہم لوگ چاہتے تو ابا کو مرنے سے بچا سکتے تھے۔

فرانسواز: کیسے؟ کیا یہ میرا قصور تھا کہ وہ مجرم تھے؟ نہیں، مجرم تو وہ تھے۔ وہ تمھارے باپ۔ میں کیا کر سکتی تھی؟ میں ان کی فطرت بدلنے کے لیے کر ہی کیا سکتی تھی؟ وہ بہت ضدی ہو گئے تھے۔ میں بے چاری ایک غریب، جاہل، بے پڑھی عورت ہوں، میں نے اپنی پوری زندگی ہی اپنے کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے پریشان رہ کر گزاری ہے۔ تم نے کبھی مجھے دیکھا کہ میں اپنے اچھے اچھے کپڑے پہن کر تھیٹر کی پہلی رات یا سنیما دیکھنے جا رہی ہوں؟ مجھے ان چیزوں کا کتنا شوق تھا، مجھے ان چیزوں میں کس قدر لطف آتا تھا، لیکن اس کے باوجود میں نے سب ترک کر دیا کیونکہ میں آرام کی زندگی پر تم لوگوں کی خدمت اور دیکھ بھال کو ترجیح دیتی تھی۔ میں تم سے صرف یہی مانگتی ہوں۔ احسان فراموشی نہ کرو۔ اپنی ماں کی قربانیوں کی قدر پہچانو، یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تمھیں ایسی ماں ملی۔

بینوا: ہاں امی، میں آپ کی قربانیوں کی قدر پہچانتا ہوں۔

فرانسواز: ہاں، مجھے معلوم ہے کہ تم قدر شناس ہو، لیکن تمھارا بھائی نہیں ہے۔ میری ساری مصیبتیں اور محنتیں تمھارے بھائی کی نگاہ میں کچھ نہیں۔ اگر ہم سب مل جل کر رہتے، اگر ہم میں اختلاف رائے نہ ہوتا، تو میں کتنی خوش ہوتی!

بینوا: موریس، آؤ ہم لوگ ایک دوسرے سے مل جل کر شانتی سے رہیں، ایک دوسرے کو سمجھیں، امی کتنی نیک ہیں، میں جانتا ہوں کہ وہ تم کو بہت چاہتی ہیں اور جو کچھ تم چاہو گے تمھیں دیں گے۔ خودغرضی سے سہی، لیکن ہم لوگوں میں لوٹ آؤ، ہم تینوں مل جل کر خوش و خرم رہیں گے، ایک دوسرے کو چاہیں گے۔

موریس: لیکن.... (وقفہ) ابا.... (خاموشی)

بینوا: وہ سب پرانی باتیں ہیں۔ ماضی کی طرف مت دیکھو، اب جو چیز اہم ہے وہ آئندہ کے دن ہیں۔ ماضی کو سینے سے چپکائے پڑے رہنا بڑی بے وقوفی ہوگی۔ امی تمھاری سب ضرورتیں پوری کریں گی۔ جو کچھ ان کا ہے وہ تمھارا ہوگا۔ کیوں امی؟

فرانسواز: ہاں بیٹے، جو کچھ بھی میرا ہے وہ اس کا ہوگا۔ میں اسے معاف کرتی ہوں۔

بینوا: دیکھا، امی کتنی اچھی ہیں! وہ تمھیں معاف تک کرنے کو تیار ہیں۔

فرانسواز: ہاں، میں نے تمھیں معاف کیا۔ تم نے جو کچھ میری توہین کی ہے وہ بھی میں بھلا دوں گی۔

بینوا: امی سب بھول جائیں گی، (خوش اور ہنس مکھ) بڑی بات یہ ہے اور ہم سب بلا کسی تلخی یا کینہ توزی کے اکٹھے رہیں گے۔ امی، تم اور میں۔ اب اس سے بڑھ کر کیا بات ہو سکتی ہے؟

موریس: (نیم راضی) ہاں، مگر.....

بینوا: (بات کاٹ کر) نہیں نہیں، تم بدلہ لینے یا لڑنے کی بات نہ کرو۔ امی کی طرح بنو۔ وہ تم سے خفا ہوں تو کچھ غلط نہیں ہے، انھوں نے سب کچھ بھلا دینے کا وعدہ کیا ہے، اگر تم اچھے بن جاؤ تو ہم سب کتنے خوش ہوں گے!

(موریس! جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ سر جھکا لیتا ہے۔ طویل خاموشی۔ بینوا اپنے بازو بھائی کی گردن میں حمائل کر دیتا ہے۔)

بینوا: چلو امی کا ہاتھ پکڑ کر معافی مانگو اور پیار کرو (خاموشی) چلو، اٹھو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ، جو ہوا سو ہوا۔

(موریس اٹھ کر ماں کے پاس جاتا ہے اور اس کو پیار کرتا ہے۔)

فرانسواز: میرا بچہ!

بینوا: (موریس سے) امی سے معافی مانگو!

موریس: (تقریباً اشک بار) امی مجھے معاف کر دیجیے!

(دونوں ایک دوسرے کو لپٹا لیتے ہیں۔ بینوا بھی آ کر لپٹ جاتا ہے۔)

.... پردہ ....

عقد خونیں

ایکٹ ۳، منظر ۲ (آخری ٹکڑا)

گارسیا لورکا

ماں: چپ کر، چپ کر، مجھے اس کی کیا پروا ہے کہ تو پاک باز ہے؟

دلھن: کیونکہ میں دوسرے کے ساتھ بھاگ گئی تھی، میں بھاگ گئی تھی۔ (درد سے) تم بھی ہوتیں تو یہی کرتیں۔ میں ایک عورت تھی، تمناؤں میں جلتی ہوئی، اندر بھی زخموں بھری اور باہر بھی زخموں بھری اور تمھارا بیٹا پانی کی ایک ننھی سی ندی تھا جس سے مجھے اولاد اور زمین اور تندرستی کی امید تھی۔ لیکن دوسرا والا ایک سیاہ دریا تھا۔ جھاڑیوں سے اٹا اور ٹھنسا ہوا، جو میرے پاس اپنی تیزی اور تندی اور سوار کے نغمے اور سرگوشی بھرے گیت لایا اور میں تمھارے بیٹے کے ساتھ چلی گئی جو ٹھنڈے پانی کی ایک خلیج کی طرح تھا اور دوسرے نے میرے پیچھے پیچھے سیکڑوں پرندے بھیجے جنھوں نے میری راہ روک دی اور میرے زخموں کو سفید پالے سے ڈھک دیا۔ ایک بے چاری مرجھائی ہوئی لڑکی کے زخم۔ ایک لڑکی جس پر آگ نے اپنے ہاتھ پھیرے تھے۔ میں نہیں جانا چاہتی تھی، بھولو مت کہ میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ تمھارا بیٹا میری تقدیر تھا اور میں نے اس سے دغا نہیں کی، لیکن دوسرے کے ہاتھ مجھے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ سمندر کی بے پناہ کشش کی طرح، کسی ضدی خچر کے اڑے ہوئے سر کی طرح اور وہ مجھے

ہمیشہ کھینچے لیے جاتا، ہمیشہ، ہمیشہ، چاہے میں کوئی بوڑھی عورت ہوتی اور تمھارے بیٹے کے تمام بیٹے میرے بالوں کو جکڑے ہوئے ہوتے۔

(ایک پڑوسی داخل ہوتا ہے۔)

ماں: ہاں، ہاں، اس کا قصور نہیں ہے، اور نہ میرا ہے۔ (طنزیہ) تو پھر قصور کس کا ہے؟ کوئی نازک مزاج، کاہل اور بے خواب ہی عورت ہوگی جو نارنگی کے پھولوں کا گجرا پھینک دے اور دوسری عورت کے گرم کیے ہوئے بستر کی تلاش میں نکل کھڑی ہو!

دلھن: ٹھہرو ٹھہرو، مجھ پر بدلہ نکالو، میں موجود ہوں۔ دیکھو میری گردن کتنی نازک ہے! اسے کاٹنا باغ کے گلاب توڑنے سے بھی آسان ہوگا۔ لیکن کبھی نہیں! صاف، شفاف جیسے کوئی نوزائیدہ ننھی بچی اور اتنی قوت بھی رکھتی ہوں کہ تم پر یہ ثابت کرسکوں۔ جلاؤ، آگ جلاؤ۔ آؤ دونوں اپنے اپنے ہاتھ اس میں ڈالیں۔ تم اپنے بیٹے کے لیے اور میں اپنے جسم و جاں کے لیے۔ میں جانتی ہوں تم ہی پہلے اپنا ہاتھ کھینچ نکالوگی۔

(ایک اور پڑوسی داخل ہوتا ہے۔)

ماں: تیری نیک نامی سے مجھے کیا حاصل ہے؟ تیری موت سے مجھے کیا ملنا ہے؟ کسی بھی چیز کے بارے میں کوئی بھی چیز میرے لیے کیا معنی رکھتی ہے؟ مبارک ہیں گیہوں کی بالیاں، کہ میرے بیٹے ان کے نیچے ہیں۔ مبارک ہو بارش کی بوند کہ وہ گزرے ہوؤں کے چہرے تر کرتی ہے۔ پاک ہے خدا کی ذات کہ جو ہم سب کو سکون سے ایک ساتھ لٹا دیتی ہے۔

(ایک اور پڑوسی داخل ہوتا ہے۔)

دلھن: مجھے اپنے ساتھ رونے دو۔

ماں: رو، مگر یہاں نہیں، دروازے پر جا کر۔

(لڑکی داخل ہوتی ہے۔ دلھن دروازے پر ٹھہر جاتی ہے۔ ماں اب اسٹیج کے وسط میں ہے۔)

لناردو کی بیوی: (داخل ہو کر بائیں کو جاتے ہوئے۔)

کیا حسین شہ سوار تھا!

وہ اب برف کا ڈھیر ہے۔

وہ پہاڑوں اور میلوں، حسینوں کے آغوش کا راہ رو،
آج تو رات کی تیرہ کائی
کا تاج اس کے ماتھے پہ ہے!
ماں: ایک سورج مکھی تیری امی کی خاطر
زمیں کا بنا آئینہ۔
تلخ کڑوی کسیلی جڑی بوٹیوں کی صلیب
تیری چھاتی پہ چن دیں ذرا
اور چمکیلے ریشم سے تیرا بنائیں کفن،
اور پانی سے کہہ دو، تری ان خموش انگلیوں
سے گزرتا ہوا ماتمی نغمہ گھڑتا چلے۔
بیوی: ہائے رے! شیر دل نوجواں چار چار
آئے ہیں اپنے کندھے تھکائے ہوئے۔
دلھن: ہائے رے! شیر دل نوجواں چار چار
اپنے کاندھوں پہ رکھے ہوئے موت کو!
ماں: میرے ہم سائے ہیں۔
چھوٹی لڑکی: (دروازے پر سے) لوگ اب لا رہے ہیں انھیں۔
ماں: ہاں، وہی بات ہے۔
بس صلیب، بس ہمیشہ صلیب۔
عورتیں: پیاری میخیں۔
صلیبیں بھی جن کی پرستش کریں۔
پیارا نام، ابن مریم کا، مالک کا اپنے۔
دلھن: اے صلیب! تو سدا زندوں مردوں کو رکھنا حفاظت میں اپنی، بچانا ہمیں۔
ماں: میرے ہم سایو دیکھو! چھری سے، ذرا سی چھری سے مقدر جو دن تھا، اور بس تین یا دو بجے ہوں گے

جب دونوں مردوں نے ایک دوسرے کا محبت کے کارن بہایا لہو۔ اک چھری، ایک ذرا سی چھری، جو
بمشکل ہتھیلی میں آئے مگر جو صفائی سے کاٹے بدن کو (جو حیرت زدہ ہے) رکے جا کے
اپنی جگہ پر جہاں
کانپتی ہے، گرفتار، اک چیخ کی
تیرہ تاریک جڑ۔

دلھن: اور یہ ایک چھری ہے، ذرا سی چھری، جو کہ مشکل
سے ہاتھوں میں آئے مگر
ایک مچھلی بلا فلس، پانی کے باہر،
تڑپتی ہوئی۔
اس لیے، پھر مقدر جو دن تھا، اور بس تین یا دو بجے ہوں گے جب
اس چھری سے وہ دو مرد
پتھر بنے، ان کے ہونٹوں پہ زردی بکھرنے لگی۔

ماں: وہ جو مشکل سے ہاتھوں میں آتی ہے لیکن
صفائی سے کاٹے بدن کو (جو حیرت زدہ ہے)، رکے جا کے
اپنی جگہ پر جہاں
کانپتی ہے، گرفتار، اک چیخ کی
تیرہ تاریک جڑ۔
(پڑوسی زمین پر گھٹنوں کے بل جھکے سسکیاں بھر رہے ہیں۔)

.... پردہ ....

چپ سوانگ

سیموئل بیکٹ

کردار: ایک گم نام آدمی (ڈیرک منڈل)

ہدایت: ڈیرک منڈل

موسیقی: جان بیکٹ

رائل کورٹ تھیٹر لندن میں 3 اپریل 1957ء کو پہلی بار پیش کیا گیا۔

ریگستان۔ چکا چوندھ کر دینے والی روشنی۔

دائیں طرف سے ایک آدمی اسٹیج پر الٹا پھینک دیا جاتا ہے۔

وہ گر پڑتا ہے، فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اپنے کپڑے جھاڑتا ہے،

رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے

دائیں طرف سے سیٹی

وہ کچھ سوچتا ہے، پھر دائیں طرف سے باہر نکل جاتا ہے۔

فوراً وہ دوبارہ اسٹیج پر پھینک دیا جاتا ہے، وہ گر پڑتا ہے، فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اپنے کپڑے جھاڑتا ہے،

رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

بائیں طرف سے سیٹی

وہ کچھ سوچتا ہے، پھر بائیں طرف سے باہر نکل جاتا ہے۔

فوراً ہی وہ دوبارہ اسٹیج پر پھینک دیا جاتا ہے، گر پڑتا ہے،

فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اپنے کپڑے جھاڑتا ہے، رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

بائیں طرف سے سیٹی۔

وہ کچھ سوچتا ہے۔ بائیں طرف جاتا ہے، جھجکتا ہے، پھر فیصلہ کرتا ہے کہ باہر جانا مناسب نہیں، رک جاتا ہے رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

سٹیج کی چھت سے ایک ننھا سا درخت اترتا ہے، زمین پر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔ درخت پر ایک ہی شاخ ہے جو زمین سے کوئی تین گز اوپر ہے اور اس کی پھنگی پر پام کا ایک معمولی سا گچھا ہے۔ گچھے کا سایہ درخت کی جڑ پر ایک حلقے کی صورت میں پڑ رہا ہے۔

وہ اب بھی سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی

وہ مڑتا ہے، درخت کو دیکھتا ہے، اس کے پاس جاتا ہے، اس کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے۔

اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔

کپڑے کاٹنے کی ایک قینچی چھت سے اترتی ہے، اور درخت کے سامنے، زمین کے ایک گز اوپر آ کر ٹھہر جاتی ہے۔

اور اب بھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہے۔

اوپر سے سیٹی

وہ اوپر نظر اٹھاتا ہے، قینچی کو دیکھتا ہے، اسے پکڑ لیتا ہے اور اپنے ناخن تراشنا شروع کرتا ہے۔

پام کا گچھا چھاتے کی طرح بند ہو جاتا ہے۔ سایہ غائب ہو جاتا ہے۔

وہ قینچی زمین پر گرا دیتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے۔

ایک ننھی سی صراحی، جس کے ساتھ ایک بہت بڑا لیبل لگا ہوا ہے، جس پر پانی لکھا ہوا ہے، چھت سے اترتی ہے اور زمین سے کوئی تین گز کے فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے۔

وہ اب بھی سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی

وہ اوپر نظر اٹھاتا ہے، صراحی کو دیکھتا ہے، کچھ سوچتا ہے، اٹھتا ہے، اور جا کر اس کے نیچے کھڑا ہو جاتا ہے، اس کو پکڑنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہے، پھر اس سعی کو ترک کر دیتا ہے، رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

ایک بڑا سا ٹھوس مکعب چھت سے اترتا ہے، زمین پر آکر ٹھہرتا ہے۔ وہ اب بھی سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی۔

وہ مڑتا ہے، اس کی نظر مکعب پر پڑتی ہے، وہ مکعب کو، پھر صراحی کو دیکھتا ہے، کچھ سوچتا ہے، مکعب کے پاس جاتا ہے، اسے اٹھاتا ہے اور اسے لے جا کر صراحی کے نیچے رکھ دیتا ہے، اسے ہلا جلا کر دیکھتا ہے کہ وہ ثابت ہے کہ نہیں، اس پر چڑھ جاتا ہے، صراحی تک پہنچنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہے، پھر اس سعی کو ترک کر دیتا ہے، اتر آتا ہے، مکعب کو اس کی جگہ پر واپس لے جاتا ہے، رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

ایک دوسرا ٹھوس مکعب، جو پہلے مکعب سے چھوٹا ہے، چھت سے اترتا ہے، زمین پر آکر ٹھہر جاتا ہے۔

وہ اب بھی سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی

وہ مڑتا ہے۔ اس کی نظر دوسرے مکعب پر پڑتی ہے، وہ مکعب کو، پھر صراحی کو دیکھتا ہے، دوسرے مکعب کے پاس جاتا ہے، اسے اٹھاتا ہے اور اسے لے جا کر صراحی کے نیچے رکھ دیتا ہے، اسے ہلا کر جلا کر دیکھتا ہے کہ وہ ثابت ہے کہ نہیں، اس پر چڑھ جاتا ہے۔ صراحی تک پہنچنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہے، پھر اس سعی کو ترک کر دیتا ہے، اتر آتا ہے، دوسرے مکعب کو اس کی جگہ پر واپس لے جانے کے لیے اٹھاتا ہے، جھجکتا ہے، پھر فیصلہ کرتا ہے کہ یہ مناسب نہ ہوگا، مکعب کو وہیں رکھ دیتا ہے، بڑے مکعب تک جاتا ہے اسے اٹھاتا ہے، پھر اسے لے جا کر چھوٹے والے مکعب کے اوپر رکھ دیتا ہے، انھیں ہلا جلا کر دیکھتا ہے کہ وہ ثابت ہیں کہ نہیں، ان پر چڑھ جاتا ہے، دونوں مکعب لڑکھڑا کر گر جاتے ہیں۔ وہ بھی گر پڑتا ہے، فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اپنے کپڑے جھاڑتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

وہ چھوٹا مکعب اٹھاتا ہے، اسے اٹھا کر بڑے پر رکھتا ہے، انھیں ہلا جلا کر دیکھتا ہے کہ وہ ثابت ہیں کہ نہیں، ان پر چڑھ جاتا ہے اور صراحی تک پہنچنے ہی کو ہوتا ہے کہ وہ ذرا سا اوپر کھینچ لی جاتی ہے اور اس کی دسترس

سے باہر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ وہ اتر آتا ہے، کچھ سوچتا ہے، دونوں مکعبوں کو ایک ایک کر کے ان کی جگہ پر واپس لے جاتا ہے، رخ بدلتا ہے کچھ سوچتا ہے۔ ایک تیسرا اور بھی چھوٹا مکعب چھت سے اترتا ہے، زمین پر آ کر ٹھہر جاتا ہے۔

وہ اب بھی سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی۔

وہ مڑتا ہے، اس کی نظر تیسرے مکعب پر پڑتی ہے، وہ اسے دیکھتا ہے، کچھ سوچتا ہے، رخ بدلتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے۔ تیسرا مکعب اوپر کھینچ لیا جاتا ہے اور اوپر جا کر غائب ہو جاتا ہے۔

صراحی کے پاس ایک رسی چھت سے اترتی ہے، اس میں گرہیں لگی ہوئی ہیں تاکہ چڑھنے میں آسانی ہو۔

وہ اب بھی کچھ سوچ میں ہے۔

اوپر سے سیٹی۔

وہ مڑتا ہے، رسی کو دیکھتا ہے، کچھ سوچتا ہے، رسی تک جاتا ہے، اس پر چڑھتا ہے اور صراحی تک پہنچنے کے قریب ہوتا ہے کہ رسی ڈھیلی کر کے گرا دی جاتی ہے اور وہ زمین پر آ رہتا ہے۔

وہ کچھ سوچتا ہے ادھر ادھر قینچی کو تلاش کرتا ہے، اس کی نظر قینچی پر پڑتی ہے، جاتا ہے، اسے اٹھا لیتا ہے، رسی کی طرف لوٹتا ہے۔ اور اسے قینچی سے کاٹنا شروع کرتا ہے۔

رسی اوپر کھینچ لی جاتی ہے۔ وہ رسی کے ساتھ زمین سے اوپر اٹھ جاتا ہے، وہ لٹکا رہتا ہے، رسی کو کاٹنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، دھم سے زمین پر گر پڑتا ہے، قینچی کو چھوڑ دیتا ہے، گر پڑتا ہے، فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

اپنے کپڑے جھاڑتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

رسی تیزی سے کھینچ لی جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ جتنی رسی اس کے پاس ہے اس سے وہ ایک کمند بناتا ہے، وہ کمند پھینک کر صراحی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

صراحی تیزی سے اوپر کھینچ لی جاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ وہ رخ بدلتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے۔

کمند ہاتھ میں لیے وہ درخت تک جاتا ہے، شاخ کو دیکھتا ہے، مڑتا ہے اور مکعبوں کو دیکھتا ہے، شاخ کو پھر دیکھتا ہے۔ کمند ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے، مکعبوں کے پاس جاتا ہے، چھوٹے والے کو اٹھاتا ہے، اسے اٹھا کر

شاخ کے نیچے لاکر رکھ دیتا ہے، واپس جا کر بڑے مکعب کو اٹھاتا ہے، اسے اٹھا کر شاخ کے نیچے لاتا ہے، وہ بڑے مکعب کو اٹھاتا ہے، اسے اٹھا کر شاخ کے نیچے لاتا ہے، وہ بڑے مکعب کو چھوٹے پر رکھنے والا ہوتا ہے کہ جھجکتا ہے، فیصلہ کرتا ہے کہ یہ مناسب ہوگا، بڑے مکعب کو زمین پر رکھ دیتا ہے، چھوٹے مکعب کو اٹھا کر بڑے پر رکھتا ہے، ان کو ہلا جلا کر دیکھتا ہے کہ وہ ثابت ہیں یا نہیں،

رخ بدلتا ہے اور جھکتا ہے کہ کمند کو اٹھائے۔

شاخ نیچے کو مڑ کر تننے سے چپک جاتی ہے۔

وہ کمند ہاتھ میں لے کر سیدھا ہوتا ہے، مڑتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ کیا ہو گیا۔

وہ کمند ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے، رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے، وہ دونوں مکعبوں کو ایک ایک کر کے ان کی جگہ پر واپس لے جاتا ہے، واپس آکر کمند اٹھاتا ہے، اسے مکعبوں کے پاس لے جاتا ہے، پھر اسے بڑے قاعدے سے لچھا بنا کر چھوٹے مکعب پر رکھ دیتا ہے۔

دائیں طرف سے سیٹی

وہ کچھ سوچتا ہے، پھر دائیں طرف سے باہر نکل جاتا ہے۔ فوراً ہی وہ دوبارہ اسٹیج پر پھینک دیا جاتا ہے، گر پڑتا ہے۔ فوراً اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے، اپنے کپڑے جھاڑتا ہے،

رخ بدلتا ہے۔ کچھ سوچتا ہے۔

بائیں طرف سے سیٹی

وہ ہلتا نہیں۔

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے، ادھر ادھر قینچی کو تلاش کرتا ہے، اس کی نظر قینچی پر پڑتی ہے، وہ قینچی کے پاس جاتا ہے، اسے اٹھاتا ہے اور اپنے ناخن تراشنا شروع کر دیتا ہے، رک جاتا ہے، کچھ سوچتا ہے، قینچی کی دھار پر اپنی انگلی پھیرتا ہے، جاتا ہے، اور قینچی کو چھوٹے مکعب پر رکھ دیتا ہے، رخ بدلتا ہے۔

اپنا کالر کھولتا ہے، گلا کھول کر اس پر انگلی پھیرتا ہے۔ چھوٹا مکعب اوپر کھینچ لیا جاتا ہے اور کمند اور قینچی کے ساتھ غائب ہو جاتا ہے۔

وہ قینچی اٹھانے کے لیے مڑتا ہے، دیکھتا ہے کہ کیا ہو گیا۔ وہ رخ بدلتا ہے، کچھ سوچتا ہے۔

وہ جا کر بڑے مکعب پر بیٹھ جاتا ہے۔

بڑا مکعب اس کے نیچے سے کھینچ لیا جاتا ہے۔ وہ گر پڑتا ہے۔ بڑا مکعب اوپر کھینچ لیا جاتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔

وہ کروٹ لیٹا ہوا پڑا رہتا ہے، اس کا رخ ناظرین کی طرف ہے، وہ اپنے سامنے نظر جمائے ہوئے ہے۔

صراحی چھت سے اترتی ہے اور اس کے جسم سے چند فیٹ کے فاصلے پر آ کر رک جاتی ہے۔

وہ ہلتا نہیں۔

اوپر سے سیٹی

وہ ہلتا نہیں

صراحی اور نیچے اترتی ہے۔ ادھر ادھر لہراتی ہے اور اس کے چہرے کے پاس ڈولتی ہے۔

دوہ ہلتا نہیں

صراحی کھینچ لی جاتی ہے اور اوپر جا کر غائب ہو جاتی ہے۔ شاخ پھر سیدھی ہو جاتی ہے، پام کا گچھا کھل جاتا ہے، سایہ واپس آ جاتا ہے۔

اوپر سے سیٹی

وہ ہلتا نہیں۔

درخت کھینچ لیا جاتا ہے اور اوپر جا کر غائب ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے۔

.... پردہ ....

ناول

کئی چاند تھے سرِ آسماں

چند ابتدائی ابواب

اِس طرح اُچھلتا ہے لہو ساتوں رنگ[(۱)]

ایک ذرا مڑ کر اُردو دُنیا کی اُن ساری شخصیات کو دیکھ آئیں جنھوں نے رواں زمانے کے صفحات پر ایک سے زیادہ جہتوں سے اپنے دستخط ثبت کیے اور محترم ٹھہریں تو اُن سب سے الگ اور نمایاں مقام پر بس ایک شخصیت ملے گی: شمس الرحمٰن فاروقی۔ میں ہمیشہ سے اُن کی غیر معمولی تنقیدی صلاحیتوں کا معترف رہا ہوں۔ مجھے موقع ملتا رہا ہے کہ ''شعر، غیر شعر اور نثر''، ''تفہیم غالب''، ''شعر شور انگیز'' اور ''اُردو کا ابتدائی زمانہ'' جیسے ان کے قابل قدر کام سے استفادہ کروں۔ جب میں نے فاروقی صاحب کا داستان امیر حمزہ کے حوالے سے کام ''ساحری، شاہی، صاحب قرانی'' دیکھا تو سچ کہوں تو یوں ہے کہ میرا کافر دِل (جو کم کم کسی کو مانتا ہے) احترام اور مرعوبیت سے بھر گیا تھا۔ یوں ہے کہ فاروقی صاحب کے لیے میرے دِل میں بے پناہ محبت اور احترام ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ میں اندر سے اُن کی شخصیت کے رعب اور دبدبے میں ہوں۔ ''گنج سوختہ''، ''سبز اندر سبز''، ''چار سمت دریا'' اور ''آسماں محراب'': یہ ان کی شاعری کے حوالے ہیں۔ درست کہ ایک زمانے میں انھوں نے شاعری کے مقابلے میں فکشن کی تخلیق کو مرتبے میں کم دیکھا دکھایا اور ہم جیسوں کو ردعمل پر اُکسایا مگر یہ بھی تو ماننا ہوگا کہ جب وہ فکشن لکھنے کی طرف آئے تو اس صنف کو عجب دھج

(۱) ناول کی تازہ اشاعت کا دیباچہ۔ اس تحریر کا عنوان شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کی ''رباعی سب رنگ'' سے ماخوذ ہے۔ یہ رُباعی کے اُن کے چوتھے مجموعہ کلام ''آسماں محراب'' میں ہے جو پہلی بار ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا تھا۔ مذکورہ رباعی کے آخری دو مصرعے مقتبس کیے دیتا ہوں:

دِل چیر کے میرا کبھی دیکھا ہوتا
کس طرح اُچھلتا ہے لہو ساتوں رنگ

سے ثروت مند بنا دیا۔ جی صاحب، یہ وہی فاروقی صاحب ہیں جو ''افسانے کی حمایت میں'' میں یہاں تک کہہ گزرے تھے کہ افسانے میں نئے تجربات کی کوئی جگہ نہیں اور یہ کہ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کا بیانیہ کردار پوری طرح بدلا نہیں جا سکتا مگر جب اُنھوں نے افسانے لکھے تو پانسہ پلٹ کر رکھ دیا اور ناول لکھے تو ہم اس تخلیقی تجربے کے سامنے حیرت کی تصویر بنے کھڑے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اچھا، یوں بھی لکھا جا سکتا ہے۔

مجھے یاد ہے ہم جشنِ ریختہ میں شرکت کے لیے نئی دِلّی میں تھے۔ فاروقی صاحب اپنے سیشن میں گفتگو کر چکے تو ہم مہمان مقررین کے لیے مختص جگہ پر اکٹھے ہو گئے۔ وہیں لوگ فاروقی صاحب کی کتابیں لا لا کر اُن سے دستخط لینے لگے۔ ایک صاحب اُن کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا پینگوئن سے چھپا ہوا انگریزی ترجمہ ''The Mirror of Beauty'' لائے اور ان سے اس پر آٹوگراف لینے کے لیے کتاب انہیں تھما دی۔ وہ نشست کی ٹیک پر پوری طرح پشت جمائے بیٹھے تھے۔ کتاب اُنھوں نے گود میں رکھی اور اُسے کھولتے ہوئے اس پر اپنے قلم کی نوک جمائی ہی تھی کہ وہیں موجود آصف فرخی نے کہا: ''فاروقی صاحب، آپ کا یہ کام تو بہت کمال کا ہے۔'' فاروقی صاحب نے قلم روکا نہیں، لکھتے رہے۔ اوپر دیکھا بھی نہیں مگر مجھے یوں لگا تھا جیسے اُن کے چہرے پر ایک چمک سی آگئی تھی۔ یہی چمک اُن کے اُس جملے میں تھی جو اُنھوں نے روئے سخن میری طرف کرتے ہوئے کہا تھا: ''یہ قصہ گو مانے تو۔'' یہ شوخ جملہ میرے لیے تازیانہ تھا۔ میں کون تھا جس کا ماننا نہ ماننا کوئی معنیٰ رکھتا تھا؟ یہ تو فاروقی صاحب کی محبت تھی کہ ایسا کہہ دیا۔ ہوا یہ تھا کہ جب اِس ناول نے، بہ قول اِنتظار حسین پاک و ہند کی ادبی دنیا میں ہلچل مچائی تھی۔ میں فاروقی صاحب کی تحقیقی ریاضتوں، لسانی کمالات اور انتہائی زرخیز اور شاداب متخیلہ کے وسیلے سے ایک بھولے بسرے کردار وزیر بیگم کی کہانی کو ایک تہذیبی، ادبی اور دستاویزی ناول میں ڈھلتے پا کر اُس مفلس بچے جیسا ہو گیا تھا جس کے سامنے روشنیوں اور رنگوں میں نہاتی، جی لبھاتی اور چھاتی پر دھاک بٹھاتی ایک کائنات تھی۔ ایسے میں قلم اٹھاتا تو کیسے؟ حتیٰ کہ وہ لمحہ آیا جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ تب تک میری جھولی میں شرمندگی سے سوا کچھ نہ تھا۔ میں اگر اِس ناول کے رُعب اور دبدبے میں تھا اور کچھ نہ لکھ پا رہا تھا تو ہمت والے یہاں وہاں کئی تھے جو اِس پر خوب خوب لکھ رہے تھے۔ یہ اُردو، ہندی والے بھی تھے اور انگریزی والے بھی۔ انتظار حسین اس شاندار استقبال کے ہنگامے کا مقابلہ اس ہلچل سے کر رہے تھے جو ''امراؤ جان ادا'' نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی تو ڈاکٹر اسلم فرخی کا کہنا تھا کہ یہ اکیسویں صدی ہی کی نہیں اُردو فکشن کی بہترین کتاب تھی۔ ہر کہیں اعتراف ہو رہا تھا اور صاف صاف کہا جا رہا تھا کہ اُردو کے عظیم ناول گننے لگو تو ہاتھ کی انگلیاں ختم ہو جانے سے پہلے ہی رُک جانا پڑتا ہے۔ فاروقی صاحب کا ناول اِن چند ناولوں میں شمار کیا جا رہا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان سب میں کئی حوالوں سے الگ اور نمایاں تھا۔

یوسف سادہ کار کی بیٹی اور داغ دہلوی کی ماں وزیر بیگم کی زندگی کے اوبڑ کھابڑ راستے میں چار مرد آئے۔ انگریز کیپٹن مارسٹن بلیک، نواب شمس الدین خاں والی لوہارو و فیروز پور جھرکہ، رامپور کا رئیس آغا مرزا تراب علی اور فتح الملک

بہادر نواب مرزا سلطان شاہ عرف مرزا فخرو بہادر۔ پہلے دو مردوں کے ساتھ وہ بن نکاحی رہی اور آخری دو مردوں نے باقاعدہ نکاح کے بول پڑھوائے تو بیوی کا درجہ پایا مگر یہ چاروں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق اُسے دُکھ سکھ دے کر لگ بھگ ایک سے انجام سے دوچار ہوئے۔ پہلا بلوے میں مارا گیا، دوسرا پھانسی چڑھ گیا، تیسرے کو ٹھگوں نے مار کر زمین میں دبا دیا اور چوتھا ہیضے کا لقمہ ہو گیا۔ ہر مرد کی موت کے بعد وزیر بیگم میں بہت کچھ پا کر بھی خالی رہ جاتی رہی۔ مرزا فخرو بہادر کی موت کے بعد تو کچھ باقی نہ رہا تھا۔ وہ قلعہ مبارک کے لاہوری دروازے سے یوں رخصت ہو رہی تھی کہ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا اور پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی اور سر جھکائے بیٹھی تھی اور اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

کہنے کو کہانی بس اتنی سی ہے۔ یہ کہانی فاروقی صاحب کے ہاتھ نہ لگتی اور اسے کوئی اور لے اڑتا تو شاید اتنی بھی نہ رہتی مگر جس طرح فاروقی صاحب نے اس بھولے بسرے کردار وزیر بیگم کی تصویر کی تلاش سے لے میاں مخصوص اللہ کی بنی ٹھنی تک پیچھے جاتے ہوئے ہند اسلامی تہذیبی ماضی سے کہانی کو جوڑ دیا ہے، اس سے ایک پوری تہذیب کی خوبیاں اور رنگینیاں بیان کا حصہ ہو گئی ہیں۔ راجپوتانے سے کشمیر اور سونپور تک واقعات کے پھیلاؤ اور مختلف مزاج کے کرداروں، فنون، عمارتوں اور رویوں کو کہانی کے اندر اپنی تکنیک سے رواں کرتے ہوئے جس طرح وزیر بیگم کی کہانی کو ایک عظیم ناول میں ڈھال لیا گیا ہے اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے محمد حسن عسکری کے وہ خیالات یاد آ جاتے ہیں جن کا اظہار انھوں نے غلام عباس کے افسانے ''آنندی'' کو پڑھ کر کیا تھا۔ عسکری صاحب نے کہا تھا کہ ''آنندی'' کی کہانی کسی اناڑی کے ہاتھ لگ جاتی تو پہلے تو وہ خوشی سے اُچھل پڑتا اور پھر دو چار صفحوں میں جھگڑا طے کر کے رکھ دیتا۔ بہ قول عسکری صاحب جس چیز نے آنندی کو لائق توجہ بنایا وہ مصنف کا صبر و سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' پڑھ کر فاروقی صاحب کے ہاں یہ صبر و سکون اور ٹھہراؤ، اِس سے کہیں بڑھ کر نظر آتا ہے جس مقدار میں عسکری صاحب نے نشان زد کیا ہے۔ ناول کے عین آغاز کے تین ابواب میں جب وہ ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی ماہر امراض چشم کی یادداشتوں سے بیانیہ تشکیل دے رہے ہوتے ہیں یا چوتھے باب میں اُن تحریرات پر مبنی متن ترتیب دیتے ہیں جو ڈاکٹر وسیم جعفر کے وکیل نے اپنے مؤکل کے مرنے کے بعد لندن سے بھیجی تھیں یا پھر اگلے باب میں یوسف سادہ کار کو راوی بنا لیا جاتا ہے اور بعد میں سارے قصے کو ہمہ جہت راوی کی نظر سے دکھایا اور سجھایا جاتا ہے تو ہر ہر مرحلے پر کمال درجے کا صبر اور ٹھہراؤ بیانیے کی اپنی جمالیات مرتب کرتا چلا جاتا ہے۔ کہہ لیجیے یہ محض حقیقت پسند راوی کا بیانیہ نہیں میاں مخصوص اللہ کے موقلم کا شاہکار بنی ٹھنی ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ ضخیم ناول ایک بار اٹھا لیں تو مکمل پڑھے بغیر ایک طرف رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم پڑھتے ہیں؛ چھلانگیں لگاتے ہوئے نہیں، ایک ایک لفظ اور ایک ایک سطر سے ہو کر، بیانیے کے اندر رچ بس کر؛ یوں جیسے اُس زمانے میں خود سانس لے رہے ہوتے ہیں جس کا قصہ ناول کا حصہ ہو رہا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا اس سبب ہوا ہے کہ فاروقی صاحب لکھتے ہوئے خود بے صبرے نہیں

ہوئے۔ یوں لگتا ہے انھوں نے کہانی کی ایک ایک منزل اور سارے مقامات پہلے سے طے کر رکھے تھے۔ کہاں کہاں سے ہو کر جانا ہے، کہاں ٹھہرنا ہے اور کہاں پہنچنا ہے۔ اس طرح یہ وزیر بیگم کی کہانی ہو کر بھی اپنے سروکار بڑھاتی چلی جاتی ہے اور ایک سطح پر ہند مسلم تہذیب اور مغلیہ سلطنت کے انہدام اور بکھراؤ کی علامت جیسا نظر آنے لگتی ہے۔

''مراۃ العروس''، ''فسانہ آزاد''، ''امراؤ جان ادا''، ''گئودان''، ''آگ کا دریا''، ''اُداس نسلیں''، ''آنگن''، ''خدا کی بستی''، ''بستی''، ''علی پور کا ایلی''، ''چاکیواڑہ میں وصال''، ''راجہ گدھ'' سے لے کر ''خوشیوں کا باغ''، ''بہاؤ''، ''راکھ'' اور حال ہی میں لکھے جانے والے ناول، سب نگاہ میں رکھیں اور اِن کے ساتھ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کو رکھ لیں، زبان، مواد، کردار نگاری، تکنیک، تہذیبی مظاہر کو متن میں برتنے کا چلن، زمان اور مکان سے معاملے کا قرینہ، بیانیے کی مضبوطی اور اثر انگیزی، ہر طرف سے آنک لیں تو اندازہ ہوگا کہ یہ بالکل الگ مزاج کا ناول ہے؛ محض ناول نہیں؛ اس سے کہیں بڑھ کر تہذیبی، ثقافتی تاریخ کی ادبی دستاویز۔ بجا کہ اس ناول کا مواد تحقیق پر استوار ہے اور بہ قول ''انتظار حسین محقق فاروقی یہاں ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے'' اور صاف لگتا ہے کہ لکھنے والے کو لسانی اور زمانی کروٹوں سے گہری دلچسپی ہے، اتنی کہ وہ زمانی اور مکانی اعتبار سے زبان کی تشکیل نو کرتے چلے گئے ہیں۔ ایسی زبان جو نہایت رس دار اور رواں ہے، اور ایسے بیانیے میں ڈھل گئی ہے جس کا اپنا آہنگ اور اپنی جمالیات ہے۔ وسیم جعفر، سوفیہ عرف مسیح جان عرف بادشاہ بیگم، میاں مخصوص اللہ، گجندر پتی مرزا، من موہنی، محمد یوسف سادہ کار، انوری خانم عرف بڑی بیگم، عمدہ خانم عرف منجھلی بیگم، وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم، مولوی نظیر، نواب یوسف علی خان، مارسٹن بلیک، نواب یوسف علی خان، ولیم فریزر، مرزا غالب، نواب شمس الدین، مرزا داغ دہلوی، تراب علی شاہ محمد آغا، نواب ضیا الدین، مرزا فتح الملک بہادر عرف مرزا فخرو، زینت محل یا دوسرے کردار! حقیقی ہوں یا فاروقی صاحب کے ہرے بھرے تخیل کے تراشے ہوئے فکشن کے کردار؛ سب تاریخی واقعات کی صحت کو ساتھ لے کر کہانی کا حصہ ہوئے ہیں یوں کہ کہیں کوئی رخنہ نہیں رہنے دیتے۔ فاروقی صاحب نے یہاں جو تخلیقی قرینہ چنا ہے، وہ ناول کے بنے بنائے سانچے سے کہیں زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ جی اتنا زیادہ اہم کہ یہ محض ناول نہیں رہتا ایک تہذیبی اور ادبی دستاویز کی سی عظمت پا لیتا ہے۔ تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' شمس الرحمن فاروقی کا وہ کارنامہ ہے جو اب اُردو ادب کا مستقل اور نہایت اہم باب ہے۔

فاروقی صاحب کا یہ شاہکار ناول پاکستان سے پہلی بار ''شہرزاد، کراچی'' کے زیر انصرام چھپا تھا۔ ''شہرزاد'' کے پروپرائٹر، ہمارے دوست اور افسانہ نگار آصف فرخی (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) نے تب جو نسخہ

مجھے عطا کیا تھا، اُس پر ضابطے کی ذیل میں، اشاعت کا مہینہ اور سال بھی درج ہے؛ جنوری ۲۰۰۶ء۔ ہندوستان میں یہ کہیں جولائی ۲۰۰۶ء میں شائع ہو پایا تھا۔ اس کے بعد ''شہرزاد'' نے پاکستان سے اور ''پینگوئن'' نے ہندوستان سے کئی ایڈیشن نکالے۔ کوئی سال بھر پہلے امر شاہد ملے تو خواہش ظاہر کی کہ اُن کا ادارہ ''بک کارنر، جہلم'' فاروقی صاحب کا ناول بہت اہتمام سے اور اُن کی اجازت سے چھاپنا چاہتا ہے۔ وہ اس باب میں میری سفارش کے متمنی تھے۔ ناول چوں کہ آصف فرخی چھاپ رہے تھے اس لیے بات آگے نہ بڑھی۔ چند ماہ پہلے اُنھوں نے ایک بار پھر مجھ سے اس دلیل کے ساتھ رابطہ کیا کہ آصف فرخی کا ''شہرزاد'' چوں کہ اب کوئی کتاب خود نہیں چھاپ رہا اور اُن کی اپنی کتابیں بھی دوسرے اداروں سے نکل رہی ہیں اس لیے فاروقی صاحب سے ناول کی اشاعت کے حقوق اُنہیں دینے کی بات کروں۔ میں نے اُن کے بے پناہ اصرار اور شدید خواہش کے پیشِ نظر فاروقی صاحب سے سفارش کر دی۔ انہیں ''بک کارنرز'' کی کتابیں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اُن کی طباعت کے معیار سے مطمئن تھے۔ اصولی طور پر اجازت دینے کے بعد انھوں نے کہا آصف فرخی سے بھی بات کر لی جائے۔ امر شاہد کے اصرار پر میں نے آصف فرخی سے بات کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کچھ اپنی کتابیں بھی ''بک کارنرز'' سے چھپوانے کا عندیہ دیا۔ امر شاہد، آصف فرخی اور فاروقی صاحب کے درمیان رابطہ ہو گیا تو میں ایک طرف ہو گیا کہ معاملات طے پا گئے تھے۔ آصف فرخی اچانک ہم سے بچھڑ گئے تو ''بک کارنرز'' سے ناول کی اشاعت کا معاملہ تعطل کا شکار ہو گیا۔ مجھے ایک بار پھر فاروقی صاحب سے رابطے کے لیے کہا گیا۔ خود امر شاہد نے بھی اُن سے رابطہ کیا تو انھوں نے ''بک کارنر جہلم'' کو اجازت نامے کی دستاویز لکھ کر دے دی اور مجھے بھی تمام تفاصیل لکھ کر ای میل کر دیں۔

''بک کارنر، جہلم'' نے متن کو غلطیوں سے پاک رکھنے اور تازہ اشاعت کو ناول کے شایانِ شان بنانے کے لیے جو اہتمام کیا اِس کا قصہ الگ ہے اور وہ سب یوں میرے علم میں ہے کہ وہ اس عرصے میں بار بار مجھ سے رابطہ کرتے رہے۔ چھپنے سے پہلے پورا ناول کمپیوٹر سے نکال کر مجھے دِکھا لیا۔ جس لفظ پر انہیں شک ہوا، اس کا پوچھا، صفحہ سازی پر مشورے لیے اور یوں یہ منصوبہ احسن طریقے سے اپنی تکمیل کو پہنچا۔

میں پاکستان سے اِس تازہ اشاعت پر محترم شمس الرحمٰن فاروقی اور ''بک کارنر، جہلم'' کے پروپرائٹرز شاہد حمید، گگن شاہد اور امر شاہد کو دِل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

محمد حمید شاہد

ہستی پر بنیاد نہ ہونے دینا
مقصود کو برباد نہ ہونے دینا
اے دشت خلا کا عزم کرنے والے
سیمرغ[1] کو آزاد نہ ہونے دینا

---

[1] نظامی کی مثنوی "ہفت پیکر" میں بادشاہ سیمرغ پر سوار ہو کر ایک نئی دُنیا کا سفر کرتا ہے۔

کئی چاند تھے سرِ آسماں

وزیر خانم

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم (پیدائش غالباً ۱۸۱۱ء) محمد یوسف سادہ کار کی تیسری اور سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ ان کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ لیکن محمد یوسف سادہ کار دہلوی الاصل نہ تھے، کشمیری تھے۔ یہ لوگ دہلی کب اور کیونکر پہنچے اور دہلی میں ان پر کیا گذری، یہ داستان لمبی ہے۔ اس کی تفصیلات پہلے بھی کچھ بہت واضح نہ تھیں اور اب تو تمادی ایام کے باعث اور کچھ دوسری مصلحتوں کے باعث شاید بالکل بھلادی گئی ہیں۔ جو کچھ معلوم ہوسکا ہے وہ حسب ذیل ہے، لیکن ضروری نہیں کہ یہ سب تاریخی طور پر بالکل درست ہو۔

وزیر خانم ۱۲۴۵ / ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۲۹ / ۱۸۳۰ء میں نواب شمس الدین احمد خان، والی فیروز پور جھرکہ ولوہارو سے منسلک تھیں۔ لیکن اس سے پہلے وہ مسٹر ایڈورڈ مارسٹن بلیک صاحب انگریز Edward Marston Blake, Gent. کے ساتھ بھی رہ چکی تھیں۔ اس زمانے میں وہ مارسٹن بلیک کے دو بچوں، یعنی ایک بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) عرف امیر مرزا اور ایک لڑکی سوفیہ (Sophia) عرف مسیح جان، عرف بادشاہ بیگم کی ماں بنیں۔

گمان غالب یہ ہے کہ مارسٹن بلیک (Marston Blake) ان کی زندگی میں پہلا مرد تھا اور اس سے وزیر خانم کی ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ تقریب ملاقات کا کچھ مصدقہ حال نہیں ملتا۔ پردہ نشین مسلمان لڑکی جو بظاہر کسبن یا پیشہ ور نچنی نہ تھی، کس طرح اور کیوں ایک انگریز کے تصرف تک پہنچی، اس کے بارے میں کوئی تحریری روایت یا کسی چشم دید گواہ کے بیان کی بنیاد پر مرتب کی ہوئی روداد موجود نہیں ہے۔ خاندان میں جو روایت ایک زمانے میں متداول تھی وہ حسب ذیل ہے۔

بڑی بوڑھیوں کا کہنا تھا کہ ایک بار عرس مبارک کے ایام میں وزیر خانم اپنے والد کے ساتھ مہرولی شریف خواجہ قطب صاحب کی درگاہ فلک بارگاہ سے واپس آرہی تھیں۔ شام پھوٹ چلی تھی، سب مسافروں کو مراجعت کی جلدی تھی، کہ حوض شمسی کے کھنڈر ان دنوں بعض پنڈاروں نے چپکے چپکے اپنی آماجگاہ بنا لیے تھے اور موقع مناسب دیکھ کر وہ رات کے مسافروں کا شکار کھیل لیا کرتے تھے۔ لہٰذا سب ہی اس تگ و دو میں تھے کہ سورج افق مغرب سے نیچے نہ اترنے پائے اور وہ حوض شمسی اور حوض خاص کے مضافات کو پار کر لیں۔ وزیر خانم کی بہلی کا ایک دھرا گھستے گھستے ذرا مخدوش ہو گیا تھا اور خوف تھا کہ بیلوں کو اگر تیز دوڑایا گیا تو دھرا ٹوٹ سکتا ہے۔ ان کی بہلی آہستہ آہستہ چل رہی تھی، یہاں تک کہ ساتھ کے تمام مسافر، خواہ وہ بہلیوں پر تھے یا تام جھام یا پالکیوں پر، آگے نکل گئے۔ فیل نشین، شہسوار، سانڈنی سوار اور بگھی سوار تو پہلے ہی یہ جادہ جانظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

وسط بیساکھ کے دن تھے۔ ریواڑی اور لوہارو کی طرف سے آنے والی گرم ہوا میں جتنی گرمی تھی اس سے زیادہ گرد و غبار تھا۔ لیکن یہی گرد و غبار ہفتے میں چار یا پانچ دن سورج ڈھلنے کے کچھ پہلے الور اور رنتھم بھور کے جنگلوں کی تھوڑی بہت رطوبت پی کر اور راستے کی گھنی جھاڑی جھنڈیوں سے ملاطفت کرتا جب گوڑ گاؤں پہنچتا تو طوفان ابر و باد کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی دلی پر بہت ساری مٹی اور اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، بلکہ جھکڑ، سارے میں غبار کی ہلکی سی چادر اور خنکی کا محبت اور مروت بھرا ماحول بچھا کر، دلی اور مضافات کی ارض و غبرا کو خوش کرتے، دو ڈھائی گھڑی کے کھیل کود کے بعد متھرا کی راہوں میں خود کو گم کرنے نکل جاتے اور دلی کے امیر و غریب، وضیع و شریف، جوان و پیر، سب کے کلیجے اور آنگن ٹھنڈے ہو جاتے۔

لیکن ایسے میں ان مسافروں کی جان پر بن آتی جو منزل سے دور ہوتے یا جن کی سواریاں ان سے بے وفائی پر آمادہ ہوتیں۔ اچانک وزیر خانم کی بہلی ریت اور لال مٹی کے بڑے بڑے ذروں سے بھر گئی۔ بیلوں کی بڑی بڑی آنکھیں دہشت اور چبھن کے باعث بند ہو گئیں۔ بہلی کے تین پردے جھرا نا مار کر یوں اڑے گویا لومڑی کے خوف سے بوکھلائے ہوئے تیتر ہوں۔ گاڑھی ہوتی ہوئی روشنی میں ماشی اور قرمزی رنگ کے پردے کچھ دور تک تو ہوا میں معلق دکھائی دیے، پھر خدا جانے کہیں دور اڑ گئے یا گھنے درختوں کی شاخوں نے ان کو اچک لیا۔ پردوں کے یوں اڑ جانے، بیلوں کے بھڑکنے اور سواریوں کے جگہ سے بے جگہ ہونے کے باعث گاڑی کا توازن جو بگڑا تو بہلی چار کے بجائے دو پہیوں پر معلق ہو گئی اور پھر ہوا کے دوسرے تھپیڑے نے اسے سیدھا کیا تو چاروں پہیے ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرائے اور اسی کے ساتھ ساتھ دھرے کے ٹوٹ جانے کی کریہہ آواز سنائی دی۔ فوری طور پر تو سمجھ میں نہ آیا کہ بہلی میں کوئی چیز ٹوٹی ہے یا آس پاس کے درختوں کی کوئی موٹی شاخ ہوا کے دباؤ سے مجبور ہو کر زمیں بوس ہو گئی ہے۔ لیکن بہلی کا ایک پہیہ بھی چشم زدن میں الگ ہو گیا اور بہلی دوبارہ الٹتے الٹتے بچی تو بچارے مسافروں کو معلوم ہوا کہ ان پر کیا آفت ٹوٹی ہے۔

وزیر خانم کے باپ نے تو تقدیر ٹھونک لی تھی کہ آج کی رات اس کے اور اس کی بیٹی کے لیے آخری رات ہوگی۔ اب کوئی اکا دکا بچھڑا ہوا مسافر تو کیا، کوئی قافلہ بھی گذرنے والا نہ تھا، نہ کہیں سے کوئی دستگیر پیدا ہوسکتا تھا کہ سب اپنی اپنی پناہ گاہوں میں بند تھے۔ شکستہ بہلی کے سواروں کی رات اسی بیابان میں گذرنی تھی اور صبح کا منھ دیکھنا انھیں شاید ہی نصیب ہونا تھا۔ لڑکی کو تو لونڈی یا قحبہ بننا تھا اور باپ کی قبر وہیں بنی تھی۔ گاڑی بان شاید بچ نکلتا تو بچ نکلتا۔

لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ دہلی کی طرف سے ایک نیم روشن ابر نما بڑا دھبہ سڑک پر متحرک نظر آیا۔ پھر سانڈنی کے پاؤں کی جھنا جھن سنائی دی، پھر ایک گھڑ سوار، جس کے پس اور جلو میں دو برچھیت ہواؤں اور غبار کے آگے منھ کو ڈھانکے ہوئے، لیکن پامرد اور ثابت قدم، ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پاؤں رکھتے ہوئے، گھوڑ سوار کے دونوں طرف دو احدی، ایک کے ہاتھ میں مشعلہ، ایک کے ہاتھ میں باد بان (۱) گھوڑا بھی خوب سدھا ہوا تھا کہ ہوا کے تھپیڑے اور درختوں کی سائیں سائیں اس کی دلجمعی میں قطعاً حارج نہ تھی۔

سانڈنی سوار نے دھندلاتی فضا میں اپنی فراست کو کام میں لاتے ہوئے تھوڑی دور پر ہی سے سمجھ لیا تھا کہ مصیبت زدہ مسافر ہیں۔ ٹھگ بھی ہوسکتے تھے، لیکن یہ موسم ٹھگی کا نہ تھا اور نہ وہ علاقہ ٹھگوں کا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ٹھگوں کے جرگے میں عورتیں نہ ہوسکتی تھیں۔ سانڈنی سوار اور برچھیت نفر تو آگے بڑھتے آئے لیکن گھڑ سوار اپنے روشنی بردار احدیوں کے ساتھ ذرا فاصلے پر رک گیا۔ ابھی کچھ واضح نہ تھا کہ شہسوار کی ذات برادری کیا ہے۔ بادشاہ ظل الٰہی کے اہل کاران بھی ان اطراف میں شاموں کو گشت لگاتے دکھائی دے جایا کرتے تھے اور کمپنی بہادر کے بھی سپاہی کسی کسی دن نکل پڑتے تھے۔ ادھر گاڑی بان نے بھی سمجھ لیا تھا کہ یہ لوگ ڈاکو لٹیرے نہیں ہیں، ان سے امداد کی درخواست ممکن ہے۔

گاڑی بان آگے بڑھا تو سانڈنی سوار نے اپنی سواری کو ڈپٹا کر اس کا راستہ روک دیا اور پوچھا:

''کون ہو تم لوگ؟ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ جانتے نہیں ہو غروب آفتاب کے بعد کسی قافلے یا سپاہیوں کی نفری کے بغیر یوں پھرنا ممنوع ہے؟''

''جانتے ہیں مائی باپ۔ ہم لوگ خواجہ صاحب بختیار بابا کے دربار سے آرہے ہیں۔ اچانک آندھی نے

۱۔ مشعل کی لکڑی سے ذرا چھوٹی لکڑی کے ایک سرے پر پیتل کا گہرا پیالہ نصب کر دیتے تھے، پھر مشعل میں جلانے کا سامان، مثلاً سرسوں کے تیل کی گاڑھی تلچھٹ یا روغن نفت میں تر کیا ہوا موٹا چیتھڑا، اس میں یوں رکھتے تھے کہ پیالے کی کور اس کے لیے اوٹ کا کام کرتی تھی۔ لہٰذا اس کا شعلہ ہوا سے بجھتا نہ تھا۔ ایسی مشعل کو مشعلہ کہتے تھے۔ دستی اس سے بھی چھوٹی مشعل ہوتی تھی۔ ایسا فانوس، جو چاروں طرف سے بند ہو لیکن جس میں ہوا کے لیے ننھے ننھے سوراخ ہوں اور جسے ہاتھ میں لیا جا سکے، باد بن کہلاتا تھا۔ انگریزی لفظ Lantern سے بنایا ہوا لفظ لالٹین اور روشنی کے آلے کے طور پر خود لالٹین بھی رائج ہو رہے تھے، لیکن احدی اور مشعل بردار اسے کم استعمال کرتے تھے۔

آلیا۔ پھر پہیہ ٹوٹ گیا۔ اب یہاں کھڑے اپنی جان کو رو رہے تھے۔ پردے کی بیبیاں ساتھ ہیں، اللہ ہی جانتا ہے کیا ہو جاتا اگر آپ اور او غلان صاحب....''

''زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ تمھارے مالک کہاں ہیں؟ کمپنی صاحب کے سامنے حاضر ہوں۔''

''حاضر ہیں سرکار، بس زنانہ ایک تل اوٹ ہو جائے، بے پردگی ہوتی ہے۔'' اس فروتنی کے عالم میں بھی گاڑی بان کا اشارہ تھا کہ فرنگی مرد ذرا دور ہی رہے تو بہتر ہے۔

وزیر خانم کا باپ خود کو ٹوٹی ہوئی بہلی سے الگ کر کے آگے آ رہا تھا کہ گھڑ سوار نے اپنی سواری کو حرکت دی اور ایک لمحے میں وہ اور بہلی کی سواریاں آمنے سامنے تھیں۔ اتنی دیر میں ایک برچھیت نے انگریزی وضع کی ایک لالٹین بھی روشن کر لی تھی۔ لیکن اسی اثنا میں ہوا بھی تیز تر ہو گئی تھی۔ لالٹین کا شعلہ دھواں سا ہوا جا رہا تھا۔ اچانک ایک زور کا جھونکا آیا اور وزیر خانم کے بدن کی چادر اڑتی چلی گئی اور دفعتاً اس کا چہرہ کھل گیا۔ بڑی بڑی جامنی آنکھوں کے نیچے اس کا منھ خوف، گھبراہٹ اور شرم کے باعث کالے ہرن کی پیشانی جیسا تمتما اٹھا تھا اور لالٹین کی کپکپاتی ہوئی لو نے اس کے آپے کو ذرا اور روشن کر دیا تھا۔ انگریز اسے تکتا رہ گیا اور ادھر ایک دلکش غیر مرد کو اپنے میں اس قدر مستغرق دیکھ کر جوانی کی بڑھتی ہوئی موجوں نے کچھ شوخ ہونے کی ٹھانی۔ دونوں کی آنکھیں ایک نگاہ بھر تک ملیں، پھر گاڑی بان نے جلدی سے ایک چادر کھینچ کر اس کے بدن پر ڈال دی۔

یہ انگریز مارسٹن بلیک تھا جو اپنی معشوقہ کے گھر رات گذار نے عرب سرائے جا رہا تھا۔ تھوڑی سی گفتگو اور کچھ تامل کے بعد یہ طے ہوا کہ مارسٹن بلیک صاحب بنفس نفیس ان مسافروں کو حوض شمسی کے آگے منیر کے باغ تک پہنچا دیں گے۔ وہاں سے کسی معتبر سواری کا انتظام ممکن تھا۔ منیر کے باغ تک کا سفر زنانہ سواریاں تو کسی نہ کسی طرح ٹھنس ٹھنسا کر سانڈنی پر کر لیں گی۔ باقی لوگوں کو گھوڑے کی دلکی چال کے ساتھ ساتھ چلنا تھا۔ مسافروں کا سامان بہت نہ تھا، کچھ کو تو سانڈنی ہی پر ڈال لیا گیا۔ جو تھوڑا بہت بچا اسے بھی کسی صورت برچھیتوں اور گاڑی بان نے اٹھا لیا۔

اس واقعے کے بعد مارسٹن بلیک کسی نہ کسی تقریب سے ہر دو تین دن پر وزیر خانم کے گھر پہنچ کر سیر و تفریح کی باتیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ اسے چاندنی چوک اور نہر کی سیر کے لیے لوا لے جاتا۔ ماں تو تھی نہیں، باپ ان کے ساتھ ہوتا، لیکن طوعاً و کرہاً اور بیٹی کو پوری چادر لپیٹ کر باہر جانے پر ہمیشہ اصرار کرتا۔ پھر بھی، اس اثنا میں وزیر خانم سے اس کے چپکے چپکے کیا مراسم بنے یا کیا عہد و پیمان ہوئے، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ خیر، چند مہینے بعد مارسٹن بلیک نے آ کر خبر دی کہ میں اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کی اسامی پر متعین ہو کر ریاست جے پور جا رہا ہوں۔ اس وقت تو کچھ خاص بات چیت نہ ہوئی، صرف رسمی افسوس اور راہ و رسم قائم رکھنے کے وعدوں کے بعد مارسٹن بلیک ان سے رخصت ہوا۔ لیکن وہ پھر ایک سوا مہینے بعد دہلی واپس آیا تو محمد یوسف کے یہاں بھی گیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے مناسب مکان لے لیا ہے اور گرہستی کے سب ساز و سامان مہیا کر لیے ہیں۔ تنخواہ بھی معقول ہے، نوکر چاکر قدم قدم پر موجود ہیں، ہل کر پانی بھی

نہیں پینا پڑتا۔ جے پور میں میری بڑی آؤ بھگت ہے۔ بس صاحب پولیٹکل ایجنٹ میرے حاکم بالا ہیں، ورنہ اور مجھ سے نکلتا ہوا وہاں کوئی نہیں۔

مارسٹن بلیک کی باتیں سن کر سب لوگ کچھ دیر کے لیے خاموش سے ہو گئے۔ پھر مارسٹن بلیک ہی نے پہل کی، لیکن کچھ کہنے کے بجائے اس نے چھوٹی بیگم کو ذرا معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ کچھ ادھر کا بھی اشارہ دیکھ کر بلیک اور محمد یوسف خاموشی سے ایک طرف کو ہو لیے، سرگوشیوں میں کچھ گفتگو ہوئی۔

اس کے کوئی ہفتہ بھر بعد مارسٹن بلیک کے قافلے میں، جو عازم جے پور تھا، آرائش اور گوٹے ٹھپے سے جگمگاتا ہوا اور تازہ پھولوں کے گجروں سے گمکتا ہوا اور تازہ ہری ترہات سے ہریالا بنا ہوا ایک رتھ بھی تھا۔ وزیر خانم عرف چھوٹی بیگم زرق برق حلۂ عروسی میں محلل اس میں سوار تھیں۔

سوفیہ

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

مارسٹن بلیک کی موت ریاست جے پور میں بزمانۂ ملازمت ایک مقامی بلوے میں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ اوائل ۱۸۳۰ء کا ہے۔ انگریزوں نے غالباً از راہ نا منصفی یا از روے قانون انگریزی، چھوٹی بیگم اور مارسٹن بلیک کے رشتۂ زنا شوئی کو تسلیم نہ کیا تھا۔ لہٰذا بلیک کے املاک غیر منقولہ اور نقد وجنس سے چھوٹی بیگم کو کچھ بھی نہ ملا۔ نہ انھیں کچھ گذارے کی رقم یا پنشن ملی۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، چھوٹی بیگم کے بطن سے مارسٹن بلیک کے دو اولادیں ہوئی تھیں، ایک بیٹا مارٹن بلیک عرف امیر مرزا اور بیٹی سوفیہ عرف مسیح جان عرف بادشاہ بیگم۔ سوفیہ اپنے وقت کے حسینوں میں تھیں۔ ان کی پہلی شادی مشہور اینگلو انڈین فوجی افسر ایلکزنڈر اسکنر (Alexander Skinner) المعروف بہ ایلک صاحب سے ہوئی تھی جس کے باپ جیمس اسکنر (James Skinner) عرف ''سکندر صاحب'' کے فوجی رسالے Skinner's Horse کی بڑی شہرت تھی۔ بیگم اسکنر، یعنی سوفیہ عرف بادشاہ بیگم عرف مسیح جان کو اردو کے ادبی حلقوں میں مس بلیک خفی کے نام سے جانا گیا۔ وہ اپنے زمانے کے خوش فکر شعرا میں شمار ہوتی تھیں۔ یہ دونوں بھی اپنے باپ کے ترکے سے محروم رہے۔ لیکن اس کی ایک رشتے کے چچا چچی اور خود چھوٹی بیگم نے ان کی کفالت کی۔

سوفیہ مارسٹن بلیک اور ایلکزنڈر اسکنر (Alexander Skinner) کے ایک بیٹا بہادر میرزا نام کا اور ایک بیٹی احمدی بیگم نامی ہوئیں۔ احمدی بیگم کا عیسائی نام شارلٹ (Charlotte) تھا لیکن وہ کہلائیں احمدی بیگم۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں ان کی اولادیں جے پور میں خوش حال زندگی بسر کر رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ اس شادی سے ایک اور بیٹا محمد امیر یا

امیر مرزا، یا امیر اللہ، بھی پیدا ہوا تھا۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، امیر مرزا تو مارسٹن بلیک (Marston Blake) کے بیٹے مارٹن بلیک (Martin Blake) کی عرفیت تھی۔

یہ ضرور ہے کہ سوفیہ عرف بادشاہ بیگم کے دوسرے شوہر کا نام محمد امیر، یا امیر اللہ تھا۔ ان کے ایک بیٹا تھا، لیکن اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، بجز اس کے کہ اس بیٹے کے ایک بیٹا ہوا جس کا نام حسیب اللہ قریشی تھا۔ حسیب اللہ کی پیدائش شاید ۱۸۹۰ء کے آس پاس ہوئی۔ (ممکن ہے کہ امیر اللہ پہلے شوہر رہے ہوں اور ان کے انتقال کے بعد سوفیہ بیگم نے ایلک صاحب سے نکاح کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ امیر اللہ دوسرے شوہر رہے ہوں، یا انھوں نے سوفیہ بلیک سے نکاح نہ کیا ہو، انھیں صرف داخل حرم کر لیا ہو۔) حسیب اللہ قریشی نے اپنے باپ کا اصل نام ونسب کیوں چھپایا اور خود کو قریشی کیوں قرار دیا، یہ بات کبھی نہ کھلی۔ ممکن ہے کہ امیر اللہ نسباً قریشی رہے ہوں، لیکن حسیب اللہ کے عمل اخفا سے یہ گمان پیدا ہونا فطری ہے کہ امیر اللہ اور سوفیہ عرف بادشاہ بیگم رشتۂ نکاح میں منعقد نہ ہوئے تھے۔ بہر حال، یہی حسیب اللہ قریشی بعد میں سلیم جعفر کے نام سے اردو کے ممتاز ادیب، نقاد اور عروضی مشہور ہوئے۔ سلیم جعفر نے نظیر اکبر آبادی کا ایک مبسوط انتخاب ''گلزار نظیر'' کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد کے لیے کیا تھا۔[1] یہ اب بھی کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے غالب اور دوسرے کلاسیکی شعرا پر بھی لکھا ہے۔ فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی بھی وہ خوب جانتے تھے اور انگریزی تو گویا اردو کے ساتھ ساتھ ان کی پہلی زبان تھی۔

سلیم جعفر کا انتقال کراچی میں ہوا۔ غیر منقسم ہندوستان میں وہ اچھی سرکاری ملازمت پر متمکن تھے۔ پاکستان میں انھیں اپنی لیاقت کے موافق، بلکہ اس سے کچھ نزدیک مرتبے کا بھی کام نہ ملا۔ ایسا شاید اس لیے بھی ہوا ہو کہ وہ وظیفہ یابی کی عمر (اس زمانے میں پچپن سال) کو پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے میر پور خاص (تب مغربی پاکستان) میں سکونت اختیار کی اور ایک مقامی وکیل محمد لطیف گاندھی کے یہاں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ انھوں نے تصنیف وتحقیق کا کام جاری رکھا اور ایک مبسوط لغت اشتقاق بھی مرتب کیا۔ ''تحقیق اللغات'' نام کے اس لغت میں اردو کے ایسے الفاظ کے اشتقاقات بتائے گئے ہیں جو سنسکرت یا فارسی سے اردو میں آئے ہیں۔ افسوس کہ یہ لغت ابھی تک تشنۂ انطباع ہے۔ میر پور خاص میں ادب گلشن آبادی اور پھر پروفیسر کرار حسین کے ساتھ ان کی ادبی صحبتوں نے ان کی زندگی کو کچھ دلچسپ بنا دیا تھا۔ کرار صاحب کی فرمائش پر شاہ عبداللطیف بھٹائی کالج میں تقابلی لسانیات اور دیگر علمی موضوعات پر سلیم جعفر نے کئی لیکچر بھی دیے جو بہت کامیاب رہے۔ سلیم جعفر کا رویہ طالب علموں کے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا اور وہ بلا معاوضہ ان کی علمی امداد کرتے تھے اگرچہ خود ان کی مالی حالت بہت اچھی نہ تھی۔

سلیم جعفر کی واحد اولاد ان کے بیٹے اعجاز احمد قریشی تھے۔ باپ کی طرح وہ بھی اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ انھیں تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا، لہٰذا انھوں نے شمیم جعفر قلمی نام اختیار کیا لیکن انھوں نے کوئی

---

(۱) مطبوعہ ۱۹۵۱ء

تصنیف نہیں چھوڑی۔ باپ کے برعکس انھیں نواب مرزا داغ سے اپنی قرابت داری، وہ دور کی سہی، بڑی قابل ذکر بات معلوم ہوتی تھی۔ شمیم جعفر نے داغ کی والدہ یعنی اپنی پردادی وزیر خانم کے بہت سے حالات کتابوں، بزرگوں کی یادداشتوں اور بڑے بوڑھوں سے پوچھ پوچھ کر جمع کیے تھے۔

شمیم جعفر (اعجاز احمد قریشی) کی شادی سلیم جعفر کی ایک اینگلو انڈین قرابت دار خاتون ہرمائنہ مارٹیمر (Hermione Mortimer) کی اکلوتی بیٹی پرڈیٹا مارٹیمر (Perdita Mortimer) سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں کسی چائے کے باغ میں منیجر تھے۔ ایک بار باغ کے مزدوروں نے اپنے میٹ کے کسی برے برتاؤ کی بنا پر ہڑتال کردی اور ان میں سے تھوڑے بہت کچھ تشدد پر بھی مائل ہو گئے۔ پولیس یا انتظامیہ کے آتے آتے شمیم جعفر کے گھر پر ایک بھیڑ مجتمع ہو گئی۔ شمیم جعفر کو چونکہ اپنی ہر دلعزیزی پر اعتماد تھا، اس لیے وہ کسی خطرے کی پروا کیے بغیر مجمعے کے سامنے چلے آئے اور مزدوروں کے رہنماؤں سے انھوں نے اتنی خوش اسلوبی اور خوش خوئی سے گفتگو کی کہ ہڑتال وہیں کی وہیں واپس لے لی گئی۔ اپنے مقصود میں کامیابی اور ہڑتال کے ختم ہو جانے کی مسرت میں سرشار مجمعے نے شمیم جعفر کو کاندھوں پر اٹھالیا اور ''منیجر صاحب زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ہوئے انھیں باغ کی طرف لے چلے۔ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ شمیم جعفر کی سرکاری زندگی کا سب سے منور لمحہ چشم زدن میں حادثے کا شکار ہو کر ان کی اور ان کے گھر والوں کی دنیا اندھیری کر گیا۔

وہ دن بارشوں کے تھے اور چائے کے علاقوں میں بارش عام ملک سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر یہ باغات زیادہ تر ڈھلواں زمین پر لگائے جاتے ہیں کہ بارش سے پودے سیراب تو ہوں لیکن پانی کہیں ٹھیرنے نہ پائے۔ فتح مندی اور تشکر کے احساس سے چور مزدوروں نے شمیم جعفر کو کاندھوں پر اٹھائے اٹھائے ایک معمول سے زیادہ تیز ڈھال پر چڑھنا چاہا۔ ایک مزدور کا پاؤں جو رپٹا تو سب کے سب دور تک لڑھکتے ہوئے بالآخر بائیں طرف کی ایک نچلی کھائی میں جا رہے۔ جان تو بفضلِ خدا کسی کی نہ گئی لیکن زخمدار سبھی ہوئے۔ شمیم جعفر کے سر میں گہری چوٹ آئی جس کی بنا پر وہ اپنا حافظہ کھو بیٹھے۔ کلکتہ میں طویل علاج کے بعد ان کی یادداشت تو بڑی حد تک واپس آ گئی لیکن ان کی ذہنی کیفیت بچوں یا از کار رفتہ بوڑھوں جیسی ہو گئی۔ مجبوراً انھیں نوکری چھوڑ کر باپ کے پاس میرپور خاص (تب مغربی پاکستان) چلا جانا پڑا۔ اپنے خیالوں میں ابھی تک وہ ٹی اسٹیٹ کے بڑے صاحب تھے اور ان کی دوستی بڑے بڑے انگریزوں اور سرکاری افسروں سے تھی۔

وہ ہر شام کو پورے سوٹ بوٹ میں ملبوس، ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار لیے ''ٹی اسٹیٹ'' کے ''کلب گھر'' کو جاتے۔ ظاہر ہے کہ کلب گھر تو کوئی تھا نہیں، وہاں دور دور تک چائے کی پتی کی مہک بھی نہ تھی۔ لیکن شمیم جعفر اپنے خیالوں میں مگن، مسکرا مسکرا کر خود سے انگریزی بولتے ہوئے ساری بستی کا چکر لگا کر رات ڈھلے واپس آ جاتے۔ ان کی صاحبی وضع قطع پر اتنی سخت پابندی کی بنا پر بعض لوگ، خاص کر بچے، ان کا مذاق

اڑانے کے لیے ان سے پوچھتے، ''بابو جی ٹیم کیا ہوا ہے؟'' حتی کہ ان کا نام ہی ''ٹائم بابو'' پڑ گیا۔

حادثے کے وقت شمیم جعفر کے بیٹے وسیم جعفر کی عمر کوئی دس بارہ سال کی تھی۔ وسیم کی ایک بہن بھی تھی جو بھائی سے کوئی دو سال بڑی تھی، لیکن وہ ذہنی طور پر کمزور اور جسمانی طور پر بڑی حد تک معذور تھی۔ شمیم جعفر کی دیکھ بھال ان کی بیوی نے اور باپ نے حتی المقدور کی، لیکن اب ان کے دن بگڑنے ہی پر آمادہ تھے۔ سلیم جعفر ایک حادثے میں دائیں کولھے کی ہڈی تڑا بیٹھے۔ اس عمر میں اور ان حالات میں اصلاح بھی محال تھی، صحت مندی کا کیا ذکر۔ اب ان کی بہو انھیں بھی دیکھتی، معذور بچی کو بھی اور ذہنی طور پر ماؤف شوہر کی بھی نگہداشت کرتی۔ مسلسل پلنگ پر پڑے رہنے کی وجہ سے سلیم جعفر کے سارے بدن پر آبلے اور زخم ہو گئے جن میں پیپ کے ساتھ ساتھ بدبو بھی پیدا ہو گئی تھی۔ سلیم جعفر جیسے نستعلیق اور نفاست پسند شخص کی یہ گت دیکھنے والوں کو رنجیدہ اور ہراساں کرتی تھی، خود ان پر کیا جانے کیا بیتتی ہوگی۔ آخر کار حد درجہ معذوری کے عالم میں وہ اپنے ایک رشتے کے ماموں کے یہاں کراچی لے جائے گئے، لیکن اب ان کی حالت معالجے سے زیادہ دعا کی متقاضی تھی کہ انھیں اس دار المحن سے نجات ملے۔ کئی مہینے تک مصیبت جھیلتے رہنے کے بعد انھوں نے جان جان آفریں کے سپرد کی۔ بقول بعض یہ سال ۱۹۵۹ء تھا۔

سلیم جعفر نے ایک وصیت نامہ لکھ کر شمیم جعفر کے لیے بہت کچھ انتظام کر دیا تھا اور ضروری کاغذات محمد لطیف گاندھی کے سپرد کر دیے تھے۔ پرڈیٹا اپنے مخبوط الحواس شوہر اور بیٹی بیٹے کو لے کر انگلستان منتقل ہونا چاہتی تھیں، لیکن باپ کے چند ہی دن بعد شمیم جعفر کا بھی بلاوا آ گیا۔ ان کی تکفین و تدفین کے کچھ عرصہ بعد پرڈیٹا دونوں بچوں کے ساتھ ایک ننہالی عزیز کے توسط سے انگلستان آ گئیں۔

ماں کی توقع اور امید کے خلاف وسیم جعفر نے خود کو اپنے دادا کی تہذیبی اور ادبی روایات سے پوری طرح سیراب رکھنا پسند کیا اور ان کے علوم و آداب کو شعوری طور پر اور بیش از بیش اختیار کیا۔ وسیم جعفر نے لندن یونیورسٹی کے مشہور ادارے School of Oriental and African Studies میں کئی سال تک تعلیم حاصل کر کے اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ بہم پہنچائی۔ بولنے کی حد تک تو وہ بہت صفائی اور روانی سے نہایت بامحاورہ اردو بولتے ہی تھے۔ باپ سے ان کی ساری گفتگو اردو میں ہوتی تھی۔ ماں کے ساتھ بھی وہ انگریزی اردو ملا کر ہی بولتے تھے۔ اب کالج میں جم کر تعلیم لینے کے باعث وہ بہت اچھی ادبی اردو لکھنے اور سمجھنے بھی لگے تھے۔ وزیر خانم اور ان کے خاندانی حالات کے بارے میں انھوں نے اپنے دادا سے کچھ کہانیوں کے روپ میں تو کچھ باپ دادا کی گفتگوؤں کے ذریعہ بہت کچھ سنا تھا۔ اُردو فارسی کے علاوہ انھیں مصوری سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے لندن کے مشہور زمانہ Slade School of Art میں کئی برس شام کے درجات میں تعلیم حاصل کی۔ پھر انھیں محسوس ہوا کہ ان کا اصل میدان مغل طرز کی مصوری ہے۔ یہاں بھی انھوں نے بہت تگ و دو کے بعد اچھی دستگاہ حاصل کر لی اور بالآخر وکٹوریہ اینڈ البرٹ Victoria and Albert) میوزیم میں وہ انیسویں صدی کی ہندوستانی (اور کمپنی) مصوری کے شعبوں

میں نائب نگراں (Assitant Keeper) مقرر ہو گئے۔ فرصت کے زیادہ تر اوقات وہ انڈیا آفس لائبریری میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے کاغذات کو الٹنے پلٹنے میں گذارتے۔ (اب وہ برٹش لائبریری کا حصہ بنا دی گئی ہے لیکن پرانے لوگ اسے اب بھی ''انڈیا آفس لائبریری'' کے نام سے پکارتے ہیں۔)

وسیم جعفر کئی سال سے شمالی ہندوستان میں اٹھارویں انیسویں صدی کے بعض ایسے خاندانوں اور گھرانوں کے حالات ڈھونڈنے میں مصروف تھے جو اپنے زمانے میں تو بہت نمایاں تھے لیکن اب وقت نے انھیں اوراق کے مزبلے میں داب دیا تھا اور ان کے نام اب اگر کسی کو معلوم تھے تو وہ محض چند اختصاصی مؤرخین ہی تھے۔ ان میں سے بعض تو انگریزوں کی سرپرستی میں خوب پھلے پھولے لیکن اپنے ہی نااہل اخلاف کی بنا پر تباہ یا گمنام ہوئے اور بعض ایسے تھے جو ۱۸۵۷ء کے پہلے یا بعد حاکمان فرنگ کی تیغ جور اور ستم عدل نما کی ترازو پر تلے اور کم وزن پائے گئے۔ انھیں امید تھی کہ ان کی داستان وہ کبھی قلم بند بھی کر سکیں گے۔

آج ایسے گھرانوں کے نام صرف اختصاصی مؤرخین ہی کو معلوم سہی، لیکن اپنے وقت میں یہ خانوادے علم اور فن، خاص کر شاعری، مصوری اور موسیقی کا گہوارہ تھے۔ ان کے کاغذات اور کتابیں اگر دیکھی جاتیں تو ہند اسلامی تہذیب کے نہ جانے کتنے گوہر بے بہا ان میں خفتہ اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے نظر آتے۔ وسیم جعفر کے سامنے چند نام تھے جن پر وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے یا ڈھونڈتے رہتے تھے: بریلی کے راجا رتن سنگھ زخمی، کڑا مانک پور کے رائے بالمکند شہود، بنارس کے صاحب رام خاموش، باندہ کے علی بہادر خان، فرخ آباد کے تجمل حسین خان، فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے شمس الدین احمد خان اور وزیر خانم، خاص گنج (کاس گنج) کے کرنیل گارڈنر، ان کی بیگم، جو نواب کھمبائت کی بیٹی تھیں اور ان کی بہو، جو فردوس منزل شاہ عالم بہادر شاہ ثانی کی بیٹی تھیں اور شاہ اودھ کی مہربانیوں اور اپنے پہلے شوہر کی زیادتیوں سے متنفر ہو کر کرنیل کے بیٹے کے ساتھ چلی آئی تھیں، دہلی کے حسام الدین حیدر اور ان کی اولاد، دیوان فضل اللہ خان۔ وسیم جعفر خود سے پوچھتے تھے کہ کیا سیاسی وجوہ سے قطع نظر بھی نئے ہندوستان کے عروج میں ان لوگوں کا زوال لازمی تھا اور اب ہم لوگ ان سے جتنی دوری پر ہیں وہاں سے یہ لوگ کیسے نظر آتے ہیں؟ آج ان کی شبیہوں پر ماضی کی سیاہ دھند ہے، یا تمنا کی گلابی دھند ہے؟ یہ لوگ اپنے بارے میں کیا سوچتے تھے؟ وہ خود کو کیا سمجھتے تھے اور اپنے عہد کو کس روشنی میں دیکھتے تھے؟ کیا انھیں کچھ اندیشہ یا تصور تھا کہ ان کی تہذیب کی ردا اس طرح پارہ پارہ ہونے والی ہے کہ ان کا نظام اقدار جلتے ہوئے ملک کا گاڑھا دھواں بن کر سمندر میں تحلیل ہو جائے گا اور اس سے جو انقطاع پیدا ہو گا اس کی خلیج میں حافظے زائل ہو جائیں گے اور یادیں گم ہو جائیں گی؟

وسیم جعفر کو یقین نہ تھا کہ انھیں اپنے سوالوں کے جواب مل سکیں گے لیکن وہ اس بات کے بھی قائل نہ تھے کہ ماضی ایک اجنبی ملک ہے اور باہر سے آنے والے اس کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ وہ کہتے تھے کہ پرانے لفظوں کو نئے لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے، بس ہم آہنگی اور ہم آغوشی چاہیے۔

وسیم جعفر

[ڈاکٹر خلیل اصغر فاروقی، ماہر امراض چشم، کی یادداشتوں سے]

جیسا کہ بیان ہوا، وسیم جعفر کا گھر لندن میں تھا۔ میری ان سے کوئی رشتہ داری نہیں تھی، بلکہ پہلے سے کوئی ملاقات بھی نہ تھی اور نہ میں لندن میں رہتا ہوں۔ میں نے گذشتہ سال مولانا حامد حسن قادری کے مکتوبات (مرتبہ خالد حسن قادری) میں وسیم جعفر کے دادا سلیم جعفر کے خاندانی حالات کے بارے میں بڑی دلچسپی سے پڑھا ضرور تھا اور قادری صاحب کے یہاں سلیم جعفر کا ذکر پڑھنے سے پہلے میں نے ان کی کئی تحریریں بھی دیکھی تھیں۔ میں انھیں دہلی یا لکھنؤ یا حیدرآباد کا کوئی باذوق مصنف خیال کرتا تھا، لیکن سلیم جعفر، یا ان کے اخلاف اب کہاں ہیں اور کہیں ہیں بھی یا نہیں، اس معاملے میں مجھے کوئی معلومات نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ سلیم جعفر بزرگ آدمی تھے، کہیں مرکھپ گئے ہوں گے۔ عام حالات میں تو یہ ہوتا کہ نواب مرزا خان داغ اور ان کے حوالے سے ان کی والدہ وزیر بیگم اور سلیم جعفر کے باہمی تعلق اور وزیر بیگم کی غیر معمولی زندگی کی بنا پر مجھے ان کے بارے میں کرید ہوتی اور میں سلیم جعفر کے اعقاب کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا۔ لیکن ان دنوں مجھے کچھ اور ہی دھن تھی۔

گذشتہ سال ایک شادی کے سلسلے میں مجھے لندن جانے کا موقع ملا۔ اپنے بارے میں کچھ زیادہ کہنے میں مجھے تکلف ہے اور جو داستان اگلے صفحات پر مرتسم ہے اس کا مجھ سے کوئی تعلق بھی نہیں۔ لہٰذا اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں پیشے کے لحاظ سے ماہر امراض چشم ہوں۔ شعر و شاعری کا کچھ شوق میں بھی رکھتا ہوں، لیکن اگر میں زمانۂ قدیم میں ہوتا تو مجھے نسّاب کہا جاتا، اس معنی میں کہ مجھے خاندانوں کے حالات معلوم کرنے، ان کے شجرے بنانے اور دور دور کے

گھرانوں کی کڑیوں سے کڑیاں ملانے کا بے حد شوق ہے اور اب اگر چہ میری عمر بہت زیادہ نہیں ہے، میں نے طب کا مشغلہ ترک کر دیا ہے، میرا زیادہ تر وقت شجرے بنانے اور بنائے ہوئے شجروں کو مزید وسیع اور پیچیدہ بنانے میں گذرتا ہے۔

میں نے اوپر اپنی ایک دھن کا ذکر کیا ہے۔ اسے دو دھنیں کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ جن دنوں مولانا حامد حسن قادری صاحب کے مکتوبات میری نظر سے گذرے تھے اسی زمانے میں مجھے گورکھ پور میں مقیم ایک پارسی خاندان بومن جی خدائی جی کا شجرہ دریافت اور تحریر کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے جدامجد جمشید آرین پور کو شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے زمانے میں انگریز سیاح ٹام کوری ایٹ (Tom Coryat) اپنی رہبری کے لیے علاقۂ سورت سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ کوری ایٹ نے یورپ اور ایشیا میں ہزاروں کوس پیدل سفر کیا تھا اور بالآخر جہانگیر کے دربار کے ساتھ آگرہ سے اجمیر ہوتا ہوا براہ سندھ ترکستان و چین کی طرف نکل گیا تھا۔ کوری ایٹ کو تو دربار جہانگیری سے کچھ نہ ملا، لیکن جمشید آرین پور کی کسی بات پر خوش ہو کر اسے وسادۂ خاقانی سے اودھ کے علاقۂ گورکھپور میں شراب اور جنگلاتی پیداوار، خصوصاً شہد اور بنسلوچن کی تجارت کرنے کا اجازت نامہ عطا کر دیا گیا تھا۔ مشہور تھا کہ زمانۂ حال کے تمباکو و شراب فروش بومن جی خدائی جی کا خاندان اسی جمشید آرین پور کے اخلاف میں تھا۔

ایک دوسری چیز جس کی مجھے اس وقت کرید تھی، اس کا تعلق خود میرے لوگوں سے تھا۔

یہ بات اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندوستان کے صوفیا اور اہل اللہ میں سیدوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، لیکن کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ آل عبدالمطلب کے بعد صوفیاے ہند کی سب سے زیادہ تعداد آل خطاب سے ہے اور یہ بات بھی صرف مؤرخوں کو معلوم ہے کہ سید، ترک اور پٹھان حکمراں تو یہاں کثرت سے ہوئے ہیں، لیکن فاروقیوں کے صرف ایک خاندان نے ہندوستان کے کسی خطے میں فرماں روائی کی ہے۔ برہان پور کی فاروقی مملکت کی بنیاد ملک راجا فاروقی نے ۱۳۹۷ء میں رکھی تھی اور اس کی اولاد نے دو صدیوں سے کچھ اوپر برہان پور اور خاندیس پر حکومت کی۔ بالآخر جلال الدین محمد اکبر کی ہواے شمس اقبال اور جیش و اجلال نے ۱۶۰۱ء میں اس گھرانے کا چراغ گل کر دیا۔

انتزاع سلطنت کے بعد برہان پور کے فاروقیوں کا ذکر تاریخ سے کچھ یوں فراموش ہو گیا گویا میدان جنگ کی گرد کے چھٹنے کے ساتھ ساتھ ان کا نام بھی آسمانی گہرائیوں میں تحلیل ہو گیا ہو۔ برہان پور کے فاروقیوں کی بات مجھے بالکل اتفاقی طور پر معلوم ہوئی اور تب سے مجھے یہ دھن (خیال خام کہیے) لگ گئی کہ اس بات کا پتہ لگایا جائے کہ زوال حکومت کے بعد برہانپور کے فاروقیوں پر کیا گذری۔ ہر چند کہ ہم اعظم گڈھ کے فاروقیوں کا خاندان تو عام عقیدے کے مطابق ملک راجا کے بھی پہلے سے، یعنی فیروز تغلق کے آخری زمانے (۱۳۸۸ء) سے ان اطراف میں آباد تھا، لیکن کیا پتہ ہمارے اسلاف کا کچھ رشتہ برہان پوری فاروقیوں سے بھی رہا ہو، یا اکبر کے زمانے کے بعد بن گیا ہو۔

مجھے دونوں ہی منصوبوں میں کچھ کامیابی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی مجھے اس کا امکان ہی نظر آتا تھا، لیکن شادی میں شرکت کے لیے لندن جانے کو میں نے دراصل اپنی تلاش کو وسعت دینے کا بہانہ بنالیا اور شادی کی تقریبات کے دوسرے ہی دن سے میں نے انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈس (India Office Library and Records) میں ضروری کارروائی کے بعد اس کے دارالمطالعہ میں بیٹھنے، فہرستوں اور کتابیات اور ان کے علاوہ اہم انگریز افسروں کے خاندانی کاغذات اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے کی سہولت کا انتظام کرلیا۔ نچلی منزل کے بڑے ہال میں ایک کونا، ایک کمپیوٹر اور چھوٹا سا ڈیسک اور کتابوں کاغذوں کے لیے ایک چھوٹا سا کھلا ہوا شیلف بھی مجھے دے دیا گیا کہ وہاں اپنے دوران کار میں مجھے ضروری سہولتیں مہیا رہیں۔ انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈ اب برٹش میوزیم کا حصہ قرار دے دیے گئے ہیں اور برٹش میوزیم سے لائبریری کو الگ کر کے اس جدید اکائی کو ''برٹش لائبریری'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

ایک زمانے میں برٹش میوزیم میں مالی تنگی بہت تھی۔ اب یہ تنگی ایک حد تک رفع ہو رہی ہے کیونکہ برنارڈ شا نے اپنی دولت خطیر کا بڑا حصہ برٹش میوزیم کو وقف کر دیا تھا۔ اس وقت برٹش میوزیم اور لائبریری ایک ہی شے تھے، لہٰذا برنارڈ شا کے وقف کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ لائبریری کے مصارف میں کام آتا تھا۔ لیکن جب انڈیا آفس لائبریری اور ریکارڈس کو برٹش لائبریری میں ضم کیا گیا تو برٹش میوزیم نے ایک نکتہ اٹھایا کہ برنارڈ شا کا ترکہ انڈیا آفس کے لیے تو تھا نہیں، لہٰذا اب یہ نوتشکیل برٹش لائبریری اس بات کا حق نہیں رکھتی کہ برنارڈ شا کی وراثت سے اسے کچھ ملے۔ آپسی جھگڑوں نے قانونی شکل اختیار کر لی اور برٹش لائبریری کا کٹھن سماں طویل تر ہوتا گیا۔ اب کچھ دن ہوئے معاملہ بحسن وخوبی طے ہوا ہے تو لائبریری کے دلدر کچھ دور ہوئے ہیں۔ پنسل، کاغذ، ٹیلیفون، کام کرنے کے لیے آرام دہ کرسیاں، آسانی سے سمجھ میں آجانے والے کمپیوٹر کیٹیلاگ، سب مہیا ہیں۔ پہلے یہ سب کچھ نہ تھا۔ دام بھی زیادہ نہیں ہیں۔ ہاں اب بھی ہر چیز کے لیے انتظار بہت کرنا پڑتا ہے اور بسا اوقات پرانی دستاویزات اور خاندانی کاغذات، جن میں سے بعض کی حالت خاصی سقیم ہوتی ہے، انھیں ڈھونڈنے اور اندر سے نکلوانے میں دیر اب بھی لگتی ہے۔

میں نے گریٹ ویسٹ رسل اسٹریٹ (Great West Russell Street) کی ایک میوز (Mews) میں ایک کمرہ لے لیا تھا جو میری ضرورتوں کے لیے کافی تھا۔ اطلاعاً عرض کردوں کہ Mews کسی محلے کا نام نہیں۔ اچھے مکانات یہاں شارع عام پر بالکل لب سڑک ہوتے ہیں۔ ایسے مکانوں کے پیچھے ایک تنگ سی گلی ہوتی ہے جن میں ان مکانوں کے گیریج (پہلے زمانے میں (Carraige House)) بنے ہوتے ہیں۔ انھیں Mews کہا جاتا ہے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے گاڑی خانے کو شاگرد پیشہ بنالیا تو جن گھروں میں شاگرد پیشہ کا انتظام گھر کے اندر ہی تھا، انھوں نے اپنے Mews کو گیریج بنالیا اور بعض نے انھیں نسبتاً کم قیمت پر نوجوانوں کے لیے ایک کمرے کا فلیٹ بنا دیا۔

سنٹرل لندن کے علاقے میں یہ میوز بے انتہا مقبول اور قابل قدر اقامت گاہ کا رتبہ رکھتے تھے۔ یہ میری بس خوش نصیبی تھی کہ مجھے ایک بہت اچھا میوز فلیٹ واجبی کرایے پر مل گیا تھا۔ برٹش لائبریری یہاں سے پیدل بمشکل بیس منٹ کا فاصلہ تھی۔ چاروں طرف کھانے اور چائے وغیرہ کی دُکانیں بھی بہ افراط تھیں۔ ہندوستانی دکانیں تو کم تھیں لیکن گوا کا چکن بندآلو (Chicken Vindaloo) پنجاب کا دم آلو اور ''مغلئی گرلڈ چکن تکا'' وہاں بعض ریستورانوں میں مل جاتے تھے۔ میں نے انھیں دنوں مشہور معاصر انگریز نقاد اور ناول نگار پیٹر ایکرائڈ (Peter Ackroyd) کا ایک بیان پڑھا تھا کہ چکن بندآلو نے تو اب مچھلی اور آلو کے قتلے (Fish and chips) کو انگریزوں کے قومی کھانے کے درجے سے ہٹا کر ان کی جگہ خود لے لی ہے۔

برٹش لائبریری جاتے ہوئے مجھے دو چار دن ہی ہوئے تھے کہ مجھے وہ صاحب دکھائی دے گئے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ وی۔ اینڈ اے۔ کے شعبۂ مغل مصوری برائے انیسویں صدی اور شعبۂ کمپنی مصوری کے بھی اسسٹنٹ کیپر ہیں۔ میں نے تو انھیں کچھ گھبرایا ہوا سا، جلدی میں سیڑھیاں چڑھتا ہوا، اپنے خیالوں میں گم، دبلا پتلا کشیدہ قامت، نہایت گورے لیکن کجلائے ہوئے رنگ، بڑے بڑے سفید بالوں اور ہلکی سفید مونچھوں والا شخص دیکھا جو ہر موسم میں اونی ٹوپی اوڑھتا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں بریف کیس ہوتے۔ ایک میں تو کاغذات، قلم پنسل، ڈائری، یادداشتیں، ایک آدھ کتاب، ان کی چیک بک، پلاسٹک (یعنی کریڈٹ) کارڈ وغیرہ ہوتے، لیکن دوسرے بریف کیس کا حال کسی کو معلوم نہ تھا۔ شاید کچھ کھانے کا سامان رکھتے ہوں۔ لیکن کھانا تو وہ ہمیشہ ٹرافلگر اسکویر (Trafalgar Square) کے پاس ایک یونانی ریستوراں میں کھاتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس میں دوائیں ہوں گی کیونکہ وہ مجھے ہمیشہ کچھ بیمار سے لگتے تھے۔

جب میں نے انھیں پہلی بار دیکھا تو گمان کیا کہ یہ انگریزوں کے وقت کے کوئی پرانے مخطوطہ شناس، یا پرانی تحریروں کے پڑھنے میں ماہر کوئی منشی قسم کے ہندوستانی ہوں گے جو ملک کی آزادی کے بعد بھی برٹش میوزیم چھوڑ کر اس لیے واپس نہ گئے ہوں گے کہ گھر پر ان کا کوئی نہ تھا۔ وہ شیروانی پہنتے یا سوٹ، دونوں ہی ڈھیلے ڈھالے اور کچھ ملگجے رنگوں کے ہوتے تھے۔ کپڑا ہمیشہ قیمتی لیکن ذرا لاپروائی سے پہنا ہوا لگتا تھا۔ جوتے، ہیٹ، چھتری، چھاتا، سب نہایت قیمتی اور فیشن کے مطابق، لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ پہننے والے کو اس باب میں کچھ اہتمام نہیں ہے کہ کپڑے شکن آلود نہ ہوں، صفائی اور محنت سے برش کیے گئے ہوں، ان پر کوئی داغ دھبہ نہ ہو۔ وہ گریٹ ویسٹ رسل اسٹریٹ (Great West Russell Street) پر برٹش لائبریری کے ایک بس اسٹاپ پہلے بس سے اترتے، نکڑ والے اخباری لڑکے (وہاں اخبار فروش کو Newsboy کہتے ہیں، چاہے وہ بوڑھا کیوں نہ ہو) سے انٹرنیشنل ہیرلڈ ٹریبیون (International Herald Tribune) بین الاقوامی اخبار خریدتے اور اسے بغل میں داب کر برٹش میوزیم کی طرف پیدل چل دیتے۔

ایک دن بالکل اتفاق سے لفٹ میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا تو میں نے انھیں ''سلام علیکم'' کہا۔ انھوں نے نہایت گرم جوشی سے جواب دیا، اگر چہ مجھے ان کی ضعیف العمری اور عام چال ڈھال کو دیکھتے ہوئے ان سے کسی گرم جوشی کی امید نہ تھی۔ آج میں نے انھیں غور سے دیکھا تو محسوس ہوا کہ ان کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ محض درزی کی، یا پہننے والے کی لاپروائی، یا بہت زیادہ عمر رسیدگی کے باعث نہ تھا، بلکہ اصل میں وہ خود بہت ہی دبلے تھے اور ان کے بدن کی جلد ان کی گردن، ہاتھوں اور چہرے پر بے حد خشک اور سختی سے کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، گویا اندر کا گوشت گل گیا ہو اور جلد کو ہڈیوں پر کسی نہ کسی طور مڑھ دیا گیا ہو اور اگر اسے ہاتھ سے چھوئیں گے تو کاغذ کی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے گی۔ چھڑی لیے ہوئے ان کے ہاتھ کی کلائی کسی بچے کی کلائی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے میر کا شعر یاد آیا ؎

ترا ہے وہم کہ یہ ناتواں ہے جامے میں
وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں

میں ابھی انھیں خیالوں میں تھا کہ لفٹ رکی اور ہم دونوں ساتھ ہی باہر نکلے۔ سامنے سے گذرتی ہوئی سکریٹری لڑکیوں نے انتہائی خوش مزاجی سے ''گڈ مارننگ ڈاکٹر''، یا ''گڈ مارننگ وسیم'' وغیرہ کہا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ صاحب یہاں بہت جانے پہچانے ہیں اور ان کا نام وسیم ہے، پورا نام وسیم احمد، وسیم اختر وغیرہ ہوگا۔ لفٹ سے نکل کر وہ کچھ مسکرا کر ''اچھا، سلام علیکم، ان شاء اللہ پھر ملیں گے'' کہتے ہوئے دائیں طرف کی راہداری میں مڑ گئے۔ میں سامنے کے ہال میں اپنی مقررہ جگہ پر پہنچا تو مجھے دیکھ کر یک گونہ استعجاب اور بڑی مسرت ہوئی کہ کل شام جن کاغذات اور کتابوں کا طلب نامہ میں جمع کرا گیا تھا، وہ سب کچھ میرے آنے کی پیش آمد میں میری شیلف پر رکھ دیے گئے تھے۔ دستاویزیں زیادہ تر ۱۶۶۱ء کے بعد کی تھیں جب ممبئی کے جزیرے کو پرتگالی حکومت نے انگریز کمپنی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ یہودی اور پارسی وہاں مدتوں سے آباد تھے اور ان کے بارے میں کچھ معلومات ممبئی کے بدھ بھکشوؤں اور تعلیمی اداروں کی یادداشتوں میں دستیاب تھے، لیکن ان میں تسلسل نہ تھا۔ سترہویں صدی کے اواخر میں انگریزوں نے ممبئی میں میونسپلٹی قائم کی اور اس کے بعد کی دستاویزیں اور کاغذات کم و بیش مسلسل بستوں یا بکسوں میں محفوظ تھے اور اچھی حالت میں تھے۔

میں اپنے کاغذوں کی چھان بین میں لگ گیا۔ لنچ میں کھاتا نہ تھا، اس لیے وقت کے گذرنے کا کچھ اندازہ اسی وقت ہوا جب میرے پاس کے مطالعہ کنندگان آہستہ آہستہ اٹھ کر جگہ خالی کرنے لگے۔ میں بھی اٹھا تو مجھے خیال آیا کہ وسیم صاحب شاید ابھی موجود ہوں، ان سے ملنا ممکن ہوتا تو خوب تھا۔ اس لق و دق لائبریری میں ایک دو ہم صورت مل جائیں تو بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ شاید ابھی اندر ہی تھے، یا پہلے ہی اٹھ گئے تھے۔ خیر، کبھی اور سہی، میں نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اگلے دن اتوار تھا، دریاے ٹیمز کے کنارے تھیئٹروں کے سامنے پرانی کتابوں کا بازار

لگے گا، وہاں اول وقت جاؤں گا تو کتابوں میں دن اچھا گذر جائے گا۔ شاید کوئی چیز میرے مطلب کی بھی مل جائے۔

اس اتوار کو پرانی کتابوں کے علاوہ پرانی مصوری کے نمونوں اور پرانے نقشوں کی بھی کچھ دکانیں وہاں نظر آئیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی نادر چیز یا کوئی اعلیٰ درجے کی تصویر بہم پہنچنا غیر ممکن تھا۔ بیش از بیش سامان پرانی تصویروں کی مطبوعہ نقلوں پر مشتمل تھا۔ لیکن اٹھارویں صدی کے انگریزی رسالوں کے پھٹے پرانے مصور اوراق ضرور مل رہے تھے اور بہت کم داموں پر مل رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے جنوری ۱۷۷۲ء کی The Gentleman's Magazine کا ایک ورق صرف دس پونڈ میں مل گیا۔ ورق پر تاریخ اور رسالے کا نام صاف نظر آتا تھا۔ ورق پر دو جانوروں کی سفید سیاہ تصویریں تھیں۔ ایک کو Giraffe بتایا گیا تھا اور دوسرے کو Chinese Antelope لکھا تھا۔ ہر چند کہ تصویریں بہت درست نہ تھیں لیکن ان کی طباعت اب بھی بہت روشن تھی اور کاغذ صرف ہلکا سا آب زدہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کہیں کسی کیلنڈر کی خالی ٹیوب مل جائے تو اس میں اس ورق کو لپیٹ لوں۔ پاس ہی میں ایک بڑے میاں پرانے نقشوں کا انبار لگائے بیٹھے تھے۔ میں ادھر مڑا تو ایک جانی پہچانی صورت دکھائی دی۔ یہ وسیم صاحب تھے اور ایک چھوٹے سے نقشے کو طرح طرح سے الٹ پلٹ کر گھما گھما کر روشنی کو پیچھے رکھ کر دیکھ رہے تھے۔

''سلام علیکم، جناب عالی'' میں نے ان کے پاس جا کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''اچھی ملاقات ہوئی!''

انھوں نے عینک کے پیچھے سے مجھے گھورا۔ ان کے ماتھے پر شکنیں تھیں، شاید اس لیے کہ وہ اس نقشے کو غور سے دیکھ رہے تھے، یا شاید اس لیے کہ انھیں میرا مخل ہونا برا لگا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اصل بات یہ تھی کہ وہ مجھے بیک نظر پہچان نہ سکے تھے۔

''اخاہ، آپ ہیں! یہاں کیسے آنکلے؟.... لیکن معاف کیجیے گا ابھی آپ سے تعارف تو ہوا ہی نہیں، کل آپ کو وہاں دیکھا ضرور تھا۔'' ان کی آواز گلو گرفتہ تھی، گویا حلق پر بہت سا بلغم جمع ہو۔ ان کی سانس بھی بہت چھچھلی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ سانس ان کے پیٹ میں سمانہ رہی تھی۔

''جی، معافی چاہتا ہوں یہ کوتاہی میری ہے۔ آپ کا اسم گرامی وسیم ہے اور آپ وی۔ اینڈ اے۔ میں....''

''جی ہاں، مجھے وسیم جعفر کہتے ہیں۔ وی۔ اینڈ اے۔ کی بات چھوڑیے، اپنے بارے میں فرمائیے۔''

''جناب میرا نام خلیل اصغر فاروقی ہے، ماہر امراض چشم تھا، اب پریکٹس چھوڑ کر اپنے شوق کا کام کرتا ہوں۔''

''بہت خوب،'' وہ کھانستے ہوئے بولے۔ ''انسان اپنا شوق پورا کرے تو اس سے بڑھ کر کیا چاہیے۔ فراغت ہو، اپنا شوق ہو اور خوشگوار گھر کا خاموش گوشہ ہو، سبحان اللہ۔''

مجھے دفعتاً خیال آیا، وسیم جعفر....؟ لیکن مرزا داغ صاحب کی والدہ کے پرپوتے کا نام تو سلیم جعفر تھا۔ میں نے سوچا، پوچھ لوں، لیکن ہمت نہ پڑی۔ سلیم جعفر صاحب نے تو شاید اس پہلو کو مخفی ہی رکھنا چاہا تھا، ورنہ اپنا نام

کیوں بدلتے؟ لیکن نام کا بدلنا شاعرانہ مصلحت یعنی تخلص کے باعث بھی تو ہوسکتا ہے۔

مجھے خیال میں گم دیکھ کر وہ ہنس کر بولے: ''کیا بات ہے جو چپ ہو گئے، عمر خیام یاد آ گیا کیا؟ اچھا یہ بات تو رہی جاتی ہے کہ آپ کا شوق کیا ہے، یہ شوق رقیب سر و ساماں تو نہیں جو بے وطن ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ یا کیا لندن ہی میں مستقل قیام ہے؟''

''میرا شوق.... میرے شوق کو آپ نسابی کہہ سکتے ہیں اور....''

میری بات پوری ہونے کا انتظار کیے بغیر وہ بول اٹھے:

''بھئی واہ، نساب اور اس زمانے میں! کیا عمدہ بات ہے۔ آپ کو کیوں نہ مغتنم جانیں۔ آپ نے کچھ لکھ وکھا بھی ہے؟''

''لکھا تو ضرور ہے، لیکن میں مغتنم وغیرہ خاک نہیں، بس طالب علم ہوں اور....(اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ صاحب سلیم جعفر کے بیٹے بھتیجے وغیرہ ہیں، ورنہ یہ بات بات میں اشعار کے اشارے، یہ نستعلیق گفتگو اور کہاں ممکن)....اور مغتنم روزگار تو آپ لوگ ہیں، سلیم جعفر صاحب کے نام سے میں خوب واقف ہوں۔''

''سبحان اللہ، آپ دادا جان کی تحریروں سے آشنا ہیں تب تو آپ اپنی گوں کے یار نکلے۔ میں تو ان کا پاسنگ بھی نہیں۔ لیکن باپ دادا کی تربیت نے کچھ حرف شناس کچھ نقش شناس کر دیا۔ خوب لوگ تھے وہ....'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''رہے نام اللہ کا۔''

''اور وزیر خانم صاحبہ....؟'' میں نے ہمت کر کے کہا۔

''سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ کس شان اور کس آن بان کی خاتون تھیں۔ بلکہ اس وقت تو میں بھی انھیں کے بارے میں کچھ چیزیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''خوب اور اس وقت جناب کے ہاتھ میں یہ نقشہ کیسا ہے؟''

''نقشہ،'' وہ خوش ہو کر ہنسے، لیکن پھر کھانسنے لگے۔ کھانسی نے ان کا چہرہ سرخ کر دیا، سانس بالکل تلپٹ ہو گئی۔ میں بے چارگی سے انھیں دیکھتا رہا۔ انھوں نے جیب سے دوا کی ٹیوب نکال کر گہری سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے دوا کی پھوار حلق میں ڈال کر ایک لمحے کو توقف کیا۔ پھر جب حال ذرا بہتر ہوا تو بولے۔ ''جناب یہ ممبئی کا نقشہ ہے، ۱۶۹۴ء کا۔ ظاہر ہے کہ آج کا شہر کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے....''

''لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نقشے کی تاریخی اور دستاویزی اہمیت بہت ہے اور حسن اتفاق یہ کہ میری بھی دلچسپی اس وقت ایک ایسے معاملے سے ہے جس میں ممبئی کا بھی سلسلہ ہے۔''

''بھئی بہت خوب۔ تب تو یہ نقشہ خرید لیتے ہیں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔'' یہ کہہ کر انھوں نے بے تامل وہ چھوٹا سا نقشہ ایک سو ساٹھ پونڈ میں خرید لیا۔

ہم لوگ باتیں کرتے ہوئے پملکو (Pimlico) کی طرف چلے جہاں انھیں کسی سے ملنا تھا۔ راستے میں ہم دونوں نے اپنا مزید تعارف کرایا۔ نسابی کے باعث پرانی دستاویزوں اور کتابوں سے مجھے دلچسپی تھی اور مخطوطہ شناس، نقش شناس اور قدیمیات کے ماہر کی حیثیت سے پرانی کتابیں، دستاویزیں، تصویریں، ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ شعر بھی انھیں خوب یاد تھے، لیکن اقبال کے بعد کے کسی شاعر کو انھوں نے نہیں پڑھا تھا۔ ناول اور افسانے سے انھیں کوئی ذوق نہ تھا، ہاں قرۃ العین حیدر کے کئی بیانیے خاص کر ''کار جہاں دراز ہے'' انھوں نے پڑھے تھے اور انھیں اپنے کام میں ایک حد تک مفید مطلب جانتے تھے۔

پملکو پہنچ کر انھوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ ''اب میں بائیں گلی سے ہو کر اپنے دوست کے یہاں پہنچ جاؤں گا، آپ مزید زحمت نہ کریں۔ کل ملاقات ہوگی۔''

مجھے خوف تھا کہ کہیں کھانسی انھیں پھر نہ پریشان کرے لیکن انھوں نے مجھے ہی ہنسی میں اڑا دیا کہ آپ بھی خوب شے ہیں، ذرا سی کھانسی سے ڈرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر مڑے ہی تھے کہ رکے اور بولے، ''آپ کو معلوم ہے عربی میں ''کھانسی'' کو کیا کہتے ہیں؟''

''جی، جی نہیں۔ میری عربی بس واجبی سی ہے۔''

'قحبہ''، وہ مسکرا کر بولے۔ میں ایک لمحے کو گڑبڑا گیا۔ کیا یہ کسی آنے جانے والی خاتون کی طرف اشارہ تو نہیں کر رہے ہیں؟

''جی؟ قحبہ، میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں۔''

انھوں نے ہنسنے کی کوشش کی، لیکن انھیں پھر کھانسی آ گئی۔ وہ کچھ دیر کھانستے رہے، اس بار انھوں نے سینے کو دونوں ہاتھوں سے داب لیا تھا لیکن کھانسی تھی کہ آئے چلی جا رہی تھی۔ جب ان کی حالت میں ذرا اعتدال آیا تو بولے۔

''مجھے اس کھانسی پر ہی یاد آیا۔ قدیم عرب میں قحبائیں چونکہ اپنے گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہلکے سے کھانستی اور کھنکھارتی تھیں، اس لیے انھیں بھی ''قحبہ'' کہا جانے لگا۔''

میں ہنسا، ''بڑی عجیب بات بتائی آپ نے۔ زبان بھی کیا شے ہے خدا کی قسم۔ امریکی انگریزی میں طوائف کو Hooker بھی کہتے ہیں۔ اس کی بھی شاید کچھ ایسی ہی تاریخی وجہ تسمیہ ہے۔ لیکن صاحب آپ اپنی کھانسی کا علاج کر ڈالیے، اس عمر میں کوتاہی ٹھیک نہیں۔''

ان کے چہرے پر کچھ عجیب سا رنگ آیا۔ ''ہاں، علاج تو کرتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ مسکرا کر بولے۔ ''قحبہ تو قحبہ، جائے گی کہاں۔ اچھا خدا حافظ۔'' وہ گلی میں مڑ گئے۔

اگلے دن لائبریری میں مجھے انھوں نے خاص طور پر ڈھونڈا اور دن کا کھانا کھلانے کے لیے اپنے معمولہ یونانی ریستوراں میں لے گئے۔

''جانتے ہیں آپ، ورجینیا وولف (Virginia Woolf) بھی اسی ریستوراں میں دن کا کھانا کھاتی تھی۔ جب وہ برٹش میوزیم میں دیر تک کام کرتی تو ذرا سا کھانا یہیں آکر کھالیتی تھی۔ اس نے اپنی کتاب A Room of One's Own میں اس کا ذکر کیا ہے۔''

وسیم جعفر کا دماغ اور بہت سی چیزوں کے علاوہ کسی بڑے عجائب گھر کے ان کمروں سے مشابہ تھا جن میں وہ اشیا رکھی جاتی ہیں جنھیں نمائش پر رکھنا کسی باعث ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کمروں میں ایک سے ایک عجیب، دور از کار، غیر متوقع اور نادر سامان بھرا ہوتا ہے۔ وسیم جعفر صاحب بھی ایسی ہی انوکھی معلومات کا خزانہ تھے۔ مجھے وہ اپنے خیال میں کچھ شرمیلا اور منھ چھپاؤ سمجھتے تھے۔ ایک دن رائل سوسائٹی کے سامنے سے گذرتے ہوئے انھوں نے مجھے بتایا کہ شرم اور گھر گھسنا پن اعلیٰ سائنسی یا ادبی کارناموں کا ضامن ہوسکتا ہے۔ مشہور سائنسداں ہنری کیونڈش (Henry Cavendish) اس قدر شرمیلا تھا کہ وہ کسی سے، حتیٰ کہ اپنے نوکروں سے بھی بات نہ کرسکتا تھا۔ اس کے گھر کی مغلانی ذرا ذرا سے معاملات میں احکام حاصل کرنے کے لیے اس سے دن رات رقعوں کے تبادلے کرتی تھی۔ مغلانی کے سوالوں کا جواب عموماً وہ ''ہاں''، ''نہیں''، ''جانے دو''، وغیرہ فقروں میں دیتا تھا۔ اس کے باوجود کیونڈش نے کئی سائنسی دریافتیں ایسی کیں جو اس کے عہد سے کئی دہائی، بلکہ ایک دو صدیاں آگے تھیں۔ کیونڈش نے گھر بیٹھے صرف ایک بھونڈی سی مشین، کاغذ قلم اور ایک دو معمولی پیمانوں کی مدد سے زمین کا وزن دریافت کیا۔ اس کا نکالا ہوا نتیجہ آج کے نہایت باریک اور لطیف اوزاروں کی مدد سے متعین کیے ہوئے وزن سے بس ایک فی صدی سے کچھ کم ہے۔

''تو میاں خلیل، جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم کچھ عقلمندی کا مقولہ نہیں۔ ضرورت تو دراصل خود سے شرم کرتے رہنے کی ہے۔ کل میں لارڈ لیک اور مہاراول بختاور سنگھ کے کاغذات اور مراسلت دیکھ رہا تھا۔ انھوں نے بعض اچھے مصور بھی نوکر رکھے تھے۔ مجھے ان کی بنائی ہوئی تصویروں کی تلاش ہے۔'' انھیں بے طرح کھانسی آگئی، یہاں تک کہ وہ سڑک کے کنارے ایک دُکان کی سیڑھی پر ذرا سمٹ کر بیٹھ گئے کہ کھانسی فرو ہو تو بات کو آگے بڑھائیں۔ ایسی بری کھانسی اور پھنسی ہوئی آواز اور تنفس کی تنگی تو کوئی اچھی علامتیں نہ تھیں۔ بات کو بدلنے کی غرض سے میں نے کہا:

''لیکن آپ نواب احمد بخش خاں اور وزیر خانم کے بارے میں بھی کچھ تلاش کر رہے تھے؟ جناب عالی، خود سے شرم کرنا تو ایک ادائے ناز ہے۔ وہ ہم لوگوں کو نصیب کہاں۔ یہ آپ وزیر خانم سے کہتے تو ایک بات بھی تھی۔'' میں نے انھیں چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

انھیں دوبارہ ذرا سی کھانسی آئی، انھوں نے فوراً رومال سے منھ صاف کیا اور بولے: ''ہاں میاں، ہم ٹیوب ٹرین اور انٹرنیٹ کے زمانے کے لوگ ادائے ناز جیسی نازک شے کیا سمجھیں۔ لیکن جناب میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اپنے کو کرم کا احساس ہو....''

''واللہ یہ لفظ کو کرم آپ نے کہاں سے نکالا، اچھا خاصا انسان کتا معلوم ہونے لگے!''

''یہی تو اس لفظ کی خوبی ہے۔ وہ کس کی نظم تھی، آڈن کی نظم تھی نہ، The Dog Beneath the Skin....؟ تو پھر میں نے کیا جھوٹ کہا۔''

''جی ہاں عمیق حنفی صاحب مرحوم نے بھی ایک نظم میں لکھا ہے، ؏ میرے اندر بھونکتا کتا بندھے۔''

''یہ عمیق حنفی صاحب کون تھے، ان کو تو میں جانتا نہیں، لیکن بات پتے کی کہی ہے انھوں نے۔ تو لیجیے کتنا کارآمد لفظ ہے۔ لیکن صاحب میں سچ کہتا ہوں اگر ہمیں اپنی برائیوں کا شعور ہو جائے....''

''تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہے۔'' میں نے بادشاہ بہادر شاہ کے شعر کا ایک ٹکڑا کچھ بدل کر پڑھ دیا۔

''نہ، نہ، نہ.... ہرگز نہیں، یہ بات نہیں۔ برے تو ہم سب ہیں، لیکن ہم اپنی برائیوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ ولیم فریزر کو لیجیے، بڑا ہندوستانی بنا پھرتا تھا لیکن شمس الدین احمد خان سے وزیر خانم کا عشق برداشت نہ کر سکا۔ شمس الدین احمد خان کی والدہ کے ساتھ ان کی سوتوں نے اچھا سلوک نہ کیا تو شمس الدین احمد خان کے دل میں ان کے لیے اور ان کی اولادوں کے لیے نفرت اُمڈ آئی۔''

''اور وزیر خانم، آپ کی دادی جان؟''

''بڑی پیچیدہ مزاج خاتون تھیں، باہمت بھی تھیں۔ میں ان کی تصویر کی دھن میں ہوں کہ کہیں سے مل جائے تو شاید ان کا کردار کچھ اور سمجھ میں آئے۔ اس زمانے کے بعض ہندوستانی مصوروں نے شبیہ سازی میں کردار نگاری کے بھی ڈھنگ آزمانے شروع کر دیے تھے۔''

پھر میری ان کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں۔ انھیں وزیر خانم، مارسٹن بلیک، نواب احمد بخش خان، میرزا فتح الملک بہادر وغیرہ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مارسٹن بلیک کی موت کا حال انھوں نے مجھے بہت مفصل بتایا تھا۔ میں دیر تک تعجب کرتا رہا کہ انگریزوں کے خلاف اس زمانے میں بھی ایسے اقدامات اور ''غدارانہ'' واقعات ہو سکتے تھے۔ وسیم جعفر صاحب نے میری غلط فہمی رفع کی۔ انھوں نے بتایا کہ سنہ ۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان اہل ہند نے تین یا چار بار فرنگی حاکم کے خلاف خروج کیا تھا اور ہر بار انگریز کو خاصا جانی و مالی نقصان پہنچایا تھا۔ انھوں نے بریلی اور بنارس کے واقعات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بنارس میں تو شاہ عالم ثانی کے سب سے ہونہار بیٹے میرزا جہاندار شاہ نے انگریز پر گولی ہی چلا دی تھی اور انگریزوں کے خلاف خروج کی سربراہی کی تھی۔ ایک اور مغل شاہزادے میرزا جہانگیر بخت نے بھی کسی بدتمیزی کی بنا پر ایک انگریز افسر کو گولی مار دی تھی اور الہ آباد جلاوطن کر دیے گئے تھے۔

''سر سید کی بات میں کچھ صداقت تھی۔'' وسیم جعفر نے کہا، ''اپنے بجنور والے رسالے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانیوں کے دل میں اس بات کا بہت غصہ تھا کہ فرنگی لوگ ہمارے ساتھ برابری کا سلوک تو دور رہا، انسانی سلوک بھی نہیں کرتے۔ اسی بات کو بڑے عجیب و غریب انداز میں سید محمود نے بنارس میں ۱۸۹۱ء کی ایک تقریر

میں کہا کہ انگریزوں کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ حاکم ہیں اور ہم رعایا۔ رعایا ہم دونوں ہیں۔ ملکۂ عالیہ ہماری حاکم ہیں اور ان کی رعایا کی حیثیت سے ہم دونوں برابر ہیں، برابر کے حقوق و فرائض و مراعات رکھتے ہیں۔''

''اس زمانے کو دیکھتے ہوئے بڑی عجیب اور بڑی جرأت مندانہ بات تھی، بلکہ سید محمود کا یہ خیال ہی بالکل نیا تھا۔ مگر انگریزوں کا جواب کیا رہا؟''

''اجی انگریز ایک کائیاں قوم ہیں۔ وہ موقع یہ تھا کہ سر سید نے اپنے پرانے کلکٹر بجنور اور موجودہ کمشنر بنارس مسٹر شیکسپیئر کی دعوت کی تھی، شہر کے سارے رؤسا و عمائد جمع تھے۔ سید محمود کی تقریر کو اس زمانے کے مذاق کے مطابق ایک خوش طبع After dinner speech کہہ کر ٹال دیا گیا۔ ویسے بھی کمشنر صاحب کرتے کیا؟ سید محمود کی تجویز کو حکومت کے سامنے پیش کر سکتے نہ تھے اور اگر پیش کرتے بھی تو نوکری سے برخاست ہو جاتے۔''

وہ ہنسے، لیکن ان کی ہنسی پھر کھانسی میں تبدیل ہو گئی۔

ایک بار وسیم جعفر صاحب نے مجھے اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ پورٹو بیلو روڈ (Portobello Road) خود ہی ذرا خستہ حال علاقہ ہے، اس کی ایک سالخوردہ عمارت کی تیسری منزل پر ان کا گھر تھا۔ پرانی وضع کی تنگ سیڑھیاں تھیں، لفٹ تھی نہیں، خدا معلوم کس طرح چڑھتے اترتے ہوں گے۔ جب میں اندر داخل ہوا تو فوراً محسوس ہوا کہ ایسی غیر فیشن ایبل اور کم آرام دہ بستی کے ایسے معمولی گھر میں ان کے قیام کی وجہ یہ تھی کہ وہ زیادہ کرایہ نہ دے سکتے تھے اور زیادہ کرایے کی عدم استطاعت کا باعث جز رسی نہیں، بلکہ نوادرات جمع کرنے کا شوق تھا۔ دو کمروں کے گھر میں تصویریں، کتابیں، شیشہ آلات، مخطوطے، ہر طرف بکھرے ہوئے تھے اور یہ بھی تھا کہ پورٹو بیلو روڈ میں پرانی اشیا اور چھوٹے موٹے عجائبات کی کئی دکانیں ہیں۔ لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا سامان انھیں وہاں وافر مقدار میں مہیا تھا۔ میں جس چیز کو اٹھاتا اسے اپنی طرز کی انوکھی ہی پاتا۔ میری حیرت اور شغف کو دیکھ کر وہ مسکرائے۔

''میں نے آپ کو ایک خاص مطلب سے زحمت دی ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کھانا نہ کھلوائیں گے آپ؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کھانا.... تو کھائیں گے، ضرور ہی کھائیں گے صاحب۔ لیکن یہ بتائیں آپ نے مولانا محمد حسین آزاد کا مدون کردہ دیوانِ ذوق پڑھا ہے؟''

''کہہ تو نہیں سکتا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ذوق کا کلام تھوڑا بہت دیکھا ضرور ہے لیکن مولانا محمد حسین آزاد کا مرتب کیا ہوا دیوانِ ذوق تو.... میں نے شاید اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اب تو بہت نادر ہو گیا ہوگا۔ مگر آپ اسے ہی کیوں پوچھتے ہیں....؟ تنویر احمد علوی والا نسخہ تو ہر جگہ مل جاتا ہے۔''

''آپ نے اس کی شکل نہیں دیکھی تو اچھا ہی کیا۔'' اچانک ان کا منہ تمتما گیا، جیسے بخار میں ہوں۔ میں نے انھیں ہمیشہ نہایت ٹھنڈے مزاج کا اور کسی بات کا زیادہ اثر نہ لینے والا پایا تھا۔ لیکن آج ان کا رنگ بظاہر بے سبب

اور دفعتاً اس قدر برہم دیکھ کر میں کچھ گھبرا گیا۔ میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔
''چلیے پھر تو کوئی بات نہیں۔ میں تو ڈرا تھا کہ اگر میں نے وہ کتاب دیکھی ہوتی تو اس کی سزا میں آپ مجھے کھانا ہی نہ کھلاتے۔''

انھوں نے کچھ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''نہیں یہ بات نہیں کہ اس کی وجہ سے کوئی بھوکا سوئے۔ لیکن جس نے لکھی ہے اس نے ایمان و انصاف کا کچھ خیال نہ رکھا۔''

میں ذرا پریشانی میں پڑ گیا۔ کتاب سے اگر ان کی مراد دیوانِ ذوق سے تھی تو اس کے مصنف کے بارے میں یہ خیال مولانا حالی یا سرسید کا تو ہو سکتا تھا کہ اس نے ایمان و انصاف کا کچھ خیال نہ رکھا، لیکن وہ تو ایک تاریخی اور تہذیبی شکست کی بات تھی۔ سنہ ۵۷ کی جنگ آزادی میں لٹ پٹ کر ہمارے بزرگ اپنے بزرگوں کی ہر بات کو وجود ُکَ ذنبٌ کہہ رہے تھے۔ اب وہ بات تو تھی نہیں۔ کیا مولوی نذیر احمد کی روح نے دوبارہ جنم لے لیا تھا؟ لیکن آج تک تو وسیم صاحب نے ایسی کسی رائے یا رویے کا اظہار نہ کیا تھا.... پھر آج کیا بات ہو گئی تھی؟

مجھے چپ دیکھ کر وسیم صاحب کا بھی مزاج ذرا ٹھنڈا ہوا۔ ''دیکھیے نہ، اس میں ایک جگہ مولانا نے کیسی غیر منصفانہ اور دل آزار بات لکھ دی۔''

''جی، میں نے اس کتاب کو پڑھا تو نہیں ہے.... لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مولانا تو شیخ ابراہیم ذوق کے بے حد پرستار تھے۔ ذوق کے خلاف انھوں نے بھلا غیر منصفانہ بات کیا لکھ دی ہوگی؟''

''تھے۔ وہ ذوق کے پرستار تھے۔'' وہ تیزی سے بولے۔ ''لیکن بہادر شاہ ظفر کے نہیں، نہ مرزا فتح الملک کے.... اور نہ شوکت محل کے۔''

ان کا چہرہ پھر سرخ ہونے اور سانس پھر پھولنے لگی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کہوں کیا کروں۔ شوکت محل کے نام سے میں واقف نہ تھا۔ مجھے یہ بھی خبر نہ تھی کہ وسیم جعفر صاحب پر اس طرح کے دورے اکثر پڑتے تھے یا آج ہی یہ معاملہ تھا اور یہ کہ ان کا ڈاکٹر یا نیشنل ہیلتھ سروس (National Health Service) کا اسپتال کہاں تھا، اس وقت ڈاکٹر کو بلانا ٹھیک ہے بھی کہ نہیں، میں کچھ سراسیمہ سا ہونے لگا۔ میں وسیم جعفر صاحب کی صحت کے بارے میں کچھ جانتا نہ تھا، بیمار وہ ضرور لگتے تھے۔ گھبراہٹ میں مجھے اور کچھ نہ سوجھی تو میں نے ریفریجریٹر سے بوتل نکال کر انھیں پانی پیش کیا اور کہا، ''لیجیے پہلے پانی پی لیجیے، ذرا سانس تو برابر آئے۔ پھر بات کریں گے۔''

انھوں نے پھنسی پھنسی آواز میں میرا شکریہ ادا کیا۔ ایک دو گھونٹ پانی پی کر انھیں شاید کچھ سکون ہوا۔ وہ چپ بیٹھ گئے اگر چہ ان کے منہ پر اب بھی تھوڑی سی وحشت کے آثار تھے۔

پانچ سات منٹ یوں ہی گذرے۔ پھر انھوں نے گہری سانس لی، دونوں ہاتھوں سے منہ کو رگڑا، آنکھیں ملیں، گویا ابھی سو کر اٹھے ہوں۔ پھر وہ گلاس کا باقی پانی ایک سانس میں پی کر اپنی عام آواز میں بولے:

''خلیل اصغر، چوری کرنے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

میں گڑ بڑا کر کچھ الٹی سی کہنے ہی والا تھا کہ انھوں نے بات پوری کی، ''میرا مطلب یہ ہے کہ چوری کرنا آپ کی نظر میں کیسا ہے؟''

مجھے الجھن سی ہوئی، یہ کیا فضول گفتگو ہو رہی ہے۔ کھانے پر بلا کر عجب عجب طرح کی بے تکی اڑائی جا رہی ہے۔ پھر بھی میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا۔ ''جناب چوری کرنا تو پانچوں عیب شرعی میں شامل ہے، مگر کیا آپ کوئی اجتہاد کرنے والے ہیں؟ یا آپ کی کوئی چیز کھوئی گئی ہے؟''

ان کے چہرے پر بیزاری اور کبیدگی کے سے تاثرات ابھرے۔ شاید میری بات انھیں پسند نہ آئی تھی، یا شاید وہ بات ہی ناپسندیدہ تھی اور اسے میرے سامنے افشا کرنا انھیں بہت ناگوار تھا، لیکن افشا کیے بغیر بنتی بھی شاید نہ تھی۔

''دیکھیے،'' وہ سمجھانے کے انداز میں بولے، جس طرح بچوں یا کم عقل لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ ''فرض کیجیے آپ کی کوئی چیز ہو اور اسے اگلا چرا لایا ہو، تو آپ اس چیز کو واپس چرا لینے میں حق بجانب ہوں گے کہ نہیں؟''

''د.... دیکھیے یہ معاملہ تو ف.... ف.... فرضی ہے،'' اچانک میری زبان میں ہکلاہٹ آگئی۔ ''جسے انگریزی میں hypothetical کہتے ہیں۔ ایسی ای ای ب.... بات پر میں کیا رائے دوں؟'' میں ڈر رہا تھا کہ میرے انکار پر انھیں پھر سے غصے، یا کھانسی، کا دورہ نہ پڑ جائے۔ لیکن ان کی بات ہی عجب بے ڈھب اور گھم سی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کون سی بات کہوں جو انھیں ناگوار نہ ہو اور یہ بھی محسوس نہ ہو کہ میں ان کے ساتھ مربیانہ برتاؤ کر رہا ہوں یا انھیں بہلا رہا ہوں۔

وہ دوبارہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ پھر کچھ اس لہجے میں بولے گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہیں:

''بتائیے برٹش لائبریری اور وی۔ اینڈ اے۔ میوزیم میں بہت سارا مال ہندوستانیوں کا ہے، کہ نہیں؟''

''بے شک، ہندوستانیوں یا کسی انفرادی ہندوستانی کا بھلے ہی نہ ہو، لیکن اہل ہند کی ملکیت تو وہ بے شک ہے۔''

''خوب اور یہی کیفیت اس مال کی بھی ہے جو دوسرے عجائب گھروں اور ذاتی حویلیوں، کوٹھیوں، بکنگھم پیلس وغیرہ میں ہے؟''

''جی بے شک۔ لیکن اس سب میں سے کچھ تو مال کے اصل مالک نے موجودہ مالک کو تحفۃً بھی دیا ہوگا۔''

''بے شک،'' انھوں نے میری بات دہرائی لیکن اس میں کوئی طنز نہ تھا۔ ''میں اس سب مال کو چھوڑنے کو تیار ہوں جو برضا و رغبت اور تحفۃً دیا گیا ہوگا۔ لیکن خوشامد اور رشوت میں دیے ہوئے مال، لوٹ کے مال اور از روے جبر و استحصال قرق کیے ہوئے مال کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟''

یہ بحث کہاں لیے جا رہی تھی، اس کا دھندلا سا احساس مجھے تھا۔ لیکن اس طرف جانے کا مقصد میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے بہت سوچ کر کہا، ''اگر کسی ایسے مال کا حقیقی اور جائز وارث پیدا ہو جائے تو وہ اس کی واگذاشت کے لیے دعویٰ کر سکتا ہے۔''

''اور اگر دعویٰ منظور ہونے کی کوئی امید نہ ہو....؟''

''مگر عدالت ہی تو ایک راستہ ہے۔''

''کیوں؟ اور کوئی راستہ کیوں نہیں؟''

''بھلا کیا راستہ ہے، کیا وہ اسے زبردستی چھین لے؟ اور زبردستی چھیننا.... یہ اس کے بس میں بھی ہے کہ نہیں؟''

''نہیں، چھیننے کی بات نہیں ہے۔''

''بھئی وسیم جعفر صاحب پہیلیاں نہ بجھایئے۔ میرا تو دم الٹا آ رہا ہے۔''

مجھے ڈر تھا کہ جعفر صاحب پھر بگڑ جائیں گے۔ لیکن اس بار وہ ایک لحہ چپ رہ کر بولے:

''آپ کو معلوم ہے وزیر خانم میری پردادی تھیں اور میں ان کے حالات تلاش کر رہا ہوں۔''

''جی ہاں.... اور آپ کو تلاش ہے کہ ان کی کوئی تصویر آپ کو مل جائے۔''

''محمد حسین آزاد نے ایک تصویر کا ذکر کیا بھی ہے، اسی دیوانِ ذوق میں جس کا میں نے ابھی آپ سے تذکرہ کیا تھا۔''

''اچھا، بہت خوب۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔''

''مجھے وہ تصویر مل گئی ہے۔'' انھوں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''ارے واللہ!'' میں اپنی جگہ سے تقریباً اچھل کر بولا۔ ''تو یہ تو بڑی قیمتی تصویر ہو گی، تاریخی اعتبار سے بھی اور ادبی اعتبار سے بھی۔ واہ صاحب واہ۔ آپ نے تو بڑا گہرا ہاتھ مارا!''

''وزیر خانم کے واحد مرد وارث کی حیثیت سے میں اس تصویر کا قانونی مالک ہوں۔'' انھوں نے اپنی بھاری، کھانسی زدہ آواز میں کہا۔

''لیکن وہ تصویر ہے کہاں؟ کیا اس کا مالک آپ کے ہاتھ اسے بیچ دے گا؟''

''وہ بھلا کیوں بیچے گا؟ کیا عبد الحمید لاہوری کا ''پادشاہ نامہ'' انگریزوں نے واپس کیا؟ کیا کوہ نور ان لوگوں نے واپس کیا؟''

''لیکن وہ تو کروڑوں کی چیزیں ہیں اور وہ بھی پونڈ میں، نہ کہ ہندوستانی روپیوں میں۔ یہ تو ایک تصویر ہے، وہ بھی کسی شہزادی یا ملکہ کی نہیں۔ بھلا ''پادشاہ نامہ'' اور کوہ نور کہاں اور یہ تصویر کہاں؟ یہ تصویر تو اس کا موجودہ مالک

دے ہی دے گا، نہیں تو بھاری داموں میں آپ کے ہاتھ بیچنے پر ضرور راضی ہو جائے گا۔ ہے کہ نہیں؟''

''مانتا ہوں کہ یہ تصویر کوئی بڑا خزانہ نہیں، لیکن پھر بھی یہ قوم ایسی نہیں کہ ہاتھ آئی چیز کو جانے دے۔''

''یعنی وہ تصویر بھی انگریزی حکومت کے قبضے میں ہے اور آپ اس سے واپسی کی درخواست نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے؟''

''دونوں ہی باتیں ہیں۔''

''بھئی معاف کیجیے گا آپ چبا چبا کر کیوں بات کر رہے ہیں؟ صاف کہیے تو کچھ میں عرض بھی کر سکوں۔'' میں نے کچھ جھنجھلا کر کہا۔

''آپ کے کیے کچھ نہ ہوگا۔'' وہ ٹھنڈے لہجے میں بولے۔ ''بہرحال سنیے۔ آپ جانتے ہیں میں برٹش لائبریری میں چیزیں ڈھونڈا کرتا ہوں۔ ایک بار بالکل اتفاقاً مجھے لارڈ رابرٹس، وہی Forty one Years In India والا لارڈ رابرٹس (Lord Roberts) جس نے ایک موقعے پر زینت محل کے بارے میں گستاخانہ باتیں کہی ہیں، اس کی ڈائری کی خبر لگی کہ جس کے اندراجات سے اس نے اپنی کتاب میں بہت کام لیا تھا۔ میں نے سنا کہ وہ ڈائری ایبرڈین یونیورسٹی (Aberdeen University) کے کتب خانے میں ہے لیکن عام مطالعے کے لیے نہیں ہے۔ خیر میں نے اپنے تعلقات کو کام میں لا کر وہاں تک رسائی حاصل کر لی۔ میں نے ڈائری میں جگہ جگہ ایسی چیزیں پائیں جن کا ذکر رابرٹس نے اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔''

''یعنی لوٹ مار کے واقعات، یا انگریزوں کے مظالم؟'' میں نے کہا۔

''وہ تو یقیناً، لیکن اس میں بادشاہ کے اور میرزا فتح الملک بہادر کے ذاتی کاغذات کا بھی ذکر تھا کہ قلعے کے کتب خانے اور دفاتر کی لوٹ میں سے کچھ چیزیں اس کے ہاتھ لگیں، جیسے میرزا فتح الملک بہادر کا ذاتی روزنامچہ۔ میں نے اس سے پہلے اس زمانے کے کسی معمولی شہزادے، کجا کہ ولی عہد سلطنت کے روزنامچے کا ذکر نہ سنا تھا۔ رابرٹس نے لکھا ہے کہ میں نے وہ سب کاغذات انڈیا آفس میں جمع کرا دیے تھے۔''

''تعجب اور سخت تعجب ہے کہ آج تک کسی کو اس کا خیال نہ آیا۔ آپ کی دریافت تو بڑی اہم ثابت ہو سکتی ہے۔''

''جی۔ پھر میں نے برٹش لائبریری میں ہر جگہ ڈھونڈا، تمام ممکن فہرستیں، کیٹلاگ اور سالانہ رپورٹیں دیکھیں، کچھ پتہ نہ لگا۔ میں امید کھو چکا تھا لیکن بس اتفاق ہی کہیے کہ ایک دن ایک بڑے میاں مجھے مل گئے جنھیں انڈیا آفس کی نوکری سے سبک دوش ہوئے کوئی پچیس تیس برس گذر گئے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ ۱۸۵۷ء کے بہت سے کاغذات جنھیں غیر اہم قرار دیا گیا تھا، وہ کتب خانے کی فہرست میں درج ہی نہ ہوئے تھے۔ انھیں بکسوں میں بند کر کے تہ خانے میں رکھوا دیا گیا تھا کہ کبھی فرصت اور وسائل ہوں گے تو انھیں کیٹلاگ کیا جائے گا لیکن وہ نوبت ہی نہ آئی۔''

''بھئی واہ۔ یہ تو بڑی عجب بات ہوئی۔''

''جی ہاں، خیر مزید تفصیل کو چھوڑتے ہوئے بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بہت تلاش کے بعد وہ سب بکس مجھے مل گئے۔ چمڑے کے سات بکس تھے، جیسے کہ اکثر جہازی استعمال کرتے ہیں اور ہر بکس کے مشمولات کی تفصیل بھی کاغذوں کے ساتھ بستے میں بندھی ہوئی تھی۔ ایک بکس میں بہت سی دستاویزوں کے ساتھ میرزا فخرو مرحوم کا روزنامچہ بھی تھا.... لیکن اس میں کچھ اور بھی تھا۔''

وسیم جعفر خاموش ہو گئے، جیسے آگے بتانا چاہتے نہ ہوں۔ اب مجھے بھی کرید ہوئی کہ وہ کیا چیز ہو سکتی تھی، بادشاہ کی وصیت، یا مرزا الٰہی بخش کی غداری کے بارے میں کوئی نئی بات، یا.... وہ جو بات مشہور ہے کہ دہلی کے قلعے سے لے کر آگرے کے قلعے تک سرنگ تھی، اس کا کچھ ثبوت، یا.... یا گڑا ہوا خزانہ، بھلا کیا شے ہو سکتی تھی؟

''کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی؟'' میں نے سنبھل سنبھل کر کہا۔

''جاننا کیا معنی، میں وہ چیز آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھے اور اپنا بریف کیس کھول کر انھوں نے ایک مضبوط، بڑا سا لفافہ میری طرف بڑھایا۔ ان کے ہاتھ میں خفیف سی لرزش تھی۔ لفافہ مہر بند نہ تھا، لہٰذا میں نے اس کا فلیپ کھول کر اس کے اندر رکھا ہوا کوئی چھ انچ اونچا اور پانچ انچ چوڑا موٹا کاغذ نکال لیا۔

کسی انتہائی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ اس کی عمر یہی چوبیس چھبیس سال کی رہی ہو گی۔ سانولا رنگ، لیکن اس قدر تر و تازہ چہرہ گویا کسی نے سوسن کے پھول کا جوہر نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ سیدھی، نازک سی ناک، لیکن دونوں نتھنے ذرا پھڑکتے ہوئے سے، جیسے اس نے کوئی اچھی بات سنی ہو یا کوئی اچھی بات کہنے والی ہو۔ کوئی ڈیڑھ دو سو برس پرانی تصویر دو چشمی تھی لیکن اس زمانے کی عام تصویروں سے برخلاف صاحب تصویر کو یوں دکھایا گیا تھا گویا وہ مصور اور تماشائی، دونوں کے وجود کا پورا احساس رکھتی ہو۔ اس کی آنکھوں میں جنس اور شباب کا ایسا بھرپور شعور تھا کہ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا یہ تصویر اپنی آنکھ یا ابرو سے مجھے کوئی اشارہ کرنے والی ہے۔ لیکن اس اشارے میں کوئی رکاکت یا سوقیانہ پن نہ تھا، بلکہ ایک طرح کی چنوتی تھی، کہ کیا تم اس فتنہ سامانی سے عہدہ برآ ہونے کا دل رکھتے ہو؟ سڈول چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں، ان پر لمبی لمبی پلکیں، لیکن سایہ فگن نہیں، چلمن کی طرح کچھ اٹھی ہوئی۔ آنکھوں کا رنگ شربتی، گہرا اور ہلکی سی سنہری دمک لیے ہوئے اور سفیدی ایسی سفید اور اس میں ہلکی سی ٹھنڈک کی ایسی کیفیت جیسے تازہ کھلا ہوا گل مشکی۔ آہو کی سی لمبی سڈول گردن میں مالائے زمرد، نولڑوں کا، لیکن سب دانے برابر کے اور ہم رنگ و ہم شکل تھے۔ گلے کے نیچے تک وادی شانہ میں چنے کی دال کے برابر زمرد ہی زمرد تھے جن کی سبزی آنکھوں میں ہری دوب کی طرح کھبی جاتی تھی۔ آنچل سر پر نہ تھا اور صاف معلوم ہو رہا تھا کہ صاحب تصویر کو آنچل کے ڈھلک جانے کا علم ہے۔ سنہرے بادلے سے پٹا ہوا آسمانی دوپٹہ شانے اور سینے کو بے پروائی سے کچھ ڈھک رہا تھا کچھ نمایاں کر رہا تھا۔ بہت گھنی چوٹی، تھوڑی سی کھلتی ہوئی، ہر لٹ میں ایک دو موتی ٹکے ہوئے، گویا بے خیالی میں وہاں

اُلجھ گئے ہوں۔

لیکن افسوس کہ تصویر ادھوری تھی، لیکن اس لیے نہیں کہ مصور نے اسے نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ کسی بے درد نے اسے اس طرح پھاڑ ڈالا تھا کہ تہائی سے کچھ زیادہ تصویر ضائع ہو گئی تھی۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا:

''یہ..... یہ تصویر..... وزیر خانم کی تو نہیں؟ اسے پھاڑ کس نے ڈالا؟'' میں نے وفور وحشت میں یہ بھی نہ محسوس کیا کہ میرا دوسرا سوال کس قدر احمقانہ ہے۔

وسیم جعفر نے کہا، ''اس کی پشت پر ایک تحریر ہے۔ پڑھیے۔'' ان کے چہرے پر کچھ سیاہی مائل تپش تھی، بیماروں جیسی۔ ان کی آواز میں اب اور زیادہ لرزش تھی۔

میں نے کاغذ پلٹا تو دیکھا کہ اس پر خط شکستہ میں تحریر تھی، مٹی مٹی سی۔ شاید کبھی کسی نے اسے پانی سے دھونے کی کوشش بھی کی تھی۔ سیاہ روشنائی آنسو بھرے کاجل کی طرح پھیل گئی تھی، حرف بہت جلی نہ تھے، لیکن مجھے پرانے شجرے اور دستاویزیں پڑھنے کی جو مشق تھی وہ کام آئی۔ ذرا سی کوشش کر کے میں نے پڑھ لیا: ''شبیہ حقیقی وزیر خانم صاحب عرف چھوٹی بیگم، سلمہا اللہ تعالیٰ''۔ اس کے آگے کچھ تاریخ تھی لیکن وہ کوشش کے باوجود مجھ سے پڑھی نہ جا سکی۔

''مبارک ہو، وسیم جعفر صاحب، آپ کی تلاش کامیاب ہوئی،'' میں نے بڑے جوش سے کہا۔ ''لیکن..... لیکن یہ تصویر..... یہ تصویر کیا انھیں بکسوں میں ملی جن کا ذکر آپ فرما رہے تھے؟ اگر ایسا ہے تو..... تو آپ اسے لائبریری سے نکال کیونکر لائے؟''

''جی ہاں۔'' انھوں نے ''جی'' پر زور دے کر کہا۔ ''میں اسے نکال لایا اور اب یہ میری ہے۔'' ان کے لہجے میں مبارزطلبی تھی، گویا مجھ سے کہہ رہے ہوں کہ ہمت ہو تو میری شکایت کر دو، یہ تصویر مجھ سے چھنوا لو۔

''مگر..... مگر بھلا کیسے یہ ممکن ہو سکا، یہ تو بتائیں۔'' میں نے حلیمی سے کہا۔ میں انھیں خفا نہ کرنا چاہتا تھا اور یوں بھی مجھے اس معاملے میں کوئی داروغۂ اخلاق بننے کا شوق تو تھا نہیں۔ تصویر پر اصل حق تو وسیم جعفر ہی کا تھا، قانون کچھ کہے۔

''بات یہ ہے خلیل اصغر صاحب،'' انھوں نے کچھ رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''اس تصویر کا کہیں اندراج نہیں ہے۔ آپ کو میں بتا ہی چکا ہوں کہ ان بکسوں کا کیٹلاگ اب تک نہیں بنا ہے، صرف کچی فہرست ہر بکس کے اندر رکھی ہوئی ہے، لیکن یہ تصویر اس فہرست میں بھی درج نہیں۔ ہر فہرست کی نقل لائبریری کے ڈائرکٹر کے قبضے میں مہر بند بھی رکھی ہوئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ فہرست بھی اس تصویر کے ذکر سے خالی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر کو چپ ہو گئے، میں ڈر کے مارے کچھ نہ بولا۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیا کہوں۔ پھر وسیم صاحب نے کچھ اور بھی آہستہ لہجے میں کہنا شروع کیا:

''دراصل یہ تصویر میرزا فخرو صاحب کے روز نامچے میں دو ورقوں کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی، اسی حالت میں جیسی آپ اس وقت دیکھ رہے ہیں۔ میں شاید پہلا شخص ہوں جس نے اس روز نامچے کے سارے ورق کھول کر دیکھے ہیں۔ جب یہ تصویر مجھے ملی تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ وزیر خانم کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ لیکن میں اور وزیر خانم کی تصویر! ایسا میرا نصیبہ کہاں؟''

وہ پھر چپ ہو گئے۔ میں بھی اسی طرح خاموش رہا۔ اس وقت ان کا عالم ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے بیچ میں بولنے کی کچھ بات سوجھتی نہ تھی۔

''بڑی دیر تک تو میں نے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہ کی۔ خدا معلوم یہ تصویر ان کی نہ ہو، کسی اور کی ہو۔'' بالآخر انھوں نے سلسلۂ کلام پھر جاری کیا۔ ''پھر میں نے آنکھیں بند کر کے اس کاغذ کو کئی بار الٹا پلٹا اور پھر آنکھیں کھول دیں.... وہ عبارت آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ اب آگے کیا کہوں۔ تصویر کو میں نے بے سوچے سمجھے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ آپ جانتے ہی ہیں لائبریری میں بریف کیس، بیگ، پیکٹ، کچھ بھی لے جانا ممنوع ہے۔ سردیوں کے اوور کوٹ تو رواج اور قاعدے کے مطابق اتار کر کلوک روم میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تصویر چھوٹی سی ہے اور مجھ پر کوئی شک بھی نہ کر سکتا تھا۔ بس میں نے اتنا کیا کہ اس دن اور کچھ کام نہ کیا، سب کاغذات سمیٹ کر لائبریری کے عملے کو واپس کیے اور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اطمینان سے چلتا ہوا لائبریری کے باہر ہو گیا۔''

''حق بہ حقدار رسید۔'' میرے منھ سے بے ساختہ نکلا۔

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا، گویا انھیں شک ہو کہ میں ان کا تمسخر کر رہا ہوں۔

''کیا واقعی؟ کیا واقعی آپ کا یہی خیال ہے؟'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولے۔

چونکہ مجھے اپنے دل میں پوری طرح اطمینان تھا کہ اخلاقی طور پر اس تصویر کے مالک وہی تھے، میں نے ذرا جوش سے جواب دیا:

''جی بالکل۔ مجھے اس میں کوئی شک ہی نہیں۔ خدا مبارک کرے۔''

انھوں نے دوبارہ مجھے غور سے دیکھا، لیکن اس بار انداز یہ تھا کہ مجھے متنبہ کر رہے ہوں کہ انھیں میری رائے کی چنداں پروا نہیں۔ تصویر تو انھیں کی تھی اور انھیں کی رہے گی۔

''اچھا اب لیجیے، دیوانِ ذوق مرتبہ مولانا محمد حسین آزاد ملاحظہ کیجیے۔'' انھوں نے ایک پرانی سی کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مجھے اب بھوک لگ رہی تھی اور تصویر کی دریافت اور صاحب تصویر کی کرشمہ جاتی شخصیت نے میرے حواس بھی کچھ زائل کر رکھے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے احمقوں کی طرح منھ پھاڑ کر انھیں دیکھا۔ پھر مجھے یاد آیا

کہ انھوں نے ابھی کچھ پہلے بھی دیوانِ ذوق اور وزیر خانم کی تصویر کا ذکر کیا تھا۔ میں ہاتھ بڑھا کر کتاب ان سے لے لینے کے لیے اٹھا تو انھوں نے کہا:

''صفحہ ۱۴۱ ملاحظہ فرمائیں۔ میں نے وہاں ورق نشان رکھ دیا ہے۔''

میں نے وہ صفحہ کھولا اور بڑھتی ہوئی نفرت، کراہیت اور استعجاب کے ساتھ یہ عبارت پڑھی:

> شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر میں باکمال تھیں۔ عمر کی دو پہر ڈھل چکی تھی اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴۔ ۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچے سے نکالی، اسے دیکھا اور کہا کہ استاد اسے ذرا دیکھیے۔ استاد سمجھ گئے کہ اسی کی تصویر ہے۔ دیکھ کر کہا، بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا دیکھیے تو سہی۔ اگر واقعی معشوق ہو تو کیسا ہو۔ استاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے۔ چاہتا ہے میں بھی بڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی رہا نہ گیا۔ تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا بھلا استاد اس حسن میں کچھ نقص تو بتائیے۔ استاد نے دیکھا اور کہا ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ استاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا لڑکا ہے اور ایک بیسوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔

میرے جی میں آئی، ورق کو کتاب سے چیر کر مٹھی میں مسل ڈالوں اور اسے غسل خانے کے فلش میں بہا دوں۔ لیکن ظاہر ہے یہ بے وقوفی اور بدمذاقی ہوتی۔

''میں ماننے کو تیار نہیں۔ مغل شاہزادہ، وہ بھی ولی عہد، ہزار گئی گذری حالت پر بھی اس قدر بے حیا نہیں ہو سکتا۔'' میں نے گرم لہجے میں کہا۔ ''بادشاہوں کی غیرت یہ بات گوارا ہی نہ کر سکتی تھی کہ ان کی عورتوں کو کوئی نامحرم شہزادہ بھی دیکھ لے، کجا کہ ایک معمولی ملازم، چاہے وہ شاعری میں ان کا استاد ہی کیوں نہ ہو اور پھر متانت اور تمکین بھی کوئی شے ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ مولانا نے داغ یا مرزا فخرو سے کوئی دشمنی نکالی ہے۔''

''میں اس کو خارج از امکان نہیں قرار دیتا، خاص کر جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ واقعہ یا لطیفہ بالکل بے محل اور بے موقع درج کیا گیا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اگر ولی عہد نے دلالوں کی طرح وہ تصویر دکھا کر صاحب تصویر کے حسن کی داد چاہی بھی تو شیخ ذوق کی یہ ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسا رکیک اور سوقیانہ جواب دیں۔''

''لیکن مولانا کو پرخاش کیوں ہوگی، بھلا کوئی بات بھی تو ہو۔''

''پتہ نہیں۔'' وسیم جعفر نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ نے شاید غور کیا ہو مولانا نے بادشاہ اور اصحاب

حویلی کے خلاف اور بھی کئی باتیں کئی جگہ لکھی ہیں۔ شاید اس زمانے کی تاریخ نگاری کا فیشن یہی رہا ہو۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ حویلی والے سب تھے ہی ایسے زوال آمادہ اور بے غیرت کہ ان کی تاراجی ہی بہتر تھی۔''

''ہاں پھر تو فیشن ہی بن گیا۔ نیاز صاحب نے داغ صاحب کے بارے میں جو لکھا سو لکھا لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ نے بھی ارباب قلعہ کے ساتھ پوری طرح انصاف نہ کیا۔''

''خیر، پھر بھی ان کا انداز غنیمت تھا۔ یہاں مولانا کو دیکھیے، میرزا فخرو بہادر کو ''لڑکا'' بنا رہے ہیں اور یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ان کی عمر ۲۴ یا ۲۵ کی ہوگی اور وزیر خانم ''بڑھیا'' تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرزا فتح الملک بہادر اور وزیر خانم کی عمریں برابر ہی برابر رہی ہوں گی۔ شاہزادہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوا تھا اور وزیر خانم کی بھی پیدائش کچھ اسی زمانے کی ہے، ممکن ہے وہ شاہزادے سے چار چھ مہینے چھوٹی ہی رہی ہوں۔''

''بہرحال۔ چلیے اب یہ تصویر تو آپ کے قبضے میں آ گئی۔ یہ بڑی کامیابی ہے لیکن افسوس کہ آپ اس کے بارے میں کچھ لکھ نہیں سکتے۔''

''کیوں نہیں لکھ سکتا؟ میں کبھی نہ کبھی اس موضوع پر کچھ لکھوں گا ضرور۔ آپ دیکھیے گا۔''

اس گفتگو کے کچھ دن بعد میں ہندوستان واپس آ گیا۔ وسیم جعفر کے برخلاف مجھے اپنے مقصد میں کچھ بھی کامیابی نہ ہوئی تھی۔ برہان پور کے فاروقی اور گورکھ پور کے خدائی جی دونوں ہی اپنی کہانی مجھ پر منکشف کرنے سے گریزاں رہے۔ اس ناکامی اور مایوسی کو تو میں نے کم و بیش بھلا ہی دیا لیکن وزیر خانم کی تصویر کو میں نہ بھول سکا۔ مجھے افسوس رہا کہ میں مؤرخ یا ناول نگار ہوتا تو محبت، فن اور زندگی کی تلاش کی داستان میں ضرور لکھتا۔

کوئی تین چار مہینے اور گذرے تھے جب مجھے مارٹن اینڈ مارٹن (Martin and Martin) نام کی ایک قانونی فرم کے پارٹنر مسٹر ڈگلس ایبرنیتھی (Douglas Abernethy) کے خط کے ساتھ ایک لفافہ اور کوئی پچاس اوراق پر مشتمل ایک پیکٹ ملا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

> ہمیں یہ اطلاع دیتے ہوئے رنج ہے کہ ہمارے ایک قدیمی موکل ڈاکٹر وسیم جعفر، پی۔ ایچ۔ ڈی۔، ایف۔ آر۔ ایچ۔ ایس۔، وغیرہ، ساکن ۱۴ / ۴۲، پورٹو بیلو روڈ، لندن، کا گذشتہ ۱۹ ستمبر کو لندن میں انتقال ہو گیا۔ انھیں پھیپھڑوں کا سرطان تھا۔ مرض کا مقابلہ انھوں نے آخری وقت تک نہایت پامردی سے کیا، لیکن سرطان آہستہ آہستہ ان کے سارے بدن میں سرایت کر گیا تھا۔ موصوف نے اپنے وصیت نامے میں ہدایت کی تھی کہ منسلک کاغذات اور سر بہ مہر لفافہ ان کی وفات کے بعد آپ کی خدمت میں ارسال کر دیے جائیں۔ متوفی کی ہدایت یہ بھی تھی کہ اگر آپ منسلک کاغذات پر مبنی کوئی تاریخ مرتب کرنا چاہیں تو تحقیق اور دیگر اخراجات کے لیے ان کے ترکے سے ایک ہزار

پونڈ کی رقم آپ کو پیش کر دی جائے۔ علاوہ ازیں، ڈاکٹر جعفر کی تمام کتابیں اور کاغذات برٹش لائبریری میں محفوظ ہیں اور ان کی وصیت کے مطابق ان میں سے کسی بھی کاغذ یا کتاب کی نقل آپ کو موصوف کی جائداد کے خرچ پر مہیا کی جا سکے گی اگر آپ کو ان میں کسی کی ضرورت اپنی تصنیف کے لیے محسوس ہو۔ براہ کرم اس خط اور منسلک کاغذات کی رسید سے مطلع فرمائیں، شکریہ۔

ہم ہیں آپ کے صادق،

برائے مارٹن اینڈ مارٹن
ڈگلس ایبر نتھی، جونیئر پارٹنر

پیکٹ کو میں نے الگ رکھ کر لفافے کو کھولا۔ اس میں وزیر خانم کی تصویر تھی، ایک کونے میں وسیم جعفر نے باریک لیکن روشن حروف میں اپنے دستخط ثبت کر کے تاریخ بھی درج کر دی تھی۔

کتاب

[ڈاکٹر وسیم جعفر کی تحریرات پر مبنی]

چھوٹی سی کتاب تھی، بالکل جیسے صفیر بلگرامی کی ''رشحات صفیر''۔ نام کے اعتبار سے تو ''رشحات صفیر'' مجموعۂ اشعار لگتی ہے، لیکن ہے یہ دراصل تذکیر و تانیث کا لغت۔ اردو میں تذکیر و تانیث کے انتشار کے باوجود صفیر نے اس کتاب میں اردو مذکر مونث کے قاعدے بھی بیان کرنے یا وضع کرنے کا جوکھم اٹھایا تھا۔ کتاب اس اعتبار سے ناکام رہی تو کیا ہوا اور ہر طرح سے تو کارآمد تھی۔ ''رشحات صفیر'' مطبع نورالانوار، آرہ سے ۱۸۷۶ء میں چھپی تھی، پھر کبھی نہ چھپی اور اس کے نسخے اب اس قدر کمیاب تھے کہ النادر کالمعدوم کا حکم رکھتے تھے۔ میں اس سے بہت کام نہیں لیتا لیکن اسے عزیز بہت رکھتا ہوں۔ دو ڈھائی سو صفحے، گدلا کاغذ، گندی چھپائی لیکن جلی اور روشن کتابت۔ بہت موٹی دفتی کی جلد جس پر چمڑا مڑھا ہوا۔ پچھلے مالک نے کتاب کو شاید احتیاط سے نہ رکھا تھا۔ دفتی دونوں طرف ٹیڑھی ہو گئی تھی، جلد کی سنہری جدول اتنی دھندلی گویا کبھی تھی ہی نہیں۔ چمڑا جہاں جہاں سے سوکھ کر تڑخ گیا تھا، بادامی گتہ اس کے نیچے صاف نظر آنے لگا تھا۔ میں جب بھی کوئی لفظ دیکھنے کے لیے ''رشحات صفیر'' کھولتا تو چمڑے پر ہلکی سی کریم یا زیتون کا تیل ضرور پھیر دیتا، کہ چمڑا کچھ نرم ہو جائے اور اس میں مزید دراڑیں نہ پڑیں۔ یورپ اور امریکہ والے ایسے کاموں کے لیے برفانی لومڑی (Mink) کے تیل کی بنی گاڑھی پالش استعمال کرتے ہیں۔ لیکن بے گناہ جانوروں کی جان لے کر اپنا الو سیدھا کرنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ ہاں اگر کوئی دوسرا چارہ ہی نہ ہو تو اور بات ہے۔

گتے کی خاکی اور چمڑے کی کتھئی بھوری رنگت اب تطاول ایام اور میری ہلکی روغن آمیزیوں کے باعث کچھ سیاہ پڑ گئی تھی۔ اس سبب سے وہ کتاب، میرا مطلب ہے ''رشحات صفیر''، کچھ اور بھی پرانی لگنے لگی تھی۔

مگر یہ کتاب تھی کیا اور کس کی تھی، کون اسے لا کر میرے پلنگ پر رکھ گیا تھا، یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میں نے اسے چھوا تو گرم گرم سی لگی، جیسے ابھی ابھی کسی نے دھوپ یا آگ کے پاس سے اٹھالی ہو۔ میں نے اسے کھولنا چاہا تو کچھ رکاوٹ کا سا دھوکا ہوا، گویا دفتی کی جلد نیچے کے کاغذوں کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہو۔ جلد پر کوئی نام تھا نہیں اور پشتہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن نہ بھی ٹوٹا ہوتا تو یہ صاف ظاہر تھا کہ اس پر مصنف، یا مالک، یا تصنیف کے بارے میں کچھ نہ لکھا تھا۔ یہ کتاب مخطوطہ ہے کہ مطبوعہ؟ عمر کے لحاظ سے تو بہت قدیم نہ معلوم ہوتی تھی، رہی ہوگی یہی کوئی سوا ڈیڑھ سو برس کی۔ لیکن اتنی عمر کی بھی کتاب قیمتی، بلکہ بے حد قیمتی ہو سکتی تھی۔ کہیں کوئی بالکل نایاب شے نہ ہو۔ مثلاً میر کے مکاتیب، یا بہادر شاہ ظفر کا اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان؟ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ لیکن زور لگا کر کتاب کو کھولوں اور ورق واقعی باہم چپکے ہوئے ہیں تو سب ضائع ہو جائے گا۔ تو پھر کیا؟ میں نے کچھ جھنجھلاہٹ اور کچھ بے صبری سے اپنے دل میں کہا۔ ضائع ہو جائے کم بخت ضائع ہو جائے۔ اب بھی یہ میرے یا کسی کے کون کام کی ہے۔ نہ کھلے گی تو بند ہی تو رہے گی۔

میں نے اس بار ذرا زور سے کتاب پر ہاتھ مارا.... ہلکی سی حرارت ویسی ہی تھی۔ حرارت؟ یہ کیا فضول اوہام ہیں؟ حرارت کا لفظ تو عام طور پر ہلکے جسمانی بخار کے لیے انسانوں کی ضمن میں برتتے ہیں۔ یہ کتاب اگر کہیں سے گرم گرم آئی بھی ہوگی.... (کیا مطلب؟ گرم گرم آئی ہوگی کا کیا مطلب؟ کیا یہ کتاب نہیں کباب ہے؟) تو بھی اب تک تو ٹھنڈی ہو چکی ہوگی۔ آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر کیا خبر اس مقام تک آتے آتے کس کس نے اس کتاب کو پڑھا اور برتا ہے اور کیا ضرور ہے کہ اردو ہی کی کتاب ہو؟ فارسی عربی عبرانی کچھ ہو سکتی ہے۔ ہاں انگریزی سنسکرت تو ہے نہیں کہ وہ بائیں طرف سے کھلتی.... لیکن جب تک کھلے نہ مجھے کیسے معلوم ہو یہ کتاب بائیں سے کھلتی ہے کہ داہیں سے کھلتی ہے۔

میں نے ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے کتاب کو کہیں بیچ سے کھولنا چاہا۔ ورق کچھ بھاری بھاری لگے، لیکن سب کے سب باہم چپکے ہوئے نہ تھے۔ بھاری یوں جیسے بہت دیر تک پانی میں تر رکھے گئے ہوں اور پھر سایے میں خشک کیے گئے ہوں۔ عبدالرحمٰن چغتائی جن کاغذوں پر تصویر بناتے تھے ان کے ساتھ پہلے یہی سلوک وہ کرتے تھے۔ لیکن وہ تو کاغذ ہی خاص طرح کا ہوتا تھا اور اس پر وہ کچھ مسالے اور انڈے کی سفیدی، کچھ ہلکا السی کا تیل بھی لگا کر اسے پانی بلکہ بارش میں ڈلوا دیتے تھے۔ تو ایسے کاغذ پر یہ کتاب لکھی گئی تھی؟ پھر تو شاید بہت پرانی نہ ہوگی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ کاغذ کچھ پھولے پھولے سے تھے گویا پانی میں ارادتاً ڈبائے اور خشک نہ کیے گئے ہوں، بلکہ کسی حادثے کی بنا پر دیر تک آب زدہ رہے ہوں۔ شاید کسی بگڑے دل رئیس نے پڑھتے پڑھتے کسی بات پر الجھ کر یا اکتا کر اسے گہرے حوض میں پھینک دیا ہو۔ پھر بعد میں افسوس کر کے انھوں نے شاید اسے نکلوا لیا ہو، یا کوئی اور ہی لے بھاگا ہو۔ (سنا ہے ولی دکنی کے کسی حریف نے ان کا بھی دیوان اچانک اٹھا کر ندی میں جھونک دیا تھا....)

میر سوز کے بھی تو اوراق اشعار میر نے شاید ان کے ہاتھ سے لے کر آصف الدولہ کی عین موجودگی میں حوض میں ڈبو دیے تھے؟ میرا دل ایک بانس اچھلا۔ ولی نہ سہی میر سوز سہی۔ میر سوز نے بعد میں چپکے سے میر کی آنکھ بچا کر وہ اوراق نکال کر سکھا صاف کر کے مجلد کرا لیے ہوں گے۔ کیا عمدہ دریافت ہوگی! مگر یہ کہانی بھی سراسر فرضی ہے۔ اچھا فرضی سہی لیکن اس کتاب کے اوراق بہرحال ایک دو غسل کر چکے تھے اور دیر دیر تک بھیگے رہے تھے۔

میں نے اس بار دفتی کو اٹھا کر اور قریب سے دیکھنا چاہا کہ شاید اب سوکھ گئی ہو اور پوستین الگ دکھائی دے جائے.... دفتی بڑی آہستگی سے کھل گئی۔ مجھے خیال بھی نہ رہا کہ اب تک میں اس وہم یا کشاکش یا اضطراب میں تھا کہ دفتی اور پوستین اور ورق سب آپس میں چپک کر ٹھوس چوکھٹی لوح نہ بن گئے ہوں۔

جلد کھلی تو ایک مری ہوئی ننھی منی روپا مچھلی جلد کے موڑ اور پوستین کے درمیان پڑی نظر آئی۔ لو، اس چمن کی بچاری نگہبان اور گلچیں جو بھی تھی اس کو بھی موت آ گئی! لیکن ہوا لگتے ہی اس میں تھوڑی بہت حرکت ہوئی.... (ہوا لگتے ہی؟ سنا تو گیا ہے کہ کتاب کو ہوا لگتی رہے تو روپا مچھلی مر جاتی ہے، پنپ نہیں سکتی؟) اور وہ دھیرے دھیرے سرک کر (پھسل کر؟) پوستین کے پیچھے چلی گئی۔

پوستین کتھئی پیلی سانپ کی کھال جیسے رنگ اور قماش کے موٹے کاغذ کی تھی جو اب سے کوئی سوا ڈیڑھ سو برس پہلے مقبول تھا۔ اسے کلکتے میں انگریزی کتابوں کے جلد سازوں نے ولایت سے منگا کر عام کیا تھا۔ گہرے رنگوں کے باعث اس پر کچھ لکھا بھی ہوتا تو پڑھا نہ جاتا اور کاغذ جگہ جگہ سے شکستہ الگ تھا۔ (اس کاغذ میں خرابی یہ تھی کہ یہ ٹوٹتا بہت جلد تھا۔ اس میں لچک نہ تھی۔) جلد کی داب کے ساتھ کئی جگہ تو ٹوٹ ہی چکا تھا اور خود پوستینی ورق پر بھی دراڑیں پڑ رہی تھیں۔ (روپا مچھلی انھیں میں سے ایک دراڑ کے پیچھے جا چھپی تھی۔ نہیں، شاید سرک کر یا پھسل کر جا رہی تھی.... بھلا مرا ہوا کیڑا چل کہاں سکتا ہے۔) سلائی اگرچہ فی الحال محفوظ معلوم ہوتی تھی لیکن اندرونی پشتہ بھی اب سلائی سے الگ ہو رہا تھا۔ جزائی لئی یا گوند کی نہیں، سریش کی تھی۔ اس کی بد بو مدت ہوئی اڑ چکی تھی لیکن خود سریش کی تہ گدلے شیشے کی طرح جگہ جگہ سلائی اور پشتے سے چپکی ہوئی تھی۔ چلو خیر سلائی ٹوٹی نہیں ہے اور جز سب الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اگر سامنے سے نہ کھل سکی تو کوئی ماہر جلد ساز اسے پشتے کی طرف سے کھول ہی لے گا۔

میں نے پوستین کا ورق پلٹا۔ جس طرح کے کاغذ کی یہ پوستین تھی اس کی دوسری طرف کاغذ عموماً بالکل سادہ ہوتا تھا، یعنی اس میں رنگ تو ہوتا تھا، لیکن ایک ہی رنگ، لہٰذا اس پر کچھ لکھنا چاہیں تو لکھ سکتے تھے، بس بھاری قلم یا بہت روشن سیاہی درکار ہوتی تھی۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ لکھا ہوا تھا۔ اگلا ورق کتاب کا پہلا صفحہ تھا لیکن خالی۔ لاحول ولا قوۃ، کوئی کچھ اپنا نام، دستخط، مہر، تاریخ، کچھ تو چھوڑ گیا ہوتا۔ 'سو رنگ ہے خرابی پر کچھ تو رہ گیا ہے' کے مصداق کچھ تو مجھ تک پہنچ جاتا۔ میں تو حتی الامکان اپنی ہر کتاب پر اپنا نام ضرور لکھتا ہوں اور اگر پرانی کتاب ہو تو اس پر کچھ کتاب کی تفصیلات کا حاشیہ بھی چڑھاتا ہوں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کہیں پوری کتاب ہی اسی طرح سادہ ورق نہ ہو۔ میں نے

دل میں کہا، چلو چھوڑو، کتاب کو (اگر یہ واقعی کتاب ہے) اٹھا کر پرے کرو۔ صبح دیکھیں گے۔

میں کتاب کو سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے کھسکانے جا ہی رہا تھا دفعتاً مجھے اپنی گردن کی پشت پر روئیں کھڑے ہوتے ہوئے لگے۔ جیسے کوئی میرے پیچھے ہے اور جھک کر کتاب کو پڑھنے یا پہچاننے کی کوشش میں ہے اور اس کی سانس میری گردن کے اطراف میں ہے۔ اس اکیلے گھر میں کون.... پیچھے گردن گھمانے کی ہمت نہ پڑتی تھی اور یوں بھی میری گردن ذرا اکڑی ہوئی سی ہے (ہو سکے تو شمع ساں دیجے رگِ گردن جلا پر عمل کرنے کی ہمت نہیں)، میں التہاب وجع مہرات (spondylitis) کا پرانا مریض ہوں، 'سر کسو سے فرو نہیں آتا' کا رتبہ خود بخود حاصل ہو گیا ہے۔ قدرت کے بھی کھیل نرالے ہیں۔ خیر گردن کو کسی نہ کسی طرح دھیرے دھیرے کر کے ایک حد تک موڑ لیتا لیکن اصل معاملہ تو بکھری ہوئی ہمت کو مجتمع کرنے کا تھا۔ سانس کی تو آواز بھی اب صاف سنائی دے رہی تھی، کتاب یوں ہی کھلی ہوئی تھی۔

اچانک اپنے ہی آپ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کتاب بند ہو گئی۔ میں ابھی ٹھیک سے چونک بھی نہ پایا تھا کہ کتاب پھر کھلی اور کسی نے سرگوشی کے لہجے میں، لیکن بالکل صاف صاف ہر حرف کو ادا کرتے ہوئے کچھ کہا۔ مگر کیا کہا، یہ میں نہ سمجھ سکا۔ خدا معلوم اردو تھی یا پشتو یا ترکی، میرے لیے سب برابر تھیں۔ میں نے ہمت پھر مجتمع کرنی چاہی کہ دیکھوں تو سہی کیا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں لیکن اچانک کتاب کے کھلے ورق پر ایک نارنجی شنگرفی لہر لرزاں لرزاں گذر گئی۔ نہیں میں شاید بھولتا ہوں لرزاں تو وہ بالکل نہ تھی۔ وہ تو اس طرح گذری تھی جیسے جاندار ہو، بل کھاتی ہوئی، قمقمے کی چوڑی کی طرح لیکن ورق اب بھی خالی تھا.... پھر کچھ ایسا لگا کہ خالی تو نہیں تھا۔ کبھی اس پر کچھ لکھا ہوا ہو گا جسے کسی بے درد نے بہت آہستہ آہستہ رگڑ کر مٹا دیا تھا۔ آتشی شیشہ اٹھاؤں، کم بخت کو اسی دراز میں تو رکھتا ہوں لیکن دراز کہاں، میں تو پلنگ پر دراز ہوں۔ میں نے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں ذرا سا سوراخ بنایا اور ایک طرف سے مٹھی کو کچھ زیادہ کھلا چھوڑے رکھا جس طرح بچپن میں دور بین خورد بین کا کھیل کھیلتا تھا۔ یعنی کبھی کبھی پڑھتے پڑھتے میں مٹھی کو خوردبین فرض کرتا، مٹھی بند کر کے ایک آنکھ میچ کر نیم وا مٹھی کو ایک آنکھ سے لگاتا، اس طرح کہ باریک سوراخ والا سرا دوسری طرف ہوتا۔ پھر باریک سوراخ سے گذر کر تارنگاہ شاید زیادہ روشن اور شوخ ہو جایا کرتا تھا اور مہین لکھی ہوئی عبارت کا ایک دو لفظ مجھے پہلے سے زیادہ صاف دکھائی دینے لگ جاتا تھا۔

لیکن اب تو مجھے آنکھ کی حقیقت سب معلوم ہے۔ یہ تارنگاہ وار نگاہ فضول تو ہماتی تشکیلات ہیں۔ روشنی آنکھ سے نہیں نکلتی، آنکھ کے اندر آتی ہے تو دکھائی دیتا ہے۔ ابن الہیثم نے یہ بات ہزار برس پہلے بتادی تھی۔ لوگوں کو یقین تب آیا جب اسے انگریزی کتابوں میں ثابت کیا گیا۔ لیکن مٹھی کی لمبائی ایک طرح کی طوالت عدسہ (Focal length) بھی تو بناتی ہے، میرے ضدی ذہن نے کہا اور اس سے آنکھ کی بصارت پذیری بڑھ جاتی ہے۔ کچھ دن ہوئے میں نے ڈاکٹر سے اپنی آنکھوں کا معائنہ کرایا تھا تو اس نے ایک سیاہ ٹکیہ میری آنکھ پر رکھی تھی۔ ٹکیے میں صرف

ایک مہین سا سوراخ تھا۔ میری کمزور آنکھ پر بھی اس نے وہ ٹکیہ رکھی تو اس باریک جوف سے مجھے بہت سے حرف صاف صاف نظر آ گئے جو عام طور پر میرے لیے ناخوانا تھے۔ میں بہت خوش ہوا کہ میری نیم کور آنکھ ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ یہ کچھ خاص امید افزا بات نہیں، دلچسپ ضرور ہے۔ اسے Pinhole effect کہتے ہیں۔ تو میں اسی Pinhole effect کو کیوں نہ کام میں لاؤں، محدب شیشہ نہیں ہے نہ سہی۔

ہوگا، Pinhole effect ہی ہوگا، لیکن میرا تو ہاتھ کانپ رہا تھا، مٹھی بندھ ہی نہ رہی تھی۔ اب تو بدن میں بھی ہلکی سی تھرتھراہٹ تھی.... پیچھے کوئی تھا، زیر لب مسکرا رہا تھا.... چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے مجھ سے کسی نے کہا۔ خوشی سے وہ چہرہ کھلا جا رہا ہے! خوف کے مارے میرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا پیچھے مڑ کر دیکھ نہیں نہ دیکھ سکتا ہوں نہ واقعی کوئی چہرہ یا کوئی ہستی میرے شانے کی اوٹ سے کتاب کو یا کتاب کو دیکھنے کی میری کوشش کو دیکھنے میں محو ہے اور کوئی ہے بھی نہیں اور کوئی دکھائی بھی نہیں دیتا اور کوئی گل گل شگفتہ بھی ہو رہا ہے اور میں.... میرے سر و گردن کی پشت پر کسی سانس کا لمس اور سرگوشی اکیلا گھر۔ کسے آواز دوں کہ برائے خدا مجھے اس عذاب سے...

یہ کتاب ہے کہ کوئی لوح طلسم؟ لوح طلسم پر تو کچھ لکھا ہوتا ہے جسے طلسم کشا ہی پڑھ سکتا ہے۔ پسینے کی ایک بوند میرے ماتھے سے پھسل کر داہنی آنکھ میں آ رہی۔ بائیں تو بہت کمزور ہے، دائیں آنکھ سے ہی سارے باریک کام کرتا ہوں۔ اضطراراً میرا ہاتھ اٹھا کہ پسینہ خشک کروں۔ ''کھل جائے گی۔'' کسی نے کہا۔ گھبراہٹ میں میرا ہاتھ مٹھی کی طرح آپ ہی آپ بھنچ گیا اور زور سے میری آنکھ پر اس طرح لگا جیسے کسی نے جبراً اسے ہلکے ہتھوڑے کی طرح میری چشم و ابرو پر کھٹاک سے ٹھونک دیا ہو۔

مٹھی کے سرے پر باریک سوراخ ننھی سی سوئی کی طرح، سنہرے پکھراج کی کنی سا جگمگا رہا تھا اور کتاب کے پہلے ورق پر، جہاں حاشیہ ہوتا ہے، اگر اس صفحے پر حاشیہ ہوتا، اسی سنہری پکھراجی روشنائی میں کچھ لکھا ہوا تھا لیکن مٹا مٹا سا۔ میں نے آنکھ کو خوب میچ کر اسے مٹھی کے باریک سوراخ سے پیوست کرنا چاہا۔ ''کھل جائے گی تو سن سکو گے۔'' کسی نے کچھ اس طرح کہا گویا آواز میرے کان میں نہیں ریڑھ کی ہڈی میں سمو گئی ہو۔ پسینے کی نئی بوندیں ماتھے اور آنکھ سے ہو کر مٹھی کو تر کر رہی تھیں جیسے آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے ہوں، دکھائی کیا دیتا۔

میں نے کچھ سراسیمگی کچھ برہمی کے عالم میں کتاب کو پھر پرے ہٹانا چاہا.... تو وہ ہٹی ہی نہیں۔ پتھر بن گئی۔ میں نے کچھ زیادہ زور لگانے کی ہمت کی ہی تھی، ہاتھ ابھی بڑھایا بھی نہ تھا کہ لو وہ کتاب تو آپ ہی آپ کسی ورق پر کھل گئی، جیسے ہوا کے کسی غیر محسوس جھونکے نے اپنا کام دکھایا ہو۔ کچھ لکھا ہوا تھا۔ فارسی تھی کہ اردو، پتہ نہ چل رہا تھا۔ سارا ورق دونوں طرف سے کرم خوردہ، شاید ہی کوئی سطر سوراخ سے خالی ہو۔ مجھے غصے اور خوف اور مایوسی سے رونا آنے لگا ہے لیکن آنکھ میں تو آنسو نہیں پانی کی دھند ہے۔ یہ پانی کہاں سے آیا؟ وہی، جو کتاب کے اوراق میں تھا اور کہاں سے۔ وہ پہلا ورق آہستہ آہستہ اپنے زور پر اٹھا، اپنی قوت سے پلٹا، کتاب ٹھیک سے کھلنے والی ہے شاید۔

دوسرے ورق پر پیشانی کے بائیں جانب کچھ پڑھنے میں آنے لگا تھا۔

کوئی شعر معلوم ہوتا تھا، لیکن اکثر حرف طعمۂ دیداں ہو چکے تھے۔ میں نے مٹھی کے سوراخ سے اور پھر مٹھی کھول کر ورق کو ممکن حد تک آنکھوں کے نزدیک لاکر پڑھنے کی کوشش کی۔ بے..... ہجر..... در مرگ..... آں نیست..... شبے..... افسانہ بگذرد۔ کس کا شعر ہے؟ یہ شعر تو پڑھا ہوا ہے، سینکڑوں بار کا دل ہی دل میں دہرایا ہوا۔ بارہا اس کی کیفیت اور اسرار پر وجد کر چکا ہوں۔ بابا..... بابا؟ طاہر عریاں؟ نہیں یہ ان کی زبان نہیں۔ بابا..... بابا..... بابا فغانی گیلانی؟ نہیں اس نام کا کوئی شاعر نہیں گذرا۔ نصیری گیلانی، ہاں بابا نصیری گیلانی..... اور پھر پورا شعر میں نے پڑھ لیا، یا یاد آ گیا اور میں نے سمجھا کہ ورق پر پڑھ لیا ہے

بے خوابیم ز ہجر در مرگ می زند
ایں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد

وہی پکھراجی سنہری روشنائی بہت مٹی مٹی سی لیکن ایک زرد بہار تھی کہ ان حرفوں سے پھٹی پڑتی تھی۔ کیسی کششیں ہیں اور کیسے جوڑ۔ صرف ایک دو دائرے اور نہ جانے کتنی کششیں۔ مرگ، نیست، شبے اور بے خوابیم کو بھی یوں لکھا تھا کہ ''بے'' اور ''خوابیم'' میں بھی کشش ڈال دی تھی اور علم کی طرح دل میں کھبتے ہوئے ''ایں'' اور ''آں'' اور ''افسانہ'' کے الف۔ ایں نیست آں شبے کہ بہ افسانہ بگذرد کیا پر اسرار بات ہے اور اس موقعے پر تو اور بھی رمزناک معلوم ہوتی ہے۔ یہ رات ایسی رات نہیں کہ کہانی کی طرح گذر جائے یا کہانی کہانی اسے گذار دے ختم کر دے۔ ''سنو گے تو کہوں۔'' کوئی پھر بولا ہے۔ خدا معلوم کوئی جنات ہے کیا ہے۔ میرے جسم و جان کا جنگل اس آواز کو سن کر تھرا اٹھا ہے۔ ساکت گمبھیر فرش شب کے اوپر لمبے قدموں سے کون گذرا ہے ابھی؟ لیکن کون مجھے سنائے گا اور کیا سنائے گا؟ کون ہے جو مجھ سے کہہ رہا ہے ''سنو گے تو کہوں۔'' کیا سنوں؟ کیوں سنوں؟ ہجوم سادہ لوحی نے گوش ہوش میں خروش بے معنی کا کف بھر دیا ہے کتاب بند ہو گئی۔

مجھے اپنے ہاتھ پر اور ہاتھ پر ہی نہیں، بدن پر قابو نہیں رہ گیا۔ ہزار چاہتا ہوں کہ جی کو مضبوط کروں، آنکھیں بھینچ لوں۔ انھیں دیر تک بند رکھوں۔ پھر گوشۂ چشم سے بہت دھیرے دھیرے دیکھوں کہ کتاب اب بھی وہیں ہے کہ نہیں۔ میرے پیچھے والے [والی؟] کی سانسیں اب بھی میری گردن کے باریک روئیں مرتعش کر رہی ہیں کہ نہیں..... جاتے ہیں کیسے کیسے سمیں چشم وا کرو..... میر محمد تقی صاحب نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، یا شاید نہیں دیکھا، تو وہاں کھڑکی نہیں باریک شیشے کی دیوار تھی جس پر مخطوطہ لکھا ہوا تھا۔ آر پار کا منظر سب اس مخطوطے میں منقش تھا اور جہاں جہاں جگہ خالی تھی وہاں سے نسیم بھی کبھی تیری، کبھی معشوق سی، کبھی مصرع طرح سی چھن کر آ جاتی تھی۔ کتاب ہے کہ بہت سی غیر متعلق اشیا سے ترتیب دیا ہوا کوئی منظر؟

لیکن میری آنکھیں تو ابھی بند ہی ہیں، میں نے دل میں کہا۔ میری آنکھیں خوف سے بند ہیں شاید؟ لیکن خوف مجھے اس کتاب سے نہیں، اپنے آپ سے تھا.... شعر کے نیچے بھی کچھ لکھا ہوا تھا، حسب معمول مٹا مٹا سا۔ روشنائی وہی افشانی شنگرفی سی، یا شاید لاجوردی سی۔ مگر بھلا لاجوردی پر شنگرفی کا شک کیوں کر گذر سکتا تھا؟ میں نے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں پرانی کتابیں دیکھی اٹھائی اور برتی ہیں۔ خود میرے پاس ایسی کتابوں کی کثرت نہیں تو کمی بھی نہیں۔ ایسا کبھی نہ دیکھا کہ زرد نیلگونی اور سرخی مائل زعفرانی ایک سا معلوم ہو۔ لیکن یہ بھی ہے کہ دہلی کے پرانے مصوروں اور خطاطوں کے خاص رنگ چار تھے: سفید، سنہرا، لاجوردی اور شنگرفی۔ یہ رنگ ہمیشہ گھر کی چہار دیواری میں بڑے رازدارانہ انداز میں تیار ہوتے تھے، کیا مجال کسی کو کسی کے نسخے اور پرچۂ ترکیب استعمال کی بھنک پہنچ جائے۔ تو یہ شاید ایسے ہی کسی گھرانے کی خفیہ روشنائی ہوگی جس کے رنگ میں اور بھی رنگوں کی چھوٹ تھی۔

کچھ ''میرزا....'' کے بعد کوئی لفظ تھا، ایک لفظ یا شاید دو لفظ اس کے پہلے۔ میرزا؟ میرزا غالب، میرزا سودا؟ کچھ ''نو....'' سا بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو کیا اسے ''میرزا نوشہ'' پڑھوں؟ کیا یہ غالب کے دستخط تھے؟ میرا دل زور سے دھڑکا۔ لیکن غالب نے خود کو ''میرزا نوشہ'' تو کبھی لکھا نہ تھا، دوسرے لوگ کہتے تھے اور نوشہ.... نواب.... تو کیا ''میرزا نوشہ'' لکھا ہوا تو ہے لیکن کسی اور کے قلم سے ہے؟

اچانک مجھے بالکل صاف سمجھ میں آگیا کہ ''نوشہ'' نہیں، ''نواب'' ہے اور ''میرزا'' کے پہلے ہے۔ ''میرزا'' کے بعد جس لفظ کو میں ''نو....'' گمان کر رہا تھا وہ ''خان'' کے ''خ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دفعتاً سب آئینہ ہو گیا۔ ''نواب مرزا خان'' لکھا ہوا تھا اور دستخط کی طرح نہیں، بلکہ گویا کسی نے پہلے بابا نصیری کا شعر لکھا پھر یہ نام لکھا، پھر نیچے کچھ اور لکھا۔ مثلاً ''ملاحظہ نمایند''، یا ''مطالعہ فرمایند''، یا ''عرض دیدہ شد''، یا ''داخل کتاب خانہ شد''، وغیرہ۔ لیکن داغ کو کسی کتاب خانے سے تعلق نہ تھا۔ رامپور میں وہ داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے تھے جس پر کہتے ہیں بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی تھی.... شہر دہلی سے آیا اک مشکی آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا۔

(کسی نے فرمایا ہے کہ یہ شعر رسا رامپوری کا نہیں ہو سکتا۔ وہ ''پرانے'' آدمی تھے۔ ''اصطبل'' میں موحدہ ساکن ہے، بروزن مفعول۔ وہ موحدہ کو متحرک کر کے ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن بھلا کیوں کر لکھ سکتے تھے؟ میں کہتا ہوں کیوں نہ لکھتے؟ ''اصطبل'' کا اردو میں ایک تلفظ بتحریک موحدہ بھی ہے اور اگر نہ بھی ہو تو کیا آفت آگئی۔ عربی میں موحدہ ساکن ہوگی، اردو والے متحرک بولتے ہیں اور ان کے لیے وہی صحیح ہے۔ خیر مجھے بڑا اطمینان ہوا کہ.... یہ پرانے آدمی کی بھی خوب کہی۔ پرانے آدمی اردو کے اپنے لوگ تھے عربی فارسی کے غلام نہ تھے جو ''اصطبل'' کو بروزن فاعلن باندھنے کو گدھے کی دولتیاں کھانے کے برابر جانتے۔)

کتاب پھر آپ سے آپ بند ہو گئی۔ معاً ہلکی سی ''چٹ'' کی آواز ہوئی، پھر ایک ورق کہیں اور سے کھلا۔ انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ہاتھ کا لکھا تھا یا کانٹے کے حروف کا چربہ تھا۔ کوئی ماہر خطاط ہی ہوگا جس نے

اطالوی کاپر پلیٹ (Italic Copperplate) سے کچھ مشابہ طرز میں سیاہ روشنائی سے آڑے لمبے حروف میں لکھا تھا۔ لارڈ رابرٹس کا نام صاف پڑھا گیا۔ پھر صفحے کی آخری سطروں میں اور جلی حروف میں یہ عبارت بھی صاف دکھائی دی:

Meerza Futhoolmoolk Bahadoor Ghoolam
Fukhrooddeen Rumz, 1849

اب ہاتھ لگا کر اگلا ورق پلٹا تو بالکل خالی۔ دوسرے ورق پر کچھ لکھا نظر آیا لیکن کھلتا نہ تھا کہ اردو ہے یا فارسی۔ میرا جی الجھنے لگا۔ بھلا یہ کس طرح کی کتاب ہے؟ مطبوعہ ہے کہ مخطوطہ؟ مطبوعہ ہوتی تو صفحے کے صفحے اس عجب ڈھنگ کے نہ ہوتے کہ کوئی خالی ہے، کوئی گھنا لکھا ہوا ہے اتنا کہ پڑھا نہ جائے اور کوئی بہت ہی پاشاں۔ کہیں انگریزی ہے کہیں کچھ اور۔ عجب جناتی چیز ہے، میں نے دل میں کہا۔ اب اسے تکیے کے نیچے محفوظ رکھ دوں سو جاؤں۔ صبح دیکھوں گا۔ لیکن ابھی تو سرِ شام ہی کا سماں تھا۔ رات بہت دور تھی اور میرے سونے کا وقت ابھی بالکل نہ تھا۔

یہ کتاب نہیں کوئی جناتی کارخانہ ہے۔ بولتی ہے، چپ رہتی ہے، آپ ہی آپ کھلتی ہے، آپ ہی آپ بند ہوتی ہے، کبھی ڈراتی ہے، کبھی رجھاتی ہے۔ آرتھر کوسلر (Arthur Koestler) کی کتاب کا نام The Ghost in the Machine تھا تو اس کتاب کو The Ghost in the Book کا نام دے دوں؟ لیکن کوسلر نے تو اس عنوان کے ذریعہ دیکارت (Descartes) کے نظریے کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انسانی جسم ایک ظرف ہے اور روح، یا دماغ، یا قوت تفکر اس کا مظروف۔ یعنی روح اور مادہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ کوسلر کو خوف تھا کہ اگر سائنس یوں ہی زور دکھاتی رہی تو ایک دن وہ مشینوں میں قوت نامیہ کا اصول ڈال دے گی یا دریافت کر لے گی اور میں.... میں تو ان تمام گم شدہ چیزوں کو تلاش کر رہا ہوں.... (کہ ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں) جنھیں ہم کتابوں میں بند کر کے اور کتابوں کو کالے نیلے بستوں میں باندھ لپیٹ کر ندی کے اس پار جھاڑی جھنڈیوں میں پھینک آئے تھے کہ ہماری بندشیں ڈھیلی تھیں اور وزن زیادہ اور کمریں خمیدہ.... اور جب ہم ندی کی سیاہی مائل ریت کے کگاروں پر افتاں و خیزاں نیم تاریکی میں کشتیاں ٹٹول رہے تھے تو وہ بستے ایک ایک کر کے ہماری کمروں سے پھسلتے گئے مگر ہم نے کچھ خیال نہ کیا۔

اے پری خواں یہ پری زادوں کی تسخیر نہیں کتاب میں سے کچھ آواز سی آئی جیسے کوئی گنگنا رہا ہو جیسے شیشے کی صراحی میں پانی ٹپک ٹپک کر جمع ہو رہا ہو جیسے نہایت ہی نازک چھوٹے سے تانپورے پر کوئی پری سروں کو سدھ کر رہی ہو۔ بڑی دلفریب گونج تھی۔ نغمہ گرا ہے بوند بوند پھر بھی اٹھی ہے کتنی گونج اڑتی پھری ہے ذہن میں گرد خیال ہر طرف۔ پھر اچانک کتاب کا صفحہ روشن ہو گیا، جیسے سنیما کا چھوٹا سا پردہ ہو، میرے گھر میں تو ٹی وی بھی نہیں اور یہ تصویریں تو رنگین ہیں۔ لیکن سنا ہے خواب تو ہمیشہ سفید و سیاہ ہی ہوتے ہیں۔ ہندی والے شویت شیام کہتے ہیں، لفظ

خوبصورت ہے لیکن عجب طرح کا تصنع ہے اس پیکر میں جو اس لفظ یا فقرے کے ذریعہ ذہن میں روشن ہوتا ہے۔ لال قلعے کا لاہوری دروازہ..... لیکن یہاں تو چہل پہل کچھ اور طرح کی ہے؟ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے کچھ بے ہنگم سے لوگ، نمک مرچ لگا کر کیلے کھاتے ہوئے، گہری گاڑھی لپ اسٹک اور نمایاں ہونٹوں، کچھ اکتائے ہوئے کچھ برہم چہروں والی عورتیں، اسکوٹروں، کاروں اور بسوں کا دھواں اور شور، سڑک کے دونوں طرف دکانیں اور ٹھیلے، پلاسٹک کی تھیلیاں، گول گپے اور چاٹ کے دونے، بدصورت بیمار رنگوں کے پلاسٹک کے گلاس اور آئس کریم کی پیالیاں، یہ سب کچھ نہیں۔ میرے پیچھے جامع مسجد صاف دکھائی دیتی ہے۔ کوئی کہتا ہے، آج تو چوک سعد اللہ خاں کی چھب ہی نرالی ہے، حضرت مرشد برحق قدر قدرت ظل سبحانی مینا بازار تشریف لے جائیں گے..... پھر کہیں سے ستار پر کھرج میں کسی راگ کی آروہی کے سر گونجتے ہیں.....

پا.....نی.....سا.....رے.....رے

یہ تو تلک کا مود ہے، آروہی میں رکھب کے سر لگ رہے ہیں، گندھار وذرا سا، لیکن کھرج پورے زور میں۔ کیسی گونجتی ہوئی سی آواز ہے، ستار لگتا ہی نہیں ہے، سرود لگتا ہے۔ خدا جانے مضراب اور صاحب مضراب میں کتنی جان ہوگی، سروں میں پھیلاؤ اور گہرائی اور وزن ہے۔

رے.....ما.....پا.....نی.....سا.....

اور اب آروہی.....

سا.....نی.....دھی.....پا.....ما.....گا.....رے.....گی.....سا.....

پھر پورا راگ بجنے لگتا ہے:

سا.....نی.....سا.....پا.....نی.....سا.....رے.....رے.....رے.....پا.....ما.....گی.....

نہ بجانے والا نظر آتا ہے نہ اس کی سنگت والے۔ لاہوری دروازے پر رونقیں اور بھی بڑھ گئی ہیں، لیکن کچھ کچھ لوگوں کی چال ذرا مدھم ہے..... تلک کا مود رات کے دوسرے پہر کا راگ ہے۔ یہ سورٹھ اور دیس سے بہت مشابہ ہے۔ مشاق سازندے یا گویئے ہی انھیں الگ الگ کر سکتے ہیں۔ اس راگ میں گذرتی ہوئی رات کا درد اور بھولے ہوئے لمحات کی کسک اور آنے والی صبح کا خوف ہے جب شمعیں بجھا دی جائیں گی، جب چراغوں کی لوؤں کے سر قلم ہوں گے۔

تصویر

میرا نام محمد یوسف سادہ کار ہے۔ میں کشمیری الاصل ہوں۔ لیکن اصل معاملہ میرا اتنا سادہ نہیں اور شروع سے بیان کروں تو بہت لمبا اور پیچ در پیچ ہے۔ لیکن شروع سے بیان نہ کروں تو اس کی باریکیاں کسی کی سمجھ میں نہ آئیں گی۔ اب میں عمر کی اس منزل میں ہوں (سنہ عیسوی ۱۸۴۰، عمر ۷۴ سال) جہاں انسان پیچھے مڑ کر دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ جو ہوا اسے یوں ہی ہونا تھا یا کچھ اور صورت یا صورتیں ممکن تھیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو کچھ وہ خود بنا اور جیسے اس کے اخلاف بنے، تو کن منازل و مراحل کو طے کر کے یہ صورتیں اور مورتیں صانع وقت کو بہم پہنچ سکیں۔ قبلہ میر صاحب فرما گئے ہیں کہ بگڑیں ہزار شکلیں تو روپ یہ بنائے۔ یہ بات شاید ایک سے زیادہ مفہوم میں ہم پر صادق آتی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اس عمر میں جب عورتیں اپنوں میں سکھ اور بہناپا ڈھونڈتی ہیں اور مرد اپنی گھر والی میں ساتھی سنگاتی دیکھتا ہے، میں اکیلا ہر طرف سے ہوں۔ میری نیک بخت بیوی کو اللہ نے اچانک یوں اٹھا لیا جیسے مہر عالم تاب نوک خار سے شبنم کو چپ چاپ اٹھا لیتا ہے اور میری بیٹیاں تینوں مجھ سے جدا ہو چکی ہیں۔ اب مجھے یہاں کچھ کرنا نہیں ہے، اے خوش آں روز کزیں منزل ویراں بروم۔ لیکن اس تنہائی اور اس امید و تمنائے مرگ میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ جو بھی کہوں گا سچ کہوں گا اور کچھ پوشیدہ نہ رکھوں گا کہ مجھے کسی سے کوئی توقع نہیں، کسی کا کچھ خوف نہیں۔

سادہ کاری ہمارا آبائی پیشہ نہیں۔ میرے باپ دو بھائی تھے، محمد داؤد بڈگامی اور محمد یعقوب بڈگامی۔ یہ لوگ کشمیر میں مدت سے رہ رہے تھے، لیکن درحقیقت داؤد بڈگامی اور یعقوب بڈگامی اصلاً یہاں کے نہ تھے اور ان

کے دادا کا نام مخصوص اللہ میاں مرقع نگار تھا۔ یہ میاں صاحب فردوس قرار، اعلیٰ حضرت شہنشاہ عالم و عالمیان، اقبال نشان، سعادت گیہان، محمد روشن اختر شاہ بہادر غازی فردوس آرام گاہ کے عہد مبارک و با سعادت و جنت سند کے زمانے [1] میں کشن گڈھ راج کے ایک چھوٹے سے گاؤں ہندالولی کا پروا میں آباد تھے۔ یہ امر شاید ضروری الاظہار نہ ہو کہ راجپوتانے میں بالعموم اور ہند میں بالخصوص حضرت مہر سپہر ولایت، سپہر مہر سخاوت و جودت، خواجۂ بزرگ، غریب نواز و شاہ ساز، پیران پیر، شاہوں کے تاج بخش اور بے کسوں کے دست گیر، پیارے پیا بابو معین الدین صاحب چشتی محبوب خدا کو ''ہندالولی'' کہا جاتا ہے۔ کیا مسلمان کیا غیر مسلم، سب ''ہندالولی'' کا نعرہ لگاتے ہیں اور عقیدہ رکھتے ہیں کہ خواجہ مجیب ہو کر کرم گستر بھی ہوتے ہیں۔ ''ہندالولی'' میں حرف سوم مفتوح ہے۔ پہلے تو ایک ہی گاؤں تھا جو اجمیر شریف سے کچھ دور خواجہ صاحب کا چلہ نامی بستی کے قریب ''ہندالولی کا پروا'' کے نام نامی سے ملقب ہوا۔ وقت کے ساتھ کئی گاؤں کے ناموں میں اس مبارک نام کا بھی حصہ وابستہ ہو گیا۔

ہمارے گاؤں کا نام کثرت استعمال سے اب صرف ''ہندل پروا'' رہ گیا تھا۔ خاص گاؤں میں تین گھر کو چھوڑ کر آبادی سراسر غیر مسلم تھی، ایک دو پنڈ تانے، پانچ سات گھر راجپوتوں کے، باقی مختلف اہل حرفہ کے۔ مصوری ان کا وسیلۂ حصول آذوقہ تھی۔ کشن گڈھ قلم کی زینتیں انھیں جیسے عسرت کے مارے لیکن خلق اور خوش خوئی کی صفت سے متصف صناعوں کی مہارت، رنگ سازی میں ان کے ابداع اور کاغذ سازی میں ان کے مختارات کی مرہون منت تھیں۔ خاص شہر کشن گڈھ میں تو محض اناڑی اور دلال رہتے تھے، کام تو ہم گاؤں والے کرتے اور نام کشن گڈھ قلم کا ہوتا۔

میاں مخصوص اللہ کا اصل نام مجھے نہیں معلوم۔ نہ اس وقت ان کی عمر کا ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اب ہندل پروا کا بھی نشان صفحۂ ہستی پر نہیں کہ وہاں کسی سے پوچھ لیا جائے۔ بس اتنا ہی ہے جو میں گوش گذار پیارے ناظرین اپنے کے کر ہی چکا کہ اغلب ہے غیر مسلم تھے اور ان کا آبائی نام کچھ اور تھا۔ اس وقت ان کی عمر کوئی تیس پینتیس رہی ہوگی لیکن دنیا سے بہت الگ تھلگ رہنے اور اپنے کھانے لباس کی کچھ فکر نہ کرنے کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتے تھے اور سارا گاؤں انھیں ''میاں'' یا ''بابا'' کہتا تھا۔ گاؤں کی کل آبادی کوئی دو پونے دو سو نفر تھی۔ ان میں بیش تر ہی کسی نہ کسی طرح مصوری کی روزی کھاتے تھے۔ سرحد سے ذرا باہر کچھ مسلمان اور ہندو چرواہوں اور ساربانوں کے گھر ضرور تھے۔ ایک دو موروثی لیکن مختصر کاشت کار بھی تھے۔ ان سب کے بارے میں مدتوں سے شک تھا کہ ٹھگ ہیں اور خون بہائے بغیر قتل کرنا، لاش کو لوٹنا اور گہرا داب کر اس طرح غائب کر دینا کہ کبھی پتہ نہ لگے، ان کا دھرم ہے۔ لیکن یہ بات کسی پر ثابت نہ تھی اور گاؤں کے قرب و جوار میں ایسی کوئی واردات ان پر ثابت نہ ہوئی تھی۔ ثابت کیا معنی، کسی کو احتمال خفیف بھی ایسے جرم کا نہ گذرا تھا۔ ان میں کچھ لوگ مسلمان تھے، کچھ دوسری ذاتوں کے،

---

(۱) ۱۷۱۹ تا ۱۷۴۸ء

حتیٰ کہ ایک کے بارے میں کہتے تھے کہ پنڈت ہے۔ مسلمان تو پابند صوم وصلوٰۃ تھے اور ہندو اپنی اپنی ذات کے اعتبار سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے۔ مشہور تھا کہ ہندو یا مسلمان، ان ٹھگوں کی اصل دیوی تو درگا یا کالی ہے جسے یہ لوگ بھوانی کے نام سے پکارتے ہیں۔

گاؤں کی خوش حالی کا بڑا حصہ یہاں کے شبیہ سازوں (اور شاید تھوڑا بہت ٹھگوں) کی بدولت تھا۔ لوگ منھ مانگی قیمتیں دے کر شبیہیں لے جاتے تھے۔ یہ زیادہ تر خیالی ہوتی تھیں۔ شبیہ حقیقی بنانا عام طور پر معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے شبیہ سازوں نے جڑی بوٹیوں اور پتیوں اور درختوں کی چھالوں، پھولوں اور پھلوں اور بعض کیڑے مکوڑوں سے رنگ نکالنے کے طریقے اپنے اجداد سے سینہ بہ سینہ پائے تھے۔ ان کے رنگوں میں خارجی تیل کا عنصر بالکل نہ ہوتا تھا، الا ماشاء اللہ وہ تیل جو خود اس کیڑے یا پھل میں ہو جس کا رنگ اتارا جا رہا تھا۔ رنگ کو پہلے خشک بھر بھرے ڈھیلوں کی شکل میں بناتے تھے۔ پھر اوپر نیچے بہت باریک ململ رکھ کر نرم سنگ جراحت کے چکنے ٹکڑوں سے انھیں آہستہ آہستہ کوٹا اور پیسا جاتا۔ یہ عمل اتنی ہلکی قوت سے کیا جاتا تھا کہ آواز تک نہ آتی تھی۔ اس دوران ململ کے کپڑے پھٹ جاتے تو فوراً بدل دیے جاتے۔

جب مہینوں کی کٹائی پسائی کے بعد رنگ ایسا ہو جاتا کہ ہوا میں آپ سے آپ غبار بن کر اڑنے لگتا تو اسے ایک بار اور چھان کر ہلکے پانی سے گوندھ کر لئی سی بنا لیتے تھے۔ یہ پانی بھی ہر جگہ سے نہیں آتا تھا۔ کشن گڈھ کی قدیمی جھیل کے صرف مغربی کنارے کے ایک کنڈ کا پانی اس کام میں لگتا تھا۔ یہاں کچھ نئی طرح کی گھاس پانی کے اندر اگتی تھی۔ (کہتے تھے کہ مگر مچھ اسے اپنے پیشاب سے سینچتا ہے اور یہ مگر مچھ پشکر جھیل کے دیوتا مگر مچھوں کے خاندان کے ہیں۔) یہ گھاس نہ تو سوار کی طرح سخت اور گھنی اور دھار دار لمبی پتیوں والی تھی اور نہ مچھلی گھاس کی طرح لمبی لسلسی اور باہم الجھی ہوئی۔ موٹی موٹی ڈنٹھلیں تھیں، پتیوں اور ریشوں سے بالکل معرا اور وہ اس طرح آڑی ترچھی شکلوں میں اگی تھیں کہ کبھی کبھی لگتا تھا کسی نے ہاتھ سے بنا کر کاٹ جوڑ کر ڈال دی ہیں اور کبھی ایسا لگتا کہ کوئی تیز دانتوں والا جانور انھیں مہینوں سے کترتا آیا ہے اور اب جو لکڑی اور پتیاں جگہ جگہ سے کھل اور چھل اور کٹ گئی ہیں تو آمیر اور لال قلعے کی دیواروں پر بنے ہوئے نقش و نگار جیسے متنوع اور ایک کے اندر ایک کے گتھے ہوئے نمونوں اور نقشوں کا التباس ہوتا ہے۔

یہ ساری جھنڈیاں اور ڈالیاں ہمیشہ پانی میں غرق رہتیں۔ پانی کبھی کم ہو جاتا اور اس کا خدشہ ہونے لگتا کہ لکڑیاں سطح آب سے اوپر آ جائیں گی اور دھوپ انھیں چھو لے گی، تو خود ان ڈالیوں سے اتنا پانی بوند بوند پھوٹ بہتا کہ ڈالیاں پھر سے تہ آب ہو جاتیں۔ کشن گڈھ کے رنگ حسب ضرورت گوندھے جاتے تھے، ورنہ انھیں جست کی کلھیوں میں سر بہ مہر رکھا جاتا تھا۔ یہاں کے مصور اونٹ کے بچے کی دم کے نچلے اندرونی روئیں اور گجراتی کچھار کی گدھیوں کے نوزائیدہ بچوں کے کانوں سے آہستہ نوچے گئے باریک بالوں سے اپنے موقلم تیار کرتے تھے اور کشن گڈھ

کی جھیل کے متذکرہ گوشے کے پانی کو مٹی کی ٹھلیوں میں سرد کر کے اس پانی سے ان کے رنگ گوندھے جاتے تھے۔ کبھی کبھی زبرجد یا لاجورد کے ٹکڑوں کو اسی پانی میں رکھ کر کلھیوں کو مہینوں بند رکھتے۔ پھر پنجانگ اور آسمان اور پروہت سے مشورہ کر کے وہ کھولی جاتیں اور ان ٹکڑوں کو پیس کر رنگ بنایا جاتا۔

مخصوص اللہ (یا جو بھی نام ان کا اس زمانے میں رہا ہو، سب سے اچھا یہی ہے کہ ان کو ''میاں'' کہا جائے) کے یہاں جانور اور شکار اور مناظر کارزار کی تصویریں نہیں بنتی تھیں۔ لیکن ان کی کئی تصویروں میں کسی پرانے، بلند، یا شکستہ اور ویران لگنے والے مینار کے پس منظر کے ساتھ کسی نوجوان لڑکی کو ایک ٹوٹے ہوئے، بھورے یا کچھ کائی زدہ پتھر، یا ہری بھری لیکن پست چٹان پر اس طرح بیٹھا ہوا دکھایا جاتا گویا کوئی شخص ابھی ابھی اس کے سامنے تھا اور وہ اس سامنے والے شخص [1] کو دیکھ رہی تھی، لیکن اچانک اس کی توجہ بائیں طرف کو منعطف ہوگئی ہے اور اب اس کی نیم رخ ہی صورت تصویر کو دیکھنے والے کے سامنے ہے۔ گردن کے خم اور شانوں کے ہلکے سے کھنچاؤ کے باعث جو بن کچھ نمایاں ہو گئے ہیں، بیاض گردن میں لطیف سا دلکش تناؤ ہے، ٹھوڑی سے آنکھوں تک جلد بہت ذرا سی کسی ہوئی، بہت خفیف سی کشیدہ ہے، گویا ایک لحظہ پہلے اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی ہلکی سی لہر دوڑی تھی اور اب وہ تبسم زائل ہو چکا ہے، لیکن اس کے آثار ابھی باقی ہیں۔ ماتھا آدھے سے زیادہ ڈھکا ہوا، لیکن اوڑھنی کے باریک پلو کے نیچے بالوں کی بناوٹ اور گل دوپہریا سے ان کی تزئین صاف نظر آتی تھی۔ تصویر کے نیم رخ ہونے کے باعث چوٹی اور گردن اور شانوں کا بھی جلوہ الگ بہار رکھتا تھا۔

یہ لڑکی میاں کی کون تھی، یہ کسی کو نہ معلوم تھا۔ ان سے پوچھنے کی ہمت کسی میں تھی بھی نہیں۔ وہ دن بھر میں شاید دس یا بیس کلمے ادا کرتے ہوں، ورنہ بالکل چپ ہی رہتے۔ کئی کئی رات جنگل جا کر چاندنی راتوں میں ریت کے ٹیلوں کی چھاؤں میں پڑے رہتے۔ پڑے رہتے یا دعا پوجا کرتے۔ کبھی کبھی وہ ایک پوٹلی میں باجرے کی روٹی، چٹنی، ایک چھاگل میں پانی اور ایک دو پڑیوں میں کچھ رنگ اور کاغذ کے دو چار تختے لے کر دو دو تین تین دن تک غائب رہتے۔ ہمارا گاؤں کشن گڈھ ریاست کے صدر مقام سے کوئی دس کوس شمال مغرب میں بارمیڑ اور جیسلمیر کی طرف پڑتا تھا۔ سڑک کوئی تھی نہیں، اونٹوں، گھوڑوں، پیدلوں اور کبھی کبھی رتھوں کی آمد و رفت نے صدیوں میں ریگستان میں جو نقش بنائے تھے وہ ایک باریک سی پگڈنڈی کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ بارش دو چار برس میں ایک آدھ بار ہوتی تھی، اس لیے راستے میں گھوڑے یا گاڑی کے پھنس جانے کا امکان صرف اسی صورت میں تھا کہ بھربھری ریت کے نیچے کوئی گڈھا ہو اور سواری یا جانور انجانے میں اس میں جا رہے اور ہاتھ پاؤں تڑا بیٹھے۔ اس خطرے کے سوا ہماری راہیں محفوظ تھیں۔

---

(۱) یعنی مصوری کی اصطلاح میں Gazer

ان دنوں ہمارے گاؤں کے اطراف میں تغدر[1] بہت ہوتے تھے۔ سانپ اور چھوٹے جانور اور ٹڈیاں، کیڑے، اس کا من بھاتا کھاجا تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے علاقے کا سب سے خطرناک سانپ پھرسا اس کا محبوب شکار تھا۔ بمشکل ڈیڑھ دو ہاتھ کا پتلا سا سیاہی مائل یہ سانپ اس قدر زہریلا تھا کہ اس کا کاٹا ہوا، جانور ہو یا انسان، کبھی بچتا دیکھا نہ گیا تھا اور حملے میں وہ اس قدر تیز تھا کہ اس کے سامنے آنے والے کا بچ نکلنا غیر ممکنات سے تھا۔ اونٹ اور گائے بیل جیسے بھاری جانوروں کے سم، یا بیل گاڑی، بہلی، رتھ کے پہیوں کے بنائے ہوئے گڑھوں میں پھرسا یوں تو پہروں مزے کی نیند سوتا، لیکن اگر کسی بدنصیب کا پاؤں اس گڑھے میں پڑ گیا جہاں پھرسا محو استراحت تھا تو پھر اس کی خیر نہ تھی۔ ایک لمبی فوں سی پھنکار کے ساتھ وہ اپنے تقریباً پورے قد سے اچھلتا اور مقابل کی ران یا پیٹ پر کاٹ لیتا۔ اس کے بعد چند گھنٹوں کی لاعلاج غشی اور پھر موت۔ ہم لوگ تغدروں کی بہت قدر کرتے تھے کہ صرف وہی ایسی بے جگر اور سریع السیر تھیں کہ پھرسوں کو بے تکلف مار کر کھا لیتی تھیں۔ لوگ مخصوص اللہ میاں سے یہی کہتے کہ بابا ادھر ہی جایئے گا جدھر تغدر کثرت سے ہوں۔

ہمارے گاؤں کے زمیندار مہاراول گجندر پتی سنگھ کا تعلق بوندی راج سے تھا لیکن ایک زمانے میں کشن گڈھ راج سے کچھ خانہ دامادی کے رشتے پیدا ہو گئے تھے اور تب سے وہ لوگ کشن گڈھ ہی میں رہتے تھے۔ تیوہار کے دنوں کے سوا مہاراول ہمارے گاؤں میں شاذ ہی تشریف لاتے۔ عید، ہولی وغیرہ میں وہ ذرا دیر کو آئے، سرسواری نذریں لیں، سونے چاندی، بادلے، مقیش کے پھول لٹائے، کسی کسی کو زیور یا کپڑے سے نوازا اور چل دیے۔ گاؤں کی آمدنی جوان تک پہنچتی تھی کاشت کاری پر مرتہن نہ تھی، لہٰذا انھیں آب پاشی، کھیتی، فصل، بیج، وغیرہ معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک دن خبر اڑی کہ مہاراول گاؤں کی سیر کو آنے والے ہیں۔ یہ عجیب واقعہ تھا، کہ گاؤں کی سیر کے لیے مہاراول کیا، ان کا گماشتہ بھی کبھی نہ آتا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے دروازے دہلیزیں صاف کیں، گھروں کے سامنے چھڑکاؤ کیا۔ دیواروں پر تصویریں اور چوکھٹ کے آگے رنگولیاں بنائی گئیں۔ موروں کی تو بستی میں بہتات تھی، جگہ جگہ مور پنکھیاں لٹکائی گئیں۔ ذرا دیر میں بازار سا سماں ہو گیا۔ مخصوص اللہ میاں حسب معمول اپنی سیروں پر نکلے ہوئے تھے، لیکن ایک تصویر انھوں نے کچھ دن پہلے مکمل کی تھی۔ ہلکی لیکن مضبوط سفید ریشمی چادر کا ٹکڑا لے کر اسے ہلکے رنگ میں رنگا تھا اور پھر نقش بنائے تھے۔

تصویر کیا تھی، آئینے میں پری تھی۔ بالکل میاں کے خاص قلم کا اعلیٰ نمونہ۔ چودہ پندرہ برس کی لڑکی سنگ سیاہ کی ایک شکستہ سی چوکی پر یوں بیٹھی ہوئی گویا اب اٹھے گی تو پوری جوان ہی اٹھے گی۔ بھرپور جوانی اس کے جسم کے عضو عضو پر دستک دے رہی تھی۔ لہنگا ذرا ڈھیلا اور لمبا، لیکن گلاب کی کلی سے نازک تر ٹخنے اور گلاب کی پنکھڑی سے بھی لطیف، گلابی لیکن زندہ پھڑکتے ہوئے رنگ کے پاؤں تھوڑے تھوڑے جھلک رہے تھے۔ ایک تلوے پر ہلکا سا

---

(1) Great Indian Bustard.

داغ، خدا معلوم تل تھا یا باغ کی کوئی پتی پاؤں کے صدقے ہو کر رہ گئی تھی۔ گردن اسی طرح ایک طرف کو خم، صورت ویسی ہی نیم رخ، لباس شوخ اور بھڑکیلا نہیں بلکہ سفید اور گلابی اور زعفرانی، لیکن تینوں رنگ اس طرح بول رہے تھے کہ تصویر تھرتھراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چندری پر بہت باریک لچکا پٹھا اور چنگی، لیکن پھر بھی لگتا تھا سر سے چندری اب ڈھلکی اب ڈھلکی اور ڈھلکی تو ہاتھ بڑھا کر چھوؤ گے تو واقعی ململ کی چندری کا پلو ہاتھ میں آجائے گا اور تم اسے چٹکی سے اٹھا کر پھر اس کے سر پر رکھ دو گے۔ سُتواں ناک، گردن، سب بالکل کشن گڈھ والی، آنکھیں کمرک کی پھانکیں اور پتلیاں اتنی سیاہ اور سفیدی میں سرخی کی ہلکی سی ایسی جھلک کہ آنکھوں میں گلابی لہریے انگڑائی لیتے محسوس ہوتے تھے۔ گردن میں صرف ایک سادہ سونے کا ہار، جس میں گوریا کے انڈے کے برابر ایک انتہائی صفائی سے بیضوی کاٹے ہوئے یاقوت انجم (Star ruby) کا آویز، کلائیوں میں صرف ایک ایک گھڑیالی کڑا۔ باکمال مصور نے اندھیاروں اجیاروں کا انتظام ایسا رکھا تھا کہ اجیارے کی ایک کرن یاقوت ستارہ پر کچھ اس طرح پڑ رہی تھی کہ تارے کی چھیوں لکیریں جھلک اٹھی تھیں۔ ٹھنڈی پہاڑی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں خوش مزاجی اور الھڑپن اور نخوت کا امتزاج۔ چہرے پر واضح مسکراہٹ نہیں تو کوئی تشویش بھی نہیں، ایک خاموش تمکنت، خود پر کامل اعتماد اور دنیا کے ہر خوف سے بیگانہ، مطمئن انداز نشست۔

میاں کی بنائی ہوئی یہ تصویر ان کے حجرے کے بڑے طاق پر اٹکا دی گئی تھی۔ لوگ دیکھنے آتے اور عش عش کرتے۔ لیکن ایک دو دن ہی میں یہ بھی سنا جانے لگا کہ تصویر میں کچھ گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ؟ کیسی گڑبڑ؟ لڑکیوں کی شبیہیں تو سب خیالی ہوتی ہیں۔

''نہیں۔'' مہاراول کا ایک سپاہی پاس کھڑا تھا۔ اس نے گھبرائے ہوئے اور سرگوشی کے لہجے میں کہا، ''یہ اصلی ہے۔'' اور پھر اس نے جلدی سے کان اور منھ کو سختی سے بند کر لیا۔

سانجھ پھول رہی تھی، لیکن روز کی طرح اس میں ریت کے ذروں کی ہلکی چمک نہ تھی۔ کچھ سیاہ ڈورے افق پر لہرا رہے تھے۔ شام یوں بھی ہمارے اطراف میں بہت تیز پھیل جاتی تھی، جیسے گلدار بستی کا شکار کرنے کے لیے دوڑا آرہا ہو۔ چٹ روشنی اور پٹ اندھیرا اور اس دن تو گرد اور پانی کی بھاپ سے بھرے ہوئے بادل آسمان پر اژدہے کی مانند بل کھا رہے تھے۔

''کیا مطلب؟ 'اصلی ہے' کا کیا مطلب؟'' کسی نے اونچی آواز اور تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ لڑکیاں استریاں تھوڑی ہیں، اپسرائیں ہیں۔ بنی ٹھنی (۱) کو کسی نے آج تک دیکھا ہے؟ رادھا ماں کو کسی نے آج تک دیکھا ہے؟ کیا

(۱) سترہویں صدی کے ایک والیِ کشن گڈھ کی محبوب ملکہ کی تصویر ''بنی ٹھنی'' کی تصویر کہلاتی ہے، بعض لوگ اسے ''کشن گڈھ کی رادھا'' بھی کہتے ہیں۔ اصل تصویر کی نقلیں آج بھی سارے کشن گڈھ میں عام ہیں۔

کسی کو وہ آج تک سپنے میں بھی نظر آئیں؟ ہم لوگ استری کی شبیہ نہیں بناتے، ہم لوگ چتیرے ہیں، چاند صورت کا روپ بناتے ہیں۔''

''شش، چپ رہو، آہستہ بولو۔'' ایک شخص، جو منھ کو آدھا لپیٹے اب تک الگ کھڑا تھا، پاس آکر بولا۔ ''بحث کا وقت نہیں۔ اس تصویر کو کہیں ہٹا دو، داب دو، پھینک دو۔'' اس کا اضطراب اور جوش دفعتاً کئی درجے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اس نے گانجے کی کلی کا بڑا سا کش کھینچا۔ گاڑھا زردی مائل دھواں اس کی کھچڑی داڑھی کے چاروں طرف بل کھاتا ہوا پھیل گیا اور فضا اس کی بھاری، میٹھی لیکن امتلا انگیز مہک سے گونج اٹھی۔

''کیوں؟ اس تصویر کو کیوں پھینک دیں؟'' ایک شخص ناک سکوڑ کر بولا۔ ''میاں بھی تو نہیں ہے کہ اس سے پوچھ لیں۔ شاید کوئی مول لے چکا ہو تو....''

''ابے چڑیا کے، یہ کیا چانڈو خانے کی اڑائی ہے تو نے؟'' ایک شخص بات کاٹ کر بولا۔ ''اصلی کیا اور نقلی کیا؟ یہ تو بنی ٹھنی ہے۔''

''چپ.... چپ....'' گانجا پینے والا سانپ کی طرح پھپھکارا۔ ''یہ گاؤں لٹے گا۔ یہ گاؤں تباہ ہوگا، اجڑے گا۔ کیا تم دھمک اونچی سانڈنی سواروں اور پہاڑیوں جیسے بھاری صبا رفتاروں کے قدموں کی نہیں سن رہے ہو؟ چلو۔ سب ختم ہو گیا۔ میاں نے اس گاؤں کو سولی پر چڑھوا دیا۔ تقدیریں تمھاری اپنے تھان پر سے ہل گئیں۔'' اس کی آنکھوں میں دہشت کے آنسو تھے اور اس کے گھٹنے لرز لرز کر آپس میں یوں کھٹ کھٹ کی آواز نکال رہے تھے گویا کھڑتال بج رہی ہو۔

''ابے واہی ہوا ہے، گنجیڑی چرسی بدشراب کہیں کا۔ چل اپنا راستہ ناپ نہیں تو تیری گردن ہی نپ جائے گی۔''

کسی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ گانجا پینے والا گرتے گرتے سنبھل کر چلایا:

''یہ بنی ٹھنی نہیں.... یہ بنی ٹھنی نہیں!'' اس نے اب ایک ایک حرف پر زور دیتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر پکارنے کی آواز میں کہا۔ مدت مدید سے گانجا پینے والے کی زبان اور ادائیگی پر اس وقت گانجے کی پیدا کردہ ٹیڑھ کی پرچھائیں بھی نہ تھی۔ ''یہ.... من.... موہنی.... ہے۔''

مہاراول

سب پر سناٹا چھا گیا۔ من موہنی؟.... من موہنی....؟ وہ تو مہاراول کی چھوٹی بیٹی تھی، یہی کوئی پندرہ برس کا سن، اس کی خوبصورتی سارے اطراف میں ضرب المثل تھی لیکن خود اسے کسی نے دیکھا نہ تھا۔ وہ ستر پردوں میں رکھی جاتی تھی اور کیا مجال کہ مشاطۂ خاص کے سوا کسی نے اس کے ہاتھ پاؤں بھی دیکھے ہوں۔ منھ یا بدن دیکھنا تو ایسا ہی تھا جیسا چاند کے اندر اتر جانا۔ تو پھر یہ اس کی تصویر کیسے ہو سکتی ہے؟ فرض کیا کسی نے اس کے نام سے شبیہ خیالی بنائی تو بنائے، اصل سے اسے مطابقت کہاں ہوگی؟ جب ناک نقشہ ہی صحیح نہ ہوگا تو صورت کیسے کھنچے گی؟

''نہیں، یہ سب جھوٹ بکواس ہے۔'' کسی نے پکار کر کہا۔ ''کوئی ہماری شہزادی کو بدنام کرے گا تو زبان کھینچ لی جائے گی۔''

''مگر کوئی کیوں کرے گا بدنام؟'' ایک بڑھیا بولی۔ ''ملائی پر گوبر پوتنے والے کو کیا ملے گا؟ اس کے بھید تک پہنچو، چیخنے اور غصہ کرنے کا یہ موقع نہیں۔ گلو گیری سے ایک دوسرے کی کیا حاصل؟''

''مہاراول کو بدنام کرنے کا چکر ہو سکتا ہے،'' کوئی شخص سر کھجاتا ہوا بولا۔ ''لیکن....''

ابھی اس کا جملہ پورا نہ ہوا تھا کہ ہندل پروا کی سرحد پر گھوڑوں کی ٹاپیں غرانے لگیں۔ گرد کا ریلا اٹھا اور چشم زدن میں پورے گاؤں میں پھیل گیا۔

''میاں کہاں ہے؟ میاں کہاں ہے؟ میاں کہاں ہے؟'' کی آوازیں گرد کی دھند کو چیرتی ہوئیں اور راہ کے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے گھوڑوں کے سموں سے اڑتی ہوئی چنگاریاں اور برستے ہوئے پتھروں کی دھمک سارے پر چھائی ہوئی اور رہواروں کی پویاں قدمی کی تکان سے کسی ننھے بچے کی طرح لرزتی ہوئی زمین۔

"میاں یہاں نہیں ہے، میاں یہاں نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ہم سب نہتے ہیں۔ حکم سرکار ہم بالکل بے خطا ہیں۔" گاؤں والوں میں سے کوئی پکارا۔ پھر اسی طرح کی اور بھی آوازیں بلند ہوئیں۔ لیکن شور اس قدر تھا کہ کسی کی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔

میاں کی جھونپڑی کے طاق میں رکھی ہوئی تصویر پھڑ پھڑا رہی تھی، گویا زلزلہ آیا چاہتا ہے اور سب کچھ ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔ پورا گاؤں گھیرے میں لے لیا گیا تھا۔ اس گاؤں کی بساط ہی کیا تھی، بازار تک نام کی تو کوئی چیز نہ تھی۔ آوازوں کا زور ذرا تھما۔ بچے اور بوڑھیاں اپنے منھ آنکھ کان پر کپڑے ڈالے ہوئے زمین پر گھٹنے نہوڑائے سر جھکائے پڑے تھے کہ جان تو اس طرح شاید پھر بھی نہ بچے مگر قتل عام کا منظر تو آنکھ میں خنجر نہ چبھوئے گا۔ کبھی بالکل خاموشی ہو جاتی، کبھی زور کی بھن بھناہٹ گھٹتی بڑھتی پھیلتی سنائی دیتی۔ زیادہ تر لوگوں کی آنکھ زمین پر تھی، یا اپنے دروازے کی دہلیز پر۔ بہت ہی کم آنکھ ایسی تھی جو پیشانی کی سطح سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ جو بہت بلند ہمت تھے وہ سانڈنی سواروں کے نیزوں کو تک رہے تھے اور ہر نیزہ بردار کے نیزے کا رخ کسی گھر، کسی سینے، کسی بچے، کسی عورت پر تھا۔ لمبے نیزے ہتھوانسے ہوئے وہ بالا قد تنومند جوان جن کے چہرے پر کوئی رنگ نہ تھا، نہ خشونت، نہ برہمی، نہ جوش خوں ریزی۔ قد آدم سے ڈیڑھ سوا دو ہاتھ لمبے نیزے جن کے پھل نیزے کی لمبائی کے نصف سے کچھ کم تھے۔ لمبی باریک نوک لیکن باریکی میں پشت خار کی نزاکت نہیں تھی۔ لگتا تھا جنگلی سور کے اگلے دانت کو کھرچ کر اور سیدھا کر کے نوک کو اور تیکھا کر کے انی کی طرح نیزے کے اوپر جڑ دیا گیا تھا اور اوپر سے چاندی کا خول چڑھا دیا گیا تھا۔ سواروں کی نشست اپنے جانور پر اور نیزوں کی نشست اپنے مالک کے دست و بازو و شانہ پر ایسی تھی کہ دونوں مل کر یک جان ہو گئے تھے، پورا پیکر ایک نیزہ بن گیا تھا۔

گاؤں کی سرحد پر تھوڑا بہت شور۔ سپاہیوں کی قطار گویا آپ سے آپ ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوئی۔ آگے آگے مہاراول گجندر پتی سنگھ اپنے عربی گھوڑے پر سوار، لیکن ننگے سر۔ ننگے سر....؟ گاؤں والوں نے تو کیا، شاید کھلے آسمان نے بھی یہ لرزہ خیز منظر پہلے کبھی دیکھا نہ تھا۔ بالوں سے خوشبو دار پسینہ بہ کر ماتھے اور رخساروں پر ہلکا چمکتا ہوا۔ کان کے پاس سے دونوں طرف کی گھنی کاکلیں مونچھوں سے پیوستہ نہ رہ گئی تھیں اور مہاراول کی سواری کے پیچھے ایک محافہ، بے پردہ۔ بے پردہ محافہ۔ ہمت والوں نے کنکھیوں سے دیکھا، آنکھیں میچ کر کھولیں، پھر دیکھا۔ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں، پھر دیکھا۔ محافہ بے پردہ تھا اور من موہنی اس میں بے چادر اور جوتی۔ ناک ہاتھ پاؤں زیوروں سے عاری۔ منھ پر سرخی کا نشان نہیں، لیکن سر اٹھائے ہوئے۔ رگ گردن میں وہی خفیف سا تناؤ کہ جیسے کچھ مہینے ہوئے رانی بنی ہو اور بیاہ کر شہزادے کے شہر میں آئی ہو اور آ کر اس نے شہر کے باغوں میں لعل اور پکھراج اگا دیے ہوں اور اب گربھ کے بھاری غرور کی سربلندی سے ہم کنار ہو۔ چودہ برس کی شہزادی نے محل کی دہلیز بھی نہ دیکھی تھی لیکن میاں مخصوص اللہ کی جھونپڑی کے طاق میں اس کی تصویر، یا ہو بہو اس جیسی ماہ پارہ کی تصویر ضرور تھی۔ پھر وہ کسی نے بنائی تو

ہوگی۔ من موہنی کا محافہ ٹھیک جھونپڑی کے آگے آکر رکا۔ کسی کے اشارے یا حکم کے بغیر، جیسے اسے خود معلوم تھا کہ یہی میری منزل ہے، من موہنی نے پاؤں پھیلائے اور محافے سے اترنا چاہا۔ لوگوں نے دیکھا، اس کے پاؤں میں بیڑی تھی اور سوسن جیسے نازک پاؤں میں کیا، انگلیوں تک میں کوئی زیور نہ تھا۔ فالج زدہ کی طرح پاؤں کو شانوں اور کہنیوں کے سہارے گھسیٹ کر وہ نیچے آئی اور سرو قد کھڑی ہوگئی۔

''من موہنی....'' عجب دل شگاف لہجہ تھا جس میں التجا، خوف اور دندانہ دار پیش قبض کے پھل کی طرح بے تحاشا کاٹنے اور اندر اندر قیمہ کرنے والے غصے کا درد ہلکی سی آہ میں بدل گیا تھا۔

''من موہنی ای ای....! میری طرف دیکھ۔''

لڑکی نے آنکھیں اٹھائیں۔ لیکن باپ کی آنکھ تک اس کی رسائی نہ ہوسکی۔ اس کی آنکھیں اپنے گلے کے آویز، خون کبوتر کی طرح سرخ یاقوت ستارہ کو دیکھ رہی تھیں۔ دور نزدیک کی مشعلوں کے نور میں یاقوت کی کرنیں یوں پھوٹ رہی تھیں گویا من موہنی کے دل کو چیر دیں گی۔

''تو میری بیٹی، میں والا جاہ گجندر پتی مرزا تیرا باپ، میں نے تجھے اس لیے تو نہ پیدا کیا تھا کہ تو مجھے اور خود کو رسوا کرے۔ یہ تیری تصویر یہاں کہاں سے آئی؟ کس نے تجھے دیکھا اور کس نے اسے اتنی جرأت بخشی کہ وہ تیری شبیہ کو میرے پہلو میں زخم دامن دار بنا دے اور پھر تیرے نام کو لوگ یوں اچھالیں کہ وہ زمین آسمان میں شہاب ثاقب کی طرح سب کے لیے مفت نظر بن جائے؟''

من موہنی کچھ نہ بولی، اس کا سر جھکا کا جھکا رہا۔ کھردری ریتلی زمین کے سنگریزے اس کے پاؤں میں چبھے ہوں گے، مگر اس کے بدن میں کوئی لرزش، بے چینی کے کوئی آثار نہ تھے۔

''موہنی....'' اس کے باپ نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''ذرا مڑ کر دیکھ، وہ کس کی تصویر ہے؟ یہاں کیسے آگئی؟ تو یہاں کیسے آگئی؟ کون ہے وہ؟ اس تصویر کو چترنے والا کون ہے؟ بول تیرے منھ پر یہ کالک کے رنگ کس نے لکھے؟''

لڑکی نے آہستہ گردن موڑ کر اپنے شانوں کے پیچھے دیکھا۔ وہاں جو تصویر اپنی جوت جگا رہی تھی، اس میں بالکل وہی انداز تھا۔ وہ گہری ماشی سیاہی مائل زمین اور ننھے ننھے سفید پاشاں پھولوں کی بوٹیوں والی اوڑھنی ذرا ڈھلکتی ہوئی، پیچھے سے اجیارے کی ہلکی سی چھوٹ میں چمک دار گیسو، جن کا رنگ کہیں کہیں اوڑھنی سے اس طرح مل گیا تھا کہ اوڑھنی اور گیسو میں فرق مشکل سے ہوسکتا تھا اور کہیں وہ بالوں سے زیادہ پرداز معلوم ہوتے تھے اور بڑی بڑی جامنوں جیسی آنکھوں کے گوشے ایک طرف کو مائل، گویا کوئی آنے والا ہو اور وہ اس کی آہٹ سن کر متوجہ ہوگئی ہو۔

''گردن سیدھی کر۔ میری طرف دیکھ۔'' اس بار باپ کے لہجے میں التجا، درد، خوف، کچھ نہ تھا، صرف تحکم تھا۔ من موہنی نے دھیرے دھیرے منھ موڑا۔ اب اس کا پورا چہرہ دوبارہ سب کے سامنے تھا۔ گجندر پتی مرزا عربی

مشکی پر سوار پیچھے ہٹتا گیا، یہاں تک کہ وہ من موہنی سے کوئی دو سو قدم کی دوری پر جا کر ٹھہرا۔ اس نے نیزے کو گھوڑے کی پشت و شکم کے متوازی کر کے دوسرے ہاتھ میں ڈالا، اس طرح کہ نیزے کی انی کا سرا گھوڑے کی کنوتیوں کے بیچوں بیچ آ گیا۔ پھر اس نے میان سے تلوار نکالی، تلوار ہتھوانس کر اس نے بازو پھیلایا۔ دیکھنے والوں کو لگا جیسے کسی آسمانی عقاب کا شہپر اس کے پنجے میں اگ آیا ہو۔ گھوڑے کو ہلکی مہمیز لگی، تلوار اور بازو ساکت اور سخت تھے۔ صبا رفتار کو رانوں سے ہلکا سا دبا کر شہزور نے خدا جانے کیا اشارہ دیا کہ گھوڑے نے ایک قدم جست کی۔ پھر کچھ دکھائی نہ دیا کہ کب وہ دو سو قدم کا فاصلہ طے کر کے من موہنی کے سر پر آ پہنچا، کب تلوار کی بال سے بھی زیادہ باریک دھار من موہنی کی گردن پر اس پار سے اس پار تک خط کھینچتی چلی گئی۔ شہسوار و راہوار آگے بڑھتے چلے گئے۔ دل کی چند دھڑکنوں تک من موہنی کا سر اس کی گردن ہی پر رہا۔ پھر جیسے ٹاپ کی کوہ پیکر دھمک کی تکان مردہ جسم تک پہنچی، من موہنی کا سر لڑھکتا ہوا دو چار گز کی دوری پر بے حس کھردری بھوری زمین پر تھا۔ لیکن من موہنی کے نہال قد کو زمین چومنے کے لیے کچھ لمحے اور درکار تھے۔ خون کی چادر نے اس کے سینہ و پہلو کو ڈھانک لیا، قد بالا یوں لہرایا جیسے رقص میں ہو۔ پھر بستر نرم پر پالے پوسے اس تن کو خاکستر گرم نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

شہسوار دریا کی موج کی طرح لہرا کر بے تکلف یوں مڑا گویا وہ آگے جا ہی نہ رہا تھا، صرف ران باگ کی لڑگت دکھا رہا تھا۔ تلوار بھی اسی رقیق، لہراتی سی شان سے میان کے اندر تھی اور اب اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ میاں کی جھونپڑی کے دروازے پر کشتہ پڑی ہوئی حور کی طرف اس نے نگاہ بھی نہ کی، بس نیزے کو لمبا کیا۔ سدھا ہوا ہاتھ طاق تک پہنچا۔ تصویر کے سینے کو نیزے کی انی سے چھید کر وہ اسے اس طرح باہر نکال لایا جیسے زیر آب خنجر مار کر مچھلی کے پیٹ میں لوہا اتار دیا ہو۔ ایک جھٹکا اور تصویر زمین پر تھی، پھر ایک اشارہ اور تصویر گھوڑے کے سموں تلے پامال تھی۔

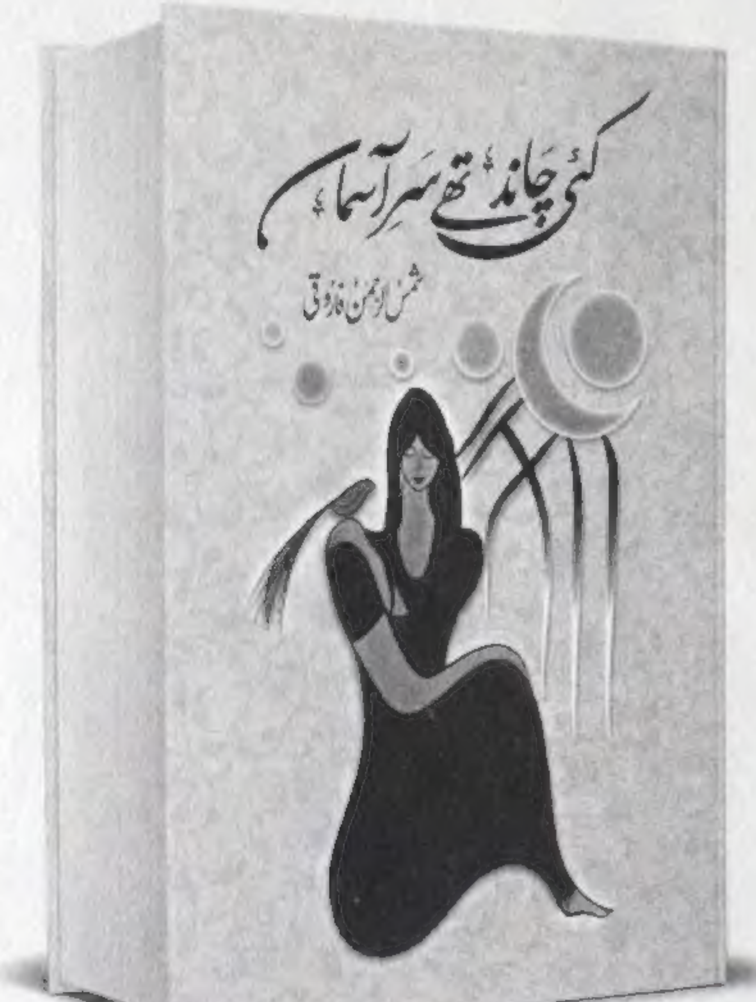
''یہ لوگ صبح کے پہلے پہلے گاؤں خالی کر دیں، ورنہ میں ان کی جان مال کا ذمہ دار نہ ہوں گا۔'' اس نے گردن موڑ کر کسی سے کہا۔ پھر اس نے نیزے کو اسی طرح شبارنگ گھوڑے کی کنوتیوں کے درمیان رکھ لیا اور مجمعے سے نکلتا چلا گیا۔



مدتوں بعد اُردو میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس نے ہند و پاک کی ادبی فضا میں ہلچل مچا دی ہے۔ کیا اس کا مقابلہ اس ہلچل سے کیا جائے جو''امراؤ جان ادا'' نے اپنے وقت میں پیدا کی تھی؟ اور یہ ناول ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جسے اوّل اوّل ہم نقاد اور محقق کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے اور محقق فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ تحقیق و تنقید اور تخلیق کا کوئی ساتھ نہیں۔ لیکن زیرِ نظر ناول کو اس بات کی، جسے قاعدۂ کلی کے طور پر دیکھا گیا ہے، استثنائی صورت سمجھنا چاہیے۔ یہاں ہم تاریخ کو تخلیقی طور پر فکشن کے رُوپ میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں لہٰذا ''کئی چاند تھے سرِآسماں'' کچھ الگ طرح کا ناول ہے۔ ہم اسے زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کے آخری برسوں کی دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو جزئیات پر مکمل مہارت ہے۔ انھوں نے وزیر خانم کی زندگی کو اس درجہ لطافت، نزاکت اور تمام باریک جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری تہذیب، جسے ہند مسلم تہذیب کہیے اور اس کے آخری دنوں میں اس کی چمک دمک اور برگ و بار کا پورا نقشہ آجاتا ہے.... اور وزیر خانم کا کردار بھی کیا کردار ہے کہ وہ تنہا اپنی ذات میں اس تہذیب کا مجسم وجود معلوم ہوتی ہے۔

انتظار حسین

- ’’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘‘ نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ یہ اکیسویں صدی ہی کی نہیں، اُردو فکشن کی بہترین کتاب ہے۔ (اسلم فرخی)
- قدیم داستانوں کی طرح، جو آپ کی نیند چھین لیتی ہیں، یہ ناول بھی جب مکمل ہوا تو ایسا لگا کہ اب میرے لیے دُنیا میں کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا۔ (صدیق الرحمٰن قدوائی)
- ایک عالمانہ، حیرت انگیز تاریخی ناول، غم انگیز جذبات کی فضا لیے، دل کو چھو لینے والی باریک بینی سے لکھا گیا گمشدہ روایات کا تذکرہ۔ (اورحان پاموک)
- کئی چاند تھے سرِ آسماں برصغیر کے ادب کا کوہِ نور ہے: شاہانہ، درخشاں، پُراسرار۔ اس میں ایسی خوشی ہے جو کسی اور کتاب میں نہیں۔ (محمد حنیف)
- اس کتاب کی اشاعت ہماری تہذیب اور ہماری زبان کی ایسی خدمت ہے جو ہمیں اور ہمارے بعد والوں کو ہمیشہ مقروض رکھے گی۔ (مشرف علی فاروقی)
- ایک دل آویز اور پُرافسوں کتاب۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تاریخ اور افسانے کا خوبصورت تانا بانا بُن کر ہمیں ہمارے ماضی کا پیرہن اوڑھا دیا ہے۔ (ندیم اسلم)
- تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ’’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘‘ شمس الرحمٰن فاروقی کا وہ کارنامہ ہے جو اب اُردو ادب کا مستقل اور نہایت اہم باب ہے۔ (محمد حمید شاہد)





اُردو ادب کی آبرو **شمس الرحمٰن فاروقی** کا کہنا ہے کہ وہ اُردو تنقید کو زبان کی خدمت سمجھ کر لکھتے رہے جب کہ شعر کہنا ایک گہری، نا قابلِ وضاحت اور ذاتی مجبوری رہی۔ اُن کی تخلیقی شخصیت کی کھوج میں نکلے ہوؤں کو بہت بعد میں خبر ہوئی کہ اُن کے تخلیقی وجود کے اندر ایک افسانہ نگار بھی ہمیشہ سے موجود رہا تھا۔ وہ اپنی ادبی حیات کے غالب حصے میں اُس سے آنکھیں چراتے رہے۔ کہیں مجبوری میں کہانی لکھنا پڑ جاتی یا کسی افسانے کا ترجمہ کرنا ہوتا تو ایک فرضی مصنف تراش لیتے اور اُس کے نام سے ''شب خون'' میں چھاپ لیا کرتے، اللہ اللہ خیر صلا۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہوگا کہ جو توقیر اُنھیں تنقید میں ریاضت سے ملی تھی وہ اُس پر کسی ایسی ادبی صنف کا سایہ پڑنے نہ دینا چاہتے ہوں گے جسے وہ اپنی تنقید میں شاعری سے کم تر اور یاک جیسی ست رَو گردان چکے تھے۔ خیر، وقت نے پلٹا کھایا اور فاروقی صاحب کے قلم پر بالکل الگ نوع کے افسانے اور ناول رواں ہو گئے۔ جی، وہ افسانے اور ناول جو اپنے کھوئے ہوئے تہذیبی وقار اور خود اعتمادی کو بحال کرنے کے قرینے سجھانے لگے تھے۔ کلاسیکی شعریات کو رواں زندگی کی ہماہمی کے اندر لے آنا فاروقی صاحب کا مسئلہ رہا ہے؛ زندگی بھر کا مسئلہ۔ اُن کے اندر کا شاعر بھی اِس جانب لپکتا رہا اور ناقد بھی مگر فکشن لکھتے ہوئے اِس باب میں جو کامیابی اُنھیں ملی تھی وہ بے نظیر تھی اور موثر بھی۔ فاروقی صاحب کہتے رہے تھے کہ قدیم شعریات کے ذریعے جو تناظر حاصل ہوتا ہے اس سے نئے ادب اور جدیدیت کو سمجھنے میں بھی مدد ملے گی لیکن یہ کیسے ممکن ہو پائے گا، ایسا اُن کے فکشن نے سجھا دیا تھا۔ اس مجموعے میں فاروقی صاحب کے افسانوں، مختصر ناول، عالمی فکشنی ادب کے تراجم (مدون / غیر مدون) سب یکجا کر دیے گئے ہیں۔ شاہکار ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے ساتھ ''مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی'' کا مطالعہ اُردو فکشن کے ایسے روشن باب کا مطالعہ ہے جس کا متن سب سے الگ اور علمی، ادبی اور تہذیبی سطح پر عطا کرنے کے معاملے میں حد درجہ فیاض ہے۔

محمد حمید شاہد

WWW.
BOOK
CORNER
.COM.PK
Standard House of Publishing

Majmua Shamsur Rahman Faruqi
ISBN: 978-969-662-327-4
Rs.1800.00

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0314-4440882
Jhelum (Pakistan)